شیر شاہ اور اُس کا عہد

کارنجن قانون گو

Marfat.com

شیرشاہ اور اُس کا عہد

مصنف

دکالکارنجن قانون گو

مترجم

رام آسرے شرما

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

Marfat.com

پیش لفظ

اردو زبان کی ترویج واشاعت کے لیے حکومت ہند کی وزارت تعلیم وثقافت کے تحت ترقی اردو بیورو کے ذریعے جن لائحوں اور منصوبوں کو عملی شکل دی جارہی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مختلف جدید علوم پر کتابیں ماہرین سے لکھوائی جائیں اور ان علوم سے متعلق اہم مغربی ومشرقی کتابوں کے تراجم شائع کیے جائیں جو نہ صرف زبان بلکہ قوم کی ترقی میں بھی مفید ومعاون ثابت ہوں۔

اس منصوبے کے تحت ترقی اردو بیورو اب تک خاصی تعداد میں کتابیں شائع کرچکا ہے۔ ان میں شعر وادب، تنقید، لسانیات، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، تجارت، زراعت، امور حکومت، معاشیات، عمرانیات، قانون، طب، فلسفہ اور نفسیات پر اعلیٰ کتابوں کے علاوہ تعلیمِ بالغان، بچوں کے ادب، سائنس اور تکنیکی علوم سے متعلق ایسی کتابیں بھی شامل ہیں جو اردو کی نصابی ضرورتوں کو بھی کسی حد تک پورا کررہی ہیں۔ ان موضوعات پر اچھی آسان اور معیاری کتابوں کی جو کمی اردو حلقوں میں شدت سے محسوس کی جارہی تھی وہ بیورو کے ذریعہ آہستہ آہستہ پوری ہورہی ہے۔ ترقی اردو بیورو کی شائع کردہ کتابیں حسنِ طباعت کا ایک معیار قائم کرتی ہیں اور ان کی قیمت بھی نسبتاً کم رکھی جاتی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ان کتابوں کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہورہا ہے۔

ترقی اردو بیورو کے جامع منصوبوں کے تحت اردو انسائیکلوپیڈیا، اردو لغت (کلاں) اردو لغت (برائے طلبہ) انگریزی اردو لغت، اردو انگریزی لغت، بنیادی متون کی اشاعت، اردو کتابیات کی تیاری اور مختلف علوم کی اصطلاح سازی کے کام بھی جاری ہیں۔ ان کی تکمیل کے لیے ہمیں ملک بھر کے ماہروں کا تعاون حاصل ہے۔

زیر نظر کتاب ترقی اردو بیورو کے اشاعتی پروگرام کا ایک جز ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو داں حلقوں میں اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

کے کے کھلر

ڈائریکٹر، ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی

Marfat.com

فہرست

تمہید 7

دیباچہ 11

باب 1

فرید عُرف شیر شاہ کے مورث اور اس کا بچپن 31

باب 2

مُصیبت کی درسگاہ میں 73

باب 3

والد کی جاگیر کا انتظام 95

باب 4

تقدیر کی گردشیں 127

باب 5

شیر خاں بحیثیت نائب گورنر بہار 162

باب 6

سُورج گڑھ کی لڑائی 226

باب 7

تلاشِ تاج 246

باب 8

بنگال کے لیے ہمایوں اور شیر شاہ کی جنگ 279

Marfat.com

باب 9
شیر شاہ مغلوں کے سراغ میں 317
باب 10 ہمایوں پر آخری فتح 357
باب 11
سلطنت ہند کی از سرِ نو تعمیر 396
باب 12
شیر شاہ اور سندھ پار کے قبائل 434
باب 13
شیر شاہ اور بنگال 486
باب 14
مالوہ کی فتح 516
باب 15
ریگستان کا سایہ 545
باب 16
مالوہ کی مکمل فتح اور شیر کی سلطنت میں ملایا جانا 594
باب 17 مارواڑ پر حملہ ہجری ۹۵۰ھ - ۹۵۱ھ 616
باب 18
آخری مہم اور انتقال 663

Marfat.com

تمہید

شیر شاہ دنیا کی ان ممتاز ہستیوں میں سے ایک ہے جس کے ساتھ تاریخ نے انصاف نہیں کیا ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی وفات کے دس سال کے اندر نہ صرف اس کا خاندان نیست و نابود ہو گیا بلکہ عنانِ حکومت اس کے قبیلے کے ہاتھ سے نکل کر جس اجنبی قوم کے ہاتھ میں پہونچی اور جس کا ہند میں صدیوں تک اقتدار رہا اس نے اپنے پٹھان مخالفین کی یادگاریں نہایت سنگدل انتقام کے جذبہ سے متاثر ہو کر ہاتھ دھو کر پیچھا کیا۔ اسی مخالف قوم کے سوانح نگاروں کی تصانیف کی بنیاد پر شیر شاہ کی تاریخ کا از سر نو خاکہ تیار کرنا ہے۔

پھر بھی شیر شاہ کے متعلق موجودہ تاریخی مواد نہ تو کم ہی ہے اور نہ یک طرفہ ہی ہے۔ لیکن شیر شاہ پر قلم اٹھانے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ ہم فارسی زبان کے جملہ دستیاب قلمی نسخوں کا گہرا مطالعہ کریں۔ اس مشکل کام سے مورخین نے آج تک گریز کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ فارسی قلمی نسخوں کی افراط ہے اور وہ سب ایک ہی مقام پر دستیاب بھی نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شیر شاہ کے متعلق فارسی تصانیف کی مختلف نقلیں ہیں۔ ان کی باہمی مطابقت کے لیے کافی وقت کی ضرورت ہے ان جملہ مسودات پر تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کس کتاب میں کتنی باتیں معتبر اور مستند ہیں۔

آج تک عوام کے ذہن میں شیر شاہ کا جو تصور ہے وہ زیادہ تر ان واقعات پر مبنی ہے جو "ایلیٹ اور ڈاوسن کی جلد چہارم" میں موجود ہیں یا اس سے بھی بدتر وہ ترجمہ ہے جو لیفٹیننٹ کرنل برگس نے تاریخ فرشتہ

Marfat.com

کا کیا ہے۔ ریورٹی کے اس ترجمہ کی سخت تنقید کے بعد اس ترجمہ کی اہمیت
اور سند بالکل ہی ختم ہو گئی لیکن ایلیٹ پر کم ہی لوگوں کو شبہ ہوا پہلی
مرتبہ جب میں نے ایلیٹ کے ترجمہ کا اصل قلمی نسخوں سے مقابلہ کیا تو میں
اس نتیجہ پر پہونچا کہ ایلیٹ نے شیر شاہ کے متعلق جو ترجمہ کیا ہے وہ نہ تو
جامع ہے اور نہ ایماندرانہ۔ اس سے پیشتر اس بات کا کسی کو گمان بہ بھی تھا
چنانچہ میری متواتر کوشش یہ ہی رہی کہ شیر شاہ کے متعلق بلا کسی امتیاز
کے تمام اصلی اور ضمنی اور دیگر قسم کے مواد کی جستجو کروں اور کسی چیز کو
بھی نظر انداز کیے بغیر اصل فارسی نسخوں کا گہرا مطالعہ کروں۔ میں نے انگریزی
ترجموں کی ذرا بھی پروانہ کی چاہے وہ کتنے ہی معروف کیوں نہ ہوں۔ اس
طرح میں نے ایک اوریجنل (نئی) اور جامع بنیاد پر شیر شاہ کی
سوانح عمری مرتب کی ہے۔ اور جب تک اس کے عہد کا کوئی ایسا مواد
جس کا کہ ہنوز کوئی علم نہیں، دستیاب نہ ہو میری یہ تصنیف نامکمل تصور
نہیں کی جا سکتی۔

شیر شاہ کے متعلق اس جدید مطالعہ کے بعد میں نے شیر شاہ کے کردار کو
ایک نئی روشنی میں دیکھا۔ اس کی شہرت کو جو محض مبہم لیکن عظیم تھی
اس کو میں نے واقعات کی تحقیق کر کے ایک ٹھوس بنیاد پر لاکر کھڑا
کیا۔ بیشتر مورخین نے شیر شاہ اور اس کے زمانہ کی تاریخ لکھنے میں جو بیشمار غلطیاں
کی تھیں ان کی میں نے اصلاح کی۔ اس قسم کا خصوصی مطالعہ کرنے والا جملہ
دستیاب تاریخی مواد کو تنقید کی چھلنی میں چھاننے سے باز نہیں رہ سکتا
اور نہ کسی بہانے کی ہی آڑ لے سکتا ہے۔ چنانچہ صداقت کو سامنے لانے کی
غرض سے تشریح کی ضرورت ہوئی اور مجھے مواد کو تفصیلی طریقہ سے استعمال
کرنا پڑا اور نتائج کی تائید میں شہادت اور دلائل بھی پیش کرنے پڑے
کیوں کہ ایک نو آموز اور بدرجہا گمنام مورخ کی بات پرانے تجربہ کار اور
اس فن کے ماہر اساتذہ کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ مجھے امید ہے کہ
میری اس کاوش اور جانفشانی کے بعد عوام کو شیر شاہ کی اصل ہستی کا

Marfat.com

اندازہ ہو جائے گا اور دنیا کو ایک ایسے فرمانروا کی سوانح عمری ملے گی جو افغانوں میں بہترین منتظم اور فنِ حرب میں غیر معمولی ذہانت رکھتا تھا۔

اس میدان میں مجھ سے پہلے جن مشہور و معروف اساتذہ نے کام کیا ہے میں ان حضرات کا ممنون ہوں۔ خصوصاً سر ہنری ایلیٹ۔ بلاک مین۔ جیرٹ۔ ڈاکٹر ڈارن اور مسٹر اور مسز بیورج کا۔ جن کی تصانیف سے مجھ کو بہت مدد ملی ہے۔

میں اپنے محترم استاد جادو ناتھ سرکار ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس کا لتناہی رہینِ منت ہوں جتنا کہ ایک بیٹا اپنے باپ کا ہوتا ہے۔ ان کے عظیم الشان کتب خانہ میں نادر و کمیاب فارسی قلمی نسخے اور مستند کتابیں اور فاضلانہ رسالہ ہیں۔ نقشہ جات اور ڈسٹرکٹ گزیٹیرس ہیں۔ غرض کہ وہ سارا مواد موجود ہے۔ جس کی ایک تاریخی تحقیق کرنے والے کو ضرورت ہو سکتی ہے۔ انہوں نے بخوشی یہ تمام مواد مجھے دیکھنے کی اجازت دی جس کی وجہ سے میں — "شیر شاہ" مکمل کر سکا۔ میں نے یونیورسٹی سے آخری

امتحان پاس ہی کیا تھا کہ ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور انہوں نے اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے مجھے تاریخ میں تحقیق کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ میں نے اس کتاب کا مسودہ ان کے مکان پر ۱۸ مہینہ کے قیام کے دوران ہی تیار کیا۔ انہوں نے اس کو تو پڑھا ہی۔ مزید براں اس کے پروف بھی پڑھے۔ مختصر یہ کہ انہوں نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں قدم قدم پر بڑے شوق سے میری رہنمائی کی۔ ایک معنی میں یہ تصنیف ان کی "ذہنی تخلیق" ہے۔

مجھے یہ بات بھی بڑے فخر سے یاد ہے کہ شیر شاہ کی عظمت سے میرا سب سے پہلا تعارف میرے محترم استاد پروفیسر ڈاکٹر اے۔ سہروردی۔ ایم۔ اے۔ بار ایٹ لا کی ایک فاضلانہ تقریر کے ذریعہ ہوا تھا۔ جو انہوں نے میری جماعت میں کی تھی۔ ان کی جاذب شخصیت نے مجھے اسلامی تاریخ کے مطالعہ کی جانب رجوع کیا۔ اور میرے دل میں علم کی تشنگی پیدا

Marfat.com

کی۔ میں اپنے ولی صفت چچا وبھوتی بھوشن دت ایم۔ ایس سی۔ پی۔ آر۔ ایس۔ کا بھی بہت متشکر ہوں جنہوں نے مجھے قانون کے مطالعہ سے نجات دلا کر میری زندگی کو یہ موڑ دیا۔ میں ان کے بارِ احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ جب مالی مشکلات میرے راستہ میں حائل تھیں۔ تو ایسے نازک موقع پر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے امداد دے کر مایوسی سے بچایا۔

آخر میں میں اپنے کرم فرما بابو بریندر ناتھ بنرجی کا بھی شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے بنگالی زبان میں متعدد تاریخی کتابیں لکھی ہیں۔ انہوں نے بڑے شوق و محنت سے میری کتاب کے پروف دیکھے اور اس کتاب کو بہت ہی قلیل مدت کے اندر چھپ جانے میں میری مدد کی۔ پروف پڑھنے کے دوران انہوں نے میری بہت سی کمزوریوں اور غلطیوں کی طرف اشارہ کیا جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔

رکالکار نجن قانون گو
کٹک۔ اوڑیسہ
مورخہ ۲۰ جون ۱۹۲۱ء

Marfat.com

دیباچہ

۱۹۲۱ء میں مصنف نے دہلی کے "اس ٹائیگر سلطان" کی سوانح عمری بہ عنوان "شیر شاہ" لکھنے کی جرأت کی تھی اب پورے ۴۳ سال کے بعد مصنف کی ضعیفی میں یہ دوسری کتاب "شیر شاہ اینڈ ہز ٹائمس" شائع ہو رہی ہے۔

جس کا دیباچہ مصنف نے خود اپنے قلم سے لکھا ہے۔ میری یہ کارگذاری پٹھان سوانح نگار نعمت اللہ کی کوشش کی مانند ہے۔ اس نے جہانگیر کے عہد میں ۱۶۲۱ء میں مخزن افغانی شائع کی تھی بعد ازاں عمر نے اسکے ساتھ وفا کی اور پورے ۴۶ سال بعد بہ عہد اورنگ زیب ۱۶۶۷ء اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن جو پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل تھا بہ عنوان "مخزن افغانی و تاریخ خان جہاں لودی" شائع ہوا۔ میری ۱۹۲۱ء کی پہلی تصنیف "شیر شاہ" میرے محترم استاد سر جادو ناتھ سرکار کی رہنمائی میں ان کے کٹک کے مکان پر ۱۸ مہینہ کے دوران قیام لکھی گئی تھی۔ اس کے لیے میں نے ایک سال تک کلکتہ میں ابتدائی تیاریاں کی تھیں۔ اس کے برعکس "شیر شاہ اینڈ ہز ٹائمس" لکھنے کے لیے میں ۱۹ سال تک تیاری کرتا رہا۔ اور بعد ازاں ۱۰ سال اس کتاب کے لکھنے اور دہرانے میں صرف ہوئے۔ میں شروع میں ہی یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری یہ کتاب پہلی کتاب "شیر شاہ" کا محض توسیع شدہ ایڈیشن نہیں ہے۔ "شیر شاہ" کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ وہ میدان تحقیق کے نوآموز طالب علم کا ایک شاہکار ہے جو کہ آرام کرسی پر بیٹھ کر کتب خانہ میں تیار کیا گیا ہے۔ اس وقت میرے دماغ پر اس میدان میں

Marfat.com

کام کرنے والے دوسرے بزرگوں اور قرون وسطیٰ کے سوانح نگاروں اور ان کی تصانیف کا بڑا اثر تھا۔ میں ان سے مرعوب تھا اور ان کا احترام کرتا تھا۔ غرض کہ میری یہ تصنیف ایک جواں عمر پرجوش مصنف کی کارگزاری کا نمونہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کو شیر شاہ کی ایسی سوانح عمری کہا جاسکتا ہے۔ جس میں شیر شاہ کی طرفداری اور حمایت مدنظر ہے۔ لیکن جن صفات وخوبیوں کی وجہ سے میری کتاب "شیر شاہ" پڑھنے والوں میں مقبول ہوئی وہ زیر نظر تصنیف "شیر شاہ اور اس کا عہد" میں موجود نہیں ہیں۔ عمر اور تجربے کا تقاضا تھا کہ میں اس تصنیف میں اپنا انداز بیان اور طرز تحریر بدل دوں۔ اس کے ساتھ ساتھ میرے ماحول اور نقطۂ نظر میں بھی کافی تغیّر ہوگیا ہے مگر یہ تبدیلی محض سطحی یا ادبی قلابازی نہیں۔ نہ یہ کسی سیاسی یا مصنوعی فلسفہ سے متاثر ہے جس کا ادبی دنیا میں فی زمانہ عام رواج ہے۔ بلکہ یہ عدالت میں پیش مقدمہ کی طرح تاریخی تحقیق کی حمایت میں ایک اعلیٰ تر عدالت کے سامنے دوبارہ غور کرنے کی اپیل ہے۔ موجودہ تصنیف میں ۱۹۲۱ء کے "شیر شاہ" کا مصنف قانون گو اپنے مداحوں اور نکتہ چینوں کے برابر عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہے۔ اور ان سب کی ان کے نقطہ نظر کے متعلق جرح ہوچکی ہے۔ اس کتاب کا ہر باب میرے اس بیان کا شاہد ہے کچھ کم ظرف ناقدان سخن نے "شیر شاہ" کے ادبی محل کا پلاسٹر کہیں کہیں سے اکھاڑنے میں مسرت حاصل کی ہے۔ مگر میں نے تو اس عمارت کے وہ تمام حصے بے پس وپیش گرادیے ہیں۔ جو بظاہر تو محفوظ اور مضبوط معلوم ہوتے تھے لیکن دراصل کمزور تھے حقیقت تو یہ ہے کہ "شیر شاہ" کے ۲۰ سال تک بازار میں رہنے کے بعد بھی اس کے مصنف کی کوئی بے حرمتی نہیں ہوئی۔ تاریخی صداقت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے سے کوئی فائدہ نہیں اگر آج نہیں تو کل سچائی عیاں ہو ہی جاتی ہے۔ اور اگر کسی مورخ نے اپنی مصنوعی شان کی خاطر یا اپنی تصنیف کے جھوٹے پیار میں اپنے فرض میں کوتاہی کی تو اس کی روح قبر میں بھی

Marfat.com

شرم سے پانی پانی ہو گی۔

موجودہ تصنیف میں میرے کچھ نتائج سے پڑھنے والوں کو پریشانی پیدا ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ وہ بحث طلب اور نہایت ہی جدت پسند ہیں لیکن قرون وسطیٰ کے سچے عالموں کو ایسے مسائل پر اپنا قطعی فیصلہ دینا ہوگا۔ مثلاً کیا فرید نے اوائل عمری میں جون پور میں تعلیم حاصل کی یا راہزنی کی یا دونوں کام ایک ساتھ کیے؟ اسی طرح فرید کو شیر خاں کا خطاب کیا اس لیے ملا کہ اس نے دراصل کوئی شیر مارا تھا؟ میں نے ۱۹۲۱ء میں "شیرشاہ" کے ہر باب کو سر جادو ناتھ سرکار کو دکھانے کے لیے تین تین بار لکھا تھا۔ اس پر بھی انہوں نے مجھے صاف طور سے آگاہ کر دیا تھا کہ اس کتاب میں لکھے گئے واقعات و نتائج کی ذمہ داری میری تنہا ہو گی۔ وہ میرے کسی واقعہ کی کوئی جانچ پڑتال نہ کریں گے۔ اگرچہ "شیرشاہ" کے آخری باب میں سر جادو ناتھ سرکار نے کوئی کمزوری نہیں بتائی تھی۔ تاہم کتاب کے چھپتے چھپتے میں نے اسے اس کے مسوّدہ سے ہٹا دیا۔ اور اس طرح میں بال بال ایک سخت غلطی سے بچ گیا۔ مجھے کچھ ایسا احساس ہوا کہ میں نے کہیں نہ کہیں اس باب میں اکبر کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا ہے اور اس کی افسردہ و غمگین روح خواب میں میرے سامنے گھوم رہی ہے بعد ازاں جب میں نے دارا شکوہ کی سوانح عمری لکھنے کے لیے صوفی مذہب کا مطالعہ کیا تو تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے مجھے یہ سبق حاصل ہوا کہ محقق کو سب سے بڑا خطرہ اس کی خود بینی و خود نمائی سے ہے اور حقیقت کے متلاشی کو اس سے ہر وقت آگاہ رہنا چاہیئے۔ چنانچہ تاریخ کے ہر طالب کو "میں" یا سنسکرت زبان کے لفظ "ہم" سے بچنا چاہیے۔ "میں" ہی مصنف کے ذہن میں تعصب خودستائی یا طرفداری پیدا کرتا ہے۔ "شیرشاہ" کی اشاعت کے بعد سے آج تک نقادان ادب نے میری اس تصنیف کے متعلق اچھی اور بری دونوں قسم کی رائے ظاہر کی ہے۔ لیکن میں نے اپنے دماغ کو ہر دو قسم کی تنقیدوں سے بے حس رکھا۔ بقول شخصے کہ

Marfat.com

"نہ ستائیش کی تمنا نہ شکایت کا گلہ"

نہ تو میں نے کسی ناموافق تنقید کا جواب ہی دیا اور نہ کسی غلطی کو تسلیم ہی کیا۔ موجودہ تصنیف میں میں نے اُن تمام باتوں کا مناسب جواب دیا ہے۔ جہاں کہیں میں نے یہ محسوس کیا کہ تنقید نگار کی بات میرے مقابلہ میں زیادہ جاندار ہے میں نے بے چوں وچرا اس کے سامنے سر جھکا دیا۔ اس ضمن میں میں سب سے زیادہ "نوٹس اینڈ کمنٹریز ان ایلیٹ اینڈ ڈاوسنز ہسٹری آف محڈن ڈاینیسٹیز" کے مصنف پروفیسر ہوڈی والا کی پر معنی تنقید و عالی مرتبہ مورخ ایچ بیورج سے مستفید ہوا ہوں۔ بیورج نے مجھے ایک شفقت آمیز خط لکھا جس میں انہوں نے رائے سین کی فتح کے بعد پورنمل کے راجپوتوں کے قتل عام میں شیر شاہ کے جرم کی پردہ پوشی کرنے کے لیے بڑے ہی نرم الفاظ میں میری نکتہ چینی کی تھی۔ تمام واقعات کا دوبارہ مطالعہ کرنے کے بعد میں خود اُس رائے کا حامی ہو گیا ہوں کہ اس شرمناک فعل کی ذمہ داری تنہا شیر شاہ کی ہی ہے اور اس کا جرم ناقابل معافی ہے اسی طرح میرے مرحوم دوست ڈاکٹر این۔ کے۔ بھٹسالی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے شیر شاہ کی تاجپوشی کی میری پہلی تاریخ ۹۴۶ھ ہجری کو غلط ثابت کیا۔ کیوں کہ ان کو ۹۴۵ھ ہجری کے شیر شاہ کے بنگال میں اپنے نام کے جاری کیے ہوئے سکے دستیاب ہو گئے تھے۔ دوراہہ کی جنگ کے متعلق پہلے میرا خیال تھا کہ شیر شاہ نے اس موقعہ پر کوئی غداری نہیں کی لیکن میرے ایک دوسرے مرحوم دوست لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر اور "ہمایوں بادشاہ" کے مصنف ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنرجی نے سب سے پہلے میری اس رائے کو چنوتی دی۔ اگرچہ ان کی دلیل کمزور تھی اور ان کا لڑائی کے مقام کا تعین بھی غلط تھا۔ پھر بھی موجودہ تحقیق میں وہ سچائی ان کے ہاتھ لگی جس تک ۱۹۲۱ء میں میں نہ پہونچ سکا تھا۔ چنانچہ موجودہ کتاب میں میں نے ان کے اور اپنے خلاف دلائیل پیش کرنے کے بعد اپنی پہلی رائے کو مسترد کر دیا اور ان کی اصلی بات کو تسلیم کر لیا ہے۔ اسی طرح نعمت اللہ کے

Marfat.com

"مخزن" کے ایک قلمی نسخہ کی بنا پر میں نے ۱۹۲۱ء میں شیر شاہ کی جائے پیدائش حصار فیروزہ بتائی تھی لیکن اب میں اپنے محترم دوست الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی رائے کا معتقد ہوں جو عمر۔ تجربہ اور شہرت میں مجھ سے کہیں زیادہ ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ فرید عرف شیر شاہ غالباً نارنول میں پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے موجودہ کتاب میں ڈاکٹر موصوف کی رائے کو سچائی اور قیاس کے زیادہ نزدیک سمجھ کر اپنی پہلی رائے کو منسوخ کر دیا۔ شیر شاہ کو اپنی زندگی میں محض ایک ہی "ہمایوں" سے واسطہ پڑا تھا۔ لیکن مجھے موجودہ کتاب لکھتے وقت دو دو ہمایوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک ہمایوں ڈاکٹر ایس۔ کے بنرجی کا تصنیف کردہ "ہمایوں اینڈ ہز ٹائمس" کی شکل میں نمودار ہے اور دوسرا ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی ذہنی تخلیق سے جو "ہمایوں بادشاہ" کے نام سے موسوم ہے۔ مجھے ان فاضلانہ کتابوں کی تنقید میں سخت الفاظ استعمال کرنے پڑے جس کے لیے میں ان حضرات سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اس عالمانہ بحث کو دوستوں کی تفریح طبع کا پر مذاق مشغلہ ہی سمجھنا چاہیے یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر راقم التحریر کو ایک بار پھر اپنی رائے میں ترمیم کرنی پڑے کہ شیر شاہ کی والدہ افغان قوم سے نہیں تھی جیسا کہ اب تک موجودہ قرون وسطیٰ کے جملہ مورخین سمجھتے رہے۔ ابھی حال ہی میں ہندی کی ایک نظم "قایم خاں راسو" ملی ہے۔ جس کے پڑھنے سے کچھ ایسا انداز ہوتا ہے کہ غالباً میاں حسن کی پہلی بیوی نارنول کی سرحد کے نزدیک فتح پور جھنجھنوں (شیخاوٹ) کے قایم خانی راجپوت حکمراں کی لڑکی تھی۔ تاریخی تحقیق میں کوئی آخری رائے نہیں ہوتی۔ محقق کی تحقیق کا ہر قدم اس کی صلاحیت کے مطابق یا تو اسے چند قدم سچائی کے نزدیک لے جاتا ہے۔ یا حقیقت سے دور ہٹا دیتا ہے۔

گذشتہ ۳۰ سال میں شیر شاہ کو لے کر تاریخی تحقیق کے میدان میں غلط اور صحیح دونوں راستوں پر کافی ترقی ہوئی ہے لہٰذا مجھے اپنی موجودہ تصنیف

Marfat.com

میں ان نتائج پر بحث کرنے کیلئے اکثر اصل موضوع سے دور رہنا پڑا ہے۔ اس وجہ سے پڑھنے والوں کو یہ شکایت ہو سکتی ہے کہ اس کتاب میں اسلوب بیان از حد سست و پیچیدہ ہے۔ انہیں یہ بھی شکایت ہو سکتی ہے کہ اس ادبی شاہکار "شیر شاہ اینڈ ہز ٹائمس" کے پردہ پر ایک جم غفیر نمایاں ہو گیا ہے اور اس وجہ سے شیر شاہ کے بمقابلہ اس کے رقیبوں اور مخالفین کی تصاویر زیادہ اُجاگر ہو گئی ہیں جس سے کہ پڑھنے والوں کی نظر کتاب کے ہیرو پر نہ پڑ کر دوسری جانب رجوع ہو جاتی ہے۔ لیکن مصنف کی یہ ایسی مجبوری تھی جس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ سولہویں صدی کے اولین دور میں شیر شاہ کے والی و سرپرست بابر اور سلطان محمود لوہانی تھے بہادر شاہ گجراتی اور بنگال کے سلطان محمود شاہ اسکے ہمعصر تھے اور شہنشاہ ہمایوں اور راؤ مالدیو اسکے رقیب اور مخالف تھے صف اوّل کی یہ جملہ ہستیاں جب تک کہ زمانے انہیں تہ خاک نہ کر دیا۔ ایک معمولی جاگیر دار کے اولوالعزم لڑکے کے مقابلہ میں زیادہ قابل قدر و مشہور و معروف تھیں۔ میں نے ان اشخاص کا شمار نہیں کیا جو ان سے کمتر درجہ کے تھے مثلاً سلطان محمود بن سکندر لودی۔ بِبَن و بایزید وغیرہ جنہوں نے بابر اور ہمایوں کے مقابلہ میں زبردست معرکہ آرائی کی۔ حالاں کہ شیر کے زمانہ کی تاریخ کے بنانے میں ان حضرات کا اتنا ہی حصہ تھا جتنا کہ خود شیر کا۔ چنانچہ انصاف کا تقاضہ تھا کہ تاریخ لکھتے وقت ان با قتدار ہستیوں کا ذکر بھی کچھ تفصیل سے کیا جائے۔ اگر شیر کی تصویر بناتے وقت اس کے ہم عصر دوستوں اور رقیبوں کی تصاویر تاریخ کے پس منظر سے ہٹا دی جائیں تو اس کی تصویر بنگال کے شاہی شیر کے مانند ہو گی۔ جس کے بدن پر سے اس کی شاندار دھاریاں مٹا دی گئی ہوں۔

جیوں جیوں میری عمر کے دن گزرتے گئے موجودہ تصنیف اپنی ضخامت میں بڑھتی گئی۔ اور ذوق و دلچسپی میں بھی تنوع پیدا ہو گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۹۲۱ء میں میری پہلی تصنیف "شیر شاہ" شائع ہونے کے بعد ہی میں نے اس مضمون کا گہرا مطالعہ شروع کیا۔ اس وقت تک میں نے سہسرام بھی نہیں دیکھا تھا۔ جہاں شیر شاہ کا مقبرہ ہے۔ سرحدی پٹھان کی محض ایک ایسی تصویر

Marfat.com

میرے ذہن میں تھی کہ وہ ایک گنوار۔ کپڑا بیچنے والا" کابلی والا" ہے جو کہ اکثر چٹگانگ کے دیہاتوں میں گھوما کرتا ہے بسنہ ۱۹۲۰ء میں رامجس کالج میں میری پہلی تقرری قرون وسطیٰ کی تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے میری عین خوش نصیبی تھی۔ دہلی قرون وسطیٰ کی حکومتوں کا عظیم الشان مدفن ہے۔ اس کی کیفیت وہاں کی فضا میں ہنوز موجزن ہے۔ رام جس کالج میں میں نے اپنی کلاس میں ہی دہلی کے ایک لودی افغان کا لچر نمونہ دیکھا۔ یہ ایک نازک بدن اور رہنس مکھ نوجوان تھا جس کو کہ ایک بنگالی یا مرہٹہ لڑکا تصور کیا جا سکتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا والد ایک قوی جثہ بلند قد اصلی پٹھان کے مانند اپنے خاندان کا مطلق العنان مالک تھا وہ اپنے اسکول جانے والے بچوں کو سبزی وغیرہ کی غذا کھلاتا تھا۔ اور گائے کا دودھ پلاتا تھا تاکہ وہ ہندو لڑکوں کی طرح عالم فاضل بن سکیں۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں میں نے وشوبھارتی کے جشن برشگال کے موقع پر ایک اور لودی پٹھان دیکھا۔ جو میرے اس طالب علم سے بھی گیا گزرا تھا۔ اس سے میرا مزید جوش وخروش اور تجسس ختم ہو گیا۔ یہ پٹھان ایک کسان تھا۔ جو صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے اپنا انعام لینے آیا تھا۔ انعام دیتے وقت اس کے حوالہ میں بتایا گیا کہ وہ اپنے کو پٹھان ہونے کا دعوی کرتا ہے۔ اس کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی۔ ہڈیاں ابھی پکی نہ تھیں۔ رنگ آبنوسی اور مزاج میں رعونت اور شیخی تھی۔ وہ اپنے زبان اور قبیلہ کو بھول چکا تھا پھر بھی اس کا اپنے کو پٹھان کہنا غیر تاریخی نہ تھا۔ کیوں کہ بنگالی فوج کے عقب اور جہازی بیڑہ کو راج محل کی پہاڑیوں میں سکری گلی کی جانب موڑنے کے لیے شیرخاں اس خطہ سے ہو کر گزرا تھا۔ اور یہ بات بھی ہر خاص وعام کو معلوم ہے کہ اس نے بنگال کے ان سرحدی اضلاع میں بہت بڑی تعداد میں پٹھان قبیلوں کو باہر سے لاکر آباد کیا تھا۔ اب مورخ اس کا اندازہ خود ہی کر سکتے ہیں کہ وقت اور جائے سکونت کسی بہادر قوم کو کس قدر بدل سکتے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۳ء اور سنہ ۱۹۲۶ء کے درمیان مجھے شمالی ہند میں گھوم کر وہاں کی اشیاء اور اشخاص خصوصاً جاٹوں اور پٹھانوں کو ہندوستانی ماحول میں دیکھنے

Marfat.com

کا شوق دامن گیر ہو گیا۔ پٹھانوں کے قد و قامت کے لحاظ سے دریائے سندھ پار کرنے کے بعد میں ان کے سامنے ایسا لگتا تھا گویا بلیوں کے درمیان کوئی چوہا ہو۔ شمالی ہند میں پٹھان حکومت کو سمجھنے کے لیے ہندوستان کی سرزمین میں پٹھان ذہنیت کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اور اسی وجہ سے شیر شاہ اور اس کے زمانہ کو سمجھنے کے لیے قرون وسطی کے دور میں پیچھے جانا پڑتا ہے۔ افغانوں کی ذہنیت اور طریقہ معاش کو سمجھنے کے لیے افغانستان جانے کی ضرورت نہیں بلکہ اپنے ملک میں ہی یو۔پی میں روہیلکھنڈ کے دیہاتی علاقہ میں جا کر پٹھانوں کے درمیان رہنے سے اس کا علم ہو سکتا ہے۔ دریائے سندھ کے اس جانب شیر کی یاد عوام کے ذہن میں ابھی بھی تازہ ہے خاص کر شیر گڑھ نام کی جگہ پر کوئی سرائے یا اس کے بنائے ہوئے سڑکوں کے جال کا کوئی ٹوٹا ہوا حصہ اس کی یاد دلانے کو کافی ہے۔ پنجاب کے دیہاتی علاقہ میں بھی عام آدمی شیر خاں کو ہنوز بھولا نہیں ہے۔ کسی نہ کسی شکل سے اس کا نام ان کے خیالوں میں موجود ہے۔ میں نے کچھ دور تک اس سڑک پر پیدل سفر کیا ہے جو کہ شیر نے ملتان اور لاہور کے درمیان بنوائی تھی۔ یہ دوسری جگہ کی سڑکوں سے بالکل مختلف ہے اور ایک گھماؤ دار اتھلے خشک نالے کی طرح دکھائی پڑتی ہے۔ یہاں کی مقامی زبان میں اس سڑک کا نام "گنکا والی" سڑک ہے۔ جو کہ ہڑپا ریلوے اسٹیشن سے موجودہ کھدائی کی جگہ تک جاتی ہے۔ مجھے اس قسم کی مختلف باتوں کی واقفیت ہڑپا کے ڈی۔ بی۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے ہوئی۔ یہ اٹک ضلع کے رہنے والے تھے۔ جب اس علاقہ میں کسی بڑے افسر جیسے تحصیلدار وغیرہ کی سواری نکلتی ہے۔ تو اس سڑک پر پانی چھوڑ دیا جاتا ہے تا کہ گرد دب جائے۔ اس سڑک کا یہ مقامی نام کاک پا نرکل سے پڑا جس کو بنگالی زبان میں کھاگ کہتے ہیں۔ اس سڑک کے دونوں طرف بسنے والے دیہاتوں کے باشندے شیر شاہ کے زمانہ سے ہی اس سڑک پر نرکل گھاس بچھایا کرتے تھے۔ اس خدمت کے عوض ان

Marfat.com

کو شیر شاہ کی جانب سے معافی اراضی ملا کرتی تھی۔ میں نے گکھڑ۔ ٹکسلا کے پار کی پہاڑیوں اور راولپنڈی کے علاقوں میں مرزا اسرور خاں کے ساتھ بادیہ پیمائی کی ہے۔ سفر کے دوران یہ ہی میرا رہنما تھا۔ اور اتفاقاً میرا دوست بھی بن گیا تھا۔ ویسے تو وہ ایک جذباتی حمال تھا۔ لیکن وہ دنیا سے بیزار ہو گیا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ راولپنڈی کے ایک حجام کے مہ پارہ لڑکے نے جس پر کہ وہ شیدا تھا اس کے ساتھ بے نیازی اور احسان فراموشی کا برتاؤ کیا تھا اگرچہ مرزا ممدوح کا گرد و نواح کے بدمعاشوں سے گہرا تعلق تھا۔ پر وہ بذات خود کمینہ خصلت نہ تھا۔ وہ مجھ کو وہاں کے خطرناک مقاموں میں سے صحیح سلامت لے گیا اس کو شیر شاہ اور اسلام شاہ کے متعلق ہزاروں قصے یاد تھے۔

میں نے یہ محسوس کیا کہ بہار میں سہسرام سے باہر شیر شاہ کو وہاں کے لوگ بالکل ہی بھول چکے ہیں۔ جونپور میں تو سولہویں صدی کے آخر میں ہی اس کی یاد ذہن سے نکل گئی تھی۔ جب اکبر کی وفات کی خبر جونپور پہونچی تو جونپور کا شاعر بنارسی داس صرف ۱۵ سال کا تھا۔ اس نے ہندی زبان میں اپنی منظم سوانح عمری بہ عنوان "اردھ کتھانک" شاہجہاں کے عہد میں لکھی۔ اگرچہ اس کا تجربہ وسیع تھا اور اس نے ہندوستان کی سیر و سیاحت میں کافی وقت صرف کیا تھا مگر اس نے اپنی نظم میں لودی و شرقی سلطانوں کا تو بارہا ذکر کیا ہے لیکن سوری بادشاہوں کا ذکر ایک جگہ بھی نہیں کیا ہے شیر شاہ نے زمین کے بندوبست و طریقہ لگان میں متعدد اصلاحات کی تھیں پھر بھی اکبر اور ٹوڈر مل نے اس کو اور اس کے پٹواریوں اور قانون گوؤں کو کلیتاً گمنام کر دیا۔ البتہ سرائے اور شیر گڑھ کی وجہ سے شیر کی دھندلی یاد ابھی باقی ہے۔

میرے محترم استاد سر جادو ناتھ سرکار نے مجھے تاریخی تحقیق کے میدان میں تربیت دینے کے لیے ایک طویل تجویز مرتب کی تھی۔ ان کے دماغ میں کسی کتب خانہ میں آرام کرسی پر بیٹھ کر تاریخی تحقیق کرنے کی کوئی قیمت نہ تھی۔ وہ یہ چاہتے

Marfat.com

تھے کہ میں سیر و سیاحت کے ذریعہ اپنے ذہنی افق کو وسیع کروں اور بیرونی اشخاص و اشیاء کے متعلق اپنی واقفیت عمیق تر کروں۔ شیر شاہ" کی طباعت کے بعد مجھے یہ موقع ملا۔ رام جس کالج کے میرے جاٹ طالب علموں نے جو زیادہ تر مشرقی پنجاب کے شورش پسند علاقہ ہریانہ کے رہنے والے تھے مجھ سے جاٹوں کی ایک مستند تاریخ لکھنے کی فرمائش کی۔ اس وقت تک اس قسم کی کوئی بھی تاریخ انگریزی زبان میں نہیں لکھی گئی تھی۔ میں اپنے شاگردوں کے اصرار کو نہ ٹال سکا۔ جاٹوں کے متعلق مجھے از سرِ نو تیاری کرنا پڑی۔ میرے استاد نے مجھے ہریانہ کے اندرونی علاقہ میں گھومنے کا مشورہ دیا اور کہلا بھیجا کہ میں خود ہریانہ کے دیہاتوں میں جاکر موجودہ جاٹ سوسائٹی کی مختلف شاخوں کا مطالعہ کروں۔ خوش قسمتی سے میں خود بھی دیہات کا رہنے والا ہوں۔ میری تعلیم و تربیت دیہاتی ماحول میں ہوئی ہے میں شہری تصنع و امارت سے محروم ہوں۔ میں نے اس تحقیق کے کام میں اپنے کو ہمہ تن محو کر دیا۔ اور جسمانی ساخت کے علاوہ ہر اعتبار سے میں ایک جاٹ بن گیا۔ اور جب تک " ہسٹری آف جاٹس" کی پہلی جلد پریس سے نہیں نکلی میں شیر شاہ کو قطعاً بھول گیا۔ یہ میری قسمت کا کرشمہ ہے کہ اس محنت و جانفشانی کا مجھے کوئی صلہ نہیں ملا۔ جاٹوں کی سماجی تاریخ کا ایک بہت بڑا حصہ میری زندگی کے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔

ڈھاکہ یونیورسٹی میں میں ۱۹۲۷ء سے ۳۰ سال تک رہا۔ اس عرصہ میں مجھے شیر شاہ کو دوبارہ لکھنے کی قطعاً فرصت نہیں ملی۔ مجھے اس یونیورسٹی میں اپنے طلبا کو ہندوستان سے باہر اسلام کی تاریخ پڑھانی تھی۔ اس کے مطالعہ نے میرے دل و دماغ کو اس درجہ متاثر کر دیا کہ اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ ہیچ معلوم ہونے لگی۔ اسلام کی پیدائش سے لے کر خلافت کے زوال تک اسلامی تاریخ نہایت دلچسپ و ولولہ انگیز تھی۔ تاہم میں نے اس دور میں اپنے اصل مضمون سے قطع تعلق نہیں کیا۔ میں نے صوفی مذہب کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ۱۹۳۵ء میں دارا شکوہ کی سوانح عمری مرتب کی۔ اسی زمانہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام "ہسٹری آف بنگال" لکھی جا رہی

Marfat.com

تھی۔ میں نے اس تاریخ کے لیے بنگال میں ابتدائی مسلم فتوحات کا مواد فراہم کیا۔ اور کچھ مضمون بھی لکھے۔ ہندوستان کی قرون وسطیٰ کی تاریخ کے متعلق کچھ متفرق مضمون لکھنے سے مجھے شیر شاہ اور اس کے زمانہ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔

ڈھاکہ شہر میں خوش قسمتی سے میرا تعارف تین پٹھانوں سے ہوا۔ جنہوں نے دوبارہ میری توجہ شیر شاہ کی جانب راغب کی۔ ان تینوں حضرات کے نام بالترتیب شفاء الملک حکیم حبیب الرحمان (جو چھوٹے کٹرہ کے ساکن تھے) پروفیسر خان بہادر فدا علی خاں (یہ دونوں اب انجہانی ہیں)۔ اور ڈاکٹر محمود حسین ہیں۔ آخر الذکر ابھی زندہ ہیں اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے علمی و ادبی شہرت کے عروج پر ہیں۔ حکیم حبیب الرحمان کے مورث قرون وسطیٰ کے متمول شیرانی قبیلہ کے تھے جو شیر شاہ کے عہد حکومت میں بنگال آئے تھے۔ حکیم موصوف سر جادو ناتھ سرکار کے عزیز دوستوں میں سے تھے اور امپیریل ریکارڈ کمیشن کے کورسپونڈنگ ممبر تھے۔ ان سے میرا تعلق چچا بھتیجے کی طرح تھا اور کبھی کبھی تو اس سے بھی قریب ہو جاتا تھا۔ میں سن رسیدہ حکیم صاحب کے پوتے کے برابر تھا اس لئے وہ مجھ سے جی کھول کر بات کرتے تھے اور اپنا تواریخی مصالحہ بلا تامل میرے سامنے رکھ دیتے تھے میں حکیم صاحب کو تازیست نہیں بھول سکتا۔ جوانی میں حکیم صاحب ذرا عیاش طبع اور آوارہ مزاج تھے۔ لیکن بعد میں وہ کٹر دیندار مسلمان بن گئے۔ وہ یونانی حکمت کے معتقد تھے۔ مزید براں ایک نوآموز طالب علم کی طرح بنگال کی قرون وسطیٰ کی تاریخ میں ان کی دلچسپی تھی انہیں ہر افغانی شے سے محبت تھی۔ حتیٰ کہ وہ افغانستان کے ہم عصر واقعات میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے پاس رہ کر میں نے مسلمانی زمانہ کے سکوں کا پڑھنا بھی سیکھا۔ اس کام میں میرے ایک دوست ڈاکٹر این۔ کے بھٹسالی بھی تھے جو عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ انہوں نے بنگال میں پٹھانوں کے آباد ہونے کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کی جانب میری توجہ مبذول کی۔ انہوں نے مجھے شیرپوروں اور شیرگڑھوں کے متعلق اپنے عالمانہ نوٹ دکھائے اور اپنی کتاب بہ عنوان "شیر شاہ کی سڑکیں" میرے حوالہ کردی۔ موجودہ کتاب لکھنے کے پیشتر ہی حکیم صاحب اس دنیا فانی سے رخصت ہو چکے تھے لہٰذا ان کے کاغذات کو دوبارہ دیکھنے کا مجھے موقع نہ مل سکا۔ پھر میں ۱۹۴۳ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے چلا آیا۔ میں نے اپنی موجودہ تصنیف

Marfat.com

میں جگہ جگہ حکیم صاحب مرحوم کے حوالہ دیئے ہیں۔ یہ ان کے رہین منت ہونے کا اعتراف ہے۔ خدا ان کی روح کو سکون دے۔

رامپور کے خان بہادر فدا علی بہادر پٹھان تھے۔ جن کے مورث ۱۸ ویں صدی میں یو۔ پی میں آئے تھے۔ خان بہادر اپنے بچپن میں کشتی اور پتنگ لڑانے کے شوقین تھے۔ ۱۵ سال کی عمر میں انہوں نے حروف تہجی پڑھنا شروع کیا۔ آگے چل کر وہ رسالہ کے افسر ہو گئے اور بڑودہ کے مہاراجہ سیاجی گائیکواڑ کے اے۔ ڈی۔ سی مقرر ہوئے۔ بعد ازاں ڈھاکہ یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہو گئے۔ بیرون ہند کی اسلامی تہذیب و تمدن کی جتنی واقفیت مجھے ان کے پاس رہ کر ہوئی اتنی جانکاری مجھے اپنے مرحوم استاد کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر اسلامی تاریخ کے مسلم الثبوت استاد خدا بخش سے حاصل نہ ہوئی وہ مجھے ایم۔ اے میں پڑھایا کرتے تھے۔ خان بہادر کے شفقت آمیز برتاؤ نے پٹھان سوسائٹی کا مطالعہ کرنے کے لیے میری ہمت افزائی کی جس کے لیے میں ان کا بہت ممنون ہوں۔ خدا ان کی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

میرے جوان دوست اور ساتھی ڈاکٹر محمود حسین ہمارے نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کے چھوٹے بھائی ہیں۔ وہ آفریدی پٹھان ہیں۔ اور ٹونک کے نواب امیر خاں پنڈوری کے خاندان سے ہیں۔ ہم اپنی جسمانی ساخت میں ایک دوسرے کے متضاد ہوتے ہوئے بھی ایک جان دو قالب تھے۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ میں منشی خاندان کا ایک نرم و نازک پودا ہوں ۔ روہیلکھنڈ علاقہ کے جنگجو پٹھان کی تکریم و توقیر کا مستحق نہیں۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ شیر شاہ شکل و شباہت عادت و خصلت میں ڈاکٹر محمود حسین کی ہی نقل ہوگا۔ حالانکہ شیر شاہ کی کوئی شبیہہ دستیاب نہیں ہے۔ یوں بھی اگر کسی آفریدی کا مقابلہ سوری نسل کے تاجر اسپ کے پوتہ سے کر دیا جائے تو آفریدی کو سخت ناگوار ہوگا۔ کیوں کہ ہر افغان کی نظر میں آفریدی کا درجہ سوری سے اعلیٰ تر ہے۔ آفریدی اپنی روزی کمانے کے لیے خون بہا سکتا ہے لیکن ایک مزدور

133335

Marfat.com

کی طرح سخت محنت نہیں کر سکتا۔ چوں کہ میری تمام زندگی "شیر شاہ اینڈ ہز ٹائمس" کے تانہ بانہ سے ہم کنار رہی ہے اس لیے جا بجا میں نے اصل موضوع سے ہٹ کر ان عزیزوں اور سرپرستوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھا جن کی حوصلہ افزائی اور اعانت کے بغیر یہ موجودہ تصنیف وجود میں نہیں آ سکتی تھی۔ میں اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔

تاریخ میں علماء کا زیادہ رجحان تاریخ کے مستند ذرائع مثلاً ادبی تصانیف کتبے اور سکوں کی جانب ہوتا ہے۔ انہیں ذرائع سے مورخ تاریخ کی تصنیف کرتا ہے۔ مصنف کے ذاتی تجربہ اور علمی سیاحت میں ان ذرائع سے مزید اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن علمائے ادب ان کی قدر کو نظر انداز کرتے ہیں۔ میں "شیر شاہ اینڈ ہز ٹائمس" کی دوسری جلد کی ببلیوگرافی میں اس پر واضح تبصرہ کروں گا۔ میں قارئین کو تشویش اور فکر سے بچانے کے لیے یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قرون وسطی کی تاریخ میں جو علمی تحقیق کی گئی ہے وہ موجودہ زمانہ کے محقق کے لیے چٹان کا کام کرتی ہے۔ حالانکہ مجھے یہ تسلیم کرتے ہوئے افسوس ہے کہ یہ چٹانیں سخت کالے پتھر کی نہیں ہیں۔ بلکہ نرم ریتیلی چٹانیں ہیں۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں میں اس خیال کا تھا کہ مغل دربار کے سوانح نگاروں کو بہ نسبت افغان مصنفین شیر شاہ کے متعلق زیادہ واقفیت ہے۔ لیکن اس طویل مدت میں فارسی تصانیف کا مطالعہ و موازنہ کرنے کے بعد اور فارسی سوانح نگاروں کی ذہنی نفسیات کو جان لینے کے بعد میں یہ دعوی کر سکتا ہوں کہ میرا پہلا نظریہ قطعاً غلط تھا۔ ہندوؤں کی طرح افغان لوگ بھی واقعات کا ریکارڈ رکھنے میں لاپرواہ تھے۔ وہ تاریخی واقعات کو قصہ کہانیوں کی طرح سمجھتے تھے۔ اور انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ان کی تنگ نظری۔ ذاتی رجحان مذہبی جنون قبائیلی و نسلی تعصب کی گہری جھلک پائی جاتی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مورخ کے لیے افغان تصانیف میں سے تاریخی صداقت کو تلاش کرنا اتنا ہی سر درد ہے جتنا کہ کسی نیاریے کے لیے زرگر کی خاک میں سے سونا تلاش کرنا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر نظام الدین احمد اور فرشتہ نہ ہوتے۔ جنہوں نے اپنے زمانہ کے مسلم خاندان کی صوبائی تاریخ مرتب کی۔ اگر بدایونی اور ابو الفضل نہ ہوتے جنہوں نے

Marfat.com

باوجود باہمی اختلاف کے عباس سروانی کی تاریخ مکمل کی۔ اگر شیر شاہ کا ہم عصر ضعیف گپ باز مشتاقی نہ ہوتا جس نے ۱۵۶۱ء کے قریب اپنی یاد سے تاریخ کے گزشتہ واقعات کو قلمبند کیا۔ تو عباس۔ نعمت اللہ۔ عبداللہ اور احمد یادگار کی سخت کاوش کے باوجود شیر شاہ کی زندگی کے بہت سے اہم واقعات وادی تاریک میں ہی پڑے رہ جاتے۔

جب میں نے ۱۹۲۱ء میں فارسی تصانیف کا مطالعہ کیا۔ تب میرا تنقیدی نظریہ تنگ تھا۔ میں نے ان کو جزواً ہی پڑھ کر ان کے واقعات کو بے بنیاد اور ایجاد تخیل کہہ کر ان کی مذمت کر ڈالی۔ اب جبکہ برسوں کے مطالعہ کے بعد رفتہ رفتہ سوانح نگار کی مکمل شبیہ پیش نظر ہوگی تو مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میں نے ان سوانح نگاروں کی تصانیف کی تنقید کرنے میں جلد بازی اور بے اعتدالی سے کام لیا ہے۔ میں نے اس کی تلافی کی کوشش کی ہے اور میں نے بلا تامل اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ میں نے عباس سروانی کے ساتھ انصاف نہیں کیا تھا۔ آج بھی شیر شاہ کی تاریخ لکھنے اور سمجھنے کے لیے عباس کی تصنیف ہی سب سے زیادہ اہم بنیادی ذریعہ ہے۔

زمانہ حال کے ہمایوں اور شیر شاہ کی تاریخ کے جملہ مورخین نے انہیں افغانی اور غیر افغانی ذرائع کا سہارا لیا ہے (صرف ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے دولت شیر شاہی کے کچھ جعلی اقتباس کا استعمال کیا ہے۔) لیکن یہ تعجب اور حیرت انگیز بات ہے کہ تمام مورخین نے ایک ہی راستہ اختیار کیا ہے۔ جس سے معمولی طالب علم کو الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ متحیر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا پہلے مورخین کو غلط ثابت کرنے کی ذمہ داری تنہا میرے کندھے پر آگئی ہے۔ زمانہ کا یہ عام دستور ہے کہ اگر کسی غلط بیانی کی تردید نہ کی جائے یا اسے نظر انداز کر دیا جائے تو عام طور سے اسے صحیح سمجھ کر علم کے ذخیرہ میں اضافہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے مجھے اس کتاب میں طول طویل حاشیے اور مباحثے لکھنے پڑے جس کی وجہ سے نہ محض کتاب کی ضخامت میں اضافہ ہوا بلکہ کہیں کہیں اسلوب بیان کی روانی میں بھی اڑچن پڑ گئی۔ ۱۹۲۱ء میں نظام الدین اور فرشتہ کی

Marfat.com

تصانیف کی اہمیت کا اندازہ لگانا بدرجہا سہل تھا۔ کیوں کہ ان کتابوں کے نول کشور پریس کے لیتھو ایڈیشن اور ایلیٹ کی تاریخ کے کچھ اقتباس ہی ہمارے سامنے تھے۔ لیکن اس کے بعد "بلیو تھیکا انڈکا" کی جلدیں۔ طبقات انگریزی کا مکمل ترجمہ۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا اردو زبان میں فرشتہ کا ترجمہ جملہ کتابیں شائع ہوگئیں ان نئی تصانیف میں نوعیت کے خیال سے نول کشور پریس کے ایڈیشن سے کہیں کہیں اختلاف ہے۔ قدیم اور نئے کے اس اختلاف کی وجہ سے یہ ضروری ہوگیا کہ نظام الدین اور فرشتہ کے مشترکہ ماخذ کا پتہ لگایا جائے۔ اور یہ فیصلہ کیا جائے کہ ان تصانیف کا کون سا ایڈیشن زیادہ معتبر اور مستند ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ جہاں تک شیر کی زندگی کے واقعات کا تعلق ہے نول کشور پریس کا ایڈیشن ہی زیادہ معتبر ہے۔ غالباً تحقیق کے میدان میں طبع آزمائی کرنے والے حضرات آئندہ بھی ان تصانیف کا استعمال کرتے وقت میری اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

احمد یادگار کی تاریخ سلاطین افغانہ اور مخزن افغانی کے مطالعہ کے وقت میرے سامنے کچھ اس قسم کی دقتیں پیش آئیں۔ میرے مرحوم دوست وشو بھارتی یونیورسٹی کے نرودھ بھوشن رائے نے مخزن کا ایک انگریزی ترجمہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن زندگی نے اس کے ساتھ وفا نہ کی۔ وہ اس تصنیف کے لودی دور کا ہی ترجمہ کرسکے۔ مسٹر رائے نے اپنے دیباچہ میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ ایشیاٹیک سوسائٹی کا قلمی نسخہ نمبر ۱۰۰ مخزن کا قدیم ترین اور بہترین ایڈیشن ہے۔ اس لیے اپنے ایک مضمون بہ عنوان "مخزن افغانی اور تواریخ مجلس آرائی" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ڈاکٹر ڈارن نے مخزن افغانیہ کے نام سے جس کتاب کا ترجمہ کیا ہے وہ دراصل وہ کتاب نہیں ہے بلکہ ایک دوسری کتاب "تواریخ مجلس آرائی" ہے جس کا مصنف ابراہیم بطنی ہے (جے۔ اے۔ ایس۔ کلکتہ جلد ۱۹۔ ۱۹۵۳) مسٹر رائے کو اس سے بھی انکار ہے کہ شیر شاہ کے عہد حکومت کے لیے عباس سروانی زیادہ مستند ہے۔ ان کی رائے میں نعمت اللہ اس سے بہتر ہے۔ ۱۹۲۱ء میں میں نے سرجادو ناتھ سرکار کے کتب خانہ میں سے (یہ کتب خانہ اب نیشنل لائبریری کلکتہ کو سونپ دیا گیا ہے) مخزن کے قلمی نسخہ کو استعمال کیا تھا

Marfat.com

اور جہاں کہیں مخزن اور ڈارن کے ترجمہ ہسٹری آف دی افغانس" میں اختلاف تھا میں نے مخزن کو ترجیح دی تھی۔ لیکن مخزن کے متعلق مسٹر رائے کی رائے زنی اور انکی بے وقت موت کے بعد میرے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ میں مخزن کے جملہ دستیاب نسخوں کا از سر نو مطالعہ کروں اور اس روشنی میں سرکار کے قلمی نسخہ اور ڈارن کے ترجمہ کی صحیح قدر کو سمجھوں یہی وجہ تھی کہ موجودہ تصنیف کو مکمل ہونے میں اتنی دیر لگی مکمل دو سال تک میں مخزن کے جملہ دستیاب نسخوں کا مطالعہ و موازنہ کرتا رہا۔ اس میں وہ نسخہ بھی شامل ہے جو لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے۔ میں نے لودی زمانہ کے متعلق مسٹر رائے اور ڈاکٹر ڈارن کے اختلاف کو بھی غور سے پڑھا اور اس کے ہر پیراگراف کو نوٹ کیا۔ اس تمام کاوش کے بعد میں نے ایک مضمون تیار کیا جو ہنوز شائع نہیں ہوا اور جس کا لب لباب مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) مسٹر رائے نے ڈاکٹر ڈارن کی جو تنقید کی تھی اس نے ان کو ایک جال میں پھنسا دیا۔ ان کا تنقیدی نظریہ خود تنقید طلب ہے رائے کی تنقید سے ڈاکٹر ڈارن کی تصنیف کی اہمیت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں مجھے خود اس کی اہمیت کا اتنا احساس نہ تھا۔ اس لئے موجودہ کتاب میں ڈاکٹر ڈارن کے ترجمہ کا نہایت فراخدلی سے حوالہ دیا گیا ہے۔

(۲) "تاریخ مجلس آرائی" مخزن کا ہی ایک دوسرا نام ہے جو کسی نقل نویس نے مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے رکھ دیا ہے۔ جس طرح عام آدمی عباس سروانی کی تصنیف کو "تاریخ شیر شاہی" کے نام سے جانتا ہے اور نظام الدین احمد اور فرشتہ کی تواریخ بالترتیب "تاریخ داؤدی" اور "تاریخ فرشتہ" کے نام سے مشہور ہیں۔

(۳) ڈاکٹر ڈارن کا ترجمہ اور حواشی مخزن کا سب سے اچھا ترجمہ ہے۔ کوئی دیگر قلمی نسخہ اس کی اس قدر وضاحت نہیں کرتا۔

(۴) جہاں تک شیر شاہ کے عہد حکومت کا سوال ہے۔ مخزن "بنیادی تصنیف" نہیں ہے۔ وہ دوسری تصانیف میں بیان شدہ واقعات کی تائید یا تردید ہی کرتا ہے مخزن نے زیادہ تر اپنے سیاسی واقعات لفظ بہ لفظ نظام الدین سے نقل کئے

Marfat.com

ہیں۔

یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ احمد یادگار کی تاریخ موسومہ "تاریخ شاہی" کو مرحوم مولانا شمس العلما ایم۔ ہدایت حسین نے بہت ہی خوش اسلوبی سے مرتب کیا (ببلیوتھیکا انڈ کا سیریز کلکتہ مسودہ نمبر ۲۵۷۔ ۱۹۳۹ء)۔ اس کتاب کی وجہ سے مجھے کچھ دن اپنا کام بند کرنا پڑا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے میرے دل میں شوق پیدا ہوا کہ میں احمد یادگار کی تصنیف پر تبصرہ کرکے اس کی اہمیت کا اندازہ لگاؤں۔ اور ایم۔ ہدایت حسین کی خوبیوں کو آشکارا کروں۔ میری اس طبع آزمائی کا نتیجہ (بنگال پاسٹ اور پریزینٹ جلد LXXXII حصہ اول ۱۹۶۳ء) میں شائع ہوا۔ غرضیکہ میں نے اس طریقہ سے شیر شاہ کی تاریخ سے متعلق قرون وسطیٰ کی فارسی تصانیف کی سب کمزوریوں کو دور کر دیا ہے۔

موجودہ تصنیف میں میں نے ہندی ذرائع سے بھی مدد لی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں اس جانب میری نظر مبذول نہیں ہوئی تھی۔ اور اس کی ایک وجہ تھی۔ "شیر شاہ" لکھتے وقت میں ہندی زبان سے ناواقف تھا۔ اور ایک تاریخی محقق کی حیثیت سے نہ تو مجھے شاعری سے اور نہ افسانوں سے کوئی رغبت تھی میں اس بات کو بھول نہیں سکتا کہ کس طرح میرے جواں دوست پروفیسر شری رام شرما (مغل انڈیا کے ببلیوگرافی کے مصنف) کے ایک تنقیدی مقالہ سے مجھے اس مقام کا پتہ لگا جہاں شیر شاہ اور مالدیو کے سپہ سالاروں کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔ اس بات کی تروتازہ یاد مجھے پروفیسر شرما کا رہین منت کرتی ہے۔ اس مقالے نے مجھے ہندی زبان سیکھنے اور ہندی ادب کا مطالعہ کرنے کی طرف رجوع کیا۔ تاکہ قرون وسطیٰ کی تاریخ لکھنے میں میں ہندی ماخذوں سے کام لے سکوں۔ تب سے میں نے متواتر ہندی ادب کا پنگل اور ڈنگل دونوں بولیوں میں کافی مطالعہ کیا ہے (پنگل ہندی زبان کی وہ بولی ہے جو مشرقی ہند میں رائج ہے اور ڈنگل مغربی ہند میں ہندی کی بولی کا نام ہے) اور اب مجھے ہندی میں ایک شوقیہ فنکار کی مہارت حاصل ہے۔ میں نے موجودہ تصنیف میں قرون وسطیٰ کے ہندی ادب و راجپوتانہ کے بھاٹوں کے گیتوں میں دستیاب تاریخی

Marfat.com

مواد کو وسیع پیمانہ پر استعمال کیا ہے۔ شیر شاہ کے عہد حکومت کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس دور میں ملک محمد جائسی جیسا صوفی شاعر اعظم پیدا ہوا۔ جائسی نے اودھی زبان میں اپنی "پدماوت" شیر شاہ کی تخت نشینی کے سال میں ہی لکھنی شروع کی تھی۔ ایک طرح سے شیر شاہ اور جائسی اکبر و تلسی داس کے پیشرو ہیں۔ اب میں ہندی ادب میں راجپوت اور راجپوتانہ کے متعلق دستیاب تاریخی مواد کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ موجودہ تصنیف میں میں نے نینسی کی "کھیات" سے کافی مدد لی ہے۔ یہ تصنیف مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور کی سرپرستی میں لکھی گئی تھی۔ اور راجپوتانہ کے متعلق قدیم ترین ہندی تصنیف ہے۔ تاریخی اہمیت کے اعتبار سے دوسرا درجہ سورج مل شان کا ہے جس نے بوندی کے مہاراؤ رام سنگھ کی سرپرستی میں "ونش بھاسکر" نظم میں لکھی۔ نینسی کو ۱۷ویں صدی کے راجپوتانہ کا ابوالفضل کہا جاتا ہے۔ لیکن بحیثیت مورخ اس کا کام ادھورا رہا۔ یہ جلیل القدر مصنف جسونت سنگھ کے ظلم و ستم کا شکار رہا۔ اور بالآخر زندگی سے تنگ آکر اس نے اور اس کے بھائی نے ایک دوسرے کو تلوار سے قتل کرنے کا تہیہ کیا۔ برطانوی حکومت کے زمانہ میں بھی کسی ہندوستانی مہاراجہ کے دربار میں ملازمت کرنا تلوار کی دھار پر چلنا تھا۔ سورج مل شان بوندی دربار کا سرکاری مورخ تھا۔ لیکن اس کی موت عالم جلاوطنی میں اپنے آقا کی سرپرستی سے دور ہوئی اور اس کا عظیم شاہکار مدتوں تک گوشہ گمنامی میں دفن رہا۔ کویراج شیامل داس پہلا ادیب تھا جس نے موجودہ طریقہ پر تاریخی تحقیق کا کام باقاعدہ شروع کیا۔ ۱۹ویں صدی کے آخری دور میں اسے میواڑ کے راناؤں کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ اس نے میواڑ کی تاریخ بہ عنوان "ویر ونود" مرتب کی اور اس خدمت کا اس کو یہ صلہ ملا کہ اس کا سرپرست اس سے ناراض ہو گیا۔ اس کی اس تصنیف پر شائع ہونے کے بعد ریاست کی طرف سے پابندی لگا دی گئی۔ جو ہندوستان میں جمہوری حکومت کے قیام کے بعد ہی دور ہو سکی۔ ایم۔ ایم گوری شنکر اوجھا جو "راجپوتانہ کا اتہاس" کا مصنف ہے موجودہ صدی میں راجپوتانہ کے سب سے بلند پایہ مورخ ہیں۔ اور پنڈت بشیور ناتھ ریو راجپوت تاریخ کے

Marfat.com

قدیمی اسکول کے آخری نمائندہ تھے۔ لیکن مقامی تعصب اور درباری خوشامدانہ ذہنیت نے ان کی تصنیف "مارواڑ کا اتہاس" کو اعلیٰ معیار سے گرا دیا۔ اب جبکہ ریاستیں ختم ہو گئیں ہیں ان کی تاریخی دستاویزیں اور محافظ خانہ تاریخی تحقیق کے طالب علموں کے لیے کھول دیے گئے ہیں۔ یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں بڑا جوش ہے کہ اس سمندر میں غوطہ لگا کر تحقیق کے نئے موتی نکالے جائیں لیکن ابھی تک ہندوستان کی ۱۶ ویں صدی کی مسلم تاریخ کے متعلق کوئی معرکہ آرا تحقیق ظہور میں نہیں آئی۔

گذشتہ ۴۰ سال میں ہندوستان کے آثار قدیمہ۔ علم کتبات و مسکوکات کی مدد سے شیر شاہ کے متعلق کوئی نئی روشنی نہیں ملی۔ محض ۹۴۵ ہجری اور اس سے کچھ پہلے وقت کے چند سکے دستیاب ہوئے ہیں۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ نے جلال خاں لوہانی بن سلطان محمود لوہانی کے فرار ہونے پر (جو ۱۵۳۳ء میں بنگال کے سلطان محمود شاہ کے دربار میں پہونچ گیا تھا۔) بہار میں ہمایوں کے نام کے سکے جاری کیے تھے۔

مجھے افسوس ہے کہ موجودہ تصنیف میں مقام اور اشخاص کے نام سب جگہ ایک ہی طریقہ سے نہیں لکھے گئے۔ ہجوں میں اختلاف ہے حالاں کہ ان مقام اور اشخاص کے وجود میں قطعاً شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ آزادی ملنے کے بعد ہم نے آج تک یہ فیصلہ نہیں کیا کہ برطانوی زمانہ کی تاریخ میں لکھے ہوئے مقام اور اشخاص کے نام یونہی برقرار رکھے جائیں یا ان میں کچھ اصلاح کی جائے۔ یہ نام ہمارے تاریخی ادب میں گہری جڑ پکڑ چکے ہیں۔ دراصل قومی نخوت کا ردعمل ہمیشہ خوشگوار نہیں ہوتا لیکن قوم کی تاریخ کو جلا دینے اور حب الوطنی کا احساس پیدا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی مرد میدان خطرات کا مقابلہ کر کے اس میدان میں پیش قدمی کرے اور اصلاح کا راستہ دکھائے۔ پڑھنے والوں کو غالباً یہ ناگوار خاطر ہوگا کہ میں نے شیر کے والد کی جاگیر کا نام "سسرام" سے بدل کر "سہسرام" کر دیا۔ اس کے متعلق میری دلیل یہ ہے کہ دراصل اس مقام کا صحیح تلفظ "سہسرام" ہے اور

Marfat.com

اس تلفظ کے رائج ہونے سے عام آدمی کے دماغ میں سچائی کا کوئی عنصر ہمیشہ تازہ رہے گا۔ یہ تلفظ سنسکرت زبان کا ہے جو زمانہ قدیم میں ہندوستان میں ایک ہزار گاؤں کی انتظامیہ اکائی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہ مقام اگر زیادہ قدیم بھی نہیں ہے تو کم از کم مہاراجہ ہرش وردھن کے سوانح نگار "بان بھٹ" کے زمانہ سے دریائے سون کے اوپری حصہ میں واقع ہے۔

سب سے آخر میں میں اپنی اس کتاب کے پبلشر اور محسن اورینٹ ونگ مین لمیٹڈ کا مشکور ہوں انہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں کافی تگ و دو کی اور پڑھنے والوں کے سامنے ایک ایسا تحفہ پیش کیا جو ہر معنی میں دلکش و دلاویز ہے۔

کالکارنجن قانون گو

لکھنؤ مہالیہ۔

۱۵؍ اکتوبر ۱۹۶۴ء۔

Marfat.com

باب ۱

فرید عرف شیر شاہ کے مورث اور اسکا بچپن

سنہ ۱۴۸۶ء۔ سنہ ۱۵۰۱ء

I ۔ پٹھان اور اُن کا وطن، روہ

شیر شاہ ایک جفاکش پٹھان قوم کا نونہال تھا۔ پٹھانوں کا آبائی وطن۔ جہاں وہ آج بھی سکونت پذیر ہیں کوہ سلیمان کے آغوش میں روہ کا پٹھار ہے سلیمان پہاڑی کا تعلق تخت سلیمان سے ہے جس کے متعلق یہودی اور عربی روایتوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمان اپنے درباریوں کے ساتھ تخت پر بیٹھ کر اس پٹھار پر اترا کرتے تھے۔ افغانستان کا یہ پہاڑی سلسلہ پٹھان یا قدیم پختون علاقہ کی ریڑھ کی ہڈی کے مانند ہے۔ جو شمال میں کشمیر سے لے کر جنوب میں بلوچستان تک اور مغرب میں غزنی کی پہاڑیوں سے لیکر مشرق میں دریائے سندھ تک پھیلا ہوا ہے۔ قدرت نے اس علاقہ کو ایک ایسی بہادر قوم کا گہوارہ بنایا ہے جو کہ ابتدائے آفرینش سے اپنے سے قوی تر دشمنوں کا مقابلہ کرتی رہی ہے یہ دشمن اس پر یا تو ایران یا توران کے میدانوں سے آکر حملہ کرتے تھے یا علاقہ سندھ کے ان دروں کو آکر حملہ آور ہوتے تھے جن سے ہو کر سندھ میں ملنے والی ندیاں بہتی ہیں۔

Marfat.com

موسم کے اعتبار سے یہ علاقہ انتہائی گرم و سرد ہے۔ یہاں اونچی اونچی پہاڑیاں اور تنگ وادیاں ہیں۔ نباتات برائے نام ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا علاقہ کسی امن پسند یا صلح منش زراعت پیشہ قوم کا مسکن نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی تہذیب و تمدن کا معیار ہی اعلیٰ ہو سکتا ہے۔

زمانہ قدیم سے سرزمین روہ کسی بزدل قوم کا مسکن نہیں رہی۔ باشندگان روہ کو خوش نصیب میدانی علاقہ کے باشندوں سے اتنی ہی مناسبت ہے جتنی اونٹ پالنے والے عربی بدوؤں کو ریگستانی سرحد کے زراعت پیشہ لوگوں سے ہے۔ یا جنگلی جانور کو پالتو جانور سے۔ قرون وسطیٰ میں پٹھان قوم کی نفسیات و ذہنی رجحان ان ٹیوٹانک نسل کے لوگوں سے مشابہت رکھتی تھی جو کہ رومن سلطنت میں گال کی سرحد پر آباد تھے۔ پٹھان ایک غلام کی طرح اپنی روزی کے لیے کڑی محنت کرنا پسند نہیں کرتا بلکہ نسبتاً خونریزی و کشت و خون سے روزی پیدا کرنا اس کے لیے آسان تر اور باعث فخر ہے۔ حکومت برطانیہ کی کڑی نگرانی کے دور میں بھی اس کے لیے پشاور کے بازار سے کسی متمول تاجر کو اٹھالانا ایسا ہی آسان تھا۔ جیسا کسی بھیڑیے کے لیے کسی میمنہ کو پکڑ لینا۔ پٹھانوں کے دشمن بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اگرچہ پٹھان گپ بازی میں دلچسپی لیتے ہیں اور اپنے پڑوسیوں کو بھی گپ سناتے ہیں۔ لیکن نہ تو وہ کبھی جھوٹ بولتے ہیں اور نہ اپنے قول سے آسانی سے منکر ہوتے ہیں۔ شجاعت دلیری و اخلاقی اصولوں کا ان کا اپنا ایک معیار ہے مثلاً میدان جنگ میں پیٹھ دکھانے کو وہ ایک ذلیل حرکت اور دھوکہ دہی سمجھتے ہیں برعکس اس کے رات کے اندھیرے میں چوری [illegible] ہر فعل کو جائز سمجھتے ہیں۔

ایک پٹھان کے لیے جنگ و جدل ایک تفریح کا مشغلہ ہے۔ وہ باہمی نزاع میں ایک کھلاڑی کی مانند لڑتا ہے۔ قدرت کی سنگدلی اور خطرات کا مسلسل سامنا کرنے کی وجہ سے وہ محتاجانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ رک رک کر سوتا ہے کبھی کبھی تین وقت کا کھانا ایک وقت میں کھا لیتا ہے اور کبھی کبھی

Marfat.com

متواتر کئی روز تک بھوکا رہنے کے بعد بھی بظاہر خوش و خرم دکھائی دیتا ہے وہ چشم زدن میں بزم کو میدان رزم میں بدل دیتا ہے۔ زمانہ قدیم سے پٹھان کی زندگی خانہ بدوش ہی رہی ہے اور اس کی اس خصوصیت کو قافلوں کی تجارت اور مشرق کی جانب سندھ کے میدان اور اس کے پار قبیلوں کی ہجرت نے زندہ رکھا ہے۔

حکومت نام کی کسی شے سے پٹھان قوم کا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ آج بھی اس کے وطن میں نظام حکومت نام کو بھی نہیں ہے تاہم ان کی مہذب اور سادہ لوح قوم نے اپنے لیے ایک ایسا آئین بنا رکھا ہے۔ جس کی مثال شاید ہی کسی دوسری قوم میں ہو۔ اس کا آئین ابتدا سے آج تک غیر تحریری ہے جو پشت در پشت کے رسم و رواج پر مبنی ہے۔ اس آئین کی امتیازی خصوصیت ہے۔ مساوات و انصاف پسندی۔ جسے ان کی زبان میں "پختون والی" کہتے ہیں۔ روہ کے علاقہ میں کبھی کوئی مطلق العنان حکمراں نہیں ہوا۔ نہ وہاں کبھی کوئی موروثی مرکزی حکومت ہی قائم ہوئی۔ بیرونی حملہ آوروں کے علاوہ ان پر کوئی بھی تلوار کے زور سے اپنا سکہ نہیں جما سکا۔ پٹھانوں میں نظام حکومت کی اولیں سیڑھی سردار قبیلہ ہوتا ہے۔ اور آگے چل کر وہ وفاقی حکومت میں مبدل ہو جاتا ہے۔ اس وفاقی حکومت کا صدر ایک منتخب ملک ہوتا ہے۔ جو دوران جنگ تو پٹھانوں کا سپہ سالار ہوتا ہے اور دوران امن ان کے قومی جرگہ کا صدر۔ اکثر جرگہ کی میٹنگ کسی سیاسی مسئلہ پر غور کرنے کے لیے یا باہمی نزاع و نفاق کو دور کرنے کے لیے بلائی جاتی ہے۔ پٹھان اپنی جائیداد پر کسی قسم کا محصول ادا نہیں کرتا اور نہ اپنے کنبہ کے سردار دبیر کے علاوہ کسی کے حکم کا روادار ہوتا ہے۔ سماجی اور سیاسی اکائی فرد نہیں بلکہ کنبہ ہوتا ہے۔ عرب بدوؤں کی طرح ان کی شجاعت کے انفرادی اصول کا انحصار کنبہ کی بانگ ہوتا ہے۔ کبھی ایک کنبہ دوسرے کنبہ کے خلاف قبیلہ قبیلہ کے خلاف۔ طایفہ طایفہ کے یا ایک افغان "شرم افغانی" کے نام پر تمام دنیا کے خلاف جنگ آزما ہو جاتا ہے۔ تو ٹھیک اسی طرح جیسے ایک عرب عجم کی مخالفت کرتا ہے۔ پٹھان سوسائٹی

Marfat.com

میں کسی فرد یا کنبہ کو دوسرے فرد یا خاندان کی فوقیت تسلیم کرنا قابل اعتراض سمجھا جاتا ہے۔ ان کا مقولہ ہے "پیر پیر سب ایک" اس قوم میں کسی فرد کی فوقیت کا انحصار کسی مخصوص قبیلہ یا خاندان میں پیدائش پر نہیں مگر کوئی فرد کسی بڑے خاندان یا قبیلہ کا ممبر ہونے کی وجہ سے اپنے سے کمزور لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ بچپن میں ایک پٹھان اپنے خاندان کے دوسرے فرد کو اپنا ساتھی سمجھتا ہے۔ وہی جوانی میں اس کا رقیب ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اپنے ذاتی مفاد کے متعلق اس کو اس سے ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے تاہم غیروں کے مقابلہ میں وقت ضرورت فطرتاً اور قدرتاً دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔

قرون وسطیٰ میں پٹھان سوسائٹی میں طبقے تو ہوتے تھے مگر ان میں ذات کا امتیاز نہ تھا۔ ان میں عام طور پر تین طبقے ہوتے تھے جو سماجی فوقیت کے اعتبار سے شریف۔ موالی اور غلام کے نام سے موسوم تھے۔ شریف آزاد افغان" تھے موالی اس کے ماتحت کام کرنے والے تھے اور غلام کا درجہ بحیثیت خدمت گار تھا۔ جس ملک میں کہ جنگ و جدل کشت و خون ہی روزمرہ کی زندگی کا معمول ہو اور جہاں قبیلوں میں آئے دن باہمی نزاع و فساد ہوتا رہتا ہو ظاہر ہے ایسی سوسائٹی میں کمزور لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی کمزور طبقہ یا فرد اپنے کسی محسن و محافظ کے بغیر زندہ رہ سکتا تھا۔ آزاد ریاستوں سے بھاگ کر آنے والے مہاجرین تو افغان برادری میں شامل کر لیے جاتے تھے ان کو اصلی قبیلہ کے مساوی حقوق دیدیے جاتے تھے۔ مگر کم رتبہ مہاجرین کی حیثیت صرف حاشیہ نشین کی ہی ہوتی تھی۔ جنگ کے دوران گرفتار شدہ لوگوں کو غلام بنالیا جاتا تھا۔ اور وہ نسل در نسل غلام ہی رہتے تھے۔ کسی غلام کو شریف زادی پٹھان سے شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ حالانکہ پٹھان اپنے غلام کے ساتھ بمقابلہ دیگر قوم اچھا سلوک کرتے تھے۔ اس طرح پٹھان سوسائٹی کا تانا بانا شریف۔ موالی۔ غلام تینوں طبقوں کو ملا کر بنا ہوا تھا۔ اور ہر طبقہ کے حقوق اور فرائض ملک کے رسمی آئین کے مطابق مقرر تھے۔

Marfat.com

پٹھانوں میں قرون وسطیٰ کا تعصب تو بھرپور تھا ہی۔ علاوہ بریں وہ ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست بھی ہوتے تھے۔ ان کی توہم پرستی اور عالم بالا میں عقائد کا مجموعہ ہندوؤں کے ہی برابر تھا مگر ان کا مذہبی جذبہ مشرکوں کے جذبہ سے قوی تر تھا۔ اس زمانہ سے لے کر آج تک وہ اتنا ہی مُلّا اور کرامات دکھانے والے پیر کا تابع ہے جتنا کہ ایک ہندو اپنے پروہتوں گروؤں اور ان اوتاروں کا قایل ہے۔ جو کہ وقتاً فوقتاً یا یکے بعد دیگرے ہر جگہ نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ مگر پیر کا معتقد ہوتے ہوئے بھی پٹھان ایک ہندو کی طرح مردم پرست نہیں ہوتا۔ پٹھانوں کا ملک پیروں کے لیے ایک نہایت ہی خوشگوار چراگاہ تھا۔ حتیٰ کہ محمد شاہ ابدالی اور شیر شاہ جیسے طاقتور حکمراں بھی اس باثر طبقہ کو نظرانداز نہیں کر سکے۔ سیاسی مسائل میں بھی پیر کی حیثیت بمقابلہ "ملک" زیادہ باثر تھی۔ جنگ ہو یا امن تکمیل مقاصد کے لیے پٹھان تندہی سے کام لیتا ہے اس خداداد ذہنیت میں کوئی بھی پٹھان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پٹھان کی زندگی کے ہر شعبہ میں ان اوصاف کی جھلک ملتی ہے خواہ وہ حصول زر ہو یا تصوفی مسلک ہو۔

روہ کے پٹھان قبیلے اس امر کی واضح مثال پیش کرتے ہیں کہ کس طرح ایک تہذیب یافتہ قوم ایک دشوار گذار پہاڑی علاقہ میں گوشہ پذیری کے بعد جبکہ گذشتہ ادب سے اس کے تعلقات منہدم ہو جاتے ہیں آہستہ آہستہ اپنی مالی اور سیاسی پریشانیوں سے پست ہو کر نیم وحشی بن جاتی ہے۔ موجودہ تاریخی تفتیش سے یہ ظاہر ہے کہ یہ قبیلے بنی نوع انسان کے وہ مورث اعلیٰ ہیں جن کی ایک شاخ آثار قدیم میں انڈو آرین کے نام سے موسوم ہوئی اور صدہا سال تک روہ میں اقامت پذیر رہ کر وہاں سے باہر چلی گئی۔ آج بھی روہ کے خطہ کو سیراب کرنے والے دریاؤں کے نام رگوید میں پائے جاتے ہیں اور اس علاقہ کی زبان کا مخزن سنسکرت ہے۔ جس طرح کہ انگریزوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ آریہ نسل کی ہی ایک شاخ ہیں جس کی کہ تہذیب کا گہوارہ ہندوستان کے میدانوں میں ہے اور جو سات سمندر پار کرنے کے بعد اینگلو سیکسن کہلائی

Marfat.com

بعینہ افغان بھی یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ تاریخی نقطہ نظر سے وہ بھی آریوں ہی کی اولاد ہیں اسلام نے یہ کوشش کی اور وہ کچھ حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گیا کہ وہ روہ اور ہندوستان کے مابین ایک ادبی دیوار حائل کر دے اس نے روہ کے قبائل کو نہ صرف مسلمان ہی بنایا بلکہ ان کے آبا و اجداد کا ایک سامی شجرہ بھی تیار کر دیا۔

اگرچہ زمانہ قدیم میں پختون (جو پٹھانوں کا موجودہ نام ہے) اور ہندوستان کے آریہ انہیں آریوں کی ایک شاخ تھے۔ جو مذہبی اختلاف کی بنا پر اپنے ایرانی بھائیوں سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ آگے چل کر ہندوستان اور افغانستان میں ارتقاء تہذیب و تمدن جدا جدا ہونے کی وجہ سے پختون و انڈو آرین بھی ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ پورانوں کے عہد تک انڈو آرین دریائے سندھ کے اس پار رہنے والے اپنے بھائیوں کو بھولے نہیں تھے۔ اس وقت یہ برت کشتری کہلانے لگے یعنی یہ وہ لوگ تھے جو سچے مذہبی عقاید و رسم و رواج سے گر گئے تھے۔ حالانکہ یہ فیصلہ کرنا فی البدیہ مشکل ہے کہ دونوں میں سے کس فرقہ نے اصلیت سے انحراف کیا۔ آیا بچھڑے ہوئے اس فرقہ نے جو اپنے قدیمی وطن میں مقیم رہا۔ یا وہ ترقی پسند آرین مہاجرین جنہوں نے کہ ہندوستان کی قدیم غیر آرین تہذیب کو اپنے میں جذب کر لیا اور دونوں کی آمیزش سے ایک ایسی تہذیب کی بنیاد ڈالی جو ان کی بنیادی تہذیب سے میل نہیں کھاتی۔ حقیقت خواہ کچھ بھی ہو لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ دریائے سندھ کے دونوں کنارے پر رہنے والی نسلیں یعنی انڈو آرین و پٹھان دونوں کے ہی خون میں آمیزش ہو گئی۔ اور وہ ایک متجانس قوم نہ رہ گئے۔ حالانکہ پٹھان یا پختون کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کی رگوں میں خالص خون ہے۔ لیکن تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ان میں ایرانی، ترکی، منگول اور راجپوت خون کی آمیزش ہے۔ پٹھان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اور دیگر اقوام میں بہت خلط ملط ہوا ہے۔ جیسا کہ گوجر پٹھان بھائی پٹھان وغیرہ ناموں سے ظاہر ہوتا ہے یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ

Marfat.com

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے آغاز کے بعد ہندوؤں کی جنگجو قومیں نہ تو ترک ہی بنیں اور نہ مغل۔ مگر ہندوستان کی پٹھان سوسائٹی نے ان کو اپنے میں شامل کر لیا۔

روہ کے خطہ سے ہجرت کا جو سلسلہ زمانہ قدیم میں انڈو آرین لوگوں کی آمد سے شروع ہوا تھا مسلسل ۱۸ ویں صدی تک جاری رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روہیلکھنڈ اور اس کے قرب و جوار میں بنگاش۔ آفریدی اور یوسف زئیوں کی آبادیاں قایم ہو گئیں۔ قرون وسطیٰ میں ہند میں [illegible] وں کی آ[illegible] نے اسلام کے افسردہ قالب میں ایک نئی روح پھونک د[illegible] [illegible]اری تاریخ کی ابتدا پندرھویں صدی کے آخری نصف دور سے شروع ہوتی ہے جبکہ روہ کے خطہ سے پٹھان قبیلے یکے بعد دیگرے ہندوستان کی جانب ہجرت کر رہے تھے اور دہلی میں سلطان بہلول لودی نے پٹھان سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اسی سلطان بہلول لودی کے عہد حکومت میں فرید عرف شیر شاہ کے مورثوں نے روہ کے علاقہ سے ہندوستان کے لیے ہجرت کی۔ اور یہی وہ فرید ہے جس نے آگے چل کر دوسری بار ہندوستان میں پٹھان حکومت قائم کی جو کہ صرف چند روزہ ہی ثابت ہوئی۔

۱۱۔ ابراہیم سوری کا وطن اور ہندوستان کیلئے ہجرت

جہاں سلیمان سلسلۂ کوہ کی ایک چھوٹی سی پہاڑی کوزک جانب شمال اب استداجیل کے پاس سے ہو کر گزرتی ہے اور تقریباً چمن اور غزنی کے درمیان واقع ہے۔ جہاں وان پہاڑی کے آبشار خوفناک غاروں میں مچلتے ہوئے ویدک زمانہ کی گومل ندی سے ہمکنار ہوتے ہیں وہیں اس وقت جھاڑیوں اور مٹی کے گھروندوں میں زمانہ قدیم کی طرح بھٹانی نسل کے لوگ رہتے ہیں جو سوری قوم اور اس سے مشابہت رکھنے والی گلزائی قوم کے مورث اعلیٰ مانے جاتے ہیں۔

دریائے گومل کے کنارے ۶ یا ۷ کوس لمبی ایک چھوٹی سی جگہ ہے

Marfat.com

جہاں ابراہیم سوری کا مکان تھا۔ اس مقام کو افغانی زبان میں سرگرٹی اور ملتانی بولی میں روہری کہتے تھے۔ جنوبی افغانستان اور وادی سندھ کے درمیان گومل درہ کے نزدیک رہنے کی وجہ سے ملتان اور غزنی کے درمیان ہونے والی قافلوں کی تجارت اور خصوصاً گھوڑوں کی تجارت اسی خطہ کے باشندوں کے ہاتھ میں تھی۔

ابراہیم سوری روہ کا ایک گمنام افغان تھا جس کا تعلق سور قبیلہ کی شیر اخیل شاخ سے تھا۔ سور قبیلہ کا شجرہ لودی۔ سروانی۔ لوہانی قبیلوں کی طرح ماتی طائفہ تک پہونچتا ہے اور اس طرح یہ سب ایک دوسرے کے خاندانی بھائی ہوتے تھے حالاں کہ ان میں باہمی محبت کی جگہ نفرت تھی۔ ابراہیم سوری کے خاندان کو غور کے خاندان سے دور کی بھی نسبت نہ تھی۔ سلطان شہاب الدین تازک قبیلہ کا تھا جو کہ بالکل ہی اجنبی تھا اور جب اس کی وفات کے بعد ان کی چند روزہ حکومت افغانستان میں ختم ہوگئی تو افغان انہیں حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے ابو الفضل کا یہ بیان صحیح ہے کہ ابراہیم ایک تاجر اسپ تھا لیکن بذات خود سوداگروں میں اس کی وقعت نہ تھی۔ اگر وہ خوشحال ہوتا تو عالم ضعیفی میں اپنے آبائی وطن سے ہجرت کرنے کی نہ سوچتا۔ اغلب ہے کہ اس کے اکلوتے لڑکے حسن نے جسکی رگوں میں جوش جوانی موجزن تھا اس کو مجبور کیا ہو کہ وہ اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر دور دراز ہند میں اپنی قسمت آزمائی کرے۔ اس وقت تک حسن غیر شادی شدہ تھا۔ افغان کے لیے عورت

---

[1] یہ جگہ اب اسندا کے نزدیک ۷۰.۹۰ طول البلد اور ۳۰.۴۳ عرض البلد پر واقع سرگور گائی ہے اس کو غلطی سے سرگڑھی نہیں سمجھنا چاہیے۔ سرگڑھی ایک دوسرا مقام ہے۔ جو قلعہ کو لہارٹ سے مغرب کی جانب ۱½ میل ہے اور قلعہ لوکہارٹ اور گلستان کو جوڑتا ہے اس مقام پر ۱۲ ستمبر ۱۸۹۷ء کو برٹش رجمنٹ کے ۲۱ سکھ سپاہیوں نے ۱۰ ہزار قبائلیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور ایک ایک سپاہی لڑتے لڑتے شہید ہو گیا تھا۔ ابراہیم کے وطن سرگری کا جو بیان عباس نے کیا ہے اس سے اس مقام کا جائے وقوع میل نہیں کھاتا۔ یہ مقام زیادہ مغرب کی جانب ہے

Marfat.com

زندگی کی ایسی نعمت ہے جو اسے مشکل سے میسر ہوتی ہے کیوں کہ ان کے ملک میں رشتہ دار عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں بدرجہا کم ہے۔

فرشتہ کا خیال تھا کہ ابراہیم کا تعلق شاہی خاندان سے ہے۔ اور اسی غیر مستند رائے سے متاثر ہو کر ایلفنسٹن نے لکھا ہے کہ ابراہیم اور اسکے لڑکے کی شادی اپنی برادری کے اونچے گھرانوں میں ہوئی تھی[۱] لیکن اس بیان کی صداقت کے لیے کسی مورخ کا کوئی بھی ثبوت دستیاب نہیں۔ حتیٰ کہ فرشتہ بھی جس کو ایلفنسٹن نے نقل کیا ہے اس کے متعلق خاموش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم اور اس کے مشہور بیٹے اور پوتے کا کوئی ازدواجی تعلق لودی فارمولی سیروانی۔ نیازی وغیرہ باوقار خاندانوں سے نہ تھا۔ ممکن ہے ان کی شادیاں افغان قوم کے معمولی گمنام افغان گھرانوں میں ہوئی ہوں۔ ابراہیم کے پوتے کے لیے یہی شہرت کافی تھی کہ وہ تلوار کا دھنی تھا۔

ابراہیم کے متعلق جو چند واقعات معلوم ہوئے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہلول لودی کے عہد کے آخری حصہ میں ہی ہندوستان آیا۔ جبکہ بہار لٹ چکی تھی لہٰذا اسے چند دانوں پر ہی قناعت کرنی پڑی۔ اسے نارنول پرگنہ کی سرحد کے نزدیک کچھ گاؤں جاگیر میں ملے اور وہ ۴۰ گھوڑوں کا سردار مقرر ہوا۔ غالباً یہ قیاس حق بجانب ہی ہوگا کہ ابراہیم نے اپنے وطن کو ۱۴۸۲ء میں خیر باد کہا۔ اب بہلول کے عہد سلطنت کے ۳۰ سال گزر چکے تھے اور اس وقت تک افغان مہاجرین کی ایک کثیر تعداد ہندوستان میں آچکی تھی۔ اور بہلول کے عہد کی خوشحالی فرقوں کے باہمی نزاع اور اس کی کثیر اولاد کے مابین تفرقہ کی وجہ سے روبہ انحطاط تھی۔

---

[۱] یہ ممکن ہے کہ افغان خون میں تاژک خون کی آمیزش ہو لیکن ۱۵ ویں صدی میں کوئی افغان تاژک خاندان میں شادی کرنے کی بات نہیں سوچ سکتا تھا۔ افغانوں میں ایک مشہور کہاوت تھی "اگر تاژک آپ کو کوئی نقصان نہ پہونچائے تو کم از کم جانے سے پہلے وہ عقب ہوا ضرور خارج کرے گا" [۲] اکبر نامہ ۶۰۔۳۲۔ انگریزی ترجمہ سے ہسٹری آف انڈیا ۴۴-۴۳

Marfat.com

ہمارے پاس ابراہیم کے سفر اور خاندانی حالات کا مستند ریکارڈ نہیں ہے۔ صرف سروانی ذرائع سے دستیاب چند کہانیاں اور واقعات ہیں جو ناقابل اعتبار ہیں۔ اگرچہ مورخ عباس نے ان کا ضرورت سے زیادہ اعتبار کیا ہے مگر در اصل یہ کہانیوں اور فرضی افسانوں سے بہتر نہیں اور نہ ہم کو کسی صحیح نتیجہ پر پہونچنے میں مدد کرتے ہیں۔ مخزن کے مصنف نے بھی عباس کے اس جانبدارانہ رویہ سے اتفاق نہیں کیا اور ان روایات پر مبنی واقعات کو تسلیم نہیں کیا۔ ابراہیم نے خطہ پنجاب سے ہو کر سفر کیا جو اس وقت لودی خاندان کی یوسف خیل شاخ کے ماتحت ایک آزاد صوبہ تھا۔ ابراہیم کے جانب مشرق جالندھر کے دوآب تک سفر کرنے کے لیے کوئی خاص وجوہات نہ تھے۔ دہلی جانے کے لیے کارواں کا سب سے چھوٹا راستہ ملتان بھاولپور حصار ہو کر ہی تھا۔ یہ مغالطہ موجودہ مورخین کا پیدا کردہ ہے کہ انہوں نے بجواڑہ کا جو ابراہیم کے سفر کا ہند میں سب سے پہلا پڑاؤ تھا۔ جالندھر کے دواب میں تعین کیا ہے۔ جبکہ فارسی مورخین اس کے برعکس اس مقام کو دہلی کے نزدیک ہریانہ کے علاقہ میں بتاتے ہیں۔

ہندوستان میں وارد ہونے کے بعد ابراہیم کو سب سے پہلے اپنے ایک دور کے رشتہ دار مہابت خاں سوری کی مہمان نوازی نصیب ہوئی۔ یہ سوری سردار داود ساہو خیل سے منسوب تھا۔ اور شاید روہ سے پہلے ہی ہجرت کر کے چلا آیا تھا۔ اس کے پاس ہریانہ (موجودہ مشرقی پنجاب) میں دو پرگنوں کا ایک اقطاع تھا۔ اس وقت ہریانہ کا صدر مقام حصار تھا۔ جس کو کہ عوام فیروز تغلق سے منسوب کر کے حصار فیروز کہتے تھے۔ کچھ روز کی مہمان نوازی کے بعد اپنے میزبان کے سلوک سے مایوس ہو کر اور ایک اجنبی ملک میں بے سرو سامانی کی وجہ سے ابراہیم جمال خاں سارنگ فانی کے یہاں روزی کی تلاش میں حصار جا پہونچا۔ جہاں جمال خاں نے پرگنہ نارنول میں اس کو چند گاؤں بطور اقطاع دیدیے۔ اس طرح وہ نارنول میں ۴۰ گھوڑ سواروں کا افسر بن گیا۔ نارنول لودی سلطنت کے جنوب مغرب میں خود مختار

Marfat.com

راجپوت ریاستوں کی سرحد پر واقع تھا۔ بالآخر ابراہیم نے اپنے اس چھوٹے سے اقطاع کے ایک گاؤں میں بودوباش اختیار کر لی۔ یہ نارنول کے علاقہ میں تھا اور اس گاؤں کا نام شملہ یا سملہ تھا۔ اسی گاؤں کو ابوالفضل نے ابراہیم کا وطن لکھا ہے۔ چونکہ اپنی مفلسی اور بے سروسامانی کی وجہ سے ابراہیم نارنول کے قصبہ میں نہ رہ سکتا تھا۔ اس لیے ابوالفضل کی اس رائے کی تردید مشکل ہے۔ البتہ ابراہیم کی یہ دیہی سکونت عارضی ہی رہی ہوگی یعنی کہ وہ اس گاؤں میں اس وقت تک رہا ہوگا جب تک حسن اپنے عیال واطفال کے ساتھ نارنول میں آکر بس گیا۔ اس بیان کی تائید مخزن کے مصنف نے "ساکن نارنول" لکھ کر کی ہے۔ (مسودہ ایف ۷۶ ۳۔بی)۔ حسن نے اپنی زندگی میں نمایاں ترقی کی اور وہ پیشہ تجارت سے اٹھ کر سپاہی ہو گیا۔ عرصہ دراز تک حسن رائے سال درباری کے باپ سردار رائے مل کی خدمت میں رہا بعد میں یہ سردار شہنشاہ اکبر کا ایک معزز عہدیدار ہوا[1]۔
ابوالفضل نے حسن کے متعلق جو کچھ شجاع الدولہ رائے مل کے لڑکے رائے سال، درباری سے سنا اس کی بالواسطہ تائید ۱۷ ویں صدی کا راجپوت مورخ نینسی بھی کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے[2] "رائے مل نے بھاٹیوں سے ان کا علاقہ زبردستی چھین لیا اس علاقہ کا نام بعد میں شیکھاوٹی ہوا۔ اغلب ہے کہ اس لڑائی میں حسن نے معہ اپنے پٹھان سپاہیوں کے بھاٹیوں کے خلاف رائمل کی مدد کی ہو۔ اس زمانہ میں یہ کوئی حیرت انگیز بات نہ تھی کیوں کہ اس کا ثبوت ملتا ہے کہ متعدد پٹھان سرداروں نے اپنے ہندو آقاؤں کی خدمت نہایت وفاداری اور تندہی سے کی تھی۔
بہت ممکن ہے کہ حسن نے اپنی پہلی شادی اس وقت تک نہ کی ہو جب تک کہ رائے مل کی خدمت میں رہ کر اس نے کافی سرمایہ اور اعزاز حاصل نہ کر لیا ہو۔ سن رسیدہ ابراہیم کا انتقال سلطان بہلول لودی کے عہد حکومت

---

[1] اکبر نامہ۔ ۱۔ ۳۲۷۔ [2] نینسی کی کھیات۔ ۲۔ ۳۵۔

Marfat.com

میں سلطان کی موت سے چند روز پہلے ہوا۔ سلطان نے جولائی ۱۴۸۹ء میں اس دارفانی سے کوچ کیا۔ اس وقت حسن سرہند کے دور دراز علاقہ میں عمر خاں سروانی کی ملازمت میں نہ تھا۔ اور نہ یہ بات ہی سچ ہے کہ عمر خاں نے حسن اور اس کے لڑکے فرید کی سرپرستی کی۔ عباس نے اپنے بے ساختہ تعصب سے متاثر ہو کر اس بات کی مبالغہ آمیز تشریح کی ہے۔ وہ لکھتا ہے "سرہند کا مقطعی عمر خاں سروانی بہلول لودی کی فوج کے ساتھ تھا۔ جب کہ حسن نے ابراہیم کے انتقال کی اس کو خبر دی۔ عمر خاں نے دوسرے ہی روز جمال خاں کو بلوا کر حسن کی پرزور سفارش کی۔ اور اس کے والد مرحوم کا اقطاع بہ اضافہ چند دیہہ اس کو دلوادیا (روز دگر با حضور خود طلبیدہ سفارش حسن بے شمار کردم۔ بلاشبہ اگر عمر خاں سروانی قبر سے نکل کر اپنے عزیز عباس کی اس خامہ فرسائی کے جوہر دیکھ سکتا تو اس دروغ گوئی پر شرم سے پانی پانی ہو جاتا۔ مستند تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ بہلول لودی کی حکومت کے آخری دور میں پنجاب کے یوسف خیل لودیوں نے سرہند کے علاقہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ عمر خاں سروانی باغی شہزادہ نظام (بعد میں سلطان سکندر لودی) کی جانبداری کرنے کی وجہ سے سلطان کی نظروں سے گر چکا تھا۔ سلطان خود اس وقت دوآب کی لڑائی میں مصروف تھا۔ اس لیے عمر خاں سروانی کا سلطان کی فوج کے ساتھ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا علاوہ بریں حصار کا گورنر جمال خاں سارنگ خانی ایک طاقتور ذی اثر سردار تھا۔ وہ عمر خاں سروانی کے اشارہ پر کیسے ناچ سکتا تھا۔ عباس کی اس غلط بیانی نے گذشتہ ۳۰ سال میں نہ جانے کتنے مورخین کو راہ راست سے منحرف کر دیا۔ ہے اور اس غلط فہمی کا شکار بنا دیا ہے۔[1]

یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس وقت تک حسن نے خود اپنے آقا جمال خاں کی نظروں میں کافی اہمیت حاصل کر لی ہو۔ اگرچہ اس دوران حسن

---

[1] اس واقعہ کے مختلف بیان کیلئے دیکھئے (۱) ڈاکٹر ایشوری پرشاد۔ دی لائف اینڈ ٹائمس آف ہمایوں صفحہ ۹۰۔ (۲) سرن۔ اسٹڈیز ان میڈیول ہسٹری صفحہ ۷۲

کے مرتبہ میں کوئی ترقی نہ ہوئی۔ البتہ چند سال بعد سلطان سکندر لودی کے عہد حکومت میں حسن کے رتبہ میں اضافہ ہوا۔ وہ ۵۰۰ گھوڑوں کے بجائے ۵۰۰ گھوڑوں کا سردار ہو گیا۔ اسی وقت ابراہیم کے اولین سرپرست جمال خاں کے لڑکے محمد خاں سوری کی بھی ترقی ہوئی۔ اب وہ ۳۰۰ گھوڑوں کے بجائے ۱۵۰۰ گھوڑوں کا سردار ہوا۔ سرسری نظر سے دیکھنے پر ترقیاں نہایت غیر معمولی معلوم ہوتی ہیں اور یہ شکوک پیدا ہوتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں حسن کی زندگی کی کوئی کڑی چھوٹ گئی ہے لیکن سلطان بہلول لودی کی وفات کے بعد تیزی سے بدلتی ہوئی سیاسی فضا سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ ان سوری سرداروں کی ترقی کا دفعتہً کیا راز تھا۔

III۔ فرید کی پیدائش اور بچپن

شیر شاہ کے اولین سوانح نگار عباس کے بیانات سے جو کچھ بھی پتہ چلتا ہے وہ یہ ہے کہ شیر خاں بہلول لودی کے عہد میں ہی پیدا ہوا تھا[1] اور یہ امر مسلمہ ہے کہ بہلول کا انتقال جولائی ۱۴۸۹ء میں ہوا۔ اس بات سے شیر خاں کے سن ولادت کی نچلی حد تو بلاشبہ متعین ہو جاتی ہے۔ لیکن بہلول لودی کی تخت نشینی ۱۴۵۱ء سے لے کر ۱۴۸۹ء تک شیر شاہ کی پیدائش کا سال کیا سمجھا جائے اس معمہ کو بہلول کی وفات کے ۴۰۰ سال تک کوئی بھی سوانح نگار واضح نہ کر سکا۔ چنانچہ اوپری حد غیر متعین ہی رہ گئی کچھ قرائنی شہادت (جس کا کہ حوالہ دوران بیان دیا جائے گا) اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ بہلول کے عہد کا آخری حصہ ابراہیم کے ہندوستان پہنچنے کا وقت تھا۔ اور غالباً فرید کی پیدائش بہلول کی وفات سے ۳ سال پیشتر ہوئی۔ اس بنا

[1] شیر خاں در وقت بہلول متولد شدہ نام او فرید نہادند۔ نسخہ عباس۔ صفحہ ۱۲۔ مخزن میں بھی ایک جگہ تذکرہ ہے "چند گاہ در حصار فیروزہ بود فرید در انجا متولد شد۔"
مخزن الف ۴۰۲-بی۔

Marfat.com

پر فی الحال فرید کی ولادت کا سال ۱۴۸۶ء مقرر کیا جا سکتا ہے اور اسی تاریخ کو فرید عرف شیر شاہ کے حالات زندگی قلمبند کرنے کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ کیوں کہ ہمارے پاس کوئی تواریخی مستند ذرائع نہیں ہیں۔ جن کی بنا پر فرید کی تاریخ ولادت کے متعلق کوئی یقینی فیصلہ کیا جا سکے۔

فرید کی جائے پیدائش کے متعلق بھی سن ولادت کی طرح عباس اور ابوالفضل دونوں ہی خاموش ہیں۔ مصنف مخزن کے بیان کے مطابق فرید حصار میں پیدا ہوا۔ لیکن اس رائے کی تائید اس کے وقت سے پہلے کے کسی مورخ کے بیان سے نہیں ہوتی۔ اور نہ قرائنی شہادت سے ہی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ مصنف مخزن کے پاس اس نتیجہ پر پہنچنے کے عباس اور ابوالفضل کے علاوہ دیگر ذرائع بھی ہوں جو اس وقت تک ہمیں دستیاب نہیں پھر مخزن کے بیان کی بنا پر بھی حصار کو فرید کی جائے پیدائش تسلیم کرنے میں ایک دقت ہے وہ یہ کہ فرید نے اپنے عہد حکومت میں حصار جیسی مشہور جگہ میں کوئی دلچسپی نہیں دکھلائی جبکہ اس کے برعکس مقابلتہً گمنام قصبہ نارنول کو ترقی دینے کے لیے اس نے اسے ضلع کا صدر مقام بنایا وہاں ایک قلعہ کی تعمیر کی۔ اور اکثر اس کی یاد اسے پریشان بھی کرتی تھی۔ وہیں اس نے اپنے جدِ مرحوم کی قبر پر ایک مقبرہ بنایا۔ جس کے کھنڈر آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اورنگ زیب جیسا خشک طبع اور جذبات سے عاری انسان بھی اپنے وطن اور باشندگان وطن سے دلی لگاؤ اور انسیت رکھتا تھا۔ اگر حصار فیروز کا کوئی تعلق فرید کی ولادت یا بچپن سے ہوتا تو وہ اپنے مذہبی جذبہ کے احترام کے لیے وہاں کم از کم ایک مسجد تو ضرور تعمیر کراتا پہلے میں خود بھی اسی رائے کا تھا کہ فرید کی جائے پیدائش حصار فیروز ہے لیکن اب میں اپنے پرانے خیال کو رد کرتا ہوں اور اس کی تردید میں ثبوت پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ ابوالفضل نے اپنی تاریخ میں کسی جگہ بھی شملہ کو فرید کی جائے ولادت نہیں بتایا لیکن اس کے طرز تحریر سے اس قسم کی منشا صاف ہے ہم اس باب میں پہلے ہی ایک جگہ ذکر کر چکے ہیں کہ نارنول میں سکونت پذیر ہونے

Marfat.com

کے بعد ہی جب گنوارپن کا داغ اس کے دامن سے دھل گیا تو حسن نے اپنی پہلی شادی کی۔ مصنف مخزن نے بھی اسے "ساکن نارنول" بتا کر اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جہاں ثبوت محض قرائنی ہو اور مستند تواریخ میں اختلاف رائے ہو۔ وہاں سچائی کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے علیٰ ھذا یہ کہنا حقیقت کے زیادہ نزدیک اور دلائل پر مبنی ہوگا کہ ہم ابوالفضل کی رائے کو مخزن پر ترجیح دیں۔ اس میں صرف اتنی ترمیم کی ضرورت ہے کہ شیر شاہ نارنول کو اپنی جائے ولادت صرف اس معنی میں تصور کرتا تھا۔ کہ اس کا بچپن وہاں گذرا۔ وہیں اس کی پرورش ہوئی اور وہیں اس کے باپ دادا رہتے تھے[1]

یہ ایک عام طریقہ ہے کہ اکثر کسی عالی مرتبہ جلیل القدر شخص کی سوانح عمری لکھتے وقت کچھ اس قسم کے عجیب و پیشن گویانہ واقعات اس کی زندگی سے منسوب کر دئے جاتے ہیں جس سے سادہ لوح انسان کو یہ یقین ہو جائے کہ اس میں بچپن سے ہی عظمت اور بزرگی کے آثار نمایاں تھے لیکن فرید کی زندگی میں اس قسم کا کوئی کرشمہ نہیں ہوا۔ موجودہ زمانہ کے ایک مورخ[2] نے عباس کا اعتبار کر کے اس قسم کے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جس سے بچپن میں فرید کی ذہانت اور حوصلہ کا پتہ چلتا ہے۔ واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ فرید نے بچپن میں یہ ضد کی کہ اس کو عمر خاں کے سامنے پیش کیا جائے اور خان نے خوش ہو کر اس کو ایک گاؤں بطور اقطاع دیدیا۔ واقعات کی تفتیش کرنے پر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ اتنا ہی بے بنیاد ہے جتنا کہ عمر خاں سروانی کی سفارش پر حسن کو ابراہیم کے اقطاع کا ملنا۔ کیوں کہ حسن نے کبھی عمر خاں کے یہاں ملازمت نہیں کی۔

IV۔ حسن کا عروج اور سہسرام کو تبادلہ

جبکہ ۱۴۸۶ء کے قریب فرید کی ولادت ہوئی اس وقت لودی سلطنت

---

[1] شیر کی جائے پیدائش و سن ولادت کے متعلق حیرت انگیز مباحثہ کے لیے دیکھیے گا باب اول کا ضمیمہ [2] ڈاکٹر ایشوری پرشاد۔ دی لائف اینڈ ٹائمس آف ہمایوں صفحات ۹۶-۹۷

Marfat.com

کے افق پر سیاہ بادل گھرنے لگے تھے۔ اور ہندوستان کے افغانوں میں باہمی خانہ جنگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ جولائی ۱۴۸۹ء میں بہلول کی وفات کے فوراً بعد ہی ایک طوفان بپا ہو گیا۔ وراثت کے مسئلہ کو لے کر اس کے لڑکوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ بہلول نے اپنے سب سے بڑے بیٹے باربک شاہ کو اپنی زندگی میں ہی جونپور کی مشرقی سلطنت کا گورنر بنا دیا تھا۔ یہ علاقہ بہلول نے ابھی حال میں ہی فتح کیا تھا۔ باربک بہلول کی بیوی سے تھا جو ایک با اثر خالص افغان نسل سے تھی۔ جونپور میں تمام سن رسیدہ تجربہ کار جنگ جو لودی سردار اکٹھا ہو گئے۔ وہ اس بات پر آمادہ تھے کہ اگر سلطان بہلول نے اپنی دوسری چہیتی بیوی کے بس میں آکر کوئی اور ہی فیصلہ کیا۔ تو وہ باربک کا ساتھ دے کر اس کے جائز حق کو اسے دلوائیں گے۔ یہ دوسری بیوی ہندو زرگر خاندان سے تھی۔ اور چھوٹے شہزادہ نظام کی ماں تھی۔ نظام نے تو بہلول کی وفات سے دو سال قبل ہی بغاوت کا پرچم بلند کر دیا تھا۔ اور اپنے والد کے دریائے ستلج کے مشرقی کنارے کے علاقوں کو لوٹ رہا تھا۔ لوہانی اور سروانی قبیلے کے افغان سردار عمر خاں سروانی کی قیادت میں اس کی امداد کر رہے تھے۔ کیوں کہ یہ سردار شاہو خیل لودی قبیلہ کے عروج سے حسد کرتے تھے۔ اس کے برخلاف لودی قبیلہ کے سرداروں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر نظام کو تخت پر نہ بیٹھنے دیں گے۔ کیوں کہ وہ ایک ہندو زرگر لڑکی کی اولاد تھا۔ حالانکہ وہ بہلول کے لڑکوں میں سب سے زیادہ ہوشیار تھا۔ جیوں ہی نظام کو بہلول کی وفات کی خبر ملی اس نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اور جمال خاں سارنگ خانی کو جو کہ ایک معتبر غیر جانب دار انصاف پسند سردار تھا دہلی کا گورنر مقرر کر دیا تاکہ پنجاب کے یوسف خیل لودی عقب سے اس کو کوئی نقصان نہ پہونچا سکیں۔ بعد میں وہ تیزی سے اپنے بڑے بھائی سے لڑنے کو چل پڑا۔ نظام کی سیاسی چالوں نے باربک کے مددگاروں کو مضطرب کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قنوج کے نزدیک ایک خونریز لڑائی میں اس نے باربک کو شکست فاش دیدی۔

Marfat.com

اس موقع پر فتح حاصل ہونے پر بھی نظام نے نہایت دوراندیشی سے کام لیا۔ بالاخر دونوں بھائیوں میں ایک معاہدہ ہو گیا جس کے مطابق یہ قرار پایا کہ نظام دہلی کا فرمانروا ہوگا بشرطیکہ وہ باربک کو جونپور کے علاقہ میں بے خلل چھوڑ دے۔ اس معاہدہ کے ایک سال بعد نظام نے دوآب میں جلالی کے مقام پر اپنی رسم تاجپوشی کی اور سلطان سکندر کا خطاب اختیار کیا اور باربک شاہ سے جنگ شروع کر دی۔ اس موقع پر جونپور کے مفرور سلطان حسینی شاہ شرقی کی آمد سے حالات اور بھی پیچیدہ ہو گئے۔ کیوں کہ وہ اپنی آبائی ریاست پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے آخری داؤ لگانا چاہتا تھا سکندر کو باربک کے معاون و مددگار سرداروں کا صفایا کرنے اور دوآبہ کے باغی سرکش افغان سرداروں کو دبانے میں پورے تین سال لگ گئے۔ ایک کامیابی کے بعد حسینی شاہ شرقی گنگا کے جنوب میں چلا گیا تھا۔ مگر اس کے جیتے جی جونپور میں امن کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ۱۴۹۴ء میں شاہ آباد اور مرزاپور اضلاع کی سرحد پر سکندر نے لڑائی میں حسینی شاہ شرقی کو ایک کمر توڑ شکست دیدی۔ اور اس نے بھاگ کر بنگال کے سلطان علاء الدین حسینی شاہ کے دربار میں پناہ لی۔ بنگال کے سلطان حسینی شاہ کی اپنی یہ خواہش تھی کہ وہ مغرب میں اپنی سلطنت کی توسیع دریائے گنگا کے ہر دو کناروں تک کرلے لیکن جنگ کی نوبت نہیں آئی اور فریقین میں صلح ہو گئی جس کے مطابق پٹنہ سے ۲۵ میل جانب مشرق بارہ قصبہ کو دونوں حکومتوں کے بیچ کی سرحد مان لیا گیا۔

سلطان سکندر کے جنگ میں مصروف رہنے کے باوجود دریائے جمنا کے مغربی علاقہ میں کسی قسم کی شورش بپا نہیں ہوئی۔ کیوں کہ جمال خاں سارنگ خانی نے جو کہ دہلی کا قوی ارادہ والا حاکم تھا وہاں امن قائم رکھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمال خاں نے اپنے سب سے بڑے لڑکے احمد کو ہریانہ کے علاقہ میں تعینات کر دیا تھا تاکہ وہ عقب دہلی سے آنے والے تمام راستوں کی حفاظت کرتا رہے۔ اس دوران میں حسن کی زندگی کا بھی نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ سلطان بہلول کی وفات سے کچھ دن پہلے اس کے

Marfat.com

والد ماجد کا انتقال ہو گیا تھا۔ زاں بعد حسن نے رائے مل شیخاوت کی ملازمت ترک کر دی۔ آہستہ آہستہ وہ زبردست سپاہیوں کا ایک پر اثر سردار بن گیا اور اتنا متمول اور طاقتور ہو گیا کہ اس کے لیے حصار کے گورنر کی ماتحتی میں ۲۰۰ گھوڑ سواروں کی سرداری ہیچ تھی۔ کیوں کہ اس وقت خود اس کے پاس اُس وقت سے پانچ گنے سوار موجود تھے۔ سیاسی نظام کے تغیر و تبدل کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ سارنگ خانیوں نے نارنول کا مکمل پرگنہ حسن کے سپرد کر دیا۔ کیوں کہ اسی میں راجپوتوں سے لوہا لینے کی ہمت تھی۔ یہ ظن بعید از عقل ہو گا کہ بہلول کو فوراً ہی جمال خاں کی سفارش پر ۵۰۰ سواروں کا سردار بنا دیا اور اس کو جنوبی بہار میں دو پرگنے بھی بطور جاگیر کے دیدیے۔

ایسی ہی ترقی اس دور میں داؤد ساہو خیل کے محمد خاں سوری پسر مہابت خاں سوری نے کی ہوگی۔ جو اس وقت ہریانہ میں چار صد گھوڑوں کا افسر تھا۔ بعد میں محمد خاں سوری کو جنوب بہار میں ۱۵۰۰ گھوڑوں کا افسر بنا کر بھیجا گیا ہو گا۔ اس وقت سوریوں کو یہاں بسایا جا رہا تھا۔ اس بابت غور طلب یہ بات ہے کہ سلطنت دہلی کے پر آشوب دور میں جبکہ ہر سو بد امنی و شورش بپا تھی غیر افغانی سارنگ خانی سردار (جو کہ سلطان فیروز کے ترک [illegible]ں کی اولاد تھے اور جنہوں نے سردار سارنگ خاں کی قیادت میں امیر تیمور سے لوہا لیا تھا)[1] سلطان سکندر کے منظور نظر سروانی اور لوہانی سرداروں سے خائف تھے چنانچہ انہوں نے ہندوستان میں نو وارد افغان مہاجرین کی حمایت حاصل کرنے کا منصوبہ باندھا ہو گا۔ ممکن ہے انہیں وجوہات سے جمال خاں

---

[1] بابر نے سارنگ خانی لوگوں کو افغان سمجھ کر ایک بھول کی ہے۔ افغانوں میں سارنگ خانی قبیلہ کی کسی بھی مشہور ہستی کا حوالہ نہیں ہے۔ افغانوں میں یہ رواج نہ تھا کہ کسی مشہور و معروف ہستی کے ساتھ وفاداری کے خیال سے کوئی قبیلہ اس کے خطاب کو اپنے نام کے ساتھ جوڑ دے جیسا کہ مغلوں میں عام دستور تھا۔ مثلاً دریا خاں ترک کے نام سے منسوب دریا خانی (دیکھیے میموریس۔ اڈکنس ۲/۸-۷-۸۱۶)۔

Marfat.com

ثانی نے یہ تہیہ کیا کہ ۱۴۹۵ء کے قریب تمام سوری سرداروں کو جونپور کی سرکار میں لے لیا جائے۔

افغان مورخ اس بابت بالکل ہی خاموش ہیں کہ سہسرام اور جونپور سے باہر میاں حسن کی کیا کارگذاریاں تھیں۔ البتہ ابوالفضل کے بیان سے جو غلط فہمی پر مبنی ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میاں حسن نے اودھ اور غازی پور کے تمام مشہور سرداروں کے یہاں ملازمت کی۔ حقیقت خواہ کچھ بھی ہو لیکن ایک بات یقینی ہے کہ میاں حسن کا مستقبل اس کے حرم سے وابستہ تھا۔ اس لئے اس کے بیوی بچوں کی تفصیل از حد ضروری ہے حسن کی پہلی بیوی نجیب الطرفین افغان نسل سے تھی۔ اس سے تین بچے ہوتے فرید۔ نظام اور ایک لڑکی جس کا نام معلوم نہیں ہے۔ اس زمانہ کی پٹھان سوسائٹی کو ہندوستانی عورتیں رکھنے کا بہت شوق تھا۔ میاں حسن بھی اس شوق سے اچھوتا نہ رہ سکا۔ اور اس نے بھی یکے بعد دیگرے تین کنیزوں سے باقاعدہ شادی کی۔ یہ شادیاں کب کہاں اور کس سلسلہ میں ہوئیں اس کا علم کسی تاریخ داں کو نہیں۔ فرید کے سوتیلے بھائیوں میں سے تاریخ میں صرف سلیمان اور احمد کا ہی ذکر آتا ہے۔ جو حسن کی سب سے آخری کنیز بیوی سے شاید سہسرام میں پیدا ہوئے تھے۔ باقی ماندہ بھائیوں کے نام کا صرف حوالہ ہی ملتا ہے۔ اس لیے ان کی تفصیل سے کوئی فائدہ نہیں۔

حسن کی خانگی زندگی کوئی غیر معمولی نہیں تھی۔ مسلمانوں کے حرم میں کسی نئی بیوی کا آنا کوئی سنسنی خیز بات نہیں ہوتی۔ یہ اسی طرح سمجھی جاتی ہے جیسے کہ مرغیوں کے ڈربہ میں مرغ کے لیے ایک نئی مرغی کی آمد وہ تو حسب معمول پھدکتا ہی رہتا ہے۔ جس سوسائٹی میں مرد کو کئی کئی بیویاں رکھنے کا حق حاصل ہو وہاں حرم کے اندر مستورات کے رہنے کے قاعدہ قوانین کا رسماً ایک اصول بن جاتا ہے۔ ایک شوہر اپنی بیویوں سے شرعاً یہ توقع کرسکتا ہے کہ وہ موجودہ رسم ورواج کے مطابق باہمی سمجھوتہ کرلیں گی۔ جس کا کہ مطلب یہ ہوا کہ وہ حرم کے باہر اور اندر دونوں جگہ اپنی اپنی حیثیت کا اندازہ کرکے اس کو تسلیم کرلیں

Marfat.com

گی۔ جب ایک کنیز حرم میں لبطور بیوی داخل ہوتی ہے تو اسے حرم کی آزاد عورت کو اپنی مالکہ تسلیم کرنا پڑتا ہے اور اس کے حضور میں وہ لبطور کنیز قاعدہ سے پیش آتی ہے۔ اسی طرح شوہر کو بھی اپنی پہلی بیوی کی عزت و تکریم کرنی پڑتی ہے۔ خواہ اُس کو اس سے محبت و یگانگت ہو یا نہ ہو۔ بدقسمتی سے حسن کی آخری بیوی غضب کی حسین۔ فتنہ انگیز اور شوخ طبیعت تھی۔ حسن کے حرم میں اس کے داخلہ سے سہسرام میں کس قدر افسوسناک واقعات رونما ہوئے۔ اس کا ذکر اب تفصیل سے کیا جائے گا۔

V۔ سلطان سکندر لودی کے ماتحت چنار سرکاریں

میاں حسن کی نئی جاگیر

جب کہ پندرھویں صدی کے آخری حصہ میں سکندر لودی بہار اور جونپور کے علاقہ میں تمام باغیوں اور مخالفین کو پسپا کر چکا تب اس نے دھلی سلطنت کے نظام حکومت کے ڈھانچہ میں تفصیلی تغیر و تبدل کر کے اپنی قوت کو مستحکم کرنا شروع کیا۔ اس مقصد سے سب سے پہلے تو اس نے نہایت خوش اسلوبی سے افغانوں کی جاگیروں کو از سر نو تقسیم کیا۔ ہنوز اس علاقہ میں ساہوخیل لودیوں کی جاگیریں تھیں۔ اور وہ ہی وہاں برسر اقتدار تھے۔ انہیں نے ایک زرگر عورت کے بطن سے پیدا لڑکے کے سلطنت پر وراثت کے حق کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ چنانچہ اب ان کا سر لوہار کے ہنوڑے کے نیچے تھا۔ سروانیوں اور لوہانیوں نے تو سکندر کا ساتھ دیا تھا۔ اب ان کو اس علاقہ میں بسا کر ساہوخیل والوں کو منتشر کر دیا گیا۔ اور اس طرح ان کا خطرہ ختم ہو گیا۔ مگر سکندر تو عقلمند تھا۔ اگرچہ اس نے اپنے نئے منظور نظروں کو جی کھول کر انعام و اکرام دیئے تھے مگر اس کو ان کی جانب سے بھی شبہ دامن گیر تھا۔ اس نے سروانیوں کو گنگا کے دوآب کے شمالی نصف حصہ میں کانپور سے کانٹ و گولہ یعنی ضلع شاہجہانپور تک بسایا تھا اور لوہانیوں کی ایک شاخ کو دریا خاں کی قیادت میں جنوبی بہار میں جس میں ضلع شاہ آباد شامل

Marfat.com

نہیں تھا بسا دیا۔ تاکہ ریاست بنگال کی جانب ایک پشت پناہ بن جائے۔ لوہانیوں کی ایک دوسری شاخ کو نصیر خاں لوہانی کی قیادت میں غازی پور کے اوپر کے حصہ میں بسایا اور اودھ اور اس کے پار گھاگرہ کی نچلی وادی تک فارمولیوں اور لودیوں کو مخلوط کر کے آباد کیا۔

سکندر کی بہترین سیاسی چال یہ تھی کہ اس نے جونپور کے خاص علاقہ کو براہ راست مرکزی حکومت کے تحت میں رکھا تاکہ وہ اس کا مناسب انتظام ایک ایسے گورنر کے ذریعہ کر سکے جو غیر جانبدار ہو۔ اسی خیال سے اس نے جمال خاں سارنگ خانی کو جونپور کا حاکم مقرر کیا۔ اور اس کو ۱۲۰۰۰ گھوڑ سواروں کی فوج کی داشت و پرداخت کے لیے ایک وسیع جاگیر بھی عطا کی۔ اس نے جمال کے ایک رشتہ دار مسمی تاج خاں سارنگ خانی کے سپرد چنار کا مضبوط قلعہ کیا۔ یہ براہ راست سلطان کے ماتحت تھا۔ جمال خاں نے حسن کی خدمات سے خوش ہو کر پرگنہ سہسرام اور خواص پور کی جاگیر اس کو دیدی[1]۔ یہ پرگنہ اس وقت سرکار روہتاس کے تحت میں تھا[2] اور حسن کو ۵۰۰ گھوڑ سوار رکھنے کا حکم تھا۔ حسن کے ساتھ جمال خاں مہابت خاں سوری کے لڑکے محمد خاں سوری کو بھی ہریانہ سے

---

[1] عباس صفحہ ۱۰ الف (بسیار از خدمت حسن راضی شدہ)۔

[2] از خدمت حسن بسیار راضی و شاکر شد۔ اور ارعایت نمودہ پرگنہ سہسرام و خواص پور ٹانڈہ از تابع روہتاس بہ جاگیر۔۔۔ (مخزن قلمی نسخہ کپورتھلہ اسٹیٹ لائبریری سرکار کی نقل)۔

یہاں قابل غور یہ بات ہے کہ حسن کی جاگیر کے دوسرے پرگنہ کے نام کے متعلق دونوں مورخین میں اتفاق رائے نہیں ہے۔ عباس نے تو اس کا نام حاجی پور ٹانڈہ بتلایا ہے۔ اور مخزن نے اسے خواص پور ٹانڈہ لکھا ہے۔ اور اس کا جائے وقوع سرکار روہتاس کی حد میں بتایا ہے۔ جو کہ جغرافیائی پہلو سے درست ہے۔ لہٰذا یہ زیادہ قابل اعتبار ہے سلطان سکندر کے زمانے میں روہتاس فتح نہیں ہوا تھا۔ اس لیے سرکار جونپور کہنا ہی زیادہ موزوں ہوگا۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ (باقی حاشیہ صفحہ ۵۲ پر)

Marfat.com

اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور اس کو پرگنہ چاند دیا۔ جس میں کہ موجودہ ضلع مرزا پور اور ضلع شاہ آباد کے کرم ناسہ ندی کے مشرق کی جانب کا کچھ حصہ شامل تھا۔ اس کو ۱۵ ہزار گھوڑ سوار رکھنے کا حکم ہوا۔ سارنگ خانی افغان نہیں تھے۔ وہ ترکمان نسل سے تھے۔ سلطان سکندر نے ان کو یہ ترقی محض اس لئے دی تھی تاکہ وہ لوہانی سرداروں کے اثر کو حد اعتدال میں رکھیں اور مغرب، شمال و جنوب مشرق میں لوہانی، فارمولی اور سروانی سرداروں پر نگاہ رکھ سکیں۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لیے جمال خاں سارنگ خانی نے سوریوں کو جن کی وفاداری پر اسے پورا اعتماد تھا۔ لوہانی قبیلوں کے ساتھ ملا جلا کر بہار اور غازی پور کے علاقہ میں بسایا۔

چوں کہ سلطان سکندر لودی نے جنوبی بہار کو فتح کر کے اسے حال ہی میں اپنی سلطنت میں شامل کیا تھا۔ اس لیے اس علاقہ کے نیم خود مختار ہندو سرداروں کو دبانے میں اس کو متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اور خاص کر اس وجہ سے کہ بندھیل کھنڈ کا راجہ ان کا معاون و مددگار تھا۔ چنانچہ جنوبی بہار ایک نیم مفتوح علاقہ ہی بنا رہا۔ یہاں افغانوں کا فوجی تسلط تھا۔ ان کو اپنی جاگیروں کو قبضہ میں رکھنے کے لیے سخت جدوجہد کرنا پڑتی تھی۔ ایسی حالت میں سہسرام خواص پور ٹانڈہ کے پرگنے ایک غیر متعین سرحد پر صرف ایک حاشیائی ڈانڈے

مصنف مخزن نے اپنی تاریخ اکبر کی وفات کے بعد لکھی ہے اور اکبر کے زمانہ میں شاہ آباد روہتاس میں شامل کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اپنی مشہور تاریخ لائف اینڈ ٹائمس آف ہمایوں" میں دو پرگنوں کے تین پرگنے کر دیے وہ لکھتے ہیں کہ اس کو بنارس کے نزدیک سہسرام۔ حاجی پور اور خواص پور کے پرگنے دیدیے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے عباس اور مخزن میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے حاجی پور اور خواص پور دونوں پرگنوں کو علیحدہ علیحدہ لکھا ہے اور خواص پور ٹانڈہ کو بنارس کے نزدیک بتایا ہے۔ ان کی یہ رائے نہ تاریخی رو سے درست ہے نہ جغرافیائی اعتبار سے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔ فرید اور اس کے مخالف پڑوسی محمد خاں سوری کے درمیان جو خانگی جنگ خواص پور ٹانڈہ کی سرحد پر ہوئی تھی وہ بنارس سے بہت دور رہے۔

Marfat.com

کی طرح تھے۔ جن کے جنوب اور جنوب مغرب میں خود مختار ہندو علاقہ تھا جس کی کہ طاقت کا مرکز تھار وہتاس کا غیر مفتوح قلعہ سہسرام کا منتہی قصبہ جو کسی زمانے میں ایک مشہور ہندو مقام تھا۔ حسن کی جاگیر کا صدر مقام تھا۔ تقریباً ۱۴۹۸ء سے اس نے یہاں سکونت شروع کی اور یہاں کا سیاسی انتظام کیا۔

فرید کو جس کی عمر اس وقت تقریباً ۱۲ سال تھی سہسرام کی فضا راس نہ آئی۔ جب حسن کی چہیتی کنیز کے بطن سے دو لڑکے سلیمان[1] اور احمد پیدا ہوئے تو گھریلو نفاق کی آگ جو کہ اب تک آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی دفعتہً بھڑک اٹھی اس آگ کے بھڑکانے میں سب سے زیادہ ہاتھ سلیمان کی والدہ کا تھا۔ چوں کہ اس کا شوہر فوجی زندگی بسر کرتا تھا اور اس کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہ تھا لہذا سلیمان کی والدہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر خدا نخواستہ اس کے شوہر کا دفعتہً انتقال ہو گیا تو اس کا سب سے بڑا لڑکا فرید اس کی جائیداد کا وارث مان لیا جائے گا چنانچہ اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ حسن اس کو اپنی جاگیر میں سے اس کا شرعی حصہ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی دیدے تاکہ اس کو نہ صرف سکون قلب ہی حاصل ہو جائے بلکہ اپنے ہی شوہر کے ہاتھوں اپنی حاسد سوتوں کی بے حرمتی کی تمنا بھی پوری ہو جائے یہ سازش غالباً ایک عرصہ سے چل رہی ہوگی۔ جس کا برملا انجام یہ ہوا کہ حسن کے خاندان میں صریحاً نفاق پڑ گیا جس سے کہ فرید کو روحانی تکلیف ہوئی۔ اپنی والدہ کی جانب اپنے والد کی بے توجہی اور بے انصافی اس کو اب صاف ظاہر ہو رہی تھی اور گراں خاطر ہو رہی تھی۔ میاں حسن اب فرید اور نظام کی والدہ کی طرف نہ تو نظر ہی اٹھاتا تھا اور نہ اس سے محبت ہی کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ سلیمان کی ماں کا اتنا گرویدہ اور اس پر اتنا فریفتہ ہو گیا تھا کہ اس کے ہر اشارے پر چلنے کو تیار رہتا تھا۔ عباس رقمطراز ہے "حسن کے دل پر سلیمان کی والدہ کا اتنا اثر تھا کہ وہ بالکل اس کی مٹھی

---

[1] میں نے شیر شاہ میں لکھا تھا "جب فرید جونپور گیا اس وقت تک سلیمان کی پیدائش نہیں ہوئی تھی" یہ بیان غلط ہے اور میں اسے واپس لیتا ہوں۔ غالباً سلیمان سہسرام میں پیدا ہوا تھا اسی لیے اس کی والدہ نے اپنے گذر بسر کے لیے علیحدہ جاگیر مانگی ہوگی۔

Marfat.com

میں ہی ہو گیا۔ حرم میں اس کی ہی بات چلتی تھی۔ چنانچہ اکثر میاں حسن اور فرید کی باہمی کشیدگی کی وجہ سے دونوں میں وحشت انگیز تکرار بھی ہو جاتی تھی جسکے دوران ناشائستہ الفاظ بھی منہ سے نکل جاتے تھے۔ تقسیم جاگیر کے وقت میاں حسن نے نہ فرید کی والدہ کی پاسداری کی اور نہ ہی اس کو حسب مرضی حصہ دیا۔ اپنے والد کے اس رویہ سے ناراض ہو کر فرید جمال خاں کے پاس جونپور[1] چلا گیا۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جبکہ فرید سن تمیز کو پہونچ چکا تھا۔ (مخزن)۔ یعنی اس کی عمر ۱۵ سال ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس کا سن ۱۵۰۱ء تعین کیا جا سکتا ہے اس بات کا اندازہ کرنا بہت مشکل نہیں کہ حسن کے گھر سہسرام میں ایک کنیز نے جس کی مٹھی میں وہ تھا کتنا ہنگامہ بپا کر دیا ہوگا۔ خاص کر جب کہ ہم اس بات کو نظر انداز نہ کریں کہ اس عہد کی سوسائٹی میں ایسے رسوم رائج تھے کہ ایک کنیز اپنی شریف زادی سوت کے حضور میں بلا اس کی اجازت بیٹھ بھی نہ سکتی تھی[2]

VI۔ فرید کی ابتدائی تعلیم اور منصوبۂ زندگی

اس بات پر تو جملہ مورخین متفق الرائے ہیں کہ جونپور پہونچنے

---

[1] عباس قلمی نسخہ صفحہ ۱۶۔ ایلیٹ قلمی نسخہ جلد ۴۔ صفحہ ۳۱۱۔ میں اس کے متعلق معمولی فرق ہے۔ نظام الدین فارسی اصل صفحہ ۲۳۳ اور فرشتہ اصل صفحہ ۳۲۱ اور مخزن میں تقسیم جاگیر کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ایک تنقید نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ حسن فرید کی ماں کے ساتھ کوئی برا سلوک کرتا تھا۔ شاید اس نقاد کی نظر میں برے سلوک کے معنی ہیں لات اور گھونسے (دیکھئے ڈاکٹر پی سرن کی تاریخ اسٹڈیز ان میڈیول ہسٹری۔ صفحہ ۳۲۔ ۳)۔

[2] تا حال یہی رواج رئیس مسلمان خاندانوں میں جاری تھا۔ جتنی شب اودھ کا نواب شجاع الدولہ اپنی منکوحہ بیگم کے محل سے غیر حاضر رہتا تھا اس کے لیے فی شب ۵ ہزار روپیہ بطور جرمانہ دیتا تھا۔

Marfat.com

کے کچھ عرصے بعد ہی فرید ایک عالم بن گیا۔ مگر تاریخ میں کوئی شہادت نہیں ملتی جس کی کہ بنا پر ہم قطعی طور پر یہ کہہ سکیں کہ اس طفل نو مکتب نے جونپور میں حروف تہجی سیکھے یا وہ یہاں پہونچنے کے قبل ہی لکھنے پڑھنے اور ریاضی کے بھید سے واقف ہو چکا تھا۔ اصول ریاضی تو ان دنوں بقالوں کے ہی کام کے تھے، بظاہر دونوں ہی باتیں ممکن معلوم ہوتی ہیں۔ اور نہ یہ بات ان لوگوں کے تجربہ کے متضاد ہے۔ جنہوں نے گزشتہ صدی میں پٹھان لڑکوں کی ذہنیت کی جانب توجہ کی ہے[1] اگر ہم ہندوستان میں روہیل کھنڈ کے مؤ اور شمس آباد کی نوآبادیات میں رہنے والے پٹھانوں کے بچوں کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ہم

---

[1] میرے ایک مرحوم دوست محسن و استاد فدا علی خاں رامپوری تھے۔ جنہوں نے مجھے ۱۰ سال سے زیادہ پڑھایا تھا۔ وہ تیروال پٹھان تھے۔ اور ہندوستان میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ ڈھاکہ دارالعلوم میں عربی اور فارسی شعبہ کے صدر اور پروفیسر تھے۔ وہ اپنے متعلق کہا کرتے تھے کہ انہوں نے ۱۵ سال کی عمر تک اپنے محلوں کے لڑکوں کے ساتھ کشتی لڑنے اور پتنگ اڑانے کے علاوہ کوئی تعلیم نہیں پائی۔ اس کے بعد ۱۵ سال کی عمر میں انہوں نے فارسی حروف تہجی سیکھنا شروع کیا۔ اور رامپور کے مدرسہ عالیہ میں دینیات کی تعلیم حاصل کی۔ وہ اپنے مدرسہ کے طلبا کی زندگی کے متعلق طرح طرح کے واقعات بیان کرتے تھے۔ ان طلبا میں سے کچھ افغانستان سے نووارد تھے۔

میرے ایک دوسرے ساتھی دوست ڈاکٹر محمود حسین تھے۔ جو اس وقت دارالعلوم کراچی میں ہیں۔ آپ نواب ابرخاں کے خاندان کے ایک معزز پٹھان ہیں۔ آپ کا خیال تھا کہ پٹھانوں کے زمانہ ماضی کو سمجھنے کے لیے موجودہ پٹھان سوسائٹی کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔ مجھے یہ تسلیم کرانا ہے کہ ان دونوں صاحبان کی مدد سے میں نے جتنا اچھا شیرشاہ کو اب سمجھا ہے اتنا اچھا ۱۹۲۱ء میں نہیں سمجھا تھا۔ جب کہ میری پہلی کتاب "شیرشاہ" شائع ہوئی تھی۔

Marfat.com

یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیر شاہ نے اگر ۱۵ سال کی عمر میں مکتب جانا شروع کیا ہو گا تو بھی یہ بات غیر معمولی نہ ہو گی۔ اور جہاں تک کہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کا تعلق ہے جن کو کہ فی سبیل اللہ تحصیل علم کا شوق ہوتا ہے وہ تو ۱۰ سال کی عمر میں اس کی ابتدا کرنے دیوبند اور رام پور آتے ہیں۔

اس کے بر عکس لودیوں کی تاریخ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی آب ہوا اور تمدن نے پٹھانوں پر جادو کا اثر کیا چنانچہ شمالی ہند کے شہروں میں آباد ہونے کے ایک پیڑھی بعد ہی ان کے فلسطینی طور طریقے بدل گئے۔ اور وہ معیاری یعنی عیش پسند ہو گئے۔ سکندر لودی اور اس کا روشن خیال دربار اس ہمعصر پٹھان سوسائٹی کا ایک حصہ تھا۔ جو کہ بدل کر مہذب ہو گئی تھی۔ اس وقت تک پٹھان سوسائٹی میں تحصیل علم کا شوق بڑھنے لگا اور ایسا کہا جاتا ہے کہ میاں حسن خود فرید کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلوانا چاہتا تھا۔ چنانچہ یہ قرین قیاس ہے کہ میاں حسن نے فرید کو ۵ یا ۶ سال کی عمر میں ہی جب کہ وہ نارنول میں تھا۔ مکتب بھیجنا شروع کر دیا ہو۔ اگر یہ بات سچ ہے تو یقیناً فرید نے سہسرام چھوڑنے سے پہلے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم پوری کر لی ہو گی۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ کیا فرید اپنے گھر کے بدرنگ ناموافق ماحول میں حصول علم کے لیے آمادہ ہو سکتا تھا؟ یا میاں حسن جس بیوی کو تقریباً طلاق دے چکا تھا اس کے لڑکے کو اچھی تعلیم دلانے کی بات سوچ سکتا تھا؟

فرید کی ماں کی حالت تقریباً ویسی ہی تھی جیسی کہ بالعموم کسی عیاش سوسائٹی میں جہاں ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کا رواج ہو کسی عورت کی ہو سکتی ہے۔ خواہ وہ عورت فرید کی ماں ہو یا شیواجی و مہارانا پرتاپ کی ماں۔ اس نیک دل خوددار عورت کو اپنے سے کمتر خاندان کی ایک حسین خاتون کے مقابلہ میں اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا جیسا کہ بعد کی تاریخ میں فقیر منش جیجا بائی کو کرنا پڑا۔ فرید کی ماں کو نہ تو اپنے شوہر کی روز افزوں ترقی سے کوئی فائدہ ہی ہوا اور نہ اس کو اپنی سوسائٹی میں جائز رتبہ ہی ملا۔ اس کے مصائب پس پردہ ہی رہے اور وہ صبر و تحمل کے ساتھ بچوں کا مستقبل بنانے میں مصروف رہی۔ اس کی خاموش

Marfat.com

بے نیازی دیکھ کر اس کے بچوں نے اپنی تقدیر سے سمجھوتہ کرلیا۔ اس نے یقیناً فرید کی گرم جوشی پر بندش کن اثر ڈالا ہوگا۔ بعد میں عمر اور تجربہ نے اس کے جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر فرید کی ماں اس کی اوائیل عمری میں ہی اس کو اشتعال دیتی تو تعجب نہیں فرید اپنے والد میاں حسن سے برسرپیکار ہو جاتا اور ممکن ہے کہ خونریزی کی بھی نوبت آ جاتی۔ یہ بیان بہت حد تک صحیح ہے کہ شیواجی اور شیر شاہ نہ صرف اپنے کردار و قابلیت میں یکساں تھے بلکہ ان کی پرورش اور پرداخت بھی یکساں ماحول میں ہوئی (دیکھئے سرکار کا شواجی)۔ تاریخ ہند میں بابر۔ اکبر۔ شواجی۔ رنجیت سنگھ جیسی چند ہی نمایاں ہستیاں ہیں مگر ان میں سے کسی نے بھی اتنی بے سرو سامانی و بیکسی سے اپنی زندگی نہیں شروع کی جتنی کہ فرید عرف شیر شاہ نے کی۔

اوائیل عمر میں فرید حوصلہ مند اور حساس تو تھا ہی۔ فوری جوش میں آکر اس نے اپنے مصیبت آلودہ گھر کو خیرباد کہہ دیا۔ اور اس کی مطلق پروا نہیں کی کہ سہسرام سے باہر کی وسیع دنیا میں اس پر کیا بیتے گی۔ اس طرح سے فرید کا گھر سے نکل کر جونپور جانا اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی جد و جہد کرنا اس کی حاضر دماغی اور اعتماد نفسی کا بین ثبوت ہے۔ خاص کر ایسی حالت میں جبکہ وہ پیسہ پیسہ کو محتاج اور بے یار و مددگار تھا۔ اس کے پٹھانی خون نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ کسی کا دست نگر بنے یا ہاتھ میں کاسہ گدائی لے کر در در پھرے۔ عباس اور مخزن کے اس بیان کی صداقت میں شبہ کرنے کے لیے متعدد قوی وجوہات ہیں کہ فرید جمال خاں سارنگ خانی کے حضور میں گیا اور بعد ازاں میاں حسن نے جمال کو یہ لکھا کہ وہ یا تو لڑکے کو گھر واپس کر دے ورنہ اس کو اپنی ہی سرپرستی میں رہنے دے کیوں کہ وہ فرید کو دین و ادب کی تعلیم دلوانا چاہتا تھا۔ مذکورہ وجوہات کی تفصیل درج ذیل ہے

(۱) عباس نے لکھا ہے "عرصہ دراز تک (جو سلسلہ واقعات کی رو سے ۱۵ سال سے زیادہ ہوتا ہے) حسن نے فرید سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ وہ سرکاری کام سے بار بار جونپور جاتا رہا۔" عباس نے کسی جگہ بھی باپ بیٹے کی

Marfat.com

کہانی میں جمال کا ذکر نہیں کیا۔ جس کے متعلق اس نے لکھا ہے کہ حسن نے اس کو فرید کا ولی و سرپرست بننے کے لیے درخواست کی تھی۔ اگر حقیقتاً جمال کو فرید اور حسن میں دلچسپی ہوتی تو وہ ایک دو سال میں باپ بیٹوں میں سمجھوتہ کرا سکتا تھا۔ کیوں کہ دونوں میں سے ایک بھی خان کی حکم عدولی کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ مگر عباس لکھتا ہے کہ بہت سال بعد حسن کے رشتہ داروں اور افغان بزرگوں نے حسن پر زور ڈالا کہ وہ فرید کو واپس بلا کر سہسرام اور خواص پور ٹانڈہ کی جاگیر کا شقدار مقرر کر دے۔ عباس کے اس بیان میں کہیں کچھ فروگذاشت ہے۔ آپس میں تضاد بھی ہے۔ لہٰذا ناقابل اعتبار ہے۔ عباس نے فرید اور حسن کے باہمی تعلق کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ فطری اصول کے خلاف ہے۔

(۲) جونپور میں فرید کی زندگی کے واقعات (جن کا ذکر ہم آئندہ صفحات میں کریں گے) عباس کے بیان کی صداقت کو ثابت نہیں کرتے کہ وہ کبھی بھی اپنے والد کے محسن جمال خاں سے ملا۔ یا حسنؒ نے اس کو کبھی واپس سہسرام بلانے کی فکر کی۔ یا جونپور میں جا کر اس کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام کیا ہو۔ واقعہ تو یہ ہے کہ فرید اس مصمم ارادہ سے روپوش ہو گیا تھا کہ وہ گوشہ تنہائی میں رہ کر بقول شاعر "پڑیے بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار۔ اور اگر مر جایے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو" جاں بحق تسلیم کر دے گا۔ یا اس دنیائے ناسازگار میں اپنی قوت بازو سے اپنے لیے ایک ممتاز جگہ بنا لےگا تاریخ میں کسی جگہ کوئی ثبوت ایسا نہیں ہے کہ فرید نے اپنی مدد کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا ہو یا جونپور میں اس سے قبل کہ اس نے اپنا گھر بار بنا لیا کسی نے اس کو پہچانا بھی ہو۔ عباس نے یہ لکھا ہے کہ جب حسن نے فرید کو سہسرام واپس بلا کر اپنی جاگیر کے انتظام کے لیے اپنا نائب بنانے کی بات سوچی اس وقت تک فرید کی شہرت بحیثیت ایک مدبر اور منتظم خوب پھیل چکی تھی۔ لیکن عباس نے اس کا ذکر کہیں نہیں کیا کہ فرید کو کب۔ کہاں اور کیسے ان اوصاف کے اظہار کا موقع ملا۔ تاریخی تحقیق کے میدان میں کسی بات پر بلا وجہ یقین کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جو بات عقل اور دلیل سے باہر ہے اس کو تاریخی حقیقت نہیں کہہ سکتے۔

Marfat.com

(۲) افغان مورخین عموماً اور عباس خصوصاً صداقت میں تنگدستی کرنے میں ماہر ہیں۔ اور خاص کر ان واقعات کے متعلق جن سے کہ ان کی قوم کے مشہور شاہکاروں کے کردار پر کوئی دھبہ لگتا ہو۔ بلکہ بلا تنقید اور ادبی چابک دستی کے اپنے بیانوں کو سنوار نکھار سے دیتے ہیں جونپور میں فرید کی زندگی کا زمانہ تو ایک معنی میں تخم ریزی کا زمانہ تھا۔ اس کی آئندہ شہرت و کامرانی کا راز تو بمقابلہ عباس، غیر افغانی مورخوں کی تحریر سے ہی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ چنانچہ رزق اللہ کی واقعات مشتاقی کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس نے ان اوایل رہزنی کے کارناموں کو قلمبند کیا ہے جن کو کہ خود شیر نے قادر شاہ کو سنایا تھا۔ جبکہ وہ ایک قیدی کی حیثیت سے اس کا مہمان تھا[1]

---

[1] جب میں نے سر جادو ناتھ سرکار کے یہاں رہ کر سنہ ۱۹۳۰ء میں اپنی پہلی تصنیف "شیر شاہ" لکھی تھی تو میرے پاس "واقعات مشتاقی" کی کوئی نقل نہیں تھی۔ میں (باقی حاشیہ صفحہ ۶۰ پر)

Marfat.com

باب ۱ کا ضمیمہ اور نوٹ

(۱) افغانستان کے ویدک قبیلے

زمانہ حال میں زمر۔ راٹھہ۔ ہاپکنس وغیرہ کی ہند کے آثار قدیمہ اور ویدک عہد کی تحقیق نے قطعی طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ پختون اسی علاقہ میں رہتے ہیں جس میں کہ انکے مورث اعلیٰ پکتھا قیام پذیر تھے۔ (انکا نام پکتھاج بھی تھا یعنی پکتھاؤں کی اولاد) تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح پکتھاؤں نے سورس کے علاقہ پر قبضہ کیا تھا۔ بعد وہ اس کے بھی جنوب تر علاقہ میں مقیم ہوئے۔ اس کا نام سیبی تھا یہ علاقہ دریائے سندھ کے مغرب میں کوئٹہ سے لے کر ڈیرہ غازی خاں تک

(بقیہ صفحہ ۵۹) نے ایلیٹ کے چند اقتباسات پر جو اس نے "واقعات مشتاقی" سے نقل کیے تھے اعتماد کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایلیٹ نے شیر کی ابتدائی زندگی کے متعلق جو کچھ لکھا تھا اسے محض ایک گپ سمجھ کر نظرانداز کر دیا۔ ممکن ہے میرا یہ رویہ اپنے شاہکار کی پاسداری کی وجہ سے رہا ہو۔ کیونکہ مجھ کو اس کی زندگی کے ابتدائی دور کو ایک رہزن کی شکل میں پیش کرنے سے گریز تھا۔ اگرچہ شیر کے سیاسی نظام کے متعلق میں نے اسی کے بیانات سے خوشہ چینی کی ہے۔ جہاں تک کہ صدق بیانی کا تعلق ہے میں اپنے معروف معتقدین کی طرح ہی عباس سے چپکا رہا۔ لیکن تاریخی صداقت کا لحاظ کر کے (اگرچہ عربی مورخین کا یہ قول ہے:" واللہ اعلم بالصواب" اور غالباً یہ ہی صرف ایک ایسی سچائی ہے جو کہ ایک مورخ کی زندگی کے آخری دور میں منکشف ہوتی ہے) مجھے اپنی رائے بدلنا پڑی اور بلا رورعایت پرانی عمارت کے ڈھانچے کو مسمار کرنا پڑا۔ اگرچہ بڑے بڑے عالموں کو بھی اس پر انگلی اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ (باب اول کے نوٹ اور ضمیمہ دیکھیے گا)۔

Marfat.com

ایک خط حدی کے جنوب میں واقع ہے۔ پکتھا علاقہ میں رگ ویدی دریا موجزن تھے۔ جیسے کہ کوبھا (کابل) سووستھو (سوات) کرُمو (کرّم) اور گومتی (گومل) یہ سب دریا سندھ میں گرتے تھے۔ یہ آج بھی اسی طرح پختونوں کے علاقہ میں بہتے ہیں۔ پختون تو اپنے پرانے وطن سے وابستہ رہے مگران کے برادر یعنی کشتر یہ قبائل وسطی ملک یعنی پنجاب اور گنگا کی گھاٹی کو ہجرت کر گئے اور وہاں بھارتوں کی ماتحتی میں رہنے لگے۔ رگ وید میں پختونوں کا تین مقام پر حوالہ ملتا ہے کہ وہ ویدک صدقہ کیا کرتے تھے آسونی یعنی جوزہ کے معتقد تھے اور زمانہ سلف میں سندھ پار سے آئے تھے وہ دوسرے کشتر یہ قبیلوں سے کندھا ملا کر ہندوستان کے میدان میں ترستو قوم کے راجہ سوداس سے جنگ آزما ہوئے۔ اس لڑائی کا نام "دس راجاؤں کی جنگ" ہے تاریخ کا یہ نہایت ہی پر اثر واقعہ ہے کہ بھارتوں کا قبایل تو ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ شیروشکر ہو گیا اور اس کی امتیازی خصوصیت بھی ختم ہو گئی۔ صرف برآعظم کے بھارت ورش نام میں ان کا نام باقی رہ گیا مگر پکتھا . . . ہم سال تک گوشہ تنہائی میں اپنی شخصیت کو بچائے رہا۔ اس کی خاص وجہ ہے اس کی قوت حیات جو کہ اس کی اولاد میں بمقابلہ اس کے ہندوستانی میدان کے برادروں کی اولاد کے بدرجہا زیادہ ہے۔

(۲) گومل ندی

عباس سروانی کی تاریخ میں (جلد ۳۔ پبلک لائبریری لاہور کی نقل صفحہ ۱۲۔ اور علی گڑھ یونیورسٹی کی نقل) اس مقام کا نام سرگری دیا ہوا ہے۔ جو "برکنار کمال پور" واقع تھا۔ اس تاریخ میں گومل ندی کا کہیں ذکر نہیں۔ اس سلسلہ میں نہ تو کمال پور کا کوئی مفہوم آتا ہے اور نہ صحیح ہی معلوم پڑتا ہے۔ موجودہ اٹیلسوں میں کمال پور نام کا آس پاس میں کوئی مقام نہیں ہے۔ اور نہ اس نام کا کوئی دریا ہے۔ لفظ کنار کسی دریا کے وجود پر ہی دلالت کرتا ہے اور سرگری جس کو کہ میں نے سرگورگاتی تسلیم کر لیا ہے کہ قریب تر تو شہور

Marfat.com

دریا گومل ہی ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ کاتب سہواً گومل کو کمال پور لکھ گیا ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ان نکیوں پر غور نہیں کیا اور کمال پور کو درست مان لیا۔ مزید براں انہوں نے سرگری کو پیشاور کے نزدیک بتایا ہے۔ جب کہ دراصل یہ مقام غزنی کے نزدیک ہے جیسا کہ نقشہ پر ایک نظر ڈالنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے (لائف اینڈ ٹائمس آف ہمایوں۔ اورنٹ لونگ مین۔ صفحہ ۹۶۔ فٹ نوٹ)۔

(۳) مخزن کا قلمی نسخہ۔ الف ۴۔ ۲۔ بی۔

مخزن اس جگہ پر شیر خیل کا حوالہ نہیں دیتا۔ یہ اکبر نامہ (صفحہ ۳۲۶) سے لیا گیا ہے جو کہ مخزن میں دوسری جگہ دیتے ہوئے افغان کے شجروں کے مطابق ہے۔ (ڈارن ۲۔ صفحہ ۵۰)۔ داؤد خیل کا صحیح نام داؤد شاہ خیل ہے جس سے مہابت خاں سوری کا تعلق ہے۔

(۴) ابراہیم نے تقریباً ۱۴۵۸ء میں اپنا وطن چھوڑا

ایک مصنف کا یہ خیال ہے کہ میری تصنیف مسمی شیر شاہ میں جو واقعات اور واقعات کی غلطیاں ہیں اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میں اس غلط مفروضہ سے چلا کہ ابراہیم سور بہلول لودی کے عہد کے آخری دور میں ہندوستان آیا۔ اس مصنف کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس نے ہندوستان اور انگلینڈ میں عباس اور نعمت اللہ (مصنف مخزن) کے متعدد قلمی نسخے پڑھے ہیں جو کہ میری نظر سے نہیں گزرے۔ اپنے استاد کی بنا پر مصنف کا یہ بیان ہے کہ ابراہیم سلطان بہلول لودی کے دعوت نامہ پر ہندوستان آیا تھا۔ یہ دعوت نامہ اس کو بہلول لودی کی تخت نشینی کے ایک سال کے اندر ملا تھا۔ (ڈاکٹر پی۔ سرن۔ پی۔ ایچ ڈی۔ اسٹڈیز ان میڈیول ہسٹری صفحہ ۲۰۶)

اگر ڈاکٹر سرن کے اس بیان کو صحیح مان لیا جائے کہ ابراہیم سلطان بہلول لودی کے دعوت نامہ پر جو اس نے روہ کے جملہ افغانوں کو بھیجا تھا اس کی حکومت کے آغاز میں ہندوستان آیا تو سلسلۂ واقعات حسب ذیل ہوگا۔

Marfat.com

(۱) کہ ابراہیم تقریباً ۱۴۵۳ء میں ہندوستان آیا (سلطان بہلول لودی کی تاجپوشی ۱۴۵۲ء میں ہوئی تھی)۔

(۲) کہ ابراہیم (جس کی وفات ۱۴۸۸ء یا اس کے قریب سلطان کی موت سے چند ماہ پیشتر ہی ہوئی تھی) بہلول کے مسلم عہد حکومت کے دوران ۴۰ سپاہیوں کے ایک ادنیٰ سردار اور نارنول کی بنجر سرحد پر چند گاؤں کی جاگیرداری سے زیادہ ترقی نہ کرسکا۔ کیا ہندوستان میں اس کی ۳۵ سالہ خدمات کا یہی صلہ تھا۔؟

(۳) اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ابراہیم کا لڑکا حسن ۱۴۵۳ء میں ۲۵ سال کا تھا کیوں کہ اس کے بعد ہی اس کی شادی ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ۶۴ سال کی خدمت کے بعد تقریباً ۱۰ سال کی عمر میں وہ ۵۰۰ سواروں کے منصب تک پہونچ سکا۔ علاوہ بریں اس حساب کے بموجب حسن جس کی وفات ۱۵۲۶ء کی جنگ پانی پت سے ایک سال قبل ہوئی ۹۹ سال کی عمر میں سلیمان کی والدہ کے دام عشق میں گرفتار و بیقرار تھا۔ اور لطف یہ کہ اس خاتون کی عمر اس وقت تقریباً ۲۰ سال کے ہوگی۔ کیا یہ بات قرین قیاس ہو سکتی ہے؟

بہلول کی فیاضی اور رحمدلی کا کیا اچھا ثبوت پیش کیا گیا ہے؛ اس نے سادہ لوح افغان مہاجرین کے ساتھ اپنے وعدہ کو کتنی دیانتداری سے نبھایا؛ بہلول نے میاں حسن کی قابلیت کی جس کا اعتراف ابوالفضل جیسے مخالف مورخ نے بھی کیا ہے کیسی قدر دانی کی؟۔

مجھ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ میں نے واقعات کو ان کے سلسلہ سے علیحدہ کر کے ان کی تشریح کر دی ہے۔ کاش کہ عالم ناقد نے کم پڑھا ہوتا۔ اور چند قلمی نسخوں کے مضامین اور مطالب کی جانب اپنا خیال زیادہ مبذول کیا ہوتا۔ اس کے متعلق ہمارے قدیم ترین مستند مصنف کا یہ بیان ہے "در عہد دولت سلطان بہلول جد شیرخاں ابراہیم نام" یعنی سلطان بہلول کے عہد سلطنت میں شیرخاں کا جد مسمی ابراہیم (پنجاب یونیورسٹی اور علی گڑھ کے نسخوں میں یکساں عبارت ہے)۔ ڈاکٹر سرن نے ان فارسی الفاظ کا یہ ترجمہ کیا: "یہ واقعہ سلطان بہلول کی فیاضی کے عصر کا تھا" (خط کشیدہ الفاظ میرے ہیں)۔ اس

Marfat.com

لئے جائے تعجب نہیں کہ انہوں نے جدت طبع کا دعوئی کیا ہے۔ فی زمانہ فارسی زبان ہندوستان میں ایک یتیم کے مانند ہو گئی ہے۔ اس زبان کے معدودے چند ماہرین کو ہی فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ کیا یہ فقرہ ڈاکٹر سرن کی دلیل کا شاہد ہے۔ ڈاکٹر سرن کے سبک محل کو بے محابا درہم برہم کرنا تقاضائے دوستی سے بہت دور ہوگا۔

(۵) جالندھر کے دوآب میں بجواڑہ کا جائے وقوع

میں نے لکھا کہ "وہ بجواڑہ آیا" (یہ جلندھر دوآب میں ہے) یہ ایلیٹ کے ترجمہ کی بجنسہ نقل تھی۔ عباس کے نسخہ میں اس مقام کا نام ہے نہواڑہ۔ یہ صریحاً غلط تھا۔ ایلیٹ نے اس کو "بجواڑہ" صحیح ہی پڑھا۔ ۳۵ سال قبل میں ایک طفل نو آموز ہی تھا۔ چنانچہ میں نے یہ خیال کیا کہ ایلیٹ کے "جالندھر دوآب" الفاظ جو کہ بریکٹوں کے اندر لکھے ہیں۔ اس کی بنیاد کوئی ایسا نسخہ ہوگا جو کہ انہوں نے دیکھا ہوگا۔ مگر اب مجھے یہ صاف ہو گیا ہے کہ جو بات بجواڑہ کے جائے وقوع کی آئین اکبری کی رو سے صحت کے متعلق تشریحی نوٹ میں لکھنی چاہتے تھے اس کو ایلیٹ نے اصل عبارت کا ترجمہ کرتے وقت بریکٹوں میں لکھ دیا۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے اس عبارت کے اس ٹکڑے نے گمراہ کر دیا۔ چنانچہ میں اس کو اب کلیتاً رد کرتا ہوں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ بجواڑہ جالندھر دوآب والے بجواڑہ کے مماثل نہیں تو اس کا جائے وقوع کہاں ہے۔؟ اس راز کو حل کرنے کے لیے ہم کو مہابت خاں سوری کے پرگنوں کی چھان بین کرنا ہوگی کیوں کہ ایسا بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ہی ابراہیم کو نوکری کے بالعوض بجواڑہ دیا تھا۔ (عباس کا نسخہ) ہمارے نسخہ میں جو برہنا اور رتھ کا نام پڑھنے میں آتے ہیں ان سے صحیح پتہ پانا غیر ممکن ہے کیوں کہ پرگنوں کے نام خلط ملط ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے مہابت خاں سوری سے متعلق جو پرگنے گنائے ہیں ان کے نام ہیں پنجاب میں واقع ہریانہ اور اور باہ کلا۔ (دی لائف اینڈ ٹائمس آف ہمایوں صفحہ ۹۵)۔ شاید انہوں نے ڈاکٹر سرن (اسٹڈیز ان میڈیول ہسٹری صفحہ ۳۶) کے یقین کی بنا پر ہی ایسا لکھ دیا ہے۔ بہرحال ہریانہ صداقت کے قریب تر ہے مگر ہریانہ کوئی پرگنہ نہیں ہے وہ تو

Marfat.com

ایک علاقہ ہے جس میں شامل ہیں رو ہتک حصار اور ہانسی کے اضلاع مخزن کے کچھ نسخوں میں مہابت خاں کے متعلق یہ لکھا ہوا ملتا ہے کہ اس کی جاگیر ہریانہ میں تھی۔ اس کے علاوہ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ مخزن کے مصنف نے عباس کی ان تفصیلات کو عموماً نظر انداز کیا ہے اور اس کا ایسا کرنا حق بجانب بھی ہے۔

پروفیسر ہودی والا کی رائے کے مطابق ہریانہ اور بجواڑہ ہوشیار پور ضلع میں ہیں ان کا خیال ہے کہ باہ کلا بیگوال کا دوسرا نام ہو سکتا ہے جو ریاست کپور تھلہ میں ہے (دیکھئے اسٹڈیز صفحہ ۴۴۴ - ۴۴۵) مگر مندرجہ ذیل وجوہات کی وجہ سے یہ بیان قابل تسلیم نہیں۔

(۱) مہابت خاں سوری کے پرگنے سلطان بہلول کے گورنر جمال خاں سارنگ خانی کے حدود اختیار میں ہونے چاہئیں۔ یہ حدود ہوشیار پور اور کپورتھلہ تک نہیں تھے۔

(۲) عباس کے مسودہ میں پرگنوں کے نام "باہ کلا" اور تہکا درج ہیں۔ جو ابیٹ کے مقابلہ میں زیادہ درست ہیں۔ یہ پرگنے آئین اکبری میں سرکار حصار کی حد میں ہونے چاہئیں۔ فی الحال باہ کلا کو "بروالا" سمجھا جا سکتا ہے۔ جو حصار سے ۱۹ میل بجانب شمال واقع ہے اور تہکا "توہانہ" ہو سکتا ہے۔ جو سرکار حصار کا ایک پرگنہ ہے۔

Marfat.com

ضمیمہ 2

شیر شاہ کی تاریخ ولادت وجائے پیدائش

میری پہلی کتاب "شیر شاہ" کو شائع ہوئے آج ۲۹ سال گذر چکے ہیں۔ اس عرصہ دراز میں میرے سامنے کوئی ایسا تاریخی مواد نہیں آیا۔ جس کا کہ مجھے پہلے علم نہ تھا۔ یا جو شیر شاہ کی تاریخ ولادت مقرر کرنے میں از سر نو میری مدد کرتا۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ میں اس تاریخ میں کوئی ردو بدل کروں۔

عباس خاں سروانی کے اس بیان نے کہ شیر خاں بہادل کے عہد حکومت میں پیدا ہوا (در وقت بہادل۔ عباس قلمی نسخہ صفحہ ۱۲) محققوں کو پوری آزادی دیدی ہے کہ وہ شیر شاہ کی تاریخ ولادت ۱۴۵۲ء اور ۱۴۸۹ء کے درمیان کہیں بھی مقرر کر دیں۔ میری تصنیف کا پہلا ایڈیشن شائع ہونے کے بعد سے آج تک کئی قابل مورخ اس غلطی کا شکار ہو چکے ہیں۔ میرے قابل دوست ڈاکٹر پی سرن دہلی یونیورسٹی کو یہ اعزاز یا رسوائی حاصل ہے کہ انہوں نے ایک نقشہ کی مدد سے شیر شاہ کی تاریخ پیدائش کا یقینی طور پر پتہ لگا لیا ہے۔ اس شجرہ یا چارٹ میں مہابھارت کے زمانہ سے لے کر ملکہ وکٹوریہ کے عہد تک اندر پرستھ یعنی دہلی کے تمام حکمرانوں کی تاریخ پیدائش۔ تاجپوشی و وفات درج ہیں۔ (دیکھئے اسٹڈیز ان میڈیول انڈیا۔ صفحہ ۴۶) تاریخ کی یہ نایاب کتاب مسمی "نقش جام جم" دہلی کے ایک مشہور آزاد منش صوفی جام جم کی تصنیف ہے جو اس نے دہلی کی پرانی تاریخ و آثار قدیمہ کی تلاش کے سلسلے میں ۱۸۳۹ء میں لکھی تھی۔ ڈاکٹر سرن نے بڑی ہی معصومیت سے یہ بیان کیا ہے کہ اس کتاب میں یدھشٹر سے لے کر ملکہ وکٹوریہ تک کے حکمرانوں کی جو تاریخ پیدائش تخت نشینی اور وفات کے حالات درج ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر بعد تحقیق درست معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس بیان سے ہندوستانی علما کی بیحد ذلت ہوتی ہے۔ پھر بھی ڈاکٹر موصوف اپنی تفتیش کے

Marfat.com

کلیتاً قائل ہیں۔ اور اس بنا پر کہ علی گڑھ کے سر سید احمد نے بھی قرون وسطیٰ کے فن تعمیر پر لکھی اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں اس تاریخ کو صحیح تسلیم کیا ہے۔ اس کے باوجود بھی دونوں عالموں کی تاریخ میں ایک سال کا فرق ہے۔ بہر حال ڈاکٹر سرن اپنی تاریخ کی اس نایاب تحقیق سے چپکے ہوئے ہیں۔ اور وہ اس تاریخ کو یعنی ماہ رجب ۸۸۶ھ ہجری کو شیر شاہ کی تاریخ پیدائش تصور کرتے ہیں۔ اس تاریخ کی رو سے شیر شاہ بابر سے دس سال بڑا ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر سرن کو اول بار کب اس تاریخ کا الہام ہوا (دیکھیے جرنل آف بہار اینڈ اوڑیسہ ریسرچ سوسائٹی جلد ۲۰ صفحہ ۱۰۸ سے ۱۲۲) اس کا تو وہ قطعاً کہیں ذکر ہی نہیں کرتے مبادا کہ وہ اس جدت کے اعزاز سے کہیں محروم رہ جائیں۔ (حالاں کہ مسز بیورج کے "ہمایوں نامہ" کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت کے بعد اس تاریخ کا سب کو علم ہو چکا تھا۔) اس کتاب میں شیر شاہ کی ایک خیالی شبیہ بھی موجود ہے جس کے کہ اوپری حاشیہ پر تاریخ ولادت کی جگہ رجب ۸۸۶ھ ہجری درج ہے۔ غالباً یہ تاریخ "نقش جام جم" سے لی گئی ہوگی۔ بعد میں ڈاکٹر سرن نے اپنی اس غلطی کی تلافی کر لی اور اپنی اس تحقیق کو مستند بنانے کے لیے اپنی تصنیف "اسٹڈیز ان میڈیول انڈیا" کے صفحہ ۴۰-۴۱ پر "ہمایوں نامہ" کی تصویر کے حاشیہ پر تاریخ مندرجہ کا حوالہ دیدیا۔

ایک ناتجربہ کار نوآموز مصنف کے لیے اس قسم کی غلطی نہایت ہی مہلک ہوتی ہے۔ مگر ۱۹۲۰ء میں سر جادو ناتھ سرکار کے ایک اشارے سے میں اس غلطی کا شکار ہونے سے بال بال بچ گیا۔ اس خیالی شبیہ پر جو الفاظ تحریر تھے یعنی نمبر شمار (انگریزی میں عدد شمار) جس کا کہ مطلب ہے کہ اس شبیہ کی تاریخ ساخت اور تاریخ پیدائش کا فرضی اندراج۔ اس کا اولین شکار ہوئے۔ ڈاکٹر سرن۔ اس وقت بھی سر جادو ناتھ سرکار کے کتب خانہ میں سر سید احمد کی آثار الصنادید اور نقش جام جم میں مندرجہ تاریخ میری نظر کے سامنے تھی مگر جب سر جادو ناتھ سرکار نے مسز بیورج کی کتاب میں دی ہوئی شبیہ کے متعلق مجھے آگاہ کر دیا تب مجھ کو ان مورخوں کی شیر کی ولادت کے متعلق تاریخ

Marfat.com

کی صحت بیانی پر اعتبار کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہ گئی۔

مگر ڈاکٹر سرن نے متعدد عالموں کو اس گرداب میں غرقاب ہونے کو مجبور کیا۔ جن میں سے ایک میرے مرحوم دوست ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنرجی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ لندن۔ مصنف "ہمایون بادشاہ (اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۴۱ء) تھے غالباً انہوں نے ڈاکٹر سرن کو سند مان کر یہ لکھدیا کہ فرید ۱۴۷۲ء میں پیدا ہوا۔ (ہمایوں بادشاہ۔ جلد۔ ۱۔ صفحہ ۱۷۹)۔ حالانکہ میرے دوست نے اس نام کا کہیں اعتراف نہیں کیا۔ ڈاکٹر بنرجی نے شیر شاہ کی زندگی کے واقعات کو سلسلہ وار لکھا ہے۔ جو بظاہر درست ہیں (ہمایوں بادشاہ۔ صفحہ ۱۹۳)۔ ہم ڈاکٹر صاحب کی اس تصنیف کے متعلق کچھ کہنے سے معذور ہیں۔ کیوں کہ میرے مرحوم دوست اب ہم سے اتنی دور ہیں جہاں سے وہ ہمارے اعتراضات اور تنقید کا جواب نہیں دے سکتے۔

قبل اس کے کہ میں ڈاکٹر سرن کی اس جدت طبع کے متعلق کچھ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ہماری عزت بچائی۔ یوں تو ڈاکٹر سرن کی اس تحقیق میں کوئی جان نہ تھی۔ کیون کہ ان کے تاریخی تحقیق کے اصول نادر و نایاب ہیں پھر بھی ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے لکھا ہے۔ یہ دونوں کتابیں آثار الصنادید اور نقش جام جم زمانہ مابعد کی تصانیف ہیں لہذا ان پر کوئی زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ (دی لائف اینڈ ٹائمس آف ہمایوں۔ صفحہ ۹۶۔ فٹ نوٹس)۔ چنانچہ جب تک ڈاکٹر سرن کی تائید میں شیر شاہ کا زائچہ نہ مل جائے ہم شیر کی تاریخ پیدائش ۱۴۸۶ء ہی مانتے رہیں گے۔

اب ہم شیر کے متعلق دوسرے سوال پر یعنی ان کی جائے پیدائش کہاں ہے غور کریں گے۔ میں نے اپنی تصنیف میں اس مسئلہ کی کافی وضاحت کردی ہے کہ میں شیر کی جائے پیدائش حصار فیروزہ کے بجائے نارنول کیوں تسلیم کرتا ہوں۔ تاریخی تنقید کے اصول میری پہلی رائے کے خلاف دلالت کرتے ہیں شروع شروع میں میں افغان مورخین سے مرعوب تھا۔ اور انہوں نے جو کچھ شیر کی ابتدائی زندگی کے متعلق لکھا تھا۔ اس کو حرف بحرف تسلیم کرلیا

Marfat.com

برعکس اس کے میں ابوالفضل کو ناقابل اعتبار سمجھتا تھا۔ مگر اب میرے پاس اس قسم کے ثبوت موجود ہیں کہ ابوالفضل کے زمانہ میں شیر کے متعلق عباس کے علاوہ دیگر تاریخی ذرائع بھی موجود تھے۔ اس لیے ابوالفضل کے ہر بیان کو ناپ تول کر کے مان لینا چاہیئے۔ اگرچہ ہر معاملہ میں وہ ہمارا قطعی رہبر نہیں ہوسکتا ہے۔

یہاں بھی ڈاکٹر سرن نے حسب معمول اپنی جدت سے کام لیا ہے میرے خلاف ان کی فرد الزام یہ ہے۔

(۱) یہ کہ میں نے اس حصے پر مخزن کے اقتباسات کو صحیح الفاظ میں پیش نہیں کیا۔ اصل اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔

"پدر حسن ابراہیم نام از ولایت روہ بہندوستان آمدہ نوکری امرا سلطان بہلول می کرد۔ چند گاہ در حصار فیروزہ بود و فرید در انجا متولد شدہ و چند گاہ در نارنول بود" قلمی نسخہ کپور تھلہ اسٹیٹ لائبریری الف ۴۰۲-بی۔

بعینہ یہی عبارت مخزن کے اس قلمی نسخہ میں ہے جو ابھی حال میں لکھنؤ یونیورسٹی نے ٹیگور لائبریری کے لیے خریدا ہے مخزن کی اس عبارت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ حسن کچھ مدت کے لیے حصار فیروزہ میں رہا اور وہیں فرید پیدا ہوا۔

ڈاکٹر سرن نے انڈیا آفس لائبریری کی مخزن کی ایک جلد سے مندرجہ ذیل اقتباس لیا ہے۔

"پدر حسن.... می کرد (یہاں تک یہ عبارت بجنسہ وہی ہے جو میں نے کپورتھلہ اسٹیٹ لائبریری کی مخزن کی جلد سے نقل کی ہے)..... چند گاہ در حصار فیروزہ متولد شد، و چند گاہ در نارنول... (خالی جگہ ڈاکٹر موصوف نے خود چھوڑ دی ہے)۔

میرے اور ڈاکٹر موصوف کے اقتباس میں مندرجہ ذیل فرق ہے۔

(۱) انڈیا آفس کی مخزن کی جلد میں حصار فیروزہ کے بعد لفظ "بود" نہیں ہے جبکہ کپورتھلہ اسٹیٹ لائبریری کی جلد میں یہ لفظ موجود ہے۔

Marfat.com

(۲) انڈیا آفس کی مخزن کی جلد کی اس عبارت "چند گاہ در حصار فیروز متولد شد" کا مفہوم ہے کہ کچھ وقت تک حصار فیروز میں پیدا ہوا۔ یہ مفہوم اگر فاتر العقلی کا ثبوت نہیں ہے تو کم از کم فارسی انشا کی رو سے غلط ضرور ہے۔

ان الفاظ پر رائے زنی کرتے ہوئے ڈاکٹر سرن فرماتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص کچھ وقت تک حصار فیروز میں پیدا ہوا ہو اور کچھ وقت تک نارنول میں (اسٹڈیز ان میڈیول ہسٹری صفحہ ۴۲)

تاریخی تنقید کا صحیح اصول یہ ہے کہ جب کسی تصنیف کے کسی نسخہ کی عبارت ناقص معلوم ہو تو اس کی اصلاح کسی دوسرے قلمی نسخہ سے مطابقت کر کے کر لینی چاہیے نہ کہ اس کو کتابت کی غلطی قرار دے کر اس میں حسب مرضی الفاظ کو توڑ مروڑ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یا تو ڈاکٹر سرن کو انڈیا آفس کے مخزن کے نسخہ کے علاوہ کوئی دوسرا نسخہ دستیاب نہ تھا یا وہ زبان دانی انشاء کے تنقیدی اصول سے بے بہرہ ہیں جیسا کہ اس عبارت پر ان کی طبع آزمائی سے پتہ چلتا ہے۔ اب میں اس بات کا فیصلہ علماء کی رائے پر ہی چھوڑتا ہوں کہ کیا تاریخ میں اس قسم کے ثبوت نہیں ہیں کہ شیر بمقام حصار پیدا ہوا۔ (وہی صفحہ ۳۹)۔

اب ہم فرید کے متعلق ڈاکٹر سرن کی رائے کی جانب اپنا خیال مبذول کرتے ہیں۔ عباس اور مخزن دونوں ہی اس بات کے شاہد ہیں کہ فرید کی پیدائش اس کے جد امجد (دادا) کے نارنول کے تبادلہ سے پیشتر اس وقت ہوئی جب کہ وہ بجواڑہ میں مقیم تھے۔ علماء کے غور کرنے کے لیے ہم اس ضمن میں مندرجہ ذیل اقتباس پیش کرتے ہیں۔

"جد شیر خاں ... پیش ماتھی خاں (صحیح مہابت خاں بقول ایلیٹ) سور داؤد شاہ خیل کہ در جاگیر او سلطان بہلول پرگنہ ہریانہ و تکہا عنایت نمودہ بود۔ خدمت او اختیار در شہوارہ (صحیح بجواڑہ) سکونت ساخت شیر خاں در وقت بہلول متولد شدہ نام او فرید نہادند بعد از موت ابراہیم از ماتھی خاں (مہابت خاں) رخصت شدہ پیش جمال خاں سارنگ خانی در حصار فیروزہ آمدہ ملازم شد" (عباس نسخہ صفحہ ۱۲)۔

Marfat.com

عبارت بالامیں اختیار کے بعد فعل کردہ "صریحاً چھوٹا ہوا معلوم ہوتا ہے اس لفظ کو جوڑ دینے کے بعد عبارت کا ترجمہ اس طرح ہوگا۔

"شیرخاں کا دادا داؤد شاہو خیل مہابت خاں سوری کے پاس آیا۔ جس کو سلطان بہلول نے بجواڑہ اور تاکھا کے پرگنے جاگیر میں دیئے تھے۔ مہابت خاں کی ملازمت اختیار کی اور بجواڑہ میں سکونت پذیر ہوا۔ شیرخاں بہلول کے عہد میں پیدا ہوا اور اس کا نام فرید رکھا گیا۔ کچھ مدت کے بعد ابراہیم مہابت خاں سے رخصت ہو کر جمال خاں سارنگ خانی کی خدمت میں حصار فیروزہ کے مقام حاضر ہوا۔ اور اس نے وہیں ملازمت کرلی"۔

عبارت کو غور سے پڑھنے کے بعد کوئی شخص "در وقت بہلول متولد شدہ" کا مطلب یہ نہیں نکال سکتا کہ فرید بجواڑہ میں پیدا ہوا۔ اگر عباس کا مفہوم اس جملہ سے یہ ہوتا تو وہ "متولد شدہ" الفاظ سے پیشتر "در آنجا" ضرور لکھتا۔ ظاہر ہے کہ عباس کو فرید کی جائے پیدائش کا صحیح علم نہیں تھا۔ وہ صرف یہ ہی جانتا تھا کہ وہ بہلول کے عہد حکومت میں پیدا ہوا تھا۔ واقعات کے سلسلہ میں اس عبارت میں یہ جملہ بے معنی معلوم ہوتا ہے اور جب تک ہمیں مخزن کے کسی دوسرے نسخہ میں "در آنجا" الفاظ نہ ملیں ہم ان الفاظ کو اس جملہ میں جوڑ کر از خود ترمیم نہیں کرسکتے۔ عباس کا کوئی دوسرا نسخہ فی الحال دستیاب نہیں اور ڈاکٹر سرن اس متعلق بہ ضد ہیں کہ "بجواڑہ" کو شیر کی جائے پیدائش مان لیا جائے۔

مخزن کی اصل عبارت جس کی نقل ہم اس سے پیشتر بھی کر چکے ہیں یہ ہے۔

"پدر حسن .... نوکری امرا سلطان بہلول می کرد و چندگاہ در حصار فیروزہ بود فرید در آنجا متولد شدہ و چندگاہ در نارنول بود"

اس عبارت کا مفہوم ہے کہ حسن کے والد نے سلطان بہلول لودی کے ایک امرا کے یہاں ملازمت کی۔ وہ کچھ روز تک حصار فیروزہ میں رہا۔ وہیں فرید پیدا ہوا اور وہ کچھ دن نارنول میں رہا۔

Marfat.com

لیکن اس نے ابراہیم شاہ کی مسجد کا (جسے اب خالص مخلص مسجد کہتے ہیں) مشرقی دروازہ زمین دوز کر دیا۔ اور بی بی راضی کے لال دروازہ کو مکمل طور سے نیست و نابود کر دیا۔ صرف اس کا عبادت خانہ ہی باقی رہ گیا۔ اس نے فیروز تغلق کی یاد کا احترام کرتے ہوئے اٹالوی مسجد کو کوئی ضرر نہیں پہنچایا کیوں کہ اس مسجد کی بنیاد اس نیک خصلت بادشاہ نے رکھی تھی۔ جب پٹھان کے غیظ و غضب کا شکار شہر کی سب سے بڑی مسجد "جامع الشرق" ہونے لگی تو شہر کے عالموں اور ملاؤں کا ایک وفد سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس سے مودبانہ درخواست کی کہ وہ بحیثیت ایک مسلمان کے مسجدوں کو مسمار کرنے کے ناپاک ارادہ کو ترک کر دے۔ سلطان اس درخواست سے متاثر ہوا اور اس نے "جامع الشرق" کے محض صدر دروازہ کو گرا کر ہی قناعت کر لی (دیکھئے خیرالدین الہ آبادی کا جونپور نامہ)۔

ہم مشرق کے رہنے والے اصول قضا و قدر کے معتقد ہیں۔ ہمارا مقولہ ہے "خدا کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں"۔ ایک نہ ایک دن انسان کو اپنے فعل کا ثمرہ ضرور ملتا ہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ شرقی سلطان اور ان کے خوبصورت شہر پر جو کچھ گزری وہ ان کے افعال کی جائز سزا تھی۔ اور اللہ پاک کی مرضی تھی۔ سکندر اس مرضی کی تکمیل کا محض ایک ذریعہ تھا۔ نادر کے حملہ کے وقت یہ جملہ ؎

"شامت اعمال ما صورت نادر گرفت"

شرقی سلطانوں کے حسب حال ہے۔ محض نادر کی جگہ سکندر لکھنے کی ضرورت ہے جونپور کی بدقسمتی اس کے حکمرانوں کی ایک صدی پرانے مذہبی تعصب کا ثمرہ تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس پر یہ بلا اس لیے بھی نازل ہوئی کہ وہاں سید محمد جونپوری جیسے عالم لیکن پاگل شخص نے ایک رجعت پسند تحریک چلائی اس تحریک کا آغاز ایک ایسے نازک دور میں ہوا جب حسین شاہ شرقی بہلول لودی کے خلاف اپنے تحفظ کے لیے جنگ آزما ہو رہا تھا۔ سلطان حسین شاہ سید محمد کے اثر میں آگیا۔ سید ایک عالم مگر گمراہ عابد و زاہد مسلمان تھا۔ اس

Marfat.com

میں مذہبی تعصب بدرجہ جنون تھا۔ اس کی جسمانی قوت حیرت انگیز تھی وہ فن خطابت و تقریر کا ماہر تھا۔ سید محمد نے سلطان حسین کے قدیم وفادار دوست چونند کے راجہ دلپت راؤ کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسلام کسی کافر سے دوستی کی اجازت نہیں دیتا اور نہ کوئی مسلمان شریعت کی رو سے اس بات کا پابند ہے کہ کافر کو دیا ہوا وعدہ پورا کرے۔ اس نے شرقی سلطان کو بلاوجہ دلپت راؤ کے خلاف فوج کشی پر آمادہ کر لیا۔ اور سادہ لوح مسلمانوں کو متاثر کرنے کے لیے اس جنگ میں بڑی دلیری دکھائی اور دلپت راؤ کا سر قلم کر کے اپنے مہدی ہونے کا دوبارہ اعلان کیا۔ چند سال بعد فاتح افغان فوج جونپور میں داخل ہوئی تو سلطان اور سید مہدی دونوں ہی روپوش ہو گئے۔ اس کے بعد مہدی نے کبھی بھی اپنی شکل جونپور میں نہ دکھائی مگر مہدی تحریک سید مہدی کے راہ فرار میں متواتر زور پکڑتی گئی۔ اور شیر شاہ کے عہد میں کمیونسٹ طرز کی اس رجعت پسند تحریک نے افغانوں کی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا۔

یہ تھی جونپور کی سیاسی، مذہبی اور تمدنی فضا جس کا کہ اثر نوجوان فرید پر ہونا لازمی تھا۔ کیوں کہ وہ اس وقت کچی عمر کا تھا

اگرچہ جونپور کی خوشحالی زوال پذیر ہو رہی تھی تاہم ہنوز وہ اسلامی علم و سخن کا بنارس تھا۔ اور تلاش علم کے خانہ بدوشوں کا مسکن زمانہ قدیم کے بغداد اور قرطبہ کے مدارس کی طرح یہاں کے مکتبوں اور مدارس کی مالی حالت نہایت اچھی تھی۔ کیوں کہ ان میں جائدادیں اور زمین وقف تھیں۔ طالب علموں کو بود و باش اور کھانا مفت ملتا تھا۔ یہاں اسلامی دنیا کے ہر گوشے سے طلبا تحصیل علم کے لیے آتے تھے۔ داخلہ کے وقت نہ تو ان کے حسب و نسب کے متعلق کوئی بات پوچھی جاتی تھی نہ ان کی گذشتہ تعلیم اور واقعات زندگی کا خیال کیا جاتا تھا۔ پھر بھی کوئی طالب علم سوسائٹی کی اس خدا داد خیرات کا بیجا استعمال نہیں کرتا تھا۔ طلبا کو اپنی محنت سے فائدہ اٹھانے کی پوری آزادی تھی۔ اسلام میں ایک طالب علم کو آغاز زندگی سے ہی توقیر د

Marfat.com

احترام حاصل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ نے حصول علم پر بہت زور دیا تھا۔ حتیٰ کہ تلاش علم میں دور دراز ملک چین تک سفر کرنے کی اجازت دی تھی۔

چوں کہ فرید کی عمر ایسی نہ تھی کہ وہ پیشہ سپاہگری اختیار کرتا اس لیے ایک باعزت زندگی بسر کرنے کے لیے اس کے سامنے کوئی دوسرا چارہ نہ تھا۔ بجز اس کے کہ وہ کسی مدرسہ میں اپنا داخلہ کرائے۔ جہاں اس کی روزانہ ضروریات زندگی پوری ہو سکیں۔ کسی مستند ذریعہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ فرید نے کس مدرسہ میں تعلیم حاصل کی اور کس قابل استاد کے زیر اہتمام اس کی تعلیم ہوئی۔ البتہ عباس نے اس کی قابلیت کی خوب داد دی ہے۔ اور ان مضامین و کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کا کہ اس دوران فرید نے مطالعہ کیا۔ وہ لکھتا ہے "فرید عربی ادب کے مطالعہ میں ہم تن مشغول ہو گیا۔ اس نے قافیہ کا غور سے مطالعہ کیا۔ اور اس میں قاضی شہاب الدین کی تفسیر کی مدد لی۔ اور دیگر مضامین بھی پڑھے۔ اس کے علاوہ گلستاں۔ بوستاں سکندر نامہ وغیرہ کتابیں بھی پڑھیں۔ سلطان بننے کے بعد جب مخدوم (مسلمان علما) مدد و معاش کے لیے اس کے دربار میں حاضر ہوتے تھے تو وہ ان سے حاشیہ ہندیہ کے متعلق سوال پوچھا کرتا تھا۔ زمانہ سلف کے حکمرانوں کی سوانح عمریوں کا بھی وہ متواتر مطالعہ کرتا تھا[1]۔ مصنف مخزن نے فرید کے مطالعہ کی فہرست میں پیغمبروں کی سوانح عمریاں و نصیحت آمیز تاریخوں کا اضافہ کیا ہے[2]۔

---

[1] عباس کی اصل عبارت یہ ہے "فرید بہ تحصیل علم عربیہ مشغول۔ قافیہ بہ حاشیہ قاضی شہاب الدین خوب طریق خواند۔ علوم دیگر نیز تحصیل کرد و گلستان و بوستان و سکندر نامہ وغیرہ ہم خواند۔ در ایام او بخا دیم کہ برائے مدد و معاش حاضر شدند از حاشیہ ہندیہ می پرسید۔ او کتب الملوک ماضیہ اکثر وقت مطالعہ می کرد (عباس نسخہ صفحہ ۱۸)۔

[2] مخزن کی اصل عبارت یہ ہے "پس مدت آنجا بود و تحصیل می کرد۔ و قافیہ حواشی قاضی و کتب دیگر فارسی از گلستان و بوستاں و سکندر نامہ نیز گزرانید و سیار

وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس عرصہ میں فرید نے باہر کی دنیا کا عملی تجربہ بھی کیا۔ (اخلاق سوریہ) لیکن مخزن میں اس بات کا کہیں بھی حوالہ نہیں ملتا ہے کہ شیرشاہ مسلم علما اور مولویوں سے حاشیہ ہندیہ کے متعلق سوالات پوچھا کرتا تھا۔ کچھ مورخین نے عباس اور مخزن کی اس لاف زنی کو صحیح مان کر فرید کو ایک مولوی بنا دیا۔ اور اس کو جونپور کی اعلیٰ تہذیب کا ایک نمونہ بھی قرار دیدیا اور اس کا شمار ان قومی شاہکاروں میں کر دیا ہے۔ جن کے بلند اخلاق اور اعلیٰ اصولوں نے ان کو ہندوستان کے قرون وسطیٰ میں سیاسی امتیاز بخشا۔ فرید کی تعلیم کے متعلق ایسے جملہ بیانات خالی از شبہ نہیں۔ حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ فرید کو عربی اور فارسی ادب پر دسترس حاصل تھی اور اس نے تواریخ اور پیغمبروں کی سوانح عمریوں کا مطالعہ کیا۔ یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ فرید عربی اور فارسی صرف و نحو کا ماہر تھا۔ فارسی عربی قواعد میں مہارت حاصل کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کام کے لئے فرید سے بھی زیادہ ذی عقل لوگوں کو پوری ایک عمر درکار ہے۔

۱۳ویں صدی میں ابن الحاجب نے الکافیات تصنیف کی تھی۔ جس کو علما بھی ایک پیچیدہ رسالہ سمجھتے ہیں۔ اسی کتاب کا ترجمہ ۱۵ ویں صدی میں شرقی حکمرانوں کے دور میں قاضی شہاب الدین جونپوری نے فارسی زبان میں معہ تفسیر حاشیہ کے بہ عنوان "حاشیہ ہندی" کیا ہے۔ یہ ترجمہ خود اس قدر دقیق ہے کہ اس کے سمجھنے کے لیے عربی طلبا کو خود ایک اور تفسیر کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ اس کے جونپور کے حالات زندگی سے ظاہر ہے فرید تعلیم کو کسی مقصد کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ حصول علم اس کا نصب العین نہ تھا۔

انبیاء ماضیہ و تاریخ جملہ واقفیت حاصل کرد۔ و اخلاق سوریہ را اسب نمود۔"

پروفیسر ہودی والا نے اس بات پر ملامت کی کہ میں نے اپنی کتاب میں ایلیٹ کے غلط ترجمہ کو جگہ دی۔ اور یہ لکھدیا کہ اس کو سکندر نامہ حفظ یاد تھا۔ (شیرشاہ صفحہ ۶) (تنقید کے لیے دیکھئے ہادی والا اسٹڈیز جلد ۱۔ صفحہ ۴۴۶)۔

Marfat.com

وہ کچھ وقت تو علما کی صحبت میں پڑھنے لکھنے میں صرف کرتا تھا اور باقی ماندہ وقت ایسے کاموں میں لگاتا تھا جو کہ دشمنِ تمدن تھے جن کا کہ اعتراف اس نے اپنے بڑھاپے میں کیا اس کا حوالہ رزق اللہ نے دیا ہے جو کہ عباس سے پہلے کا سوانح نگار ہے۔ بہرحال پرواز تخیل خواہ کتنی ہی اونچی کیوں نہ ہو فرید کو جونپوری تہذیب کا اعلیٰ نمونہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیوں کہ شیر خاں میں نہ تو جونپور کے قاضی شہاب الدین جیسی علمی لیاقت ہی تھی نہ سید محمد جیسا مذہبی جنون۔ نہ اس میں محمد یزد (جونپوری) کی طرح جس نے اکبر کو تخت سے ہٹانے کا فتویٰ دیا تھا۔ ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے شیطانی رجحان ہی تھا یہ اصحاب جونپوری تہذیب کے مثالی نمونے تھے۔ شیر شاہ میں دماغی توازن تھا۔ وہ دنیادار تھا۔ اگرچہ شان گا نٹھنے والا مہدی سید جونپور سے مفرور ہو چکا تھا۔ لیکن وہاں کی فضا میں اس کا زہر یلا اثر ابھی تک موجود تھا۔ بلاشبہ اگر فرید کے دماغ پر اس زمانہ کے علم و مذہبی تعصب کی گہری چھاپ پڑی ہوتی تو اغلب یہ تھا کہ تاریخ میں اس کا کہیں نام نہ ہوتا۔ یا اگر ہوتا بھی تو بحیثیت عالم و مولوی ہوتا۔ یا محمد تغلق کی طرح وہ تاریخ کا دوسرا شیخ چلی ہوتا جسے اکثر لوگ پاگل کہا کرتے تھے۔

بہرحال اس مسئلہ پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ فرید نے طالب علمی کے زمانہ میں کن کن مضامین اور کتابوں کا مطالعہ کیا جن سے اس کو اپنا مستقبل بنانے میں مدد ملی۔ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اس وقت تک فرید کے دماغ میں اس قسم کا کوئی خیال پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ یہ کہنا کہ طالب علمی کے دوران فرید نے بادشاہوں کی سوانح عمریاں اور قدیم سیاسی تاریخ کا مطالعہ کیا میری رائے میں محض تصنع اور نمائش ہے۔ افغان مورخین نے اس کا محض اس لیے سہارا لیا کہ شیر شاہ کے واقعات زندگی کو کچھ رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کیا جائے۔ کیوں کہ وہ تاریخ کی ایک نمایاں ہستی ہے۔ یہ شیر شاہ کو قدیم اسلامی شجاعت کے قالب میں ڈھالنے کی ایک کوشش ہے۔ جس کے بموجب تاریخ و تلوار۔ قبیلائی جنگ و فیاضی۔

Marfat.com

داڑھی اور شجاعت ہر مسلمان کی زندگی کا ایک اہم جزہے۔ قدیم اور موجودہ دونوں سوانح نگاروں میں یہ کمزوری ہے جس سے یہ مصنف بھی اچھوتا نہیں ہے کہ وہ کسی تاریخی ہستی کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت حال سے ماضی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور شجر کی تلاش اس کے تخم میں کرتے ہیں۔

فرید کی آوارگی

زمانہ قدیم میں طلبا عموماً اپنے استاد کے گھر نہایت پرسکون زندگی بسر کرتے تھے لیکن مسلم طلبا کی حالت ایسی نہیں تھی۔ ان کا حوصلہ بلند تھا ان میں جوانی کی اُمنگ تھی۔ لہٰذا ان کی شروع سے ہی دو شخصیت ہو جاتی تھیں۔ اپنے اساتذہ کے سامنے مکتب کی چار دیواری میں مسلم طلبا کی تعلیم و تربیت تہذیب و پارسائی کے اعلیٰ نمونہ ہوتے تھے لیکن بزرگوں کی نظر سے اوجھل ہوتے ہی شیطان بن جاتے تھے۔ اور تمام محلہ میں فساد برپا کرنے لگتے تھے۔ اگر ہم ایک صدی سے قبل شمالی ہند کے اسلامی ادب کے مرکزوں میں قیام کرنے والے عالموں کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ہم یہ دیکھیں گے کہ زمانہ سلف کی بے ہنگم فضا میں عالم نسبتاً کہیں زیادہ آزاد۔ بے تفکر اور لاابالی ہوتے تھے۔ اس کے شاہد وہ اقبالات ہیں جو کہ ان کے شاگردوں نے سن ضعیفی میں قلمبند کیے تھے۔

رزق اللہ نے اپنی تاریخ "واقعات مشتاقی" میں جونپور میں فرید کی آوارگی کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ابوالفضل اور عباس سے دو پڑھی پہلے لکھی گئی تھی۔ اس تذکرہ کی بنا میں وہ جملہ باتیں جو کہ شیر شاہ نے خود اپنی زبان سے مالوہ کے ملّو خاں عرف قادر شاہ کے سامنے کہی تھیں۔ اکثر سنجیدہ اور کم سخن انسان بھی اپنے ہم عصروں کی صحبت میں عالم سن رسیدگی میں جی کھول کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اور اپنی جوانی کی بے عنوانیوں کا پوست کندہ ذکر کر کے کھل کھل کر ہنستے ہیں۔ چنانچہ کوئی وجہ نہیں کہ ہم شیر شاہ کے

Marfat.com

اقبالی بیان کو رد کر دیں۔ اگرچہ اس کے متعلق ہمارے موجودہ احساسات کو ٹھیس لگتی ہے۔ اور ہم ششدر رہ جاتے ہیں۔ اگر ہم قرون وسطیٰ کے معیار اخلاق کو مدنظر رکھیں تو رزق اللہ نے جو واقعات بیان کئے ہیں ان کو ناقابل اعتبار سمجھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ اپنے طالب علمی کے زمانہ میں فرید رفتہ رفتہ ایک تنومند اور دلیر جوان ہو گیا ہو گا۔ کبھی چوری کرتا ہو گا اور کبھی تیروں سے شکار۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے شکار کے پیچھے دیہاتی علاقہ میں ۱۵ کوس تک پیدل دوڑتا ہو گا۔ کیونکہ اس کو گھوڑا رکھنے کی توفیق نہ تھی۔

فرید جونپور کے مدرسہ میں کتنے روز رہا۔ اس کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ ابھی تک اس نے اپنے مستقبل کا نہ تو کوئی منصوبہ بنایا تھا اور نہ اس کا کوئی ذریعہ معاش ہی تھا۔ اس قسم کی ایک روایت یہ ہے کہ جب وہ اپنی قسمت آزمائی کر رہا تھا تب فرید کو ایک روز ڈاکوؤں کے گروہ سے واسطہ پڑا۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ اس کے ساتھی بن گئے۔ اور وہ ان کا سرغنہ۔ اس طرح اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ لیکن اس دور میں اس کو کس قدر کامیابی ملی اس کا کوئی علم نہیں۔ کچھ

عرصہ بعد غالباً چند سالوں کے بعد فرید کو ایک سانحہ پیش آیا۔ ایک روز جب کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کشتی میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسکا مقابلہ اسی قسم کے ایک دوسرے گروہ سے ہوا۔ جو اس سے زیادہ طاقتور تھا۔ اور اسی قسم کی مہم پر جا رہا تھا۔ اس گروہ نے فرید کا پیچھا کیا اور ایک لڑائی میں اسے شکست فاش دیدی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرید کا گروہ منتشر ہو گیا۔ فرید اپنی جان بچانے کے لیے دریائے گومتی کی ایک معاون ندی "سائی" میں کود پڑا۔ اس حالت میں بھی وہ حاضر دماغ رہا۔ اور اس نے اپنے اسلحہ قبضہ میں رکھے۔ اس نے اپنے تیر و کمان سر سے باندھ لیۓ اور بہار کی جانب تین کوس تیر کر اپنی جان بچائی۔ اس واقع کے بعد فرید نے خطرناک پیشہ چھوڑ دیا۔ اور وہ ایماندارانہ زندگی بسر کرنے لگا۔

Marfat.com

مگر افغان سوسائٹی میں فرید کے پیشہ رہزنی سے اس کی علمی اور پارسائی حیثیت میں کوئی فرق نہ پڑا ہوگا۔ کیوں کہ وہ لوگ کسی شریف شخص کے پیشے کی بابت تحقیق کو خلاف وضع اور نشان بدتمیزی سمجھتے تھے علاوہ بریں قرون وسطی میں بہادر عرب اور افغانوں میں علما اور پیرزن کا ڈاکوؤں کے کسی گروہ میں سرغنہ بن جانا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے متعدد ثبوت اس زمانہ کی تاریخ میں موجود ہیں۔ اس دیرینہ اور خوش گوار عہد میں یہ دونوں کام یعنی تحصیل ادب اور مشغلہ راہزنی ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔ ان میں نہ تو کوئی باہمی تضاد ہی تھا۔ اور نہ کوئی بے جوڑ پن۔ ایسی حالت میں تو کبھی کبھی قومی رجحان ادب کے سنگین پلاسٹر توڑ کر باہر نکل پڑتا تھا۔

خلیفہ ہارون رشید کے مشہور درباری شاعر ابو نواس کی زندگی اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ کس طرح ایک شریف اور پاک طینت انسان تاریک اور سنسان راتوں میں عرب کا بدو بن جاتا تھا۔ ایسی روایت ہے کہ ابو نواس دن کے وقت اپنی مشہور غزلیں لکھتا تھا اور رات کے وقت بغداد کی شاہی سڑکوں پر دل بہلانے کے لیے لوٹ مار کیا کرتا تھا۔ اور اس گناہ کی تلافی کے لیے دوسرے روز صبح کو غریبوں اور مسکینوں کو دل کھول کر خیرات تقسیم کرتا تھا۔

قرون وسطی میں مشرق و مغرب میں ایران اور ہندوستان میں بہت سے شہزادوں نے اپنی ابتدائی زندگی لوٹ مار سے شروع کی تھی۔ اسس باب میں فرید کی زندگی یعقوب پسر لیث سے ملتی جلتی ہے یعقوب تانبہ گری کا پیشہ کرتا تھا۔ آگے چل کر اس نے فارس میں سفریدی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس کے خوف سے بغداد میں عباسی خلیفہ لرزہ بر اندام رہتا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں فرید شواجی کا پیشرو تھا۔ حالاں کہ شواجی نے اپنی زندگی بہتر پونجی سے شروع کی تھی۔ اور وہ تخت پر بیٹھنے کا شیر کے مقابلہ زیادہ حقدار تھا۔

Marfat.com

ہمارے پاس کوئی ایسے مستند تاریخی ذرائع نہیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوسکے کہ دریائے سیتی میں تین کوس تک تیر کر بچ نکلنے کے بعد فرید نے کون سا ایماندارانہ پیشہ اختیار کیا۔ سیتی ندی بجانب مشرق۔ رائے بریلی اور پرتاپ گڑھ کے اضلاع سے بہتی ہوئی جونپور سے ۳۰ میل نیچے دریائے گومتی میں مل جاتی ہے۔ یہ اضلاع اس زمانہ میں جرائم پیشہ اور مخدوش لوگوں کا اڈا تھے۔ شیر شاہ کی ابتدائی رنگین زندگی میں یہی ایک حسرتناک واقعہ پیش آیا مگر اس سے اس کو کافی عبرت ملی۔ اگرچہ فرید ہنوز ایک لاپتہ مستقبل کے پتھر کے مانند لڑھک رہا تھا۔ پھر بھی ہر ایک پیچ وتاب کے بعد اس پر کچھ رنگ تو چڑھ ہی جاتا تھا۔ اور بالآخر وہ جونپور کے افغانوں میں ایک مشہور و معروف ہستی ہو گیا۔ مگر فرید کی قسمت کے اس عرصہ کے اتار چڑھاؤ جب سے اس نے رہزنی کے پیشہ کو چھوڑ کر اپنے والد کے پرگنوں کا اہتمام ۱۵۱۸ء میں اپنے ہاتھ میں لیا پردہ کے پیچھے مستور رہیں۔ اس کے ازدواج کے بعد یہ دس سال کا عرصہ تھا۔ بایں ہمہ مورخوں کو یہ لازم ہے کہ ہم عصر رائے اور عباس کی اس شہادت کی تائید میں ایسے ثبوت فراہم کریں جس کے کہ بموجب اس نے لکھا ہے کہ جونپور کے بزرگوں سے میاں حسن نے یہ کہا کہ "از خوردی آثار بزرگی بر ناصیہ او پیدا است۔ علم و فہم عقل و فراست کہ او دارد در قوم سور ایک ندارد۔ آں چناں قابلیت پیدا کردہ اگر مہام پرگنہ وغیرہ باو سپاری بہ آسان وجہی بہ انصرام خواہد رسانید یعنی عالم طفلی سے فرید کی پیشانی پر بزرگی وعظمت کے آثار نمایاں ہیں۔ جملہ سور قبیلہ میں وہ عقل وفہم تمیز وشعور علم وہنر میں لاثانی ہے۔ اس میں خداداد قابلیت ہے۔ اگر پرگنوں کا انتظام اس کے سپرد کر دیا جائے تو وہ بخوبی اسے انجام دے سکتا ہے۔

عباس کے اس اقتباس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ علمی قابلیت کے علاوہ مورخ موصوف نے جن مزید اوصاف تجربات اور خوبیوں کا فرید کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے وہ کلیتاً فوجی نہ تھیں بلکہ وہ

Marfat.com

ایک ذی شعور۔ شہری افسر کی تھیں۔ جو کہ محکمہ مال کے معاملات میں ماہر تھا۔ اگر فرید نے اپنی اسمائیل زندگی میں عرصہ دراز تک سپاہیانہ زندگی بسر کی ہوتی تو وہ غالباً جونپور چھوڑنے سے پہلے اپنے دادا کی طرح ہم گھوڑوں کا سردار تو ضرور بن جاتا اصل واقعہ یہ ہے کہ سلطان سکندر کے آخری دور میں کرایہ کے سپاہیوں کی مانگ کم ہو گئی تھی۔ بادشاہ نے دیوانی اور مال کے محکموں میں اس قسم کی انتظامیہ اصلاحات کی تھیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کو کافی ذی عزت اور نفع بخش نوکریاں ملنے لگی تھیں۔ ان عہدوں پر اب تک محض ہندو لوگ ہی ملازم تھے۔

سلطان سکندر کی اصلاحات کی وجہ سے محکمہ مال کے ماہرین کی مانگ بڑھ گئی تھی جو فارسی زبان کے ساتھ ساتھ مقامی زبان بھی جانتے ہوں۔ کیوں کہ اس وقت محکمہ مال کے سارے کاغذات اور حسابات مقامی زبان میں ہی رکھے جاتے تھے۔ سلطان نے خالصہ کے علاقہ میں لگان بندی زمین کی پیمائش کی بنا پر شروع کر دی تھی۔ اس نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ ہی تمام اراضی کا مالک ہے اور اقطاع داروں کو یہ ہدایت دی کہ وہ اپنے اپنے پرگنوں کی کاشت کا رقبہ اور جمع کا سالانہ نقشہ بنا کر داخل کریں۔ اسطرح اس نے جاگیرداروں کی وہی حالت کر دی۔ جو کہ آخری عہد مغلیہ میں منصبداروں کی ہو گئی تھی۔ چنانچہ سلطان کے احکام کی تعمیل کرانے کے لئے ہر جگہ قابل افغان افسروں کی بھرتی ہونے لگی۔ تاریخ داؤدی سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں ایک سپاہی کی تنخواہ ایک مال کے محکمہ کے اہلکار سے اوسطاً ۴ گنا زیادہ تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی عام شہرہ تھا کہ سول محکمہ کا چھوٹے سے چھوٹا اہلکار بھی ایک سپاہی سے ۵ گنا زیادہ کما لیتا ہے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آج دن بھی یہ ہی کیفیت ہے۔

انہیں باتوں کو مد نظر رکھ کر جب کہ فرید نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ایک مہذب خانہ دار کی زندگی بسر کرے گا۔ تب اس نے سپہ گری کے عام پیشہ

Marfat.com

کو چھوڑ کر زندگی میں ترقی کرنے کے خیال سے ایک نیا ہی راستہ اختیار کیا
مخزن کے اقتباسات سے جن کو پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ فرید
نے جتنی محنت سے کتابی علم حاصل کیا اتنی ہی تندہی سے اس نے اخلاق
سوربہ کی طرف توجہ کی یعنی یہ کہ اس نے باہری دنیا کی بابت مفید جان کاری
حاصل کی۔ لودی حکومت کے زمانہ میں ایک معمولی انسان کے لیے یہ ضروری
تھا کہ اسکو ریاضی اور ہندی زبان کا اچھا علم ہو۔ بہلول کے وقت سے ہی پٹھان
امیر اور فقیر بڑے شوق سے ہندی پڑھنے لگے تھے۔ سلطان سکندر بذات خود
اور اس کے دربار کے دیگر علما اچھی ہندی جانتے تھے۔ کیوں کہ عوام سے
ان کے اچھے تعلقات تھے۔ جس کا کہ ثبوت ہم کو تاریخ داؤدی اور دیگر
تواریخوں سے ملتا ہے۔ مصنف مخزن یعنی نعمت اللہ نے ایک گرگشتی پٹھان
فقیر مسمی میاں شیخ عیسیٰ کا ذکر کیا ہے کہ وہ فارسی پشتو اور ہندی زبان میں
اشعار کہتا تھا۔ اور شراب بھی خوب پیتا تھا۔ لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں
اگر فرید نے ہندی میں اتنی مہارت حاصل کر لی ہو کہ چند سال بعد جب
اس کا واسطہ سہسرام کے پٹواریوں سے پڑا تو وہ اس کو دھوکہ نہ دے
سکے۔ اس نے اپنے عہد حکومت میں اپنے سکوں پر عربی کے ساتھ ساتھ
ہندی زبان میں بھی اپنا نام لکھوایا تھا۔ یہ نام "سری سرساہ سوری" لکھا
ہوا تھا۔ کسی جگہ شیر شاہ سوری تھا۔

دریائے سندھ کے اس پار سے آئے پٹھان عموماً ریاضی میں کمزور
ہوتے تھے۔ وہ مال غنیمت کو مٹھی بھر کر بانٹا کرتے تھے اور اگر اس میں
کوئی خرخشہ پڑ جاتا تھا تو یا تو فوراً تلوار نکال لیتے تھے یا کسی مہاجن کے
پاس جا کر اس مال کی تقسیم میں مدد مانگتے تھے۔ وہ اس روپیہ کو گن کر بانٹ
دیتا تھا۔ لیکن یہی پٹھان جب حکومت برطانیہ میں سندھ کے اس پار آکر
بس گئے تب وہ حساب لگانے میں اتنے ماہر ہو گئے کہ ہمارے وقت کے
ہندوستانی مہاجنوں کے بھی کان کاٹنے لگے۔ فرید ریاضی کا ماہر تھا۔ ابتدائے
زندگی میں اپنے والد کی جاگیر دیکھنے میں یا زندگی کے آخری دور میں دہلی

Marfat.com

سلطنت کے محکمہ مال کا انتظام کرنے میں وہ بغداد کے خلیفہ منصور کی طرح کوڑی کوڑی پر نگاہ رکھتا تھا اور "ابو ال دھانک" یعنی "پیسہ کا باپ" کے نام سے مشہور تھا۔

فرید نے کس قسم کی ملازمت کی؟ کہاں اور کس کے پاس کی؟ اس کے متعلق محض قیاس آرائی یا طبع آزمائی ہی کی جا سکتی ہے چنانچہ ہمیں اپنی پہلی رائے کو بدلنا ہوگا کہ جمال خاں نے فرید کی ذہنی و علمی لیاقت سے متاثر ہو کر اس کو محکمہ مال میں جگہ دیدی۔ (شیر شاہ صفحہ ۸)۔ اگر فرید کو جمال خاں کی خدمت میں رہنے کا موقع مل جاتا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنی گذر بسر کے لئے عالم کے بجائے ڈاکو بن جاتا۔

اس شبہ کے ہمارے پاس بہت سے براہان قاطع موجود ہیں جو فرید کی مذمت کرتے ہوئے اس کو ایک شریف اور مشہور شخص کی اولاد بتلاتے ہیں۔ ابوالفضل نے حسن کے متعلق کئی رسمی غلطیاں کی ہیں۔ جیسے کہ اس کا یہ بیان کہ اس نے ناصر خاں لوہانی۔ دولت خاں اور ببن لودی کی خدمت کی یا یہ کہ اس کے حسن انتظام کے بہت سے مفید نتائج نکلے۔ جبکہ فرید نے اپنی نخوت اور بدسلوکی سے اپنے والد کی دل شکنی کی اور کچھ عرصہ تک تاج خاں لودی کی خدمت کی۔ یہ تاج خاں لودی نہ ہو کر سارنگ خانی تھا۔ چنار کے قلعہ کا قلعدار۔ اور جمال خاں کا بھائی تھا۔ علاوہ بریں ابوالفضل نے یہ کہہ کر کہ فرید نے حسن کی وفات کے بعد چوری۔ ڈکیتی اور قتل کر کے لوگوں کو تکلیف پہونچائی اور یہ واقعات سہسرام کے علاقہ اور چوند کے جنگلوں میں ظہور پذیر ہوئے سلسلہ واقعات کو ہی الٹ دیا مگر خوش قسمتی تو یہ ہے کہ ابوالفضل کی رسمی غلطیوں سے ایک تاریخی صداقت مترشح ہو جاتی ہے۔ جس سے کہ فرید کی زندگی کے جونپوری دور میں جو فروگزاشت عباس اور دیگر مورخوں نے کی ہے اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ بیان کرنا صحیح و مناسب ہوگا کہ اپنے والد سے مصالحت کے قبل فرید ہی ناصر خاں لوہانی ببن خاں لودی۔ اور تاج خاں سارنگ خانی کی خدمت میں تھا نہ کہ اس

Marfat.com

کا دالدہ۔اس سے یہ بھی یقین ہو جاتا ہے کہ ناصر خاں لوہانی، بہن لودی اور دولت خاں کی خدمت میں متعدد کارنامے حسن کی خوبی انتظام کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے بیٹے فرید کی ہوشیاری سے انجام پائے۔اور اگر یہ کارنامے فوجی مہمیں ہوتے تو ابوالفضل لفظ انتظام نہ استعمال کرتا۔بس ہم صدق بیانی سے لعید نہ ہونگے اگر ہم یہ فرض کریں کہ فرید کے نئے مالکوں نے اس کو مالی بندوبست اور شہری انتظام میں ہی لگایا ہوگا۔

اس طرح سے ابوالفضل کے بیانات کی تنقیدی لوٹ پوٹ سے ہم فرید کی ابتدائی زندگی کے حالات میں ان فروگزاشتوں کی حتی الوسع صحت کر سکتے ہیں۔جو کہ عباس اور دیگر افغان مورخین سے ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ چنانچہ یہ دعوی قرین قیاس ہوگا کہ اپنی زندگی کے جونپوری دور میں فرید نے بہن لودی۔ناصر خاں لوہانی اور تاج خاں سارنگ خانی کی خدمت کی۔اگرچہ یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ خدمت کس سلسلہ میں یا کس صیغہ میں کی

اور اگر فرید کی شناسائی ناصر خاں اور تاج خاں کے خاندانوں سے پہلے سے ہی نہ ہوتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ ان کی متمول بیوائیں بعد کو شیر شاہ کے ساتھ شادی کرنے کے لیے اتنی جلدی تیار ہو جاتیں؟

فرید کی شادی اور والد کیساتھ مصالحت

فرید نے اپنی شادی کے لئے بہت دنوں تک مقدر کے جاگنے کا انتظار نہیں کیا۔ہر انسان کی زندگی میں ایسا دور آتا ہے جب کہ اس پر خواہشات نفسانی کا اتنا زبردست غلبہ ہو جاتا ہے کہ اس کو اس وقت نہ تو مستقبل کا خیال ہی ستاتا ہے اور نہ مالی تفکرات ہی۔نوجوان فرید بھی ان کمزوریوں سے مبرا نہ تھا نہ وہ انسان کا کوئی اعلیٰ نمونہ ہی تھا۔جو قرائنی شہادتیں کہ عباس اور مخزن میں موجود ہیں ان سے اس بات کا توصیح اندازہ لگایا ہی جا سکتا ہے کہ جونپور کے دوران قیام میں فرید کے جو بچے پیدا ہوئے ان کی

Marfat.com

عمر بیں کیا گئیں۔ فرید کے سب سے چھوٹے لڑکے عبدالرشید کی عمر کے متعلق ایک سرسری حوالہ ہے لبعد ہا اس کا نام قطب خاں ہوا۔ یہ پندرہ سال کا بچہ تھا جب کہ ۱۵۳۲ء میں اس کو بطور ضمانت شہنشاہ ہمایوں کے حوالہ کیا گیا۔ اور وہ اپنے اتالیق کے ساتھ شاہی خدمت کے لیے گیا۔ اس طرح اس کی تاریخ ولادت ۱۵۱۷ء قائم کی جاسکتی ہے۔ اور اس کی بنا پر فرید کے دوسرے بچوں کی تاریخ ولادت بھی تعین کی جاسکتی ہے اور تقریباً اس کی اول شادی کی بھی۔

اگر ہم ۱۵۱۷ء کو فرید کے تیسرے لڑکے کی تاریخ پیدائش مان کر پیچھے کی طرف لوٹیں اور فرض کرلیں کہ ہر دو بچوں کے درمیان عموماً دو سال کا وقفہ رہا ہوگا تو فرید کے دوسرے لڑکے جلال خاں کی تاریخ پیدائش جس نے ۱۵۳۲ء میں ہمایوں کے خلاف چنار کے قلعہ کی حفاظت کی تھی ۱۵۱۵ء ہونی چاہیے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ فرید کے دو لڑکوں یعنی جلال خاں اور عادل خاں کے بیچ ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی تھی۔ اس حساب سے فرید کی لڑکی کی تاریخ پیدائش ۱۵۱۳ء اور سب سے بڑے لڑکے عادل خاں کی تاریخ پیدائش ۱۵۱۱ء ہونی چاہیے۔ اس زمانہ میں پہلا بچہ عموماً شادی کے ۳ سال بعد ہوتا تھا۔ کیوں کہ شادی صغر سنی میں ہوتی تھی۔ اس وقت نہ تو لڑکیوں کو بھگانے کا رواج تھا اور نہ دام محبت میں گرفتار ہو کر شادی کرنے کا۔ اس زمانہ میں ایسی حرکتیں معیوب و قابل سزا سمجھی جاتی تھیں۔ لہٰذا فرید کی شادی اس کے جونپور آنے کے تقریباً ۲ سال بعد ۱۵۰۸ء میں ہوئی ہوگی کوئی مستند تاریخی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے یہ قیاس آرائی بے معنی ہوگی کہ بوقت شادی فرید طالب علم تھا یا نہیں۔ یا کچھ عرصہ تک وہ گھر جنوائی ہی بنا رہا۔ یا اس نے بذات خود کوئی پیشہ اختیار کر لیا تھا۔

فرید کی اپنے والد سے کب اور کیسے مصالحت ہوئی یہ ایک پیچیدہ سوال ہے۔ تمام واقعہ اتنا ناٹکی نہ رہا ہوگا جتنا کہ عباس کے طرز بیان سے ظاہر ہوتا ہے اگرچہ قرون وسطیٰ اور حال دونوں ہی زمانہ کے مورخین نے جن میں

Marfat.com

کہ موجودہ مصنف بھی شامل ہے۔ اس بیان کو یک قلم باور کر لیا۔ ایسی روایت ہے کہ کئی سال بعد ایک بار جب حسن، جمال خان کے پاس جونپور پہونچا تو اسکے افغان دوستوں نے اس کو لعنت و ملامت کی اور اس سے یہ باز پرس کی کہ ایک کنیز بیگم کو خوش کرنے کے لیے اس نے کیوں اپنے ایک ہونہار و قابل لڑکے کو گھر سے نکال دیا ہے۔ ان باتوں کو سن کر حسن نرم پڑ گیا۔ اور اس بات پر راضی ہو گیا کہ اپنے جاگیر کے پرگنوں کا انتظام وہ فرید کے سپرد کر دے گا۔ لیکن فرید اپنے والد پر کم اعتبار کرتا تھا۔ اس کو یہ یقین نہ ہوا کہ اس کے دل میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس نے اس تجویز کو رد کر دیا۔ بعد ا جب اس کے خیر خواہاں اور با اثر دوستوں نے اس پر زور ڈالا جن کو کہ وہ ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا تب فرید اپنے والد کے پاس جانے اور اپنی شرطوں پر پرگنوں کا انتظام لینے کو تیار ہو گیا۔ یہ شرائط ہر دو فریقوں کے لئے مناسب تھیں۔ حسن نے فرید کو کچھ دن تک اپنے پاس رکھا اور انتظامیہ معاملات پر اپنے عالم لڑکے کی تقریروں کو سنجیدگی سے سنا۔ عباس کے طرز بیان سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا فرید نظام الملک طوسی ہی ہو جو کہ اپنے شاہی شاگرد ملک شاہ سلجوقی کو نظام سیاست کے متعلق فہمائش کر رہا ہو۔ تقریبًا نصف صدی بعد مخزن کے مصنف نعمت اللہ نے بھی اس کہانی کو مجملاً دہرایا ہے۔ فرق اتنا ہی ہے کہ مخزن نے تاریخ میں بے ساختہ رد و بدل کر دیا ہے وہ لکھتا ہے کہ یہ واقعہ ۲۔۳ سال بعد ہوا (بعد از دو سہ سال۔ مخزن صفحہ ۳)۔ ہمارے پاس اس امر کے کافی ثبوت موجود ہیں کہ حسن کو فہمائش ایک بار نہیں بلکہ متعدد بار کی گئی۔ لیکن حسن پر اس کا کوئی اثر اس وقت تک نہیں ہوا جب تک کہ سلیمان کی والدہ کو اس نے پہلے سے راضی نہ کر لیا۔

فرید کی اپنے والد سے مصالحت اور سہسرام میں نیابت کے عہدہ پر اس کی تقرری یہ تمام واقعات عباس نے جس طریقہ سے بیان کیے ہیں اور دوسرے مورخین نے انہیں دہرایا ہے وہ بیش از بیش ایک بظاہر

Marfat.com

قابل اعتماد قصّہ تو ہیں مگر مستند تاریخ نہیں۔ یہ یقین کرنا خلاف عقل ہوگا کہ ۱۸ سال کے عرصہ دراز تک فرید جونپور میں قیام پذیر رہا۔ اور اپنے کنبے کی داشت و پرداخت بھی کرتا رہا۔ مگر ایک بار بھی اس کو اپنے والد کا نیاز حاصل نہ ہوا۔ کیوں کہ سلطان سکندر کے نئے ضابطوں کے مطابق اس کو کم از کم ایک سال میں ایک مرتبہ اپنے فرض منصبی کو ادا کرنے کی غرض سے یعنی جاگیر کے مال کا نقشہ داخل کرنے جونپور آنا ہوتا ہوگا۔ پھر یہ بات بھی قابل قیاس نہیں کہ جونپور میں حسن اور فرید کے مشترکہ دوستوں نے اتنے عرصہ تک بے نیازی کا اظہار کرنے کے بعد دفعتًا معاملات میں دخل اندازی کر کے حسن کو قطعًا مجبور کر دیا کہ وہ چند پرگنوں کا بندوبست اس کے حوالے کر دے اس کے برعکس یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ حسن نے فرید کو ارادتًا اپنے سے دور رکھا تاکہ سلیمان کی والدہ خوش رہے اور گھر میں امن چین رہے۔ یہ بالکل ہی غیر ممکن ہے کہ حسن نے فرید کے متعلق اہم فیصلہ سلیمان کی والدہ کے بلا مشورہ کیا ہو۔ عباس خود رقم طراز ہے کہ فرید کو پرگنوں کا منتظم بناتے وقت حسن نے سلیمان کی والدہ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ سلیمان کے بالغ ہو جانے پر اسے فرید کی جگہ شقدار بنا دیا جائے گا۔ (یہ صرف آنسو پونچھنے کی بات ہوگی۔ کیوں کہ سلیمان اس وقت تک بالغ ہو چکا تھا)۔ بہرحال یہ امر مسلمہ ہے کہ حسن نے یہ فیصلہ سلیمان کی والدہ کی رضامندی سے اور کسی ایسی فوری ضرورت سے مجبور ہو کر کیا ہوگا جس کی وجہ سے فرید کو سہسرام بلانا لازمی ہو گیا تھا۔ چنانچہ میاں حسن نے اپنی آبرو بچانے کے خیال سے فرید کے بہی خواہوں کی بات مان لی۔ اگر اس کو فرید کی اتنی ضرورت نہ ہوتی تو بھلا اس کو کب یہ گوارا ہوتا کہ فرید اپنی شرطیں اس پر لادے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت فرید کو اپنے والد کی اتنی ضرورت نہ تھی جتنی کہ اس کے والد کو اس کی ضرورت تھی۔ اس بات کا راز کہ میاں حسن اور سلیمان کی والدہ فرید سے مصالحت کرنے اور اس کو عارضی طور پر کچھ پرگنوں کا بندوبست حوالہ کرنے کو کیوں آمادہ ہو گئے اس سیاسی بحران میں

Marfat.com

پوشیدہ ہے جو کہ ۱۵۱۷ء میں سلطان سکندر کی وفات کے بعد لودی سلطنت میں ظہور میں آیا۔

سلطان سکندر کی وفات کے بعد اس کا سب سے بڑا لڑکا ابراہیم ۸ ذی القعدہ ۹۲۳ ہجری میں دہلی میں تخت نشین ہوا۔ (دیکھئے ڈارن صفحہ ۷۰ سے ۷۷ لکھنؤ یونیورسٹی قلمی نسخہ مخزن جلد اول صفحات ۱۸۶ لغایت ۱۹۱)

لیکن کچھ ذی اثر امراء اس کے چھوٹے بھائی شہزادہ جلال خان کو جونپور کا خود مختار حکمراں بنانا چاہتے تھے۔ اس ریاست میں دریائے گنگا کے شرق سے لے کر بنگال کے مغرب تک کا سب علاقہ شامل تھا۔ واقعات تیزی سے بدلنے لگے اور تمام سلطنت میں ہر چہار جانب خوف و دہشت طاری ہوگئی۔ جس طرح سروانی سرداروں نے بہلول کی وفات کے بعد سکندر کی مدد کی تھی ٹھیک اسی طرح اب وہ تا سلطان سکندر کے دوسرے لڑکے کے مددگار بن کر میدان میں آگئے۔ سکندر کی وفات کی خبر ملتے ہی شہزادہ جلال خان جونپور کو روانہ ہوگیا اور شہر پر قبضہ کر لینے کے بعد اعظم ہمایوں سروانی کے لڑکے فتح خان سروانی کو اپنا وزیر مقرر کر لیا۔ حالانکہ اس تقرری کے وقت تک اس نے سلطان کے لقب کا اعلان نہیں کیا تھا۔ ابراہیم بھی پیچھے نہ رہا اور اس نے فوراً اپنی سیاسی چالوں سے لوہانی اور فارمولی سرداروں کو جو سروانی سرداروں سے حسد رکھتے تھے اپنی طرف ملالیا۔ شہزادہ جلال خان جونپور سے اودھ کی طرف چل پڑا۔ مگر جلد ہی اس کو کالپی کی جانب ہٹنا پڑا۔ جہاں اس نے سلطان جلال الدین کا لقب اختیار کیا لیکن پہلی بازی ابراہیم کے ہاتھ رہی۔ اس کو جب یہ خبر ملی کہ بہار کا دریا خان لوہانی۔ غازی پور کا ناصر خان لوہانی اور لکھنؤ و اودھ کا معروف فارمولی اس کی مدد پر ہیں تو اس نے ۱۵ ذی الحجہ کو یعنی پہلی تاجپوشی کے ۵ ہفتہ بعد دوبارہ رسم تاجپوشی ادا کی۔ اور شاندار جشن منایا۔ مگر اعظم ہمایوں عمر خاں سروانی جس کو کہ شہزادہ جلال خاں کے خلاف بھیجا گیا تھا تاکہ وہ گوالیار کے قلعہ کو شہزادہ کے قبضہ میں جانے سے بچائے۔ جلال خاں

Marfat.com

سے مل گیا۔ اور اس سے ہم آہنگ ہوگیا۔ ابراہیم نے پہلے تو جونپور اور اس کے گرد و نواح کے علاقہ کو فتح کرنے کا تہیہ کیا۔ زاں بعد آگے کے منصوبے بنائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے د ن ۲۵ ذی الحجہ کو جونپور اور اودھ کی طرف روانہ ہوا اور تیزی سے کوچ کرتا ہوا پہلے بھوگاؤں اور پھر قنوج پہنچا۔ (دیکھیے ڈارن جلد ۲ صفحہ ۷ سے ۲۷ لکھنؤ یونیورسٹی کا قلمی نسخہ اور مخزن صفحات ۱۸۶ لغایت ۱۹۱)۔

سلطان ابراہیم کے عہد حکومت کے ابتدائی سنسنی خیز واقعات کا یہ خاکہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ سہسرام و جونپور اور اس کے ساتھ ساتھ فرید و حسن کی قسمت کا فیصلہ اس خانہ جنگی کے انجام سے وابستہ تھا انہی واقعات کے پردہ میں میاں حسن کی اپنی جاگیر سے طویل غیر حاضری کا راز مضمر ہے۔ اور انہی واقعات سے مجبور ہو کر اس کو فرید کو سہسرام بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیوں کہ اس کی جاگیر کے ہر دو جانب دو قوی دشمن تھے۔ ایک طرف محمد خاں سوری دوسری طرف جنگجو لوہانی۔ فرید خود بھی اس وقت جونپور چھوڑنے کی فکر میں رہا ہوگا۔ کیوں کہ جونپور کا مستقبل تاریک تھا کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کیا ہوگا۔ چنانچہ باپ بیٹوں کے درمیان مصالحت کا یہ نہایت ہی مناسب اور زریں موقع تھا۔ ۱۵۱۸ء میں جب کہ اس کا والد اسے اپنے پرگنوں کا نایب مقرر کر چکا اس نے سہسرام کا رخ کیا۔

Marfat.com

ضمیمہ

فرید کی ابتدائی زندگی کے متعلق ابوالفضل کی رائے

ابوالفضل نے فرید کی کارگذاریوں کو اس کے والد کے کارناموں کے ساتھ مخلوط کر دیا۔ اس کے علاوہ اس نے فرید کی ابتدائی زندگی کے واقعات قلمبند کرتے وقت اور بھی غلطیاں کی ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباسات اس کو ظاہر کریں گے۔

" وہاں سے یعنی نارنول سے حسن چوند گیا۔ اور ناصر خاں لوہانی کے یہاں ملازمت کر لی۔ چوند سہسرام کے علاقہ میں ہے۔ ناصر خاں سلطان سکندر لودی کا ایک سردار تھا۔ اپنی اہلیت اور قابلیت سے وہ دوسرے سرداروں سے سبقت لے گیا۔ ناصر خاں کے انتقال کے بعد وہ دولت خاں کی خدمت میں گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنا نام ہبن کے یہاں درج کرا لیا۔ جو سلطان سکندر لودی کا ایک امیر تھا۔ یہاں اس نے تھوڑا بہت نام بھی پیدا کیا۔ اور اپنے حسنِ بندوبست سے بہت سی کمیاں پوری کر دیں۔ مزید اپنی بد طینتی اور تکبر سے اپنے والد کو اذیت پہونچاتا رہا..... کچھ دنوں تک وہ اودھ میں تاج خاں لودی کے یہاں ملازم رہا۔ پھر کچھ دن اس نے جونپور میں سلطان جنید برلاس کے یہاں نوکری کی۔ اس عرصہ میں اسکے والد حسن کا انتقال ہو گیا۔ اور اسکی تمام جائداد پر اسکا قبضہ ہو گیا۔ پھر فرید نے سہسرام کے علاقہ اور چوند کے جنگل میں جو روہتاس کا ایک پرگنہ ہے رہزنی قتل اور ڈکیتی کا پیشہ شروع کیا۔ عوام اس سے تنگ آگئے۔"

(اکبر نامہ بیورج صفحات ۳۲۷-۳۲۸ دیکھیے گا)۔

ابوالفضل نے جملہ واقعات کو بری طرح مخلوط کر دیا ہے بظاہر اس کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرید کی ایک ایسی تصویر پیش کرے جس سے کہ یہ معلوم

Marfat.com

ہو کہ وہ ایک معزز اور قابل باپ کا آوارہ اور بد معاش لڑکا ہے ساگرمبے صبر ہو کر کوئی مورخ ابوالفضل جیسے سوانح نگار کی سند کو دوسرے تاریخی ذرائع سے بلا مطابقت کیے ہوئے یا واقعات میں میل بیٹھائے ہوئے صحیح تصور کرے تو سچائی کے خون کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

فرید کی زندگی کے اس دور کے متعلق بلاشبہ عباس بمقابلہ ابوالفضل زیادہ مستند ہے۔ حالاں کہ عباس میں اس کے برعکس دوسری کمزوری ہے۔ اس نے ارادتاً فرید کی زندگی کے ان واقعات کو نظر انداز کر دیا ہے جن سے فرید کے نام پر دھبہ لگنے کا اندیشہ تھا یا اس کے کردار کی جلد کے دھندلے ہونے کا امکان تھا۔ ابوالفضل نے ان واقعات کا دوسرے ذرائع سے پتہ لگایا تھا۔ اب ہم ابوالفضل کے بیان کا تجزیہ کریں گے۔

(۱) میاں حسن تازندگی جمال خاں سارنگ خانی کی اطاعت میں رہا۔ لہٰذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس نے ناصر خاں لوہانی اور اس کے بھائی دولت خاں کے یہاں نوکری کی۔ نہ وہ ایسا کر ہی سکتا تھا کسی مورخ نے بھی دولت خاں کو ناصر خاں کا بھائی نہیں بنایا ہے۔ دولت خاں جو فرید کا آقا اور محسن تھا سلطان ابراہیم کا درباری تھا۔ اور غیر افغان تھا۔ وہ غالباً سارنگ خانی تھا اور شاید جونپور کے گورنر جمال خاں سارنگ خانی کا بھائی ہو پس یہ ظاہر ہے کہ ناصر خاں اور دولت خاں کے یہاں فرید نے نوکری کی تھی نہ کہ حسن نے ابوالفضل نے غلطی سے اس کا اطلاق میاں حسن پر کر دیا ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ابوالفضل نے ابراہیم کے درباری دولت خاں کا ذکر جو فرید کا آقا و محسن تھا کسی جگہ نہیں کیا۔ جبکہ دوسرے تمام مورخین نے معہ عباس کے یہ لکھا ہے یہ بھی تعجب کی بات ہے کہ ابوالفضل نے تزک بابری کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی ایسی غلطی کیوں کی کہ ناصر خاں کی تاریخ وفات پانی پت کی لڑائی سے پہلے دکھائی جبکہ تزک بابری میں صاف لکھا ہے کہ پانی پت کی لڑائی سے ایک سال بعد ناصر خاں اس کے سامنے حاضر ہوا۔

(۲) ابوالفضل لکھتا ہے جب فرید نے جونپور کے صوبیدار جنید برلاس

Marfat.com

کے یہاں نوکری کرلی تو اس کے بعد اس کے والد حسن کا انتقال ہو گیا۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ اسی طرح سلطان سکندر یا ابراہیم کے زمانہ میں میاں حسن کو بہن کی ملازمت میں بتانا بھی حیطہ امکان سے باہر ہے۔ عباس یا کسی دیگر مورخ سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی۔

(۳) ابوالفضل نے لکھا ہے کہ فرید تاج خاں کی ملازمت میں رہا۔ لیکن یہ تاج خاں لودی نہیں تھا۔ بلکہ جمال خاں سارنگ خانی کا بھائی تھا اور چنار کے قلعہ کا گورنر تھا۔

(۴) فرید نے چوری۔ رہزنی۔ قتل و ڈکیتی جو کچھ معیوب حرکتیں کیں وہ حسن کی زندگی ہی میں ہی کیں۔ اس کی وفات کے بعد کچھ نہیں کیا اور شاید وہ کوئی دوسرا علاقہ ہی ہوگا سہسرام یا چوند کا جنگل نہیں۔

Marfat.com

باب 3

والد کی جاگیر کا انتظام

(۱۵۱۸ء لغایت ۱۵۲۲ء)

جاگیر کی وسعت، آبادی اور مالی حالت

جنوبی بہار میں جہاں آج ضلع شاہ آباد ہے اسی علاقہ میں میاں حسن کی جاگیر کے پرگنے سہسرام اور خواص پور ٹانڈہ تھے۔ شرقی خاندان کے عہد حکومت تک جنوبی بہار میں مسلمانوں کا مستقل تسلط قایم نہیں ہو پایا تھا۔ ہاں مختلف راجپوت خاندان جگہ جگہ اپنا اثر جمائے تھے مثلاً مونگیر اور اس کے قرب و جوار میں گوڑ خاندان تھا۔ روہتاس میں اجین کے پرمار راجپوتوں کی ذوزا شاخ قبضہ جمائے تھی۔ اس کے علاوہ بھوجپور اور قنوج سے بھی آکر لوگ یہاں بس رہے تھے۔ سلطان حسین شاہ شرقی کی حکومت کے آخری دور میں بھاٹا (موجودہ ریوا) کے بگھیلہ راجہ بدھی چندر نے (جس کو افغان مورخین نے غلطی سے پٹنہ کا راجہ لکھدیا ہے)۔ پریاگ سے لے کر بہار میں موجودہ پٹنہ تک اپنا تسلط قائم کر لیا تھا بظاہر وہ شرقی سلطان کا دوست تھا۔ سلطان سکندر کو بہار سے بھاٹا کے راجہ بدھی چندر کو نکالنے کے لیے کئی بار فوج کشی کرنی پڑی۔ مجبور ہو کر راجہ سرگوجا و اقع جھارکھنڈ ہوتا ہوا

Marfat.com

بندھیل کھنڈ بھاگ گیا لیکن اپنے آخری حملہ میں بھی سلطان سکندر راجہ کے مضبوط قلعہ بد گڑھ (بھاٹا) کو فتح کرنے میں ناکامیاب رہا۔ اس قلعہ کو سلطان علاؤالدین خلجی کے زمانہ سے لے کر اکبر کی حکومت کے ابتدائی دور تک کوئی بادشاہ فتح نہیں کرسکا۔ شاہ آباد اور روہتاس کا علاقہ بھی مکمل طور پر تحت میں نہ آسکا اس کی دو وجہ تھیں اول یہ کہ علاقہ پہاڑی تھا۔ اور دوسری یہ کہ یہاں کے باشندے سرکش تھے۔ انہیں خیالات کو مدنظر رکھ کر سلطان سکندر لودی نے یہاں پر سوریوں کے ایک ٹھوس گروہ کو لاکر آباد کردیا اور ان کے سرداروں کو سرحدی افسر مقرر کردیا۔۔۔ تاکہ امن قائم رکھ سکیں اور علاقہ کو اپنے تحت میں لاسکیں۔

سہسرام جو میاں حسن کی جاگیر کا صدر مقام تھا آج ایک اونگھتا ہوا قصبہ ہے۔ اور گرانڈ کورڈ لائن پر ایسٹ انڈین ریلوے کا اسٹیشن ہے۔ سہسرام سے بجانب جنوب ۵ میل پر روہتاس کا حصن حصین ہے جہاں اس وقت بھی ایک آزاد ہندو خاندان حکمراں تھا سہسرام سے براہ راست ۴۶ میل بجانب مغرب دریائے کرناسہ کے اس پار چونڈ[1] کا قلعہ واقع ہے (رسل کے نقشہ میں اس کا نام سانت ہے) یہ قلعہ محمد خاں سوری کا صدر مقام تھا۔ اس کی جاگیر میاں حسن

---

[1] مختلف تاریخوں میں اس کا نام مختلف طریقہ سے درج ہے۔ کہیں چونڈ لکھا ہے کہیں جند لکھا ہے رینل کے نقشہ میں "سانت" لکھا ہے۔ لیکن اصل نام چونڈ ہے اس کی اصلیت میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ فارسی تاریخوں میں (باقی حاشیہ صفحہ ۱۰۰ پر)

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۰۷ کا) اس کا بارہا حوالہ دیا ہے۔ (دیکھیے ایلیٹ جلد ۴۔ صفحہ ۴۵۸۔ جے۔ اے۔ بی۔ ایس۔ ۱۸۹۵)۔ سلطان سکندر جب حسین شاہ شرقی کے خلاف حملہ آور ہوا تو انہوں نے چونڈ پر قبضہ کرنے کے لیے دریائے گنگا کو کنتت گھاٹ پر پار کیا اور بجانب مشرق روانہ ہوا۔ بعد میں اس قلعہ کی مرمت شیر شاہ نے از سر نو کی اور اسے مغلوں کے خلاف اپنی جائے پناہ بنایا۔ بنارس کے راجہ بلونت سنگھ نے اس کا نام بجے گڑھ رکھا۔ اس قلعہ میں مہاراجہ چیت سنگھ نے وارن ہسٹنگز کے عہد میں پناہ لی تھی (دیکھیے جوڈی والا اسٹڈیز صفحہ ۴۴۴۔)

Marfat.com

کی جاگیر سے ۳ گنا بڑی تھی۔ جو کہ اس کو ۵۰۰ گھوڑ سوار رکھنے کے لیے دی گئی تھی۔ خواص پور ٹانڈہ محمد خاں سوری کے علاقہ کی سرحد پر تھا۔ نقشہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خواص پور ٹانڈہ وہی جگہ ہے جسے مارٹن کے ایسٹرن انڈیا نقشہ میں موہنیا[1] نام سے دکھایا گیا ہے۔ خواص پور ٹانڈہ کی بالائی حدود کرم ناسہ کے اوپری پہاڑ سے کنار ندی کے سنگم تک ہیں۔ مارٹن نے یہ بھی لکھا ہے کہ دریائے سون کی معاون ندی دھاوتی میاں حسن کی جاگیر کی مشرقی سرحد پر بہتی تھی اور رام گڑھ[2] پرگنہ کی جنوبی سرحد اس کی جاگیر کی شمالی حد تھی۔ اس طرح میاں حسن کی جاگیر موٹے طور پر ضلع شاہ آباد کے بارا ونگ سہسرام، تلوٹھو اور موہنیا کے تھانوں پر مشتمل تھی۔ میاں حسن کی جاگیر کے جنوب میں تلوٹھو کے پہاڑی علاقہ سے لے کر مغرب میں روہتاس تک چیرو اور ساور لوگ رہتے تھے۔ چیرو لوگ دراوڑ نسل کے تھے اور کسی زمانہ میں بہت طاقتور

[1] موہنیا سہسرام کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس پرگنہ میں مقام چین پور شیر شاہ کے خاندان کے کچھ گھرانوں کو بود و باش کے لیے بہت پسند خاطر تھا۔ یہیں پر اس کے خاندان کے بہت سے لوگوں کے مقبرے بھی ہیں۔ انہیں میں سے ایک قبر شیر کے داماد اطہر خاں کی ہے۔ (دیکھیے مارٹن ایسٹرن انڈیا۔ ۲۔ صفحہ ۴۵۵۔ ۴۶۱) موہنیا سب ڈویژن کے جہان آباد مقام پر اینٹ اور پتھر کی بنی ایک سرائے آج بھی موجود ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر شیر شاہ نے کرائی تھی۔ (دیکھیے مارٹن وہی۔ صفحہ ۵۶۰)۔

[2] رام گڑھ موہنیا کے شمال اور سہسرام سے شمال مغرب واقع ہے۔ مارٹن نے لکھا ہے کہ ضلع رام گڑھ کے درّوں میں چیرو لوگوں کی کافی زمین تھی۔ (ایسٹرن انڈیا۔ صفحہ ۴۴، ۴۶۱) مارٹن نے ضلع رام گڑھ میں ایک مقام کا نام مہارتھ لکھا ہے۔ اس نام سے ہم کو عباس اور دوسرے مورخوں کی مہارتھ چیرو مقام کی شناخت میں مدد ملتی ہے جب کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے غالباً رام گڑھ کے چیرو حکمرانوں میں بھدی چند آخری راجہ تھا۔

Marfat.com

اور مہذب تھے یہ لوگ راج بھنت شاخ سے تھے (صحیح لفظ راج بھار ہے)۔
جو کبھی گورکھپور۔ اور بندھیل کھنڈ کے درمیانی علاقہ پر حکومت کرتے تھے۔
جیسا کہ ان کی حکومت کے پرانے کھنڈ ہروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہی لوگ
موجودہ شاہ آباد اور مرزاپور اضلاع میں برسراقتدار تھے۔ جہاں آج بھی
ان کے قلعوں کے کھنڈ ہر بکھرے پڑے ہیں۔ اس علاقہ میں مسلم فتوحات کے
بعد بدنظمی پیدا ہوئی اسی دوران میں آریہ اور دراوڑ قبائل میں جنگ و
جدل چھڑ گئی۔ کبھی ایک کا پلہ گراں ہوتا تھا تو کبھی دوسرے کا۔ جبکہ مغلوب
راجپوت قبائل شمال سے بھاگ کر گنگا پار جنوب میں داخل ہوئے تب انہوں
نے چیروؤں کو اور جنوب میں کھدیڑ دیا۔ مگر چیروؤں نے اپنی کھوئی زمین پر
پھر سے قبضہ کر لیا۔ اور پر مار راجپوتوں کو مار بھگایا۔ مگر پٹھانوں کے عہد میں
بھوجپوریوں نے ان کو نکال باہر کیا۔

میاں حسن کی جاگیر کے شمالی حصہ میں زیادہ تر کاشتکار اور درمیانی طبقہ
کے لوگ رہتے تھے۔ ہندو آبادی کے اعلیٰ طبقوں میں راجپوتوں کا شمار تھا
اور ادنیٰ طبقوں میں تھے اہیر وغیرہ جیسا کہ آج کل بھی ہے۔ راجپوتوں کی
صریحی اکثریت جو آج تک قائم ہے۔ فرید کی حکمت عملی کا ہی نتیجہ ہے۔ اس نے
راجپوتوں کو اسی مقصد سے آباد کیا تھا کہ وہ نہ صرف چیروؤں اور افغانوں
دونوں کو دبائے ہی رہیں گے بلکہ موقع پڑنے پر وہ افغانوں کے خلاف بھی
اس کا ساتھ دیں گے[1]

مارٹن نے ۱۹ویں صدی کے آغاز میں شاہ آباد علاقے کے باشندوں

---

[1] ہمیں یہ بات بے قیل وقال تسلیم کر لینی چاہیے کہ ہندوستان میں اپنے دوسرے
ہم پیشہ لوگوں کے مقابلہ میں بھوجپوری ڈاکو زیادہ بلند حوصلہ ہوتے ہیں وہ خوں ریزی پسند
نہیں کرتے۔ پٹھان بلا آگاہ کیے ہی اپنے شکار کو قتل کر ڈالتا ہے۔ بڑیا میں میرے استاد و میزبان
نے مجھے یہ بتایا کہ منشگو مری کے کاتھی لوگ اپنے شکار کو لوٹنے کے بعد کسی خاردار پیڑ
سے کس کر باندھ دیتے تھے تاکہ اس راستہ سے گزرنے والا کوئی مسافر اس کو بچالے

Marfat.com

کی گفتار اور کردار کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے تین سو سال قبل
کے آباؤ اجداد کے اخلاق و عادات کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مارٹن لکھتا ہے
"وہ خصلتاً جنگجو تھے۔ ان کا میلان طبع رہزنی کی طرف تھا۔ وہ بھالوؤں کے مانند
کاہل تھے۔ اجنبی کو غلط راستہ بتانے میں ان کو بڑا ہی مزا آتا تھا۔ رفتار زمانہ
بھی خطہ زمین کے مقابلہ میں لاچار ثابت ہوئی اور ان کی خصلت میں کوئی نمایاں
فرق نہ پڑا۔ بہرحال ان کا اپنا ایک خاص ہی وجود ہے۔ یہ سیاسی روایات۔
زبان اور کردار و گفتار میں شمال مشرق و مغرب میں سکونت پذیر بندی بولنے
والے اپنے پڑوسیوں سے مختلف ہیں۔ بایں ہمہ وہ بڑی ڈینگ بانکتے ہیں۔
اپنی ناتراشیدہ بولی کا ایک دلچسپ قصہ بتاتے ہیں اور اپنے بھلے اخلاق و
اولوالعزمی پر ناز کرتے ہیں

سلطان سکندر کی منصفانہ حکومت اور اصلاحات کا کوئی اثر اس کی
سلطنت کے دور دراز علاقہ پر نہ ہو سکا۔ جو سرحدی علاقے حال میں ہی فتح
کر کے سلطنت میں شامل کیے گئے تھے وہ دائرہ اصلاح سے باہر رہے۔ یہاں
فوجی اور سیاسی ضرورت کی وجہ سے کچھ نرمی سے کام لینا پڑتا تھا۔ کسی فوجی جاگیر
میں قانون کے ڈھیلے نفاذ سے جو عام خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں ان سب کا
فرید کو سامنا کرنا پڑا۔ چوں کہ فوجی زمیندار اپنی ہندو رعایا کے ساتھ اپنی بات
کا پاس رکھنے میں قاصر تھے اس لیے کاشت کاروں کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی
تھی۔ جاگیردار زمینداروں کے قبیح سے قبیح افعال سے بھی چشم پوشی کرتا تھا۔

جے پور کے مینا لوگ اپنے شکار کو آگاہ تو کر دیتے تھے مگر وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ شکار
خود اپنے آپ کو ان کے حوالہ کر دے۔ وہ بلا خون ریزی و قتل کے کسی کو لوٹنا کسر شان
سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس بھوجپور کے ٹھاکر صاحب (وہاں ڈاکو لوگ زیادہ تر
راجپوت ہیں) مسافر کو کھچڑی کھانے کا موقع دیتے ہیں اور اسے پرامن طریقے سے
رخصت کرتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی پینٹ کی تہلوئی مانگ کر ٹھاکر صاحب کو بطور نذرانہ
پیش کر دے۔

Marfat.com

کیوں کہ اپنے افسروں کی جفاکاری سے اپنی بت پرست رعایا کو تحفظ دینے کے لیے ان کے پاس نہ تو حسب ضرورت طاقت ہی تھی اور نہ کوئی رجحان ہی تھا۔ کاشت کار محض بھیڑوں کے اس گلہ کے مثل تھا جو کہ گرگ خصلت فوجی سپاہیوں کے کرم کا محتاج ہو۔ لومڑی کی طرح چالاک ہندو محاصلین اور افسران دیہہ مقدم و پٹواری جو کہ جاگیردار اور کاشت کار کے بیچ کی کڑی ہوتے تھے۔ ہر دو فریق کو نہایت ہی عیاری سے دھوکہ دیتے تھے۔ چنانچہ کسانوں پر ظلم کرنے والوں اور رعایا کے خون چوسنے والوں کا یہ ایک علیحدہ ہی طبقہ بن گیا تھا۔ اصلی رقبہ کاشت اور اس کی پیداوار کی مقدار کے علم سے بے بہرہ رہ کر انہیں افسران محکمہ مال کی مدد سے جاگیردار ہر ایک گاؤں کی مالگذاری تشخیص کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ چودھریوں اور مقدموں کے موروثی حقوق محاصلانہ بھی بندھے ہوئے تھے جن کا کہ فیصدی تناسب رقم مال گذاری سے تھا۔ ماسوا ان کے کچھ ایسے بھی فرضی غیر قانونی ٹیکس تھے جن کا نہ تو حاکموں کو علم ہی تھا اور نہ ان کے ایما سے وصول کیے جاتے تھے۔ چنانچہ جو لگان کہ کاشت کار حکومت یا جاگیردار کو ادا کرتا تھا۔ اس کے عوض میں وہ حفظ عزت جان و مال کی بجا امید کر سکتا تھا۔ مگر حقیقتاً اس زمانہ میں جبکہ ہندو مسلمان دونوں کے ہی ضابطہ عدل و انصاف میں اس کا ذکر تو بین و مفصل تھا۔ مگر اس کا افادہ معدودے چند کو ہی پہنچ پاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کا صرف ایک جزوی حصہ ہی زیر زراعت آسکا اور اس کا بیشتر حصہ گھنے جنگلوں سے ڈھکا رہا۔ زیادہ دباؤ پڑنے پر دیہی کاشت کار یا تو آمادہ پیکار ہو جاتا یا بھاگ کر پڑوس کے باغی زمینداروں کے پاس پناہ لیتا تھا۔ پرگنوں میں پہنچنے کے بعد فرید نے صورتحال کو بالکل ہی بدلنا شروع کر دیا۔ وہاں قانون کا نفاذ کیا اور نئے معقلانہ ضابطے بنائے۔

فرید کا نظام حکومت اور مالی اصلاحات

جہاں تک کہ عباس کے بیان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے فرید کا نظام حکومت سادہ لیکن بہت سخت و پر اثر تھا مگر اس کی بنا خوف تلوار نہ

Marfat.com

تھی۔ اور نہ یہ کہ رعایا کو دہشت زدہ کر کے اور سخت ضابطوں پر عملدرآمد کر کے بد معاشوں اور باغیوں کو بلا اصلاح کا موقع دیے ہوئے پسپا کیا جائے۔ اس کی حکمت عملی مدبرانہ تھی۔ جس کا کہ دارومدار مصالحت تھا۔ اس میں انسانی ہمدردی کا وہ جز بھی تھا۔ جس کے کہ بموجب بنی نوع انسان کی مشترکہ کمزوری کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ فرید نے اوائل عمر میں کافی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ اس لیے اس کے دل میں اصولوں کے لیے کوئی کٹرپن یا ضد نہیں تھی۔ نہ اس نے اپنے قول وفعل میں کبھی حد اعتدال سے ہی تجاوز کیا۔ وہ ایک ہی نگاہ میں انسان کے مکر و فریب کی گرفت کر لیتا تھا۔ اس کو یہ یقین واثق ہو گیا تھا کہ اوسطاً انسان کو شہرت سے زیادہ زر اور زر سے زیادہ سرعزیز ہوتا ہے مگر آئندہ زندگی میں ذمہ داریوں کے اضافہ اور رفتہ رفتہ ذہن کے دائرہ افق میں توسیع کی وجہ سے اس کا یہ یقین بھی بدل گیا۔

فرید کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ پریشاں کن ماضی کو کلیتاً ٹھکرا دے کر بالکل نیا ہی رویہ اختیار کرنا چاہتا تھا تاکہ ان کے دماغ میں کسی کے خلاف کوئی تعصب باقی نہ رہ جائے۔ چنانچہ اس نے ایک عام جلسہ میں سب فریقوں اور طبقہ کے لوگوں کے لیے عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے واضح طور پر اور پرزور الفاظ میں اپنی نئی حکمت عملی کی عوام کے سامنے تشریح کی۔ اور یہ کہا کہ وہ پوری نیک نیتی اور دیانتداری سے ان کے مفاد کی حفاظت کرنا چاہتا ہے۔ اور اس پالیسی کا یہ ہی مقصد ہے۔

عباس چاہتا ہے کہ ہم اس بات کا یقین کریں کہ فرید نے اپنی جاگیر میں پہنچنے کے بعد اپنے والد کے پرگنہ سہسرام کے کاشتکاروں فوجیوں اور عاملوں کو بلایا اور ایک ہی جلسہ میں زوردار تقریریں دے کر سارے کا سارا کام پورا کر دیا۔ جنہوں نے کہ عباس کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے ان کے دماغ پر اس غلط تصویر کا اتنا اثر پڑا کہ انہوں نے اس کو صحیح باور کر لیا۔ چنانچہ دوران حال کے مورخین[1] نے (جن میں کہ میرا بھی شمار ہے) اتنا سوچنے کی بھی کوشش

---

[1] شیر شاہ پہلا ایڈیشن ۱۹۲۱ء صفحہ ۱۲ الغایت ۱۹۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد دی لائف

نہیں کی کہ صرف جلسہ کی ایک ہی بیٹھک میں دھمکیوں اور تقریروں کا کتنا جادوئی اثر ہو سکتا تھا۔ اور نہ مورخین نے اس جانب ہی دھیان دیا کہ سہسرام کے چھوٹے سے قصبہ میں یعنی ۴۰ مربع میل کے علاقہ کی آسامیاں کیسے اکٹھا ہو سکیں یہ خیال محمد تغلق کے ہی شایان شان تھا۔ بیش از بیش اتنا کہنا ہی مناسب ہوگا کہ فرید کی پالیسی تھی کاشت کاروں اور ان کے اصلی نمائندوں اور رہبروں سے براہ راست تعلق قائم کرنا۔ اس پالیسی کی تکمیل کے لیے اس نے نہ صرف ایک ہی جلسہ سہسرام میں کیا ہوگا بلکہ دونوں پرگنوں کے دوران معائنہ میں اکثر مقامات پر تقریریں کی ہوں گی۔ اس نے ستم رسیدہ کاشت کاروں۔ جفا کار فوجیوں اور جابر عاملوں کو اکٹھا کر کے ہر ایک طبقہ سے حسب حال باتیں کہی ہوں گی۔ اس کا اصول یہ تھا کہ وہ ہر چیز اپنی آنکھ سے دیکھے۔ اپنے کانوں سے سنے اور جلد از جلد ہر مجرم کو اپنی مرضی کے مطابق سزا دے۔ وہ آرام طلب حاکم نہیں بننا چاہتا تھا جس تک کہ عوام کی رسائی نہ ہو سکے۔* جس کے پاس کسی واقعہ کی تفصیل جاننے کے لیے نہ وقت ہوا اور نہ شوق ہی۔

تاریخ عباس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حسن کی جاگیر کا انتظام فرید کے ہاتھوں میں کب تک رہا۔ عباس لکھتا ہے کہ بہت مدت کے بعد جب حسن جمال کے پاس سے آیا تو فرید کا یہ چارج ختم ہو گیا۔ (عباس قلمی نسخہ صفحہ ۳۹۔ بعد از مدتے) ابراہیم

ایںڈ ٹائمس آف ہمایوں"۔ ۱۹۵۵ء صفحہ ۹۹۔ عباس کے قلمی نسخہ صفحہ ۲۵ تا ۲۹ میں یہ عبارت ہے "امر فرمود کہ مقدم و مرزایان کہ مدار آبادانی زراعت از ایشاں است . . . . حاضر شوند۔ چوں رعیت مذکور حاضر شد سپاہیاں نیز طلبید۔ چوں از نعمت سپاہی فارغ شد۔ روبہ رعیت آورد گفت"۔ اس اقتباس سے یہ واضح ہے کہ جلسہ میں صرف رعیت اور مقدم ہی بلائے گئے تھے۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے پریشانی سے پیچھا چھڑانے کے خیال سے اس عبارت سے لفظ "رعیت" قلم زد کر دیا ہے جس سے فرید کا منشا ہی فوت ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ رعایا سے براہ راست ہی ملنا چاہتا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے گا باب ۳ کا ضمیمہ۔

Marfat.com

کے عہد کے سنسنی خیز واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۲۲ء تک جونپور اور اس کے قرب و جوار کے علاقہ میں بدامنی جاری رہی لہٰذا میاں حسن کو ۱۵۲۲ء کے بعد ہی اپنے وطن لوٹنے کا موقع ملا ہوگا۔ اس حساب سے فرید حسن کی جاگیر کا منتظم تقریباً ۴ سال تک رہا۔ اسی دور میں اس نے انتظامی اور فوجی اصلاحات کے لئے ۱۵۱۸ء کے موسم گرما میں غالباً اپنے پرگنوں کا دورہ کیا اور بچشم خود اصل حالات کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد ہی اس نے اپنی مالی اصلاحات کا پروگرام نافذ کیا ہوگا۔

فرید کے بندوبست کے خاص پہلو اور اس کی واقعی کامرانی کا صحیح اندازہ اس سلوک سے ہو جاتا ہے جو کہ اس نے سپاہی۔ زمینداروں۔ عامل۔ کاشتکاروں اور ان کے رہبر مقدم اور پٹواریوں کے ساتھ کیا۔ جاگیر کے انتظام میں فرید کو اختیارات مکمل حاصل تھے۔ وہ کسی بھی سپاہی کی جاگیر ضبط کر سکتا تھا بشرطیکہ یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے کاشت کار پر تشدد کیا یا بے جا لگان وصول کرنے میں اپنے قول کا پاس نہیں کیا ہے اور من مانے طریقہ سے روپیہ وصول کیا ہے لیکن صرف یہ دھمکی سپاہی زمینداروں کو مرعوب کرنے کے لیے کافی نہ تھی۔ مگر جلد ہی ان کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اگر انھوں نے اس کو بلا وجہ ناراض کر دیا تو فرید ہوشیاری اور خونخواری میں ان سے کم نہ ثابت ہوگا۔ فرید نے یہ پالیسی اختیار کی کہ وہ سب طبقہ کے لوگوں کے مستقل حقوق میں دست اندازی نہ کرے گا۔ لہٰذا اس نے فوجی زمینداروں کے ساتھ ایک مناسب سمجھوتہ کر لیا اور ان کی جائیداد میں ان کے قانونی حقوق کو مستحکم کر دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر کاشت کاروں کی محنت کی وجہ سے رقبہ زراعت میں اضافہ ہو یا آمدنی میں اضافہ ہو تو اس کا بھی فائدہ انہیں کو حاصل ہوگا مگر اس میں یہ شرط لگا دی کہ وہ اپنی جبلی قانون شکنی اور رعایا۔ کے ساتھ وعدہ فراموشی کی قبیح عادت کو چھوڑ دیں گے۔ فرید نے سپاہیوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس کے کسی عزیز و اقربا بھی اتنے سے جرم کے مرتکب ہوئے کہ کسی کاشت کار کے کھیت میں سے ایک پتی بھی اکھاڑی تو وہ انکو بھی مناسب سزا دینے سے دریغ نہ

Marfat.com

کرے گا۔ اسکے الفاظ پہ لوگوں کو اطمینان ہوا اور سنگدل سے سنگدل کا پتہ پگھل گیا۔

فرید دینی علوم کا ماہر تھا۔ اس کی شہرت نے بھی سرکش افغانوں کے دلوں پر ضرور سکہ بٹھایا ہوگا۔ ان کے لیے تلوار کے مقابلے میں ایک ملا کا قول زیادہ قابل یقین تھا۔ مگر اس کا حوالہ نہیں ملتا کہ کیا کبھی فرید کو سپاہیوں کا جی توڑ مقابلہ بھی کرنا پڑا اس کے برعکس عباس رقمطراز ہے کہ جب سپاہی میاں حسن کی خدمت سے واپس آئے تو انہوں نے فرید کی پالیسی کی بہت تعریف کی۔ کیوں کہ ان کو اب اس بات کا یقین ہو گیا کہ اس کے نفاذ سے ہر زمیندار بہ سہولیت کاشت کار سے لگان وصول کر سکے گا۔ جہاں تک کاشت کاروں کا واسطہ ہے توسیع زراعت سے ان کی آمدنی میں متواتر اضافہ ہوتا رہا۔ اس سے فرید کو ایک عبرت انگیز سبق یہ بھی ملا کہ فوجیوں کو نقد تنخواہ کے بجائے جاگیر دینا کتنا فضول خرچ دستور ہے اس کے علاوہ اس سے فوجی زمینداروں کا ایک طبقہ وجود میں آجاتا ہے جو کہ سرکاری گرفت میں ذرا سی ڈھیل پڑنے سے سلطان کی حکم عدولی کرنے لگتا ہے۔ اور اپنے امن پسند پڑوسیوں پر حملہ کرنے لگتا ہے۔ شیر شاہ کی فوجی اصلاحات کی مبدا کی یہاں تلاش کرنی چاہیے نہ کہ ضیاالدین برنی کے بیان کردہ علاؤالدین کی اصلاحات میں۔

فرید نے نہایت جانفشانی سے محکمہ زراعت کی بے عنوانیاں دور کرنا شروع کر دیں۔ اور ایسی اصلاحات کیں جن سے کہ مستقبل میں پریشانیاں دور ہو جائیں۔ معاشیات کے فطری اصول کے بموجب ابتدائے تاریخ سے ہندو حکمرانوں کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ زراعت ہی دولت کا صرف ایک ذریعہ ہے۔ عباسی خلیفاؤں کے عہد سے اسلام کے سیاسی اصول کا بھی یہی نظریہ رہا ہے لہٰذا یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی کہ فرید نے بھی زراعت کو اپنی حکومت کا سنگ بنیاد سمجھا اور انتظامیہ امور میں کاشت کار کے مفاد کو سب سے زیادہ ترجیح دی۔

زراعت پیشہ لوگوں کی خاص شکائتیں تھیں لگان کا من مانا اور بوجھل

Marfat.com

تخمینہ اور اس کی وجہ سے روز افزوں بقایا لگان وصول کرنے والے اہلکاروں کی ضمیر فروشی اور بے ایمانی اور عاملوں سے مل کر پٹواریوں اور مقدموں کا در پردہ ابوابوں کا اینٹھنا۔ علاوہ بریں اب تک کاشت کاروں اور جاگیرداروں کے مابین ایک رشوت خور اور نیم سرکاری نظام حائل تھا۔ کاشت کار اس سے اتنا خوفزدہ تھا کہ اس کو نظر انداز کر کے اپنی تکلیفوں کی براہ راست شکایت جاگیردار سے کرنے کی جرأت بھی نہ کر سکتا تھا۔ عموماً دیہاتی علاقہ میں جاگیردار تو کبھی کبھی ہی دکھائی پڑتا تھا۔ چنانچہ اس کو اپنی جاگیر کی اندھیر گردی کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ نیک دل و نیک ارادہ رکھتے ہوئے بھی رعایا کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اس زمانہ کا یہ عام دستور رہا کہ کسی حکمراں کا رعایا سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ حکومت کا واسطہ چند برسر آوردہ لوگوں تک ہی محدود تھا۔ مثلاً گاؤں کے مقدم، پٹواری، چودھری وغیرہ ہر مسئلہ پر انہیں لوگوں کی بات مانی جاتی تھی۔ خواہ وہ مسئلہ لگان وصولی کا ہو یا علاقہ میں امن وامان قائم رکھنے کا۔ یہی لوگ یعنی مقدم (جسے ہندی زبان میں پردھان یا پٹیل کہتے تھے) اور چودھری (یعنی اردنی مجسٹریٹ) زمانہ قدیم سے گاؤں کے معزز لیڈر مانے جاتے تھے اور رعایا اور حکام کے درمیان کی ایک کڑی تھے۔ ان کا وہی درجہ تھا جو محکمہ مال میں پٹواری کا تھا۔ انہیں لیڈران کی وفاداری پر دیہات کی ساری رعایا کی وفاداری کا انحصار تھا۔ جیسا کہ آج کل بھی دیکھنے میں آتا ہے سرکار اور کاشت کاروں کی نظر میں پٹواری کا درجہ بہت اونچا تھا۔ وہ محکمہ مال کا ایک اہم پرزہ اور اپنے موضع کے مالی اسرار کا محافظ و امین سمجھا جاتا تھا۔ وہ گاؤں کا دماغ اور اس کی جمہوریت کا وزیر تھا۔ دیہات کی رعایا میں کسی مسئلہ پر غور کرنے اور فیصلہ لینے کی اہلیت نہیں تھی۔ وہ ان لیڈران کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی تھے۔ جو ان کو بھیڑ اور بکریوں کی مانند اپنی حسب مرضی ایک ہی ساتھ میں کسی بھی جاگیردار یا زمیندار کے سپرد کر دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ سرسبز و شاداب علاقہ ویران بن جاتا تھا۔

فرید اس طبقہ کے ساتھ سختی اور ہوشیاری سے پیش آیا۔ ایک طرف ان اہلکاروں کی جن کو کہ دستوراً روپیہ ملتا تھا اس بالائی آمدنی کو اس نے مستقل

Marfat.com

کر دیا اور دوسری طرف ان اہلکاروں کو اپنے بندوبست کا جز بنا دیا حسب معمول عباس فرید کے محکمہ مال کی اصلاحات کا تفصیل سے کہیں ذکر نہیں کرتا ہے بلکہ اس تصویر کی تکمیل کا کام مورخوں کے قیاس وگمان پر چھوڑ دیتا ہے عباس نے ان جملہ اصلاحات کا ایک ہی سودمند تقریر میں اختصار کر دیا ہے یہ تقریر فرید نے اول بار اس وقت کی تھی جبکہ تمام کاشتکاروں اور مقدموں کو جمع کیا تھا۔ مگر واقعہ تو یہ ہے کہ یہ اس کی چار سال کی اصلاحی کارروائیوں کا خلاصہ ہے۔ تاہم عباس کا مکمل بیان قابل اقتباس ہے۔

"جب وہ سپاہیوں سے اپنی بات کہہ چکا تب وہ رعایا کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس نے یہ کہا "آج میں تمہیں پوری آزادی دیتا ہوں کہ اپنا طرز عمل چن لو" کچھ کاشت کاروں نے تو جریب کے لئے رضامندی ظاہر کی اور کچھ نے غلہ دار ن پسند کیا۔ فرید نے کاشت کاروں سے انہیں کے قلم سے قبولیتیں لکھوائیں۔ اور یہ کہا "میں نے محصلانہ اور محصلوں (لگان وصول کرنے والے) کی خوراک مقرر کر دی ہے۔ اگر کسی اہلکار نے مقررہ درسے زیادہ کسان سے وصول کیا تو حساب فہمی کے وقت اس سے یہ مجرا نہیں ہوگا۔ (مجرا نا خواہم داد) یہ بات واضح رہے کہ حساب فہمی میرے روبرو ہوگی۔ اور میں صرف تمہارا جائز خرچہ ہی پاس کروں گا۔ لگان صرف ضابطہ کے مطابق ہی وصول ہونا چاہیئے۔ خریف کے لگان کی خریف میں اور ربیع کے لگان کی ربیع میں پوری وصولیابی ہونی چاہیئے۔ بقایا لگان سے پرگنہ برباد ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے عاملوں اور رعیت کے درمیان نفاق پیدا ہو جاتا ہے۔ حاکم کا یہ فرض ہے کہ زمین کی پیمائش اور لگان مقرر کرتے وقت وہ رعایا کے ساتھ نرمی سے کام لے اور ان کے مقدور کے بموجب لگان مقرر کرے لیکن بوقت وصولی سختی سے پیش آئے۔ اور پورا لگان وصول کرے۔

اگر رعیت میں سے کوئی دھوکہ دے تو اس کو اتنی سخت سزا ملنی چاہیئے کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ اور کوئی دوبارہ ایسا کرنے کی جرأت نہ کرے۔ اگر رعیت میں سے کسی کو کوئی پریشانی یا مشکلات ہوں تو وہ خود میرے روبرو پیش کرے میں کسی کو ان پر ظلم نہیں ڈھانے دوں گا۔" فرید کی کاشت کاروں کو آخری نصیحت یہ تھی۔

Marfat.com

"جاؤ اور پوری تندہی سے اپنے کھیتوں میں کام کرو اور سرکار کے وفادار رہو"۔ کاشت کاروں کو رخصت کرنے کے بعد اس نے اپنے والد کے عہدہ داروں سے خطاب کیا "میں نے اطاعت شعار رعیت کو تسلی وتشفی دے کر رخصت کر دیا ہے۔ اب میں ان کے مفاد کو مد نظر رکھوں گا تاکہ نہ تو کوئی ان کے ساتھ بدسلوکی کر سکے۔ اور نہ کوئی انہیں ستا سکے۔ اگر کوئی حکمراں رعایا کو افسران کے ظلم سے نہیں بچا سکتا تو اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ رعایا سے لگان وصول کرے"۔ (قلمی نسخہ عباس۔ صفحات ۲۸۔۲۹) عباس کے ان الفاظ سے فرید کے نظام حکومت اور پالیسی کی مکمل اور نمایاں جھلک ملتی ہے۔ لیکن اس جگہ عباس نے ایک بھول کی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق فرید نے پہلے ہی عام جلسہ میں جریب۔ قبولیت۔ پٹہ۔ ضابطہ وغیرہ کا ذکر کر دیا۔ حالانکہ حقیقت کچھ اور رہی ہے۔ عباس نے اکبر کے عہد حکومت میں اپنی کتاب لکھی تھی۔ اس لیے اس نے فرید کی مالی اصلاحات کا جو برسوں کی کاوش اور تجربہ کا نچوڑ ہیں شروع میں ہی ذکر کر دیا۔ جب فرید نے میاں حسن کی جاگیر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا تو ان دستوروں کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ فرید نے ہی اس وقت بتدریج ایک منظم محکمہ مال کا انصرام کیا جو کہ بعد کو اس کی سلطنت کے مالی نظام کا ابتدائی نمونہ بنا۔ پھر مغلیہ سلطنت اور برٹش سلطنت نے اس کو اپنایا اور جیسا کہ ہم آگے چل کر بتلائیں گے یہ آزاد ہند کو بھی سالماً دستیاب ہوا۔

فرید کے حملے اور تعزیری مہم

سہسرام کے بندوبست کے زمانہ میں فرید کو دو کام ایک ہی ساتھ کرنے پڑتے تھے۔ ایک اصلاح کا اور دوسرا سپاہی کا۔ جونپور کے قیام کے آخری حصہ میں فرید سول اور مالی محکموں کے انتظام کا تقریباً ماہر ہو گیا تھا۔ لیکن اپنے والد کی جاگیر کا مہتمم مقرر ہونے سے پیشتر اس نے کئی فوجی خدمات بھی انجام دیں اس کا کوئی ثبوت ہمارے پاس نہیں ہے۔ تاہم فرید زندگی کے شروع میں ایک رہزن رہ چکا تھا۔ موقع پڑنے پر جیسا کہ اکثر جو رو لٹیرے ہوا کرتے ہیں وہ اعلیٰ سپاہی بھی ثابت ہوا

Marfat.com

اگرچہ فرید کے پاس جنگ کا کوئی سامان نہ تھا اور نہ اس کے والد کے اصطبل میں گھوڑے تھے نہ گھوڑوں کیلئے زین۔ تو بھی اس نے باغی مقدّم اور سرکش زمینداروں کو دبانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اسکے پرگنوں کے زیادہ تر سپاہی میاں حسن کے ساتھ بہ کار سرکار جونپور میں حاضر تھے صرف سن رسیدہ اور نوآزمودہ سپاہی ہی اپنے عیال و اطفال کے ساتھ گھروں پر موجود تھے فرید نے اپنے والد کے عاملوں کو حکم دیا کہ وہ دو سو زین فوراً تیار کرائیں۔ (زین راست کنید) اپنے دو پرگنوں میں ایسے افغانوں اور خیل داروں (یعنی باعزت خاندانوں میں) کی جو کہ تنومند مگر بے روزگار نوجوان تھے شماری کروائی۔ ان کو اپنے حضور میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ اور بطور والنٹیر کے بھرتی ہونے کی تاکید کی۔ اس نے یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کے کھانے کپڑے کا صرفہ خود ہی برداشت کرے گا۔ اور جو باغیوں کا مال غنیمت نقد اور سامان کی شکل میں ان کے ہاتھ لگے گا اس میں وہ اپنا حصہ نہیں بٹائے گا۔ ان کو گھوڑے دینے کا بھی اس نے ذمہ لیا اور میدان جنگ میں نمایاں دلیری دکھانے پر ان کو جاگیریں دلوانے کا بھی وعدہ کیا۔ جو لوگ ان باتوں پر راضی ہو گئے۔ ان کو اس نے بطور انعام کپڑا اور کچھ نقدی نہایت خوش خلقی سے یہ کہہ کر دی کہ یہ ان کے حمام کا صرفہ (وجہ صابن) ہے۔ اس طرح اس کو زین اور سپاہی تو مل گئے لیکن اس کے پاس سواروں کے لیے گھوڑے نہ تھے۔ اس نے رعایا کو بلایا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے گھوڑے اس کو عاریتاً دیدیں۔ اور یہ وعدہ کیا کہ مہم کے بعد وہ ان کو واپس کر دے گا۔ رعایا فوراً بخوشی تیار ہو گئی اور ہر گاؤں سے ایک یا دو گھوڑے آئے۔ اس طرح والنٹیر فوج کے ایک چھوٹے سے دستہ کے ساتھ پہلی مرتبہ فرید اپنی زندگی میں سپاہیانہ کارگذاری دکھانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۰ اور ۴۰ سال کے درمیان تھی۔

فرید کو دو قسم کے باغیوں کو سزا دینی تھی۔ پہلا طبقہ سرکش مقدموں کا تھا۔ جو جاگیردار کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر لگان دینا بند کر دیتے تھے۔ وہ زمینداروں کی طرح فطرتاً سرکش نہیں تھے۔ یہ زمیندار عملی طور سے خود مختار تھے۔ وہ جنگلوں میں قلعہ بنا کر رہتے تھے۔ اور اپنے مسلم جاگیرداروں کو چنوتی دیتے

رہتے تھے۔ یہ زمیندار جب تک کہ ان کی گردن پر تلوار نہ رکھی جائے کسی قسم کا مطالبہ ادا نہ کرتے تھے۔ اور کسی طاقتور مالک کو کبھی کبھی کچھ دیتے بھی تھے۔ اس کی نوعیت یہ ہوتی تھی کہ کوئی مشتبہ وفاداری والا سردار خراج ادا کرے۔ اگر زمیندار مالکوں کی اطاعت بھی قبول کر لیتے تھے تو بھی مالکوں کی رسائی ان کے علاقہ تک نہ ہو پاتی تھی۔ وہاں وہ کلیتًا با اختیار تھے۔ جب سب تیاریاں مکمل ہو گئیں تب فرید سرکش مقدموں کے گلوؤں پر ٹوٹ پڑا۔ دیہاتیوں کے مویشیوں۔ املاک حتیٰ کہ بیوی بچوں کو بھی چھین لیا۔ حسب وعدہ اس نے مال غنیمت تو اپنے سپاہیوں کو تقسیم کر دیا۔ مگر دیہاتیوں کے کنبوں کو اپنی ہی حراست میں رکھا تاکہ سپاہی ان پر جور و تشدد نہ کر سکیں۔ جب مقدّموں نے اطاعت قبول کر لی۔ بقایا لگان ادا کر دیا۔ اور مستقبل میں اپنی خیر خواہی اور وفاداری کی ضمانت دیدی تو فرید نے ان قیدیوں کو رہا کر دیا۔

باغی زمینداروں کی سرکوبی کے لیے کافی اسلحہ جنگ اور مزید سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ فرید نے یہ کام نہایت دور اندیشی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا اس نے اپنے رسالہ میں مقامی ہندو کسانوں کو بھرتی کر لیا۔ اور رعیت کے نام فرمان جاری کیا کہ جن لوگوں کے پاس گھوڑے ہیں وہ سوار ہو کر اور جن کے پاس گھوڑے نہیں ہیں وہ پیدل میرے سامنے حاضر ہوں۔ اس نے ان میں سے نصف لوگوں کو فوج میں بھرتی کر لیا۔ اور باقیوں کو کاشت کرنے اور اپنے گھروں کی حفاظت کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ (عباس صفحہ ۳۴ اور ایلیٹ میں کچھ فرق ہے)۔

اپنی اس عارضی فوج کے ساتھ فرید نے باغی زمینداروں کے علاقہ کیطرف بہ احتیاط تمام کوچ کیا۔ وہ ہر پڑاؤ پر اپنی فوج سے ایک کوس کے فاصلہ پر چہار طرف قلعہ خام سے ناکہ بندی کرتا تھا[1] اور فوج کو اس کے اندر بحفاظت تمام ٹھہراتا

---

[1] یہیں سے فوج کے چاروں طرف قلعہ بندی کرنے کے طریقہ کا آغاز ہوا جو شیر شاہ نے اپنی تمام عمر استعمال کیا۔ یہ طریقہ کوئی نیا یا غیر معمولی نہیں تھا۔ بلکہ ضرورت کا تقاضا تھا۔ شیر شاہ سے پہلے اور بعد کے حکمرانوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔ مثلاً سلطان فیروز فرمی

Marfat.com

تھا۔ اس نے پیدل سپاہیوں کو یہ حکم دیا کہ گاؤں کے چاروں طرف کے جنگل صاف کردیں اور رسالہ کے سپاہیوں کو گاؤں کے چاروں طرف گشت لگانے و فصل کو برباد کرنے۔ مویشیوں کو ہنکالانے۔ عورتوں بچوں کو قید کرنے اور آدمیوں کو تلوار کے گھاٹ اتارنے کی ہدایت کی۔ اس طرح گاؤں کی پوری ناکہ بندی ہو جاتی تھی۔ جنگل صاف ہونے کے بعد وہ اپنی فوج کو گاؤں کے اور نزدیک لاتا اور اپنے لشکر کے چاروں طرف کھائی کھود کر قلعہ خام بنا کر اس کی حفاظت کا انتظام کرتا تھا۔ جب زمینداروں کے پاس جنگل میں چھپنے کا کوئی وسیلہ نہ رہا تو مجبور ہو کر انہوں نے اطاعت قبول کرلی اور ہرجانہ میں ایک رقم کثیر ادا کرنے کو تیار ہو گئے۔ لیکن فرید اس قسم کا حکمراں نہ تھا جو عارضی نفع کے لیے اپنے مصمم ارادہ کو بدل دیتا۔ وہ ان سرکش شریر زمینداروں کو جڑ سے اکھاڑنا چاہتا تھا اس نے ان کے قلعوں کو برباد کیا۔ جملہ باغیوں کو قتل کیا اور ان کے بیوی بچوں کو غلام بنا کر فروخت کردیا۔ پھر اس ویران علاقہ کو آباد کرنے کے لیے اس نے اپنے پرگنہ کے تمام حصوں سے آدمیوں کو بلا کر بسایا۔ جب دوسرے غداروں نے اس قتل و غارت گری ظلم و ستم کی داستان سنی تو ان کی عقل ٹھکانے آگئی۔ انہوں نے اظہار ندامت کیا۔ اور آئندہ لوٹ مار اور رہزنی سے توبہ کی (ڈایلیٹ جلد ۴۔ صفحہ ۳۱۷) ان باغی زمینداروں کے سرکشانہ رویہ کو دیکھتے ہوئے ان کے ساتھ فرید نے جو سلوک کیا وہ درحقیقت اس کے مستحق تھے۔ اس میں بے جا بے رحمی نہ تھی بلکہ یہ حاکم کی طرف سے منصفانہ سختی تھی۔ بلاشبہ یہ زمیندار اس کے پرگنوں میں امن و امان قائم کرنے کی راہ میں مستقلاً مسدود مانع تھے۔

قرون وسطیٰ میں جنگ کے دوران دشمن کے بیوی بچوں کو قید کرکے غلام بنانا اور ان کو فروخت کرنا ایک عام رواج تھا[1] سرکش مقدم اور کاشتکاروں کی

پڑاؤ کے چاروں طرف کاٹھ گڑھ بنایا کرتا تھا۔ اسلام خاں نے بھی جب عثمان کے خلاف فوج کشی کی تھی تو اپنے پڑاؤ کے چاروں طرف قلعہ خام بنوایا تھا۔

[1] ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس قسم کے تعزیری اقدام کی (باقی حاشیہ صفحہ 125 پر)

Marfat.com

بقایا لگان وصول کرنے کا اس کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں تھا کہ انہیں حراست میں لیا جائے اور ان کی جائیداد پر قبضہ کر لیا جائے۔ برطانیہ حکومت کے شروع زمانہ تک اسی طریقہ کا چلن رہا۔

فرید کا اپنے عہدے سے استعفا

فرید نے جاگیر کے انتظام میں جو کارہائے نمایاں کیے ان کا صلہ اس کو یہ ملا کہ جب میاں حسن کچھ عرصہ بعد اپنے سپاہیانہ فرائض کی انجام دہی سے فارغ ہو کر جونپور سے واپس آئے تو فرید سے یہ کہا کہ اب اس کی خدمت کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ یا تو اپنے عہدہ سے از خود مستعفی ہو جائے ورنہ اسے برخاست کر دیا جائے گا۔ میاں حسن کی جونپور سے سہسرام واپس لوٹنے کی تاریخ کا مورخوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ اس کا صرف عباس کے اس فقرے سے "بعد مدت" اور اس ضمنی بیان سے کہ فرید کے استعفیٰ کے وقت بہار کے لوہانی سلطان دہلی کے خلاف منصوبہ باندھ رہے تھے تھوڑا بہت اندازہ لگایا جاسکتا ہے لہذا عباس کے بیان کردہ واقعات کی تقریباً صحیح تاریخ معلوم کرنے کے لیے اس وقت کی لودی سلطنت کے سیاسی حالات کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔

۱۵۱۸ئ کے آخری نصف دور میں سلطان جلال الدین (شہزادہ جلال خاں لودی) نے جو تخت کا دعویدار تھا تمام دوآب کے علاقہ میں بدامنی پھیلادی۔ اس نے اودھ اور جونپور پر قبضہ جما لیا۔ سلطان ابراہیم لودی دہلی سے ایک فوج لے کر اعظم ہمایوں خاں سروانی اور جلال الدین کے دوسرے مددگاروں کو دبانے کے لیے روانہ ہوا۔ ابراہیم کی فوج کی آمد سے ضعیف الارادہ تو خوف زدہ ہو گئے۔ مگر ابراہیم کے حمایتی حوصلہ مند ہو گئے۔ اعظم ہمایوں سروانی سیاسی چالباز تھا۔

(بقیہ حاشیہ ۱۲۴ کا) تعریف کی ہے (آئین اکبری۔ جیرٹ جلد ۲۔ صفحہ ۴۰) اکبر نے اپنے تحصیلداروں کو اس قسم کی ہدایت دی تھی کہ وہ باغی گاؤں کا محاصرہ کریں اور باغیوں کے جان و مال کو ہر ممکن طریقہ سے نقصان پہونچائیں۔

Marfat.com

اس کو بد قسمت دعویدار شہزادہ سے غداری کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ ہوا۔ وہ اپنے لڑکے فتح خاں کو لے کر ابراہیم کی جانب رجوع ہوا۔ ابراہیم نے اپنے تمام امراء سرداروں کو اس کے شاندار استقبال کے لیے بھیجا اور غداروں کو انعام دیے۔ یہاں سے وہ سلطان کی فوج کے ساتھ قنوج پہنچے۔ اسی درمیان جلال خاں آگرہ کی طرف تیزی سے روانہ ہوا اور اس خیال سے کہ سلطنت میں شورش برپا ہو جائے اور اگر ممکن ہو تو آگرہ پر قبضہ کرے (ڈارن ا۔ صفحہ ۷۰)

آگرہ پر دھاوے کی خبر پاتے ہی سلطان ابراہیم فوراً اٹاوہ کے راستہ ہوتا ہوا آگرہ کی جانب روانہ ہوا۔ اس نے اپنی فوج کا ایک دستہ اعظم ہمایوں عمر خاں سروانی اور دیگر سرداروں کی کمان میں جلال خاں کے مضبوط قلعہ کالپی پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ تاکہ جلال خاں واپس لوٹنے کو مجبور ہو جائے۔ اور فوج کا دوسرا دستہ ملک آدم خاں ککر اور دیگر سرداروں کی کمان میں جلال خاں کی آگرہ میں پیش قدمی کرنے کے لیے اس طرف روانہ کیا۔ جلال خاں اس وقت تک آگرہ شہر کے ایک حصہ پر قابض ہو چکا تھا۔ اور قلعہ پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ کہ ملک آدم خاں ککر نے صلح کی بات چیت شروع کر دی تاکہ مزید کمک کے آنے تک وہ دشمن کو الجھائے رہے۔ اس کی یہ چال کارگر ثابت ہوئی۔ جلد ہی جلال خاں نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن"۔ کالپی تو اس کے ہاتھ سے نکل ہی گیا تھا۔ اور آگرہ پر قبضہ پانے کی کوئی امید نہ رہ گئی تھی۔ ملک آدم ککر اور ابراہیم کے دوسرے امیروں نے جلال کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر وہ تمام شاہی نشانوں سے دست کش ہو جائے اور ابراہیم کی ماتحتی قبول کرے تو اس کے عوض میں اس کو کالپی واپس کر دی جائے گی۔ جلال خاں نے تو ان شرطوں کو منظور کر لیا مگر جب آدم خاں ککر شاہی چھتر اور دیگر نشانات لے کر اٹاوہ میں ابراہیم خاں کے سامنے حاضر ہوا تو اس نے ان شرطوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ پناہ گزینی کے خیال سے جلال گوالیار کے راجہ کے پاس پہونچا۔ ادھر ابراہیم کے رویہ سے وہ امیر برگشتہ و ناراض ہو گئے۔ جنہوں نے جلال سے قول و قرار کیا تھا۔

Marfat.com

اب سلطان ابراہیم نے اعظم ہمایوں عمر خاں سروانی کو جلال خاں کے تعاقب میں گوالیار روانہ کیا تا کہ وہ جلال خاں کو وہاں سے نکال کر قلعہ کو ہندو راجہ کے قبضہ سے چھین لے۔ جلال خاں گوالیار سے بھاگ نکلا۔ اور اس نے مانڈو کے خلجی سلطان کے یہاں پناہ مانگی۔ یہاں سے مایوس ہو کر وہ گڑھ گنگا (سینٹرل انڈیا) کے جنگلوں میں گھسا مگر یہاں ابراہیم کی فوج کی ایک ٹکڑی نے جو اس کا تعاقب کر رہی تھی اسے گرفتار کر لیا۔ جلال خاں کو قید کر کے ہانسی بھیجا جا رہا تھا لیکن راستہ میں اس کے محافظین نے ہی اسے قتل کر دیا۔ جلال خاں کی وفات کے بعد بھی سلطنت کے مشرقی علاقہ میں امن قائم نہ ہو سکا اور اس لیے میاں حسن کو فرض منصبی سے چھٹی ملنے کا موقع ہی نصیب نہ ہوا۔

جب اعظم ہمایوں عمر خاں اور اس کا لڑکا سلطان کے دربار میں اپنی گوالیار کی کامیابی کا انعام لینے گئے تو دغا باز سلطان نے انہیں قید خانہ میں ڈال دیا۔ سلطان کی اس حرکت سے تمام دوآب میں آگ لگ گئی۔ اور ہر سروانی نے تلوار اٹھالی۔ لودی اور فارملی امیر بھی جو سلطان سے ناراض تھے۔ اس بغاوت میں شامل ہو گئے۔ اور اس طرح ۱۵۲۰ء کے نزدیک صورت حال بہت نازک ہو گئی سلطان ابراہیم نے اپنے دربار کے لودی۔ فارملی اور لوہانی سرداروں کی کمان میں باغیوں کو دبانے کے لیے ایک فوج بھیجی۔ باغیوں کے سرغنہ تھے خاں جہاں لودی۔ اسلام خاں سروانی ولد عمر خاں۔ دلاور خاں سارنگ خانی بھی اس فوج کے ساتھ گیا[1] (جونپور کے جمال خاں سارنگ خانی کا غالباً انتقال ہو چکا تھا) جب بادشاہی فوج دریائے گنگا کے مغربی کنارے پر قنوج اور کانپور کے درمیان بانگر اشو کے نزدیک پہنچی تو باغیوں نے دفعتہً حملہ کر دیا۔ شاہی فوج

---

[1] ڈارن جلد ۱۔ صفحہ ۷۰۔ لیکن اس جگہ بابر کا بیان زیادہ درست ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ابراہیم نے مصطفیٰ فارملی اور فیروز خاں سارنگ خانی کو مشرقی باغیوں کو دبانے کے لیے بھیجا۔ (تزک صفحہ ۵۲۷) ظاہر ہے کہ جمال خاں کی وفات کے بعد فیروز خاں کا تقرر جونپور میں ہوا ہو گا۔

Marfat.com

کو شکست فاش ہوئی اور کثیر نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ یہ سن کر ابراہیم آگ بگولہ ہو گیا اور اس نے مزید کمک روانہ کی۔ لیکن اب کی بار اس کی فوج میں بغاوت پھیل گئی۔ باغیوں نے اسلام خاں سروانی کی قیادت میں بادشاہ کے سامنے صلح کی یہ شرط پیش کی کہ عمر خاں اور فتح خاں کو قید سے رہا کر دیا جائے۔ سلطان کے افسروں نے اس شرط کو منظور کرنے کے لیے دباؤ ڈالا مگر سلطان نے ان کی ایک نہ سنی اور اس نے بہار کے دریا خاں لوہانی۔ غازی پور کے ناصر خاں لوہانی اور اودھ کے شیخ زادہ مسطفی خاں فرملی کو لکھا کہ وہ اپنے علاقہ کے وفادار جاگیرداروں کو فراہم کر کے باغیوں کی سرکوبی کریں۔ پاک طینت اور دانشمند لوگوں نے صلح کی ہر چند کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے۔ چنانچہ ایک عرصہ تک دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا کھڑی رہیں۔ برابر کا مقابلہ تھا۔ ہر اک فریق کو اپنی فتح کا کامل یقین تھا بالآخر افغان تاریخ کی سب سے زبردست خونریز جنگ شروع ہوئی بھائی بھائی سے لڑا۔ باپ بیٹے سے لڑا۔ تقریباً دس ہزار افغان کھیت رہے یہ لودی سلطنت کی انتہا کا آغاز تھا۔

سروانیوں اور ان کے دیگر معاون سرداروں کو پسپا کرنے میں دریا خاں کی اپنی خود غرضی تھی۔ اس کو یہ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ اسکی ترقی و حصول مقصد میں روڑہ اٹکائیں گے۔ جب سلطان ابراہیم لودی نے اس کو اپنے دربار میں طلب کیا تو وہ ایک کثیر فوج لے کر روانہ ہوا۔ لیکن جیسے ہی راستہ میں اسے عمر خاں سروانی کے قتل کی خبر ملی۔ تو وہ دغاباز سلطان سے خوفزدہ ہو گیا۔ اور اس کو اپنی جان کی فکر ہو گئی۔ چنانچہ چونکہ محمد خاں سوری اور دوسرے سرداروں سے ساز باز کر کے وہ بہار واپس گیا[1]

---

[1] ڈارن جلد ۱۔ صفحہ ۷۷۔ ہم نے قصداً اس عبارت کو قلم زد کر دیا ہے "اس نے اپنے نام کے سکے جاری کیے اور محمد شاہ کا خطاب اختیار کیا" اس بات کا تعلق دریا خاں سے نہ ہو کر اس کے لڑکے سے ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کا قلمی نسخہ تاریخ خاں جہاں لودی و مخزن افغان میں لکھا ہے "کچھ دنوں کے بعد دریا خاں لوہانی کا انتقال ہو گیا اور اس کا لڑکا بہار خاں ..... " صفحہ ۲۰۳۔

Marfat.com

ان واقعات سے ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ میاں حسن بھی اس مہم میں شاہی سپہ سالار اعظم دریا خاں لوہانی کی کمان میں چوند کے محمد خاں سوری کے ساتھ ۱۵۲۲ء کے شروع تک رہا ہوگا اور غالباً یہی تاریخ اس کے سہسرام واپس لوٹنے کی تاریخ بھی ہوسکتی ہے۔

اس درمیان ۱۵۱۸ء سے ۱۵۲۲ء تک فرید اپنے والد کی جاگیر میں سب لوگوں کو خوش حال اور فارغ البال بنانے کے لیے جدوجہد کرتا رہا۔ یہ کام اس نے اپنی اصلاحات اور حسن انتظام سے پورا کیا۔ اس نے اپنے والد کی جاگیر کے جنوب اور جنوب مغرب میں بسنے والے چیرو زمینداروں کو نیست و نابود کر کے ان کے علاقہ کو اپنی جاگیر میں ملا لیا۔ جس سے کہ اس کا رقبہ دوگنا ہوگیا۔ میاں حسن نے خود اعتراف کیا ہے (بلکہ دو چند ساختہ است۔ عباس صفحہ ۵۴) یعنی دوگنا کر دیا ہے فرید نے یہ کام معمولی فوجی طاقت سے ہی کیا اور موقع موقع پر کاشت کاروں سے بھی مدد ملی۔ جب میاں حسن واپس آیا اور اس نے فرید کے حسن انتظام کی تعریف ان سپاہیوں سے بھی سنی جن کے کہ ساتھ اس نے سختی کی تھی تو اس کا دل باغ باغ ہوگیا۔ اپنی جاگیر میں ہر چہار طرف سرسبزی اور شادمانی کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کچھ دنوں تک باپ بیٹوں کے درمیان پیار و محبت کا سماں رہا اور میاں حسن نے جوش محبت میں آکر یہاں تک کہہ دیا کہ وہ اس کی دوران حیات جاگیر کا انتظام کرتا رہے۔ (عباس صفحات ۳۹ تا ۴۲) لیکن یہ محبت صرف چند روزہ بہار ثابت ہوئی۔

فرید کی روز افزوں شہرت نے سلیمان کی ماں کے دل میں نشتر کا کام کیا۔ وہ میاں حسن پر اپنے اثر کے زوال سے زار زار ہو اٹھی۔ چونکہ اس کی فطرت تھی شر اور بدمزاجی کا مجموعہ تھی اس لیے وہ مناسب موقع کا انتظار کرنے لگی۔ سلیمان اور اس کی والدہ نے فرید کے خلاف جھوٹے الزام لگا کر حسن کے کان بھرنا شروع کر دیا۔ شروع میں تو میاں حسن نے اسے جھڑک دیا۔ لیکن بعد میں اسے توبہ کرنی پڑی۔ سلیمان کی ماں نے اس سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ میاں حسن اس جدائی کی تاب نہ لاسکا اور چند ہی دنوں میں اس نے اپنی بیوی کے سامنے گھٹنے

Marfat.com

ٹیک دیے۔ جب کہ بیقرار عاشق جس کا کہ سن اس وقت صرف ۶۰ سال تھا اپنی بیوی کے پاس گیا تو وہ سسکیاں بھر بھر کر زار زار رونے لگی اور اس پر وعدہ خلافی کی تہمت لگانے لگی۔ اس نے میاں حسن کو اس کے وعدہ کی یاد دلائی جو کہ اس نے فرید کی تقرری کے وقت کیا تھا کہ سلیمان کے بالغ ہونے پر فرید کی جگہ سلیمان کو دے دی جائے گی۔ اس نے یہ بھی دھمکی دی کہ اگر میاں حسن نے اپنا وعدہ فی الفور پورا نہ کیا تو وہ خودکشی کر لے گی۔ حسن کی حالت اس وقت قابل رحم تھی۔ اس نے اپنی اس آتش طبع دلآویز محبوبہ کو خوش کرنے کے لیے دوبارہ قسم کھائی اور عہد و پیمان کیے۔ بس اسی روز سے میاں حسن ایک دوسرا ہی انسان ہو گیا اور فرید کی جانب اس کا رویہ بالکل بدل گیا۔

میاں حسن نے فرید کے انتظام میں نکتہ چینی شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باپ بیٹوں میں دل شکنی پیدا ہو گئی۔ جیوں ہی فرید کو یقین ہو گیا کہ سلیمان کی والدہ کے جادو سے میاں حسن کو بچانا اس کے بوتہ سے باہر ہے۔ اس نے جاگیر کے انتظام میں دلچسپی لینا بند کر دیا۔ اور اپنے عہدہ سے استعفیٰ دیدیا۔ فرید چند روز انتظار کرتا رہا۔ اور اس نے اپنے والد کو چغل خوروں کے خلاف آگاہ کیا۔ اس نے اپنے والد سے جاگیر کے مالی حالات کی خفیہ جانچ کرانے پر زور ڈالا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خفیہ جانچ کرنے اور بے ایمانی کا پتہ لگانے کے طریقہ بھی بتلا دیے۔ جن الفاظ میں فرید کے خیالات کا اظہار کرایا گیا ہے۔ وہ قابل اعتماد نہیں مگر ان سے اتنا تو ظاہر ہی ہوتا ہے کہ بے ایمان لوگوں کے ساتھ وہ کس طرح برتاؤ کرتا تھا۔ یہ روایت ہے کہ فرید نے میاں حسن سے یہ کہا وہ حاکم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی رعیت اور عاملوں کے معاملات کا مکمل پتہ رکھے تاکہ دونوں میں ایمانداری اور دیانتداری قائم رہ سکے۔ زراعت میں ترقی ہو۔ اور اس کو شہرت و سکون خاطر نصیب ہو۔ اگر حاکم کو کبھی عاملوں کی نیک نیتی پر شبہ ہو جائے تو اس کو لازم ہے کہ ان کا تبادلہ کر کے ان کی جگہ آزمودہ ایماندار عامل مقرر کرے اور مقدم و نویسندہ کے پاس سے اصل کاغذات دکا غذات خام منگوائے قبل اس کے کہ اس کو اپنے تبادلہ کی بو کا بھی احساس ہو۔ پھر چودھری اور

Marfat.com

محرر کو معہ کاغذات خام (کچی بہی) کے اپنے حضور میں طلب کرے۔ جانچ کرتے وقت حاکم کو پہلے یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ زمانہ حال میں ایسے قابل اعتماد و ایماندار اہلکار جن کو زر کی طمع نہ ہو عنقا ہیں۔ رعایا میں شقدار کی مخالفت اور شکایت کی استطاعت کہاں۔ عقل و دانش کا تقاضا یہ نہیں کہ پرانے شقدار کو بدل کر نیا شقدار مقرر کیا جائے کیوں کہ نیا شقدار پرانے شقدار کی بے ایمانی طشت از بام کرنے کی کوشش کرے گا تاکہ پرانا شقدار اسے خوب رشوت دے اور اس سے درخواست کرے کہ "رعایا کی جانب سے کوئی شکایت نہ پہنچنا چاہیئے (رعیت را مدعی نہ باید کرد) اگر آج یہ میری شکایت کریں گے تو کل تمہاری۔ اور نیا شقدار رعیت پر زور ڈالے گا کہ حاکم کو اصلی حالات معلوم نہیں ہو سکیں .... چنانچہ بہتر تو یہ ہو گا کہ کوئی منصف مزاج ثالث بھیج کر اصل کاغذات حاصل کر لیے جائیں اور چودھری اور نویسندہ کے کاغذات کو بھی طلب کر لیا جائے۔ آپ کو یہ جان کر عین مسرت ہو گی کہ میں نے پرگنہ کی شقداری سے استعفیٰ دے دیا ہے۔" (عباس صفحات ۴۶ تا ۴۸)۔

اپنے عہدہ سے مستعفی ہونے کے بعد فرید نے روزی کی تلاش میں سہسرام چھوڑ کر آگرہ جانے کا ارادہ کیا۔ جب میاں حسن کے عزیز و اقارب کو یہ معلوم ہوا تو وہ اکٹھے ہو کر حسن کے پاس آئے اور اس کو سخت لعنت و ملامت کی کہ وہ ایک کنیز بیگم پر فریفتہ ہو کر اپنے لائق و ہونہار لڑکے کو گھر سے نکال رہا ہے خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ سلطنت میں ہر چہار طرف بدامنی ہے۔ اور بہار کے لوہانی اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے جا رہے ہیں۔ لیکن مثل مشہور ہے "سوتے کو جگانا آسان ہے لیکن جاگتے کو جگانا مشکل" غرضکہ ۱۵۲۲ء میں فرید نے دوسری بار اپنے والد کا گھر چھوڑ دیا۔ اس کی زندگی پھر ایک بار کشتی بے پتوار۔ بے یار و مددگار ہو گئی۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً ۳۰ سال ہو گی۔ اس نے اپنے بیوی بچوں کو سہسرام میں اپنے چھوٹے بھائی کے سپرد کر دیا اور تن تنہا کانپور کے راستہ سے آگرہ کے لیے روانہ ہو گیا[1]

---

[1] میں نے پہلے "شیر شاہ" میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ دونوں بھائیوں نے ایک

Marfat.com

دردناک انجام کے باوجود بھی فرید کی زندگی کا یہ دور نہایت ہی اہم ہے ہندوستان کی آئندہ سلطنت کے نظام کے لیے گویا وہ بلاارادہ سہسرام میں تیاری کر رہا تھا۔ اسی دور میں فرید کے قابل تحسین اوصاف نمایاں ہوئے۔ جیسے کہ کام میں سرگرمی۔ مالی اصلاحات میں دوراندیشی اور سپہ گری میں حاضر دماغی۔ سہسرام میں ہی وہ ایک ایسا شاہکار بن گیا۔ جس کی کہ یاد نہ مٹ سکی یعنی ایک پٹھان اور پٹواری کا لاثانی مجموعہ اور اس سب سے اہم تر سہسرام کے زبردست شقدار کی شخصیت تھی جس کی کہ دہشت سے خونخوار پٹھان سپاہی اور خاکسار ہندو کاشت کار ایک ساتھ رہتے تھے اور پٹھان ہندو کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کی ہمت بھی نہ کر سکتا تھا۔ فرید کا یہ اولین پارٹ گویا ہندوستان کے فریدون[1] کا پارٹ تھا۔ جس کے منصفانہ کردار اور انجام کے سخت خوف سے ایک مشرقی مبالغہ کے بموجب شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔

ساتھ اپنے والد کا گھر چھوڑا۔ لیکن اس رائے کی تائید میں کوئی مستند تاریخی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے میں نے اب یہ خیال رد کر دیا ہے۔ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ فرید نے اکیلے ہی یہ سفر کیا۔ (عباس صفحہ ۲۴)

[1] فریدون فارس کا ایک بادشاہ تھا۔ جو اپنی دلیری اور انصاف پسندی کے لیے مشہور تھا۔

Marfat.com

باب 3 کا ضمیمہ

فرید کی مالی اصلاحات اور انتظام کی بحث

سہسرام میں فرید کے طرز حکومت اور اس کی ماہیت کا افغان مورخین کو صحیح اندازہ نہ تھا لہٰذا ان کے بیانات مبہم اور بعض اوقات گمراہ کن ہیں۔ انہوں نے فرید کی اصلاحوں کی بیّن تفصیل نہ دے کر بلا حاشیہ کے مالی اصطلاحات اور افسروں کے عہدوں کی فہرست دیدی ہے جو کہ ایک بنڈل کی مانند ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ابوالفضل کی آئین اکبری سے افغان مورخوں کے بیانات کی تائید نہ ہوتی تو جو تحسین و تعریف شیر شاہ کی اصلاحات کی عام مورخین نے کی ہے وہ خالی از شبہ نہ ہوتی۔ عباس اور مخزن کا مصنف دونوں ہی تنقیدی تفتیش کے جھٹکے سے پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ نقاد ہی ان کی صراحت کرتا ہے۔

سب سے پہلے ہم جریب۔ غلہ داروں اور قبولیت پر غور کریں گے اس کے متعلق مورخین کے مندرجہ ذیل اقتباسات پیش نظر ہیں۔

(۱) "آج میں تمہیں آزادی دیتا ہوں کہ اپنی حسب مرضی کوئی بھی طریقہ پسند کر لو" کچھ کاشت کاروں نے طریقہ جریب پسند کیا اور کچھ نے غلہ دادن (فصل کا بٹوارہ)۔ فرید نے رعیت سے قبولیت لکھوا کر لے لیں۔ (عباس قلمی نسخہ صفحہ ۲۸)۔

(۲) کچھ کسانوں نے طریقہ جریب پسند کیا اور کچھ نے خراج۔ (مخزن۔ انڈیا آفس کا قلمی نسخہ)۔

(۳) کچھ کسانوں نے زمین لینا پسند کیا اور کچھ نے مالگذاری اور اپنی تحریری رضامندی دیدی۔ (ڈارن۔ جلد ا۔ صفحہ ۸۲۔)

مندرجہ بالا اقتباسات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فرید کو

Marfat.com

سمجھنا تو در کنار خود مورخین اپنے لکھے کو ہی سمجھنے میں قاصر تھے۔ مندرجہ ذیل واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ صورت حال سے کس قدر بے بہرہ تھے۔

(ا) لفظ جریب کا استعمال غلہ دادن کے مفہوم میں کبھی نہیں ہوتا نقد ادائیگی لگان فصل کے بٹوارہ (غلہ دادن) کا متضاد ہے۔ خراج کے بجائے جریب (دیکھو مخزن) یا مالگذاری کے بجائے اقطاع (ڈارن صفحہ ۸۲) اس کا تو کچھ مفہوم ہی نہیں ہوتا۔ یہ بے معنی ہے۔ جریب کا مطلب ہے پیمائش آراضی یا ۳۶۰۰ مربع گز آراضی کا ایک ٹکڑا۔ اگر ہم اس کو جریب پڑھیں تو اس لفظ کے معنی ہوتے ہیں اناج کا ایک پیمانہ (تول کے مطابق نہیں)۔ لہذا جریب یا جریب کوئی ایسی اصطلاح نہیں جو کہ غلہ دادن یا خراج کے علاوہ یا کسی دوسرے طریقے ادائیگی سے میل کھا سکے خراج کہتے ہیں لگان کو جو کہ ممالک محروسہ کا کاشت کار نقد یا اناج کی شکل میں ادا کرتا ہے یہ عشر یعنی ۱/۱۰ یا خراج کا نصف کا متضاد ہے عشر صرف مسلمانوں سے ہی لیا جاتا ہے۔ لہذا لفظ خراج جو کہ مخزن کے دوسرے نسخوں میں پایا جاتا ہے۔ صریحاً کتابت کی غلطی ہے۔

(ب) مورخین کے اس بیان سے کہ کچھ کسانوں نے جریب کا طریقہ پسند کیا اور کچھ نے نقد، اصل واقعہ کا پتہ نہیں چلتا کہ شیر شاہ نے کسانوں کو کیا رعایت دی؟ اگر عباس نے جریب کی جگہ اپنے قلمی نسخہ میں لفظ زر استعمال کیا ہوتا تو یہ تمام الجھنیں اور دقتیں دور ہو جائیں اور مطلب واضح ہو جاتا۔ لیکن عباس کا منشا جریب تھا یعنی زمین کی پیمائش نہ کہ نقد لگان ادا کرنے کا دوسرا طریقہ چنانچہ لفظ جریب کو بدلا نہیں جا سکتا لہذا فرید نے کاشت کاروں کو جو چھوٹ دی وہ صرف طریقہ لگان کی ادائیگی کے متعلق تھی نہ کہ پیمائش زمین کے متعلق پیمائش گز سکندری کے مطابق ہوتی تھی۔ فرید نے مالی اصلاحات کا کام زمین کی پیمائش سے شروع کیا۔ یہ پیمائش صرف قابل کاشت زمین کی کی گئی تھی۔ نہ کہ عام یا بنجر زمین کی جس پر لگان واجب نہ تھا۔ مال گذاری کا تعین "تنکہ" میں کیا گیا اور غلہ کی شکل میں بھی۔ ہر کاشت کار کو یہ آزادی تھی کہ وہ ان دونوں طریقوں میں سے کوئی بھی طریقہ اپنی حسب مرضی پسند کرے لیے فرید کا منشا محکمہ مال کی اصلاح کرنا اور کاشت کے

Marfat.com

رقبہ میں اضافہ کرنا تھا۔ نہ کہ کسانوں کو نقصان پہنچا کر مال گذاری میں اضافہ کرنا۔ وہ چاہتا تھا کہ جنس یا غلہ کی شکل میں لگان کی وصولی بتدریج ختم ہو جائے۔ لہٰذا اس نے نقد لگان مقرر کرنے میں نہایت نرمی سے کام لیا۔ تاکہ ایک یا دو سال میں کاشت کار خود یہ محسوس کرلے کہ لگان نقد دینے میں بمقابلہ جنس فائدہ زیادہ اور نقصان کم ہے۔

علاوہ بریں عباس نے کہیں بھی نظام حکومت طریقہ پیمائش یعنی مال گذاری اور اس کی وصولیابی۔ اور جاگیرداروں کا اس میں حصے کے متعلق کوئی قابل مطالعہ صاف الفاظ میں تفصیل نہیں دی ہے۔ اس کی تکمیل ابو الفضل کی آئین سے ہوتی ہے۔ عباس نے تو محکمہ مال کے اصطلاحی الفاظ کا ایک بے ترتیب ذخیرہ اور محکمہ مال کے افسروں کے نام کا ایک مجموعہ پیش کر دیا ہے۔ یہ نام اور اصطلاحات اس زمانہ میں تو عام فہم تھے۔ لیکن آج ان کو پڑھ کر کوئی بھی اوسط درجہ کا شخص پرگنہ کے نظام کے صحیح خاکہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔ ہم ان الفاظ میں سے کچھ کا جائزہ لیں گے۔

(الف) فرید نے رعیت سے ان کی ہی تحریر میں قبولیتیں حاصل کریں۔

رعیت سے پہلی ہی دفعہ ملاقات میں جبکہ نہ تو زمین کی پیمائش بھی ہو پائی تھی اور نہ تخمینہ لگان۔ رعیت سے قبولیت لینے کا کیا سوال تھا اور کیوں؟ کسی کسی نسخہ میں یہ بھی ذکر ہے کہ کاشت کاروں کو پٹے دیے گئے۔ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ آج سے ۴۰۰ سال پہلے بہار میں ہر کاشت کار اتنا تعلیم یافتہ تھا کہ بقلم خود تحریری قبولیت دے سکے جبکہ فی زمانہ وہاں کا ۸۰ فیصدی کسان ناخواندہ ہے اور کاغذات پر فقط نشانی انگوٹھا ہی لگاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عباس نے لفظ رعیت کا استعمال کشادہ معنوں میں کیا ہے۔ اس کا مفہوم صرف کاشت کار ہی

سلہ برطانیہ سلطنت کے زمانہ میں ضلع مونگھیر کے پیمائش کے کاغذات میں یہ درج ہے کہ کاشت کار اللہ زمیندار کو کتنا لگان بشکل اناج یا اس کے بالعوض نقد دینا ہے اور یہ ہی عام دستور تھا۔

Marfat.com

نہیں بلکہ اس لفظ کے تحت مقدم ۔ پٹواری اور ان کے دیگر نمائندے بھی آتے ہیں ۔ لہٰذا قرین قیاس بات تو یہ ہے کہ فرید نے جو قبولیتیں لکھوائیں وہ کاشتکاروں کے خطہ میں نہیں تھیں بلکہ ان کی جانب سے پٹواری اور مقدم لوگوں نے لکھی تھیں[1] اور ان پر اپنی تصدیق بھی کی تھی ۔ لفظ قبولیت کے اس مبہم حوالہ کو آئین کے مذکورہ ذیل الفاظ مشرح کر دیتے ہیں ۔

' اگر کوئی زمین پیمائش کرا کر لگان دینا چاہے اور کوئی فصل کے تخمینے کی بنا پر تو وہ اپنا اقرار نامہ دربار کو روانہ کر دے '۔ (آئین جلد ۲ ۔ صفحہ ۴۴) ۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس قبولیت کا عباس میں حوالہ دیا گیا

---

[1] سرکار کے عباس کے قلمی نسخہ میں جہاں لفظ رعیت لکھا ہے وہاں ایلیٹ کے قلمی نسخہ میں لفظ مقدم لکھا ہے ۔ میں نے رعیت لفظ کو بہتر سمجھ کر استعمال کیا ہے ۔ اس لیے یہ گڑبڑ پیدا ہو گئی ۔ میں نے شیر شاہ میں ایلیٹ کی بے جا تنقید کی تھی ۔ اس لئے مجھے افسوس ہے ۔ شیر شاہ صفحہ ۱۰۸ کے فٹ نوٹ کو رد سمجھا جائے ۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۱۲۹ پر)

(بقیہ حاشیہ ۱۲۸ کا) ایلیٹ کے قلمی نسخہ کے مطابق فرید نے ان لوگوں کو (مقدموں) خلعت دے کر رخصت کر دیا تاکہ وہ جا کر زراعت کا کام دیکھیں ۔ (ایلیٹ صفحہ ۳۱۴) اس میدان میں نیا کھلاڑی ہونے کی وجہ سے میں ایلیٹ کی اس پراگندگی کو سمجھنے سے قاصر رہا ۔ اور اس کی بے جا تنقید کر دی ۔ (دیکھئے شیر شاہ کا فٹ نوٹ صفحہ ۱۹) ۔ مگر نو آموز کی یہ صفائی کہ اس کی دانش کاری محدود ہے قابل قبول نہیں ۔ ممکن ہے کہ یہ قبولیتیں انہیں لوگوں نے رعیت کی جانب سے لکھ دی ہوں ۔ اور اس کے بالعوض فرید نے ان کو خلعتیں عطا کی ہوں ۔ خلعت سے مطلب قیمتی پوشاک نہیں بلکہ پگڑی وغیرہ اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ مغلوں کے زمانہ تک یہ عام رواج تھا کہ جب کوئی افسر بالا دیہات کے دورہ پہ جاتا تھا تو وہ کاشتکاروں سے ملتے وقت ان کو خلعت دیا کرتا تھا ۔ ہمارے زمانہ تک بنگال کے زمیندار اس قسم کی خلعت اپنے علاقہ کے پٹواری پٹیل وغیرہ کو دیتے رہے ہیں یہ ان کی خوشنودی کا خاص نشان سمجھا جاتا تھا ۔

Marfat.com

ہے وہ قبولیت اس قبولیت سے بھی مختلف تھی جو کہ کاشت کار زمیندار کے نام لکھتا ہے۔اس قبولیت میں رقبہ کاشت۔ لگان نقد یا جنس کی شکل میں اور دیگر باتیں جو رعایا پر واجب ہوتی تھیں۔ درج ہوتی تھیں۔اس کے بالعوض زمیندار کاشت کار کو پٹہ لکھتے تھے۔جس کی بنا پر کاشت کار کا زمین پر قبضہ تسلیم کیا جاتا تھا۔

جو اصلاحات کہ فرید نے اپنے والد کی جاگیر میں کیں ان سب کی بنیاد جریب تھی۔پیمائش کا مطلب تھا محکمہ مال کے مختلف کاغذات کی ترتیب اور ان میں صحیح اندراج۔ بنگالی زبان میں ان کاغذات کا نام ہے توجیع یا چٹھا اور کھاتیاں۔ ہندی میں انہیں چتونی اور کھتونی کہتے ہیں۔ان کاغذات کو مرتب کرنے کے لیے مستقل عملہ کی ضرورت تھی۔اس عملہ کا کارپرداز شقدار ہوتا تھا اس کے ماتحت متعدد اہلکار اور کارکن ہوتے تھے۔فرید خود ہی سرکار کا شقدار شقداران بن گیا۔ مفصل پرگنہ کچہریوں سے اس کے پاس ششماہی ضبط (گوشوارے) سہسرام بھیجے جاتے تھے۔ یہ پرگنہ کا صدر مقام تھا۔ان ضبطوں میں تخمینہ لگان۔ رقم وصول یافتہ۔ اور فصلوں کا خلاصہ ہوتا تھا۔بعد کو ہر سرکار کو اسی دستور پر عملدرآمد کرنا پڑا۔یعنی ہر سرکار مرکزی محکمہ کے پاس ضبط ہر سالہ (گوشوارہ مالگذاری سال موجودہ) روانہ کرتی تھی۔اس دستور پر تب عمل ہوا جب کہ فرید شیرشاہ ہو گیا۔جس ضبط سالانہ کا ذکر اکبر کے زمانہ میں آتا ہے دراصل اس کی شروعات تغلق حکومت میں ہوئی تھی۔شیرشاہ کے زمانہ میں نظام حکومت کے زینہ کی ابتدائی سیڑھی شخصی نہ رہ کر کاغذی راج میں بدل گئی اور تب سے یہ نظام آج تک اسی طرح جاری ہے۔

بعض اوقات کتابت کی غلطی بھی اہم واقعات کی سراغرسانی میں مدد دیدیتی ہے۔انڈیا آفس کی لائبریری کے مخزن کے قلمی نسخہ سے ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ایک اقتباس کیا ہے جو اس کی واضح مثال ہے۔حالانکہ فاضل مصنف نے اس غلطی کو نوٹ نہیں کیا ہے۔اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔

"جلسہ ختم ہونے کے بعد اس نے مقدم اور شریک داروں سے یہ کہا کہ ہر فصل کے آخر میں وہ چھوٹے بڑے جملہ کاشت کاروں کو طلب کرے گا اور تخمینہ

Marfat.com

لگان و وصول لگان کے خرچہ کی جانچ کرے گا۔" دلائیف اینڈ ٹائمس آف ہمایوں۔ صفحہ ۰۰ افٹ نوٹ)۔

یہ صاف طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ڈارن نے بھی مخزن کے اس قلمی نسخہ کا مطالعہ کیا تھا۔ اس نے اس اقتباس کا انگریزی میں ترجمہ یوں کیا ہے۔

"اس جلسہ میں اس نے اپنے مقدم۔ پیمائش کرنے والے اور حصہ داروں کو۔۔۔ کہ ہر فصل کے آخر میں" (ڈارن۔ جلد۔ ا صفحہ ۸۲)

ڈاکٹر ایشوری پرشاد اور ڈارن دونوں نسخوں کی مطابقت سے پتہ چلتا ہے کہ ڈارن نے لفظ "شریک دار" کا انگریزی ترجمہ "پارٹنر" یعنی حصہ دار سے کیا ہے۔ لفظ شریک دار نہ تو فارسی زبان کا ہے اور نہ اردو۔ نہ ہندی زبان کا ہی ہے۔ صرف بنگال کے دیہات میں اس بے کار اور غلط لفظ کا رواج ہے۔ یہ حصہ دار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ فارسی اور اردو زبان میں لفظ "پارٹنر" کا صحیح ترجمہ "شریک" ہے لیکن اس عبارت میں اگر شریک دار کی جگہ شریک بھی لکھ دیا جائے تو بھی عبارت کا مفہوم واضح نہیں ہوتا اور مصنف کا منشا پورا نہیں ہوتا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ جس شریک دار کو مقدم اور سرویر (پیمائش کنندہ) کے ساتھ لگان مقرر کرنے اور وصول کرنے کی ذمہ داری دی گئی وہ دراصل کون تھا؟۔ یہ صاف ہے کہ اس قسم کا ملازم نہ تو جاگیر دار کا حصہ دار ہوسکتا ہے نہ کاشت کار کا۔ بلکہ یہ پرگنہ کے کسی مقامی ذمہ دار اہلکار کا نام ہے دوسرے ذرائع سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شیرشاہ نے اپنے پرگنہ میں ایک منصف اور ایک شقدار کی تقرری کی تھی۔ اگر مخزن کے کل اقتباس کو لفظ "شریک دار" کے مفہوم کو ٹھیک نہ سمجھنے کی وجہ سے رد کرنے کے بجائے اس لفظ کو ہی "شقدار" سے بدل دیا جائے تو کل مطلب واضح ہو جاتا ہے اور عبارت کا منشا بھی پورا ہو جاتا ہے۔ اس ترمیم سے اس جانب بھی اشارہ ہوتا ہے کہ فرید نے اپنے بندوبست کی سب سے آخری اکائی میں شقدار کب تعینات کیا۔ بعد میں جب فرید اپنے

Marfat.com

والد کی جاگیر کا وارث بنا تو اس نے "خواص پور ٹانڈہ" علاقہ کے لیے ایک علیحدہ شقدار تعینات کیا۔

اپنے والد کی جاگیر کا منتظم ہونے کی حیثیت سے فرید نے جو اصلاحات کیں اور قانون بنائے ان کی حسب ذیل خصوصیتیں ہیں۔

(۱) یہ کہ فرید کا نظام حکومت ایک واثق الیقین۔ نیک ارادت مطلق العنان شخص کا بندوبست تھا۔ جو کہ زراعت پیشہ لوگوں کی بہبودی کے لیے دل و جان سے کام کر کر رہا تھا۔ اس نے ایک طبقہ کے مفاد کو دوسرے طبقہ کے مفاد سے ہم آہنگ کر کے اور سرکاری خدمت کے لیے ہر طبقہ کی قابلیت کو کام میں لا کر ہر خاص و عام کی قدر و محبت کو تسخیر کر لیا۔

(۲) فرید نے محکمہ مال میں اس وقت جن اصلاحات کو رائج کیا ان کے اصول نہ تو اس کی ایجاد ہی تھے نہ محض کتابوں کے مطالعہ سے حاصل کیے گئے تھے۔ بلکہ ان میں کچھ خیالات اور تجربات تو خلجی اور تغلق عہد کی میراث تھے سلطان سکندر لودی نے بھی اپنے علاقہ جاگیری میں اس قسم کی اصلاحات نافذ کیں تھیں۔

(۳) فرید نے اپنی جاگیر کے مال اور فوج دونوں شعبوں کے انتظام کی جانب برابر توجہ دی۔ اور اس طرح بیک وقت مختلف کاموں کو کرنے کی اہلیت کا ثبوت دیا۔ اور یہ وہ وصف تھا جو کہ تاریخ کی مایہ ناز ہستیوں میں پایا جاتا ہے۔

(۴) اس کی پالیسی یہ تھی کہ کمزور کی داشت و پرداخت کر کے اس کو اوپر اٹھایا جائے تاکہ وہ پوری ترقی کر کے وفادار رعایا بن جائے۔ باغی اور ناقابل علاج لٹیروں کے متعلق اس کی پالیسی نہایت ہی سنگ دلانہ تھی۔ جس میں کہ قرون وسطیٰ کی خونخواری کی جھلک تھی۔

(۵) بحیثیت منتظم فرید نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ محض تخیل کی بلند پروازی یا سر بہ فلک تصوریت کا دلدادہ نہ تھا بلکہ اپنی تجاویز کو عملی جامہ بھی پہنا سکتا ہے فرید کا سب سے اہم و ممتاز کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی جاگیر کے انتظام کے لیے جس قسم کے بندوبست کا نفاذ کیا وہ قرون وسطیٰ کے ہر نظام سے ہر معنی میں بالاتر

Marfat.com

فرید کے اس دور کے حالات زندگی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اور بہتر تھا۔ دور مستقبل میں جب فرید شیر شاہ بنے گا تو نہ وہ علاؤالدین خلجی ہو گا نہ اکبر۔ ہمایوں بادشاہ کی سوانح عمری لکھنے والے موجودہ دور کے ایک مصنف نے فرید کے متعلق بیان کیا ہے کہ اس کے اصولوں میں افلاطون کے فلسفی بادشاہ کی جھلک تھی، وہ مطلق العنان ہونے کے باوجود اپنی رعایا کی رائے کا مطلق نمائندہ تھا اور رائے عامہ کا مظہر تھا اور اس کے مطابق عمل کرتا تھا۔ لیکن فاضل مصنف کی یہ رائے بے بنیاد اور لغو ہے فرید کی زندگی کے کسی دور میں بھی نہ تو فلسفیانہ خیال کا کوئی عنصر ہی تھا اور نہ اس زمانہ کے عوام "رائے عامہ" سے واقف تھے۔ اس رائے کا اظہار کرنا کہ فرید نے موجودہ جمہوریت کے کچھ بنیادی اور صحیح اصولوں کی جیسے کہ کثرت رائے کا احترام کی بنیاد ڈالی سرتاسر غیر مناسب ہو گا۔ حسن کی جاگیر کے سرحد پر آباد سرکش زمینداروں کی سرکوبی کے لیے جو قدم فرید نے اٹھائے وہ کسی "رائے عامہ" پر مبنی نہ تھے۔ اگر ازمنہ وسطیٰ میں کسی بادشاہ نے اپنی رعایا کی رائے عامہ جاننے کی کوشش کی ہوتی تو اس کو اپنے کاشت کاروں کی یہ آواز سنائی دیتی "نہ سرکار نہ لگان" اس زمانہ کے کاشت کار اپنے کو خوش نصیب سمجھتے ——— اگر وہ باغی پرگنہ نگینہ کے کسانوں کی مانند اعلانیہ یہ کہہ سکتے۔

"دہلی سے ۴۰ کوس کہار نگینہ۔"

"اپنا کھائے اپنا بوئے حاکم کو نہ دے دانہ۔"

سولہویں صدی کے ہندوستان کا سیاسی اصول اس قسم کا نہیں تھا کہ کوئی نیک طبع مالک اپنے مویشیوں کو ہل میں جوتنے سے پہلے یہ پوچھتا کہ کیا وہ رعایا کی فلاح و بہبودی کے لیے اپنے کندھے پر جوا رکھنے کو تیار ہیں۔

Marfat.com

باب 4

تقدیر کی گردشیں

(سنہ ۱۵۲۲ء لغایت سنہ ۱۵۲۹ء)

فرید کا فرید کی دربار میں قسمت آزمائی اور سہسرام کو واپسی

براہ کانپور آگرہ کے سفر کے متعلق تاریخ میں صرف ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ وہ چندون سروانیوں کا مہمان رہا۔ ایک روز اتفاقیہ ایک دعوت میں اس کی نظر شیخ اسماعیل پر پڑی۔ فرید نے اپنے میزبانوں سے اس کا حسب و نسب دریافت کیا۔ مذاقاً اس کا صریحاً جواب ملا "سروانی" شاید یہ اس لئے کہا گیا کہ اس کا مہمان پر کیا اثر پڑتا ہے پھر حال جلد ہی اسکو بتادیا گیا کہ شیخ اسماعیل سوری ہے اور اس کے قبیلہ کا خواہر زادہ ہے۔ یہ جان کر فرید نے شیخ اسماعیل اور اس کے سالے حبیب خاں ککّر کو اپنے ساتھ آگرہ چلنے کے لیے راضی کر لیا۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ یہ دو شخص فرید کی آئندہ زندگی میں اس کے والد کی جاگیر کے دو پرگنوں کے مقابلہ میں زیادہ کار آمد ثابت ہوئے اگرچہ فی الحال اس کے دل میں ان پرگنوں کے حاصل کرنے کی ہی آرزو سمائی ہوئی تھی۔

جب سنہ ۱۵۲۲ء کے عنقریب فرید نے پہلی بار آگرہ دیکھا تب وہ ایسا شہر نہ

Marfat.com

تھا۔ جیسا کہ بعد کو عہد مغلیہ میں ہو گیا۔ سلطان سکندر لودی نے اس کی بنیاد
ڈالی تھی۔ مگر نہ تو وہ اکبر اور شاہ جہاں کی طرح دولت مند ہی تھا اور نہ وہ ان کی
طرح صاحب ذوق ہی تھا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ پٹھان فطرتاً ابھی دیہاتی تھے یہاں
تک کہ جس قصبہ میں بھی وہ آباد ہوتے تھے اس کو بھی گاؤں بنا ڈالتے تھے۔
جب کہ شہری تہذیب میں تربیت یافتہ مغل جس کسی ویرانے میں بھی سکونت پذیر
ہوتے تھے اس کو دم کے دم میں ایک دل کش شہر میں تبدیل کر دیتے تھے سکندر
لودی نے آگرہ کی بنیاد محض فوجی چھاونی کے لیے ڈالی تھی۔ لیکن سیاسی ضرورت
سے مجبور ہو کر سکندر اور ابراہیم نے اسے اپنی سلطنت کا دوسرا صدر مقام بنا
لیا۔ ابتدا میں یہ ایک منتشر قصبہ تھا اس کے گاؤں چہار دیواری خام سے محیط
تھے۔ جمنا کے مغربی کنارے پر جو ایک مرتفع ٹیلہ تھا اس پر ایک اینٹوں کا بنا
ہوا حصار تھا۔ اسی حصار کے کھنڈروں پر بعد میں اکبر نے لال پتھر کا ایک عالیشان
قلعہ تعمیر کرایا تھا۔

فرید اس شہر میں اجنبی تھا۔ سلطان ابراہیم فرعون کے نقش قدم پر چلنا
چاہتا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دربار میں معدودے چند افغان
سردار رہ گئے۔ افغان سرشت سے ہی جمہوریت کے سرگرم مقلد تھے۔ چنانچہ
ان کو اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ سینہ پر ہاتھ باندھ کر دربار میں کھڑے رہیں ابراہیم
کی سخت کوتاہ اندیشی تھی۔ پچاس سال بعد مغل بادشاہ ہی اس طرز عمل کو
اختیار کر سکے۔ جو افغان سردار سلطان بہلول اور سلطان سکندر کے ساتھ ایک
ہی مسند پر بیٹھنے کے عادی تھے۔ ان کے ساتھ ایسا سلوک سراسر نادانی تھی۔
ابراہیم اپنے قبیلہ کا سب سے عقل مند بیوقوف تھا۔ اس کا اپنا مقولہ تھا کہ
"بادشاہ کا اپنا کوئی عزیز نہیں۔ سب لوگ رعایا ہیں"۔ اسی نظریہ کی وجہ سے اس کو
پانی پت کے میدان جنگ میں اپنی جان و تخت دونوں سے ہی ہاتھ دھونے پڑے
اس کی یہ دانشمندانہ حرکت حضرت علی کے اس فعل کے مانند تھی جس سے کہ اس
کے سوا سب ہی مستفید ہوئے اسی اصول کی بنا پر سوریوں اور مغلوں نے اپنی
سلطنت کو ترتیب دیا گو کہ بظاہر انہوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔

Marfat.com

عباس رقم طراز ہے کہ آگرہ پہنچ کر فرید نے دولت خاں دین بدھو کو اپنا مربی و سرپرست بنایا۔ یہ اعظم ہمایوں سروانی کا ایک خانہ زاد غلام تھا۔ اور بارہ ہزار گھوڑوں کا کمانڈر تھا۔ (عباس نسخہ صفحہ ۴۴)۔ عباس کا یہ کہنا کہ فرید نے عمر خاں سروانی کا لڑکا پوریا کے (جس نے اعظم ہمایوں کا خطاب اختیار کیا تھا) خانہ زاد غلام بدھو کے لڑکے کے یہاں ملازمت کی حقیقتاً اتنا ہی لغو ہے جتنا کہ اسکا یہ بیان کہ نارنول میں میاں حسن کا ولی و سرپرست عمر خاں سروانی تھا۔ اس قسم کی بے باکانہ سروانی گپ جس سے کہ عباس سروانی کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ نوآموز فن کاروں کو گمراہ کرنے کے لیے کافی ہے خاص کر اس حالت میں جب کہ عباس کے بیانات کی قرار واقعی چھان بین نہ کی گئی ہو اس میں شک نہیں کہ آگرہ میں فرید نے دولت خاں کو اپنا مربی و محسن بنایا لیکن یہ دولت خاں ابراہیم لودی کے جانی دشمن عمر خاں سروانی کے غلام بدھو کا لڑکا نہیں ہو سکتا۔ عمر خاں سروانی کو تو ابراہیم نے دھوکہ سے ہانسی کے قلعہ میں قید رکھ کر قتل کر دیا تھا۔ (مخزن صفحہ ۲۰۴) فرید کا یہ مربی دولت خاں سن رسیدہ جمال خاں سارنگ خانی کے تین لڑکوں میں سے ایک تھا جو کہ حصار میں ایک سربرآوردہ افغان نہیں تھا بلکہ ایک ترک بچہ تھا[1] (دیکھو ایلیٹ جلد ۴۔ واقعات مشتاقی)۔

تاریخ میں اس کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے کہ فرید کے نئے آقا نے اس کو کوئی جاگیر دی۔ ممکن ہے کہ فرید دولت خاں کے ذاتی ملازمین میں بحیثیت روزینہ (روزانہ تنخواہ پانے والا) بھرتی ہوا ہو۔ اسنے اپنے والد کی جاگیر کو اس بنا پر کہ وہ بوجہ ضعیفی ملازمت کے قابل نہیں ہے اپنے نام مستقل کرانے کی کوشش کی۔ اور اس نے اس سلسلہ میں سلطان کے سامنے دل کش شرائط بھی رکھے جیسے کہ اگر اس کی تقرری اس کے والد کی جاگیر میں ہو گئی تو وہ یا اس کا چھوٹا بھائی نظام ۵۰۰ سوار کے رسالہ کے ساتھ سلطان کی خدمت میں حاضر رہے گا جب ایک آگرہ میں ہوگا تو دوسرا

---

[1] سارنگ خانی کے معنی ہیں سارنگ خاں کے پیروکار۔ فیروز کے محل میں جو ترک بچہ تھے سارنگ خاں ان کا سردار تھا۔ فیروز کے انتقال کے بعد یہ ملتان کا گورنر

Marfat.com

جاگیر کا انتظام کرے گا۔ کچھ عرصہ بعد جب دولت خاں لودی نے فرید کی یہ تجویز سلطان ابراہیم کے سامنے پیش کی تو سلطان نے اسے بہ یک قلم مسترد کر دیا اور کہا کہ جو شخص اپنے والد کی شکایت کرتا ہے یقیناً وہ نیک انسان نہیں ہے اس واقعہ کے چند روز بعد ہی میاں حسن کا انتقال ہو گیا اور دولت خاں کے توسل سے یہ جاگیر فرید کو مل گئی[1]

غالباً ۱۵۲۴ء کے قریب فرید سہسرام واپس لوٹا اس کی واپسی سے اس کے عزیز و اقارب اور فوج کے سپاہیوں کو بے حد خوشی ہوئی۔ سلیمان مقابلہ کی تاب نہ لا کر اپنے بھائی کے ساتھ چوند کے جاگیر دار محمد خاں سوری کے پاس بھاگ گیا۔ محمد خاں سوری اس وقت اپنی ممتاز حیثیت کی وجہ سے سوری

بنا۔ اس نے امیر تیمور سے لوہا لیا۔ قید کر لیا گیا۔ تیمور اسے سمرقند لے گیا۔ پر وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ (دیکھیے تاریخ مبارک شاہی) لودی حکمرانوں نے سارنگ خانیوں کا ذمہ دار عہدوں پر تقرر کیا جس سے وہ پٹھان سرداروں کو دبا سکیں کیوں کہ ان پر لودیوں کو کم اعتقاد تھا۔ بابر کا یہ قول کہ سارنگ خانی افغان تھے درست نہیں ہے۔ یہ سارنگ خانی ابراہیم کے زمانہ میں اعلیٰ عہدوں پر معمور تھے۔ مثلاً گوالیار میں تاتار خاں سارنگ خانی جونپور میں فیروز خاں۔ چنار میں تاج خاں وغیرہ۔ فیروز خاں کو بابر نے ایک کروڑ ۴۶ لاکھ کی جاگیر عطا کی تھی۔ (دیکھو تزک بابری۔ مترجم صفحات ۵۲۳ ۔ ۵۲۷ ۔ ۵۲۰ ۔ ۶۰۴ ۔ ۶۵۷ ۔ ۶۸۳)۔

[1] مخزن ف ۲۰۸ لکھتا ہے " جاگیر فرید و برادراو نظام گرفت فرمان حکومت سہسرام خواص پور ٹانڈہ بہ نام فرید درست ساختہ" حسن کی جاگیر فرید اور اس کے بھائی نظام کے نام کرا دی سہسرام و خواص پور ٹانڈہ کا انتظام فرید کو سونپ دیا۔ عباس (صفحہ ۵۶ ۔ ۵۷) لکھتا ہے میاں حسن کے انتقال کے بعد جاگیر پر سلیمان نے قبضہ کر لیا فرید کے چھوٹے بھائی نظام نے اس کی مخالفت کی۔ جب فرید نے یہ خبر دولت خاں لودی تو اس نے جاگیر فرید کے نام کرا دی اور اسے واپس گھر لوٹنے کی اجازت دیدی۔

Marfat.com

قبیلہ کا سردار سمجھا جاتا تھا۔ چوں کہ میاں حسن کی زندگی میں وہ اس سے کچھ رنجش رکھتا تھا (بامیاں حسن مخالفتِ بود) اس کی یہ دلی خواہش تھی کہ فرید اور اس کے بھائی سلیمان میں باہمی نزاع ہو جائے تاکہ ہر دو فریق اس کو ثالث اور مربی ماننے کو مجبور ہو جائیں۔ اس نے سلیمان سے کہا۔ "ابھی صبر کرو۔ فرید کے پاس شاہی فرمان ہے۔ دولت خاں یوسف خیل نے مغلوں کو ہندوستان آنے کے لیے مدعو کیا ہے اور ان میں اور سلطان ابراہیم میں جنگ ہو گی۔ اگر لڑائی میں مغلوں کی فتح ہوئی تو میں ان پرگنوں پر بزورِ شمشیر قبضہ کر لوں گا۔ اور تمہیں سونپ دوں گا۔ اگر لڑائی میں سلطان کامیاب ہو گیا تو تم سلطان کے پاس چلے جانا میں فرید کے خلاف شکایت لکھ دوں گا" (عباس صفحہ ۴۸) لیکن اس موقع پر بابر اور ابراہیم کے درمیان لڑائی نہ ہوئی۔ دولت خاں کو جس نے کہ اپنے لڑکے دلاور خاں کو کابل بھیجا تھا اپنی حرکت کے لیے کفِ افسوس ملنا پڑا۔ بابر نے ۱۵۲۴ء میں چوتھی بار دریائے سندھ عبور کیا اور لاہور پر تصرف کر کے پنجاب میں اپنی حکومت قایم کر لی۔ بیچارے دولت خاں کو جالندھر اور سلطان پور کا علاقہ ملا اور لودی تخت کا باطل دعویدار عالم خاں ملتان کا گورنر مامور ہوا۔ ۱۵۲۵ء شورش کا زمانہ تھا۔ عالم خاں لودی نے بابر کی اطاعت سے منہ موڑ لیا اور دولت خاں کے ساتھ ہو گیا۔ اگرچہ پنجاب کبھی بھی اس کے قبضہ میں نہ تھا پھر بھی اس نے پورا علاقہ دولت خاں یوسف خیل کو عطا کر دیا۔ پھر عالم خاں نے دہلی پر فوج کشی کی۔ لیکن ابراہیم نے اس کو شکست فاش دیدی اسے ستلج کے پار بھاگنا پڑا۔ ابراہیم کی اس غیر متوقع اور حیرت انگیز کامیابی اور اس کی طاقت کے مظاہرہ نے مذبذب سیاسی کیفیت کے باوجود مشرقی افغان قبیلوں اور خاص کر بہار کے لوہانیوں کو خوفزدہ کر دیا۔

چنانچہ ۱۵۲۴ء سے ۱۵۲۶ء تک محمد خاں سوری فرید کے خلاف طاقت آزمائی کی بات بھی نہ سوچ سکا پھر بھی دونوں کے درمیان سیاسی بساط پر کشت و مات کے داؤ چلتے رہے۔ جب محمد خاں نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ خود سہسرام پہنچ کر فیصلہ ثالثی دے گا تب فرید خاں نے نہایت ادب سے کہہ دیا کہ یہ

Marfat.com

بات خان والاشان کے شایاں نہیں ہے کہ وہ ایسی زحمت برداشت کرے وہ
تو اس کو (فرید کو) ہی اپنے پاس بلا سکتا ہے۔ فرید نے لکھا "ابا جان کی زندگی
میں آپ میں اور ان میں جو کچھ بھی رنجش رہی ہو میں اسے مٹانے کو تیار ہوں۔
میری دلی خواہش ہے کہ اپنی باقی ماندہ زندگی آپ کی محبت وشفقت سے باریاب
ہوتا رہوں۔ میں اپنے بھائی نظام الدین کو آپ کی خدمت میں سلیمان کو بلانے
کے لیے بھیج رہا ہوں۔ میں اس کو ایسی جاگیر دوں گا جس سے اس کو مکمل سکون و
اطمینان حاصل ہو سکے لیکن اگر اس کا منشا ابا جان کی جاگیر میں حصہ کشی کرنا ہے تو
میری زندگی بھر تو اس کی امید کا بر آنا محال ہے۔ جیسی کہ ایک مثل ہے۔ "ایک میان
میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔" جب خان کو فرید کی تحریر کا علم ہوا تب اس نے
سلیمان سے یہ کہا کہ فرید آسانی سے اس کا حصہ نہ دے گا۔ پھر اس کو یہ کہہ کر مزید اطمینان
دلایا کہ چوں کہ تینوں بھائی اس کے پاس آچکے تھے اس لیے اس کا یہ فرض منصبی ہوگیا
کہ اس کو اس کا واجب حصہ دلوائے۔ یہ سن کر سلیمان کو تو تسلی ہوگئی مگر فرید کے
مخبروں نے سارے واقعہ کی روئداد اس کے پاس بھیج دی۔ (عباس ۴۰-۱۴۱)۔
۱۵۲۵ء میں لودی سلطنت کی سیاسی فضا نہایت ہی مذبذب تھی۔
سلطان ابراہیم کو اس کے چچا عالم خاں کی ناکام بغاوت نے آنے والے خطرات
سے آگاہ کر دیا تھا۔ دولت خاں یوسف خیل کی دورنگی سے بیزار ہو کر اس کو سزا
دینے کے لیے بابر دوبارہ ہندوستان آنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس کو یہ اندیشہ
تھا مبادا ہندوستان کے جملہ منحرف افغان سردار سلطان ابراہیم لودی کے پرچم کے نیچے
متفق ہو جائیں۔ حالاں کہ افغان سے اس قسم کی سیاسی عاقبت اندیشی کی توقع رکھنا
تصور سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ ایک طرف تو دولت خاں یوسف خیل کمر میں دو دو
تلوار باندھے شیخی بھگارتا پھرتا تھا کہ وہ تن تنہا مغلوں کو ہندوستان سے نکال باہر
کر دے گا۔ دوسری طرف اس کا فرزند ارجمند دلاور خاں اپنے والد کی دیرآمدہ
حب الوطنی اور قوم پرستی کی جڑ کاٹنے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ سلطان ابراہیم
لودی کی فوج عالم خاں کے حملہ کو ایک مرتبہ ناکام کر چکی تھی عالم خاں پر فتح حاصل
کرنے کے بعد سے ابراہیم کی فوج کا جوش اور بھی دوبالا ہو گیا تھا۔ دہلی اور آگرہ

Marfat.com

کے قرب وجوار میں آئندہ حملہ کو روکنے کے لیے زوروں سے فوجی تیاریوں کی ہل چل مچنے لگی۔ مشرق کے افغان سردار کبھی بھی سلطان ابراہیم کے وفادار نہیں رہے چنانچہ اب ان کا یہ بیوقوفانہ خیال تھا کہ ان کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ خاموشی سے صورت حال کو دیکھتے رہیں اور ابراہیم کی شکست کے لیے دعا کرتے رہیں۔ یحض فرید ہی ایک ایسا فرد تھا جو اس خیال کا حامی نہیں تھا۔ مگر موجودہ سیاسی فضا میں اس کی ہستی ہی کیا تھی۔ پھر بھی جہاں کہیں افغانوں کی شکست کا ذکر دوران گفتگو آجاتا تو اس کا دل درد سے بھر آتا اور وہ بے ساختہ کہہ اٹھتا "اللہ وہ دن کبھی نہ دکھائے۔" (عباس صفحہ ۴۱)

جب فرید کو یہ معلوم ہو گیا کہ چوند کا افغان سردار محمد خاں سوری اس سے کینہ رکھتا ہے تو اس نے توازن طاقت قائم رکھنے کی تمنا سے اور اپنی بچت کے خیال سے کسی اور افغان سردار کی امداد کی تلاش شروع کر دی۔ اس کے گرد و نواح میں بہار کے دریا خاں لوہانی کا لڑکا بہار خاں لوہانی ہی ایک ایسا قوی سردار تھا۔ جو محمد خاں سوری سے لوہا لے سکتا تھا اور اسکو مرعوب کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے ۱۵۲۵ء کے قریب اسکی ملازمت اختیار کر لی[1]۔ بہار خاں نے ابھی تک اپنی خود مختاری کا اعلان نہیں کیا تھا۔

---

[1] چوں کہ مخزن کا بیان گمراہ کن ہے لہٰذا یہاں عباس کی رائے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ میں نے اپنی پہلی تصنیف "شیر شاہ" میں بہار خاں کی ملازمت میں فرید کے آنے کی تاریخ جو ۱۵۲۳ء لکھی تھی وہ رد کی جاتی ہے (دیکھئے شیر شاہ صفحہ ۱۳) عباس اور دیگر افغان مورخین نے بہار میں فرید کی زندگی کے مختلف واقعات کو بنا کسی تاریخی سلسلہ یا ترتیب کے ایک جگہ اکٹھا کر دیا ہے۔ مثلاً فرید کا بہار خاں کی ملازمت میں آنا۔ بہار خاں کی جانب سے فرید کو شیر کا خطاب عطا کرنا۔ بہار خاں کے لڑکے جلال خاں کے اتالیق کی حیثیت سے فرید کی تقرری اور مدت دراز تک بہار میں فرائض کی انجام دہی کے بعد شیر شاہ کی رخصت وغیرہ جملہ واقعات کو ۲۰ اپریل ۱۵۲۶ء لغایت ۲۰ جنوری ۱۵۲۷ء یعنی ۱۱ مہینہ کی قلیل مدت میں دکھایا گیا ہے۔ ۲۰ اپریل ۱۵۲۶ء کو بابر نے پانی پت کے میدان جنگ میں ابراہیم کو ہرایا تھا اور ۲۰ جنوری ۱۵۲۷ء کو شہزادہ ہمایوں مشرق سے باغی افغان سرداروں کو ہرا کر آگرہ (باقی صفحہ ۱۳۴ پر)

Marfat.com

فرید کی علمی قابلیت اور مال کے صیغہ میں اس کے وسیع تجربہ کی شہرت ہر چار سو پھیل چکی تھی۔ اس لیے فرید کا بہار خاں کی ملازمت میں آنا۔ بہار خاں کے لیے ایک نعمت خداداد تھی۔ معلوم نہیں کہ بہار خاں نے پانی پت کی جنگ اول کے بعد اور سلطان محمد کا لقب اختیار کرنے کے پیشتر کس قسم کی خدمت فرید کو سپرد کی۔ بہر حال وہ اپنی ذمہ داری نبا ہنے میں تن من سے مصروف رہا۔ اس نے ایک لمحہ بھی آرام سے نہ گذارا۔ بہترین خدمت گذاری انجام دے کر وہ بہار خاں کا معتمد بن گیا۔ اور وہ بہار خاں کا جگری دوست ہوگیا۔ اس کے حسن انتظام کی شہرت بہار میں پھیل گئی۔ اس کے روز افزوں اثر نے محمد خاں سوری کو خایف کر دیا۔ وہ بہار خاں متوفی والد دریا خاں کا ہم منش تھا۔ چنانچہ اس نے بہار خاں کے دربار میں فرید کے خلاف سازش شروع کر دی۔

اس درمیان یہ خبر ملی کہ بابر نے دولت خاں یوسف خیل کو شکست دے کر پنجاب پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور وہ اب دہلی کی جانب کوچ کر رہا ہے۔ اس

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۳)

واپس لوٹا تھا۔ ان افغان سرداروں نے بہار خاں کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ اور اس کی کمان میں قنوج پار کر چکے تھے (میموریس صفحہ ۴۳ ۔ ۴۴۵)۔

بیرون قیاس و ذہن بات کو تاریخی واقعہ نہیں کہہ سکتے۔ عباس کے بیان کے مطابق فرید نے اس معاملہ پر نظام اور دیگر دوستوں سے مشورہ کیا۔ کہ یہ مناسب ہوگا کہ اگر پانی پت کی جنگ میں ابراہیم کو شکست ہو جائے تو وہ بہار خاں کی ملازمت کرے۔ لیکن صورت حال ایسی تھی کہ فرید کو انتظار کی گنجائش نہ تھی۔ اس لیے یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس نے بہار خاں کی ملازمت جنگ پانی پت سے پیشتر ہی کر لی ہوگی لہٰذا فرید کی ملازمت کا سال ۹۳۲ھ ماننا زیادہ مناسب اور صحیح ہوگا۔ عباس لکھتا ہے کہ فرید کو محمد خاں سوری کی مخالفت کے کافی عرصہ بعد ابراہیم کے میدان جنگ میں شہید ہونے کی خبر ملی اور تب فرید کو بہار خاں کی ملازمت کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ (عباس صفحہ ۶۱)۔ لیکن فرید نے اپنے ارادہ کو عملی شکل دینے میں کیوں اس قدر پس و پیش سے کام لیا۔ اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی اور اس لیے اس کو صحیح تصور نہیں کیا جاسکتا۔

Marfat.com

خبر سے مشرقی صوبوں میں خوف اور تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ آنے والے خطرے نے چند روز کے لیے تمام لوہانی۔ فارمولی اور دریائے گنگا کے مشرق میں رہنے والے جملہ افغانوں کو متحد کر دیا۔ انہوں نے ضعیف العمر دریا خاں لوہانی (جس کا انتقال غالباً ۱۵۲۳ء میں ہو گیا تھا) کے لڑکے بہار خاں لوہانی کی کمان میں دس لاکھ فوج منظم کی۔ افغانوں کی اس متحدہ فوج نے قنوج کے نزدیک دریائے گنگا کو پار کیا اور دوسری جانب ڈیرے ڈال دیے۔ افغان سرداروں میں ارادہ اور عمل کی کمی تھی اور یہ ہندوستان میں افغان حکومت کے خاتمہ کے آثار تھے۔ اب ان افغان سرداروں میں ان کی قوم کے بہترین اوصاف مثلاً شجاعت و دلیری۔ حب الوطنی و قوم پرستی۔ شرم افغانی کے لیے جذبۂ اتحاد و انتقام۔ نام کو بھی باقی نہ تھے۔ اب ان کی جگہ تھی قبائلی تنگ نظری۔ بے جا ضد، حرص و طمع باہمی نفاق و جنگ و جدل۔ ان سب کمزوریوں نے ہندوستان کے میدانوں میں آباد افغانوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ پانی پت کی جنگ عظیم میں ابراہیم کی شکست کی خبر سن کر بہار خاں کے معاون افغان سردار خوشی سے اچھل پڑے۔ اور اب انہوں نے "شرم افغانی" کے لیے مغلوں سے لڑنے کا تہیہ کر لیا۔ انہوں نے دریائے گنگا کے اس پار بہار خاں کے سر پر ہندوستان کا تاج رکھ دیا اور اسے سلطان محمد کا خطاب عطا کر دیا۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ بہار خاں کی تاجپوشی کے موقع پر جملہ بااثر افغان سرداروں کے رتبہ و جاگیر میں اضافہ ہوا ہوگا۔ انہیں انعامات و خطابات ملے ہوں گے۔ اور غالباً اسی موقعہ پر فرید کو بھی شیر خاں کا خطاب ملا ہوگا۔ یہ کہنا کہ فرید کو یہ خطاب شیر مارنے کی وجہ سے ملا درست نہیں ہے۔

فرید کو شیر خاں کا خطاب ملنا

ایک روایت ہے کہ ایک روز فرید اپنے آقا بہار خاں لوہانی کے ہمراہ شکار کے لیے گیا۔ جنگل میں ایک شیر ملا اور فرید نے اسے قتل کر دیا۔ بہار خاں

Marfat.com

لوہانی اس وقت سلطان محمد کا خطاب اختیار کرچکا تھا۔ اس نے اپنے نام کے سکے رائج کیے تھے اور مسجدوں میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا تھا۔ وہ فرید کے اس بہادری کے کام سے بہت خوش ہوا اور اس کو شیر خاں کا خطاب دیدیا[1]۔ (عباس ۱۲)

اس مسئلہ پر بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ فرید کو شیر خاں کا خطاب سلطان محمد کی تاجپوشی کے موقع پر ملا لیکن گذشتہ ۰۰م سال سے ازمنہ وسطیٰ اور دور جدید کے مورخین[2] عباس کی اس کہانی پر ایمان لاتے رہے ہیں کہ فرید کو شیر خاں کا خطاب محض شیر مارنے کی وجہ سے ملا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عباس کی یہ کہانی اتنی ہی لغو، فرضی اور بے بنیاد ہے جتنی کہ عرب کے مشہور مورخ و مصنف البلاذری کی یہ کہانی کہ امیہ خلیفہ عبد الملک بن مروان نے اپنے دفتر میں عربی زبان محض اس لیے رائج کی تھی کہ اس کے دفتر کے یونانی و ایرانی منشی اپنی دواتوں میں پانی نہ رہنے پر پیشاب کر لیا کرتے تھے۔ اور اس خبر سے خلیفہ موصوف کو ایذا پہنچی تھی۔ یہ دونوں کہانیاں حقیقت پر مبنی نہ ہو کر قرون وسطیٰ کی اس ذہنیت کو آشکارا کرتی ہیں جس

---

[1] مصنف مخزن نے اس کہانی میں ایک جملہ کا اضافہ اور کیا ہے اس نے "بیک ضرب شمشیر" لکھا ہے یعنی فرید نے تلوار کے ایک ہی وار سے شیر کو مار ڈالا۔

[2] قانون گو "شیر شاہ صفحہ ۱۳" لکھتا ہے "ایک شیر دکھائی پڑا اور فرید نے اسے مار ڈالا" میرے ۱۷ سال بعد ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنرجی نے لکھا "ہمایوں نامہ جلد ۱۔ صفحہ ۱۸۰) ایک بار فرید نے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر اپنے آقا کو شیر سے بچایا"

ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ۴۳ سال بعد اس واقعہ کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اس روایت کو اپنے طرز بیان سے اور بھی جلا دیدی۔ وہ لکھتے ہیں "ایک روز جب آقا اور خادم دونوں شکار کھیل رہے تھے۔ دفعتہً ایک شیر پاس کی ایک جھاڑی سے نکلا۔ فرید نے جسے تلوار زنی میں مہارت حاصل تھی۔ (ثبوت۔ ؟) فوراً اسے قتل کر ڈالا۔ (لائف اینڈ ٹائمس آف ہمایوں۔ صفحہ ۱۰۵) مندرجہ بالا اقتباسات اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ ازمنہ وسطیٰ اور آج کے مورخین تاریخی واقعات کو کس طرح رنگ دیتے ہیں۔

Marfat.com

کی وجہ سے اس وقت کے مورخ کسی تاریخی واقعہ کی اصلیت نہ معلوم ہونے پر اس قسم کی کہانیاں گڑھ لیتے تھے۔ جس پر عوام کو یقین لانا سہل ہو۔ فرید کے متعلق عباس کی یہ کہانی بھی اس زمرہ میں شامل ہے۔ حالاں کہ یہ کہانی لفظ شیر خاں کی مناسبت شیر سے ہونے کی وجہ سے گڑھ دی گئی ہے۔ سرزمین ہند شیروں اور شیر دل لوگوں کا مسکن رہی ہے۔ ہند کی تاریخ میں صدہا شیر خاں اور شیر افگن ہوئے ہیں۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ اس نام کے ہر فرد نے کوئی شیر ہی مارا ہو۔ فرید کو شیر خاں کا خطاب عطا کیا جانا بھی ایک اتفاقیہ واقعہ ہو سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس خطاب کو "شیر" سے کوئی مناسبت ہو۔ بلاشبہ فرید میں شیر کی سی شجاعت تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے کردار میں عیاری اور چالاکی بھی مضمر تھی۔ اس کے یہ اوصاف نہ شیر دل اکبر میں ہی تھے نہ بہادر راجپوتوں میں۔ وہ شجاعت و دلیری میں جہاں گیر بادشاہ کے زمانہ کے راجپوت "انی رائے سنگھ سنگدلان" کے برابر بھی نہ تھا۔ علاوہ بریں پانی پت کی لڑائی کے بعد سیاسی حالات جس تیزی سے بدل رہے تھے اس کے دوران افغان سرداروں کو شکار کھیلنے کی فرصت کہاں تھی۔ انہیں تو ہر وقت یہ فکر دامن گیر تھی کہ کہیں وہ خود مغلوں کے تیروں کا شکار نہ ہو جائیں۔

باوجود ان واقعات کے قارئین تاریخ کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ سلطان محمد نے فرید کو شیر خاں کا خطاب کب دیا۔ غالباً یہ وقت ان ہر دو واقعات کے درمیان ہی ہو سکتا ہے۔

(۱) پانی پت کی لڑائی (۲۰ اپریل ۱۵۲۶ء) کے بعد جب بہادر خاں نے سلطان محمد کا خطاب اختیار کیا۔

اور (۲) جب شیر خاں بھاگ کر جنید برلاس کی خدمت میں حاضر ہوا۔

ہمایوں نے لوہانی اور دیگر افغان سرداروں کو دریائے گنگا اور گھاگھرا کے اس پار بھگا کر دسمبر ۱۵۲۶ء میں جونپور کو جنید برلاس کے تصرف میں دیدیا تھا[1]۔ لہٰذا محض گیارہ ماہ کی قلیل مدت میں ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ فرید کی زندگی میں یہ جملہ واقعات اگر بقول عباس ان کو سچ مان لیا جائے تو کب سرزد ہوئے۔ مثلاً فرید

Marfat.com

کو شیر کا خطاب کب ملا۔ وہ کتنے روز جلال خاں کا اتالیق بن کر رہا۔ دریا بقول عباس تا اتالیق بن کر رہا۔ صفحہ ۶۲) سلطان محمد سے رخصت ہو کر وہ سہسرام کب واپس آیا سلطان محمد کے دربار میں محمد خاں سوری نے اس کے خلاف کب سازش کی۔ محمد خاں سوری سے اس کی لڑائی کب ہوئی اور وہ بھاگ کر جونپور کب پہنچا وغیرہ وغیرہ۔ عباس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات فرید کی زندگی میں اسی دوران میں ظہور پذیر ہوئے۔[1] اگر بابر کی تزک کی روشنی میں فرید کی زندگی کے واقعات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ تو بلاشبہ عباس کی قلعی کھل جاتی ہے اور یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہونے لگتی ہے کہ ۱۱ مہینہ کی قلیل مدت میں یہ سب کیسے ظہور پذیر ہوئے۔ بابر رقمطراز ہے۔

" اس وقت یعنی ۱۲ مئی ۱۵۲۶ء کو ناصر خاں لوہانی معروف فارمولی اور دیگر افغان سرداروں کی ایک جمعیت قنوج کے اس جانب ہم سے دو یا تین منزل دور ہے۔ انہوں نے دریا خاں لوہانی کے لڑکے بہار خاں کو سلطان محمود کا خطاب دیکر اپنا بادشاہ بنا لیا ہے۔"[2]

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ بہار خاں کی تاجپوشی کی رسم جنگ پانی پت کے تقریباً دس روز بعد ہوئی ہوگی۔ کیوں کہ ابراہیم کی شکست و موت کی خبر قنوج تک بذریعہ ہرکارہ یا ڈاک چوکی پہنچنے میں غالباً اتنا عرصہ ضرور لگا ہوگا۔ اس رسم تاجپوشی کے فوراً بعد ہی کچھ افغان امیر بہادر خاں سے ناخوش ہو کر بابر کی خدمت میں چلے گئے تھے ان سرداروں میں ایک نام

---

[1] سلطان محمد کے واقعات کے متعلق (۱) عباس صفحہ ۶۲۔ (۲) مخزن صفحہ ۱۸۔ جنید برلاس کی جونپور میں تقرری کے متعلق دیکھیے تزک بابری مترجم صفحہ ۲۴۰۔

[2] تاریخ عباس کی جو نقل میرے پاس دستیاب ہے اس میں لکھا ہے کہ فرید نے اپنا سفیر جنید برلاس کے پاس آگرہ بھیجا اور وہاں سے وہ برلاس کی فوج لے کر واپس لوٹا۔ (دیکھیے عباس صفحہ ۶۴ سے ۶۸) مخزن صفحہ ۹ سے ۱۲ لکھتا ہے کہ فرید جنید برلاس سے کڑا مانک پور کے مقام پر ملا۔ بابر کی تزک میں دی ہوئی تاریخ اور واقعہ زیادہ مستند ہیں۔

Marfat.com

بایزید فارمولی کا ہے جو اپنے بھائی معروف فارمولی سے عرصہ دراز سے اودھ کی جاگیر کے متعلق کینہ و عداوت رکھتا تھا۔ دوسرا سردار محمد خاں لوہانی تھا۔ جس کو غازی پور کے جاگیردار ناصر خاں لوہانی سے اسی قسم کا بغض تھا۔ بابر کی فوج کا جنگ پانی پت کا تکان ابھی کم نہ ہوا تھا علاوہ ازیں اس کو کچھ دیگر اہم مصروفیات بھی تھیں۔ لیکن افغان غداروں کی موجودگی نے بابر کو اس غیر معمولی وقت میں فوج کشی کے لیے آمادہ کر دیا تاکہ قبل اس کے کہ افغان سردار اپنی تنظیم و اتحاد سے طاقت بہم کریں وہ ان پر حملہ کر دے۔ اس مہم پر ہمایوں ماہ اگست ۱۵۲۶ء میں روانہ ہوا۔ اور پانچ ماہ کے عرصہ میں اس نے ضلع بلیا میں خرید تک کا تمام علاقہ اپنے تصرف میں لے لیا۔ اس اثنا میں اس کو افغان سرداروں سے کسی جگہ بھی لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ اودھ اور غازی پور کا علاقہ بالترتیب معروف خاں اور ناصر خاں سے چھین کر بایزید فارمولی اور محمد خاں لوہانی کو دے دیا گیا۔ اور جونپور میں اس نے اپنا قائم مقام سلطان جنید برلاس اور شاہ میر حسن کو بنا دیا۔ اور کچھ مغل فوج وہاں رکھ دی تاکہ افغانوں پر نگاہ رکھے۔ ۶ر جنوری ۱۵۲۷ء کو فاتح ہمایوں جونپور سے کڑامانک پور اور کالپی ہوتا ہوا آگرہ پہنچا اور بابر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ (دیکھیے تزک صفحہ ۵۴۴)۔

اس وقت سلطان محمد کا بے ساختہ پیچھے ہٹنا اس بات کی دلیل ہے کہ لوٹتے وقت بابہار میں پہنچ کر وہ شکار کی بات کیسے سوچ سکتا تھا؟ وہ تو مغلوں سے لرزہ براندام ہو رہا تھا۔ مغلوں نے اس کے دو قومی معاون و مددگار افغان سردار معروف خاں اور ناصر خاں کو ان کی جاگیر سے برطرف کر دیا تھا۔ ان کی جگہ اب ان کے جانی دشمن و قومی غدار بایزید فارمولی اور محمد خاں لوہانی نے لے لی تھی۔ ایسے نازک وقت میں جب کہ تمام افغان سردار اپنی سلامتی جان و مال کے لیے گھر کی طرف بھاگ رہے تھے اور فاتح مغل فوج دریائے گنگا کے اس پار ڈیرہ ڈالے پڑی تھی یہ بات ذہن میں نہیں آتی کہ شیر خاں اور محمد خاں سوری سلطان محمد کے دربار میں رہ جاتے اور اپنی جاگیر قسمت پر چھوڑ دیتے۔ لہٰذا عباس کے بیان کی تائید اصلی واقعات سے کرنا بے سود ہے۔ یہ بات زیادہ قرین قیاس

Marfat.com

ہے کہ سلطان محمد نے اپنی تاجپوشی کے وقت ۱۵۲۶ء میں ہی فرید کو شیر خاں کا خطاب عطا کیا اور بعد میں جب سلطان محمد مشرق کی جانب پیچھے ہٹ رہا تھا تو شیر خاں اور محمد خاں سوری بھی اپنی جاگیر کی حفاظت کیلئے اس سے جدا ہو گئے۔ اس وقت محمد خاں سوری کے لیے کوئی موقع ایسا نہ تھا کہ وہ فرید کے خلاف سلطان محمد سے سازش کرتا یا اس کی جاگیر کو اپنے قبضہ میں کرنے کی کوشش کرتا۔ سلطان محمد کی طاقت ہمایوں کے حملہ کے خوف سے خود ہی جواب دے رہی تھی۔ چنانچہ اس وقت سلطان محمد میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ سہسرام کے ایک معمولی جاگیر دار کی خاطر محمد خاں سوری جیسے معتمد دوست و مددگار کو ناراض کر دیتا۔

دوسرا غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ بہار خاں کے یہاں ملازمت کے دوران فرید کو جلال خاں لوہانی کا اتالیق کب مقرر کیا گیا۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ یہ تقرری تو ہوئی تھی۔ اگر ہم عباس اور مخزن کی ترتیب واقعات کو صحیح تصور کرلیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ معاملہ فہمی اور ہوشیاری کی بنا پر نائب یا وکیل یا اتالیق کے عہدہ پر فرید کی تقرری اس کے شیر خاں کے خطاب حاصل کرنے کے بعد ہی ہوئی تھی۔ لیکن متذکرہ بالا سیاسی واقعات کی ترتیب کی روشنی میں اس بات کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی کہ جنگ پانی پت کے بعد فرید کی تقرری کے بعد اتنا وقت مل جاتا کہ اس کی شہرت ہو جاتی چنانچہ قرین قیاس یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جلال خاں کا اتالیق اور کارپرداز ۱۵۲۵ء کے آخری نصف میں ہی مقرر ہوا ہوگا۔ اور جو فضیلت و شہرت اس کو عباس کے بیان کے مطابق خوش انتظامی کے لیے حاصل ہوتی وہ جلال خاں کی جاگیر کے انتظام کی بدولت ہی حاصل ہوئی۔ نہ کہ تمام علاقہ بہار کے حسن نظام سے۔ اسی وقت وہ جلال خاں کی والدہ دودو کا معتمد اور منظور نظر بھی ہو گیا۔

شیر خاں کا سہسرام سے نکلنا اور واپسی

چونڈ کا افغان سردار محمد خاں سوری میاں حسن کے عزیز و اقارب

Marfat.com

سے اپنی پرانی دشمنی کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ پانی پت کی مشہور لڑائی کے بعد مشرقی صوبوں میں جو بدامنی و بدنظمی پھیلی اور اس کی وجہ سے سلطان محمد اور اس کے ہم عنان افغان سردار مرعوب ہوئے اور ان کے اتحاد کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس نے محمد خاں سوری کو یہ موقع دے دیا کہ وہ اس وعدہ کو وفا کرے۔ جو کہ اس نے سلیمان اور اس کے بھائیوں سے کیا تھا۔ اس نے شیر خاں کے پاس اپنا ایک سفیر شادی غلام بھیجا اور پرزور مانگ کی کہ وہ اپنے والد کی جاگیر میں سے ٹانڈہ اور ملہو سلیمان کے سپرد کر دے کیوں کہ اس جاگیر میں اس کا بھی حصہ ہے شیر خاں نے مودبانہ التجا کی کہ وہ سمجھداری سے کام لے۔ ہندوستان روہ کا علاقہ نہیں ہے جہاں باپ کی جائیداد اس کے بیٹوں میں بحصہ مساوی تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس نے ٹانڈہ اور ملہو سلیمان کو سپرد کر دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اور اس نے اپنے غلام ملک سُکھا کو جو کہ خواص پور ٹانڈہ کا حاکم تھا۔ یہ ہدایت کی کہ وہ طاقت کا جواب طاقت سے دے۔ اور مقابلہ میں پورا ساز و سامان لگا دے۔ شادی غلام اپنے آقا کی تمام خانگی فوج لے کر غلام سُکھا پر ٹوٹ پڑا۔ لڑائی میں غلام سکھا مارا گیا اور شیر کی فوج شکست خوردہ سہسرام کی جانب بھاگ گئی۔ چونکہ جاگیردار شیر کے مقابلہ میں تین گنا زیادہ طاقتور تھا۔ برعکس اس کے شیر خاں کے پاس اس کے مقابلہ کے لیے کافی ساز و سامان نہ تھا۔ اس نے اس باب میں اپنے بھائی نظام سے مشورہ کر کے آئندہ کے طرز عمل کا فوراً فیصلہ کیا کہ نظام تمام عزیز و اقارب یا مددگار لے کر روہتاس کی پہاڑیوں میں چلا جائے اور روہتاس کے راجہ سے استدعا کرے کہ وہ عارضی طور پر ان کو اپنے قلعہ میں پناہ لینے کی اجازت دیدے۔ اسی عرصہ میں شیر خاں جونپور کے مغل گورنر سلطان جنید برلاس کے پاس جا کر مدد مانگے۔

اس تجویز کے بموجب شیر خاں بنارس[1] گیا اور وہاں اپنے سفیر کا انتظار

---

[1] اس مقام کا نام بنارس ہم نے اپنی جانب سے لکھا ہے۔ عباس نے لکھا تھا شیر پٹنہ گیا اور وہاں سے جونپور کے گورنر سے سلسلہ نامہ و پیام جاری کیا لیکن اس بیان سے

Marfat.com

کرنے لگا۔ اس نے گورنر مذکور کے پاس اپنا سفیر اس منشا سے بھیجا تھا کہ گورنر اس کو اس بات کا اطمینان دلا دے کہ اگر فرید اس کے پاس جائے تو اس کو کسی طرح کا ضرر نہ پہنچایا جائے گا۔

عباس لکھتا ہے کہ ایک بار پہلے بھی روہتاس کے راجہ کے نائب چوڑامن نے میاں نظام کے خاندان کو اپنے یہاں پناہ دی تھی۔ یہ غالباً جنوری ۱۵۳۸ء کی بات ہے جب ہمایوں نے دوسری بار چنار کے قلعہ کا محاصرہ کیا تھا۔ اور شیر نے چوڑامن سے ساز باز کی تھی۔ عباس کے بیان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس ضرورت سے مجبور ہو کر میاں نظام نے چوڑامن کے یہاں پناہ لی تھی۔ یقیناً یہ ضرورت میاں حسن کے دوران حیات یا اس کے انتقال کے فوراً بعد پیدا نہیں ہو سکتی تھی لہٰذا یہ نتیجہ نکالنا زیادہ مناسب و درست ہوگا کہ جب شیر خاں جونپور کے لیے روانہ ہو گیا تو نظام نے بھی معہ اپنے متعلقین کے سہسرام کو خیرباد کہہ دیا۔ اور اپنے فاتح سوتیلے بھائی کے انتقام اور محمد خاں سوری کی فوج سے بچنے کے لیے روہتاس کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوا۔ چنانچہ وہ فروری ۱۵۲۷ء سے دسمبر ۱۵۲۸ء تک تقریباً ۲۰ مہینہ مجبوراً جلاوطنی کے عالم

عباس نے ہندوستان کے جغرافیہ سے اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے۔ جیسا کہ اکثر اس نے دوسری جگہ بھی اس قسم کی غلطی کی ہے۔ پٹنہ بہار شریف سے ۳۴ میل (باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۲ پر)

(بقیہ حاشیہ ۱۶۲ کا) بجانب شمال ہے۔ بہار شریف اس وقت سلطان محمد لوہانی کا صدر مقام تھا۔ اور عباس کے خود کے بیان کے مطابق شیر خاں محمد خاں لوہانی سے اس وقت نہیں ملنا چاہتا تھا۔ جونپور سے بنارس کا فاصلہ ۳۴ میل ہے۔ دی سرکار انڈیا آف اورنگ زیب صفحہ ۱۱) اور گنگا کے کنارے پر سہسرام اور جونپور سے سب سے زیادہ نزدیک ہے۔ اسی وجہ سے پٹنہ کے بجائے بنارس زیادہ ممکن ہے۔

Marfat.com

میں رہا[1]

شیر خاں فروری ۱۵۲۷ء میں سلطان جنید برلاس کے توسل سے مغلوں کی ملازمت میں داخل ہوا۔ اس وقت اس بات کا کوئی امکان نہ تھا۔ کہ شیر خاں کو اس کے دشمنوں کے خلاف کوئی مدد مل سکے۔ یہ محض ایک موہوم سی امید تھی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ۱۵۲۷ء کے موسم سرما میں بابر بادشاہ کا مستقبل شیر خاں کے مقابلہ زیادہ تاریک تھا۔ میواڑ کے رانا سانگا نے راجپوتانہ کی تمام طاقتوں کو اپنے پرچم کے نیچے متحد کر لیا تھا۔ وہ شمالی ہند میں دوبارہ ہندو راج کو زندہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے مالوہ کی مسلمان طاقت کو سرنگوں کر دیا تھا اور اپنی معرکہ آرا فتوحات سے گجرات کے حکمراں مظفر شاہ دوم کو بھی پایمال کر دیا تھا۔ اس سب کے باوجود اس میں سیاسی بیداری اور دور اندیشی برائے نام ہی تھی۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ہند کے جملہ ہندو جنگجو حکمراں اس کمزوری کا شکار رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ دلیر اور بلند حوصلہ پرتھوی راج دوم کی مانند ہی رانا سانگا کو بھی بالآخر ہار کا منہ دیکھنا پڑا اور وہ اپنے منصوبہ میں ناکامیاب رہا۔ اگر

دہلی اور اجمیر کے چوہان حکمراں میں ذرہ برابر بھی سیاست دانی اور فن حرب کی مہارت ہوتی تو وہ اپنے پڑوس کے کمزور مسلم حکمراں خسرو ملک غزنوی سے مل کر اپنے مشترکہ دشمن شہاب الدین غوری کو دریائے سندھ نہ پار کرنے دیتا۔

---

[1] یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ میں فرید کے متعلق عباس کے مندرجہ ذیل بیانات کو نہیں مانتا اور ان کو رد کرتا ہوں۔ (۱) یہ کہ فرید طویل عرصہ تک سلطان محمد کی خدمت میں رہا (۲) یہ کہ وہ رخصت لے کر اپنے وطن آیا۔ (۳) یہ کہ وقت مقررہ پر نہ پہنچنے سے اس کے آقا کو پریشانی ہوئی (۴) یہ کہ محمد سوری نے اس کے خلاف سازش کی (۵) یہ کہ لوہانی سردار کی چشم پوشی سے محمد سوری نے شیر پر حملہ کیا۔ لہٰذا میں نے "شیر شاہ" کے پہلے ایڈیشن (صفحہ ۳۰ سے ۳۲) میں شیر شاہ کے متعلق جو قیاس آرائیاں کی تھیں میں اب اس کی تردید کرتا ہوں۔ کیوں کہ میں نے پہلے شیر شاہ کے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ عباس پر مبنی تھا جبکہ درحقیقت وہ غلط ہے عباس قلمی نسخہ صفحہ ۱۳۔ ایلیٹ ۱۔ جلد ۴۔ صفحہ ۳۵۰۔

Marfat.com

تب تاریخ اس کو "محافظ قوم وملت" کے لقب سے یاد کرتی۔ اسی طرح اس موقف
پر سیاست کا یہ ہی تقاضا تھا کہ پانی پت کے میدان جنگ میں رانا سانگا ابراہیم
لودی کے شانہ بشانہ تلوار پکڑتا، لیکن بدقسمتی سے مہارانا کا رویہ پرتھوی راج
کے ہم عصر راجہ جمو کے مانند افسوسناک اور قابل مذمت رہا۔ راجہ جمو نے
شہاب الدین غوری کو خسرو ملک کے خلاف حملہ کی ترغیب محض اس غرض سے
دی تھی کہ سیالکوٹ پر اس کا قبضہ ہو جائے لیکن بعد میں اسے کف افسوس ملنا
پڑا اور وہ خود بھی غوری کے حملہ کا شکار ہوا۔ رانا سانگا نے بھی ابراہیم لودی
کے خلاف بابر کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دونوں طاقتوں
کو (مغل اور پٹھان) آپس میں لڑا دے اور جب وہ باہمی جنگ وجدل سے کمزور
ہو جائیں تو دونوں کو نیست ونابود کرے۔ (خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ رانا
سانگا کا یہ خیال کس قدر غلط نکلا)۔ البتہ پانی پت
کی لڑائی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں نے سیاسی بیدار مغزی اور کشادہ
دل حب الوطنی کا ثبوت دیا۔ وہ بیرونی حملہ آور سے لوہا لینے کے لیے ہندو پرچم
کے نیچے متحد ہو گئے۔ پانی پت کی لڑائی کے بعد ہی جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئی
تھیں۔ سکندر لودی کا لڑکا تخت کا باطل دعویدار محمود دس ہزار افغان فوج کے
ساتھ رانا کے ساتھ ہو گیا۔ محمود اس وقت خانہ بدوش تھا۔ حالاں کہ تخت کا
دعویدار تھا۔ الور کا بہادر اور جری حاکم حسن خاں میواتی بھی ایک کثیر فوج کے
ساتھ رانا سے آکر مل گیا۔ مغلوں میں آئندہ لڑائی کے خیال سے ہی خوف اور سنسنی
پھیلی ہوئی تھی۔ روزانہ کسی نہ کسی افغان سردار کے جس کے ساتھ بابر نے احسان
کیے تھے ساتھ چھوڑنے کی خبر آجاتی تھی۔ بابر خود امداد غیبی کے لیے دعا مانگ
رہا تھا اور خداوند تعالیٰ کے حضور میں توبہ کر رہا تھا کہ وہ ایک مقررہ تاریخ
سے شراب نوشی ترک کر دے گا۔ حالاں کہ اس عرصہ میں بھی وہ اکثر عیش وعشرت
وحسن کی محفلوں میں معروف رہتا تھا اور خوب شراب پیتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے
کہ ایک اچھا عیسائی لینٹ سے پہلے کارنیوال میں شراب پیتا ہے [1]

---

[1] جنگ کنواہہ سے پہلے بابر کی مشکلات کے لیے دیکھیے تزک بابری صفحہ ۵۰۷

Marfat.com

بالآخر، ۱۷ مارچ ۱۵۲۷ء کو کنواہہ کی فیصلہ کن لڑائی ہوئی۔ یہ مقام فتح پور سیکری سے ۱۰ میل بجانب مغرب ہے۔ یہ لڑائی پانی پت کی لڑائی سے زیادہ معرکہ آرا اور خونریز تھی۔ اس لڑائی میں بابر کو رانا سانگا کی متحدہ فوج پر فتح نصیب ہوئی۔ یہ فتح خود مغلوں کو تو ایک کرشمہ الٰہی معلوم ہوا۔ کیونکہ آج تک مغل فوج کا سامنا ایسے قوی دشمن و مسلح و منظم فوج سے نہیں ہوا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کافروں کی یہ شکست کرشمہ الٰہی نہ تھا بلکہ بابر کے فوجی امتیاز کا صلہ تھا اس نے ہند کے گھوڑ سواروں کے گھسے پٹے طرز معرکہ کے خلاف عثمانی ترکوں کی نوایجاد طرز جنگ کو استعمال کیا تھا۔ حقیقتاً یہ کوئی جنگ نہ تھی بلکہ افغانوں اور راجپوتوں کی خودکشی تھی۔ یہ مغل فوج کی توپوں اور بندوقچیوں کا شکار ہوئے۔ یہ لوگ ارابہ یعنی لکڑی کی عارضی دیوار کے پیچھے سے مہلک گولہ باری کرتے ___ یہ ارابہ بیل گاڑیوں کو چمڑے کی رسیوں سے باندھ کر بنایا گیا تھا۔ اس کے برعکس دوسری جانب راجپوت اور افغانوں کی فوج تھی جو شجاعت اور دلیری میں ذرا بھی کم نہ تھی۔ لیکن جن کے پاس اسلحہ حرب صرف نیزہ اور شمشیر ہی تھے جو دشمن تک چوٹ بھی نہ کر سکتے تھے۔ انجام یہ ہوا کہ گولیتھ کی مانند جو داؤد کی کمند سے ہلاک ہو گیا تھا۔ تمام فوج پائمال ہو گئی۔

ہند کی فوجی تاریخ میں پانی پت اور کنواہہ کی لڑائیاں ۱۶ ویں صدی کے طریقہ جنگ میں ایک معرکتہ الآرا انقلاب کی علمبردار رہیں۔ جس طرح دور حاضر میں ۱۷۵۷ء کی جنگ اربا میں ڈوپلے کی یورپین طریقہ پر سکھائی ہوئی پیادہ فوج نے کثیر تعداد رسالہ پر فتح حاصل کی تھی۔ سیاسی نقطہ نظر سے بھی ان لڑائیوں کی ایک خاص اہمیت تھی۔ بابر کی فتح نے ہند کی قسمت کو ۲۰۰ سال سے بھی زیادہ عرصہ کے لیے خاندان تیموریہ کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

شیر خاں نے مغلوں کے ساتھ رہ کر اسی قسم کی تربیت حاصل کی جیسا کہ ۱۸۰۰ سال پیشتر چندر گپت موریہ نے سکندر اعظم کے خیمہ میں رہ کر کی تھی۔ مغرور چندر گپت موریہ کی ہی طرح شیر خاں کی وفاداری مشتبہ ہو گئی تھی اور اسے اپنی سلامتی جان کے لیے فرار ہونا پڑا۔ لیکن بابر کی تزک عباس اور

Marfat.com

دوسرے افغان مورخین کا پردہ فاش کر دیتی ہے۔ دور حاضر کے مورخین پر ایک بار پھر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ جو عباس پر ایمان لائے گا یقیناً گمراہ ہو گا۔ پھر بھی صداقت کی خاطر عباس نے بابر اور شیر خاں کے تعلقات پر جو کچھ لکھا ہے اس کا تنقیدی جائزہ لینا ضروری ہے۔

اس زمانہ کے شیر خاں کے خاص خاص واقعات زندگی جن کا عباس نے ذکر کیا ہے۔ حسب ذیل ہیں۔

(۱) وہ دوبارہ اپنی جاگیر پر تصرف کرتا ہے اور محمد خاں سوری کو چوند سے نکال باہر کرتا ہے۔ محمد خاں سوری روہتاس کے قلعہ میں جا کر پناہ لیتا ہے شیر خاں نے یہ کام مغل فوج کی اعانت سے کیا جو سلطان جنید برلاس نے اس کے لیے جونپور سے بھیجی تھی۔ شیر خاں دریا دلی اور فیاضی سے شکستہ دشمن کو معاف کرتا ہے اور اس کی جاگیر واپس دے کر اسے اپنا دوست بنا لیتا ہے۔

مخزن نے بھی اس واقعہ کو یوں ہی دہرایا ہے محض اس میں اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ کچھ دن بعد..... شیر خاں فوج کی ایک ٹکڑی لے کر جو کڑا مانک پور کے گورنر سلطان جنید برلاس نے دی تھی.....

(۲) سہسرام سے شیر خاں سلطان جنید برلاس کی خدمت میں آگرہ گیا اور اس کی وساطت سے بابر کے دربار میں پیش ہوا۔ اس نے چندیری کے محاصرہ میں شرکت کی اور کچھ مدت تک مغلوں کی فوج کے ساتھ رہ کر طریقہ جنگ و نظام حکومت سیکھے۔

(۳) ایک روز ایک دعوت میں بابر کی موجودگی میں شیر خاں کو چینی کی طشتری میں مچھلی کھانے کو دی گئی۔ شیر خاں اس کھانے سے ناواقف تھا۔ اس نے فوراً اپنے خنجر سے اس کو کاٹا اور کھانے لگا۔ بابر یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے وزیر کی توجہ اس طرف دلائی اور یہ کہا کہ اس نے ایک سے ایک عالی مرتبہ۔ ذوی القدر بہادر افغان دیکھے ہیں لیکن آج تک کسی اور افغان نے اس کو متاثر نہیں کیا۔ اس نے اپنے وزیر کو یہ بھی تاکید کی وہ شیر خاں پر متواتر

Marfat.com

اپنی نگاہ رکھے۔

(۴) میر خلیفہ شیر خاں کی جانب سے بابر کو یقین دلاتا ہے کہ شیر خاں نیک طبع اور نیک سرشت ہے اس کے ساتھیوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے کہ اس کی جانب سے کسی قسم کا کوئی خدشہ پیدا ہو۔

(۵) شیر شاہ اس سرگوشی سے متفکر ہو جاتا ہے اور اپنے خیمہ کو واپس لوٹ کر اپنے ہمراہیوں سے اس کا تذکرہ کرتا ہے اور چپ چاپ بھاگ کھڑا ہوتا ہے بابر کو مجلس میں شیر کی عدم موجودگی کا احساس ہوتا ہے وہ شیر کو بلانے کے لیے آدمی بھیجتا ہے اور یہ معلوم ہونے پر کہ شیر خاں بھاگ گیا میر خلیفہ سے ناراض ہوتا ہے۔

(۶) شیر خاں سہسرام واپس لوٹتا ہے اور جنید برلاس کی خدمت میں بیش قیمت تحفے اور سوغات بھیج کر اپنی غیر حاضری کا بہانہ پیش کرتا ہے اور اسی وقت یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ نہ تو مجھے ہی مغلوں پر اب کوئی اعتماد رہ گیا ہے اور نہ مغل ہی میرا اعتبار کرتے ہیں اب وقت اور حالات کا تقاضا یہی ہے کہ میں سلطان محمد لوہانی کی خدمت میں چلا جاؤں اور اس نے ایسا ہی کیا۔ (عباس صفحات ۶۸-۶۸)۔

اب ہم عباس کے ان واقعات کا بابر کی تزک میں دی ہوئی تاریخ اور واقعات سے مطابقت کرکے دودھ اور پانی علیحدہ علیحدہ کریں گے۔

(۱) ۱۵۲۶ء کے قریب سلطان جنید برلاس اور شاہ میر حسن کی تقرری جونپور میں ہوئی۔ چندیری کا محاصرہ ۱۵۲۸ء میں ہوا۔ اس درمیان مشرقی صوبوں کی سیاسی فضا میں اس قدر ہیجان اور شورش تھی جیسا کہ خود بابر نے اپنی تزک میں بیان کیا ہے[1] کہ برلاس کے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ مغل فوج کا کوئی دستہ

---

[1] بابر نے اپنی تزک میں فروری ۱۵۲۶ء کی سیاسی فضا کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔
"اس زمانہ میں ہر چہار طرف بدامنی اور ابتری کا عالم تھا۔ حسین خاں لوہانی نے راپری پر قبضہ کرلیا تھا۔ قطب خاں نے آگرہ سے ۶۵ میل دور چندوار پر قبضہ کرلیا۔ کول

(باقی حاشیہ ۱۴۸ پر)

Marfat.com

شیر خاں کی کمک کے لیے بھیج سکتا جس کی مدد سے وہ سہسرام کی اپنی جاگیر پر دوبارہ قبضہ کر سکتا۔ ہمایوں کی واپسی کے ایک مہینہ کے اندر ہی قنوج سے کول و علی گڑھ تک کا تمام علاقہ مغلوں کے تصرف سے نکل گیا۔ صرف جونپور کے قرب و جوار کا کچھ علاقہ ان کے اقتدار میں رہ گیا۔ بتن لودی نے مارچ ۱۵۲۷ء میں لکھنؤ کا محاصرہ کیا اور بایزید فارمولی کی وفاداری بھی مشتبہ ہو رہی تھی۔ چندیری کے محاصرہ میں بابر کی فوج بتن لودی کے ہاتھوں شکست کھا کر بھاگ کر قنوج میں پناہ گزیں ہوئی تھی۔ فروری ۱۵۲۸ء میں حالات اتنے بدتر ہو گئے تھے کہ بابر کو اپنی فوج کشی کا منصوبہ بدلنا پڑا۔ اور اب اس نے قنوج کی طرف رخ کیا۔ یہاں گنگا پار کرنے کے راستہ پر معروف فارمولی کے لڑکے نے اس کو روکا۔ ان حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے عباس کا یہ بیان کہاں تک قابل یقین ہے کہ سلطان محمد جنید برلاس (جو خود مصیبتوں سے گھرا ہوا تھا) کوئی فوج گنگا کے اس پار شیر کی مدد کے لیے بھیج سکتا تھا۔ اور وہ بھی اس کثیر تعداد میں کہ چوند کے حاکم محمد خاں سوری جیسے دبنگ اور طاقتور سردار کا ایک دم خاتمہ کر دے۔ یہ کام تو کوئی جاہل مطلق یا فاتر العقل ہی کر سکتا تھا۔ کیوں کہ اس کا یہ فعل اس کی مشکلات و پریشانیوں میں اضافہ کر دیتا۔

(۲) ۱۵۲۹ء سے پیشتر بابر کی تزک میں شیر خاں کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ ایک جگہ کسی ضمن میں یہ ذکر ضرور ہے کہ ۱۵۲۸ء کے آخری نصف میں بابر نے اس کو کچھ پرگنے دیے۔ سلطان جنید برلاس کے جونپور چھوڑنے کا یا آگرہ یا چندیری

(بقیہ حاشیہ ۱۴۷) رستم خاں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ اس نے کیچک علی کو گرفتار کر لیا۔ خواجہ زاہد سنبھل چھوڑ کر بھاگ گیا۔ سلیمان محمد دلائی قنوج سے میرے پاس آیا۔ ہر روز چاروں طرف سے خبر بد ملتی تھی۔ ہندی لوگوں نے غداری شروع کر دی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب شیر خاں بھاگ کر سلطان جنید برلاس کے یہاں جونپور پہنچا تھا۔ اس عالم ابتری میں وہ ہی ایک ایسا افسر تھا جس نے اس بڑھتے ہوئے سیلاب میں بڑی مشکل سے اپنے پیر جمائے رکھے۔"

Marfat.com

پہنچنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا عباس کا یہ بیان کہ برلاس کی وساطت سے شیر خاں بابر کے دربار میں پیش ہوا بعید از قیاس ہے۔

(۳) جہاں تک ماہی چا کی کہانی اور شیر خاں کا ہمراہیوں سے لاف زن کا سوال ہے اس سالم واقعہ کا انحصار اس بات پر ہے کہ شیر خاں مغل فوج سے بھاگا یا نہیں۔ عباس کا یہ کہنا کہ محمد خاں سوری شیر خاں کی امدادی مغل فوج کے خوف سے بھاگ کر روہتاس کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوا قطعاً بے بنیاد و لغو ہے کیوں کہ کوئی بھی ذی عقل اور باہوش انسان ایسی غلطی نہیں کر سکتا کہ وہ چونڈ سے بھاگ کر جو مرزاپور کے وسط میں واقع ہے شیر شاہ کے پڑوس میں آ کر روہتاس میں پناہ گزیں ہو۔ جب کہ مرزاپور کے پاس نزدیک ہی بندھیل کھنڈ اور بگھیل کھنڈ کے دشوار گذار جنگل ہیں۔

اب ماہی چا کی کہانی پر غور کیجیے۔

خود عباس نے یہ کہانی اپنے چچا شیخ محمد سے سنی تھی۔ شیخ محمد چندیری کی لڑائی میں خان خاناں یوسف خیل کے جو بابر کو کابل سے بلا کر لایا تھا ہم رکاب تھا۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز شیخ ابراہیم سروانی نے شیخ محمد سے کہا "شیر خاں کے خیمہ پر تشریف لے چلیے اور اس کی لاف زنی پر غور فرمایئے جس کا کہ سب لوگ مذاق اڑاتے ہیں۔" کہا جاتا ہے کہ اس مجلس میں شیر لاف زنی میں حد سے زیادہ تجاوز کر گیا اور گرم ہو کر ڈینگ مارنے لگا۔ "شیخ محمد تم آج میرے اور ابراہیم کے درمیان گواہ رہو اگر قسمت نے یاوری کی تو میں بہت جلد مغلوں کو ہندوستان سے نکال دوں گا۔ میں کافی عرصہ مغلوں کے ساتھ رہا ہوں۔ میں نے ان کی "روش جنگ" دیکھی ہے میں نے دیکھا ہے کہ دوران جنگ ان میں ثبت و قرار ترتیب و تنظیم نہیں ملتی۔ ان کا بادشاہ[1] اپنے عہد کی شان و خاندانی تکبر کی وجہ سے خود سلطنت کی دیکھ بھال

---

[1] ایلیٹ نے اپنے ترجمہ میں لفظ بادشاہ کو بطور جمع استعمال کیا ہے

Marfat.com

نہیں کرتا ہے۔ ان کے امیر ہر معاملہ میں بدنیتی سے کام لیتے ہیں خواہ وہ کسی سپاہی سے متعلق ہو یا کاشت کار سے۔ یا کسی باغی زمیندار کے متعلق ہو۔ اگر تقدیر نے یاوری کی تو شیخ تم دیکھو گے اور سنو گے کہ میں کس طرح تمام افغانوں کو اپنی کمان میں متحد و منظم کرتا ہوں۔ اور پھر ان کو منتشر نہ ہونے دوں گا۔"

شیر کی اس لنترانی میں صریحاً ایک پیشن گوئی نمایاں ہے۔ دور حال کے مورخوں[1] نے نہایت ہی وضاحت سے اس پر جلا کر دی ہے اور اپنے مبہم پرواز تخیل کے ذریعہ مستقبل کے شیر شاہ کی ہستی کا انکشاف کیا ہے۔ جب بار بار ان بیانوں کو دہرایا گیا۔ تو انہوں نے ایک تاریخی بدعت کی صورت اختیار کر لی۔ میری رائے کی

---

[1] ڈاکٹر ایشوری پرشاد لکھتے ہیں۔ "ظاہر ہے کہ اس وقت چندیری کے محاصرہ کے وقت وہ مغلوں کے بہت نزدیک آیا۔ اور اس نے ان کو ہندوستان سے باہر نکالنے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے اپنے ارادہ کو چنداں پوشیدہ نہیں رکھا اور نہایت ہی دیدہ دلیری سے اس کا اظہار بھی کر دیا۔ اس نے دیکھا کہ مغلوں میں تنظیم و ترتیب کی زبردست کمی ہے۔ وہ اپنے سرداروں اور وزیروں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد رکھتے ہیں۔ اسکے دل میں یہ بات اتنی گہرائی سے گھر کر گئی تھی کہ اس کو یہ کلی یقین ہو گیا کہ افغانوں کو متحد کر کے وہ مغلوں کو ہندوستان سے باہر نکال دے گا۔ (ہمایوں۔ صفحہ ۱۰۹)۔ ڈاکٹر موصوف نے اس واقعہ کو باور کرنے کی جو وجہ بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ عباس سروانی نے اپنے چچا شیخ محمد سے سنا تھا کہ شیر شاہ چندیری کے محاصرہ میں موجود تھا۔ تعجب ہے کہ قابل قدر مورخ کی نظر واقعات کی تشریح و تنقید کرتے وقت ان خامیوں کی جانب مطلق نہیں گئی۔ اس واقعہ پر یقین لانے کے یہ معنی ہیں کہ ہم شیر شاہ کو اس کے زمانہ کا سب سے بڑا شیخ چلی مان لیں کیا یہ قرین قیاس ہو سکتا ہے کہ شیر خاں نے مغلوں کو باہر نکالنے کے ہوائی قلعے اس وقت سے بنانا شروع کر دیئے تھے۔ جب کہ مغل پانی پت اور کنواہہ کی عظیم الشان لڑائیوں میں کامیاب ہو چکے تھے اور مشرق کے باغی افغانوں کی سرکوبی کر چکے تھے!!

Marfat.com

اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ اس کہانی میں بازاری گپ ٹنک کی صداقت نہیں۔ یہ کہنا بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ یہ مبالغہ آمیز کہانی ۸۰ سالہ ضعیف شیخ محمد کے دماغ کی ایجاد ہے۔ جس پر اس کا بھتیجا عباس بروئے تعظیم و عقیدت ایمان لے آیا حقیقت یہ ہے کہ مورخ عباس کو تاریخی صداقت کی چنداں فکر نہ تھی۔ اس کا خاص مقصد تو اس واقعہ کی تشہیر تھا۔ اس کہانی کے ایک جز سے معلوم ہوتا ہے کہ عباس کو اپنے زمانہ کے مغل حکمرانوں کے طریقہ نظم و نسق سے ذاتی رنجش تھی۔ جس کا اظہار اس نے ان الفاظ میں کیا ہے اور ان الفاظ کو شیر شاہ کے نام سے منسوب کر دیا ہے۔

عباس کی اس کہانی کو کلیتہً رد کرنے کے لیے ہمارے پاس دیگر وجوہات بھی ہیں۔

(۱) شروع میں عباس سروانی کی تائید میں یہ ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس کے ۸۰ سالہ چچا شیخ محمد چندیری کے محاصرہ کے وقت ۱۵۲۸ء میں کم از کم ۲۸ سال کا رہا ہوگا اور علیٰ ہذا ان کو چندیری کے محاصرہ کی مکمل یاد ہوگی۔ علاوہ بریں یہ بھی ممکن ہے کہ چندیری کے محاصرہ میں شیخ محمد کی خان خاناں یوسف خیل (دلاور خاں) سے ملاقات ہوئی ہو کیوں کہ خان خاناں دولت خاں لودی[1] پانی پت کی جنگ اول کے پیشتر ہی مر چکا تھا۔ اور بابر نے اس کے لڑکے دلاور خاں کو اس کے والد کا ہی خطاب عطا کر دیا تھا۔ مگر شیخ محمد کی صداقت پر اعتماد کرنے کے لیے اتنا واقعہ کافی نہیں کیوں کہ عباس کے سب ہی راوی ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر خان اعظم مظفر خاں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس کے کہنے پر ہی عباس نے اس ڈولی والے قصہ کو رد کر دیا جو کہ شیر کے متعلق زبان زد تھا کہ کس طرح اس نے

---

[1] میں نے خان خاناں یوسف خیل کی شناخت میں جو بھول کی تھی اس کے لیے پروفیسر ہودی والا نے میری بجا تنقید کی ہے میں ان کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔ عباس کا منشا بیٹے سے تھا باپ سے نہیں۔ لیکن میں اپنے نقاد کے دیگر نتائج سے اتفاق نہیں کرتا۔ جو انہوں نے اس واقعہ کے متعلق قلمبند کیے ہیں۔
(دیکھیے اسٹڈیز صفحہ ۴۴۴ - ۴۴۸)۔

Marfat.com

روہتاس کے راجہ کو دھوکہ دیا۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ کیا ۱۵۲۸ء کے موسم سرما میں چندیری کے محاصرہ کے وقت شیخ محمد وہاں موجود تھا۔؟ اس وقت سروانی سردار بابر سے کشیدہ خاطر تھے اور ان کا سرغنہ فتح خاں سروانی آہستہ آہستہ مشرقی صوبوں میں افغان طاقت منظم کر رہا تھا۔ اور سکندر لودی کے لڑکے محمود کو جس سے چند روز بعد بابر کو لوہا لینا پڑا بہار میں لانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

(۲) اس وقت کی سیاسی فضا اور شیر شاہ کی سیرت کے چند روشن پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد شیخ محمد کی شہادت میں کوئی وزن نہیں رہتا۔

شیر خاں کی عمر اس وقت ۴۰ سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ وہ زمانہ کی سردی وگرمی دیکھ چکا تھا بلکہ سردی زیادہ اور گرمی کم۔ اس کی جہاں دیدہ آنکھوں نے یہ بھی بھانپ لیا تھا کہ اس نازک گھڑی میں ایک افغان کا کسی دوسرے افغان کو اپنا ہمراز بنانا کس قدر مشکل اور پر خطر ہے جبکہ دلاور خاں جیسا بیٹا اپنے باپ دولت خاں کے ساتھ غداری کر سکتا تھا اور اپنی مطلب برآری کے لیے ایک بھائی مغلوں سے مل کر دوسرے بھائی کا گلا کاٹ سکتا تھا۔ علاوہ بریں اس قسم کی لنترانی کہ مغلوں کو سرزمین ہند سے باہر نکال دے گا۔ شیر خاں کی کم سخن اور اعتدال پسند سیرت کے بھی خلاف تھی۔ یہ ہرگز ممکن نہیں کہ شیر نے اس قسم کی پر خطر بات خان خاناں دلاور خاں یوسف خیل جیسے چغل خور لوگوں سے کہی ہو۔ شیر خاں کے متعلق یہ تسلیم کرنا کہ وہ اس قسم کی حماقت کر سکتا ہے اس کے دماغی توازن کو مشکوک اور اسے فاتر العقل قرار دینا ہے۔ شیر شاہ اس قدر دخت رز کا دلدادہ تھا نہ مائل عیش و نشاط کہ اس نے شراب نوشی کے وقت عالم مستی میں اس قسم کی بے سر و پر کی باتیں کہہ دی ہوں۔ جیسا کہ جلال الدین خلجی کے دربار میں احمد چاپ کہا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر چندیری کے محاصرہ کے وقت دلاور خاں خان خاناں موجود ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ بابر اور ابو الفضل اس کا ذکر نہ کرتے۔

عباس کی اس کہانی میں کچھ وزن ہو سکتا تھا اگر یہ بات بابر کے لشکر سے منسوب نہ کی جاتی۔ بلکہ یہ لاف زنی کسی اور جگہ ہوئی ہوتی۔ یا شیر شاہ کمسن ہوتا اور اس کی پرواز تخیل ابن علی امیر (عرف المنظور) کی طرح بلند ہوتی۔ ابن علی امیر اسپین کے

امیہ خلیفہ حشام دوم کا وزیر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں اکثر و شب بیداری میں سوچا کرتا تھا کہ قرطبہ کا قاضی کسے مقرر کرے گا بہر حال اس بے سروسامانی وکس مپرسی کے عالم میں جب شیر شاہ خانہ بدوش تھا اور مغلوں کے رحم وکرم کا متلاشی۔ اس کی زبان سے یہ لنترانی ناموزوں معلوم ہوتی ہے اور عباس کے ذوق ادب کی کمی کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ ہاں۔ یہی الفاظ اگر شیر شاہ اس وقت کہتا جب وہ گوڑ فتح کر چکا تھا اور ہمایوں کے خلاف اپنے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتا تھا۔ تو یہ بات کچھ وزن دار ہو سکتی تھی۔

(۳۰) اس قسم کی بے ہودہ بکواس اور ہرزہ گوئی کوئی کم ظرف انسان تو کر سکتا ہے لیکن شیر شاہ جیسے مدبر اور سنجیدہ آدمی سے اس کی امید کرنا لایعنی ہے شیر شاہ آغاز جوانی سے ہی مردم شناس اور معاملہ شناس تھا۔ اور وہ مغلوں کے بارے میں اتنی غلط اور عاجلانہ رائے نہیں قائم کر سکتا تھا کہ مغل فوج میں ترتیب وتنظیم کی کمی ہے۔ خاص کر پانی پت اور کنواہہ کی عظیم الشان فتوحات کے بعد جب بابر کی فن سپہ آرائی کا زمانہ لوہا مان چکا تھا۔ اور اپنے وقت کا بہترین سپہ سالار سمجھا جانے لگا تھا۔ اس کے برعکس مغل لشکر میں رہ کر اگر شیر شاہ کو کوئی چیز متاثر کر سکتی تھی تو وہ مغل فوج کی بہتر تنظیم اور اعلیٰ اسلحات جنگ ہی تھے۔ اس نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ مغل فوج میدان جنگ میں غیر مغلوب ہے۔ اس کے توپ خانہ کی طاقت ہلاک و باہ کن ہے جبکہ اسے محاصرہ کے وقت یا دشمن کے رسالہ کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ بعد میں چل کر جب شیر شاہ نے اپنی فوج کی تنظیم کی تو اس نے مغلوں کے طریقہ جنگ کو اپنایا اور اسی طریقہ پر اپنی فوج کو مسلح اور منظم کیا۔ جہاں تک مغلوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کا سوال ہے میری رائے میں چوسہ کی لڑائی سے پہلے شیر شاہ کے کارنامے اور طرز عمل اس بات کو ثابت نہیں کرتے کہ ۱۵۳۹ء سے پہلے اس کے دماغ میں کوئی ایسا خیال آیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ شیر خاں کے مغلوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کے لیے کسی شخصی مفاد، خود غرضی یا حب الوطنی کے جذبہ کے تحت کوئی ارادی تحریک ظاہر نہیں ہوتی بلکہ جن وجوہات سے مغلوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا ان میں علاوہ دیگر وجوہات کے خود ہمایوں کی کمزوری

Marfat.com

اور کچھ سانحے بھی شامل ہیں۔

جن حضرات نے بابر کی محنت کش زندگی۔ اس کی بیدار مغزی اور تفصیلات پر گہری نظر رکھنے کی عادت کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ عباس کے چچا اور مخبر شیخ محمد نے دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ اس زمانہ کے افغانوں کی یہ عام بات تھی کہ وہ ضعیف الاعتقاد اور سادہ لوح عوام کو متاثر کرنے کے لیے قدیم افغان اولیا اور حکمرانوں کے متعلق اس قسم کے فرضی قصے گڑھ لیا کرتے تھے۔ شیخ محمد بھی اس کمزوری کا شکار تھا۔ نظام حکومت کی جن کمزوریوں کی جانب عباس نے اشارہ کیا ہے اغلب ہے ایسی کمزوریاں افیم خور اور کوڑھ مغز ہمایوں کے عہد حکومت میں پیدا ہو گئی ہوں۔ یا ابوالفضل کے آقا اکبر کے عہد میں پائی جاتی ہوں جن پر ارادۃً پردہ ڈالا گیا ہے لیکن پانی پت کی پہلی لڑائی اور چندیری کی فتح کے درمیان سیاسی حالات جس تیزی سے بدل رہے تھے ان کو مدنظر رکھتے ہوئے مغلوں میں اس وقت اس طرح کی بد نظمی ممکن نہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اکبر کے عہد حکومت میں خود عباس کا ستارہ گردش میں تھا۔[1] اس وقت

---

[1] عباس اپنے متعلق لکھتا ہے "اکبر کے عہد حکومت میں ۲۴ ویں الٰہی سال مطابق ۹۸۷ ہجری تک میں اپنے مورثوں کی جاگیر سے مستفید ہوتا رہا۔ تب اکبر نے حکم دیا کہ مجھے ۵۰۰ سواروں کا منصبدار بنا کر بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جائے۔ لیکن قاضی علی نے میرے اور میرے مورثوں کے متعلق اصل واقعات بیان نہیں کیے بلکہ ہماری مذمت اور عیب جوئی کی اور بیان کیا کہ شیخ عبدالنبی نے دو افغانوں کو دو ہزار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیگہ زمین دی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری مدد معاش ضبط کر لی گئی" (عباس صفحہ ۲۰۲۔ ۲۰۳ ایلیٹ جلد ۴، ۳۸۹۔ ۳۹۰)۔ یہ بھی عیاں ہے کہ عباس کے جذبات کو اس قدر ٹھیس لگی تھی کہ اس نے اپنے آبائی وطن لوٹنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ بعد میں اس نے کسی میر سید حامد کے یہاں ۳۰۰ روپیہ ماہانہ پر نوکری کر لی۔ جو حامد کی وفات کے بعد ختم ہو گئی اور اس کی بقیہ زندگی عسرت و مفلسی میں گذری۔ (عباس۔ ایلیٹ میں۔ صفحہ ۳۹۰۔)

Marfat.com

اس کو بادشاہ کی بے رغبی اور امرا کی بددیانتی کی کوئی شکایت ملی ہوگی ۔
عباس سروانی اور بدایونی نے وہی رنگین چشمہ لگا کر یہ واقعہ بیان کیا ہے ۔
کچھ مورخوں کا خیال ہے کہ بابر کے پڑاؤ سے شیر کے بھاگ جانے کا واقعہ صحیح نہیں ہے ۔ لیکن شیر کا دعوت میں ماہی چا کو خنجر سے کاٹنا ۔ بابر کا اس پر رائے زنی کرنا ۔ شیر کے متعلق اس کے دماغ میں شبہ پیدا ہونا جملہ واقعات صحیح ہو سکتے ہیں ۔ کیوں کہ یہ حرکت شیر خاں کے کردار کے مطابق تھی ۔ لیکن مندرجہ بالا کہانی میں بابر کا شیر خاں پر شک کرنا ایک فعل ہے اور شیر خاں کا پڑاؤ سے بھاگنا اس فعل کا نتیجہ عباس نے دونوں کو اس طرح پیش کیا ہے چنانچہ نتیجہ کی صداقت سے انکار کرنا اور فعل کو تسلیم کرنا اصول استدلال کے مطابق نہیں ۔ علاوہ بریں یہ بات بھی قابل یقین نہیں ہے کہ بابر نے شاہی دسترخوان پر شیر جیسے گمنام شخص کو مدعو کیا ہو ۔ بابر میں نسلی امتیاز کا احساس کوٹ کوٹ کر بھرا تھا وہ عام افغانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا ۔ ان کو کمتر اور غیر مہذب سمجھتا تھا ۔ بے ایمان اور غدار تصور کرتا تھا اور اس کے لیے ان کو سزا بھی دی تھی اس کی سوانح عمری میں کئی جگہ اس قسم کے دلچسپ واقعات کا ذکر ہے ۔

پھر بھی ماہی چا کی کہانی جملہ دستیاب واقعات کا جائزہ لینے پر غلط ثابت ہوتی ہے ۔ واقعات مندرجہ ذیل ہیں ۔

(۱) عباس کا بیان ہے کہ ماہی چا چینی کی طشتری میں دسترخوان پر لگایا گیا تھا ۔ اور شیر خاں قاعدہ خوردن ماہی چا سے بے بہرہ تھا ۔ اس نے اپنے خنجر (کرد) سے اس کو چھوٹے چھوٹے لقموں میں کاٹ لیا اور بڑے اطمینان سے ان لقموں کو لکڑی کے چمچہ میں رکھ کر کھا لیا ۔ (عباس صفحہ ۳۷) ۔

(۲) ابوالفضل اور عباس جو عموماً ہر معاملہ میں ایک دوسرے کے متضاد رائے رکھتے ہیں اس باب میں کچھ حد تک متفق ہیں ۔ ابوالفضل کا بیان ہے " ایک روز سلطان جنید برلاس نے موقع کا فائدہ اٹھا کر یہ سوچا کہ فرید اور دیگر افغان سرداروں کا تعارف جو اس کے دربار میں اس وقت موجود تھے جہاں پناہ گیتی ستانی فردوس مکانی بابر بادشاہ سے کرا دے ۔ جیوں ہی ظل الٰہی کی مردم

Marfat.com

شناس نگاہ فرید خاں پر پڑی۔ انہوں نے فرید کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "سلطان جنید برلاس دیکھو۔ اس افغان کی نگاہوں میں کتنا شر پوشیدہ ہے اسے حراست میں لینا چاہیے"۔ دوسرے دونوں افغانوں کے ساتھ بادشاہ لطف و مہربانی سے پیش آیا۔ قبل اس کے کہ جنید برلاس کے سپاہی اس کو گرفتار کر سکیں فرید بادشاہ گیتی ستانی کی نظروں سے خوف زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ (اکبر نامہ۔ بیورج۔ جلد دوم صفحہ ۳۲۸) یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ سلطان جنید برلاس اس وقت بابر کے خیمہ میں نہیں بلکہ جونپور میں موجود تھا۔

(۳) مخزن نے ابوالفضل کے بیان کے پہلے جز کو اور اس کہانی کے آخری جز کو ملا کر ایک نئی کہانی گھڑ دی ہے۔

"سلطان جنید برلاس بادشاہ کے حضور میں شیر خاں اور دیگر دو افغان سرداروں کو لایا۔ بادشاہ نے شیر خاں کو حراست میں لینے کا حکم صادر فرمایا۔ اسی درمیان دستر خوان بچھایا گیا اور شیر خاں کے سامنے طبق[1] ماہی چا پیش کیا گیا شیر خاں کچھ دیر تک اس کے کھانے کے طریقہ پر اظہار باد خور درا در خوردن عاجز یافتہ) پھر اس نے اپنا چھرا نکالا اور اس ماہی چا کو لقموں میں تراش لیا (ریزہ ریزہ ساختہ) اور لکڑی کے کف گیر میں رکھ کر کھانے لگا۔۔۔۔ بادشاہ

---

[1] طبق ماہی چا کے معنی چاند کی شکل کی ایک چھوٹی روٹی ہے مرحوم مورخ جناب بیورج نے مجھے ایک خط میں لکھا کہ اس لفظ کو ماہی چا کے بجائے ماہ چہ پڑھنا چاہیے کیوں کہ یہ کھانا مچھلی سے تیار نہیں کیا جاتا بلکہ گوشت سے بنایا جاتا ہے اور شاید اس کی شکل چاند کی گولائی سے مناسبت رکھنے کی وجہ سے اس کو ماہ چاہ کہتے ہیں۔ اس بحث آمیز خط میں انہوں نے میری کتاب "شیر شاہ" کے کچھ حصوں پر رائے زنی کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تھا کہ میں نے اپنی کتاب میں ماہی چا والے واقعہ کو نظر انداز کیوں کر دیا ہے۔ میں مرحوم کی یاد کا احترام کرتے ہوئے اس کتاب میں ان وجوہات کو پیش کر رہا ہوں۔

Marfat.com

نے میر خلیفہ سے کچھ باتیں تنہائی میں کیں۔ جس سے شیر خاں کو شک پیدا ہو گیا۔ اور اسی سبب وہ لشکر سے بھاگ کھڑا ہوا' (قلمی نسخہ صفحہ ۱۴۸)۔

(۴) احمد یادگار نے تاریخ سلاطین افغان میں جو جہاں گیر کے زمانہ میں لکھی گئی تھی عباس کی اس کہانی کو دوہرایا ہے۔ ڈارن نے کچھ ماہ بعد مصنفین کی نقل کرتے ہوئے اس کھانے کا نام ماہی چا کے بجائے عرابکیا لکھا ہے (ہسٹری آف افغان جلد دوم)

بہر حال جو کچھ بھی ہے ماہی چا ایسی غیر معمولی سخت غذا نہیں جس کے کھانے کے لیے کسی چھرے چاقو یا چھری کی ضرورت ہو۔ غیاث اللغات میں لفظ ماہی چا کے معنی ایک قسم کا میٹھا کھانا ہے۔ جو گیہوں کے باریک آٹے یا میدے کی سیوئیاں بنا کر دودھ اور شکر ملا کر پکایا جاتا ہے یہ کھانا آج بھی ہر ہندو مسلم گھرانہ میں خاص خاص موقعوں پر تیار کیا جاتا ہے۔ اور عام زبان میں اسے فرینی کہتے ہیں۔ اس کھانے کو کوئی بھی دیہاتی بہ آسانی چمچ سے کھا سکتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ شیر شاہ کو اس کے کھانے میں الجھن کیوں پیش آئی اور چھرا کیوں استعمال کرنا پڑا۔

عباس کے ایک پیڑھی بعد مورخوں کو یہ علم ہوا کہ افغانوں نے اپنی لاعلمی سے تل کا پہاڑ بنادیا تھا۔ پھر بھی اس کہانی نے ایسی شکل اختیار کر لی جو بظاہر قابل اعتماد معلوم ہوتی ہے۔ حاجی دبیر نے یہ سنا کہ شیر خاں نے ماہی چا اپنی انگلیوں سے کھایا تھا اور یہ واقعہ بابر کے سامنے کا نہ ہو کر ہمایوں کے وقت کا ہے[1]

---

[1] ہم پروفیسر ہودی والا کے بہت مشکور ہیں کہ انہوں نے اپنی رائے دیکر ماہی چا کے متعلق یہ بحث ختم کر دی کہ یہ کیسی غذا تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ حاجی دبیر کی اس غیر جانب دارانہ رائے سے یہ بات از خود ثابت ہو جاتی ہے کہ اس کہانی کا موجد عباس نہیں ہے جیسا کہ پروفیسر قانون گو کا خیال ہے (اسٹڈیز صفحہ ۴۸۴۔ ۴۸۹)۔ میں بھی پروفیسر ہودی والا کی اس رائے سے متفق ہوں کہ عباس نے ماہی چا کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ دوسروں سے سن کر لکھا ہے۔ پروفیسر ہودی والا نے واضح طور پر یہ تسلیم نہیں کیا کہ یہ کہانی تاریخی حقائق پر مبنی ہے۔ اس کے برعکس میں

Marfat.com

اب ہم ابوالفضل کی شہادت کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ہیں۔ قابل مصنف نے اس واقعہ کے متعلق تمام مصالحہ عباس سے لیا ہے اور فرید کو فاسق و بدکار ثابت کرنے کے لیے اس کہانی میں اپنے من پسند طریقہ سے رنگ آمیزی کر دی ہے ابوالفضل سے اس کہانی کے بیان کرنے میں جو فروگذاشت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے اس واقعہ کو بابر کے خیمہ میں میاں حسن کی وفات سے پہلے دکھایا ہے۔ اس کی اس رائے سے اس کا کوئی ہم عصر مورخ اتفاق نہیں کرتا۔ یہ محض ابوالفضل کے دماغ کی ایجاد ہے۔

پھر بھی یہ بات قابل غور ہے کہ ابوالفضل نے شیر خاں کو بابر کے دستر خوان پر کھانا کھاتے ہوئے نہیں دکھایا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابوالفضل میں واقعات سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت زیادہ ہے۔ بابر کا مغل دستر خوان پٹھانوں کے قالین کی طرح نہ تھا۔ جس پر خدمت گار سے لے کر افغان سردار بے تکلف برابر برابر بیٹھتے تھے۔ علاوہ بریں جب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ سلطان جنید برلاس نے (جس کے توسل سے شیر خاں کو بابر سے چندیری کے محاصرہ کے وقت تعارف ہونا بتایا جاتا ہے) بابر کے دوران حیات کبھی جونپور نہیں چھوڑا تو یہ ساری کہانی تاش کے پتوں کی مانند بکھر جاتی ہے[1] خود بابر کی

نے واضح طور پر اپنی رائے دی ہے کہ یہ کہانی از سرتا پا لغو ہے۔ خواہ اس کا موجد کوئی بھی ہو۔

[1] ۱۵۲۸ء کے آخری نصف میں جب بابر کے ایما سے شیر خاں کو اپنی جاگیر واپس ملی تو جنید برلاس کو جونپور کے عوض چنار دیدیا گیا۔ مفرور تارک الوطن سلطان جلال الدین شرقی کو جونپور اور کڑا کا علاقہ دیدیا گیا۔ کڑا میں بابر چند روز جلال الدین شرقی کا مہمان رہا اور مارچ ۱۵۲۹ء میں اس نے جلال الدین کے لڑکے محمود کو سلطان کا خطاب عطا کیا۔ جب وہ سلطان سکندر کے لڑکے محمود کے (جو تخت کا ایک باطل دعویدار تھا) حملہ سے بھاگ کر بنارس سے کڑا پہنچا۔ جون ۱۵۲۹ء ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں زماں مرزا کو جونپور میں مامور کیا گیا اور جنید برلاس

Marfat.com

زبان سے بیان کیا گیا ہے کہ ۱۵۲۸ء کی برسات کی مہم میں اس نے شیر خاں کے ساتھ نہایت پاسداری و رواداری کا سلوک کیا تھا۔ اگر چندیری کے محاصرہ کے وقت شیر خاں بابر کے لشکر سے بھاگ جاتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ۶ ماہ کی قلیل مدت میں وہ پھر بابر کا منظور نظر بن جاتا۔

تمام شکوک اور مشتبہ واقعات کو رد کرنے کے بعد اصلی واقعہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ شیر خاں بابر کے حضور میں سلطان جنید برلاس سے ایک تعارفی خط لے کر حاضر ہوا اور بادشاہ کے ساتھ ساتھ چندیری گیا۔ چندیری سے وہ بابر کے ساتھ جونپور گیا۔ جہاں بتن اور بایزید کے خلاف جنگ کی۔ جس کا کہ تزک میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس کے بعد اس نے (بابر) بنگال کے سلطان نصرت شاہ کے خلاف فوج کشی کی۔ ان تمام لڑائیوں میں شیر خاں نے بابر کی بڑی مدد کی۔ کیوں کہ اس کو اس علاقہ کے طبعی جغرافیہ کا علم تھا۔ اور ان وجوہات سے وہ بابر کی نظروں میں چڑھ گیا۔ اس کے بعد کے جملہ واقعات کہ کس طریقہ سے شیر خاں نے سہسرام و خواص پور ٹانڈہ کی جاگیر واپس پائی بابر کی سرگزشت میں قلم بند ہیں۔

مسز بیورج نے اشارہ کیا ہے کہ بابر کی تزک میں ۱۵ اپریل سے ۱۸ ستمبر ۱۵۲۸ء تک کے واقعات کا ایک خلا ہے ۹۳۵ھ ہجری یعنی ۱۵۲۹ء کی ڈائری لکھتے وقت بابر نے جگہ جگہ سال گذشتہ کا حوالہ دیا ہے اس سے یہ چھوٹی موٹی کڑی پوری ہو جاتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقفہ میں جب کہ بابر افغانوں کے خلاف جد و جہد کر رہا تھا۔ وہ جونپور (ف۔ ۳۶۵)۔ چوسہ (ف۔ ۳۶۵۔ ب) اور بکسر (ف۔ ۳۶۶۔ ۳۶۶۔ ب) میں موجود تھا (تزک مترجم کالوٹ۔ صفحہ ۶۰۳)۔
یہ بات بھی کہ ۱۵۲۸ء کے آخری حصہ کی بابر کی مہموں کی بدولت شیر خاں کو منجملہ

کے قبضہ میں چنار کے قلعہ کے علاوہ پورا سرکار چنار کا علاقہ دے دیا گیا۔ چنار کا قلعہ اس وقت تاج خاں سارنگ خانی کے قبضہ میں تھا۔ میمو برس ۶۵۲۔ ۶۸۴۔ نوٹ ۲)۔

Marfat.com

اپنے پرگنوں کے چند اور بھی پرگنے ملے اس ضمنی اشارہ سے بھی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ جس کا کہ ذکر تزک میں اس طرح ہے۔

"جب ہم اس علاقہ میں قیام پذیر تھے بار بار یہ خبر ملی کہ سلطان محمود لودی نے دس ہزار افغانوں کی ایک کثیر فوج اکٹھا کرلی ہے اور وہ فتح خاں سروانی کے ساتھ دریا کے راستہ چنار کی جانب کوچ کرچکا ہے اور شیر خاں سور بھی جس کو ہم نے سال گذشتہ میں کئی پرگنے بطور انعام عطا کیے تھے اور اس خطہ کی نگرانی کے لیے مقرر کیا تھا۔ ان سرکش افغانوں کے ساتھ ہے اور اس نے چند افغان سرداروں کے ساتھ گنگا کو پار کر لیا ہے (تزک۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲)

ظاہر ہے کہ اگر اپریل ۱۵۲۸ء میں سیاسی فضا بابر کے موافق نہ ہوتی تو وہ گنگا پار کر کے شاہ آباد کے علاقہ میں داخل ہونے کی قطعاً جرات نہ کرتا۔ اس علاقہ میں داخل ہونے کے معنی تھے بہار کے لوہانی سرداروں سے لوہا لینا۔ جنہوں نے ہنوز بابر کی اطاعت قبول نہیں کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ وقت تھا جب سلطان محمد لوہانی کا انتقال ہوچکا تھا۔ اور شیر خاں کی ترغیب سے بابر نے یہ مہم آسانی کی تھی کیوں کہ شیر خاں کا اس علاقہ میں اچھا اثر تھا اور مقامی جانکاری تھی ان دونوں باتوں سے بابر کو بڑی مدد ملی نتیجہ یہ ہوا کہ شیر خاں بڑے کروفر سے سہسرام واپس لوٹا۔ اب اس کی طاقت میں چار چاند لگ گئے۔ اور اس کی جاگیر میں تین گنا اضافہ ہوگیا۔

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ شیر خاں نے محمد خاں سوری کو چوند سے باہر نکال دیا۔ کیوں کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ ۱۵۲۸ء میں بابر نے اس علاقہ کو محمد خاں سوری کے حوالہ کردیا۔ شیر خاں ہمیشہ اپنے ترکش میں دو تیر رکھتا تھا۔ وہ سیاسی تلا بازی کا ماہر تھا۔ جب شیر خاں کو اس کی جاگیر واپس مل گئی تب بھی وہ سلطان جنید برلاس کو چنار سرکار کا گورنر ہونے کی حیثیت سے اپنا حاکم و آقا مانتا رہا۔ بابر کی تزک سے اس بات کی بخوبی

Marfat.com

وضاحت ہوتی ہے کہ ۱۵۲۹ء میں شیر خاں نے بابر کے خلاف افغانوں کا ساتھ بادل ناخواستہ ہی دیا تھا جب سلطان سکندر کے لڑکے محمود باطل دعویدار کا پہلا ہی حملہ ناکام رہا تو بہت سے افغان سرداروں نے خفیہ طور پر بابر کی اطاعت قبول کر لی۔ سوری سرداروں نے بھی ایسا ہی کیا۔ بابر اپنی تزک میں لکھتا ہے "اس روز ۲۱ مارچ ۱۵۲۹ء کو جلال خاں لوہانی ولد بہار خاں، فرید خاں ولد ناصر خاں لوہانی شیر خاں سور علاء الخاں سور وغیرہ افغان سرداروں سے اطاعت نامے موصول ہوئے (تزک۔ صفحہ ۶۳۹) اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک محمد خاں سور کا انتقال ہو چکا تھا اور علاء الخان اس کا وارث بن گیا تھا۔

اس طرح مغلوں کے ساتھ شیر خاں کے تعلقات کا پہلا دور ختم ہوتا ہے

Marfat.com

باب 5

شیر خاں بحیثیت نائب گورنر بہار

سنہ ۱۵۲۹ء لغایت سنہ ۱۵۳۳ء

بہار کی لوہانی سلطنت کا منتشر ہونا

سلطان محمد شاہ لوہانی عرف بہار خاں ولد دریا خاں نے بہار میں جس ریاست کی بنیاد ڈالی تھی اس پر وہ صرف دو سال ہی حکمراں رہا۔ جنگ پانی پت کے بعد اس نے رفتار واقعات سے علیحدگی اختیار کر لی تھی کیوں کہ جس افغان قوم پرستی کی لہر نے اس کو اوپر اٹھا کر لیڈر اور حکمراں بنا دیا تھا وہ جھاگ اور بلبلے کی طرح ختم ہو چکی تھی اور لودی دور کے قبائیلی جھگڑے از سر نو اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ فرمولی اور سروانی۔ لودی اور لوہانی نفسی نفسی میں گرفتار تھے۔ وہ مغلوں سے ڈٹ کر لوہا لیتے تھے مگر فرداً فرداً اور بغیر کسی منصوبہ کے۔ اسی لیے معرکہ آزادی میں حصہ لینے والوں کی فہرست میں سلطان محمد لودی کی بہ نسبت ببن لودی اور بایزید فرمولی کا نام صف اول میں آتا ہے۔ وہی قومی رہبر و رہنما تھے۔ اس دوران فتح خاں سروانی سلطان سکندر کے لڑکے محمود یا طل دعویدار کو بادشاہ بنانے کے منصوبے باندھ رہا تھا اور اس ارادہ کی تکمیل کے لیے وہ اول بہار پر قبضہ کرنا چاہتا تھا جہاں

Marfat.com

سے کچھ وقفہ کے بعد دہلی پر فوج کشی کی جا سکے۔ فتح خاں کوئی محب وطن نہ تھا۔ بلکہ چوٹی کا غدار و نمک حرام تھا۔ اس نے سب سے پہلے مغلوں سے سازباز کی تھی۔ اور بعد میں بلاوجہ ان سے کنارہ کش ہوگیا۔ شہزادہ ہمایوں جنوری ۱۹۲۷ء میں فتح خاں کو بابر کے پاس لایا تھا اور آگرہ میں بابر نے اس کو یہ امتیاز بخشا کہ اسے خاص طور سے چار باغ کی بزم مے نوشی میں مدعو کیا۔ علاوہ بریں اس کو ایک خلعت خاصہ معہ ایک دوپٹہ انعام دے کر سرفراز کیا۔ لیکن جب بابر نے اس کو اس کے والد کا خطاب "اعظم ہمایوں" نہ دے کر صرف خان جہاں کا خطاب عطا فرمایا تو فتح خاں نے اسے اپنی توہین سمجھا (تزک صفحہ ۵۳۰) چنانچہ جب بابر نے اسے اپنی جاگیر واپس لوٹنے کی اجازت دے دی تو اس کے لڑکے کو اس کی نیک چلنی کی ضمانت کے طور اپنے دربار میں رکھ لیا۔ کنواہہ کی لڑائی کے بعد فتح خاں سلطان سکندر کے لڑکے محمود کو شرقی صوبوں میں لے آیا اور اس نے ببن اور بایزید کو ترغیب دے کر محمود کی طرف کر لیا۔ لوہانیوں کو بہار سے نکالنے کے لیے جو منصوبہ بندی کی گئی اس میں بنگال کے سلطان نصرت شاہ کو شامل کرنا شاید فتح خاں کا ہی کام تھا۔

اوائل ۱۵۲۸ء میں سلطان محمد کا انتقال ہوگیا۔ لوہانی سرداروں نے اس کے نابالغ لڑکے جلال خاں کو سلطان جلال الدین کے نام سے تخت پر بٹھا دیا۔ اور اس کی والدہ دودو کو اس کا ولی بنایا۔ جب ۱۵۲۸ء میں بابر مشرقی صوبوں کی مہم سے واپس لوٹا اور شیر خاں کو اس کی جاگیر اور عہدہ واپس مل گیا اور وہ مغلوں کا معتمد و حامی سمجھا جانے لگا تب سلطان سکندر کا لڑکا محمود جو اب تک بہار کے شمال میں بنگال کی سلطنت میں کسی جگہ پناہ گزیں تھا باہر آیا اور اس نے دسمبر ۱۵۲۸ء میں بہار کے صدر مقام پر قبضہ کر لیا۔ ۹ر جنوری ۱۵۲۹ء کو بابر کو یہ خبر دھولپور پہنچی۔ بہار میں ایک لودی شہزادہ کی موجودگی نے اور خاص کر جب کہ اس کی حمایت میں افغانوں کی دس ہزار فوج تھی لوہانی سرداروں کو مرعوب کر دیا۔ لیکن ان کو یہ وعدہ کر کے مطمئن کر دیا گیا کہ جب جونپور محمود کا صدر مقام ہو جائے گا تب بہار کمسن جلال الدین کو واپس

Marfat.com

کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد محمود کے خسر اور وزیر فتح خاں سروانی نے شہر بہار میں محمود کے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا۔

جب فروری ۱۵۲۹ء میں محمود کی فوج نے مغرب میں چنار کی جانب کوچ کیا تو سلطان جلال الدین اور اس کی والدہ نے لوہانیوں کی کثیر تعداد کے ساتھ دریائے گنگا کو پار کیا اور پٹنہ کے بالمقابل حاجی پور میں پناہ لے لی۔ جو اسوقت بنگال کے سلطان نصرت شاہ کے سالے مخدوم عالم کے تحت میں تھا۔ جب بابر نے سلطان محمود لودی اور اس کے حمائیتوں کو کھدیڑ کر پوشیدہ جگہ میں پناہ لینے کو مجبور کر دیا تب وہ بہار کو اپنی سلطنت کا ایک جز سمجھنے لگا اور اس نے ۱۳ اپریل ۱۵۲۹ء کو محمد زماں مرزا کو یہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ صرف ایک کروڑ ۲۵ لاکھ کی زمین بطور خالصہ الگ کر لی۔ (تزک صفحہ ۶۶۲) اسی اثنا میں دودو نے بھی اپنے لڑکے جلال خاں کی سرپرستی اور تحفظ کے ایما سے بابر کو خطوط لکھے۔ بابر لکھتا ہے:

"۱۷ اپریل کو دودو اور اس کے لڑکے جلال خاں ولد بہار خاں کی جانب سے بذریعہ سفیر ایک خط موصول ہوا۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ بنگال کے سلطان نصرت شاہ نے انہیں نظر بند کر لیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی خبر دی کہ وہ میرے پاس آرہے ہیں بنگالیوں کی حراست سے نجات پانے کے لیے انہوں نے دو بدو کی لڑائی بھی لڑی۔ دریا کو پار کیا اور بہار پہنچ گئے ہیں۔ اب میرے پاس آنے کے لیے راستہ میں ہیں" (تزک صفحہ ۶۶۴)

۴ مئی ۱۵۲۹ء کو بابر نے ضلع بلیا میں مقام خرد پر جو دریائے گھاگھرہ (سریو) اور گنگا کے سنگم پر واقع ہے ایک غیر فیصلہ کن بحری اور بری فتح حاصل کی۔ نصرت شاہ سے صلح ہوگئی۔ اس کے بموجب گنڈک کا شمالی کنارہ اور بارہ کی پرانی سرحد میں یعنی کہ گنگا کا جنوبی کنارہ (قصبہ بہار سے شمال و مشرق میں ۲۲ میل) جو کہ لودی سلطنت کی سرحد تھی کوئی تغیر نہیں ہوا۔ بابر سے محض یہ پورا سا وعدہ کر دیا گیا کہ بنگال کی ریاست میں جنگجو مغرور افغانوں کو پناہ نہیں دی جائے گی لوہانی مغلوں کے اسامی بنکر بھی اپنی ریاست واپس لینے کے لیے اتنے ہی مضطرب تھے جتنا کہ بابر بہار کی الجھنوں سے نجات حاصل کرنے کا

Marfat.com

آرزومند تھا۔ لہٰذا محمد زماں مرزا کو جسے کہ بابر نے اولاً جنوبی بہار کا حاکم مامور کیا تھا (۱۳ اپریل ۱۵۲۹ء) اس کی بجائے جونپور کا علاقہ سپرد کر دیا گیا اور ۱۶ مئی کو لوہانیوں سے مصالحت ہو گئی۔

بابر مورخہ ۱۶ مئی لکھتا ہے "دریا خاں کا پوتا جلال خاں جس کے پاس شیخ جمالی گیا تھا معہ اپنے امراء و سرداروں کے آیا اور میری خدمت میں حاضر ہوا۔ یحییٰ خاں لوہانی بھی آیا۔ علاوہ بریں ۸،۷ ہزار لوہانی افغان اور بھی آئے۔ اس خیال سے کہ ان سب کی امیدوں پر پانی نہ پڑ جائے میں نے ۵۰ لاکھ کا علاقہ محمود خاں لوہانی کو عطا کیا اور ایک کروڑ کی زمین خالصہ کر لی۔ بہار کا بقیہ حصہ جلال خاں کو سونپ دیا گیا۔ اس نے ایک کروڑ سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ ملا غلام یساول کو اس خراج وصولی کے لیے بھیجا گیا۔[لہ] (تزک صفحہ ۶۷۶)

لوہانی سلطان جلال الدین اب مغل حکومت کا ایک باجگذار تھا۔ اور وہ مالی بار سے لدا ہوا تھا۔ وہ ابھی نابالغ تھا۔ اس کی والدہ دودو میں جو کہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد سے ریاست کا انتظام کر رہی تھی۔ اتنی صلاحیت نہ تھی کہ معاملات کا جو خیبرازہ محمود لودی (تخت کا باطل دعویدار)

لہ مسٹر بیورج نے لکھا ہے "پرانے لوہانی سرداروں کو بابر نے بہار کی جاگیر واپس کر دی اور انہیں اپنا باجگذار بنا لیا۔ جس یحییٰ خاں لوہانی کا ذکر یہاں کیا گیا ہے وہ انہیں سرداروں میں سے غالباً ایک ہو گا۔ اس کو مغالطہ سے دوسرا یحییٰ خاں لوہانی نہیں سمجھ لینا چاہیے جو بابر کے ساتھ ہندوستان کے تاجروں کے قافلہ کا سردار بن کر آیا تھا اور جس کو بابر نے ۵ جون ۱۵۲۸ء کو صوبہ لاہور میں پارسہ کے مال سے ۱۵ لاکھ روپیہ دیا تھا۔ لیکن جس محمود خاں لوہانی کو اس تاریخ میں بہار میں جاگیر دی گئی تھی وہ بہاری نہ ہو کر غازی پوری تھا۔ اس نے گھاگرہ کی لڑائی میں شرکت کی تھی۔ بہاری افغانوں کے درمیان ایک غازی پوری کو بسانا بھی بابر کی ایک حکمت عملی تھی۔

Marfat.com

کے غضب سے بھر گیا تھا وہ اس کو از سر نو تنظیم دے سکے۔ چنانچہ اس نے شیر خاں کو بلوا بھیجا۔ اس نے (شیر) اس کے متوفی خاندان (بہار خاں ولد دریا خاں لوہانی) کے زمانہ حیات میں عجیب و غریب انتظامی لیاقت کا ثبوت دیا تھا اسکے تین یا چار ماہ بعد ستمبر ۱۵۲۹ء میں اس کو نائب بھی بنا دیا۔ اس وقت شیر شاہ کی حیثیت ایک معمولی جاگیر دار کی نہ تھی۔ جس کے قبضہ میں محض دو پرگنہ ہوں بلکہ وہ مغل حکومت کا ایک معتبر حمایتی تھا۔ اس کے تحت میں براہ راست یا بالواسطہ شاہ آباد کا سالم ضلع تھا۔ سلطان جنید برلاس جس کو بابر نے چنار کا علاقہ سونپ دیا تھا۔ اس کا حاکم اعلیٰ تھا۔ شیر ادھورے طرز عمل کا حامی نہ تھا۔ لہٰذا بحیثیت نائب دودو کے اس کی پالیسی مرکزی نظام حکومت کی رہی ہوگی۔ یہ اصول خصلتاً جاگیر داری کے بالکل متضاد تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۳۰ء کے شروع میں دودو کا انتقال ہوگیا (اس کی وفات کی صحیح تاریخ مقرر نہیں کی جاسکتی) اس وجہ سے شیر کی حالت اور بھی نازک ہوگئی۔ کمسن جلال لوہانی کے ایک خاص گٹ کی سازش کا مرکز بن گیا۔ شیر کے سخت نظام حکومت کی وجہ سے یہ گٹ بیزار ہو رہا تھا۔ خاص کر ان کو دو باتیں بہت ہی ناگوار تھیں۔ ایک تو تھی بہار کے فوجی علاقہ داروں سے مال گذاری کی سختی سے وصول یابی اور دوسری تھی ایک کروڑ دام کا مغل خزانہ کو وقت معینہ پر بھیجنا۔

۱۵۳۰ء کے آخری ماہ یعنی ایک سال تک شیر شاہ کی گاڑی ٹھیک چلتی رہی۔ لیکن لوہانیوں کے سر پر ہر وقت موت کی دہشت چھائی رہتی تھی۔ انہیں ہمیشہ یہ خدشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں سلطان محمود لودی اور اس کے حمایتی جنرل ببن اور بایزید ان کو دوبارہ بہار سے نہ بھگا دیں جون ۱۵۲۹ء میں یہ لودی سردار بابر کی نگاہوں سے بچ کر صوبہ ضلع ہمیر پور میں چھپ گئے تھے۔ جب بابر ۱۵۳۰ء کے عنقریب آگرہ چھوڑ کر پنجاب کی بغاوت دبانے کے لیے لاہور کی جانب چلدیا تو شیر خاں اور لوہانیوں کو اب اس کی امداد کی توقع کم ہو

Marfat.com

گئی۔

مئی ۱۵۳۰ء کے قبل بابر آگرہ نہ واپس آسکا۔ لیکن اب اس کے جسم میں پہلے جیسی چستی اور بجلی جیسی تیزی باقی نہ تھی کہ دم زدن میں کوچ کر کے افغانوں کو پسپا کر دے۔ گذشتہ گناہوں سے شرمسار رہنے پر بھی اس کی عیاشی اتنی تیز رفتار تھی کہ اسکا آہنی جسم اس سے جھوجھنے کے ناقابل تھا۔ ۱۵۲۹ء کے بعد سے وہ شراب افیون اور معجون کا بے حد عادی ہو گیا۔ ساتھ ساتھ اس کا سن بھی آگے بڑھا۔ چنانچہ اس کی جسمانی حالت بالکل ہی خستہ ہو گئی۔ روز افزوں نفس پرستی اور دوسر کاسینی لونڈیوں کی صحبت نے اس کی صحت کو خاک میں ملا دیا۔ ان لونڈیوں کو ایران کے شاہ طہماسپ نے بطور دل کش تحفہ کے بھیجا تھا۔ بابر نے ان کے ساتھ نکاح کر لیا اور ان کے گلنار اغاچہ اور نارگل اغاچہ دل کش نام رکھے لیکن اس سے صورت حال میں کوئی رد و بدل نہیں ہوا (تزک صفحہ ۷۱۲)۔

ولی عہد ہمایوں کے غلط رویہ کی وجہ سے بابر کی پریشانیوں میں اضافہ ہی ہوا۔ اس کی غیر منظم سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ شہزادہ ہمایوں کو بابر نے اپریل ۱۵۲۶ء میں کابل اور بدخشاں کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس نے دہلی سے کابل جانے والے خزانہ کو راستہ میں ہی لوٹ لیا۔ (تزک صفحہ ۵۵۲) اس کے علاوہ اس نے اپنے والد کے سفیر کو ایک سال تک بدخشاں میں نظر بند رکھا۔ اس پر اس کے والد نے اس کو سخت تنبیہ آمیز خط لکھا۔ (وہی۔ ۵۲۱-۵۲۰)

لہ عباس لکھتا ہے "چوں دودو ہم فوت شد" یعنی تب دودو کا بھی انتقال ہو گیا (صفحہ ۷۶) اسی کے متعلق مخزن نے لکھا "در چند روز جلال خاں فوت شد" (صفحہ ۱۵) میں نے "شیر شاہ" میں مخزن کی نقل کرتے ہوئے لکھا تھا "چند روز بعد" (شیر شاہ صفحہ ۶۴) جو مخزن کی فارسی عبارت کا لفظی ترجمہ تھا جس سے دودو کی وفات کا صحیح تعین نہیں ہو پاتا۔ لہذا بعد میں میں نے عباس کی غیر واضح عبارت کو ہی پسند کیا۔

Marfat.com

پھر ہمایوں بدخشاں چھوڑ کر اگست ۱۵۲۹ء میں کابل آیا اور وہاں سے چل کر ۱۵۲۹ء کے موسم خزاں میں وہ آگرہ پہنچ گیا۔ (ذہبی صفحہ ۶۹۶) ۔جب اس طرح ہمایوں نے اپنی ذمہ داری سے منہ موڑ لیا تو بابر کی مشکلات اور بھی پیچیدہ ہو گئیں ۔ اس اثنا میں لاہور کے حاکم عبدالعزیز نے بابر کے فرمان کی حکم عدولی شروع کر دی اور وہاں کے امام نے بابر کے خلاف فتویٰ صادر کر دیا۔ کہ وہ اب اپنے فرائض کی انجام دہی میں قاصر ہے اور رعایا پر ظلم کرتا ہے۔ آگرہ کے قرب و جوار میں بھی صورت حال کچھ بہتر نہ تھی۔ گوالیار کے گورنر اور مہدی خواجہ کے بھائی رحیم داد خاں نے بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ بابر کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے باغی رحیم داد خاں اور بغاوت کی شہ دینے والے کالپی کے گورنر مہدی خواجہ جو ہمایوں کا سالا بھی تھا دونوں کو معاف کر دیا۔ ہمایوں کے آگرہ آنے سے بابر کو بالواسطہ یہ فائدہ ہوا کہ باغی افغان سردار بَبَن اور بایزید کو سر اٹھانے کی ہمت نہ رہی اور ۱۵۲۹ء کے آخری حصہ میں پھر ان کے متعلق کوئی تشویشناک خبر نہیں ملی۔

اکتوبر ۱۵۲۹ء میں[1] ہمایوں اپنی جاگیر سنبھل ضلع مراد آباد چلا گیا۔ اور بابر لاہور کی جانب روانہ ہو گیا۔ جنوری ۱۵۳۰ء کے قریب ہمایوں سخت بیمار ہو گیا اور اسے فروری میں علاج کے لیے آگرہ لانا پڑا۔ روایت ہے کہ ہمایوں کی زندگی کو بچانے کی آخری کوشش میں بابر نے ہمایوں کے بستر کا طواف کیا اور خداوند تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ ہمایوں کو شفایاب کر دے اور اس کے بالعوض اس کی جان لے لے ۔ اس کے فوراً بعد وہ بیمار پڑ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی ہمایوں نے بیماری سے اچھی طرح شفا بھی نہ پائی تھی کہ وہ بیمار بادشاہ کو چھوڑ کر کالنجر کی مہم پر روانہ ہو گیا۔ بابر کی حالت اس وقت اتنی

---

[1] ڈاکٹر بنرجی نے اپنی کتاب "ہمایوں بادشاہ" میں یہ تاریخ اگست ۱۵۲۹ء لکھی ہے۔ مسز بیورج نے لکھا ہے کہ ۲۶ اگست ۱۵۲۹ء کو ہمایوں آگرہ جانے کے لیے کابل پہنچا اور وہاں اس نے چند روز قیام کیا۔ میں اس باب میں مسز بیورج کی تاریخ کو ڈاکٹر بنرجی کی تاریخ کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتا ہوں

Marfat.com

نازک تھی کہ تمام مرزا اس کی موت کی گھڑیاں گن رہے تھے۔ ایسے وقت میں ہمایوں کا کالنجر کی مہم کے لیے روانہ ہونا محض ایک بائیس سالہ ناتجربہ کار جوان کا دماغی فتور نہیں کہا جا سکتا۔ جسے اپنے والد کی شدت علالت کا احساس نہ ہو۔ (بنرجی۔ ہمایوں بادشاہ جلد۔ا صفحہ ۱۴) دراصل ہمایوں کو خود علیل بادشاہ نے کترا مانک پور کے باغی افغانوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا تھا اور ان باغیوں کے تعاقب میں (جو مہوبہ ضلع ہمیر پور میں اپنا اڈا جمائے تھے) وہ کالنجر کے قلعہ تک جا پہنچا جو ابھی بابر کے قبضہ میں نہیں تھا۔ (باب پنجم کا ضمیمہ دیکھئے) مہوبہ ہی باغیوں کا صدر مقام تھا۔

باغی افغان سردار ببن اور بایزید نے اپنے گوریلا طریقہ جنگ سے بابر کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا۔ وہ اس وقت مہوبہ کے جنگلوں میں چھپ کر لڑائی کی تیاریاں کر رہے تھے جب ۱۵۳۰ء کے موسم بہار میں شہزادہ ہمایوں اور اس کے بعد بادشاہ بابر کی علالت کی خبر ملی تب باغی افغان سرداروں کو کھوئے ہوئے مشرقی صوبوں کو واپس لینے کا سنہری موقع ہاتھ آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم میں ہمایوں نے ببن اور بایزید کو مہوبہ کے جنگلوں سے کالنجر کی جانب بھگا دیا۔ لیکن باغی افغان ہمیشہ کی طرح مغلوں کی نگاہوں سے بچ کر ادھر ادھر سارن پہنچ گئے۔ یہاں مغلوں کا بااثر قبضہ نہ تھا۔ ہمایوں نے سن رکھا تھا کہ کالنجر کے قلعہ میں بے انتہا دولت ہے۔ اس مہم کے دوران وہ کالنجر کے قلعہ کے اس قدر نزدیک پہنچ گیا تھا کہ اب وہ اس قلعہ کو فتح کرنے کا لالچ نہ چھوڑ سکا ایک ماہ کے قریب ہمایوں نے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ اور راجہ کو اطاعت قبول کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ صلح نامہ کی شرائط کے مطابق راجہ نے ۱۲ من سونا بطور ہرجانہ کے ہمایوں کو دیا اور یہ طے پایا کہ قلعہ مذکورہ پر راجہ کا ہی تصرف رہے گا۔

اس اثنا میں بابر کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ ہمایوں جب آگرہ لوٹا تو میر خلیفہ کی سازشوں سے خائف ہو کر اپنی جاگیر سنبھل چلا گیا اور وہیں دسمبر ۱۵۳۰ء کے آخری ہفتہ تک مقیم رہا۔ بابر کی بیماری کے دوران ہی مشرقی علاقہ میں حکومت

Marfat.com

کی عظمت کم ہونے لگی۔ جونپور کا گورنر محمد زماں مرزا جونپور میں ایک قلیل فوج کو چھوڑ کر وہاں سے چلدیا۔ سلطان جنید برلاس کا بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ بابر اس سے ناراض ہو گیا تھا۔ بابر نے جون ۱۵۲۹ء میں (تزک ۶۸۲) اس کو جونپور کے عوض چنار اور کئی پرگنے دیے تھے۔ جب تاج خاں سارنگ خانی کے پاس اس کے تبادلہ کا شاہی فرمان پہنچا تو اس کی تعمیل کرنے کے بجائے اس نے محض "اطلاع پائی" لکھنا ہی کافی سمجھا۔ بابر کے پاس نہ تو اتنا وقت ہی تھا۔ اور نہ اتنے وسیع ذرائع کہ وہ چنار جیسے قلعہ پر بزور شمشیر قبضہ کر سکے۔ یہی وقت تھا جب شیر خاں کی قسمت بیدار ہوئی اور ایک ہی وار میں اس کو چنار کا قلعہ بھی مل گیا اور تاج خاں کی بیوی لاڈ ملکہ بھی۔ شاید شیر کو یہ نایاب موقع اس وقت ملا جب ۱۵۳۰ء میں بابر پنجاب کی جانب چلا گیا اور اس کی عدم موجودگی میں ادھر ابتری پھیل گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہر افغان سردار نے قسمت کی بازی لگا رکھی تھی۔ شیر خاں بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔

چنار کے قلعہ پر شیر کا قبضہ

جنوری، فروری ۱۵۳۰ء

قرون وسطیٰ کی تاریخوں میں کہیں یہ ذکر نہیں ہے کہ شیر خاں نے چنار کے قلعہ پر کب قبضہ کیا۔ عباس سروانی نے قلعہ کے پر امن تبدل کی کیفیت مشرح لیکن کچھ حد تک غلط دی ہے۔ شیر خاں کو چنار کا قلعہ لاڈ ملکہ سے ملا۔ یہ اس قلعہ کے محافظ (کمانڈنٹ) تاج خاں سارنگ خانی کی لاولد بیوہ تھی۔ سلطان سکندر کے عہد سے مشرقی علاقہ میں چنار ایک ایسا مستحکم قلعہ تھا جس کو کوئی بھی فتح نہ کر سکا تھا۔ ۱۵۲۶ء کے بعد اصولاً یہ قلعہ مغل بادشاہ کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔ کیوں کہ تاج خاں سارنگ خانی نے مغلوں کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ لیکن وہ قلعہ سے دست برداری نہیں ہوا تھا۔ بابر کی اس پر برابر نگاہ تھی۔ مگر وہ اس قلعہ کو سلطان جنید برلاس کے تصرف میں لانے میں ناکامیاب

Marfat.com

رہا۔ جنید کو اس نے قلعہ کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ عباس سروانی نے شیر خاں کے چنار پر قبضہ کا حال یوں بیان کیا ہے۔

"تاج خاں اپنی بیوی لاڈ ملکہ کی محبت کا غلام تھا۔ لاڈ ملکہ فہم و دانش کا ایک پتلا تھی۔ تاج خاں نے اپنے تینوں ترکمان بھائیوں کو (میر احمد۔ میر داد۔ میر اسحاق) اپنا نائب بنا رکھا تھا ان سرداروں نے لاڈ ملکہ کا ساتھ دینے کے عہد و پیماں کیے تھے۔ لاڈ ملکہ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ لیکن تاج خاں کی دوسری بیوی سے کئی لڑکے تھے۔ وہ اپنے لڑکوں کی گذر بسر کے لیے کافی روپیہ نہیں دیتا تھا۔ اور لاڈ ملکہ کے خوف سے یہ لڑکے آرام سے روٹی بھی نہ کھا سکتے تھے ان لڑکوں نے کئی بار اپنے والد سے اس امر کی شکایت بھی کی لیکن تاج خاں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک شب تاج خاں کے سب سے بڑے لڑکے نے لاڈ ملکہ پر تلوار سے حملہ کیا جب محلوں کا شور تاج خاں کے کانوں تک پہنچا تو وہ اپنے لڑکے کو مارنے کے لیے تلوار لے کر دوڑا۔ بچاؤ کا کوئی راستہ نہ دیکھ کر لڑکے نے اپنے باپ کو قتل کر دیا۔ تاج خاں کے لڑکوں کے تعلقات فوج سے اچھے نہ تھے۔ فوج کی کثیر تعداد لاڈ ملکہ کی حمایت میں تھی۔ چند بد طینت لوگ تاج خاں کے لڑکوں کے ساتھ ہو گئے[1] کیوں کہ یہ خزانہ کے لیے لڑا کرتے تھے۔ شیر خاں نے جو اس وقت چنار کے قریب ہی تھا۔ ترکمان بھائیوں سے پوشیدہ طریقہ سے مصالحت کی بات چیت شروع کر دی۔ تینوں بھائی اس بات پر متفق الرائے تھے کہ چوں کہ لاڈ ملکہ ایک عورت ہے وہ چنار کے قلعہ کی زیادہ عرصہ تک حفاظت نہیں کر سکتی اس لیے قلعہ کو شیر کے سپرد کر دینا ہی سود مند ہو گا۔ اور شیر خاں اس طرح ان کا ممنون ہو جائے گا۔ انہوں نے لاڈ ملکہ کو یہ بھی سمجھایا کہ اگر وہ شیر خاں سے شادی کرے تو ہر حالت میں یہ تجویز

---

[1] ایلیٹ کا یہ بیان کہ یہ لوگ آپس میں لڑا کرتے تھے ٹھیک نہیں ہے یہ بات کہانی کے قالب کے لیے موزوں نہیں معلوم ہوتی۔ اگر کوئی جھگڑا ہو سکتا تھا تو خزانہ کی وجہ سے لاڈ ملکہ سے ہی ہوا ہو گا۔

Marfat.com

ہر دو فریق کے لیے مفید ہو گی۔ لاڈ ملکہ اس تجویز سے متفق ہو گئی اس نے فوراً میر داد کو شیر کے پاس بھیجدیا تاکہ قبل اس کے کہ تاج خاں کے لڑکوں کو ان کے اس کے ارادہ کا علم ہو شیر خاں آکر قلعہ پر قبضہ کرلے" (عباس صفحہ ۱۰۸-۱۰۷ ایلیٹ جلد ۴- ۳۴۴ تا ۳۴۶)۔

قبل اس کے کہ ہم اس دلچسپ شادی کی حقیقت پر غور کریں ہم کو یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ عباس کی اس مروجہ کہانی میں کتنی صداقت ہے جس پر اعتماد کرکے نظام الدین۔ فرشتہ۔ مصنف مخزن نے اپنی تصانیف میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

جہاں تک اس کہانی کے پہلے جز کا سوال ہے یعنی تاج خاں کا اپنی بیوی کی محبت میں دیوانہ ہونا اور اپنے بڑے لڑکے کے ہاتھوں قتل ہونا۔ یہ قابل اعتبار نہیں۔ بابر نے خود اپنی تزک میں (صفحہ ۶۵۰) لکھا ہے کہ ۲۱ مارچ ۱۵۲۹ء کو بمقام نان پور۔ تاج خاں سارنگ خانی معہ اپنے دو کم عمر لڑکوں کے دربار میں حاضر ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تاج خاں نے اپنی بیوی کی مرضی کے خلاف اتنی جرات کیسے کی کہ وہ اپنے دو کم سن لڑکوں کو جن کو بقول عباس پیٹ بھر کھانا بھی گھر پر نہیں ملتا تھا بابر کے دربار میں لائے۔ یہ بات بھی قرین قیاس نہیں ہو سکتی کہ ایک سال کے اندر وہ نابالغ لڑکا اس قدر شہدا اور بدمعاش ہو گیا ہو گا کہ اس نے تلوار کی ایک ہی ضرب سے اپنے والد کو ہلاک کر دیا۔ کہانی کا بقیہ حصہ ہم کو کچھ متضاد نتائج کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ایک طرف تاج خاں کے لڑکوں کو نکما اور نا اہل کہنا اور دوسری طرف ترکمان بھائیوں کے دل میں جو ملکہ کو شادی کے لیے پھسلا رہے تھے ان کی طرف سے خوف و تشدد کا غلبہ ہونا۔ اور بوڑھی دلہن لاڈ ملکہ کا انتشار جو ان الفاظ سے ظاہر ہے "مبادا تاج خاں کے لڑکوں کو ان کے اس ارادہ کا پتہ چل جائے"۔ یہ جملہ باتیں ایک دوسرے کے متضاد و برعکس ہیں۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کوئی زبردست طاقت اپنے قلعہ کو دوسرے کے ہاتھوں میں نہیں سونپتی۔ یہ پوری کہانی عباس نے اتنی بد شعوری سے قلم بند کی ہے کہ تاریخی واقعہ کے بجائے یہ ایک ناول کا جز

Marfat.com

معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کا منشا محض یہ ثابت کرنا ہے کہ شیر خاں نے چنار کا قلعہ اس کی اصل مالکہ "لاڈ ملکہ" سے جائز طریقہ سے حاصل کیا ہے یہ بات واضح ہے کہ لاڈ ملکہ تاج خاں کی سب سے بڑی بیگم تھی اور لاولد تھی۔ تاج خاں حسن خاں کی طرح بیمار محبت نہ تھا۔ غالباً تاج خاں کی موت از خود ہوئی۔ اور اس کے بعد لاڈ ملکہ کے اثر و اقتدار میں کمی آ گئی۔ تینوں ترکمان بھائی بلا کے تیز طبع اور کرائے کے ٹٹو تھے۔ مغلوں کی طاقت دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی اور ان میں اتنا دم خم نہ تھا کہ وہ چنار کے معاملات میں دخل اندازی کریں۔ شیر خاں کی بھی آنکھ چنار پر لگی ہوئی تھی۔ غالباً اس موقع کا فائدہ اٹھا کر اس نے ترکمان بھائیوں سے سازش شروع کی۔ علاوہ بریں تاج خاں کے لڑکے ہنوز نابالغ تھے اور یہ ممکن نہ تھا کہ بابران میں سے کسی کو بحق وراثت چنار سونپ دیتا۔ چنانچہ چنار اندرونی و باہری سازش و سرکشی کا مرکز بن گیا۔ لاڈ ملکہ کا شیر سے رشتہ ازدواجی جملہ فریقوں کے لیے سودمند تھا۔ اس شادی سے لاڈ ملکہ کی عظمت و غلبہ تاج خاں کی دوسری بیویوں پر بدستور قائم رہے گا۔ تاج خاں کے لڑکوں کو اپنی نابالغی کے دوران ایک اچھا سرپرست و محافظ مل جائے گا۔ اور ترکمان بھائیوں کا مرتبہ بالا تر اور بلند ہو گا شیر خاں ان کا ممنون و مشکور رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ شیر خاں کا میر احمد کے پاس پیغام بھیجنا اور تمام خط و کتابت کو پردۂ راز میں رکھنا یہ شک پیدا کرتا ہے کہ لاڈ ملکہ اپنے فریق مخالف کے مقابلہ کمزور تھی، ترکمان بھائی خود غرض، چالاک اور غدار تھے۔ انہوں نے شیر خاں سے ایک کثیر رقم بطور رشوت لے کر اس سے خفیہ ساز باز کر لی تھی اور لاڈ ملکہ کے ساتھ اس کے سنہرے مستقبل کی دلآویز تصویر پیش کی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اسے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر لاڈ ملکہ ان کی تجویز سے اتفاق نہیں کرے گی۔ تو اسے مسلسل خطرات کا سامنا ہو گا۔ اور اس طرح انہوں نے شیر خاں کو قلعہ میں داخل کر لیا۔

اب کہانی کے بقیہ حصہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے شیر کی عمر اس وقت ۴۴ سال تھی۔ دوسری طرف لاڈ ملکہ شیر کی والدہ سے عمر میں کچھ ہی کم ہو گی۔ کیونکہ لاڈ ملکہ تاج خاں کی سب سے بڑی بیوی تھی۔ اور تاج خاں میاں حسن کے ہم عمر

Marfat.com

تھے۔ دونوں سلطان سکندر کے عہد کے سرمایہ تھے۔ اسلام میں اس قسم کے نکاح کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ ایک ضعیفہ کسی بھی خوردسال لڑکے سے شادی کر سکتی ہے اور ایک کھونسٹ ضعیف قریب المرگ انسان ایک کم سن دوشیزہ سے بھی شادی کر سکتا ہے حالاں کہ قانوناً ہر دو فریق کی باہمی رضامندی ضروری ہے۔ شیر خاں عالم تھا۔ اس نے ایسے ازدواجی رشتہ کو نہایت ہی اعلیٰ شگفتہ (ثواب) سمجھا ہوگا۔ اس کے سامنے رسول اللہ کی پہلی شادی کی نظیر موجود تھی۔ اسلامی حکومت میں ہندوستان میں یہ عام رواج ہو چلا تھا کہ متمول عورتیں اپنی ضعیفی کے دنوں میں ایسے کم سن اور بے سروسامان لڑکوں سے شادیاں کر لیتی تھیں جو ان کے پوتے کی عمر کے برابر ہوتے تھے۔ یہ سماجی فتور اتنی رسوائی کی حد تک پہنچ گیا تھا کہ اکبر کو ضعیف عورتوں کی ایسی شادیاں روکنے کے لیے ایک قانون پاس کرنا پڑا۔ پھر بھی سن رسیدہ علیل بوڑھے جوان لڑکیوں سے شادی کر سکتے تھے۔

لاڈ ملکہ اس وقت نہایت مضطرب تھی۔ اس نے میرداد کو کہلا بھیجا کہ وہ شیر خاں کو فوراً بلا تامل چنار لائے۔ شیر خاں کی آمد کے روز ہی رسم نکاح ادا ہوگئی۔ عباس اس متعلق خاموش ہے کہ بصورت طلاق شیر خاں نے اپنی متمول دلہن کے لیے کتنی رقم دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ لاڈ ملکہ نے اپنے نئے شوہر کو بطور پیش کش ۱۵۰ عدد نایاب جواہر، من موتی اور ۱۵۰ من سونا دیا[1]۔ اس طرح شیر خاں نے جنگ کے لیے کافی سرمایہ فراہم کر لیا۔ خاص کر ایسے وقت میں جب کہ سلطنت مغلیہ میں تسلط ایک دور کی ندا تھی۔ تنہا چنار کا قلعہ ہی ایسا نادر و نایاب تحفہ تھا جس کے سامنے تمام ہیرے جواہرات

---

[1] عباس صفحہ ۱۰۷، ۱۰۸۔ مخزن نے لکھا ہے کہ ۱۵۰ من سونے کی قیمت ۳۰ لاکھ روپیہ تھی (صفحہ ۱۹) اگر ہم بابر کے زمانہ میں رائج وزن سے اندازہ لگائیں تو ایک سیر برابر ۳۴ تولہ اور ایک من ۴۰ سیر کے برابر ہوگا۔ ایک تولہ سونا کی قیمت ۱۰ روپیہ آتی ہے۔ موتیوں کا وزن من میں نہ ہوکر رتی میں ہوتا ہوگا۔

Marfat.com

وسونا ہیج تھے جو اس کو لاڈ ملکہ سے ملے تھے۔ شیر خاں نے چنار پرگنہ کو فوراً اپنے تصرف میں کر لیا اور اس علاقہ میں اپنی طاقت بڑھالی۔

۱۵۳۰ء شیر خاں کے لیے ایک دوسری شادی نیک فال سال ثابت ہوا۔ اوائل ۱۵۲۹ء میں غازی پور کے ناصر خاں لوہانی کا انتقال ہو گیا یہ سلطان ابراہیم لودی کے زمانے میں باغی تھا۔ لیکن اس کی وفات کے بعد قوم پرست بن گیا تھا۔ اور آخر وقت تک بابر اس کو زیر کرنے میں ناکام رہا۔ مرتے وقت اس نے ایک کثیر دولت اپنی منظور نظر ہندوستانی بیوی کے پاس چھوڑی۔ اس بیگم کا نام گوہر گوسائیں تھا۔ نام کا آخری لفظ اس کے ہندو ہونے کی دلالت کرتا ہے۔ (یہ لفظ سنسکرت زبان کے لفظ "سوائی" کا بگڑا ہوا ہے۔)

ناصر خاں سلطان سکندر اور ابراہیم کا ہم عصر تھا۔ اس کی عمر بوقت انتقال تقریباً ۸۰ سال ہو گی۔ گوہر گوسائیں اس کی آخری بیوی تھی اور لاولد تھی۔ ناصر خاں کی وفات کے بعد اس کے لڑکے فرید خاں نے جو اس کی دوسری بیوی کے بطن سے تھا بابر کی اطاعت قبول کر لی اور بابر نے اس کے بالعوض اس کے والد کی جاگیر کا ایک حصہ اس کو دیدیا۔ اب گوہر گوسائیں کا رتبہ اور دولت اپنے سوتیلے لڑکے کے ماتحت جس نے مغلوں کی اطاعت قبول کر لی تھی محفوظ نہ تھی۔ وہ ایک محافظ اور سرپرست کی تلاش میں تھی۔ چونکہ شیر خاں کسی زمانہ میں ناصر خاں کی خدمت میں رہ چکا تھا اس لیے اس کی اس سے پیشتر سے ہی شناسائی تھی۔ چنانچہ گوہر گوسائیں نے چنار کے نئے مالک کے سامنے نکاح کی تجویز پیش کی۔ یہ شادی شیر خاں کے لیے غیبی امداد سے کم نہ تھی گوہر اپنے ساتھ ۳۰۰ من سونا لے کر آئی [1] (مخزن صفحہ ۱۹)

---

[1] جب میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں تھا تو میں نے "من" کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے اس معرکتہ الآراء مسئلہ پر ایک عالم فاضل بزرگ یونانی حکیم حبیب الرحمٰن خاں صاحب سے تبادلہ خیالات کیا۔ یہ ایک پٹھان تھے اور پٹھانوں کی تواریخ میں بہت دلچسپی رکھتے تھے ان کی یہ رائے تھی کہ من کا ترجمہ ۴۰ سیر کا من اور ۸۰ تولہ کا سیر قطعاً غلط ہے سنسکرت

Marfat.com

۱۵۳۰ء کا آخر ہوتے ہوتے شیر خاں کا ستارہ عروج پر پہونچ گیا۔ اب اس کا شمار ممتاز ترین صاحب دولت و فراست ایسے قوی افغانوں میں ہونے لگا تھا جنہوں نے مغلوں کی اعلانیہ مخالفت میں کوئی پیش قدمی نہیں کی تھی۔ لیکن اس کی یہ حالت چند ہی روز میں بدلنے لگی ۲۶ ستمبر ۱۵۳۰ء میں بابر اس دار فانی سے کوچ کر گیا اور اس کے انتقال کے فوراً ہی بعد شیر چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پسنے لگا۔ ایک طرف سلطان محمد لودی اور دوسری جانب بادشاہ ہمایوں اس کے دشمن بن گئے۔

جنگ دورا ہا (ستمبر ۱۵۳۱ء)

اگرچہ کچھ مورخین نے بابر کی عظمت کی وضاحت یہ کہہ کر کی ہے کہ وہ ۱۶ ویں صدی کا بانی سلطنت تھا مگر مغل تعداد میں کم تھے افغان زیادہ۔ اس کے علاوہ افغان ضدی اور سرکش تھے۔ ہندو یا تو سیاسی پہلو سے بے نیاز تھے یا افغانوں کے طرف دار۔ اور ملک ہندوستان اتنا وسیع تھا کہ پانی پت کی لڑائی کے بعد بابر جیسے ایک اجنبی حملہ آور کے لیے یہاں مغلیہ سلطنت کی بنیاد ڈالنا ممکن نہ تھا۔ اگر بابر دہلی کے بجائے گوڑ میں ہوتا اور بابر کے ہم عصر افغان بنگالیوں[1] کی مانند قانون پسند اور بے حس ہوتے تو شاید بابر کو ہندوستان

لفظ من کی طرح من صرف ایک وزن تھا اور فارسی کا من اشیا کے اوصاف کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ عام طور پر ایک من ۴۰ سیر کے برابر ہوتا ہے اور ایک سیر ۳۰ تولہ کا ہوتا ہے۔ یہی اوزان یونانی طبیبوں میں رائج ہیں۔ بہر حال من کو موجودہ من سے مخلوط نہ کرنا چاہیے۔ کہیں کہیں میں نے غلطی کی ہے۔

[1] بابر نے اپنی تزک میں بنگالیوں کے متعلق لکھا ہے "بنگال میں ایک عجیب و غریب رواج یہ ہے کہ وہاں خاندانی وراثت کا اصول ناپید ہے۔ سیاسی عہدہ ہی مستقل

Marfat.com

میں اپنے خاندان کو مستحکم کرنے اور سلطنت قائم کرنے میں چنداں دقت پیش نہ آتی۔ لیکن بدقسمتی سے صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بابر نے کسی سلطنت کی بنیاد نہیں ڈالی۔ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ بابر کو ہندوستان میں رہنے کا کل ۴ سال کا قلیل عرصہ ملا۔ اس لیے وہ اپنی فتوحات کو کچھ ترتیب نہ دے سکا۔ لیکن بابر کے بظاہر کردار و سیاسی فہم و فراست کو دیکھ کر یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ کیا وہ ایک سلطنت کا نظام بنا سکتا تھا خواہ اس کو ۳۰ سال کا موقع ہی کیوں نہ ملتا۔؟ بابر کی تزک اس بات کی شاہد ہے کہ اس میں ریاست کو تباہ کرنے کی تو خاصیت تھی مگر وہ صلاحیت نہ تھی کہ جس کے ذریعہ ایک نئے اور مستحکم نظام کی ترتیب دی جا سکے۔ یا پرانے کھنڈروں سے نئی عمارت تعمیر کی جا سکے۔ اور خاص کر اس جگہ جہاں جنگ

ہے اور امیر۔ وزیر۔ منصب دار وغیرہ بھی مستقل ہوتے ہیں۔ بنگالی ان عہدوں کی ہی قدر کرتے ہیں۔ ہر عہدہ دار کے ماتحت وفادار اور فرماں بردار نوکروں کا ایک عملہ ہوتا ہے اگر بادشاہ کی یہ مرضی ہوتی کہ کسی عہدہ سے کسی شخص کو معزول کرنا ہے اور اس کی جگہ دوسرا افسر مقرر کرنا ہے تو اس کے ماتحت کام کرنے والے جملہ ملازمین اسی کے ہو جاتے ہیں۔ سیاسی عہدہ کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ اگر کوئی فرد بادشاہ کا قتل کرڈالے تو وہ خود بادشاہ ہو جاتا ہے اور تخت نشین ہو جاتا ہے۔ جملہ وزیر۔ امیر۔ سپاہی۔ کاشت کار فوراً ہی اس کی اطاعت قبول کر لیتے ہیں اور اس کو ایسا ہی جائز حکمراں تسلیم کر لیتے ہیں جیسا کہ سابق حکمرانوں کو سمجھتے تھے۔ اور اس کی فرماں برداری کرنے لگتے ہیں۔ یہ مقولہ مشہور ہے۔ "ہم تاج کے وفادار ہیں جو کوئی تاج پہن لیتا ہے وہی ہمارا بادشاہ ہے"۔ بنگالیوں کے کردار کی یہ عجیب اور تعجب انگیز خصوصیت جنگ پلاسی تک اپنی اصل صورت میں موجود رہی۔ وہاں کے ایک مقامی شاعر کا کہنا ہے کہ بادشاہ آئیں یا جائیں۔ ان کے آنے جانے سے رعایا کے دل میں کوئی مسرت یا غم کی جھلک نہیں پیدا ہوتی۔

Marfat.com

جدل نے تباہی و بربادی کر دی ہو۔ بابر کی اصلی سیرت تو اس وقت سامنے آتی ہے جب کہ وہ اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ اس کے نام کے ساتھ قلندر[1] اور شاہ دونوں ہی نام وابستہ رہیں اور اسی طرح اس کی یاد قائم رہے۔ کیا بابر جیسا بے نیاز و فضول خرچ قلندر ربانی سلطنت ہو سکتا تھا۔ اور ایسا قلندر جس کو آنیوالے دن کا ذرا بھی خیال نہ ہو۔ جو بہتات کے وقت عرب داستانی حاتم طائی کی طرح سخاوت کرتا ہو۔ جس نے آگرہ و الور کا پورا خزانہ ہمایوں کو بخش دیا۔ جس نے امیروں کو لاکھوں سے مالا مال کیا۔ اور کابل اور اس کے گرد و نواح کے ہر فرد و بشر کو چاہے وہ آزاد ہو یا زر خرید غلام ایک ایک اشرفی عطا کی یا جو وقت ضرورت قرض یا جبریہ امداد حاصل کرنے سے ذرا بھی دریغ نہ کرتا ہو[2] یا جس کی مہموں کا صرف یہ ہی منشا ہو کہ ان کی بدولت کتنا سرمایہ فوجی اخراجات کے لیے ہاتھ لگے گا[3]۔ بشرطیکہ نازک اوقات میں وہ کسی دوسری مد پر خرچ نہ ہو جائے

---

[1] راماین کے مشہور ہیرو رام چندر جی کی جنم بھومی اجودھیا کی ایک مسجد پر کندہ عبارت کو ملاحظہ کیجیے۔ "قلندر فقیروں میں ایک طبقہ ہے جو دنیا سے قطع تعلق کر کے داڑھی اور سر منڈوا کر دربدر گھومتے ہیں۔ اہل ہنود میں بھی قلندروں کے مثل سنیاسی ہوتے ہیں جو آنے والے کل سے بے نیاز زندگی بسر کرتے ہیں۔ فی زمانہ پنجاب میں ریچھ اور بندر نچانے والوں کو قلندر کہتے ہیں۔ (دیکھیے روز کی گلوسری۔ جلد ۴۔ صفحہ ۲۵۷۔)

[2] بابر کی سخاوت کا تذکرہ تزک صفحہ ۵۲۲ ـ ۵۲۳۔ ہمایوں کے خزانہ کی تفصیل ۵۷۹ جاگیرداروں سے ۳۰ فیصدی زیادہ لگان وصول کرنے کا ذکر صفحہ ۱۱ پر درج ہے۔

[3] تزک صفحہ ۶۳۷ "اگر اس وقت بنگال پر فوج کشی نہیں کی جاتی ہے تو کوئی دوسری جگہ ایسی نہیں ہے جہاں سے فوج کی ضرورت کے لیے کثیر رقم مل سکے۔ مغرب کی سمت کتنی ہی جگہ نزدیک بھی ہیں اور متمول بھی۔" جنوری ۱۵۲۹ء۔

کیا کوئی کتنا ہی شریف اور ناقابل تسخیر فاتح بانی سلطنت کہا جا سکتا ہے ۔ ؟ خصوصاً جب کہ وہ تعمیری پولیٹیکل مادہ سے بالکل بے بہرہ ہو ۔ اور نہ اس میں مستقل سیاسی اصلاحات کا مادہ ہو ۔ اگر بابر کے کارناموں کو اس کسوٹی پر کسا جائے تو اس کو بانی سلطنت کہنا سراسر نامناسب اور بے بنیاد ہوگا ۔

ہمایوں کو بابر سے ایک بدنظم سلطنت ہی وراثت میں ملی ۔ یہ سلطنت صرف سایہ تمثال تھی ۔ اس کے دشمن سلطنت کے اندر اور باہر گھات لگائے بیٹھے تھے ۔ اس کا وزیر چاروں طرف سازش کا جال بچھا رہا تھا ۔ احسان فراموش مرزاؤں کا ایک گروہ اس کو پریشان کرنے پر تلا ہوا تھا ۔ ان کو خوش رکھنے کی ناعاقبت اندیش پالیسی ان کو اور بھی سر پر چڑھا رہی تھی ۔ بابر نے افغانوں کے خلاف کئی بار فوج کشی کی لیکن اس کا کوئی دیرپا اثر نہ ہوا ۔ اس کی تلوار کا وار مانو پانی پر پڑتا تھا ۔ پانی پھٹ کر الگ تو ہو جاتا تھا مگر جلد ہی پھر یکجا ہو جاتا تھا ۔ سرکش پٹھان آئندہ زمانہ کے سکھوں کے مانند ضدی اور ناعاقبت اندیش نہ تھے ۔ سکھ تو کھلی لڑائی میں ہر چیز بازی پر لگا دیتے تھے اور چند فیصلہ کن واروں کے بعد ہار تسلیم کر لیتے تھے ۔ سخت جان افغان اکثر بندھیل کھنڈ کے جنگلوں یا عیار و اولوالعزم بنگال کے حاکم نصرت شاہ کے علاقہ میں پناہ گزیں ہو جاتے تھے ۔ نصرت شاہ بابر اور ہمایوں کے خلاف برابر کسی نہ کسی باغی اتحاد کی مالی امداد کرتا رہتا تھا ۔ اور بظاہر مغلوں کی وفاداری کا سوانگ بھرتا تھا[1] بابر کی وفات ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء میں ہوئی ۔ اس سے پیشتر ہی غیر مغلوب بین اور بایزید نے سلطان محمود لودی کو جو بنگال کے جنگلوں میں چھپا ہوا تھا بلوا بھیجا اور اس کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ پہلے جونپور کی سلطنت پر قبضہ کیا جائے اور اگر تقدیر نے یاوری کی تو پھر دہلی پر زور آزمائی

---

[1] دیکھیے ڈھاکہ یونیورسٹی کی بنگال کی تاریخ جلد ۲ ۔ صفحات ۱۰۳ ۔ ۱۰۷ ۔ اور تزک بابری ۔ مترجم نصرت شاہ ۔ صفحات ۶۲۸ ۔ ۶۳۷ ۔ ۶۶۱ ۔ ۶۶۲ ۔ ۶۶۵ ۔ ۶۷۱ ۔ ۶۷۴ ۔

Marfat.com

کی جائے۔ ان کی اس تجویز نے جلال الدین اور شیر خاں کی حالت پر نہایت ہی خراب اثر ڈالا۔ اور جس کا انجام بالآخر جنگ دوراہا ہوا۔ جو ستمبر ۱۵۳۱ء میں ہوئی۔ ہم اب اس لڑائی اور ہمایوں کے چنار کے محاصرہ کا مجملاً ذکر کریں گے۔

۱۵۳۰ء کے آخری نصف میں آگرہ کی ابتری اور سازشوں سے پٹھانوں کو ایک سنہرا موقع ملا۔ ایک طرف تو بندھیل کھنڈ سے کھدیڑے جانے کے بعد ببّن اور بایزید نے قنوج اور جونپور سے لے کر دریائے گھاگھرا اور اس کے پار تک کے تمام علاقہ کو سلطان محمد کی حمایت میں ابھارا۔ دوسری طرف ہمایوں اپنی جاگیر سنبھل میں صبر کے ساتھ خاموش بیٹھا تھا۔ کیوں کہ میر خلیفہ اس کو تخت سے محروم رکھنے کے لیے متواتر سازش کر رہا تھا۔ افغان باغیوں نے (جن کو کہ فتح ملنے پر محب الوطن کہا جا سکتا تھا) ایک کثیر فوج لے کر دریائے گنگا کو پٹنہ کے مقام پر عبور کیا۔ اور نابالغ لوہانی حکمران کو تخت سے ہٹا کر سلطان محمود لودی اور اپنے لیے وہاں جگہ کر لی۔ عباس لکھتا ہے "جب سلطان محمود بن سکندر لودی بہار پہونچا تو شیر خاں میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ وہ ان سرداروں سے لوہا لیتا۔ کیوں کہ ان کے پاس ایک کثیر فوج تھی اور ان کے پیروؤں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ اگرچہ شیر خاں سلطان محمود کے سامنے حاضر بھی ہوا لیکن افغانوں کو اس پر اعتماد نہ تھا[1]۔۔۔ سلطان نے بہار کے

---

[1] مخزن صفحہ ۲۰ پر لکھتا ہے "جب شیر خاں نے یہ دیکھ لیا کہ اب افغانوں کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے بجز اس کے کہ وہ سلطان محمود کی اطاعت قبول کر لیں تو وہ بدرجہ مجبوری سلطان کے پاس چلا گیا اور اس کی خدمت و اطاعت قبول کر لی۔ سلطان محمود کے سرداروں نے بہار کے علاقہ کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ اور شیر خاں کے تحت میں تھوڑا سا علاقہ رعایتاً چھوڑ دیا۔ انہوں نے شیر خاں سے یہ بھی کہا کہ جب ہم جونپور کا علاقہ مغلوں سے چھین لیں گے تو بہار تم کو واپس کر دیا جائے گا۔" عباس کے اس بیان سے تاریخی واقعات میں گڑبڑی نظر آتی ہے۔ اگر شیر خاں نے بنگالیوں کو ہرادیا ہوتا تو محمود لودی اس وقت کہاں ہوتا؟ اس سلسلہ میں مخزن نے بنگال کی

Marfat.com

علاقہ کو اپنے افغان سرداروں میں تقسیم کر دیا۔ اور شیر خاں سے یہ کہا کہ جب جونپور کا علاقہ مغلوں سے چھین لیا جائے گا بہار کا علاقہ جو اس نے بنگالیوں کو ہرا کر اپنے قبضہ میں کر لیا ہے تو اس کو واپس کر دیا جائے گا۔ شیر خاں نے التجا کی کہ اگر بہار اس کو دینا ہی ہے تو اس کے متعلق ایک شاہی فرمان جاری کر دیا جائے۔ سلطان نے ایسا ہی کیا۔ شیر خاں بہار کے علاقہ کا شاہی فرمان لے کر اپنی جاگیر واپس لوٹ آیا۔ اور اس نے فوجی تیاریاں شروع کر دیں سلطان محمود نے بھی اپنی فوج کو تیار کیا اور جونپور کی جانب کوچ کر دیا۔ اس نے شیر خاں کو حکم نامہ بھیجا کہ وہ فوراً اپنی فوج لے کر آ جائے۔ شیر خاں نے سلطان کو یہ جواب دیا کہ جیسے ہی اس کی فوج پورے طریقہ سے مسلح ہو جائے گی۔ وہ حاضر خدمت ہوگا۔ جب سلطان کے امیروں کو اس خط کا علم ہوا تو انہوں نے سلطان کو بتایا کہ شیر خاں مغلوں سے ساز باز کیے ہے۔ (با مغلان اتفاق وارد)۔ وہ بادشاہ (محمود لودی) کی مدد کے لیے نہیں آئے گا۔ عیاری اور بہانہ سازی اس کی فطرت ہے حیلہ گری اور روباہ بازی اس کا پیشہ اس کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ اس کو ساتھ چلنے کے لیے مجبور کرنا چاہیے۔ اعظم ہمایوں فتح خاں سروانی نے عرض کیا "اس کو ساتھ لے چلنے کی ایک سہل ترکیب ہے۔ شیر خاں اس وقت اپنی جاگیر میں ہے۔ جہاں بھی وہ ہو ہمیں بھی اسی طرف اپنی فوج کا رخ کر دینا چاہیے۔ اس کی غیر حاضری کا اس سے تاوان وصول کرنا چاہیے۔ وہ ہم کو ایک شاندار دعوت دے اور وہاں سے ہمارے ساتھ چلے"۔ اعظم ہمایوں کی اس تجویز سے سب امیروں نے اتفاق کیا۔ اور سلطان کی فوج منزل بہ منزل کوچ کرتی ہوئی سہسرام پہنچ گئی یہاں شیر خاں موجود تھا۔ جب شیر خاں کو یہ علم ہوا کہ سلطان مع اپنی فوج و امرا کے سہسرام

فوج کی شکست کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے جو مصنف عباس کی صریحاً بھول ہے شیر خاں کا بنگال کی فوج سے پہلا مقابلہ دورہا کی لڑائی کے ۲ سال بعد ہوا۔ سلطان محمود سے ۱۵۳۱ء میں شیر خاں کے تعلقات کے لیے دیکھئے مخزن نسخہ صفحہ ۲۰

Marfat.com

آرہا ہے اور وہ شیر خاں کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرے گا تو وہ بہت پریشان ہوا۔ اس نے اپنے بہی خواہوں اور رفیقوں سے یہ کہا: "اعظم ہمایوں فتح خاں اور مسند عالی عیسیٰ خاں دو سروانی سرداروں نے میرے سب منصوبے خاک میں ملا دیے۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ اس فوج کشی سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ کیوں کہ امیر ایک دوسرے سے متفق نہیں ہیں اور بغیر اتحاد کے کچھ نہیں ہوسکتا۔ ان سرداروں میں سب سے زیادہ فوج ببّن اور بایزید فارمولی کے پاس ہے۔ دلیری اور جاں بازی میں ان کا نام ہے لیکن عقل اور شعور کی انمیں کمی ہے اُمورِ ملکی سے وہ بے بہرہ ہیں میری دلی خواہش یہ تھی کہ جب انکی فوجیں میرے علاقہ سے باہر ہوجائیں تو میں اس نازک کیفیت سے گلو خلاصی حاصل کروں پھر عذر و معذرت کروں۔ لیکن ان دو سروانی سرداروں کے ورغلانے سے سلطان محمود ادھر آرہا ہے اب حیلہ و حوالہ سے کام نہیں چلیگا۔ اب مجھے ہر حال میں اس فوج کے ساتھ جانا ہی ہے۔ تم لوگ کوچ کے لیے اعلان کردو میں سلطان کے استقبال کے لیے جارہا ہوں۔ میں اس کے ہم رکاب رہوں گا اور معافی مانگوں گا۔ تاکہ وہ مطمئن ہوجائے۔ تم ان کی مہمان نوازی کا سامان بھی فراہم کرلو"۔ شیر خاں نے اس قسم کا انتظام کر دیا کہ ہر منزل پر ہر امیر کے رتبہ کے مطابق اس کو تحفہ جات و سوغات ملتی رہے۔ اس نے سلطان کی خدمت میں بذات خود نظر پیش کی ..... سلطان چند روز شیر خاں کے یہاں قیام کرنے کو راضی ہوگیا۔ تاکہ اس دوران میں شیر خاں اپنی فوج کی تیاری مکمل کرے ..... بعدہٗ سلطان نے شیر خاں کے ساتھ کوچ کیا اور جب جونپور کے نزدیک پہنچ گئے تو سلطان نے اپنی فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ یہ خبر سن کر مغل جونپور کا قلعہ خالی کر کے چلدیے سلطان نے کچھ روز جونپور میں قیام کیا اور فوج کو آگے بھیجدیا۔ اس نے لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار کے علاقہ کو فتح کر لیا"[1] (عباس نسخہ ۱۱۰-۱۱۳)

---

[1] مخزن نے اس واقعہ کو تقریباً بجنسہٖ قلم بند کیا ہے مگر چند ضروری واقعات کا بھی اضافہ کیا ہے۔

(۱) چند روز بعد سلطان محمود سے رخصت لے کر شیر خاں سہسرام واپس آگیا۔

Marfat.com

اس اثنا میں قریب المرگ بادشاہ بابر کے صدر مقام آگرہ میں اس کے بستر کے چاروں طرف سنسنی خیز واقعات رونما ہو رہے تھے۔ بابر کی مزاج پرسی کا بہانہ لے کر تمام مرزا آگرہ میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ خاص نام تھے مہدی خواجہ۔ جو بابر کی ہمشیرہ خان زادہ بیگم کا تیسرا شوہر تھا۔ اور کالپی کا گورنر تھا۔ محمد زماں مرزا۔ جو عالی مرتبہ تیموریہ سلطان حسین مرزا والی ہرات کا پوتا اور بابر کی دختر معصوم سلطان بیگم کا شوہر تھا۔ بابر نے ۱۵۲۹ء میں اس کو سلطان جنید برلاس کی جگہ جونپور کا گورنر مامور کیا تھا۔ میر خلیفہ وزیر اعظم جو تاریخ میں "بادشاہ بنانے والا" بننا چاہتا تھا۔ اور اس وقت آگرہ کے حالات پر قابو پائے ہوئے تھا۔ شہزادہ ہمایوں جس کے متعلق میر خلیفہ اور دیگر مرزاؤں کی رائے اچھی نہیں تھی اس وقت پس پردہ تھا۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ آخری وقت میں محض ایک واقعہ نے ہمایوں کی ہاری بازی پلٹ دی۔ ایک روز اتفاقاً مورخ نظام الدین احمد کا والد خواجہ محمد مقیم ہروی

اسی اثنا میں بابر کا انتقال ہو گیا۔ اور ہمایوں تخت پر بیٹھا۔ اس نے امور سلطنت ترتیب دینا شروع کیا۔ اس بیان سے بابر کے انتقال اور ہمایوں کی تخت نشینی کی صحیح تاریخ کا پتہ چلتا ہے جو عباس میں دستیاب نہیں ہے مخزن قلمی نسخہ صفحہ ۲۰۱-۲۰۲۔ بانتسیق معاملات و مہمات اشتغال داشتند۔

(۲) سلطان محمود نے یہ خبر بہار میں سنی اور ایک کثیر فوج فراہم کر کے جونپور کی جانب کوچ کر دیا۔ شیر خاں کو بلانے کے لیے ایک ہرکارہ سہسرام بھیجا۔ شیر نے حیلہ حوالہ سے کام لیا۔ سلطان محمود اپنی فوج کے ساتھ سہسرام کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے وہاں چند روز قیام کیا۔ پھر جونپور کو کوچ کیا۔ مغل جونپور سے کڑا مانک پور ہٹ گئے۔ جونپور سے لکھنؤ تک کا تمام علاقہ سلطان محمود بن سکندر لودی کے تصرف میں آ گیا۔ اس وقت شہنشاہ ہمایوں کالنجر کے قریب آیا ہوا تھا۔ جب ہمایوں نے سلطان محمود کے شر کا حال سنا تو وہ اس کی سرکوبی کے لیے اس جانب چلدیا۔

Marfat.com

میر خلیفہ اور مہدی خواجہ کے ساتھ انتظاری خیمہ میں موجود تھا۔ میر خلیفہ کے چلے جانے کے بعد مہدی خواجہ خود کلامی میں مشغول ہو گیا اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میر خلیفہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا "انشاء اللہ سب سے پہلے تیری ہی کھال اتاری جائے گی۔" ادھر جب مہدی خواجہ نے محمد مقیم کو خیمہ میں دیکھا تو اس نے کان پکڑ کر یہ تاکید کی کہ اگر اس نے اس بات کا کسی سے باہر ذکر کیا تو اس کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ لیکن محمد مقیم پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ فوراً میر خلیفہ کے پاس پہنچا اور تمام واقعہ اس کے گوش گذار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میر خلیفہ نے فوراً پینترا بدل دیا اور اس نے ہمایوں کو بلانے کے لیے اپنا قاصد سنبھل بھیج دیا۔ ۲۶ دسمبر کو بابر کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔[1]

---

[1] مخزن نے ابوالفضل کی تقلید کی ہے مگر اس کا بیان گل بدن بیگم کے مقابلہ کم معتبر ہے۔ اس لیے اس کو رد کرنا ہی مناسب ہے۔ میں اس باب میں مرحوم ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنرجی سے قطعاً متفق الرائے ہوں۔ انھوں نے نظام الدین کے بیان کو کلیتہً تسلیم کر لیا ہے۔ (ہمایوں بادشاہ جلد-۱ صفحہ ۲۵) اور مسز بیورج کی رائے کو ترجیح نہیں دی۔ (تزک بابری۔ صفحات ۷۰۲-۷۰۷)۔ ہمیں نظام الدین کی اس رائے کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہمایوں بابر کی موت کے بعد آگرہ پہنچا ورنہ ہم کوئی وجہ نہیں بتا سکتے کہ بابر کی موت اور ہمایوں کی تخت نشینی کے درمیان وقفہ کا کیا سبب ہے۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے کچھ حصہ تو نظام الدین کا درست مانا ہے اور کچھ حصہ گلبدن بیگم کا۔ لیکن اس وقفہ کی کوئی وجہ نہیں بتائی ہے۔ اگر گلبدن کے الفاظ اس کے بھائی ہندال کی زبان سے کہلائے جائیں (وہ اس کا سگا بھائی تھا) تو اس کا صاف منشا یہ ظاہر ہوگا کہ وہ ہندال کو ہمایوں کے نزدیک لانا چاہتی تھی۔ مرزا حیدر نے جو کچھ لکھا ہے وہ دوسروں سے سنی سنائی بات پر مبنی ہے۔ (ہمایوں۔ صفحہ ۳۰۔ نوٹ نمبر ۱) ہمارے پاس نظام الدین کے بیان کو صحیح تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی دیگر چارہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر بنرجی نے جس طرح ہمایوں کی ایک مہم کو دور کر کے بیان کیا ہے۔ وہ قرین قیاس نہیں۔ اس پر ضمیمہ ۱۔ میں بحث کی گئی ہے۔ باب ۵ میں ہمایوں کی کالنجر کی مہم اور جنگ دورا ہہ کی تاریخوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

Marfat.com

ہمایوں اپنے والد کے انتقال کے بعد آگرہ پہنچا جہاں ۴ دن بعد ۳۰ دسمبر ۱۵۳۰ء کو اس کی تاجپوشی کی رسم ادا ہوئی۔

ہمایوں کے عہد کے اول چند روز جاگیروں کو از سر نو تقسیم کرنے اور مرزاؤں سے مصالحت کرنے میں صرف ہو گئے۔ جب بابر کے دوسرے لڑکے کامران مرزا نے کابل اور قندھار کے علاوہ پنجاب اور ملتان پر بھی قبضہ کر لیا تو مغل حکومت کے شیرازہ کے بکھرنے کے آثار نمایاں ہو گئے۔ چند روز بعد اس نے اپنے بڑے بھائی تحمل طبع ہمایوں سے درخواست کی کہ وہ اس علاقہ کو لبطور انعام سے دیدے۔ ہمایوں خاندانی شفقت اور روا داری میں بابر کی ہی طرح رحم دل تھا۔ چنانچہ وہ کامران کو بار احسان سے زبانے میں نہ چوکا۔ اپنے تیسرے بھائی عسکری مرزا کو اس نے سنبھل کی جاگیر دیدی اور سب سے چھوٹے بھائی ہندال کو الور کا علاقہ دیدیا۔ ہمایوں کی خصلت تھی کہ اگر کسی نے اس کو ایذا پہنچائی ہو یا نقصان پہنچایا ہو تو وہ اس بات کو جلد فراموش کر دیتا تھا۔ اس نے محمد سلطان مرزا اور محمد زماں مرزا دونوں مفسدوں کو معاف کر دیا۔ ابھی ہمایوں چین کی سانس بھی نہ لے پایا تھا کہ اسے یہ تشویشناک خبر ملی کہ بَبَن اور بایزید گوڑ (بہار) کی جانب سے فوج کشی کر رہے ہیں۔ (گلبدن بیگم کی رائے میں یہ واقعہ بابر کی وفات کے ۶ ماہ بعد ہوا) اس خبر نے آرام طلب ہمایوں پر تازیانہ کا کام کیا۔ اس نے جنگ کی مناسب تیاریاں شروع کر دیں۔ وہ ان باغیوں کو بتانا چاہتا تھا کہ بابر کا جانشین اپنی ذمہ داری سے بخوبی واقف ہے اور دشمنوں سے لوہا لے سکتا ہے۔ تاریخ کی ضمنی شہادت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بابر کی وفات کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب تیموری خاندان نے متحد ہو کر افغانوں کو شکست فاش دینے کی کوشش کی اس مہم میں محمد سلطان مرزا۔ محمد زماں مرزا اور مرزا عسکری بھی شامل ہوئے۔ غالباً اگست ۱۵۳۱ء کے پہلے ہفتہ میں مغل

ؔ میں نے اپنی پہلی کتاب "شیر شاہ" میں اس واقعہ کی تاریخ جون ۱۵۳۱ء درج کی تھی۔ یہ تاریخ بابر کی وفات کے بعد ۶ مہینہ گن کر نکالی گئی تھی۔ لیکن اب میں اس تاریخ

Marfat.com

فوج نے آگرہ سے کالپی کی راہ کی جانب کوچ کیا ان کا مقصد جونپور پہنچنا تھا۔

اب ہم جونپور کے باغیوں کی نقل و حرکت کا مطالعہ کریں گے سلطان محمد لودی اور اس کے فوجی سردار ببن اور بایزید کا یہ خیال تھا کہ مغل فوج برسات کے موسم میں کوئی حرکت نہیں کرے گی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی فوج کو دریائے گومتی اور سرجو کے کنارے کنارے کافی بڑے علاقہ میں پھیلا دیا تھا۔ یہ علاقہ سلطان پور اجودھیا ہو کر جانے والی جونپور لکھنؤ سڑک کے ہمکنار تھا۔ افغانوں کے پاس خبر رسانی کے معتبر ذرائع دستیاب نہ تھے۔ ادھر ہمایوں نے اپنی فوج کو تیزی سے آگے بڑھنے کا حکم دے رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک مغل فوج انکے سر پر نہ آ پہنچی۔ ان کو ہمایوں کی نقل و حرکت کی کوئی کان و کان خبر نہ ہو سکی۔ اس سے آگے کی تفصیل عباس نے یوں بیان کی ہے۔

جب سلطان محمود کو خبر ملی کہ بادشاہ ہمایوں کی فاتح فوج نے اس طرف کوچ کر دیا ہے۔ تب وہ بھی جونپور سے چل پڑا۔ لکھنؤ کے نزدیک دونوں طرف کی فوج ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہو گئی۔ روز چھوٹی موٹی جھڑپیں

کوردکرتا ہوں۔ فوج کو تیار کرنے اور مختلف چوکیوں پر اطلاع بھیجنے میں کچھ وقت ضرور لگا ہوگا۔ یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ اگست ۱۵۳۱ء سے پیشتر ہمایوں آگرہ سے روانہ ہو سکا ہو برسات کے موسم میں فوج کشی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ مثلاً شرقی افغانوں کے خلاف اگست ۱۵۲۶ء میں ہمایوں کی پہلی لڑائی ہوئی۔ (تزک مترجم۔ صفحہ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۴۴) ڈاکٹر بنرجی نے اس واقعہ کو ہمایوں کے عہد حکومت کے دوسرے سال میں بتایا ہے۔ کیوں کہ ان کو جولائی اور اگست میں جو ہمایوں نے کالنجر کے خلاف مہم کی اس سے پیوست کرنا تھا (ہمایوں بادشاہ نامہ صفحہ ۳۶) اس باب کے ضمیمہ آخر میں اس غلطی پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اس لڑائی کی تاریخ جولائی ۱۵۳۱ء قائم کی ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے پہلے ہمایوں کے آگرہ سے رخصت ہونے کی تاریخ جون ۱۵۳۱ء بتائی تھی۔

(دیکھیے ہمایوں صفحہ ۵۰)

Marfat.com

ہونے لگیں اور دونوں طرف کے سپاہی جوش و شجاعت کے جوہر دکھانے لگے۔

شیر خاں یہ جانتا تھا کہ افغانوں میں موانست نہیں ہے اور ہر سردار اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد خود بناتا ہے لہذا اس نے ہندو بیگ کے پاس یہ پیغام بھیجا تھا "میں وہ مسکین ہوں جسے مغلوں نے خاک سے اٹھا کر سرفراز کیا۔ میں بدرجہ مجبوری سلطان محمود کے ساتھ ہوں۔ لیکن لڑائی کے میدان میں کوئی ہتھیار نہیں اٹھاؤں گا۔ اور میں ہی افغان فوج کی شکست کا باعث بنوں گا۔" جب ہندو بیگ نے شیر شاہ کے اس خط کو ہمایوں کے سامنے پیش کیا تو بادشاہ نے شیر کے نام ایک فرمان جاری کر دیا کہ وہ سلطان محمود کے خیمہ میں رہنے کی وجہ سے پریشان نہ ہو اگر اس نے بادشاہ کے کام میں مدد کی تو اس کا مرتبہ اور بلند کر دیا جائے گا۔

چند روز کی صف آرائی کے بعد باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔ جنگ کے وقت شیر شاہ اپنی فوج لے کر اپنے راستے چلدیا۔ سلطان محمود لودی کو بری طرح مات ہوئی۔ حالاں کہ ابراہیم خاں یوسف خیل لودی اس جنگ میں نہایت شجاعت و دلیری سے لڑا۔ اس نے ایک قدم بھی پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیا یہاں تک کہ لڑتے لڑتے ہی اس نے دم توڑا۔ میاں بایزید فارمولی بے حد شراب پی کر بدمست و بدحواس ہوگیا تھا اسی عالم بے خبری میں وہ مارا گیا۔ سلطان محمود اور دیگر امیر سردار مغلوب ہو کر بہار واپس لوٹ گئے۔ سلطان کے پاس نہ تو اب خزانہ تھا نہ جاگیر جس سے فوج کو مسلح و آراستہ کرتا۔ جن امیروں نے اسے تخت پر بٹھایا تھا ان میں سے بیشتر لکھنؤ کی جنگ میں کام آچکے تھے۔ باقی ماندہ افغان باہمی بغض و نفاق کا شکار ہو کر تتر بتر ہو گئے۔ سلطان محمود کو طوائفوں کا شوق تھا چنانچہ وہ خود عیاشی و نفس پرستی میں ڈوب گیا۔ چوں کہ اس میں افغانوں[1] کی مخالفت کی تاب نہ رہی اس لیے اس نے تخت و تاج سے استعفیٰ دے دیا۔ اور پٹنہ

---

[1] یہ افغان کون ہو سکتے تھے؟ غالباً اشارہ شیر خاں اور جلال خاں لوہانی کے مددگاروں کی طرف ہے۔

Marfat.com

(بھاٹ۔ریوا) میں سکونت اختیار کر لی۔اسکے بعد اس نے اپنے آخری وقت تک کبھی تخت و تاج کا خواب نہیں دیکھا۔اس کی وفات ۹۴۹ھ ہجری میں ہوئی۔
ایسے تھے افغان لیڈر اور ان کا نمونہ سلطان جو کہ مغلوں سے دہلی سلطنت کو چھیننے کا خواب دیکھ رہے تھے۔اس واقعہ کے بیان کرنے میں مخزن اور عباس میں کئی جگہ اختلاف[1] ہے۔خصوصاً اس مقام کا تعین کرنے میں جہاں افغانوں اور ہمایوں کے بیچ معرکہ آرائی ہوئی تھی۔عباس نے اس لڑائی کا نام لکھنؤ کی لڑائی لکھا ہے۔مخزن نے ہمایوں کی اس فتح کو جونپور کی فتح بتایا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ یہ لڑائی نہ تو لکھنؤ کے قرب و جوار میں ہوئی اور نہ جونپور کے ہی نزدیک۔پھر بھی مخزن کی بات کچھ حد تک ٹھیک ہے اس کے متعلق ہمایوں کے دیرینہ خادم جوہر کی بات سند ہے۔وہ لکھتا ہے"جب ظل الٰہی

---

[1] ہم نے اس اقتباس کو بجنسہٖ نقل کر دیا ہے۔کیوں کہ اس میں دو باتیں بحث طلب ہیں۔(۱) لڑائی کس مقام پر ہوئی۔(۲) شیر خاں نے کس حد تک افغانوں سے غداری کی۔

[2] بقول مخزن صفحہ ۲۲-۲۳۔(۱) سلطان محمود لودی نے فوج فراہم کی اور بہار سے جونپور کے علاقہ کی جانب کوچ کیا۔اور ایک ہرکارہ شیر خاں کو بلانے کے لیے سہسرام بھیجا۔
(۲) چوں کہ شیر خاں بخیل و مکار ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ اس کی جاگیر کے راستہ گذرا جائے اور اس کو ساتھ لے لیا جائے۔
(۳) چوں کہ شیر خاں کو اس بات کا حسد تھا کہ اس کے مقابلہ میں بٹن اور بایزید فوج کی سپہ سالاری کر رہے ہیں۔اور ان کو اس پر فوقیت و ترجیح دی گئی ہے۔اسلئے اس نے ہندو بیگ کو ایک پیغام بھیجا۔اس کی خواہش تھی کہ وہ خود اس متحدہ افواج کی کمان سنبھالے۔
(۴) لڑائی کے وقت شیر خاں نے اپنی فوج تیار کی لیکن عین وقت پر پیٹھ دکھا کر بھاگ گیا۔ڈارن نے یہ بھی جوڑ دیا ہے صفحہ ۱۰۲-۱۰۳۔کہ وقت بنر شیر خاں معہ اپنی فوج کے دائیں بازو پر تھا) (۵) سلیمان محمود لودی کو شیر کی غداری سے پریشانی پیدا ہوئی اور وہ ہار گیا۔(۶) شہنشاہ جنت آشیانی بادشاہ ہمایوں جونپور کی فتح کے بعد آگرہ چلے گئے اور چنار کو فتح کرنے کے لیے ہندو بیگ کو بھیج دیا۔

Marfat.com

بادشاہ ہمایوں منزل بہ منزل کوچ کرتا ہوا دوراہا پہنچا جو ماتی دبابر کے مطابق موتی۔ صحیح لفظ گومتی) ندی کے کنارے واقع ہے تو اس کا مقابلہ مذکورہ بالا افغانوں سے ہوا۔ کئی روز کے بعد فیصلہ کن جنگ شروع ہوئی۔ ایزید۔ ابراہیم خاں لودیؒ اور دیگر جملہ سرکش و باغی سردار لڑائی میں ہلاک ہوگئے۔ (سرکار کا نسخہ تذکرات الواقعات۔ صفحہ ۶۰۵)

دوراہا کی لڑائی بقول جوہر ایک بہت بڑی لڑائی تھی۔ اور پانی پت کی لڑائی کے بعد دوسری کراری ہار تھی جو افغانوں کو آمنے سامنے کی لڑائی میں کھانی پڑی۔ ببن اور بایزید کھلے میدان میں لڑنے کے عادی نہیں تھے۔ وہ بابر کے خلاف ہمیشہ گوریلا طریقہ جنگ (مارو اور بھاگ جاؤ) استعمال کرتے تھے اور فائدہ اٹھاتے تھے دوراہا کی لڑائی میں انکو ہمایوں کے خلاف جم کر لڑنا پڑا۔ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہمایوں نے اپنی فوج کی بہتر ترتیب و تنظیم سے ان کے بھاگنے کا راستہ جو براہ اودھ بنگال کی جانب تھا روک دیا تھا۔ لڑائی کا مقام "دوراہا" بھی جو دو سڑکوں کے سنگم پر تھا ہمارے خیال کی مزید تصدیق کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں نے پریاگ (الہ آباد) پہنچے کے بعد اپنی فوج کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ فوج کے ایک دستہ کو اس نے محمد سلطان مرزا کی کمان میں لکھنؤ کی جانب روانہ کر دیا تاکہ وہ اس علاقہ سے افغانوں کی منتشر فوج

لہ ابراہیم لودی کے متعلق میں نے تاریخ "شیر شاہ صفحہ ۲، کے فٹ نوٹ میں جو لکھا ہے اسے رد سمجھا جائے۔ یہ غلط ہے۔ صحیح عبارت بقول عباس صفحہ ۱۰۸ یہ ہے "ابراہیم خاں بن احمد خاں بن مبارک خاں یوسف خیل دبتن عطا ساہو خیل "بتن کو "بتن" کی طرح لکھا ہے اور یوسف خیل دبن کے درمیان لفظ "د" چھوٹ گیا ہے اس وجہ سے یہ مغالطہ پیدا ہو گیا تھا۔ عباس نے صفحہ ۲۱ پر صاف صاف لکھا ہے کہ ابراہیم خاں یوسف خیل ہلاک ہوا۔ میں نے لفظ "ساہو خیل" لکھا تھا۔ اور اس کو عباس کی طرف منسوب کیا تھا یہ میری غلطی تھی اور مجھے اس پہ افسوس ہے۔

Marfat.com

کو بھگا دے۔ جو اس دوران میں اس علاقہ پر قابض ہو گئی تھی۔ دوسرے دستہ کو محمد زماں مرزا کی قیادت میں جونپور کی جانب بھیجدیا تا کہ وہ گھوم کر سلطان محمد لودی کی فوج کے عقب میں پہنچ جائے۔ اور اس طرح ان کے جنوبی بہار کو واپس لوٹنے کے راستہ کو روک دے۔ ہمایوں کی یہ سیاسی دور اندیشی تھی کہ اس نے دونوں مرزاؤں کو دور رکھا۔ کیوں کہ ان کی وفاداری مشتبہ تھی۔ بعد اختتام جنگ واپس لوٹتے وقت اس نے نہایت خوشی سے ایک مرزا کو لکھنؤ اور دوسرے کو بہار کا گورنر بنا دیا۔

ہمایوں نے لڑائی سے پیشتر ہی اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ افغان فوج گومتی کے کنارے کنارے "دورا ہا" کے راستہ وقت ضرورت بھاگنے کی سوچے گی۔ سلطان محمود لودی کی عادت دیکھتے ہوئے اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ دیدہ دانستہ جونپور سے مغلوں سے ٹکر لینے کے لیے دورا ہا تک آئے گا۔ بلکہ حالات نے افغانوں کو مجبور کیا کہ وہ جانب شمال حرکت کریں۔ انہیں یہ امید تھی کہ غالباً اجودھیا کو جانے والا راستہ ابھی تک پیچھے ہٹنے کے لیے کھلا ہے۔ لیکن دفعتہً راستہ میں ان کی مغل فوج سے ٹکر ہو گئی۔ اگر ہم حکومت برطانیہ سے پہلے کے زمانہ کے نقشہ پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ اودھ کے نوابوں کے زمانہ تک ایک سڑک آگرہ سے الہ آباد ہو کر جانب مشرق سلطان پور، فیض آباد اور اس کے آگے تک جاتی تھی اور دوسری سڑک چنار سے جونپور ہوتی ہوئی لکھنؤ تک جاتی تھی۔ یہ دونوں راستے جس مقام پر ایک دوسرے کو کاٹتے تھے وہ مقام سلطان پور سے جانب مغرب ۸ میل مسافر خانہ سے جانب جنوب ۱۰ میل علی گنج سے جانب جنوب ۵ میل اور جونپور سے بجانب شمال مشرق ۵۰ میل ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مقام دورا ہا جس کا ذکر جوہر نے کیا ہے۔ آج کل وہ وہ جگہ ہے جس کا موجودہ نام "دیروہ" ہے۔ یہ دریائے گومتی کے کنارے جونپور سے بجانب شمال ۸۴ میل ہے اور ۲۰ ۔ ۸۲ طول البلد و ۲۰۔۲۶ عرض البلد کے درمیان واقع ہے[1]۔

---

[1] ڈاکٹر ایس کے۔ بنرجی نے جوہر کے دورا ہا کو بارہ بنکی ضلع میں "دادرہ" جگہ

Marfat.com

سے منسوب کیا ہے لیکن مندرجہ ذیل وجوہات ان کے خیال کی تردید میں پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) اس مقام کے تعین کرنے میں ڈاکٹر بنرجی نے الہ داد فیضی سرہندی کا حوالہ دیا ہے جو جوہر کے بعد کا ہے اور اس سے کم معتبر ہے۔

(۲) قرون وسطیٰ میں جو شاہراہ عام جنگ کے لیے استعمال ہوتے تھے یہ مقام ان سڑکوں سے دور رہے۔ یہ مقام "دادرہ" لکھنؤ میں فیض آباد سڑک کے نزدیک ہے۔ لیکن یہ سڑک صفدر جنگ اور نواب شجاع الدولہ کے زمانہ تک نہیں تھی، جیسا کہ فیض آباد کے نوابوں کے سفرناموں سے معلوم ہوتا ہے۔

(۳) مخزن اور عباس کے بیانات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو لڑائی کے صحیح مقام کا پتہ نہیں تھا۔ ان کے بیانات میں کہیں بھی اس بات کا ذکر نہیں کہ محمود لودی لکھنؤ پہنچ گیا تھا۔ ان کو بمقابلہ جوہر کم واقفیت تھی۔ یہ صرف اتنا جانتے تھے کہ یہ لڑائی کہیں لکھنؤ اور جونپور کے درمیان لڑی گئی تھی اور یہ مقام قرون وسطیٰ کی کسی سڑک کے کنارے تھا۔

(۴) اگر ڈاکٹر بنرجی کو الہی داد خاں کے بیان کردہ "دادرہ" کی تلاش تھی تو اس نام کا مقام پرانی سڑک پر مسافر خانہ سے ۱میل جنوب مشرق سلطان پور سے ۱۳-۱۴ میل شمال مشرق۔ اور دونوں سڑکوں کے سنگم سے ۴ میل شمال مشرق ہے۔

(۵) حالاں کہ مسافر خانہ اور سلطان پور کے نزدیک والا "دادرہ" لڑائی کے لیے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے لیکن ہم "دادرہ" کو "دورا ہا" مان لیں اس کی کوئی معقول وجہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ خصوصاً جب ایک مقام "دیردہ" (جو فارسی کا بگڑا ہوا لفظ دورا ہا ہے) جوہر کے بیان کی تائید میں آج بھی نقشہ میں موجود ہے اور جہاں سے مغل اور افغان فوجوں کا گزرنا زیادہ قرین قیاس

Marfat.com

اس لڑائی سے شیر خاں اور مغلوں کے باہمی تعلقات میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ اسے ہم پانی پت کی دوسری لڑائی کہہ سکتے ہیں اگرچہ پیمانے میں یہ اس سے کم تھی۔ اس جنگ میں بابر کے جانشین ہمایوں نے بابر کے فنون جنگ استعمال کر کے افغانوں کو شکست فاش دی اور ہمیشہ کے لیے لودی خاندان کے منصوبے خاک میں ملا دیے۔ اب تنہا شیر خاں ہی افغانوں کی گم گشتہ راہ امید کا مرکز رہ گیا۔ شیر کے دل میں پہلے سے ہی مغلوں کے خلاف بغض و نفرت تھی۔ اب اس کے خیالات نے ایک نیا موڑ لیا۔

اکبر کے دربار کے مورخ ابو الفضل۔ جوہر اور گلبدن بیگم نے اس لڑائی کے متعلق کم از کم واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ شیر خاں نے اس لڑائی میں کیا حصہ لیا اس کے متعلق وہ بالکل خاموش ہیں۔ انہوں نے یہ خاموشی شیر شاہ کی شہرت کی خاطر نہیں اختیار کی بلکہ ان کا مقصد تو تھا ہمایوں کی کامیابی میں چار چاند لگانا۔

ہے (دیکھیے ہمایوں بادشاہ صفحہ ۴۲۔ فٹ نوٹ ۲)۔

اس کے علاوہ پروفیسر ہودی والا نے ڈاکٹر بنرجی کے اس حوالہ پر کوئی رائے زنی نہیں کی ہے یہ بات قابل غور ہے کہ اگر جوہر کے نسخہ میں یہ لفظ "دادرہ" ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ فاضل مصنف کی توجہ اس طرف نہ جاتی لیکن پروفیسر موصوف نے اس لفظ کو ہماری ہی طرح "دررا ہا" پڑھا ہے۔ چونکہ مخزن نے اس لڑائی کو "جونپور کی لڑائی" سے موسوم کیا ہے اس لیے پروفیسر مذکور نے اس مقام کی تلاش جونپور کے نزدیک کی۔ اور جونپور کے نزدیک "دیروہ" کے مقام پر اس لڑائی کا ہونا دکھایا ہے۔ لیکن ہم پروفیسر موصوف کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے کیوں کہ یہ مقام کسی بھی شاہراہ عام کے نزدیک نہیں ہے جو اس زمانہ میں استعمال ہوتی تھیں (دیکھیے اسٹڈیز صفحہ ۴۵۰)

بہر حال اس مقام کو "دادرہ" تصور کرنا کسی حالت میں مناسب نہیں ہے زیادہ سے زیادہ اس سے عباس کے اس غلط بیان کی تائید ہوتی ہے کہ یہ لڑائی لکھنؤ کے نزدیک لڑی گئی تھی۔

Marfat.com

یہ کہنا نامناسب ہوگا کہ یہ تمام مورخ جانب دار تھے۔ چنانچہ ان کی خاموشی اس بات کی دلیل نہیں کہ افغان مورخین نے شیر شاہ کی غداری کا جو بیان دیا ہے وہ قابل اعتبار نہیں ہے۔ اگر واقعات کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔ کہ شیر خاں کے دامن پر غداری و ریاکاری کا الزام درست ہے۔ شکستہ افغانوں کا یہ نعرہ کہ "ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا" بے معنی نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ میں پہلے سمجھتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ بروز جنگ شیر خاں کی فوج ترتیب اولین میں سلطان محمود کی فوج کے دائیں بازو پر تھی لیکن میدان جنگ میں شیر کے سپاہیوں نے پیٹھ پھیر لی۔ اور تمام میدان میں گڑبڑی پھیل گئی۔ (دیکھیے ڈارن۔ جلد ۱ صفحہ ۱۰۳-۱۰۲) اور غالباً یہی فعل اس حادثہ عظیم کا خاص سبب ہوا۔ آغاز جنگ ببن اور بایزید کے حملہ سے ہوا۔ یہ سردار سلطان محمود کی فوج کے داہنے بازو پر تھے۔ اور ہمایوں کی فوج کے مدمقابل۔ امید یہ کی جاتی تھی کہ شیر خاں بڑھتی ہوئی فوج کی امداد کرے گا لیکن شیر خاں نے فوراً حرکت تو کی مگر کی مخالف سمت میں۔ اس طرح افغان فوج کا قلب اور جرانغار جس گرداب ہلاکت میں پھنس گیا اس کا پورا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ خاص کر جب کہ ببن اور بایزید مارے جا چکے تھے اور جرانغار نیست و نابود ہو چکا تھا اور شیر خاں بھاگ چکا تھا۔

شیر خاں کی صفائی میں یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ شیر خاں نے ایسے نازک موقع پر اپنے اس عمل سے اپنی اور اپنے ہم وطنوں کی جان بچائی لیکن اس عذر و معذرت سے ہم شیر خاں کے دامن سے غداری کے داغ کو نہیں دھو سکتے اور نہ اس کے جرم کی نوعیت ہی کم ہو جاتی ہے۔ مگر ہماری رائے میں شیر خاں پر یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے قومی مدعا کے ساتھ غداری کی۔ قومی مدعا کا وجود ہی کہاں تھا؟ اگر تھا بھی تو شیر خاں کا اس پر یقین نہ تھا۔ ببن اور بایزید نے جو بابر اور ہمایوں سے جنگ کی اس کا اول مدعا تھا لکھنؤ اور اودھ میں اپنی متزلزل خود مختاری کا تحفظ ۱۵۳۰ء میں عیار اعظم ہمایوں نے تو دیوں

سروانیوں اور فرمولیوں کا اتحاد محض اس غرض سے کیا کہ اس کے ذریعہ وہ اپنے داماد اور کھلونا نما سلطان محمود کے نام پر مشرقی علاقہ میں اپنا وقار قائم کرے۔ اس میں چال یہ تھی کہ اس طرح وہ اپنے افغان وسوری دشمنوں کو نیست و نابود کر دے گا۔ پہلے تو شیر خاں نے نہایت ہی معقول رخ اختیار کیا مگر بعد میں اس کو اپنی انتظار کرنے والی پالیسی کو خیر باد کہنا پڑا۔ اور اس نے مغلوں کے مقابلہ میں سلطان اور اس کے متحدین کو ان کی قسمت پر چھوڑ دیا۔ شیر نے دیدہ و دانستہ اپنے توانا و غاصب حریفوں کو برباد کرنے کے لیے اپنا ہی طرز عمل اختیار کیا اور اس نے اپنا کام نہایت ہی ثابت قدمی سے کیا۔ اگر وہ قبل از وقت ذرا سی بھی لغزش کرتا یا جنگ شروع ہونے سے پہلے ہٹ جاتا تو افغان حسب معمول بھاگ کر اپنی جان بچا لیتے۔ جس طرز عمل کو اس نے اپنایا وہ صرف بدلہ لینے کی منشا سے نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک پولٹیکل اہمیت تھی۔ ایسی اہمیت جو صحیح و غلط میں امتیاز نہیں کرتی۔ شیر خان اس بات کو ہمایوں سے بہتر جانتا تھا کہ اس غداری کے عوض اس کو کیا انعام ملے گا۔[1]

سلطان محمود لودی کی فوج کو درہم برہم کرنے کے بعد ہمایوں نے گنگا اور گھاگرہ کے درمیانی علاقہ سے افغانوں کو بھگانا شروع کیا۔ اور نظام سلطنت کی از سر نو ترتیب دی۔ محمد سلطان مرزا کو قنوج کا علاقہ دیا گیا۔ محمد

---

[1] بن سعرات نے میری پہلی تصنیف "شیر شاہ" کا مطالعہ کیا ہوگا وہ میرے اس بیان سے سکتہ میں آگئے ہوں گے۔ کیوں کہ میں نے اس تصنیف میں شیر خاں کو غداری کے الزام سے بچانے کے لیے زبردست دلیلیں پیش کی تھیں۔ حالاں کہ کسی مورخ کے لیے اپنی غلطی کا اعتراف کرنا اس کی شہرت و ناموری کے لیے موزوں نہیں ہے۔ لیکن حقیقت زیادہ دن تک پس پردہ نہیں رہ سکتی۔ میں بڑے ادب کے ساتھ اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں اور شیر خاں کی صفائی میں جو دلائل پیش کیے تھے انہیں واپس لیتا ہوں۔ شیر شاہ۔ صفحہ ۳، ۷۔ ۵۔ شیر خاں کی غداری کے لیے باب پنجم کا مطالعہ کیجیے۔

Marfat.com

زماں مرزا جس کو شروع میں بہار اور بعد میں جونپور کا گورنر مقرر کیا تھا۔ دوبارہ بہار بھیج دیا گیا۔ سلطان جنید برلاس جس کو ہمایوں نے ۱۵۲۹ء میں جونپور سے بدل کر چنار بھیج دیا تھا واپس جونپور چلا گیا۔ ہمایوں کو محمد سلطان مرزا اور محمد زماں مرزا کی وفاداری پر شبہ نہیں تھا۔ اس لیے اس نے مصلحتاً اپنے ایک وفادار سردار تخت بغا چغتائی کا جو گلبدن بیگم کی بہن گل چہرہ بیگم کا شوہر تھا اودھ کے علاقہ پر تقرر کر دیا۔ اس میں لکھنؤ کا علاقہ بھی شامل تھا۔ اودھ کا علاقہ قنوج اور بہار کے درمیان واقع تھا۔ یہاں سے مرزاؤں پر نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ سلطان جنید برلاس کی جونپور پر تقرری ایک دانشمندانہ قدم تھا۔ کیونکہ ابھی تک افغانوں کی نقل و حرکت پہچاننے میں وہ سب سے زیادہ ماہر تھا۔

اس اثنا میں شہنشاہ ہمایوں نے میر ہندو بیگ کو شیر شاہ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ وہ چنار کے قلعہ کو بامصالحت و رضامندی اس کو سونپ دے۔ شیر خاں کو اس قدم کی پہلے سے ہی توقع تھی۔ چنانچہ وہ جلد ہی چنار واپس لوٹ آیا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر چنار کے قلعہ کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ ارادتاً ہندو بیگ کے ساتھ صلح کی گفت و شنید کو طول دیتا رہا تا کہ اس دوران میں وہ اپنی تیاریاں پوری کر لے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے افغانوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو میدانی علاقہ سے ہٹا کر پہاڑی علاقہ میں لے جائیں اور روہتاس و جھارکھنڈ (ضلع مرزاپور) کے دشوار گذار جنگلات میں جا کر پناہ لیں۔ اس نے چنار کی تمام شہری آبادی کو شہر خالی کرنے اور جھارکھنڈ کے جنگلات میں جا کر بسنے کا حکم دیا اور قلعہ کی حفاظت کے لیے ایک فوجی دستہ اپنے دوسرے لڑکے جلال خاں اور ایک فوجی دستہ جلال خاں بن جلو کی کمان میں مقرر کر دیا۔ ہمایوں نے اپنے چند سرداروں کو چنار کے قلعہ کا محاصرہ کرنے کے لیے پہلے سے ہی روانہ کر دیا تھا (مخزن صفحہ ۳۰۲) اور غالباً نومبر ۱۵۳۱ء میں وہ خود اس مہم کی کمان سنبھالنے آ پہونچا۔ زور شور کی لڑائی شروع ہو گئی۔ دونوں جلالوں نے مغل فوج پر بار بار اتنے سخت حملے کیے کہ مغلوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ چنار کے قلعہ کا جائے وقوع ایسا تھا کہ اس کو فتح کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ

Marfat.com

دریائی بیڑے کی مدد سے گنگا پار سے آنے والی قلعہ کی رسد بند کردی جائے۔ زمین کا وہ پتھریلا ٹکڑا جس سے ہو کر قلعہ کی باہری چہار دیواری تک پہنچا جاتا ہے۔ مشکل سے سو گز چوڑا تھا۔ اور اس لیے ایک کثیر تعداد میں فوج لے کر حملہ کرنا بے سود تھا۔ دریائے گنگا اور پہاڑی کے درمیان مغلوں نے جو ملکی ناکہ بندی کی تھی شیر خاں اس سے زیادہ دوری پر نہ تھا۔ وہ مغلوں سے لوہا لینے یا صلح کرنے دونوں میں سے کسی کام کے لیے مناسب موقع کی تاک میں تھا۔ دو تین مہینہ کے بعد ہمایوں کو یہ تشویشناک خبر ملی کہ مالوہ میں بہادر شاہ گجراتی کی نیت میں شر ہے اور وہ آگرہ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ باندھ رہا ہے۔ شیر خاں نے اس موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنا سفیر ہمایوں کے پاس بھیجا اور صلح کی یہ شرط رکھی کہ چنار کا قلعہ اس کے قبضہ میں ہی رہنے دیا جائے اس کے عوض میں وہ اپنے سب سے چھوٹے لڑکے عبدالرشید کو معہ ۵۰۰ سواروں کے بادشاہ کی خدمت میں بھیجے گا۔ ہمایوں کی یہ خواہش تھی کہ شیر خاں عبدالرشید (قطب خاں) کے بالعوض بڑے لڑکے جلال خاں کو مع اپنی فوج کے ساتھ بھیج دے۔ لیکن اس کے لیے شیر خاں نے انکار کر دیا۔ پھر بھی دونوں فریقین میں صلح ہو گئی اور ہمایوں چنار کے قلعہ سے باحزن و یاس دسمبر ۱۵۳۱ء میں واپس لوٹ آیا۔

مجموعی طور پر چنار کے محاصرہ میں ہمایوں خسارہ میں رہا اور پانی پت کی

۱؎ عباس صفحہ ۱۱۰، ۱۱۱۔ عباس نے تاریخی واقعہ کو بیان کرنے میں غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اس وقت زماں مرزا بیانہ کے قلعہ سے فرار ہو گیا۔ جس سے کہ ہمایوں کے دماغ میں تشویش پیدا ہو گئی اور وہ شیر شاہ سے صلح کرنے کو مجبور ہو گیا۔ لیکن یہ واقعہ چنار کی مہم سے ۳ سال بعد کا ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ باب میں دیکھیں گے۔

۲؎ درباری مورخ جو ہر نے اپنے آقا کی حمایت میں تاریخی واقعہ کو اپنی حسب مرضی توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں نہایت اطمینان سے لکھتا ہے "جب شیر خاں کو یہ علم ہو گیا کہ آج یا کل قلعہ اس کے قبضہ سے نکل جائے گا اس نے اطاعت قبول کر لی" (دیکھیے

Marfat.com

لڑائی کے بعد یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مغل افغانوں کے بالمقابل کسی قلعہ پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے ہمایوں کی اس ناکامیابی سے افغانوں کے پست حوصلے از سر نو بلند ہو گئے اور شیر خاں کی اس ظفرو کامرانی نے اس کے دامن سے دورا ہا کی لڑائی میں کی گئی غداری کے داغوں کو دھو دیا۔ ہمایوں کی پالیسی میں کوتاہ نظری اور ناعاقبت اندیشی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ شیر خاں ہی تنہا ایسا افغان سردار تھا۔ جس نے مغلوں کے ساتھ شروع سے رواداری اور وفاداری کا سلوک کیا تھا اور اگر احسان فراموش ہمایوں مصلحت سے کام لیتا اور اس کے ساتھ مزاحمت نہ کرتا تو غلط ہے کہ شیر ہمیشہ کے لیے مغلوں کا ایک فرماں بردار دوست بن جاتا۔

شیر خاں کی مخدوم عالم سے معاہدہ اور اسکا انجام

حسن جلال کی والدہ ... کے انتقال کے بعد لوانی سردار اور بھی سرکش ہو گئے۔ ان کے اور شیر خاں کے تعلقات میں کشیدگی ہو گئی۔ لیکن سلطان محمود کی آمد نے جو دونوں کے لیے مشترکہ مصیبت تھی کچھ عرصہ کے لیے باہمی بغض و نفاق کو مٹا دیا۔ جب یہ طوفان ختم ہوا تو لوانی سرداروں کو شیر خاں کی مدد رہنمائی کی اشد ضرورت پڑی۔ علاقہ میں امن و امان قائم رکھنے اور مغل گورنر زماں مرزا کو باہر رکھنے میں وہ شیر کی مدد کے محتاج تھے۔ چنانچہ اوائل ۱۵۳۲ء میں ہی انہوں نے شیر خاں کو دوبارہ نائب گورنر بنا دیا۔ لیکن سال کے آغاز سے ہی یہ ظاہر ہونے لگا کہ شیر خاں کے دن امن وامان سے نہ گذریں گے۔ بنگال کی سلطنت پر فکر و پریشانی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ زیرک اور ہر دلعزیز سلطان نصرت شاہ مغلوں کے خوف سے نجات پا کر عیاشی و نفس پرستی میں محو ہو گیا اور سلطنت

سرکار۔ جرہر باب ا۔ صفحہ ۶) گلبدن نے اسی بابت یہ لکھا ہے کہ ہمایوں کی والدہ محترمہ ماہم نے اپنے لاڈلے کے چنار فتح کرنے اور صحیح سلامت واپس آنے پر ایک بڑی دعوت دی۔ (ہمایوں نامہ۔ صفحہ ۱۱۳۔ ۱۱۴)

Marfat.com

کے مستقبل سے بے نیاز۔ اس کے چھوٹے بھائی عبداللہ محمود جس کو اس نے اپنے تخت کے وارث ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور قوی سالے مخدوم عالم میں وراثت کے مسئلہ کو لے کر رسہ کشی شروع ہو گئی۔ مخدوم عالم دریائے گنگا کے شمالی کنارے پر بلیا سے ترہت تک کے تمام علاقہ پر بہ حیثیت وائسرائے نصرت شاہ قابض تھا۔

۱۵۳۱ء میں ہمایوں نے مشرقی صوبہ جات کے خلاف جو فوج کشی کی تھی اس سے اس خطہ میں مغلوں کی طاقت میں اضافہ ہو گیا اور مخدوم عالم کو اپنے عقب میں دریائے گھاگرہ کی جانب سے خدشہ پیدا ہو گیا۔ مغلوں کی طاقت و اقتدار میں اضافہ ہونا شیر خاں کے لیے مستقل خطرہ کی ایک گھنٹی تھی۔ چنانچہ اس مشترکہ غنیم کے خوف نے دونوں جاہ طلب حوصلہ مند سرداروں کو متحد کر دیا۔ دونوں کے آقا کمزور تھے۔ لہٰذا دونوں نے یہ طے کر لیا کہ وہ ایک دوسرے کے ذاتی مقاصد کی تکمیل میں مدد کریں گے۔ لوہانی سرداروں کو مخدوم عالم اور شیر خاں کا اتحاد پسند نہ آیا کیونکہ وہ مخدوم عالم کو آنے والے زمانہ میں شیر خاں کے خلاف استعمال کرنا چاہتے تھے۔ لیکن شیر کی قسمت برابر اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ بہن اور بایزید کے انتقال کے بعد افغانوں میں سراسیمگی کا عالم تھا۔ بہت سے افغان معہ عیال و اطفال مال و متاع یا تو بنگال کی جانب بھاگ رہے تھے یا بندھیل کھنڈ کے جنگلوں میں پناہ گزیں ہو رہے تھے۔

جب مستغفی کا چھوٹا بھائی بایزید فارمولی سلطان محمد لودی کے ہم رکاب مغلوں سے جنگ کرنے گیا تھا بہار میں مستغفی فارمولی کی بیوہ بی بی فتح ملکہ اپنی جوان بھتیجی مہر سلطان کے ساتھ رہ گئی تھی۔ اس کو اپنے والد اور شوہر سے لاتعداد دولت ورثہ میں ملی تھی۔ اس نے اپنی دولت کا ایک حصہ بایزید کی حب الوطنی کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں صرف کیا۔ بایزید کی وفات کے بعد اس نے اپنے متعلقین اور دولت کو بہار کے جنگل بیابان منتقل کرنا شروع کر دیا۔ (عباس) اس کا آخری نصب العین بندھیل کھنڈ کے بھاٹہ ریوا علاقہ میں جانا تھا۔ (مخزن اور عباس نے اس مقام کو ہر جگہ غلطی سے پٹنہ لکھ دیا ہے)۔ یہاں سلطان محمود اپنے ایک دوست ہندو راجہ کے یہاں زندگی کے باقی ماندہ دن خلوت

Marfat.com

تنہا بسر کر رہا تھا لہٰذا[1] شیر خاں نے بی بی فتح ملک کو اس مخدوش قدم اٹھانے سے روکنے کی کوشش کی اور اس کو بتایا کہ بندھیل کھنڈ کی جانب جانا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ اس نے ملکہ کو یہ بھی یقین دلایا کہ وہ اس کی ہر ممکن طریقہ سے حفاظت کرے گا اور اس کی آزادی عمل اور دولت میں کوئی رخنہ اندازی نہیں کرے گا۔ فارمولی اور لودی قبیلہ کے دیگر افغانوں کو بھی اس نے اپنے یہاں ملازمت کرنے کی ترغیب دی اور اس طرح پورا سال لوہانیوں سے بغیر کسی مخالفت کے گزر گیا۔

سلطان نصرت شاہ کو ۹۳۹ ہجری مطابق دسمبر ۱۵۳۲ء[2] میں کسی نے قتل کر دیا۔ اس کا فرزند فیروز شاہ ان دنوں نابالغ تھا۔ اس کی جان اور دولت

---

[1] عباس خاں سروانی نے شیر خاں کے متعلق لکھا ہے (صفحہ ۱۲۱) کہ اس کی نیت میں فتور تھا۔ وہ افغان سرداروں کی دولت ہضم کرنا چاہتا تھا۔ شیر خاں کے ارادے بھی نیک نہیں تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح مکر و ریا سے فتح ملکہ کو اپنے اثر میں لانا چاہتا تھا۔ یہاں سروانی سور سوانح نگار سے بازی لے جاتا ہے۔

[2] ہجری ۹۳۹ سال ۱۳ اگست ۱۵۳۲ء کو شروع ہوتا ہے اور ۲۲ جولائی ۱۵۳۳ء کو ختم ہوتا ہے۔ علاؤالدین فیروز شاہ نے حسین آباد کی ٹکسال سے ۹۳۹ ہجری میں سکے جاری کیے۔ غیاث الدین محمود شاہ نے بھی اس سال میں اس ٹکسال سے سکے جاری کیے (ملاحظہ کیجیے۔ بھٹا سالی مضمون در ذخیرہ زمانہ ۱۹۳۰ء)۔ نصرت شاہ کے والد حسین شاہ کے زمانہ سے ہی حسین آباد بنگال کا ایک مشہور شہر تھا۔ حسین شاہ نے اپنا دارالسلطنت گوڑ سے اکدلہ منتقل کیا تھا۔ اکدلہ مقام جائے وقوع ضلع مالدہ میں پنڈوا سے ۲۳ میل بجانب شمال اور شمالی بنگال میں دیناجپور ضلع میں واقع گوڑ سے ۴۲ میل شمال ہے۔ غالباً حسین شاہ نے اکدلہ کا نام بدل کر حسین آباد رکھا تھا۔ جس لڑائی میں مخدوم عالم مارا گیا وہ اسی مقام کے قرب و جوار میں ہوئی ہوگی۔ ملاحظہ کیجیے۔ ہسٹری آف بنگال۔ ڈھاکہ یونیورسٹی جلد ۲۔ صفحہ ۱۰۱۔ فٹ نوٹ ۱۰۱۔

Marfat.com

زیر نور (؟) خطرہ میں تھیں کیوں کہ وہ اپنے چچا عبدالبدر کے زیر اثر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نصرت شاہ کے دوران حیات ہی عبدالبدر اپنے کو سلطان سمجھنے لگا تھا۔ اور اس نے بدر شاہ کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ مشرقی بنگال کے کچھ حصے بھی اس کے زیر تصرف تھے۔ جہاں ہجری ۹۳۷ھ مطابق ۱۵۳۰ء اس نے اپنے نام کے سکے بھی جاری کیے تھے۔ ماسوا مخدوم عالم کے جملہ افغان سردار اس کو نصرت شاہ کا ہونے والا جانشین تصور کرتے تھے۔ محض مخدوم عالم ہی ایک ایسا سردار تھا جس کی قوت بازو و ضرب شمشیر سے نصرت شاہ کا فرمان خریدنے تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ مقام موجودہ یو پی۔ کے ابیا ضلع ہیں ہے۔ مخدوم عالم کا صدر مقام حاجی پور تھا۔ جو آج کے پٹنہ شہر کے مقابل ہے ۱۵۲۶ء میں دریائے گھاگرہ کے کنارے بابر کی فوج سے کامیاب ٹکر لینے کے بعد اس کی عظمت در تبہ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ نصرت کے انتقال کے بعد اس نے فیروز کو گرڈ کے تخت پر بٹھا دیا۔ وہ اپنے اس قدم کے خطرات سے بھی آگاہ تھا۔ اور چنانچہ اس نے اس کے لیے دفاعی ذرائع بھی سوچ لیے تھے۔ اگر خدانخواستہ اس کی تجویز فیل ہو جائے اس نے شیر خاں کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنی فوج کے ہمراہ آکر اس سے ملے اور اپنا تمام خزانہ بھی گھاگرہ کے اس پار شیر خاں کی نگرانی کے لیے بھیج دیا۔ لیکن شیر خاں کوئی سادہ لوح افغان نہ تھا جو عزت و مدالست کی خاطر نار جہنم تک سفر کرنے کو تیار ہو جاتا۔ اس نے مخدوم عالم سے یہ کہہ کر معافی مانگ لی کہ وہ اس وقت لوہانیوں کی روز افزوں دشمنی کی وجہ سے بہار نہیں چھوڑ سکتا اور یہ حقیقت بھی تھی۔ البتہ اس نے ایک چھوٹی سی فوج میاں ہنسو کی کمان میں روانہ کر دی۔ میاں ہنسو عباس مصنف تاریخ شیر شاہی کے کسی مورث کا لڑکا تھا۔ عباس رقم طراز ہے۔

"قصہ کوتاہ۔ شیر خاں نے میاں ہنسو کو مخدوم عالم کی مدد کے لیے بھیجا۔ مخدوم عالم نے اپنا سارا مال و متاع شیر خاں کی تحویل میں بھیج دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ اگر جنگ میں فتح نصیب ہوئی تو اپنی تمام چیزیں واپس لے گا۔ فی الحال یہ سب تمہارے پاس زیادہ محفوظ رہیں گی۔" جب مخدوم عالم جنگ میں ہلاک ہو گیا اور میاں ہنسو زندہ واپس آ گیا تو تمام مال شیر خاں کے ہاتھ لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میاں

Marfat.com

ہنسو۔ شیر خاں اور لوہانیوں کے درمیان مخاصمت پیدا ہوگئی اور روز بروز جھگڑا اس حد تک پہنچ گیا کہ لوہانی شیر خاں کو قتل کرنے کی سوچنے لگے"۔ (عباس صفحہ ۷۹)۔

اب تک جو سکوں کی شہادت دستیاب ہوئی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۹۳۹ ہجری[1] میں تین معرکہ آرا واقعات ہوئے، نصرت شاہ کا قتل اس کے لڑکے علاؤالدین فیروز شاہ اور اس کے بھائی غیاث الدین محمود شاہ کی تخت نشینی۔ اس حساب سے ان واقعات کو اگست ۱۵۳۲ء کے پہلے ہفتہ سے لے کر جولائی ۱۵۳۳ء کے تیسرے ہفتہ تک محدود کیا جا سکتا ہے علیٰ ہذا مخدوم عالم نے غالباً جنوری سے مئی ۱۵۳۳ء کے وسط میں علاؤالدین فیروز شاہ کو تخت پر بٹھایا ہوگا اور اس کی حمایت میں محمد شاہ سے اکدلہ (جو شمالی بنگال کے دناجپور ضلع میں ہے) کے قرب و جوار میں آخری جنگ کی ہوگی۔ روایت یہ ہے کہ تخت پر بیٹھنے کے تین مہینہ بعد ہی فیروز کو اس کے چچا محمد شاہ نے قتل کر دیا۔ غالباً یہ واقعہ مخدوم عالم کی شکست و وفات کے بعد ہوا ہوگا۔ فیروز کے عہد حکومت کا آخری ثبوت ۲۷ مارچ ۱۵۳۳ء تک پہنچتا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حکومت مشرقی بنگال کے ضلع بردوان میں کلنا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس

---

[1] دیکھئے ہسٹری آف بنگال جلد دوم صفحہ ۱۵۹۔ فیروز کے عہد حکومت کی آخری تاریخ کا پتہ اس پتھر کے کتبہ سے چلتا ہے جو بردوان ضلع میں کلنا کے نزدیک پایا گیا ہے اور جس پر رمضان ۹۳۹ ہجری مطابق ۲۷ مارچ ۱۵۳۳ء کندہ ہے۔

[2] ڈاکٹر ایس کے۔ بنرجی نے بلا تنقید کے واقعات کا جو سلسلہ عباس سے نقل کیا ہے وہ بابر کی تزک سے مختلف ہے اور اس کی کوئی تفصیلی اہمیت بھی نہیں مثلاً ۱۵۲۸ء میں سکندر محمود اور دوزنی بی کی وفات۔ اگر یہ بات سچ ہے تو دودو نے ۱۱ اپریل ۱۵۲۹ء کو بابر کے پاس اطاعت کا خط کیسے بھیجا۔ (تزک صفحہ ۶۶۴) اس طرح بنرجی کی دی ہوئی دوسری تاریخیں بھی لغو ہیں اور کسی بحث کی محتاج نہیں۔ (دیکھیے ہمایوں بادشاہ صفحہ ۱۰۳)

Marfat.com

سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مخدوم عالم نے جو لڑائی فیروز کی حمایت میں لڑی تھی وہ غالباً اس سال کے ماہ مئی میں لڑی ہوگی۔ بنگال کے سلطان محمد شاہ نے اپنی تاج پوشی کے فوراً بعد ہی جون۔جولائی ۱۵۳۳ء میں لوہانی علاقہ پر جو حملہ کیا اس کی وجہ شیر خاں اور مخدوم عالم کا باہمی اتحاد تھا۔

شیر خاں کا بنگال کی حملہ آور فوج کو شکست دینا

مئی۔جون ۱۵۳۳ء

۱۵۳۳ء کے دوسرے حصہ میں بنگال کے سلطان محمود شاہ نے اپنے بھتیجے فیروز اور مخدوم عالم کو پامال کرنے کے بعد شیر خاں اور بہار کی لوہانی ریاست کی طرف رخ کیا۔ مونگیر کے وائسرائے قطب خاں محمود کی کمان میں ایک فوج مونگیر میں جمع ہو رہی تھی۔ یہ صورت حال شیر شاہ کے لیے نہایت تشویشناک اور پریشان کن تھی۔ مخالف لوہانی سردار اپنی جگہ بہت خوش تھے۔ کیوں کہ وہ ہر قیمت پر شیر خاں کو ہٹانا چاہتے تھے۔ شیر خاں نے افغان مہاجرین کو بھی تنخواہ دے کر جلدی سے ایک فوج تیار کی اور لوہانیوں کے ایک طبقہ کو اپنے ساتھ آنے کے لیے آمادہ کر لیا۔ اور اپنی حکمت عملی سے جنگ کو ٹالنا چاہا۔ اس نے بنگال کے سلطان سے یہ اپیل کی کہ وہ نابالغ جلال کی سلطنت کو ہڑپنے کی کوشش سے باز آئے۔ کیوں کہ اس کے والد اور جد بنگال کے سلطان حسین شاہ اور نصرت شاہ کے ہمیشہ سے فرماں بردار و معاون حکومت رہے تھے۔ پر محمود شاہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ مونگیر کے سپہ سالار قطب خاں نے ایک کثیر تعداد فوج کے ساتھ سرحد کو پار کر لی۔ اس پر شیر خاں لوہانی دار الحکومت کو حملہ سے بچانے کے لیے حملہ آور فوج کا سد راہ بن گیا۔

شیر خاں نے اس حملہ آور فوج کا کس حکمت عملی سے مقابلہ کیا اس کے متعلق عباس اور مخزن نے کچھ واقعات دیے ہیں۔ تاریخ داؤدی کے مصنف عبداللہ نے (جو جہانگیر کے زمانہ میں لکھی گئی تھی) شیر کی فوجی قابلیت

Marfat.com

کا اچھا خاصہ تذکرہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ قطب خاں نے کس ہوشیاری سے اس گرفت سے نکل جانے والے شیر کو بہار سے باہر نکالا۔ عبداللہ یوں رقم طراز ہے۔

"شیر خاں اور اس کے افغان سرداروں نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ باترتیب کھلے میدان میں آکر بنگال کے قطب خاں جیسے قوی دشمن کی فوج سے زور آزمائی نہ کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے غیر مسلسل حملوں سے قطب خاں کی فوج کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ جس سمت بھی بنگال کی فوج پیش قدمی کرتی شیر خاں کے سپاہی گھوڑوں پر سوار تیار اور باخبر نظر آتے۔ ایک روز شیر خاں میدان میں آیا لیکن دور ہی دور قطب خاں کی فوج کے زیر نگاہ کوچ کرتا رہا۔ کئی روز اس طور پر گذر گئے۔ اور لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ قطب خاں کو یقین ہو چلا کہ شیر خاں میں اس سے مقابلہ کرنے کی قدرت نہیں لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ اسے بہار کی سرحد سے ہی باہر کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ متواتر شیر خاں کا پیچھا کرتا رہا۔ جب شیر خاں ایک منزل آگے بڑھ جاتا تو سلطان کی فوج بھی ایک منزل آگے آجاتی۔" (داؤدی سرکار صفحہ ۱۷۲)

ایک روز شیر خاں چپ چاپ اپنی فوج کی صف بندی کر کے قطب خاں پر ٹوٹ پڑا۔ خوب جم کر لڑائی ہوئی۔ بنگال کی فوج نے اپنی طاقت کا اچھا ثبوت دیا۔ شیر خاں کے پرانے رفیق شیخ اسماعیل سوری اور حبیب خاں کاکڑ نے غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ حبیب خاں کی بے چوک تیر اندازی نے قطب خاں کا کام تمام کر دیا۔ سپہ سالار کے مرتے ہی بنگال کی فوج جیسا کہ اس زمانہ میں ہند کی فوجوں کا عام رواج تھا حیران و ششدر بھاگ کھڑی ہوئی۔ بے شمار خزانہ، ہاتھی، توپخانہ، میدان جنگ میں ہی چھوڑ دیا۔ شیر خاں نے اسمٰعیل سوری اور حبیب خاں کو شجاعت خاں اور سرمست خاں کے خطاب سے سرفراز کیا۔ اور اس فتح کا سہرا ان کے سر پر ہی رکھا۔ شیر نے ہاتھی اور توپ خانہ کے علاوہ تمام مال غنیمت اپنے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا اور سورج گڑھ تک کا تمام علاقہ اپنے قبضہ میں کر لیا۔

Marfat.com

بہار سے لوہانی اور جلال خاں کا فرار ہونا

شیر کی اس غیر متوقع فتح سے لوہانی سردار حسد اور کینہ سے آگ بگولہ ہو گئے۔ قطب خاں کی شکست نے ان کی آرزوؤں کے سب منصوبے خاک میں ملا دیے۔ شیر خاں نے نہ تو مال غنیمت میں سے ہی ان کو کوئی حصہ دیا اور نہ بنگال کے علاقہ میں کوئی جاگیر ہی دی۔ ان کو شکایت تو تھی ہی اس سے بدتر تھی ان کی یاس و توہین۔ جلال خاں تقریباً بالغ ہو چلا تھا اور شیر خاں کی ولایت سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ لیکن شیر کی جڑیں اب اتنی گہری اور مضبوط پھیل چکی تھیں کہ ان کو جنبش دینا آسان کام نہ تھا۔ لوہانیوں کی سفاکانہ سازش سے شیر خاں کو ہر وقت اپنی جان کا خطرہ رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی حفاظت کے لیے مناسب پیش بندی کر رکھی تھی۔ وہ جب بھی جلال کے دربار میں حاضر ہوتا یا کسی کام سے باہر نکلتا۔ تو چار سو گھوڑ سوار اس کے ہمراہ ہوتے تھے (تاریخ داؤدی۔ سرکار قلمی نسخہ صفحہ ۱۰۰) لوہانی مفسدوں نے یہ سمجھ کر کہ کھلے دربار میں شیر خاں کو قتل کرنا ممکن نہیں اپنے ناپاک ارادہ کی تکمیل کے لیے ایک دوسری ترکیب نکالی۔ جلال خاں کو یہ بہانہ کرنا تھا کہ وہ علیل ہے۔ شیر خاں یقیناً اس کی مزاج پرسی کے لیے محل میں جائے گا۔ اور اپنے محافظ دستہ کو باہر چھوڑ جائے گا۔ جب وہ جلال خاں سے رخصت ہو کر محل کے ایک دروازہ سے نکل کر دوسرے دروازہ میں داخل ہو تو اسے قتل کر دیا جائے۔ کچھ لوہانی سردار جو درحقیقت شیر خاں سے اخلاص و انسیت رکھتے تھے وہاں موجود تھے انہوں نے شیر خاں کو لوہانیوں کے ناپاک ارادہ سے آگاہ کر دیا شیر خاں خود بھی گرگ بہ سرشت تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ اس کو پیشتر سے اس سازش کا علم نہ ہوتا۔

شیر خاں کسی نہ کسی بہانہ جلال خاں سے اپنی ملاقات ملتوی کرتا رہا اور آہستہ آہستہ اپنی فوجی طاقت کو بڑھاتا رہا۔ اس نے لوہانیوں میں نفاق کا بیج بو دیا اور اپنے لیے نئے طرف دار پیدا کر لیے۔ جب شیر خاں کو یقین ہو گیا کہ اب اس کے پاس اس قدر فوج ہے کہ لوہانی نہ تو اس کو کوئی ضرر پہونچا سکتے ہیں نہ اس

Marfat.com

کے خلاف لڑائی میں ہی جیت سکتے ہیں۔ تو اس نے جلال خاں کو لوہانیوں کے ناپاک ارادہ کے متعلق خبر دی۔ اس نے جلال خاں کو لکھا۔

"آپ بخوبی جانتے ہیں کہ بنگال کا بادشاہ آج یا کل آپ کے خلاف فوج کشی کی راہ دیکھ رہا ہے۔ تاکہ وہ بہار پر قبضہ کرے۔ لوہانیوں میں تین قسم کے لوگ ہیں۔ پہلے وہ جن کو آپ نے جاگیریں بخشی ہیں اور وہ فراغت اور آسودگی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ ان اضلاع کی طرف آنکھ لگائے ہیں جن پر آپ نے حال میں ہی قبضہ کیا ہے میں آپ کا خیر خواہ ہوں اور مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ اس روپیہ اور جاگیر کی مدد سے نئی فوج بھرتی کریں۔ تاکہ ہماری طاقت اس قدر مضبوط ہو جائے کہ دشمن ... ہماری فوج کو دیکھ کر پست ہو جائیں اسی لیے وہ (یعنی لوہانی سردار) میرے خلاف ... شاکی ہیں اور مجھے نقصان پہنچانے کے کوشاں ہیں۔ اگر آپ مجھے اپنا خیر خواہ سمجھتے ہیں اور آپ کو یقین ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں آپ ہی کی بھلائی کے لیے ہے تو آپ لوہانیوں کو تاکید کر دیں

او میرے متعلق اپنے خیالات پراگندہ نہ کریں اور مجھے ضرر پہنچانے کے منصوبے نہ بنائیں۔ نہ آپ ... لوہانی کی تسلط ... پر غور کرنا چاہیے اور نہ ان کے کہنے کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ آپ یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ سور قبیلہ کی تعداد لوہانیوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ افغانوں کی یہ خصلت ہے کہ اگر کسی افغان کے چار یا ... [illegible] ... سے افغان سے زیادہ ہوتے ہیں۔ تو وہ دوسروں کو قتل کرنے اور توہین کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ براہ کرم آپ مجھے اپنے محل کے اندرونی حصہ میں طلب نہ کریں اور اگر آپ مجھے طلب ہی کریں تو مجھے اپنے ساتھ محافظی دستہ رکھنے کی اجازت دیں۔" (غباں قلمی نسخہ صفحہ ۸۲۔ ۸۳)۔

شیر خاں سا شاگرد ریاکاری و زمانہ سازی کا فن اپنے استاد سے سیکھ چکا تھا چنانچہ اس نے مکر و فریب سے قسم کھا کر شیر خاں کو خواب غفلت میں سلا دیا یا ... کر ... شیر خاں اور لوہانیوں میں باہمی خلیج جلد از جلد وسیع ہو گئی جلال خاں قدرتاً بمقابلہ اپنے ذی اثر نائب اپنے قبیلہ کے بزرگوں کا زیادہ اعتماد کرتا تھا چنانچہ نظام ریاست ٹھپ ہو گیا۔ اور یہ افواہ پھیلنے لگی ۱۵۳۳ء کے

Marfat.com

موسم خزاں میں بنگال کی سمت سے بہار پر دوسرا حملہ ہونے والا ہے۔ اور ہمایوں کا بھی یہ ارادہ ہے کہ مشرقی علاقہ میں اس مقصد سے کہ شیر خاں کا حوصلہ پست کر دے اور بہار میں افغان اقتدار کا نام و نشان مٹا دے دوبارہ فوج کشی کرے۔

شیر خاں کے سپاہی اور مددگار اپنے آقا کے نہایت وفادار تھے وہ انہیں وقت پر تنخواہ دیتا تھا اور اس کی بدولت وہ جنگ میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو تو اپنی طاقت پر اتنا ناز تھا کہ وہ سرکش لوہانیوں سے کسی قسم کی مصالحت پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جلال خاں سے صاف صاف کہہ دو کہ وہ لوہانیوں کو اپنے دربار سے نکال دے اور ان کی جاگیر دوسرے سپاہیوں میں تقسیم کر دے[1] لیکن شیر خاں بذات خود دایرہ اعتدال پسندی میں رہا۔ اور اس نے بالآخر جلال خاں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ان کے درمیان کام کا بٹوارہ ہو جائے تاکہ ان میں سے ہر ایک فوج کے ساتھ پرخطر سرحد پر پہونچ کر وہاں کی نگرانی کرے اور خریف کے لگان کی قسط وصول کرے۔

لوہانی مجلس خاص نے غور و خوض کے بعد جلال خاں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ شیر خاں کی تجویز کو قبول کرے اور اس کو مغرب کی سمت میں اپنی جاگیر کو روانہ کر دے تاکہ وہ مغلوں کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھ سکے اور وہ خود بنگال کی فوج کا مقابلہ کریں گے۔ لیکن در پردہ لوہانی سرداروں کا اصل منشا یہ تھا کہ بہار

---

[1] بہار کے سیاسی شطرنج کے خاص مہروں سے یہ بیان دیوا کر عباس خاں نے شیر کے کردار کی ایک جھلک پیش کی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک لیڈر کی حیثیت سے شیر خاں اعتدال پسند تھا۔ اس کے پیروکاروں پر اس کا اثر روز افزوں تھا اور وہ سیاسی بساط کا ماہر تھا ایک مدبر کی طرح صلح پسند اور موقع شناس تھا۔ وہ اپنے سپاہیوں اور سرداروں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتا تھا کہ ان کو یہ معلوم ہو کہ وہ ہر ضروری معاملہ میں ان کی رائے لیتا ہے اور بدون باہمی صلاح و مشورہ کے کوئی کام نہیں کرتا ہے۔

Marfat.com

کا علاقہ بنگال کے سلطان کو بطور نذر یا تحفہ پیش کر دیں اور بعدازاں اس کی فوج میں شامل ہو کر اس علاقہ کو بطور جاگیر واپس لے لیں۔ (مخزن ڈارن جلد ا، صفحہ ۹۶-۹۷)۔

چنانچہ جلال خاں نے شیر خاں کو یہ لکھ دیا کہ وہ مال گذاری وصول کرنے اور مغلوں پر نظر رکھنے کا کام کرے اور بنگال کے سلطان کا مقابلہ وہ خود کرے گا۔ جلال خاں نے ایک عام دربار کیا اور شیر خاں کو ایک گھوڑا اور خلعت دے کر رخصت کر دیا۔ اس طرح شیر خاں اور اس کا شاگرد نہایت ہی خوش اسلوبی سے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ بعدازاں ان کو کوئی بھی موقع ایک دوسرے سے ملنے کا نہ ملا۔ اور دسمبر ۱۵۳۳ء کے موسم خزاں میں غیر رسمیہ طور پر شیر خاں کی ڈپٹی گورنری کا پراز واقعات زمانہ ختم ہو گیا۔

شیر خاں کا بہار میں ڈپٹی گورنری کا عہدہ اس کی آئندہ شہنشاہیت کے لیے ایک زینہ ثابت ہوا۔ اس کا منشا خود غرضی سے پُر تھا کیوں کہ وہ اس اقتدار سے دست بردار نہیں ہونا چاہتا تھا جس کی اس کو از حد چاہ تھی۔ وہ ایک ایماندار اور بااصول محافظ کی طرح جائز مالک کو اس کے حقوق حوالہ کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس کے کچھ کام تو قابل ملامت بھی ہیں مثلاً لوہانیوں میں اپنا گٹ بنانا اور خود پروری کے لیے سرکاری روپیہ صرف کرنا۔ اور اس سے بھی زیادہ سلطان محمود لودی سے اپنے واسطے بہار کی ریاست کا فرمان حاصل کرنا وغیرہ مجموعی طور پر اس کا کردار اخلاقی معیار پر پورا نہیں اترتا۔ ایپامنونڈاس اور جارج واشنگٹن کی طرح اس کا نصب العین اعلیٰ نہ تھا۔ لیکن اگر ہم اس کا مقابلہ مشرق کے معروف سرپرست وزیروں سے کریں تو شیر خاں قرطبہ کے المنظور سے کسی حالت میں بھی کم پایہ نہ تھا شیر کے طرز عمل میں ایسے خشک مزاج اخلاقی اصول کا رنگ تھا جیسا کہ ہم کو ابن الفرات جیسے بدنام وزیر میں دکھلائی پڑتا ہے اس کا علانیہ یہ مقولہ تھا اور وہ اس پر عمل بھی کرتا تھا کہ فرماں رواؤں کو گاہ گاہ گمراہ کر دینا چاہیے۔ تاکہ ان کو ایسے وزیروں کی مدد کی ضرورت پڑتی رہے کہ وہ مضرت کو دفع کریں۔ شیر خاں نے اشتعال انگیز حالات میں بھی اپنے لوہانی آقا کے خلاف کبھی زور آزمائی نہیں کی۔ یہ تاریخ کی

Marfat.com

ایک حقیقت ہے کہ اگر شیر خاں جلال خاں کی نابالغی میں اس کا محافظ و سرپرست نہ ہوتا تو آخری ۳ سالوں میں (۱۵۳۰ء سے ۱۵۳۳ء) لوہانی ریاست کا وجود ہی نقشہ سے مٹ جاتا۔ یا تو یہ سلطنت مغلوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتی یا سلطان بنگال کے حملے اسے نیست و نابود کر دیتے۔ مخزن نے شیر کے کارناموں پہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ [1] ۴ سال کے اندر شیر خاں بالکل خود مختار حکمراں بن گیا۔ اور فوج کی اکثریت اس سے وابستہ ہو گئی۔ اس نے ان کو طرح طرح کے انعام و اکرام دے کر اپنی طرف ملا لیا اس کا اثر اس پایہ پر پہونچ گیا کہ بہار کی سرحد میں اس کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی کوئی ہمت نہ کرتا تھا۔

---

[1] دیکھیے ڈارن۔ صفحہ ۹۳۔ یہ ۴ سال ۹۳۵ھ ہجری سے ۹۳۹ھ ہجری تک ہیں جب جلال خاں بھاگ کر محمود شاہ بنگال کے پاس چلا گیا۔

باب 5 ضمیمہ ۱

ہمایوں کی جنگ دورا ہا اور کالنجر کی مہم کی تاریخ

ہمایوں کے عہد حکومت کے پہلے ۳ سال یعنی ۳۰ دسمبر ۱۵۳۰ء لغایت ۱۵۳۳ء کے واقعات کے متعلق گلبدن بیگم۔ جوہر، ابوالفضل اور نظام الدین احمد جملہ مورخین میں اختلاف ہے نہ تو واقعات کا سلسلہ یکساں ہے نہ واقعات کی تاریخیں۔ موجودہ مورخین نے جنہوں نے کہ شیر شاہ اور ہمایوں کی سوانح عمریاں لکھی ہیں اس امر کی کوئی کوشش نہیں کی کہ گذشتہ مصنفین کے متضاد بیانات کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد ہم آہنگی پیدا کرنے۔ بلکہ وہ خود بھی مختلف نتائج نکالنے میں مصروف ہوگئے اور اکثر اس افراتفری کے زمانہ کا سلسلہ واقعات من مانے ڈھنگ سے بنا ڈالا۔ اب ہمیں اس الجھن کو دور کرنا ہے اور حتی الامکان متضاد بیانات کو چھان کر مشترکہ باتیں تلاش کرنی ہیں اور اس زمانہ کے تمام واقعات کو سلسلہ بہ سلسلہ وقت کے رشتہ میں پرونا ہے جس سے واقعات کی کڑی ایک دوسرے سے میل کھاجائے اور کوئی خلا باقی نہ رہے۔ یہ کام اور بھی اس لیے زیادہ ضروری ہے کہ تاریخ کا عام طالب علم اس سے مستفید ہو سکے اس کام کے لیے ہمیں کچھ دیر کیلیے اصل موضوع سے ہٹنا ہوگا حالاں کہ یہ فعل ناگوار خاطر ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنرجی نے اپنی تصنیف "ہمایوں بادشاہ" جلد۔۱ صفحہ ۱۲ میں لکھا ہے کہ ہمایوں نے کالنجر پر دوبارہ حملہ کیا۔ لیکن فارسی مورخین نے صرف ایک ہی حملہ کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے واقعات کا تاریخی سلسلہ مندرجہ ذیل قایم کیا ہے۔

(۱) ہمایوں کا بیماری سے شفایاب ہونا	مارچ ۱۵۳۰ء
(۲) کالنجر میں ہمایوں	مارچ لغایت اگست ۱۵۳۰ء
(۳) ہمایوں کی آگرہ کو واپسی	اگست ۱۵۳۰ء

Marfat.com

(۴) بابر کی وفات — ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء

(۵) ہمایوں کی تاجپوشی — ۳۰ دسمبر ۱۵۳۰ء

(۶) کالنجر کا دوسرا حملہ — جولائی۔ اگست ۱۵۳۲ء

(۷) ہمایوں کا چنار پہنچنا — ستمبر لغایت دسمبر ۱۵۳۲ء

ان جملہ تاریخوں میں بابر کی وفات اور ہمایوں کی تخت نشینی کی تاریخوں کے علاوہ باقی سب تاریخیں مشتبہ ہیں۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے دور اندیشی اور فراست سے کام لیتے ہوئے واقعات کی تاریخیں کم از کم لکھنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے واقعات کا سلسلہ مندرجہ ذیل طریقہ سے قلمبند کیا ہے۔

(۱) ہمایوں کے پہنچنے کے دوسرے روز بابر نے محسوس کیا کہ موت کا وقت نزدیک آ گیا ہے۔ (تاریخ ندارد ہے۔ گلبدن نے بھی یہی لکھا ہے)

(۲) تین دن بعد یعنی ہمایوں کے پہنچنے کے ۴ دن بعد ۲۶ تاریخ بروز سوموار بابر اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

(۳) ہمایوں تابڑ توڑ سنبھل سے لوٹا اور اس نے اپنے والد کو زندہ پایا۔

(۴) بادشاہ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ بہادر شاہ گجرات کے خلاف فوج کشی کرے۔ اور بندھیل کھنڈ کے مشہور قلعہ کالنجر پر حملہ کرے۔

(۵) کالنجر کے قیام کے دوران ہرکارے افغانوں کے متعلق تشویشناک خبریں پہنچا رہے تھے۔

(۶) دورہا کی جنگ جولائی ۱۵۳۱ء میں ہوئی۔ ڈاکٹر ایس۔ کے بنرجی کا بیان ہے کہ یہ جنگ ۱۵۳۲ء میں ہوئی یہ غلط ہے۔

(۷) ہمایوں آگرہ واپس لوٹا اور اس نے اپنی تاج پوشی کی سالگرہ ۱۹ دسمبر ۱۵۳۱ء کو منائی۔

ڈاکٹر ایشوری پرشاد اور بنرجی کی تاریخوں کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بقول بنرجی کالنجر کی منسوبی دوسری مہم اور دورا ہا کی لڑائی میں ایک سال کا فرق ہے۔ جب کہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے کہنے کے مطابق ہمایوں کالنجر کے محاصرہ سے براہ راست افغانوں سے جنگ کرنے دورا ہا گیا۔ یہ اختلاف اس قدر اہم ہے

Marfat.com

کہ ہم اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور ہمیں صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے دونوں فاضل مصنفین کے اصل ماخذ کو تلاش کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر ایس۔ کے بنرجی نے کالنجر کے دو حملوں کا ذکر کرنے میں اس لیے دھوکا کھایا کہ ان کا ایک پیر گلبدن بیگم کی ناؤ میں ہے اور دوسرا ابو الفضل کی ناؤ میں کالنجر کی پہلی لڑائی کے متعلق مارچ لغایت اگست ۱۵۳۱ء کے ماخذ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) گلبدن بیگم کا بیان کہ ہمایوں بابر کی شدید علالت کی خبر ملتے ہی فی الفور کالنجر سے آگرہ کو چل دیا۔ (ہمایوں نامہ صفحہ ۱۰۵۔ مسز بیورج) حالاں کہ ڈاکٹر موصوف نے کسی جگہ صاف صاف گلبدن بیگم کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن ان کا یہ بیان کہ ہمایوں کالنجر سے آگرہ آیا اس بات کی دلیل ہے (ہمایوں بادشاہ ۔۱۔ ۱۴) ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے جوہر کو نقل کیا ہے۔ کہ ہمایوں سنبھل سے آگرہ آیا۔

(۲) کالنجر کی چٹان کا ایک کتبہ۔ جس پر لکھا ہے "محمد ہمایوں بادشاہ غازی مورخہ ۲۹ رجب ۹۳۶ھ ہجری مطابق ۳۰ مارچ ۱۵۳۰ء۔

ڈاکٹر بنرجی اپنے بیان کی خود تردید کرتے ہیں اور یہ کہہ کر کالنجر کے راجہ نے مارچ ۱۵۳۰ء میں ہمایوں کی اطاعت قبول نہیں کی کتبہ کی تاریخ کو جھٹلا دیتے ہیں۔ اس لیے ان کو تاج پوشی کے بعد دوسرے حملہ کا ذکر کرنا پڑا۔ اس میں ہمایوں جولائی۔ اگست ۱۵۳۱ء میں مصروف رہا۔ تاج پوشی کے سال اوّل میں ڈاکٹر بنرجی اور ڈاکٹر ایشوری پرشاد دونوں ہی کا انحصار ابو الفضل کا بیان ہے۔ (مخزن کی سند صرف ضمنی ہے)۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کالنجر کی ان دو مہموں میں سے کون سی اصلی ہے اور کون سی فرضی۔ صحیح سوانح نگار کی حیثیت سے ابو الفضل کو سند ماننا ہی مناسب ہوگا اس صورت میں کیا گلبدن بیگم کا یہ کہنا کہ ۱۵۳۰ء میں ہمایوں کالنجر میں تھا اس کی سہو ہے اور کیا کالنجر کا کتبہ جعلی ہے۔ جس کتبہ پر کندہ الفاظ ہیں "ہمایوں بادشاہ غازی" جس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ ہمایوں باغی تھا جو کہ درحقیقت وہ نہیں تھا۔ ابو الفضل نے ایک جگہ ہمایوں کے متعلق بادشاہ غازی کا لقب جوڑا

Marfat.com

ہے اور اس کا تاج پوشی کے مابعد کا نام ناصر الدین ہمایوں کا حوالہ نہیں دیا۔
اس سے ہمایوں کے بادشاہ غازی خطاب کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ ہمایوں کے
دونوں سوانح نگاروں نے اس عبارت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ عبارت یہ
ہے۔

"جب کہ پر اسرار رسوم سے ہمایوں صحت یاب ہوگیا اور بابر فوراً بیمار
پڑ گیا۔ تب اس (بابر) نے اپنے امراء و وزراء کو طلب کیا اور ان سے عہد و
پیمان لیے کہ وہ سلطنت و ہمایوں کے وفادار رہیں گے۔ اس نے ہمایوں کو اپنا
ولی عہد و جانشین مقرر کیا اور اس کو تخت پر بٹھا دیا۔ جبکہ وہ خود تخت کے قریب
بستر پر بیمار پڑا تھا۔" اکبر نامہ بیورج۔ ا۔ ۲۷۶۔

ابوالفضل کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ بابر نے عین حیات ہی میں ہمایوں
کو تخت و تاج سونپ دیا تھا اور کالنجر پر حملہ کرنے سے پہلے ۱۵۳۰ء میں ہمایوں
تخت نشین ہو چکا تھا۔ اس بنا پر اس کتبہ کو جعلی نہیں کہا جا سکتا۔ اور اس وقت
ہمایوں کو اپنے لیے "بادشاہ غازی" کا لقب استعمال کرنے کا جائز حق حاصل ہو چکا
تھا۔ چنانچہ اس کتبہ کی تحریر کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ بات بھی قرین قیاس
ہے کہ اس تاریخ کے آس پاس ہمایوں نے کالنجر کا قلعہ بھی ضرور فتح کر لیا ہوگا۔
اور ابوالفضل نے ۱۵۳۱ء میں جس خراج دینے کا ذکر کیا ہے وہ ۱۲ من سونا بھی اس
وقت کالنجر کے راجہ نے بطور نذر و اطاعت ہمایوں کو دیا ہو گا۔ اگر یہ فتح اس
وقت نہ ہوئی ہوتی تو اس کتبہ کا وجود ہی نہ ہوتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے
کہ پھر ڈاکٹر بنرجی کو یہ لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ ہمایوں نے تخت نشینی
کے بعد دوبارہ کالنجر پر فوج کشی کی۔ بظاہر یہ بات بعید از قیاس ہے۔ ڈاکٹر
ایشوری پرشاد نے اس بارے میں زیادہ سمجھداری سے کام لیا ہے۔ انہوں نے
گلبدن بیگم کے بیان کو تو بالکل ہی مسترد کر دیا کہ ہمایوں کی تاجپوشی سے قبل کالنجر
پر فوج کشی ہوئی۔ لیکن ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ابوالفضل کا آدھے راستہ تک
ہی ساتھ دیا ہے اور اس کے بیان کے دوسرے حصہ کو مسترد کر دیا ہے۔ اس

Marfat.com

کا بیان ہے کہ چنار کا محاصرہ ہوا۔ اور بدرجہ مجبوری شیر خاں کو صلح کرنا پڑی اور اپنے سب سے چھوٹے لڑکے مسمی عبدالرشید (قطب خاں) کی کمان میں اسی سال.. ۵ سپاہیوں کا ایک دستہ بھیجنا پڑا۔ (دیکھیے اکبر نامہ۔ جلد اول۔ صفحات ۲۸۷۔ ۲۸۸) اس معاملہ میں ابوالفضل ہمارا صحیح رہبر نہیں ہے کیوں کہ اس نے جملہ واقعات کو بری طرح خلط ملط کر دیا ہے اور ان کے سلسلہ کو الٹ پلٹ کر دیا ہے مثلاً وہ لکھتا ہے۔

"۹۳۹ ہجری میں یعنی ہمایوں کی تخت نشینی کے دو سال بعد بتن اور بایزید نے بغاوت کی" اکبر نامہ۔ ا۔ ۲۸۹۔ ابوالفضل کا یہ لکھنا قطعاً بے معنی ہے جوہر اور گلبدن دونوں نے بتن اور بایزید کی موت ہمایوں کی حکومت کے پہلے سال میں دکھائی ہے۔ (۹۳۹ ہجری میں وہ قبر سے اٹھ کر کیسے بغاوت کر سکتے تھے) اور چنار کا محاصرہ بڑی لڑائی کے بعد دکھایا ہے۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ان واقعات کو ۱۵۳۱ء سے منسوب کالنجر حملہ سے جوڑ دیا ہے۔ اب صورت حال یہ بن گئی ہے کہ اگر ہم ابوالفضل کے بیان کے جز اول کو جس کا تعلق ۱۵۳۱ء کی کالنجر کی مہم سے ہے صحیح تصور کریں تو اس کے بیان کے دوسرے حصہ کو بھی صحیح ماننا ہوگا یعنی یہ کہ چنار کا حملہ بتن اور بایزید کی موت سے ۲ سال پیشتر ہوا۔ چنانچہ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم نے ہمایوں کے حکومت کے پہلے سال کے واقعات کے متعلق ابوالفضل کے بیان کو کلیتہً مسترد کر دیا۔ اور دورا ہا کی لڑائی کو جولائی ۱۵۳۱ء کے عنقریب دکھایا (دیکھیے شیر شاہ۔ صفحہ ۷۰)۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے بھی اس تاریخ کو صحیح تسلیم کر لیا ہے۔ دورا ہا کی لڑائی کی تاریخ کا تعین محض اندازہ سے کیا گیا تھا۔ بابر کی وفات کے بعد ہمایوں کو وہاں تک پہنچنے میں جون ۱۵۳۱ء تک تقریباً ایک ماہ کا عرصہ لگا ہوگا۔ پھر ایک ماہ اس لڑائی میں خرچ ہوا ہوگا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ لڑائی کی تیاری کرنے اور دریائے جمنا سے کر گومتی تک لکھنؤ اور جونپور کے درمیان ۲۵۰ میل کا سفر طے کرنے میں ہمایوں کو ۲ مہینہ سے زیادہ لگے ہوں گے۔ اس لیے بعد میں میں نے اس لڑائی کی تاریخ ستمبر ۱۵۳۱ء کے وسط میں قرار دی ہے۔ ڈاکٹر بنرجی نے اگست ۱۵۳۱ء میں جو کالنجر کا دوسرا محاصرہ دکھایا

Marfat.com

ہے ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہم اس کی تردید اس سے پیشتر ہی کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اس لڑائی کا ذکر ابوالفضل کے حوالہ سے کیا ہے۔ لیکن ابوالفضل نے انہیں گمراہ کر دیا ہے۔

جن حضرات کا ان دلائل کے بعد بھی یہ خیال ہے کہ ہمیں ابوالفضل کو سند ماننا چاہیے اور ڈاکٹر بنرجی اور ایشوری پرشاد نے کالنجر کے ۱۵۳۱ء کے محاصرہ کے متعلق جو لکھا ہے اسے صحیح تصور کر لینا چاہیے۔ ان کے لیے یہ واجب اور مناسب ہوگا کہ وہ اس حملہ کے اغراض اور مقاصد پر غور کریں۔ ہمیں اس معاملہ میں ہمایوں کی سوانح عمری لکھنے والے فاضل مصنفین کی جانب رجوع کرنا چاہیے۔

(۱) مارچ ۱۵۳۱ء میں کالنجر پر کیے گئے حملہ کے متعلق ڈاکٹر بنرجی کا بیان ہے کہ شہزادہ ہمایوں اس وقت ۲۲ سال کا ناتجربہ کار نوجوان تھا۔ اس نے بابر کی علالت کو قابل فکر نہ سمجھا اور وہ کالنجر کی مہم پر چلدیا۔ (وہی۔ صفحہ ۱۴)۔

(۲) کالنجر سے منسوب شدہ دوسرے حملہ کے متعلق وہ لکھتے ہیں "ہمایوں کے لیے یہ لازم تھا کہ وہ اپنے ہمراہیوں اور پیروکاروں کو اپنی قابلیت اور مردانگی دکھانے کے لیے کوئی قابل ذکر فتح حاصل کرے۔ (وہی جلد۔۱۔ صفحہ ۴۴)

(۳) ڈاکٹر ایشوری پرشاد جنہوں نے کالنجر کا حملہ ۱۵۳۱ء کے پہلے نصف میں صحیح طور پر دکھایا ہے لکھتے ہیں "بادشاہ نے ارادہ کیا کہ بہادر شاہ کے خلاف فوج کشی کی جائے۔ اور اس غرض سے ۱۵۳۱ء میں بندھیل کھنڈ میں واقع کالنجر کے عظیم الشان قلعہ پر حملہ کیا۔ یہ قلعہ ایسی جگہ واقع تھا جہاں سے مالوہ آسانی سے پہونچا جا سکتا تھا اور گجرات کے خلاف مہم آرائی کی جا سکتی تھی۔ (ہمایوں۔ صفحہ ۴۹)۔ (خط کشیدہ الفاظ میری جانب سے ہیں)۔

مندرجہ بالا وجوہات اور دلائل جو ہمایوں کے فاضل سوانح نگاروں نے پیش کیے ہیں تنقیدی مطالعہ کے بعد بے بنیاد اور لغو ثابت ہوتے ہیں ہمیں اس ضمن میں مندرجہ ذیل حقیقت پر غور کرنا چاہیے۔

(۱) بابر نے ہمایوں کی شفایابی کے لیے کتنی دعائیں مانگی تھیں حتیٰ کہ اس نے خود اپنی زندگی ہی داؤ پر لگا دی تھی۔ کیا یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں

Marfat.com

جس کو ان سب حالات کا علم تھا۔ بابر کی علالت کو قابل فکر نہ سمجھتا اور محض اپنا شوق پورا کرنے کے لیے یا کالنجر کے خزانہ پر قبضہ کرنے کے لیے اپنے والد کو یوں چھوڑ جاتا ؟

(۲) کالنجر کے جس کتبہ کا پہلے ذکر کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ۱۵۳۱ء میں کیا گیا حملہ مکمل کامیاب رہا۔

(۳) ہمایوں کی تاج پوشی کے بعد کیا اس قسم کے اہم مسائل کی کچھ کمی تھی کہ ہمایوں محض کالنجر کو فتح کر کے ہی اپنی قابلیت کے جوہر دکھا سکتا تھا۔؟

(۴) جہاں تک کالنجر کے حملہ کے اغراض و مقاصد کا تعلق ہے ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی بات اور بھی کم فہم اور بعید از عقل ہے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ۱۵۳۱ء کے شروع میں بہادر شاہ نے اپنا دائرہ اثر راجپوتانہ کی جانب بڑھانا چاہا۔ (ہمایوں۔ صفحہ ۴۸) اب کالنجر کے جائے وقوع پر غور کیجیے۔ اس وقت مانڈو (جنوبی مالوہ) کی خلجی ریاست جس پر کہ گجرات کا بہادر شاہ تصرف کر چکا تھا اور بندھیل کھنڈ میں واقع قلعہ کالنجر (وہ نقطہ جس کو ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی رائے کے مطابق ہمایوں نے اپنے حملہ کے لیے چنا تھا) کے مابین چندیری سے لے کر مغلیائی علاقہ اور بندھیل کھنڈ کا سارا دشوار گذار علاقہ تھا۔ کالنجر ہنوز ہندوستان کے نقشہ پر موجود ہے۔ فنون جنگ کے ماہر بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیا آگرہ سے کالنجر ہو کر گجرات پر فوج کشی کرنا کوئی دانشمندانہ کام ہے۔ ایسے شیخ چلی کے منصوبے صرف وہ شخص ہی بنا سکتا ہے جو عملی دنیا سے دور محض کاغذ پر ہی میدان رزم تصور کر لیتا ہے۔

لیکن صرف تخریبی تنقید سے اضافہ علم نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ہمایوں نے ۱۵۳۱ء میں کالنجر کے قلعہ پر کیوں حملہ کیا۔ کیوں کہ یہ حملہ تاریخی حقیقت ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر فرد اس سے بخوبی واقف ہے کہ ۱۵۲۶ء سے ۱۵۲۹ء کے دوران مغلوں کو مشرقی علاقہ میں اپنی متزلزل حکومت کو مستحکم رکھنے کے لیے ہر سال فوج کشی کرنا پڑتی تھی۔ جون ۱۵۲۹ء میں بتن اور بایزید جو ابھی تک غیر مغلوب اور مغلوں کی گرفت سے باہر تھے ضلع ہمیر پور میں

Marfat.com

مہوبہ کی جانب فرار ہو گئے تھے۔ اس وقت بابر لاہور کے محاصرہ میں معروف تھا اور ہمایوں بیمار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۵۳۰ء کے شروع مہینہ تک ان کیخلاف کوئی کارروائی نہ ہو سکی۔ روبہ صحت ہمایوں کا اپنے علیل والد کو چھوڑ کر اس وقت مہم پر جانا اس بات کی دلیل ہے کہ اس علاقہ میں باغی افغانوں کی حرکت سے اس قسم کی سخت ضرورت پیش آ گئی ہوگی اور یہ بات قرین قیاس ہے کہ خود بابر نے ہی ہمایوں کو حکم دیا کہ وہ مہوبہ جا کر باغیوں کی سرکوبی کرے اور ان کو اس علاقہ سے نکال باہر کرے۔ اس مہم کے دوران ہمایوں باغیوں کا تعاقب کرتے ہوئے کالنجر تک پہونچ گیا ہوگا۔ جہاں کا راجہ صریحاً افغانوں کی سازش میں تھا۔ اور یہاں اس کو راجہ کے خلاف کامیابی نصیب ہوئی۔ جوہر اور گلبدن دونوں نے اس واقعہ کو باختصار بیان کیا ہے اور چوں کہ اس کا تذکرہ محض اپنی یادداشت سے ہی کیا ہے اس لیے جگہ بہ جگہ متضاد باتیں آ گئی ہیں۔ ابوالفضل نے اپنے بیان سے اس الجھن میں اور بھی زیادہ پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔

۱۵۳۰ء کی کالنجر کی مہم اور دورا ہا کی لڑائی کے درمیان ہمایوں کی زندگی میں کیا واقعات پیش آئے اس کے متعلق اس کے سوانح نگاروں میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر بنرجی گلبدن بیگم کی نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمایوں کالنجر سے آگرہ لوٹا۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد جوہر کی تقلید میں فرماتے ہیں کہ وہ سنبھل سے آگرہ آیا۔ ہماری رائے میں مارچ اور دسمبر ۱۵۳۰ء کے درمیان ہمایوں کا دونوں جگہ ہونا ممکن ہے۔ یہ اغلب ہے کہ کالنجر کی فتح کے بعد ہمایوں یا تو بتن و بایزید کے تعاقب میں یا کسی دیگر وجہ سے مرزاپور ضلع سے گذرتا ہوا اپنی جاگیر سنبھل چلا گیا ہو۔ لہٰذا جوہر اور ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی رائے زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ ہمایوں سنبھل سے آگرہ گیا۔ حالاں کہ گلبدن کا بیان بھی غلط نہیں ہے کہ ہمایوں کالنجر گیا اور وہاں سے آگرہ واپس آیا۔ البتہ اس کی اس رائے سے ہم متفق نہیں ہیں کہ وہ بابر کی موت سے پہلے سے ہی آگرہ میں موجود تھا۔ ڈاکٹر بنرجی اور ایشوری پرشاد دونوں اسکے متعلق خاموش ہیں کہ بابر کی وفات

Marfat.com

اور ہمایوں کی تخت نشینی کے مابین چار دن کا وقفہ کیوں پڑا۔ یہ بات غیر معمولی اور شاہی رسم تاج پوشی کے خلاف ہے خصوصاً جب کہ دونوں فاضل مصنف اس بات سے اتفاق رکھتے ہیں کہ ہمایوں بابر کی وفات کے وقت وہیں موجود تھا۔ حالاں کہ ان کے پاس اپنے اس بیان کی تائید میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔

نہ ان قابل مصنفین نے اس کی کوئی وجہ پیش کی ہے کہ ہمایوں اگست ۱۵۳۰ء لغایت دسمبر ۱۵۳۰ء آگرہ سے ایسے نازک موقع پر متواتر کیوں غیر حاضر رہا۔ بظاہر اس کا یہ فعل غیر فرزانہ تھا۔ ایک طرف بابر بحالت علالت شدید بستر پر پڑا تھا۔ دوسری طرف میر خلیفہ ہمایوں کو تخت سے محروم رکھنے اور خود پرست و خود بیں احمق مہدی خواجہ کو تخت پر بٹھانے کے لیے سازش کر رہا تھا۔[1]

ہمایوں کی والدہ ماہم اس وقت آگرہ میں موجود تھیں۔ اسی کے توسل سے ہمایوں کو دربار میں ہونے والے تمام واقعات کا علم ہوتا ہوگا۔ ان حالات میں ہمایوں کی ظاہرہ بے نیازی اور بے توجہی بابر کے وارث کی سیاسی کاہلی اور خوابیدگی نہیں تھی بلکہ ممکن ہے کہ ذی اثر میر خلیفہ کی سازش کے جال کو توڑنے میں ہمایوں نے اپنے کو بے چارہ سمجھ کر اپنی کشتی کو قسمت کے حوالہ پر چھوڑ دیا ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ؟۔ ڈاکٹر بنرجی کے اس بیان نے کہ اگست

---

[1] پروفیسر رشبرک ولیم کا بیان ہے کہ میر خلیفہ کی سازش کافی طویل عرصہ تک چلتی رہی۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد ان کی اس رائے سے متفق نہیں ہے۔ ان کی رائے میں اگرچہ یہ سازش عرصہ دراز تک چلتی تو شاہی خاندان کے بہت سے افراد کو اس کا علم ہوتا۔ اور اس کے تدارک کے لیے دفاعی قدم اٹھائے جاتے۔ لیکن ڈاکٹر موصوف کی یہ رائے بے وزن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس وقت بابر بستر علالت پر تھا وہ وقت اتنا نازک تھا کہ اگر بابر کو فی نفسہٖ اس سازش کا علم بھی ہو جاتا تو بھی غالباً وہ میر خلیفہ کے خلاف کوئی تعزیری قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ خصوصاً جب کہ تمام شریف عالی مرتبہ مرزا اس کی حمایت میں تھے۔ جس عقل و شعور سے پروفیسر موصوف نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے اس میں تنقید کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

Marfat.com

لغایت دسمبر ۱۵۳۰ء ہمایوں آگرہ میں مقیم تھا اس پیچیدگی کو اپنے لیے اور بھی پیچیدہ کر دیا ہے حالاں کہ ہمیں جوہر سے پتہ چلتا ہے کہ ہمایوں اس دوران بابر کی موت سے پہلے سنبھل میں تھا۔

اختصار سے اس بات کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ دونوں قابل مصنفین نے نظام الدین کے صحیح بیان کو کہ ہمایوں دراصل بابر کی وفات کے بعد آگرہ پہونچا تسلیم کرنے کی ہمت نہیں دکھائی۔ (دیکھیے ڈاکٹر ایشوری پرشاد۔ ہمایوں۔ صفحہ ۲۸۔ فٹ نوٹ ۱)۔ غالباً وہ مسز بیورج نے گلبدن بیگم کی حمایت میں جو نظام الدین کے خلاف تنقید نگاری کی ہے اس سے بھر گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابو الفضل۔ گلبدن۔ جوہر جملہ مورخین ہمایوں کے اس رویہ سے جو اس نے اپنے والد مرحوم کی آخری زندگی میں اختیار کیا تھا پریشان تھے۔ ہر مورخ نے ہمایوں کے لڑکے کا منظور نظر بننے کے لیے پاس داری سے کام لیا۔ اس لیے ان کے بیانات میں وہ ایمانداری اور سچائی نہیں ہے جو کہ نظام الدین کے بیان میں ہے۔ بابر کی وفات اور ہمایوں کی تاج پوشی کے دوران ۴ دن کے وقفہ کی کوئی وجہ معقول ہمارے پاس نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ ہم نظام الدین کا اعتبار کریں۔ بابر کی زندگی کے آخری وقت کا جو رقت آمیز نقشہ گلبدن نے پیش کیا ہے وہ اس کا محض ایک ادبی شاہکار ہے۔ حالاں کہ اس میں ارادۃً تصنع اور بناوٹ سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں جولائی یا اگست ۱۵۳۰ء میں آگرہ ضرور واپس آیا۔ جبکہ بابر کی حالت ابتر ہو گئی تھی۔ اس وقت گلبدن بیگم کے مطابق ہمایوں نے اپنے خیالات کا اظہار جن الفاظ میں کیا وہ یہ تھے۔

"میں تو ان کو بھلا چنگا چھوڑ کر گیا تھا۔ دفعتاً ان کی حالت میں یہ تبدیلی کیسے ہو گئی"۔ بظاہر ان الفاظ سے حقیقت جھلکتی ہے لیکن یہ بابر کی وفات سے ۵ مہینہ قبل کی بات ہے (ہمایوں نامہ۔ صفحہ ۱۰۵) یقیناً اس کے بعد کچھ اس قسم کے واقعات پیدا ہو گئے ہوں گے جن کی وجہ سے ہمایوں نے آگرہ میں رہنا خطرہ سے خالی نہ سمجھا ہو۔ اور وہ اپنی جاگیر سنبھل واپس چلا گیا۔ ہمایوں کو تخت

Marfat.com

سے محروم رکھنے کی سازش اگر کامیاب ہو جاتی، تو بلاشبہ خود میر خلیفہ اور بابر
کے خاندان کا نام و نشان صفحہ تاریخ سے مٹ جاتا۔ یہ قسمت کی خوبی تھی یا
حسن اتفاق کہ مہدی خواجہ کی حماقت سے اس سازش کا بھید کھل گیا۔ ایک روز
خواجہ جب کہ اس تجویز کے متعلق بآواز بلند بات کر رہا تھا نظام الدین کے والد کے
کان کھڑے ہو گئے۔ بہر حال اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پہلے ہمایوں جون یا جولائی ۱۵۳۰ء
میں کالنجر سے آگرہ آیا اور بابر کی وفات کے بعد سنبھل سے آگرہ آیا۔ یہ سب گڑبڑی
اس لیے ہوئی کہ جوہر اور گلبدن نے اختصار سے کام لیا۔ اور ابوالفضل نے تمام
واقعات کا سلسلہ الٹ پلٹ کر دیا۔ اور سچ کو چھپانے کی کوشش کی۔ مخزن کی شہادت
پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ بادشاہ ہمایوں نے کالنجر سے افغانوں کے خلاف فوج کشی کی
کیوں کہ درحقیقت مخزن کوئی غیر جانبدارانہ سند نہیں ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے
اس کا کچھ جز ابوالفضل سے اور کچھ عباس سے نقل کیا ہے۔ فاضل مصنف ڈاکٹر
ایشوری پرشاد نے ابوالفضل پر اعتبار کرنے میں عجلت سے کام لیا اور اس
وجہ سے وہ اس غلطی کے مرتکب ہوئے کہ ہمایوں تخت نشینی کے بعد پہلے کالنجر
گیا اور وہاں سے جونپور۔ (دیکھیے ہمایوں نامہ ۴۸-۴۹)

ڈاکٹر ایشوری پرشاد لکھتے ہیں "دوراہا کی لڑائی جولائی ۱۵۳۱ء
میں ہوئی نہ کہ ۱۵۳۲ء میں جیسا کہ ڈاکٹر ایس کے بنرجی کا خیال ہے اگر ڈاکٹر
موصوف کا خیال حق بجانب ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ بیک وقت ہمایوں آگرہ
اور کالنجر دونوں جگہ موجود ہوتا (گلبدن بیگم کے قول کے مطابق ہمایوں
اس لڑائی سے قبل ۶ مہینہ تک آگرہ میں موجود تھا) ڈاکٹر موصوف سے یہ غلطی محض اس
لیے ہوئی ہے کہ انھوں نے بھی ڈاکٹر بنرجی کے مانند ابوالفضل اور گلبدن دونوں کشتیوں
میں بہ یک وقت پیر رکھ لیے اور اس پر غور نہیں کیا کہ یہ دونوں کشتیاں ایک دوسرے
کی مخالف سمت میں بہہ رہی ہیں۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ناممکن کو ممکن بنانے کی
کوشش کی ہے یعنی تینوں واقعات کو کالنجر کی مہم — دوراہا کی لڑائی اور جونپور کا
محاصرہ ۱۵۳۱ء کے آخری ۳ مہینوں میں ہی لکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں انھوں نے نہ
تنہا ابوالفضل کا سہارا لیا اور نہ تنہا گلبدن کا بلکہ دونوں کو ایک جگہ خلط ملط کر دیا ہے۔

Marfat.com

باب 5 کا ضمیمہ 2

جنگ دوراہا میں شیر کی منسوباتی غداری پر تبصرہ

ابتدا میں شیر کی غداری کے متعلق میری رائے ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنرجی اور ایشوری پرشاد کی رائے سے مختلف تھی۔ میرا خیال تھا کہ شیر شاہ کو سلطان محمود لودی کی فوج کے ساتھ جانے کی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ (دیکھئے شیر شاہ صفحہ ۲۔۲۷) لہٰذا جنگ دوراہا میں غداری کا الزام اس پر عائد نہیں ہوتا۔ جیسا کہ عباس اور مصنف مخزن نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر بنرجی نے شروع میں شیر کی حمایت میں دلیل پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔ دوران جنگ افغان فوج کی نقل و حرکت کی کوئی ذمہ داری شیر پر عائد نہیں کی جا سکتی۔ وہ اس بات سے ناراض تھا کہ سلطان اس کی خدمات کا صحیح اعتراف نہیں کر رہا تھا۔ اس کو اس بات کا بھی علم تھا کہ بلا با قاعدہ اسلحہ جنگ سے آراستہ و منظم مغل فوج کے مقابلہ میں افغان کا لڑائی میں کیا انجام ہو گا۔ اس لیے اس نے ہمایوں کے سردار ہندو بیگ کو ایک خط بھیج کر اپنے اور اپنے ہم وطنوں کی جان بچانے کی کوشش کی تھی قانون گو کے اس خیال کی تردید میں کہ شیر خاں جنگ دوراہا میں موجود نہیں تھا۔ ڈاکٹر بنرجی مندرجہ ذیل وجوہات پیش کرتے ہیں۔

(۱) یہ ایک معرکہ کی مہم تھی۔ جس میں سب افغانوں نے طوعاً و کرہاً حصہ لیا عیسیٰ خاں، اعظم ہمایوں۔ شیر خاں وغیرہ سردار اس سے علیحدہ نہیں رہ سکتے سکتے۔

(۲) شیر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ سلطان لودی کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیتا۔ خصوصاً جبکہ سلطان خود اس کے پاس گیا تھا۔

Marfat.com

(۳) اس کا میدان جنگ سے فرار ہونا گو اصطلاحاً قوم کے ساتھ غداری تھی مگر بالآخر اس کا انجام اس کی قوم کے حق میں مفید رہا۔

(۴) شیر خاں اپنے آپ کو محافظ قوم تصور کرتا تھا اور کچھ حد تک یہ درست بھی تھا۔ وہ نالایق سلطان محمود لودی اور اس کے نااہل مشیروں کو نظر حقارت سے دیکھتا تھا۔

(۵) یہ فرض کرتے ہوئے بھی کہ تمام مورخین نے عباس کی نقل کی ہے اس کے بیان کو رد کرنا عقل سے بعید ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا مندرجہ بالا وجوہات اس قدر سنگین و معقول ہیں کہ ان سے میدان جنگ میں شیر کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔؟

(۱) ڈاکٹر بنرجی کی پہلی دلیل کے متعلق یہ بات قابل غور ہے کہ شیر خاں سروانی سرداروں سے متفق الرائے نہ تھا۔ یہ لوگ سلطان محمود لودی کے سامنے ہر وقت شیر خاں پر یہ الزام لگایا کرتے تھے کہ ریاکاری اور فریب دہی اس کا پیشہ ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ ان تینوں سرداروں کے درمیان مقاصد کی ہم آہنگی نہیں ہو سکتی تھی۔ اعظم ہمایوں سروانی (فتح خاں) پہلے خود متلون المزاج تھا۔ اس نے شروع میں بابر کے یہاں قسمت آزمائی کی۔ پھر سلطان محمود باطل دعویدار کا ساتھ دیا۔ بعد ازیں سلطان بہادر شاہ گجرات سے ساز باز کی اور بالآخر شیر خاں کے پاس گیا۔ (دیکھیئے شیر شاہ صفحہ ۱۲۸-۱۲۹)۔

(۲) اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شیر خاں نہایت ہی اعلیٰ شریف زادہ تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ سلطان کو محض اس لیے رہین منت کر سکا۔ چوں کہ سلطان بذات خود اس کے پاس گیا تھا۔ عباس صاف طور پر یہ کہتا ہے کہ سلطان شیر خاں پر کوئی احسان کرنے نہیں گیا تھا۔ بلکہ اس کے علاقہ میں جانا ایک بلائے ناگہانی کے مانند تھا۔ اور اس کا مقصد تھا۔ شیر خاں کو پریشان کر کے پنجے میں لانا۔

(۳) کیا تاریخ میں کوئی مثال ہے جب کسی غدار نے اپنے وطن اور ہم وطنوں کے ساتھ غداری کر کے جھوٹے آنسو بہائے ہوں؟ اگر شیر خاں غدار

Marfat.com

تھا تو یہ سب سے خراب بہانہ تھا جو کہ وہ پیش کر سکتا تھا۔

(۴) بے چارے تاریخ کا مطالعہ کرنے والے حضرات قدیم مورخوں کے بیانات کو مصلحت یا حکمت کی بنا پر خارج یا منظور نہیں کر سکتے۔ عباس کے بیان پر یقین کرنا کون سی عقل مندی ہوگی جب تک کہ ہمارے پاس کوئی معقول وجوہات اس پر اعتبار کرنے کے لیے نہ ہوں۔

اس موقع پر ڈاکٹر بنرجی نے جن الفاظ میں شیر خاں کی مدح سرائی کی ہے وہ اس کا مستحق نہیں "یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ شیر خاں جیسے فاتح (جس نے کئی مرتبہ کثیر التعداد بنگال فوج کو شکست دی تھی لے) کی موجودگی میں بھی افغان فوج میں بھگدڑ مچ گئی" (ہمایوں نامہ صفحہ ۴۳)۔

ہم اس کے متعلق صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں اگر شیر خاں نے نصرت شاہ کی فوج کو جسے اپنی زندگی میں بابر بھی نہ ہرا سکا اس کو شکست دیدی ہوتی تو پھر سلطان محمود کو جنوبی بہار میں اپنی صورت دکھانے کی بھی ہمت نہ ہوتی۔ ہمارے محترم مورخ ڈاکٹر ایشوری پرشادؒ نے ایک جگہ نہایت سنجیدگی سے بیان کیا ہے کہ ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنرجی نے ڈاکٹر قانون گو کے دلائل کی توتر دید کی ہے۔ مگر خود عباس کے بیان کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ (دیکھیے ہمایوں۔ صفحہ۔ ۵۰۔ فٹ نوٹ ۱) پھر بھی انہوں نے نہایت ایمانداری سے میرے دلائل کا صحیح اختصار کر کے ان کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ عباس نے جس تفصیل سے واقعات کو بیان

لے ۱۵۳۲ء سے پیشتر ایک بار بھی شیر خاں کو ایسا موقع نہیں ملا جب اس کا مقابلہ بنگال کی فوج سے ہوا ہو۔ ہرانا تو درکنار۔ ڈاکٹر بنرجی کے پیچیدہ سلسلہ واقعات کے مطابق شیر نے سلطان نصرت شاہ بنگال کی فوج کو ۱۵۲۹ء میں شکست دی۔ یہ وہ سال ہے جب کہ خود بابر بھی نصرت شاہ کے خلاف کوئی فیصلہ کن جنگ نہ کر سکا تھا۔ یہ کہنا ہی کافی ہے کہ ڈاکٹر پا سرن نے اپنی تحقیقات کی بنا پر ڈاکٹر بنرجی کو ایسی دلیل میں پھنسا دیا ہے کہ اب خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے ڈاکٹر بنرجی کی الجھی ہوئی تاریخوں کو درست نہیں کیا جا سکتا۔

Marfat.com

کیا اسے محض اس کی ایجاد نہیں سمجھا جا سکتا۔ (وہی صفحہ ۱۵)

اگر کوئی مصنف کسی واقعہ کے ۵۰ سال بعد اس کو اس قدر تفصیل و وضاحت سے بیان کرتا ہے تو خواہ مخواہ یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے اس میں نمک مرچ ملا دیا ہے۔ خصوصاً جب مصنف اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے افغانوں میں یہ عام بیماری ہے کہ جب وہ اپنی گذشتہ تاریخ کو بیان کرتے ہیں تو بلا تامل مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور نئی نئی باتیں اصل کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ علاوہ بریں عباس تصنیف تو کرنے بیٹھا تھا ایک تاریخ مگر لکھ گیا ایک تاریخی ناول۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک ناول نگار ہی کسی واقعہ کو وضاحت کے ساتھ بیان کر سکتا ہے اور من پسند طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔

—————— اس کو یہ ڈر نہیں رہتا کہ کسی گوشہ سے اس کے متضاد بیانوں کے خلاف آواز بلند ہو گی یا کوئی اس کے پیش کردہ واقعات پر تنقیدی تبصرہ کرے گا۔ عباس سروانی کی تاریخ کا اب تک یہی حشر ہوا ہے۔

ہمارے اختلاف و مباحثہ کی خاص وجہ یہ ہے کہ ہم نے اس زمانہ کی تاریخ کے بنیادی و ابتدائی ذرائعوں پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا ہے اور جن حالات میں شیرخاں نے منسوبائی غداری کی اس کے متعلق بھی ہمارے نظریوں میں اختلاف ہے۔ سب کچھ کہنے کے بعد بھی ڈاکٹر بنرجی کو ہی یہ فخر حاصل ہے کہ وہ جنگ دورا ہا میں شیرخاں کی موجودگی کے متعلق صداقت پر آن گرے۔ البتہ میرا یہ فرض ضرور ہے کہ میں اپنی پہلی رائے میں ترمیم کرنے کے لیے خود کے خلاف دلائل پیش کروں اور ان وجوہات کا ذکر کروں جس بنا پر میں نے اپنی رائے بدلی اور ڈاکٹر ایس۔ کے بنرجی کی رائے سے اتفاق کیا۔ میں نے پہلے اپنی تصنیف "شیر شاہ" میں اس کی حمایت میں لکھا تھا۔

(۱) یہ کہنا لغو ہو گا کہ ۱۵۳۱ء میں باغی سرداروں نے شیرخاں کو جو کہ اس وقت چنار کے قلعہ پر قابض تھا۔ اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

(۲) اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ دورا ہا کے مقام پر ہمایوں نے جس فوج کو ہرایا شیرخاں اس کے ساتھ نہ تھا۔

Marfat.com

جہاں تک میری پہلی دلیل کا سوال ہے یہ صحیح ہے کہ شیر خاں کو باغی سردار مجبور نہیں کر سکتے تھے (جیسا کہ آگے چل کر چنار میں ہمایوں کی ہار سے شیر شاہ کی طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے) لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ کیا شیر شاہ سلطان محمود لودی کے خلاف چنار کا محاصرہ برداشت کر سکتا تھا۔ دور اندیشی و سیاسی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ شیر شاہ یہ نوبت نہ آنے دے۔ چنار کا قلعہ شاہی قلعہ تھا۔ اگر شیر خاں اس پر ناجائز طریقہ سے قبضہ کر لیتا تو ظاہر تھا کہ کسی نہ کسی دن اس کو اس حرکت کے لیے مغل فوج سے لوہا لینا پڑتا۔ اگر شیر خاں اس وقت سلطان محمود لودی کے ہمراہ چلنے سے انکار کر دیتا تو وہ چکی کے دو پاٹوں کے درمیاں پس جاتا۔ ایک طرف تو اس کو محمود لودی اور اس کے افغان سرداروں سے فوراً مجبوراً جنگ کرنی پڑتی اور دوسری طرف مغلوں سے بھی جو اس کے دوست نہیں تھے لوہا لینا پڑتا۔ چنانچہ وقت کا تقاضا اغلب یہ ہی تھا جیسا کہ عباس نے بیان کیا ہے اور اس کو مان لینا چاہیے کہ شیر خاں لودی فوج کے ساتھ گیا خواہ اس کا یہ فعل بادل ناخواستہ تھا۔

(۲) گلبدن۔ جوہر اور ابو الفضل کا جنگ دورا ہا میں شیر خاں کی موجودگی کا ذکر نہ کرنا شیر خاں کی حمایت میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ مذکورہ بالا مصنف اکبر کے درباری مورخ تھے۔ ان کا یہ کہنا کہ جنگ دورا ہا میں ہمایوں کی کامیابی کا ایک سبب شیر خاں کی غداری بھی تھی ہمایوں کی عظمت کو کم کرنا ہوگا۔ جس کی درباری مورخین سے امید نہیں کی جاتی۔ علاوہ بریں اگر وہ اس بات کا ذکر کرتے تو بعد میں ہمایوں نے شیر خاں سے چنار کا قلعہ واپس لینے کے لیے جو قدم اٹھایا وہ قابل مذمت سمجھا جاتا۔ وہ سب شیر خاں کے فعل کی پردہ پوشی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ایسا شیر خاں کو بدنامی سے بچانے کے لیے نہیں بلکہ ہمایوں کی شہرت میں چار چاند لگانے کے لیے تھا۔

(۳) نظام الدین۔ فرشتہ اور بدایونی نے اپنی تصانیف میں جہاں ہمایوں کے عہد حکومت کا ذکر کیا ہے اس میں اس غداری کے متعلق کوئی حوالہ نہیں ہے لیکن جہاں شیر شاہ کے متعلق لکھا ہے وہاں یہ ذکر موجود ہے۔ اس بنا پر پہلے

Marfat.com

میرا یہ خیال تھا کہ جایز طور پر شبہ کا فائدہ شیر کو ملنا چاہیے۔ لیکن میرا یہ خیال بے معنی ہے (شیر شاہ صفحہ ۴۳-۴۷) اگر ہم اس عصر کے مورخین کی طرز سوانح نگاری کا مطالعہ کریں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہر مورخ نے کسی بادشاہ کے واقعات زندگی کے متعلق اس زمانہ کے کسی ایک مصنف کو سند مان لیا ہے۔ اور ان تصانیف سے اقتباس لے کر اپنی تاریخ مرتب کی ہے۔ مثلاً ہمایوں کی تاریخ لکھنے کے لیے ابوالفضل۔ شیر شاہ کی تاریخ لکھنے کے لیے عباس۔ انہوں نے اس بات پر کوئی توجہ نہیں کی کہ ان کے اس طرز تحریر سے متضاد بیانات تو نہیں ہو جاتے۔ یہ بات ہر خاص و عام پر ظاہر ہے کہ نظام الدین نے اپنی تاریخ لکھنے کے لیے ہمایوں کے عہد حکومت کے واقعات ابوالفضل سے اور شیر شاہ کے متعلق جملہ واقعات عباس سے نقل کیے ہیں۔ فرشتہ اور بدایونی نے اپنا تاریخی مواد نظام الدین سے فراہم کیا ہے۔ اس کے متعلق ایلفنسٹن کا حوالہ دینا بھی بے معنی ہے۔ ایلفنسٹن نے اگر اپنی تصنیف میں شیر خاں کی غداری کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس نے ارادتاً شیر کی حمایت کی ہے یا اسے اس الزام سے بری کر دیا ہے۔ بلکہ اس کی بنا محض یہ ہے کہ ایلفنسٹن اس باب میں ابوالفضل کا خوشہ چین ہے۔

مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر مجھے اپنی پہلی رائے میں ترمیم کرنی پڑی اور اس کے متعلق میں نے عباس کی جو سخت نکتہ چینی کی تھی اس کے لیے میں معافی کا خواستگار ہوں۔

Marfat.com

باب 6

سورج گڑھ کی لڑائی

(مارچ۔ اپریل ۱۵۳۴ء)

دو سمتوں میں جنگ کے بادلوں کا اجتماع

۱۵۳۳ء کی برسات کے بعد بنگال میں بڑے پیمانہ پر جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سلطان محمود غصہ سے آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ مقتول سرشکر قطب خاں کا لڑکا ابراہیم بھی انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ شیر خاں کو لوہانیوں کے ارادہ و نیت پر پہلے سے ہی شبہ تھا۔ جو بعد میں مناسب ثابت ہوا۔ لوہانی صدر مقام سے ۱۰۰ میل سے بھی کم فاصلہ پر جنگ کی جو عظیم الشان تیاریاں ہو رہی تھیں ان سے شیر خاں کے دشمنوں کو کامیابی کی توی امید تھی۔ لوہانی دہلی کی بہ نسبت گوڑ کی اطاعت بہتر سمجھتے تھے ان کی رائے میں شیر کی سخت گرفت سے بچنے اور اس سے انتقام لینے کا واحد ذریعہ یہ ہی تھا۔ شیر خاں سہسرام میں بیٹھا ہوا مغربی افق کا جائزہ لے رہا تھا۔ جو اس کے مستقبل کے لیے نیک فال نہ تھا۔ کیوں کہ شہنشاہ ہمایوں سال بھر کی حد سے زیادہ آرام طلبی اور تخیلانہ ایجادات کی تکان کے بعد جس کا کہ تفصیلی ذکر خواندہ میر نے "قانون ہمایونی" میں درج کیا ہے اس بات

Marfat.com

پر تلا ہوا تھا کہ مشرقی علاقہ میں مہم کرکے مفسدوں کی سرکوبی کرے اور مغل بادشاہ کی نظر میں شیر خان کا یہ خیال تھا کہ وہ سربرآوردہ مشتبہ غدار ہے۔

جب سے ۱۵۳۲ء میں ہمایوں چنار سے واپس لوٹا تھا وہ جنگ و سیاست کو خیرباد کہہ کر اپنا وقت عیش و آرام سے گزارنے لگا تھا۔ وہ سلطنت کے ضروری معاملات سے بھی غافل ہو چلا تھا۔ وہ ایک سال تک آگرہ میں مقیم رہا۔ اور کائنات کے شمسی المرکز اصول پر اپنے دربار کو آراستہ کرنے میں مصروف رہا۔ یعنی ایک ایسی کائنات جس کا فلکی مرکز سورج ہو اور ارضی مرکز دربار دہلی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام پر ہند و تہذیب و تمدن کی چھاپ کتنی گہری پڑنے لگی تھی۔ اور روشن خیال تیموری بادشاہ اس تہذیب سے کس قدر متاثر ہو گئے تھے۔ علم ہیئت و فلسفہ کے میدان میں ہمایوں کا دماغ ازحد اثر پذیر تھا۔ وہ بڑے شوق سے ہندو مسلم کلچر کے چشموں سے اپنی پیاس بجھا رہا تھا۔ ان دونوں تہذیبوں کا سنگم اب مغل دربار ہو چلا تھا۔ لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ اپنی تنگ نظری کی وجہ سے اس زمانہ کا انسان انسان کو ہی مرکز کائنات سمجھ بیٹھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بابر جیسا ذی القدر اور ممتاز بادشاہ بھی ہمایوں کے اخلاق، اطوار و عادات کو پسند نہیں کرتا تھا۔ بلکہ وہ اسے سنکی سمجھتا تھا۔

اب ہمایوں کا شاندار دربار سات سیاروں کا منطقتہ البروج بن گیا تھا۔ ہفتہ کے ساتوں دن کے نام ایک ایک سیارہ پر رکھے گئے تھے اور جو روز جس سیارہ کے لیے مقرر تھا اس روز درباریوں کو اسی کے مطابق پوشاک پہننی پڑتی تھی۔ شاہی دفتر کے کام کی تقسیم بھی چار عناصر کی بنا پر چار محکموں میں کی گئی تھی۔ آب۔ خاک۔ آتش۔ باد۔ (مسلمان پانچواں عنصر خلا کو نہیں مانتے) ہر محکمہ کے صدر کی پوشاک بھی مقرر کی گئی تھی جو اس محکمہ کے متعلق عنصر کی تھی۔ مثلاً داروغہ توپ خانہ و بارود اسلحہ میر آتش کے لیے سرخ رنگ کی پوشاک مقرر کی گئی تھی کیوں کہ آتش کا رنگ سرخ ہے۔ دربار کے امرا و سرداروں کے منصب اور عہدوں کا تعین بھی عجیب و غریب پر جدت طریقہ سے کیا گیا بادشاہ نے ۱۲ قسم

Marfat.com

کے سونے کے تیر بنوائے۔ یہ تیر سونے کی مقدار کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ ہر امیر و سردار کو اس کے عہدہ کے مطابق تیر دیا جاتا تھا۔ اور بادشاہ ظل الٰہی ان سب سے بالاتر تھا۔ غرض کہ بندہ تخیل ہمایوں کے کردار میں اپنے والد بابر سے زیادہ اپنے لڑکے اکبر کی جھلک تھی۔

اس وقت ہمایوں کے دربار میں ذی شان و ذی علم لوگوں کا ایک مجمع تھا۔ خواندہ میر مصنف "قانون ہمایونی" اور اس قسم کے دیگر علما اپنی ادبی تصانیف سے اس کے دربار کی رونق دوبالا کر رہے تھے۔ سنسکرت اور ہندی کے ادیب و شعرا اس کی فیاضی سے اپنا دامن بھر رہے تھے۔ ماہرین نجوم ہیئت کیمیاگر و ساحر کے لیے شاہی دربار ہر وقت کھلا تھا۔ ان کی قدردانی و عزت افزائی کی جاتی تھی۔ غالباً یہی وقت تھا جب ہمایوں شیخ بہلول کا مرید بنا۔ شیخ بہلول کو عوام شیخ پھول کے نام سے پکارتے تھے۔ اور وہ خیات کے مانند کرشمہ سازی کا استاد مانا جاتا تھا۔ گلبدن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس وقت بادشاہ کے دماغ پر افسردگی غالب تھی اور وہ تبدیل آب ہوا کے لیے گوالیار چلا گیا۔ حالاں کہ موجودہ مورخین سوانح نگاروں نے اس بات کو پردہ میں رکھ کر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بادشاہ گوالیار اس لیے گیا تھا کہ گجرات کے بادشاہ پر رعب غالب کرے۔

اس سیاسی خلا کے دوران ہمایوں نے محض ایک کام معرکتہ الآرا کیا۔ اس نے محرم ۹۴۰ھ ہجری مطابق جولائی۔ اگست ۱۵۳۳ء کو قدیم یدخال اندر پرست میں نئی دہلی کا سنگ بنیاد رکھا[1]

---

[1] ڈاکٹر ایس کے بنرجی کا خیال ہے کہ "دین پناہ" "شہر نو مہینہ میں مکمل ہوا۔ اور اس کے لیے بڑے پیمانہ پر جشن منایا گیا۔ (ہمایوں بادشاہ صفحہ ۶۲)۔ ڈاکٹر بنرجی لفظ "دین پناہ" سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہمایوں اس زمانہ کے ایران و توران کے بادشاہوں کی مانند متعصب و تنگ نظر نہیں تھا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہمایوں کا مدعا اس لفظ سے محض اسلام یا دین محمدی تھا۔ اس باب میں ڈاکٹر

Marfat.com

ہمایوں نے برادرانہ مشفقت و مروت میں اپنی پناہ کی بنیاد کو ہی کھوکھلا کر دیا۔ اس نے نہایت ہی ناعاقبت اندیشی سے دہلی سے ۴۰ میل دور ہریانہ کا علاقہ اپنے ریاکار و مکار بھائی کامران کو ایک قصیدہ کے انعام میں بخش دیا۔ یہ قصیدہ کامران نے بادشاہ ہمایوں کی مدح سرائی میں لکھا تھا۔ یہ علاقہ کابل قندھار پنجاب و ملتان کے علاوہ تھا۔ ان کو تو اس نے اپنی چالاکی

بنرجی کے دوسرے بیانات بھی اسی قدر دلچسپ ہیں۔

(۱) بہادر شاہ کا خیال تھا کہ یہ دین پناہ اور قلعہ کی تعمیر اس کے حملوں کا جواب ہے (وہی۔ صفحہ ۶۵)

(۲) "دین پناہ" کی تکمیل سے ہمایوں کا درجہ ہندوستان کے حکمرانوں میں اور زیادہ بلند و بالاتر ہو گیا۔ (وہی۔ صفحہ ۶۸)

(۳) ہمایوں کا خیال تھا کہ دین پناہ کی تعمیر سے بہادر شاہ کے حملوں پر روک لگ جائے گی۔ اور وہ قلیل عرصہ میں افغانوں کو مغلوب کرے گا۔ (وہی صفحہ ۷۰)۔

ڈاکٹر موصوف نے ہمایوں کے خیالات کا مطالعہ کرنے میں تخیل و جدت سے کام لیا ہے۔ جس کی داد غالباً ہمایوں ہی دے سکتا ہے۔ ہمایوں کی زندگی کے آئندہ ۲ سال کے واقعات ڈاکٹر صاحب کی رائے کی پر زور تائید کرتے ہیں۔ بہادر شاہ کی فتوحات اور حملوں کا جواب دہلی میں "دین پناہ" کی بنیاد سے نہیں دیا جا سکتا تھا۔ بلکہ اس کے لیے مناسب جگہ احمد آباد تھی۔ دین پناہ کی تکمیل سے کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ نہ شیر پر نہ بہادر شاہ پر۔ حتیٰ کہ ہمایوں کے باغی رشتہ دار محمد زماں مرزا وغیرہ ہمایوں کے خلاف بغاوت کرنے کی عین اس وقت تیاری کر رہے تھے جب کہ دین پناہ کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ (گلبدن) ایشوری پرشاد نے بغاوت کا سال ۱۵۳۳ء مقرر کیا ہے (ہمایوں۔ صفحہ ۶۴) بنرجی نے حسب معمول اس واقعہ کو ایک سال بعد دکھایا ہے جو درست نہیں ہے۔

Marfat.com

سے پہلے ہی اپنے تصرف میں کر لیا تھا۔ ادھر بادشاہ اپنی نئی ترنگوں میں مست تھا۔ گذشتہ سلطانوں کے سنگلاخ پر تعمیر شدہ پتھر کے قلعے شہنشاہ کو عالم مستی میں نہایت ہی بھدے اور بے جان معلوم پڑتے تھے۔ اعلیٰ حضرت عالم پناہ نے جیوں ہی جادو کی چھڑی گھمائی کہ جمنا کے پانی سے ایک تیرتا ہوا شہر رونما ہو گیا اس میں دو کانیں تھیں اور ایک بازار تھا۔ علاوہ بریں کاٹھ اور کنو اس سے بنا ہوا ایک سہ منزلہ قصر رواں اور ایک باغ بھی تھا۔ قصر میں دربار ہوتا تھا اور جشن بھی۔ خواندمیر نے ان کی تفصیل نہایت ہی فصاحت و بلاغت سے دی ہے۔

سیّاروں پر ٹکٹکی لگانے والا بادشاہ شاید یہ بھول گیا تھا کہ سورج و چاند کو بھی ایک دن گہن لگتا ہے۔ درباری سیاروں کے دائرہ سے باہر ہندوستان میں موذی راہو اور کیتو بھی موجود ہیں۔ جو ان روشن سیاروں کو نگلنے کو ہر وقت کمربستہ رہتے ہیں۔ (اعلیٰ حضرت بادشاہ اپنی تشبیہ سورج و چاند سے دیا کرتے تھے)۔ اس وقت یہ موذی ستارے مشرق میں شیر خاں اور مغرب میں بہادر شاہ تھے۔ ان دونوں میں بہادر شاہ شہابی اور تند خو تھا۔ اور شیر کم سخن۔ مگر ہمایوں کے تخت پر گھات لگائے تھا۔

جب ۱۵۳۱ء میں ہمایوں مشرقی صوبوں کی مہم سے واپس آ رہا تھا۔ تب ہی اس نے قنوج کا علاقہ سلطان مرزا اور بہار کا علاقہ محمد زماں مرزا کو سونپ دیا تھا۔ یہ تقرری اس نے اس خیال سے کی تھی کہ ان بے وفا سرکش تیموری سرداروں کی طاقت باغی افغانوں کے خلاف خرچ ہوتی رہے گی لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا انہوں نے شیر خاں سے مل کر قنوج اور جونپور میں دہلی کی حکومت سے آزاد ایک خود مختار ریاست بنانے کی ٹھان لی۔ یہی وجہ تھی کہ زماں مرزا نے اپنی فوج شیر خاں اور بہار کے لوہانیوں کے خلاف نہ لگا کر ہمایوں کے بہنوئی تخت بغا سلطان کے خلاف استعمال کرنی شروع کر دی بغا سلطان ہمایوں کی بہن گل چہرہ بیگم کا شوہر اور اودھ کا گورنر تھا۔ محمد سلطان مرزا نے ایک دیگر وفادار افسر حاجی محمد خاں کوکی کے والد کو قتل

Marfat.com

کردیا اور وہ بغاوت کی تیاریاں کرنے لگا۔ (گلبدن۔ صفحہ ۱۱۴)

مرزاؤں کی باغی حرکتوں کی وجہ سے ہمایوں کی توجہ بہار میں شیر کے روزافزوں اقتدار کی طرف نہ جاسکی۔ اس دوران میں شیر نے مخدوم عالم سے میل کرلیا تھا۔ اور قطب خاں نے بنگالی فوج کو ہرادیا تھا۔ اب شیر کے سامنے ہر دو محاذ پر خطرہ تھا۔ مغرب میں ہمایوں سے لڑائی کا اندیشہ تھا اور مشرق میں بنگال کے محمد شاہ سے ۱۵۳۳ء میں جب ہمایوں دین پناہ کی بنیاد ڈال چکا تو اس نے اپنی توجہ محمد زماں مرزا۔ محمد سلطان مرزا اور اس کے لڑکے الغ مرزا کی بغاوت کی طرف مبذول کی۔ شاہی فوج کی آمد کی خبر سن کر باغیوں نے دریائے گنگا کے مشرقی کنارے پر موجودہ فتح گڑھ کے سامنے اپنی فوجیں جما دیں۔ ہمیں اس مہم کے متعلق صرف اتنی ہی واقفیت ہے کہ شاہی فوج نے دریائے گنگا کے کنارے بھوجپور[1] مقام پر پڑاؤ ڈالا۔

---

[1] ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے بھوجپور مقام کا تعین کرنے میں غلطی کی ہے یہ مقام گنگا کے کنارے ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے بہار میں بکسرا اور چوسہ کے درمیان سمجھا ہے۔ جو "بھوجپور بہیا" ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے ہی ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ یادگار ناصر مرزا کو بہار بھیجا گیا۔ تاکہ وہ باغیوں کے گھروں میں جاکر ان کی سرکوبی کرے۔ (ہمایوں۔ صفحہ ۶۴) کسی بھی مستند تصنیف میں بہار کا حوالہ نہیں ہے۔ علاوہ بریں یہ بھی اغلب نہیں ہے کہ باغی مرزاؤں نے بہار میں پناہ لی ہو گی اور ہمایوں اس وقت بہار آیا ہو گا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو اسی وقت شیر خاں کا بھی صفایا ہو جاتا۔ جس بھوجپور کا ذکر ہے وہ مقام دریائے گنگا کے مشرقی کنارے پر ایک گھاٹ ہے جو قنوج سے ۲۴ میل شمال مشرق اور فتح گڑھ سے ۲۳ میل جنوب مشرق ہے۔ چوں کہ ہمایوں نے یادگار مرزا کو گنگا پار کرنے کا حکم دیا تھا اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ مقام جو اب گنگا کے مشرقی کنارے پر ہے اس وقت مغربی کنارے پر ہو گا۔ کیوں کہ اس علاقہ میں گذشتہ ۲۰۰ سال میں دریا نے کئی بار اپنا بہاؤ بدلا ہے۔

Marfat.com

یادگار ناصر مرزا کو دریا عبور کرنے کا حکم دیا۔ اور باغی مرزا گرفتار کر لیے گئے (اکبر نامہ۔ صفحہ ۲۸۹) مرزاؤں کی یہ بغاوت کس طرح ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ گئی یہ ایک معمہ ہے۔ یادگار ناصر مرزا بابر کا سب سے چھوٹا بھائی تھا۔ اسے خاندان والے اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ ممکن ہے اس نے صلح کی کوشش کی ہو۔ اور باغیوں کی جان کی سلامتی کی ذمہ داری لے لی ہو۔ اسی وجہ سے مرزا سرداروں نے بغیر لڑائی کے ہتھیار ڈال دیے ہوں۔ اور اطاعت قبول کر لی ہو۔ ہمایوں بھوجپور سے (یو۔پی میں ضلع فرخ آباد میں قنوج سے جانب شمال) فتح کی خوشی میں شادمان آگرہ لوٹ آیا۔ اس نے شیر کی نقل وحرکت پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ غالباً شیر نے اس وقت ہمایوں کی خدمت میں اپنے سفیر کے ذریعہ بیش بہا تحفے و نذر پیش کیے۔ اور اپنی وفاداری کے مظاہرہ سے اس کو دھوکہ دے دیا۔ یہ شیر کی خصلت تھی۔ وہ آنے والے سیلاب کے سامنے ہمیشہ اس طرح جھک جاتا تھا جیسا کہ پہاڑی رود کی روانی کے سامنے بید جھک جاتا ہے۔

اس طرح مغل طوفان اُڑ گیا اور شیر خاں کے لیے مغربی افق صاف ہو گیا ادھر ہمایوں اپنے غیر دانشمندانہ فعل کی وجہ سے بہادر شاہ گجراتی سے فوراً ہی الجھن میں پھنس گیا۔ ہمایوں کی گوناگوں جملہ خوبیوں کے باوجود جن کا تعلق ان کے دماغ سے نہ ہو کر دل سے تھا اس کی سرشت میں مغلوں کی سفاکی اور بیوفائی بدرجہ غایت موجود تھی۔ اور وہ کبھی کبھی ابل پڑتی تھی۔ اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ کس طرح یادگار مرزا کے توسل سے باغی مرزا سرداروں نے ہمایوں کی اطاعت تسلیم کر لی تھی۔ یادگار مرزا نے باغیوں کو ان کی جان کی سلامتی کا یقین دلایا تھا لیکن اب ہمایوں وعدہ شکن بن گیا۔ اس نے باغی مرزاؤں کو بیانہ کے قلعہ میں بند کر دیا۔ پھر یہ حکم دیا کہ ان میں سے کچھ کی آنکھوں میں سرئی پھونک دی جائے مرزا لوگ محافظوں کو رشوت دے کر قلعہ سے بھاگ نکلے۔ سلطان محمد زماں مرزا بھاگ کر گجرات پہونچا۔ محمد سلطان مرزا قنوج چلا گیا اور معلوم ہوتا ہے کہ یادگار مرزا بھی گجرات بھاگ گیا۔ ناصر مرزا نے دوران حراست باغیوں کے ساتھ دوستانہ سلوک کیا تھا۔ کیوں کہ غیرت و حمیت کا تقاضا تھا کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے اور

Marfat.com

بھتیجے کی قول شکنی سے ان کو بچائے۔ بہادر شاہ نے اس وقت شیطانی چال سے کام لیا۔ اس نے بادشاہ کے دماغ سے شکوک رفع کرنے کے لیے قیمتی نذر و تحفے بھیجے اور خط لکھ کر اس کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ اور دوستی و اطاعت کا وعدہ کیا۔

شیر خاں کی سورج گڑھ کی لڑائی میں فتح اور لوہانیوں کا فرار ہونا

قدرت نے شیر شاہ کے دشمنوں کو "چہ میکنم" کی حالت میں ڈال دیا۔ ان میں صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت جاتی رہی۔ بلا اپنی فوج کو بہار بھیجے ہوئے ہمایوں واپس ہو گیا۔ اور اس وقت جلال خاں اور اس کے لوہانی مددگار بہار سے چلدیے۔ (۱۵۳۳ء کی خزاں) شیر کے لیے میدان خالی ہو گیا۔ حالات کی اس موافق تبدیلی سے وہ بہت خوش ہوا۔ جلال خاں اور اس کے لوہانی ساتھیوں نے پہلے سے ہی نسر ... باندھ رکھا تھا چنانچہ جب شیر خاں سہسرام چلا گیا تو انہوں نے گویا جنگ کی تیاریاں شروع کیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ محمود شاہ سے ٹکر لیں گے۔ اور سرحد تک انہوں نے کوچ بھی کیا۔ بعد ہا۔ اپنے مال و مطاع کو لے کر وہ بنگال کے علاقہ میں داخل ہو گئے اور محمود شاہ کی پناہ میں آ گئے۔ وہ بھی اس امید سے کہ وہ محمد شاہ کی فوج کے دنبال میں فخر سے اتراتے گھر واپس آ جائیں گے۔

جلال خاں کے فرار ہونے نے شیر خاں کو ایک نازک صورت حال سے بچا لیا۔ ان کے اس فعل نے لوہانیوں اور ان کے جائز حاکم جلال خاں کو قومی غدار اور عوام دشمن کا جامہ پہنا دیا۔ اور اس کے برعکس غاصب شیر کو بنگال کے اشتعالی حملہ سے جو کہ غداروں کی ایما سے ہو رہا تھا بہار کی آزادی کے تحفظ کا لیڈر بنا دیا۔ باوجود اس موافق فضا کے اس کی معینوں کا پلہ ہنوز زیادہ بھاری تھا۔ اس کا مستقبل ابھی مشتبہ تھا۔ اس کی قسمت ترازو کے پلہ میں جھول رہی تھی۔ کیا پتہ کہ اگر گوڑ اور دہلی آپس میں مل جائیں تو کیا گل کھلے۔ چنانچہ وقت ہر لمحہ

Marfat.com

بیش قیمت تھا۔ اس نے پورے جوش و خروش سے فوج کو مسلح و مرتب کرنا شروع
کر دیا۔ اور اس خزانہ کی مدد سے جو اسے اپنی نئی دو بیویوں لاڈ ملکہ اور گوہر
گوسائیں سے ملا تھا اس نے بڑے پیمانہ پر فوج میں نئی بھرتی کی۔
بنگال کے سلطان نے اس دوسری مہم کا کمانڈر ابراہیم خاں کو تعینات
کیا۔ یہ اس قطب خاں کا لڑکا تھا جو کہ پہلی مہم میں مارا گیا تھا۔ مونگیر کا ناقابل تسخیر
قلعہ ہی بہار کے خلاف فوجی دوادوش کا مرکز بنایا گیا۔ گوڑ سے کمک لاکر
ابراہیم کی فوج کو اتنا مضبوط بنایا کہ شکست کا کوئی امکان باقی نہ رہ جائے۔
اس تیاری میں کئی ماہ صرف ہو گئے۔ ابراہیم کی فوج تعداد میں مقابلتہً کافی بڑی
تھی۔ اس میں پیادوں کا ایک جم غفیر تھا۔ ان کی مدد کے لیے فیل سوار اور توپخانہ
تھا۔ علاوہ بریں کشتیوں کا ایک بڑا بھی تھا جسکی امداد سے قلعہ میں براستہ دریا رسد
پہونچائی جا سکتی تھی اور حسب ضرورت پٹنہ سے بہار تک کسی بھی جگہ فوج کو حملہ کرنے
کے لیے لے جایا جا سکتا تھا۔ ۱۵۳۴ء کے موسم سرما میں شیر خاں بھی گھات لگائے
بیٹھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ قبل اس کے کہ بنگالی فوج قلعہ مونگیر سے باہر نکل کر
آئے وہ (شیر) اس پر حملہ کر دے۔ شیر خاں کی فوج میں زیادہ تر گھوڑ سوار تھے
کچھ ہاتھی تھے۔ ایک ہلکا سا توپ خانہ بھی تھا۔ کچھ بندوقچی تھے۔ مغلوں کی تقلید میں
اس نے اپنی فوج میں بندوقچی پیادوں کا بھی ایک دستہ مرتب کر لیا تھا حسب
معمول اس نے بہار کے بہت سے کسانوں کو بھی فوج میں شامل کر لیا تھا تاکہ
کسی کو یہ علم نہ ہو پائے کہ اس کے پاس جنگی فوج کی تعداد کم ہے۔ شیر کو یہ امید نہ
تھی کہ بہار کے خستہ قلعہ کا محاصرہ وہ جھیل سکے گا۔ اگرچہ اولین مسلم فاتحوں
نے اس کو اپنا صدر مقام بنایا تھا۔ مگر یہ ان کا غلط انتخاب تھا۔ بعد ہا شیر کی
حربی نگاہ راج گڑھ (راج گرم) اور پاٹلی پترا (پٹنہ) کے مقامات پر جا پڑی
یہ دونوں جگہیں اودنتی پور بہار کے مقابلہ میں کہیں زیادہ صوبائی صدر
مقام کے لیے موزوں تھیں۔ اودنتی پور سابق میں ایک یونیورسٹی قصبہ تھا
مگر اس کے تحفظ کے لیے نہ تو کوئی دریا تھا اور نہ کوئی پہاڑی شیر خاں جلال خاں
کی فوج اور لوہانی غداروں کو بہار میں داخل ہونے کا موقع نہیں دینا

Marfat.com

چاہتا تھا۔ اسے یہ ڈر تھا کہ اگر وہ لڑائی میں اپنا پرانہ طریقہ جنگ یعنی "مارو اور بھاگ جاؤ" استعمال کرے گا تو اغلب ہے جلال خاں سے درپردہ ہمدردی رکھنے والے اور تلون طبع لوگوں کی بن آئے اور وہ اس کے (شیر) علاقہ میں بدامنی و بغاوت پھیلا دیں۔ لہٰذا اس مرتبہ اس نے اپنا طریقہ بدل دیا۔ اور اس نے ارادہ کر لیا کہ اس بار وہ بہار سے آگے بڑھ کر دشمن کی ہی زمین پر اس سے لوہا لے گا اور بہار عقب میں چھوڑ دے گا۔

۱۵۳۴ء کی شیر خاں کی یہ مہم تاریخ ہند کے قرون وسطی میں سب سے زیادہ فیصلہ کن اور معرکہ آرا ثابت ہوئی اس لڑائی نے شیر خاں کی زندگی کو ایک نیا موڑ دیدیا۔ حالاں کہ یہ اب بنگال کی تاریخ کا ایک پُرحزن و فراموش شدہ واقعہ ہے۔ عباس (صفحہ ۹۲ لغایت ۱۰۰) مخزن (صفحہ ۱۰۶-۱۰۷) و تاریخ داؤدی مصنفہ عبداللہ (صفحہ ۱۷۲-۱۷۳) نے بہت تفصیل کے ساتھ اس لڑائی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن نہ تو کسی نے اس جگہ کا تعین کیا ہے جہاں یہ لڑائی ہوئی اور نہ لڑائی میں شرکت کرنے والے فریقین کے نام ہی لکھے ہیں۔ نظام الدین نے محض یہ لکھا ہے کہ بنگال کے سلطان نے ابراہیم خاں کو جلال خاں لوہانی کی مدد کے لیے بھیجا اور فرشتہ نے اسی کہانی کو دوہرایا ہے۔

چند واقعات اور کچھ داخلی شہادت کی بنا پر یقیناً ہم اس مقام کا تعین کر سکتے ہیں۔ عباس کا اس طرف اشارہ ہے جب کہ وہ یہ بیان کرتا ہے "شیر ایک کثیر تعداد فوج فراہم کر کے مکمل تیاریوں کے بعد بہار کے علاقہ کو عقب میں چھوڑ کر بنگال کی فوج کے روبرو آیا اور اپنے لشکر کے چاروں طرف ایک مٹی کا قلعہ کھڑا کر لیا"[1] یہ امر مسلّمہ ہے کہ یہ لڑائی بنگال کی حد میں ہوئی۔ یہ سرحد بہار قصبہ

---

[1] عباس کے الفاظ یہ ہیں "ولایت بہار را پس پشت دادہ روبرو بادشاہ بنگال شد و گرد لشکر خود قلعہ خام از گل ساخت" صفحہ ۹۲۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ بادشاہ بنگال لکھنا غلط ہے۔ عباس نے اسی بارے میں دوسری جگہ لکھا ہے "بنگال کے بادشاہ نے ابراہیم شاہ ولد قطب خاں کو جلال خاں کے ساتھ بھیجا" (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

کے شمال مغرب میں ۲۲ میل دور بمقام باڑہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ عباس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سال گذشتہ میں قطب خاں کی شکست کے بعد شیر خاں نے بنگال کا کچھ حصہ اپنے علاقہ میں ملا لیا تھا۔ نقشہ پر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باڑہ سے مشرق کی جانب بہار اور بنگال کے درمیان قدرتی حد یا تو دریائے کول ہے۔ یا کھڑک پور کی پہاڑیوں کا نچلا حصہ لہٰذا شیر خاں نے اس لڑائی میں اپنا پڑاؤ دریائے کول کے اس جانب ڈالا ہوگا اور مونگیر اور کول ندی کے درمیان جم کر لڑائی لڑی ہوگی۔ ابو الفضل نے بنگال کی فوج کے سپہ سالار کا نام نہیں لکھا ہے۔ لیکن وہ لکھتا ہے کہ شیر خاں نے سورج گڑھ کے نزدیک ایک لڑائی میں فتح حاصل کی۔ یہ مقام بنگال کی سلطنت اور شیر خاں کی جاگیر کی درمیانی سرحد ہے [۱]

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شیر خاں کا مقابلہ ابراہیم خاں سے ہوا تھا۔ نہ کہ بنگال کے بادشاہ سے۔ مخزن اور بھی زیادہ الجھن میں ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "جلال خاں ابراہیم خاں کے پاس گیا اور اس سے شیر خاں کے خلاف شکایت کی۔ ابراہیم خان نے اپنے ایک سردار قطب خاں کو جلال خاں کے ساتھ بھیج دیا" صفحہ ۱۷۱۔ اس سے بھی یہ بات ظاہر ہے کہ جلال خاں سلطان بنگال کے پاس گیا جس نے ابراہیم خاں کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ابراہیم اپنے مرحوم والد کو اس کے ساتھ بھیج دیتا۔ شیر نے اپنے لشکر کے چاروں طرف مٹی کا قلعہ تعمیر کرایا۔ اس حوالہ نے اسٹورٹ کو (جو اب غیر مستند ہو گیا ہے) گمراہ کر دیا۔ وہ لکھتا ہے "شیر نے مجبوراً اپنے کو بہار کے قلعہ میں بند کر لیا۔ اس قلعہ کی دیواریں گل خام کی بنی تھیں۔ بنگال کی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کیا" ہسٹری آف بنگال صفحہ ۱۷۷ ابو الفضل نے آئین اکبری میں بہار کو ایک قصبہ بتایا ہے۔ جس کی شہر پناہ اینٹوں کی بنی تھی۔

[۱] ابو الفضل کے اس بیان سے ہمارا قیاس ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ شیر خاں کی یہ فتح یقیناً ابراہیم خاں کی فوج کے خلاف ہوئی ہوگی۔ کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ سال

Marfat.com

(بیورج اکبر نامہ جلد۔۱ صفحہ ۳۲۸)۔

علاوہ بریں یہ بات کہ شیر خاں نے بہت دنوں تک ایک فوج کو جو تعداد میں اس کی فوج سے کہیں زیادہ تھی جس کے پاس ہاتھی اور توپخانہ تھا۔ ایسی جگہ میں روکے رکھا جہاں سے وہ نہ تو اس کی زد سے نکل سکتی تھی اور نہ شیر خاں کو حملہ کے لیے مجبور کر سکتی تھی جب تک کہ بقول عباس خود شیر خاں نے ہی ابراہیم کو کھلے میدان میں آنے کا موقع دیا۔ اس امر کی دلالت کرتی ہے کہ شیر خاں نے اس فوج کو کسی ایسی تنگ جگہ میں روکا ہوگا۔ جیساکہ بونل کی گردن ہوتی ہے۔ ایسا مقام جیساکہ بعد کی تاریخ سے ثابت ہوتاہے۔ سورج گڑھ کے علاوہ دوسرا نہیں ہو سکتا[1]

گذشتہ میں ابراہیم کے والد قطب خاں نے شیر کے خلاف فوج کشی کی تھی اور لوہانی علاقہ میں گھس آیا تھا۔

[1] سورج گڑھ کے مقام پر تاریخ کی دوسری مشہور لڑائیاں مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) سلطان محمد عادل شاہ سوری اور گوڑ کے بہادر شاہ کے درمیان جو لڑائی ہوئی تھی وہ ایک نالہ کے نزدیک ہوئی تھی۔ جو سورج گڑھ سے ایک کوس اور مونگیر سے جانب پٹنہ ۱۲ کوس ہے (یعنی مونگیر سے جانب مغرب)۔ (دیکھیے ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن جلد ۴)۔ یہ نالہ وہی چھوٹا دریا کول ہے جو آج کل بالکل سورج گڑھ کے پاس سے بہتاہے لیکن رینل کے زمانہ میں (۱۷۸۰ء) سورج گڑھ سے ۲ میل تھا۔ شیر کے زمانہ سے تقریباً دو صدی بیشتر شاید یہ دریا سورج گڑھ سے ایک کوس (یعنی دو میل) کے فاصلہ پر بہتا تھا۔ جیساکہ جہاں گیر کے زمانہ میں جب تاریخ داؤدی لکھی گئی تھی۔

(۲) دارا کی فوج کو بھی شجاع نے اس مقام پر روکا تھا۔ اور میر جملہ کی فوج کا مقابلہ بھی سورج گڑھ پر ہی ہوا تھا۔ (سورج گڑھ کے جائے وقوع کے لیے سر جادوناتھ کی تاریخ اورنگ زیب جلد دوم ملاحظہ کیجیے گا) علاوہ بریں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ میری پہلی تصنیف "شیر شاہ" کے شائع ہونے کے کئی سال

Marfat.com

چوں کہ بنگال کے سلطان کی اس مہم کا مقصد بہار کی ریاست کو فتح کرنا اور اس کو جلال خاں لوہانی کو واپس کرنا تھا لہٰذا بنگال کی فوج نے وہی قدیم فوجی راستہ لیا ہوگا۔ جو گوڑ سے بہار کو موجودہ راج محل اور مونگیر ہوتا ہوا جاتا ہے۔ یہ وہی راستہ ہے جہاں سے اب گرانڈ ٹرنک سڑک گنگا کے جنوبی کنارے کے ساتھ ساتھ اور کہیں کہیں نارتھ ایسٹ ریلوے کی لوپ لائن (شہاب گنج سے پٹنہ تک)۔ کے متوازی چلی جاتی ہے۔ اسی سڑک پر شمال میں دریائے گنگا اور جنوب میں کھڑک پور کی پہاڑیوں کے درمیان سورج گڑھ کا تنگ میدان ہے (رینل کے زمانہ میں اس کی چوڑائی تقریباً ۵ میل تھی) جو مونگیر سے جانب مغرب ۱۲ کوس ہے فن حرب کے نقطہ نگاہ سے ایک فوج کے لیے جو اپنے تحفظ و بچاؤ کے لیے اپنے سے قوی تر غنیم سے لڑ رہی ہو اس سے بہتر کوئی دوسری جگہ نہیں ہو سکتی۔ خواہ حملہ مشرق سے بہار کی جانب سے ہو یا مغرب سے راج محل کی پہاڑیوں کی جانب سے۔ کوئی بھی مغرب کی جانب سے حملہ آور فوج کھل کر نقل و حرکت نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ دریائے کول کو عبور نہ کرے۔ شیر خاں ہمایوں کی طرح ایسا کوتاہ اندیش نہ تھا کہ وہ دریا کو پس پشت رکھ کر جنگ کا نقشہ بناتا۔ چنانچہ اس نے اپنی فوج کو دریائے کول کے مغربی کنارے پر مرتب کر دیا۔ تاکہ وقت ضرورت چنار یا بہار (موجودہ بہار شریف) کی

بعد پروفیسر ہودی والا خود بھی آزادانہ طریقہ سے اسی نتیجہ پر پہونچے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ابو الفضل کا بیان ہے کہ لڑائی سورج گڑھ کے مقام پر ہوئی مسٹر بیورج کا خیال ہے کہ ابو الفضل نے غلطی سے سورج گڑھ لکھدیا ہے۔ دراصل یہ مقام پرگنہ سنتھال میں تلیا گڑھی ہے۔ لیکن اس معاملہ میں ابو الفضل کی رائے بالکل درست ہے۔ بیورج نے اپنی قیاس آرائی کے ثبوت میں کسی بنیادی تاریخ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ اس لیے وہ بے کار ہے۔

(دیکھیے اسٹڈیز صفحہ ۴۴۹)

Marfat.com

جانب واپسی کا راستہ صاف رہے۔ اپنی فوج کی مزید بچت کے لیے شیر نے دوسرے کنارے بھی مٹی کی ایک مضبوط دیوار کھڑی کر دی۔ شیر خاں اور ابراہیم خاں کی فوج ایک دوسرے کے بالمقابل اس طرح صف آرا تھیں کہ کوئی بھی فریق دوسرے پر دفعتہً حملہ آور نہیں ہو سکتا تھا۔ بنگال کی فوج کے دائیں بازو پر دریائے گنگا تھا۔ جنوبی حصہ پر کھڑک پور کی پہاڑیاں۔ پشت کی جانب مونگیر کا قلعہ تھا۔ اور سامنے کول سے مشرق کی جانب سورج گڑھ کا قلعہ۔ اور افغان فوج کی مسلح قلعہ بندی تھی۔ اسی طرح شیر خاں کی فوج پر بھی جلو یا عقب سے کوئی حملہ ممکن نہیں تھا۔ جب تک کہ دشمن میں اتنا حوصلہ نہ ہو کہ وہ کھڑک پور کی دشوار گذار پہاڑیوں کو عبور کر کے چپ چاپ اس کو نہ دبا لے۔ افغان فوج کی نقل و حرکت کو عباس نے اسی طرح بیان کیا ہے۔

شیر خاں کی خندقوں میں چھپی ہوئی فوج روزانہ افغان فوج سے جھڑپیں کرتی تھی۔ اور باوجود ہر ممکن کوشش کے افغان فوج شیر کو کسی قسم کا نقصان نہ پہونچا سکی۔ شیر کی فوج کے ہر چار جانب مٹی کی قلعہ بندی تھی۔ افغانوں نے انتہائی جرأت و دلیری دکھلائی۔ جب بھی ابراہیم کی فوج نے قلعہ بندی کے نزدیک آنے کی کوشش کی وہ مایوس ہو کر واپس گئی حتیٰ کہ کوئی بھی ایک فریق دوسرے فریق پر غالب نہ آ سکا۔ ابراہیم کو بنگال کے فن شمشیر زنی پر ناز تو تھا پر وہ یہ بھی بخوبی جانتا تھا۔ کہ اگر کسی روز افغانوں سے جم کر لڑائی ہوتی تو بنگالی تاب مقاومت نہ لا سکیں گے۔ اگر اس وقت بنگالی افغانوں کے مقابلہ میں کھڑے تھے۔ تو اس کی وجہ تھی محض ان کی کثیر التعدادی اور ان کا ہاتھیوں اور توپ خانوں کا سہارا۔ لہذا اس نے اپنے بادشاہ کو پیغام بھیج کر مزید کمک طلب کی اس نے لکھا کہ شیر خاں قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا جس کی وجہ سے وہ اپنی فوج کو جائے ترتیب سے ہٹا نہیں سکتا ہے۔

شیر خاں نے افغانوں کو یک جا فراہم کر کے یوں خطاب کیا۔ "میں

Marfat.com

نے ہنوز بنگالیوں پر ترتیب وار حملہ نہیں کیا۔ ابھی تک قلعہ بندی کی پشت پر سے اپنا کام کر رہا ہوں۔ چند سپاہیوں نے بنگالیوں سے معمولی جھڑپیں کی ہیں جس سے بنگالی اپنی طاقت کا میری طاقت سے موازنہ نہ کر سکیں۔ اور ان کے دماغ سے غرور نکل جائے۔ اگر میرے عزیز ورفیق اجازت دیں تو میں کل اپنی فوج کو جنگ کے لیے صف آرا کر دوں۔ اب غنیم کی کمک آنے والی ہے۔ لہٰذا جنگ کے لیے تامل و تاخیر مصلحت و دوراندیشی کے خلاف ہے۔"

افغانوں نے جواب دیا" انشاءاللہ جو شربت مرگ باپ نے چکھا تھا بیٹے کو بھی وہی پلایا جائے گا۔"

شیر خاں نے اپنا ایک وکیل ابراہیم خاں کی خدمت میں یہ پیغام لے کر بھیجا "تم بار بار کہتے ہو قلعہ سے باہر آؤ تاکہ میدان جنگ میں ایک دوسرے کے جوہر کھل جائیں۔ لیکن میں اب تک جنگ سے اس لیے گریز کرتا رہا کہ مجھے یہ امید تھی کہ شاید صلح ہو جائے۔ براہ عنایت کل صبح تشریف لایئے۔ تاکہ ہم لوگ قسمت آزمائی کر لیں۔"

ابراہیم خاں نے اس خط کے جواب میں کہلا بھیجا کہ اس نے بہت مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ کل میدان کارزار گرم ہو۔ شیر خاں اس خبر سے بہت خوش ہوا۔ اور اس نے اپنی فوج کو آراستہ ہونے کا حکم دیدیا۔ ابراہیم خاں نے بھی فتح خاں کو یہ ہدایت کی کہ وہ تمام لشکر کو کل کی جنگ کے لیے آراستہ ہونے کا حکم دیدے۔ جب ایک پہر رات باقی تھی تب شیر نے اپنے لشکر کی صف آرائی کی اور قلعہ سے باہر آیا۔ فجر کی نماز کے بعد اس نے اپنے لشکر سے کہا کہ غنیم کے پاس پیادہ فوج۔ توپ خانہ اور ہاتھی زیادہ تعداد میں ہیں۔ اس لیے اب نیا طریقہ جنگ اختیار کرنا ہوگا۔ بعد ازیں اس نے دور پہاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ سامنے جو پہاڑیاں ہیں انکے عقب میں میں فوج کے ایک بڑے حصہ کے ساتھ پناہ گزیں ہوں گا۔ اور تھوڑے سے چنیدہ جرار سپاہی جن کو کہ جنگ کا پیشتر سے تجربہ ہے انہیں کو غنیم کی راہ شکست تیار کرنے کے لیے آگے بھیجوں گا ..... یہ تیروں کی بوچھار

Marfat.com

کر کے حملہ آور ہوں گے اور پھر پیچھے ہٹیں گے۔ (عباس۔ صفحہ ۹۳-۹۹)۔

قصہ مختصر۔ شیر خاں نے نہایت حکمت عملی سے کام لیا۔ اس وقت کسی قسم کا تامل و تساہل حماقت ہوتی۔ شیر سلطان بنگال کی فوجوں کو گنگا پار کرنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو شیر کو اپنے عقب میں حملہ کا خطرہ پیدا ہو جاتا۔ یا اس کو اپنی موجودہ قلعہ بندی چھوڑنی پڑتی۔ ہر دو حالت میں ابراہیم کی فوج ایک تباہ کن سیلاب کی طرح بہار پر ٹوٹ پڑتی۔ ایسی صورت حال میں کسی بھی سواروں کے رسالہ کے لیے خواہ وہ کتنا ہی بیدار مغز کیوں نہ ہوتا گوریلا طرز جنگ سے میدان سر کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ شیر خاں نے نہایت ہی ہوشیاری سے اپنے منصوبوں کو ترتیب دی۔ اور عزم بالجزم سے ان پر عمل درآمد کیا۔ اس کے روبرو پیدل فوجوں کے دستے پر دستے صف آرا تھے۔ ان کے پیچھے توپ خانہ تھا۔ اور اس کی پشت پر ہاتھیوں کی قطاریں تھیں۔ کیا ان پر گھوڑ سواروں کو متواتر حملہ کرنا خودکشی سے کچھ کم ہوتا؟ شیر خاں نے اس ادق مسئلہ کا وہی حل نکالا جیسا کہ اس کے قبل و مابعد ولیم فاتح سے جسونت راؤ ہولکر تک سواروں کے رسالہ کے لیڈروں نے نکالا تھا۔ وہ بھی حریف کو بہکا کر ناقابل جنگ مقام سے ہٹا کر میدان میں لے آیا۔

افغان رسالہ نے آگے بڑھ کر دشمن پر تیروں کی بوچھار شروع کی تاکہ معلوم ہو کہ انہوں نے اپنی پوری طاقت سے دشمن پر دھاوا بول دیا ہے لیکن فوراً ہی ان کی صفیں ٹوٹ گئیں۔ اور وہ سرپٹ بھاگ پڑے۔ ابراہیم کے رسالہ نے یہ سمجھا کہ افغان میدان چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ اس لیے انہوں نے توپ خانہ اور پیدل فوج کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اور فتح کے نشہ میں سرشار افغان فوج کے تعاقب میں وہ پہاڑیوں کے اس پار نکل گئے، جہاں کثیر تعداد میں افغان فوج گھات لگائے بیٹھی تھی۔ شیر نے اب اپنے جوہر دکھانے شروع کیے۔ اس کی بھاگتی فوج دوبارہ صف آرا ہو گئی۔ وہ افغان طریقہ جنگ یعنی رکاب سے رکاب ملا کر ابراہیم کے لشکر پر بجلی کی طرح ٹوٹ

Marfat.com

پڑے۔ اور ابراہیم کو اتنی مہلت بھی نہ مل سکی کہ وہ اپنی فوج کو از سر نو منظم کر سکے
ابراہیم ایک عالی حوصلہ جری سپہ سالار تھا۔ اس کو دیکھ کر بنگال کی فوج خوب
جم کر لڑی۔ اس کی فوج کا کچھ حصہ اپنے دبے ہوئے ساتھیوں کی امداد کو چل
پڑا۔ ورنہ جنگ اتنی گھماسان نہ ہوتی اور شیر کو اس فتح کی اتنی بھاری قیمت
نہ ادا کرنی پڑتی۔ ہر دو جانب نامی گرامی سردار کھیت رہے ابراہیم خود تو
ڈٹا رہا لیکن اس کی فوج درہم برہم ہو کر بھاگ گئی۔ اور وہ لڑتے لڑتے
ہی شہید ہو گیا۔ (جون ۱۵۲۶ء)۔

سورج گڑھ کی لڑائی شیر کے لیے نہ صرف فن حرب کے نقطہ نظر
سے معرکہ آرا و فیصلہ کن ثابت ہوئی بلکہ اس کے سیاسی تاثرات بھی بہت
وسیع تھے۔ سلطان محمود کی یہ دوسری ہار تھی اور آخری مہم۔ میدان جنگ
میں قطب خاں کی شہادت کے ایک سال کے اندر ہی ابراہیم خاں بھی ہلاک
ہو گیا۔ جس سے ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ بنگال میں سید خاندان کا ٹمٹماتا چراغ
بجھ گیا۔ اگر شیر شاہ سورج گڑھ کی لڑائی میں کامیاب نہ ہوتا تو معمولی جاگیردار
کا یہ لڑکا یونہی گوشہ گمنامی میں پڑا رہتا اور کبھی تخت و تاج کی تلاش میں
یوں سرگرداں نہ ہوتا۔

بہار کا بے تاج بادشاہ شیر

سورج گڑھ کی فتح سے شیر کو بہار پر حکومت کرنے کے سب
قانونی و جائز اختیارات حاصل ہو گئے۔ جلال خاں اپنی کوتاہ نظری سے
بہار سے بھاگ کر اور اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کی غرض سے
محمد شاہ کی اطاعت و اعانت طلب کر کے ناکام کوشش کے بعد افغان عوام
کی نظروں میں قومی غدار ہو گیا تھا۔ اس کے برعکس اب عوام شیر خاں کو مسیحا سمجھنے
لگے تھے۔ کیوں کہ اس نے بیرونی حملہ سے ملک کی حفاظت کی تھی۔ اب اس کو نہ
تو فوج کی جانب سے نہ کاشت کاروں کی طرف سے کوئی نزع کی امید رہ گئی
تھی۔ وہ گذشتہ چند سال سے بہار میں بحیثیت ڈپٹی گورنر کام کر رہا تھا۔ بہار کی

Marfat.com

رعایا اس کے احکام کی تعمیل کرنے کی عادی ہو گئی تھی۔ علاوہ بریں۔ اس کے پرزور نظام حکومت اور منصف مزاجی سے رعایا بشاش و فارغ البال ہو گئی تھی۔ فوج کا ہر سپاہی شیر خاں سے اپنا مفاد وابستہ سمجھتا تھا۔ اور اس کے ساتھ جذباتی انسیت بھی رکھتا تھا۔ اس کی سپہ سالاری میں ان کو دو مرتبہ عظیم الشان فتح نصیب ہوئی تھی۔ اور کثیر تعداد میں مال غنیمت بھی ان کے ہاتھ لگا تھا۔ اسی لیے شیر خاں فوج میں ہر دلعزیز بن چکا تھا۔ علاوہ بریں فوج کے سرداروں کو شیر خاں سے جاگیر اور دیگر قسم کے مشاہرات بھی حاصل ہوئے تھے۔ انہیں یہ ڈر تھا کہ اگر جلال خاں دوبارہ برسر اقتدار آ گیا۔ یا شیر کے اثر میں کسی قسم کی کمی آ گئی تو یقیناً ان کی جاگیریں ضبط کر لی جائیں گی۔ اور وہ دیگر مشاہرات سے محروم کر دیئے جائیں گے۔ شیر خاں کے لوہانی معاون سے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنی قبیلائی ریاست کے تہ و بالا ہونے سے ناراضگی کا اظہار کریں گے لیکن موجودہ کیفیت حال میں وہی اس کے برسر اقتدار رکھنے کے حامی تھے۔ کسی اور کے مفاد استنے خطرے میں نہ تھے جتنے کہ ان کے۔ اس لئے کسی اور کو جلال خاں کی بحالی اور ان کے کینہ پرور رشتہ داروں کی واپسی سے اتنا اندیشہ نہ تھا۔ جتنا کہ خود ان لوہانیوں کو تھا۔ انہیں کو ان کے مفرور قبیلہ والوں کی جائیدادیں اور جاگیریں دیدی گئی تھیں۔ اور ان کے عہدوں میں ترقی ہو گئی تھی۔ پھر اگر شیر خاں اپنے منصب سے ہٹا دیا جاتا۔ تو غالباً وہ سب کچھ کھو بیٹھتے۔ لہٰذا سورج گڑھ کی جنگ کے بعد چنار سے لے کر سورج گڑھ تک کے گنگا کے جنوب میں تمام وسیع علاقہ کا اب شیر خاں مسلمہ مالک ہو گیا اور اس کی پشت پر تھی ایک فتح یافتہ فوج اور خوشحال رعایا۔

بنگالی فوج کی اس شکست کے بعد شیر خاں نے اپنا کل وقت اپنے علاقہ کے انتظام میں صرف کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قلیل عرصہ میں رعایا کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہو گئی۔ اور انتظام سلطنت عروج پر پہونچ گیا۔ وجہ یہ کہ شیر خاں انتظام کے ہر صیغہ کی دیکھ بھال خود کرتا تھا اور کسی ایذا رساں کے ساتھ مروت سے پیش نہیں آتا تھا۔ خواہ وہ اس کا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ جب کوئی شخص

Marfat.com

اس کی ملازمت میں پہلی مرتبہ داخل ہوتا تو شروع سے ہی وہ اس کو یہ تاکید کرتا تھا" میں تمہیں پوری تنخواہ دوں گا۔ اس میں ایک کوڑی بھی کم نہیں کرونگا شرط صرف یہ ہے کہ تم نہ تو کسی سے نزاع و فساد کروگے نہ کسی کے ساتھ ظلم و تشدد۔ اگر تم کسی اس قسم کے جرم کے مرتکب ہوگے تو میں تمہیں ایسی سزا دوں گا جو دوسروں کے لیے عبرتناک ہو" اس تاکید کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں اس کی شہرت عوام میں چارسو پھیل گئی اور ہر کس و ناکس کو علم ہو گیا کہ شیرخاں اپنی فوج کی تنخواہ ماہانہ باضابطہ دیتا ہے۔ وہ نہ تو کسی پر ظلم کرتا ہے اور نہ کسی غیر کو ظلم کرنے کی اجازت دیتا ہے (ایلیٹ بقول عباس جلد ۴ صفحہ ۳۴۳)

اس دوران شیر نے نہ صرف اپنی نئی فتوحات کو از سرنو ترتیب دیا اور بہار کے علاقہ میں اپنے انتظام کو درست کیا بلکہ اس نے اپنے پرچم کے سایہ میں افغان قوم کو رشتہ یگانگت و یک جہتی میں پرونے کی بھی کوشش کی۔ اس نے اودھ و شمالی بہار کے جملہ افغانوں کو جو بدقسمتی سے بے کار و گمنام پڑے تھے اپنی فوج میں بھرتی ہونے کی دعوت دی۔ بابر کے ساتھ میدان جنگ میں رہ کر شیر نے فوج کی تنظیم کا نیا طریقہ سیکھ لیا تھا۔ اور لودی زمانہ کے فرسودہ و بے کار طریقہ کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اس نے اپنی تمام توجہ رسالہ اور توپ خانہ پر لگادی۔ اب اس کے قبضہ میں بنگال کا پورا توپخانہ تھا جو اس نے گذشتہ دو لڑائیوں میں اپنے تصرف میں کر لیا تھا۔ افغانوں نے گولہ اندازی میں مہارت حاصل کرلی۔ آگے چل کر چنار کی لڑائی میں مغلوں کے خلاف اس نے اپنی اس نئی تنظیم و تربیت کا مظاہرہ کیا۔ آہستہ آہستہ لیکن خاموشی سے شیر نے اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے جنگ کے جملہ سامان فراہم کیے۔ اب اس کے سیاسی افق کا دایرہ وسیع تر ہونے لگا۔ گوڑ نزدیک تھا لیکن دہلی ہنوز دور تھی۔ شیرخاں کی سورج گڑھ کی فتح سے پیدا شدہ تبدیلی کو ہمایوں اور محمود نہ سمجھ سکے اور مشرقی ہند کی اس نئی الٹ پھیر کی اہمیت کا اندازہ لگانے میں وہ قاصر رہے۔

Marfat.com

شیر خاں کے کردار میں دو وصف تھے۔ کامیابی کے وقت اعتدال پسندی اور بظاہر وفاداری۔ ان اوصاف کی وجہ سے وہ ہمایوں کی نظر میں مشتبہ نہ ہو سکا۔ اصولاً وہ مغل بادشاہ کا مطیع تھا۔ بادشاہ کے نام کے سکے جاری کرتا تھا۔ چنار اور اس کے ارد گرد کے اضلاع اس کی فوجی خدمت کے عوض بادشاہ نے اس کو بطور جاگیر دیدیے تھے۔ بہار میں اس نے اپنی دور اندیشی و سیاسی دانائی سے کوئی کام ایسا نہیں کیا جس سے حکومت کی بو آتی۔ اگر شیر کی جگہ کوئی معمولی عقل کا انسان ہوتا تو نشہ کامرانی میں مخمور ہو کر وہ ایسا نہ کرتا۔ اور تب اس کے افغان قبیلہ والوں کو اس کا بہ رو بہ ناپسند ہوتا۔ ان میں باہمی بغض و نفاق کی آگ بھڑک اٹھتی۔ لوہانی و لودی سردار ہرگز یہ پسند نہ کرتے کہ ایک سوری سرداران کے تاج و تخت کو ضبط کر کے خود حکمراں بن جائے۔ اسی لیے شیر شاہ نے بہار کا تخت خالی چھوڑ کر اپنے لیے محض "مسند عالی" کا خطاب ہی پسند کیا۔ یہ وہ خطاب تھا جو لودی عہد میں اعلیٰ افغان سرداروں کو عطا کیا جاتا تھا۔

Marfat.com

باب 7

تلاش تاج

١٥٣٤ء لغایت ١٥٣٦ء

تشویش و تیاریوں کا سال

سورج گڑھ کی لڑائی کے بعد شیر خاں اس فتح سے کاملاً مستفید نہ ہو سکا۔ اس کی وسعت سلطنت میں مونگیر کا قلعہ سدّ راہ تھا۔ ١٥٣٤ء میں موسم برسات شروع ہو گیا تھا۔ اب بیک وقت اس کو دو مرحلوں کا سامنا کرنا تھا۔ پہلے دیکھنا تھا بادشاہ ہمایوں کی پالیسی پر سورج گڑھ کی مہم کا اثر اور دوسرے شمالی بہار میں دریائے گنگا کے ہر دو جانب مونگیر و بھاگلپور اضلاع میں محمود کی حکومت کے باقی ماندہ نشانات کا اختتام۔ تاکہ بنگال پر حملہ کرنے کا راستہ صاف ہو جائے۔ لیکن ١٥٣٤ء کے موسم خزاں میں مغلیہ دارالسلطنت میں جنگی تیاریوں نے اسے سراسیمہ کر دیا۔ دراصل بادشاہ نے بنگال فتح کرنے کے لیے فوج کشی کا حکم دیدیا تھا۔ اور اکتوبر میں وہ کالپی پہونچ گیا۔

شیر شاہ کے سیاسی افق سے یہ سیاہ بدلیاں تب چھٹیں جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ ١٥٣٤ء میں بہادر شاہ گجرات میں مغل سلطنت کو تباہ کرنے کے درپے وہ منصوبہ بنا رہا ہے۔ بہادر شاہ گجرات کے تخت پر ١٥٢٦ء میں جلوہ افروز ہوا تھا۔ وہ پہلا ہندوستانی حکمراں تھا۔ جس نے بابر کی پانی پت و کنواہہ کی لڑائیوں

Marfat.com

سے فنون حرب کا سبق سیکھا تھا۔ اس نے ترکوں اور مغلوں کے طرز پر اپنی فوج کی تنظیم از سر نو کی۔ اور ایک مہیب و مہلک توپ خانہ مرتب کیا۔ اس کام کے لیے اس نے قسطنطنیہ (روم) سے ترکی افسر بلوائے۔ اور ڈیو کے پرتگالیوں سے توپ و گولہ بارود فراہم کیا۔ بہادر شاہ کی اس نئی منظم فوج نے اس کو اپنے ہندوستانی مخالفین پر ویسی ہی فوقیت دی جو کہ ۱۸ ویں صدی میں "ڈی بوائن" کی مرتب فوج نے سندھیا کو دی تھی۔ اس نو تنظیم یافتہ فوج کی امداد سے اس نے تقریباً ۸ سال کے اندر ہی ایک مد مقابل سلطنت تعمیر کر لی اور وہ ہندوستان میں شہنشاہی کے لیے بابر اور ہمایوں سے بازی لینے کے لیے گامزن ہونے لگا۔ لیکن وہ اتنا ہوشیار تھا کہ اس نے اپنے مدعا کو ہمایوں سے پوشیدہ رکھا اور اس کو (ہمایوں) اپنی سیاسی عقلمندی سے اتنا ہی ظاہر ہونے دیا کہ وہ مغلوں کے دایرہ اقتدار کے باہر ہی توسیع سلطنت میں مصروف ہے۔

اس وقت بہادر شاہ کا فرمان جنوب میں خاندیش و احمد نگر تک قابل اطاعت تھا۔ شمال میں سندھ کے ارغون خلیج کچھ کے پار اس کے خوف سے لرزہ بر اندام تھے۔ مشرق کی جانب وہ ہمایوں اور بابر سے بھی بازی لے گیا۔ اس نے مالوہ اور راجپوتانہ کے بیابان جنگلوں میں بھی اپنا سکہ بٹھا دیا۔ مالوہ میں اس نے تو در لیا لیکن ہوشیار ملو خاں عرف قادر شاہ کو اپنی طرف ملا لیا تھا۔ اور راجپوتانہ میں اس نے مختلف راجاؤں کے درمیان باہمی بغض و حسد۔ کینہ و رنجش کا بیج بو کر فائدہ اٹھایا تھا۔ راجپوتانہ میں ناگور و اجمیر سے بانسواڑہ و ڈونگر پور تک والور و اجمور سے بوندی و رنتھمبور تک کوئی حکمراں ایسا نہ تھا جو بہادر شاہ کی حکم عدولی کی تاب لا سکے۔ میواڑ کی خود مختاری بہادر شاہ کے متواتر جارحانہ حملوں کے سامنے تقریباً سرنگوں و خمیدہ تھی۔ ۱۵۳۳ء کے قبل ہی گجرات کی فاتح فوجیں مالوہ سے گزرتی ہوئی بندھیل کھنڈ تک پہونچ چکی تھیں۔ کوتاہ کلام یہ کہ جس طرح پانی پت کی جنگ کے بعد بابر کے لیے رانا سانگا خطرناک ثابت ہوا اس سے بدرجہا زیادہ بہادر شاہ

Marfat.com

کی روز افزوں طاقت ہمایوں کے لیے خوف کا باعث بنی ہوئی تھی۔ پھر بھی ہمایوں اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ بہادر شاہ کافروں سے جنگ کر کے اسلام کی اشاعت کر رہا ہے۔ جب کہ مغل بادشاہ دین اسلام کا ہند میں تنہا نمائندہ ہے۔

۹۳۹ھ ہجری میں بہادر شاہ نے چتوڑ پر حملہ کیا۔ یہ وہی وقت تھا جب کہ بادشاہ ہمایوں نے گوالیار کی سمت رخ کیا تھا۔ چنانچہ بہادر شاہ کو یہ موقع مل گیا کہ وہ رانی کرموتی بیوہ رانا سانگا اور والدہ مہاراجہ بکرماجیت سے (جو ہنوز نابالغ تھا) صلح کر کے اپنی توجہ مالوہ کی جانب مبذول کرے۔ (۲۴ مارچ ۱۵۳۳ء) جب گجرات کی فوج نے رانی کرموتی پر دباؤ ڈالا۔ تو اس نے ہمایوں کے پاس ایک سفیر بھیجا اور امداد کی درخواست کی لیکن ہمایوں نے اس کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ بہادر شاہ بھی علی الاعلان مغلیہ حکومت سے رشتہ داری میں اتنا ہی محتاط تھا جتنا کہ شیر خاں دونوں پر شاہی طاقت کا صحت بخش رعب طاری تھا۔ جب سورج گڑھ کی لڑائی کے بعد سیاسی افق پر شیر خاں کی قسمت کا ستارہ چمکنے لگا تو بہادر شاہ کی نظر اس پر گئی۔ اور اس نے افغانوں کو ساتھ لے کر مشترکہ دشمن یعنی مغلوں کی مخالفت کرنے کا منصوبہ باندھا۔ لودی عہد کے تمام بڑے بڑے امیر کبیر اس کے دربار میں پناہ لے چکے تھے۔ ابراہیم کے چچا سلطان علاء الدین عالم خاں لودی کو بہادر شاہ نے یہ امید دلائی کہ وہ اس کے خاندانی عظمت ورتبہ کو پھر سے واپس دلا دے گا۔ بہادر شاہ نے شیر کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ دونوں مل کر مغلیہ حکومت کے خلاف جہاد کریں۔ مشرق سے شیر خاں حملہ کرے اور مغرب سے گجرات کی فوج آگرہ و دہلی پر فوج کشی کرے۔ ابوالفضل لکھتا ہے "اس نے سوداگروں کے ذریعہ شیر خاں کے پاس رقم خاص بھیجی اور اس کے ساتھ ملنے کی دعوت دی"[1]

---

[1] ابوالفضل کا بیان ہے کہ شیر خاں کو رقم خاص سورج گڑھ کی لڑائی سے پہلے بھیجی گئی تھی۔ یہ بیان اتنا ہی ٹھیک ہے جتنا کہ یہ کہنا کہ شیر نے سورج گڑھ کی لڑائی

Marfat.com

شیر خاں نے روپیہ تو سرکشی کرنے کے لیے جمع کر لیا اور نہ جانے کے لیے بہانہ بنا دیا۔ یہ عام دستور ہے کہ جو لوگ روپیہ لیتے ہیں وہ ان لوگوں سے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں جو کہ دوسروں کی جیبوں میں روپیہ انڈیلتے ہیں اور وہ بھی خود غرضی کے مقصد سے۔ چنانچہ شیر خاں پر اس متعلق کوئی جرم عائد نہیں ہوتا۔ اس نے بہادر شاہ کے دام سیاست میں پھنس کر یہ مناسب نہ سمجھا کہ خواہ مخواہ مغلوں سے جنگ کا وبال اپنے سر لادے۔ وہ خود ہی اس وقت اس موقع کی تاک میں تھا کہ بہادر شاہ کی حرکتوں سے ہمایوں کی توجہ اگر ادھر لگ جائے تو اس کو کچھ وقفہ کے لیے راحت مل جائے۔

بہادر شاہ ایک طرف تو ہمایوں کو بیش قیمتی تحفے اور عجز آمیز خطوط بھیج کر دھوکہ دے رہا تھا۔ دوسری جانب راجپوتانہ کی سرحد پر فوجوں کا اجتماع کر رہا تھا۔ شاید اس کا ارادہ چتوڑ پر حملہ کرنے کا تھا۔ اس نے سلطان سکندر کے بھائی سلطان علاؤالدین عالم خاں کی سپہ سالاری میں ایک کثیر تعداد فوج کالنجر کی جانب بھیجی۔ بندھیل کھنڈ میں بہت سے افغان سردار پناہ گزیں تھے۔ خصوصاً بھاٹ ریوا کے راجہ کے یہاں۔ جہاں بدقسمت باطل دعویدار سلطان محمد بن سلطان سکندر گوشہ عزلت میں اپنی زندگی بسر کر رہا تھا سلطان علاؤالدین کا اس مہم سے مقصد تھا اس علاقہ کے افغانوں کو بیدار کرنا اور اگر ممکن ہوا تو اس سمت شیر خاں کی معاونت سے مغلوں کے مقبوضات پر قبضہ کرنا۔ سلطان علاؤالدین کے لڑکے تاتار خاں کو رنتھمبور بھیجا گیا۔ اور اس کو نئی فوج بھرتی کرنے اور مغل فوج کو ورغلانے کے لیے ۲۰ کروڑ روپیہ دیا گیا۔ فوج کا ایک اور دستہ برہان الملک کی کمان میں پنجاب کی جانب روانہ کیا گیا۔ تاکہ ادھر سے دہلی کے خلاف مورچہ بندی کی جا سکے (اکبر نامہ۔ ۱۔ ۲۹۶)

دنیا کی تاریخ میں ہمایوں جیسا سادہ لوح انسان جس کو کہ دوست و

کے بعد نصرت شاہ کے خلاف جنگ کی۔ اس لیے ہم نے واقعات کے سلسلہ میں الٹ پھیر کر دیا ہے۔ (اکبر نامہ جلد ۱ صفحہ ۳۲۸)۔

Marfat.com

دشمن آسانی سے دھوکہ دے سکیں آج تک تخت شاہی پر نہیں بیٹھا۔ اس نے بنگال کو فتح کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ شاید محمود شاہ کے سفیروں نے بھی اس کی اس مہم کے لیے حوصلہ افزائی کی ہو۔ کیوں کہ اس کا (محمود شاہ) یہ خیال تھا کہ اس طرح شیر خاں کی سرکوبی ہو جائے گی۔ ابوالفضل کا بیان اس بات کا شاہد ہے کہ ہمایوں کو ہنوز بہادر شاہ کی نیت پر کوئی بھی شک وشبہ نہ تھا۔ اکتوبر ۱۵۳۲ء کے شروع میں ہمایوں نے فوج کا رخ مشرق کی جانب موڑ دیا۔ اور وہ بنگال فتح کرنے کے ارادہ سے چل پڑا۔ چنانچہ بہادر شاہ کو اپنی چال اور حکمت عملی میں کامیابی دیکھ کر عین مسرت حاصل ہوئی۔ خاص کر اس لیے بھی کہ خمیازہ اس کے دوست شیر خاں کو بھگتنا تھا۔ لیکن تاتار خاں کی غیر وقتی گرم جوشی نے سارا کھیل ہی بگاڑ دیا۔ ہمایوں کے مشرق کو کوچ کرتے ہی وہ ایک طوفان کی طرح آگرہ پر ٹوٹ پڑا۔ یہاں حفاظت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے چالیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ بیانہ تک کے سارے علاقہ کو روند ڈالا۔ اس وقت ہمایوں پرگنہ کالپی میں قصبہ کنار کے مقام پر پڑاؤ ڈالے تھا۔ یہیں اس کو یہ سنسنی خیز خبر ملی۔ چنانچہ نومبر ۱۵۳۲ء میں اس نے عسکری مرزا کی کمان میں ایک جرار فوج تاتار خاں کی گوشمالی کے لیے روانہ کی۔ وہ بھی اتنا محتاط تھا کہ بہادر شاہ سے اعلانیہ بگاڑ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے کالپی سے بہادر شاہ کو ایک خط لکھا تھا جس میں تاتار خاں کی حرکت کی سخت شکایت کی۔ اس کے علاوہ اس نے آگرہ کی جانب اپنا رخ موڑ دیا تاکہ بہادر شاہ کے ساتھ بگڑی بات بنا کر بنگال کی مہم پر جانے کے لیے آزاد ہو جائے۔

تاتار خاں کی بے ترتیب فوج کے تعاقب میں مرزا عسکری بہت ہی تیزی سے روانہ ہوا۔ مال غنیمت اور زر کے لالچ سے افغان و نیز مقامی باشندے تاتار خاں کی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی مغل لشکر قریب آپہونچا اور تو بھاگ گئے۔ صرف ایک ہزار اس کے عزیز و اقارب اس کے ساتھ رہ گئے۔ انہوں نے چمبل کی دشوار گذار گھاٹیوں میں پناہ لی۔ دیر

Marfat.com

تاتار خاں کو اپنی جلد بازی کی سزا بھگتنی پڑی۔ وہ مندرائیل کے مقام پر جو آگرہ ضلع میں کرالی سے جانب مشرق و جنوب ۱۲ میل ہے ایک گھماسان لڑائی میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ سلطان بہادر جس نے چتوڑ کا دوسری بار گھیرا ڈال رکھا تھا تاتار خاں کے لشکر کی برہمی کی خبر سن کر اور ہمایوں کے آگرہ واپس آنے سے بہت خوفزدہ ہو گیا۔ تاہم اس نے اپنی تیز فہم حکمت عملی سے اپنے نقصان کی تلافی کر لی۔ جو کہ اس کو تاتار خاں کے قبل از وقت اور ناکامیاب فعل سے ہوا تھا۔ ہمایوں کو اپنے احتجاجی خط کا جواب بہادر شاہ سے بمقام آگرہ موصول ہوا۔ اس میں بہادر شاہ نے تاتار خاں کے فعل کی ذمہ داری سے صاف انکار کر دیا۔ ہمایوں پر اس کا بہت ہی اچھا اثر پڑا۔ اس کے بعد بادشاہ اور سلطان میں عرصہ تک خط و کتابت ہوتی رہی۔ ہر فریق نے دوسرے کو تین تین خط لکھے اور ان کے جواب دیے۔ بہادر شاہ نے اپنے خطوط میں ہمایوں کی خود بینی کو اکسایا۔ اسے محافظ دین کہہ کر پکارا۔ اور شریعت کے نام پر اس سے یہ اپیل کی کہ وہ کم از کم چتوڑ کی مہم کے دوران جو ایک قسم کا کافروں کے خلاف جہاد تھا دخل اندازی نہ کرے۔ اُدھر خود ہمایوں بنگال کی جانب کوچ کرنے کا خواہشمند تھا۔ کیوں کہ حملہ کا وقت بہت ہی نزدیک آچکا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار پھر بہادر شاہ نے اپنی سیاسی چالوں سے اپنے کو ہمایوں کی گرفت سے آزاد کر لیا۔ اور ہمایوں کو بے وقوف بنا دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ تخت و تاج ایسے بے وقوف کٹھ ملاؤں کے لیے نہیں ہوتے جو اتنی آسانی سے ذی ہوش عیاروں کے جال میں پھنس جاتے ہوں۔

بہادر شاہ کی جانب سے مطمئن ہو کر ۱۸ فروری ۱۵۳۵ء[1] کو بادشاہ

---

[1] گلبدن ہمایوں نامہ صفحہ ۱۳۱۔ مسز بیورج نے اپنے ترجمہ میں یہ واقعہ ۱۵۳۴ء میں دکھایا ہے۔ جو یا تو مطبع کی غلطی ہے یا اس کی بھول ہے۔ ۱۴ شعبان ۹۴۱ ہجری مطابق انگریزی سال ۱۵۳۵ء ہے۔ ابوالفضل نے اس واقعہ کی تاریخ ایک جمادی ۹۴۱ھ ہجری مطابق نومبر ۱۵۳۴ء دی ہے یہ ناممکن ہے کیوں کہ نومبر میں مرزا

Marfat.com

دوبارہ آگرہ کے باغ زرافشاں سے روانہ ہوا۔ اس بار اس کی کمان میں غیر جنگجو لوگوں کے علاوہ تیس ہزار فوج تھی۔ بادشاہ نے اتنی بڑی فوج کی کمان اس سے پیشتر کبھی نہیں سنبھالی تھی۔ تمام فوج بہترین طور پر مسلح و منظم تھی۔ اب شیر کی تقدیر ڈانواں ڈول ہونے لگی۔ صورت حال یہ تھی کہ یا تو اب وہ نیست و نابود ہی ہو جائے گا یا دو مورچوں پر لڑ کر سب کچھ اپنے قبضے میں کرے گا۔ اس نے محمود شاہ کے خلاف مہم کے لیے جو فوج فراہم کی تھی اس سے اس کے ذرائع میں بہت کھینچا تانی پڑ گئی تھی۔ اب اس کو ہمایوں سے مورچہ لینے کے لیے دوسری فوج منظم کرنی تھی۔ ضرورت قانون و اخلاقی اصول کی پرواہ نہیں کرتی۔ اسی ضرورت نے شیر کو مجبور کر دیا کہ وہ بیوہ ضعیفہ بی بی فتح ملکہ کی دولت غصب کرے۔ ایک وقت تھا جب شیر خاں نے اس کو بندھیل کھنڈ میں پناہ لینے سے اس کی جان و مال کی حفاظت کا خود ذمہ لے کر منع کیا تھا۔ اور وعدہ وفا کرنے کی قسم بھی کھائی تھی۔ مگر یہ وعدہ تین سال پیشتر کا تھا۔ جبکہ ببن اور بایزید کے ساتھی دوراہہ کی لڑائی کے بعد مغلوں کے انتقام سے بچنے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ بی بی فتح ملکہ مشہور و معروف امیر کالا پہاڑ فارمولی کی دختر تھی۔ جو سلطان بہلول لودی کا بھانجا تھا۔ بی بی فتح ملکہ اپنے کفایت شعار باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بوقت شادی وہ اپنے شوہر میاں محمد فارمولی کے لیے ۶۰۰ من سونا بطور جہیز لے کر آئی تھی۔ اس کا شوہر اودھ کے نامی گرامی شخص مستفی فارمولی کا لڑکا تھا۔ لودی عہد کی اس بیوہ کی دولت پر دست درازی کرنا آسان کام نہیں تھا۔ شیر خاں نے اس بیوہ کو ۳۰۰ من سونا بطور عارضی قرضہ دینے کے لیے راضی کر لیا۔

عسکری تاتار خاں کے خلاف جنگ کر رہا تھا۔ اس کے بعد ہمایوں کافی عرصہ تک آگرہ میں مقیم رہا۔ بہادر شاہ کو تین خط لکھے اور ان کے جواب موصول ہوکے ایک دفعہ کی خط و کتابت میں کم از کم ۴۰ دن ضرور لگتے ہوں گے۔ اس تاریخ کے لیے دیکھیے۔ اکبر نامہ (صفحہ ۳۰۰)

Marfat.com

بقیہ اس کی ضرورت کے لیے بہت کافی تھا۔شیر خاں نے چند گاؤں بھی اس کے گذارہ کے لیے دیدیے۔ (عباس۔ صفحہ ۱۲۵) اس کے علاوہ شیر خاں نے اس کے ساتھ مہر و مروت کا سلوک کیا۔ اور اپنے دوسرے لڑکے آتش طبع جلال خاں کو اس کے ناپاک ارادہ سے روکا۔ جلال خاں مہر سلطان سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کی دولت پر نگاہ لگائے ہوئے تھا۔ فتح ملکہ کے باپ نے نیامو نام کے ایک لڑکے کو گود لے لیا تھا۔ مہر سلطان اس نیامو کی لڑکی تھی۔ اگر یہ نکاح ہو جاتا تو اس ضعیفہ کے لیے دولت کے نقصان سے یہ بات کہیں زیادہ خفت آمیز ہوتی۔ مگر شیر خاں نے اپنے لڑکے کو سخت تاکید کر دی کہ وہ یہ کام نہ کرے۔

پھر بھی شیر خاں نے بی بی فتح ملکہ کے ساتھ وعدہ خلافی تو کی ہی۔ اس کا یہ فعل قابل مذمت ہے۔ اور کوئی دلیل اس کی تائید میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ یہ بات ضرور ہے کہ اس نے اس دولت کے لیے بیوہ کے ساتھ وہ ظالمانہ اور بیرحمانہ سلوک نہیں کیا جو کہ وارن ہیسٹنگز نے اودھ کی بیگمات کے ساتھ ان کی دولت کو ہڑپنے کے لیے کیا۔ بہرحال زمانہ کسی کو معاف نہیں کرتا۔ دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کہنا ہی پڑتا ہے۔

ہمایوں کی بہادر شاہ سے لڑائی اور شیر کا بچ نکلنا

روایت ہے کہ بنگال کو جاتے ہوئے راستہ میں ہمایوں کو چتوڑ کی رانی کرما وتی کی راکھی ملی۔ اور رانی کی اس پاکیزہ درخواست پر وہ فوراً اس کی مدد کے لیے واپس لوٹ پڑا۔ لیکن اسے چتوڑ پہونچنے میں دیر ہو گئی۔ چتوڑ پر بہادر شاہ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اور رانی رسم جوہر ادا کر چکی تھی۔ ہمایوں وہاں جا کر صرف اتنا ہی کر سکا کہ اس نے رانی کے لڑکے بکرماجیت کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس واقعہ کی کوئی تاریخی سند نہیں ہے[1] یہ بعد کے بھاٹوں کی تیاس آرائی ہے جسے ٹاڈ نے

---

[1] تنقید کے لیے دیکھیے۔ ساتویں باب کا ضمیمہ اول۔

Marfat.com

اپنی تصنیف میں جگہ دی ہے۔ یہ کہنا کہ رانی کرم وتی کی راکھی کی وجہ سے ہمایوں شیر کے خلاف مہم چھوڑ کر بہادر شاہ کی جانب مڑ گیا بادشاہ کو ایک سنگدل غدار و عیار تسلیم کرنا ہے۔ کیوں کہ اپنے اس فعل سے نہ تو وہ محافظ دین ہی رہتا ہے نہ مرد میدان و رستم رزم۔ اگر ایک جگہ کسی مسلمان کے جہاد میں رخنہ اندازی کرنا کفر ہے تو کیا یہ کار ثواب ہے کہ اسی مسلمان کی غیر محفوظ جائیداد پر دوسری جگہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا جائے۔ اور یہی تھا جو ہمایوں نے کیا۔ فرض کر لیا جائے کہ ہمایوں کو کرم وتی کی راکھی کالپی میں مل گئی تو بھی بہادر شاہ کے حملہ سے چتوڑ کو بچانے کے لیے اس کے پاس کافی وقت تھا۔ لیکن جواں مرد۔ ذی حوصلہ۔ ہمایوں نے چندیری اور رائے سین کا راستہ اختیار کیا۔ وہاں سے سارنگ پور کا اور پھر وہاں سے جنوب کی جانب ابین کو مڑا۔ جب تک بہادر شاہ کا جہاد ختم نہ ہو گیا وہ چتوڑ جانے میں برابر تساہل کرتا رہا۔ یہ ہمایوں کا کون سا نیک کام تھا جو اس نے بہادر شاہ کے عذر و معذرت کو تسلیم کر لیا اور آگرہ سے روانہ ہونے سے پیشتر اس سے صلح کر لی اور بعد میں بنگال میں حملہ کرنے کے بہانہ سے اس کے علاقہ مالوہ پر قبضہ کر لیا۔ بہر حال ہمایوں کے ثنا خوانوں اور مدح سراؤں نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ اس معاملہ میں یہ قیاس آرائی کی جا سکتی ہے کہ یا تو دیندار ہمایوں پر ذرا دیر کے لیے شیطان غالب آ گیا۔ اور اس نے ہمایوں کو مالوہ فتح کرنے کی ترغیب دی۔ کیوں کہ اس کو مالوہ کی اشد ضرورت تھی یا ہمایوں کو جو کہ دنیاوی معاملات میں عقل کم استعمال کرتا تھا اس کے ہمرکاب سرداروں مثلاً مرزا عسکری وغیرہ نے بہکا دیا کہ ملیریا کے بنگال کو فتح کرنے سے یہ زیادہ بہتر ہو گا کہ وہ اخلاقی اصولوں کو خیر باد کہہ کر غیر محفوظ مالوہ پر جو نزدیک بھی ہے قبضہ کرے۔ اس طرح قدرت یا مشیئت ایزدی نے شیر شاہ بہادر شاہ اور ہمایوں ہر ایک کے مستقبل پر جداگانہ اثر ڈالا۔

شیر کو جب یہ خبر ملی کہ ہمایوں کی فوج چندیری اور رائے سین کی جانب گامزن ہے تو اس کو حیرت تو ضرور ہوئی لیکن دل کو بڑا سکون ملا۔ اس نے فوراً اپنے لڑکے قطب خاں اور اس کے اتالیق عیسیٰ خاں حاجب کو یہ ہدایت کی کہ

Marfat.com

مناسب موقع ملتے ہی وہ معہ اپنے تمام دستہ کے مغل لشکر کو چھوڑ کر چلے آئیں
چنانچہ جب مارچ ۱۵۳۵ء کے آخری ہفتہ میں ہمایوں اور بہادر شاہ کی فوجوں کا
مندسور کے مقام پر تصادم ہوا تو وہ چپ چاپ وہاں سے فرار ہو گئے۔ محمود
شاہ بنگال کے لیے مغل فوج کی امداد محض ایک سراب ثابت ہوئی۔ جیوں جیوں
اس کی حالت بدتر ہوتی چلی گئی۔ مغل فوج کی امداد کی امید بھی دور سے دور تر
ہوتی گئی۔ اور ہمایوں گجرات اور مالوہ کی شاندار لیکن مغالطہ آمیز فتح کے
خواب میں مصیبت کی دلدل میں پھنستا چلا گیا۔

مئی ۱۵۳۵ء کے آغاز میں شیر خاں نے بڑے اطمینان سے دریائے گنگا
کے ہر دو جانب بنگال کے علاقہ کو اپنے قبضہ میں کرنے کے لیے جنگ کا بگل
بجا دیا۔ کسی بھی فارسی زبان کے مورخ نے اس لڑائی کا تفصیل سے ذکر
نہیں کیا ہے۔ عباس نے صرف یہ لکھا ہے "بی بی فتح ملکہ کے زر سے ایک فوج
فراہم کر کے اس نے بنگال کے علاقہ پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اور گڑھی تک
کے کل اضلاع اپنے تصرف میں کر لیے۔" (قلمی نسخہ صفحہ ۱۲۶)۔ لیکن یہ اس لڑائی
کی تفصیل نہیں بلکہ صرف لب لباب ہے۔ البتہ پرتگالی مورخین کے بیان سے
یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیر خاں نے ۱۵۳۵ء میں محمود شاہ بنگال کے خلاف فوج
کشی کی۔ اور ۱۵۳۶ء میں تیلیا گڑھی مقام (عباس نے جسے گڑھی لکھا ہے)
پر تسلط کر لیا۔ واقعات کے سلسلے سے یہ ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ شیر خاں
کی مہم کے آغاز (۱۵۳۴ء) اور آئندہ سال گڑھی پر قبضہ (۱۵۳۶ء) کے بیچ کافی
وقفہ رہا ہوگا۔ لہٰذا اغلب یہ ہے کہ برسات شروع ہونے سے پہلے شیر خاں
نے محض مونگیر ضلع پر ہی قبضہ کیا ہو۔ کیوں کہ موسم برسات میں مشرق کی جانب
موجودہ بھاگلپور کے نشیبی علاقہ میں فوجی نقل و حرکت ناممکن تھی۔

مونگیر ضلع کا ⅔ حصہ پہاڑی اور دراروں سے پر ہے اس ضلع میں
کھڑک پور اور گدھور کی پہاڑیاں ہیں۔ کول دریا کے دہانہ سے سورج گڑھ
۶ میل ہے۔ مونگیر سورج گڑھ سے بجانب مشرق ۱۸ میل ہے اور راج محل کی
پہاڑیوں میں واقع تیلیا گڑھی مونگیر سے ۶۶ میل جانب مشرق ہے۔ سورج

Marfat.com

گڑھ کے مقام پر کشادہ میدان کی چوڑائی ۶ میل ہے۔
یہ مونگیر کے مقام پر صرف ۲½ میل رہ جاتی ہے۔ سورج گڑھ سے مونگیر تک کا ۱۸ میل کا یہ فاصلہ کسی بھی حملہ آور کے لیے جو بجانب مغرب دریائے گنگا کے جنوبی کنارے سے حملہ کرنا چاہتا ہو حوصلہ شکن ہے اس سڑک کے ہر دو جانب جنوب و مشرق میں کھڑک پور کی پہاڑیاں ہیں۔ جو مونگیر کے مقام پر تقریباً گنگا سے ہم کنار ہیں۔ اس کے مشرقی کنارے پر مونگیر کا ناقابل تسخیر قلعہ ہے۔ اس کا فتح کرنا کسی بھی غنیم کے لیے اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس کے پاس بھاری توپ خانہ نہ ہو اور گنگا پر اس کا قبضہ نہ ہو۔ کوئی بھی دانا دوراندیش فوجی سپہ سالار ایسی مہلک جگہ میں اپنے کو جھونکنا پسند نہ کرے گا۔ شیر سے اس قسم کی غلطی کی توقع نہ تھی۔ اگر وہ ایسی غلطی کر جاتا تو اس کی حالت ہمایوں کی چنار کی حالت سے بھی بدتر ہوتی خواہ بنگال کی طاقت مونگیر کے تحفظ کے لیے کتنی ہی کم ہوتی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں بنگالی اپنی حسب مرضی شیرؔ سے لڑنا چاہتے تھے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس مہم میں شیر خاں نے مونگیر اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ جانب مشرق اپنے تسلط میں کر لیا۔ اس نے یہ کیسے کر لیا۔ اس کا اندازہ صرف اس طرز جنگ سے کیا جا سکتا ہے جس کو میر جملہؔ جیسے ایک کم شعور جنگجو نے اپنایا۔ یہ واقعہ ۱۲۵ سال بعد ظہور پذیر ہوا جب کہ سورج گڑھ کے مقام پر اس کے سامنے بعینہٖ اسی طرح کی صورت حال تھی اور شاہجہاں کے لڑکوں میں جنگ وراثت چل رہی تھی۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ شیر خاں نے سورج گڑھ کی لڑائی میں اس

---

[1] ۱۶۵۹ء میں شجاع مونگیر میں تھا۔ اس نے ایک عرصہ میر جملہ کی فوج کو سورج گڑھ میں روکے رکھا۔ میر جملہ مونگیر جانے کے لیے شجاع کی فوج سے آمنے سامنے کی ٹکر نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے ایک دشوار راستہ اختیار کیا جو کھڑک پور کی پہاڑیوں سے ہو کر گزرتا تھا۔ وہ اس راستہ سے مونگیر کے ۱۴ میل جنوب مشرق پیالہ پور مقام پر پہنچ گیا۔ (سرکار ہسٹری آف اورنگ زیب جلد ۲۔ صفحہ ۲۳۹)۔

Marfat.com

مقام کے نزدیک فتح حاصل کی جہاں وہ سال گذشتہ میں بنگالیوں کی ناکہ بندی کو توڑنے میں ناکام رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی اس مہم کو سورج گڑھ کی فتح سے ہی شروع کیا تھا۔ اس وقت بنگالیوں نے اس کی حفاظت کے لیے اور بھی سخت بندوبست کر لیا ہوگا شیر خاں نے دشمن کو دھوکہ دینے کے لیے ایک چال کھیلی۔ اس نے غالباً اپنی فوج کا ایک دستہ سورج گڑھ پر حملہ کرنے کی غرض سے اس جگہ چھوڑا۔ اور خود باقی فوج کو لے کر کول کے کنارے کنارے ۵ میل جنوب (یعنی اس جگہ سے جہاں کول گنگا میں ملتی ہے) ایک ایسے مقام پر پہونچ گیا۔ جو ملی پور سے کچھ جنوب میں ہے۔ جہاں کھڑک پور کی پہاڑیوں کی چوڑائی ختم ہو جاتی ہے۔ (رینل نے اس مقام کا نام ملچی پور لکھا ہے) ملی پور اور گدھور قصبہ کے درمیان اندازاً ۱۰ میل کا ایک کشادہ میدانی علاقہ ہے۔ شیر اس علاقہ کو طے کر کے گنگا کو مونگیر سے کئی میل نیچے پار کرنے کے ارادہ سے شمال مشرق کی جانب چل پڑا۔ اس طرح اس نے بنگالیوں کو سامنے اور پیچھے دونوں جانب سے گھیر لیا۔ اب بنگالی صرف کشتیوں کے ذریعہ ہی گنگا کو عبور کر کے بھاگ سکتے تھے۔ سورج گڑھ اور مونگیر پر قبضہ کرنے کے بعد ہی شیر کی اس مہم کا خاتمہ ہو گیا۔

اسی دوران ہمایوں نے بھی حیرت انگیز فتوحات حاصل کیں۔ اس کے حملوں کی تاب نہ لا کر بہادر شاہ کی عظیم الشان سلطنت تاش کے پتوں کی مانند بکھر گئی۔ سلطان بہادر شاہ میں تمام شاہی اوصاف تھے۔ محض ایک کمزوری تھی۔ اس میں بذات خود میدان جنگ میں فوج کی کمان سنبھالنے کی صلاحیت نہ تھی۔ اور نہ وہ کسی نازک مسئلہ پر فی الفور کوئی رائے قائم کر سکتا تھا۔ مغل بادشاہ اپنی فوج کی تنظیم جس طریقہ پر کرتے تھے وہ اس کا دلدادہ تھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ اپنی فوج کی تنظیم بھی اسی طرز پر کرے۔ لیکن وہ اس طرز میں مغلوں جیسی لچک پیدا کرنے میں قاصر رہا۔ اس نے مغلوں کی تقلید میں ایک بڑا توپ خانہ مرتب کیا۔ جو میدان جنگ اور بوقت محاصرہ کارگر ثابت ہو۔ اس توپ خانہ میں ترکی افسروں کے ماتحت ماہر گولہ انداز تھے۔ اس نے روم کے ایک خوش قسمت سپاہی خداوند کو اس توپ خانہ کا افسر اعلیٰ مقرر کیا۔ اور اسے رومی خان کا

Marfat.com

خطاب عطا فرمایا۔ رومی خاں بادشاہ کا داہنا ہاتھ بن گیا تھا۔ وہ اس قسم کے طرز جنگ کا زبردست حامی تھا۔ جس میں جنگ کا مکمل انحصار توپ خانہ اور بندوقچیوں پر ہو۔ وہ رسالہ کو فوج کا ثانوی جُز سمجھتا تھا۔ بہادر شاہ کی فوج میں رسالہ کی تعداد بھی کافی تھی۔ صدر خاں اور عماد الملک جیسے عالی حوصلہ اور خوش تدبیر افسر تھے۔ پھر بھی فن حرب میں رسالہ کا نمبر دوسرے درجہ پر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہادر شاہ کے دربار میں اور مجلس جنگ میں جدید اور قدیم طریقہ کے حامیوں میں زبردست رسہ کشی ہونے لگی۔ کچھ روز تک بہادر شاہ کی فراست اور سیاسی دانشمندی ان دونوں فریقوں کو ایک جگہ ملائے رہی۔ لیکن مندسور میں مجلس جنگ کے جلسہ میں ان کے باہمی اختلاف ابھر کر سطح پر آگئے اور رشتہ ٹوٹنے کی نوبت آگئی۔ صدر خاں اور رسالہ کے دیگر افسران کو اپنے سپاہیوں کی جرأت و شجاعت پر یقین کامل تھا۔ انہوں نے جنگی کونسل میں یہ تجویز پیش کی کہ مغل فوج پر فوراً حملہ کر دیا جائے۔ لیکن رومی خاں نے اس تجویز کو مہلک اور مخدوش سمجھ کر اس کی پرزور مخالفت کی۔ اس کا خیال تھا کہ مغل فوج کو برباد کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اسے توپ خانہ کی زد میں لایا جائے۔ بہادر شاہ بذات خود سیاست داں و مدبر تو تھا مگر فنون جنگ سے بے بہرہ۔ اس نے اپنے منظور نظر رومی خاں کی تجویز کو سمجھ کر ترجیح دی کہ اس میں خطرہ کم ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوج میں جوش کم ہو گیا۔ اب سپاہیوں کو خندقیں کھود کر ان میں بٹھا دیا گیا۔ اور رومی توپ خانہ ان کی حفاظت کے لیے لگا دیا گیا۔ اب تک تو رومی خاں کو بہادر شاہ کے ہندوستانی مخالفین کے خلاف جنگ میں اس طرح کامیابی ملی تھی جیسی کہ ڈی بوئن کے فوجی دستہ کو سندھیا کے راجپوت و مغل دشمنوں پر نصیب ہوئی۔ لیکن اب پہلی بار پانی پت کے مابعد طرز جنگ کا اصلی اور نقلی روپ میدان جنگ میں ایک دوسرے سے ٹکر لینے کو سامنے آیا۔

۹۳۵ھ کے رمضان کا آخری ہفتہ تھا۔ روزہ اور زہد اسلام کے اصلی جز ہیں مگر سفر اور میدان جنگ میں لازم نہیں ہوتے چنانچہ ایک روز مغلوں کے

Marfat.com

ایک دستہ نے جو بے کاری اور تساہل سے بیزار ہو چکا تھا اور خورد و نوش سے شکم پُر۔ یہ تہیہ کیا کہ دشمن کو اپنے جوہر دکھلائیں۔ شراب سے سرشار دو سو جنگجو نکل پڑے۔ اور انہوں نے گجراتیوں کے ایک چار ہزار کے دستہ کو جو کہ پڑاؤ کی حفاظت کر رہا تھا مار بھگایا۔ اس کے بعد گجراتیوں نے اپنی توپ خانہ کی ناکہ بندی سے باہر نکلنے کی ہمت نہ کی۔ دونوں فریق اب باخبر ہو گئے۔ اور ایک دوسرے کے حملہ کا انتظار کرنے لگے۔ مغلیہ یعنی رومی صف آرائی اس کی مقتضی نہ تھی کہ آگے بڑھ کر حملہ آور ہو۔ کیوں کہ ایسا کرنا اس کے لیے مضر اور پراگندہ کن ہوتا جب کہ مدافعانہ طرز جنگ میں اس کو تمام مفاد حاصل تھے۔ وہ قلعہ کی جائے پناہ سے لڑ سکتے تھے۔ اس کے میمنہ اور میسرہ دشمن کے بازوؤں اور عقب کو پریشان کر سکتے تھے۔ اور ان کو توپوں کی ہلاک کن زد میں لا سکتے تھے۔ چنانچہ بہادر شاہ کی فوج کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ مغل فوج کو آگے بڑھنے کے لیے کس طرح اشتعال دے انجام کار عین عید کے دن ۱۴ر اپریل ۱۵۳۵ء کو محمد زماں مرزا نے جو طریقہ جنگ کا ماہر تھا اور بہادر شاہ کے یہاں پناہ گیر تھا۔ اپنی قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے تقریباً ۵۰۰ یا ۶۰۰ گھوڑ سوار لے کر ہمایوں کی فوج پر حملہ کر دیا۔ دو تین بار تیروں کی بوچھار کی اور پھر پار تھین لوگوں کی طرح بھاگ کھڑا ہوا۔ ہمایوں کی فوج اس کے اس جال میں پھنس گئی۔ اس نے بھاگتی ہوئی گجراتی فوج کا تعاقب کیا اور اچانک رومی توپ خانہ کی زد میں آگئی۔ بڑی تعداد میں جان کا نقصان ہوا اور مغل گھوڑ سوار سر پر پیر رکھ کر بھاگ گئے۔ (اکبر نامہ ۱- ۳۰۲- ۳۰۳)

تین ہفتہ تک میدان رزم میں خاموشی چھائی رہی۔ ہمایوں عام حملہ کے لیے تیاریاں کر رہا تھا۔ ۲۴ر اپریل ۱۵۳۵ء بروز شنبہ آدھی رات کے وقت بہادر شاہ کی جانب سے توپوں کی متواتر آواز سن کر مغل ششدر ہو گئے۔ یہ سمجھ کر کہ اب دشمن کا حملہ ہونے والا ہے ہمایوں کی تیس ہزار فوج صبح تک صف آرا کھڑی رہی۔ لیکن بہادر شاہ کی جانب سے کسی قسم کی فوجی نقل و حرکت کے آثار نمایاں نہ ہوئے۔ وہاں سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ گجرات کی کثیر التعداد

Marfat.com

فوج دشمن کی ایک بھی گولی کھائے بغیر پانی کے بلبلہ کی مانند درہم برہم ہوگئی۔ ان کے خیمے ویران ہوگئے اور توپ خانہ نیست و نابود۔ حتیٰ کہ ہاتھیوں کو بھی خود ہی گولی سے ہلاک کر دیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ دفعتہً کیوں ہوا۔ دراصل تین ہفتہ کے عرصہ میں ہمایوں نے طرز جنگ یک قلم بدل دیا۔ اب مغل فوج نے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر بہادر شاہ کی رسد کے ذرایع بند کر دیئے۔ یہ ایک ایسا اتفاقی حادثہ تھا کہ جس کا اندازہ نہ تو بہادر شاہ نے لگایا تھا نہ اس کے منظور نظر رومی خاں نے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہادر شاہ کو یہ سانحہ عظیم برداشت کرنا پڑا۔ مغلوں نے بہادر شاہ کی فوج کا پیچھا کیا۔ بڑی مشکل سے گجراتی رسالہ کی مدد سے بہادر شاہ مانڈو تک پہونچ سکا۔ ۴ دن بعد ہمایوں بھی وہاں پہونچ گیا۔ اب بہادر شاہ کا حوصلہ پست ہو گیا۔ ایک ماہ بعد جون ۱۵۳۵ء کو بہادر شاہ مانڈو سے فرار ہو گیا ہمایوں نے کھمبات تک اس کا پیچھا کیا۔ اب گجرات کی تمام سلطنت ہمایوں کے پیروں کے نیچے تھی۔ اس نے مرزا عسکری کو وہاں کا گورنر بنا دیا۔ اور ۱۵۳۶ء کے شروع میں مانڈو لوٹ آیا۔ مالوہ کی خوش گوار صحت بخش آب ہوا نے ہمایوں کو پھر کاہل الطبع آرام طلب بنا دیا۔ شیر اور محمود شاہ بنگال کا خیال اس کے ذہن سے بالکل نکل گیا وہ یہ بھی بھول گیا کہ مندسور کی لڑائی میں شیر کا دستہ اس کو دغا دے کر بھاگ گیا تھا۔ اور اس عیاری و ریاکاری کے پس پردہ ان کے ناپاک ارادے کیا تھے۔ شیر کی دلی خواہش تو یہ تھی کہ ہمایوں مغرب میں گجرات سے آگے بھی اپنی فتوحات کا دایرہ وسیع کرتا رہے تاکہ اس دوران میں اس کو بنگال فتح کرنے کا پورا پورا موقع مل جائے۔

محمود کا شیر کے خلاف پرتگالیوں سے امداد کی درخواست

سلطان محمود سیاسی افق پر کسی نشان سیاہ کا متلاشی تھا۔ جو کچھ دن بعد خطرناک طوفان بن کر شیر خاں پر برس پڑے۔ اور بنگال کو اس کے جارحانہ حملوں

Marfat.com

سے چند روز کے لیے نجات مل جائے۔ اس کا خیال تھا کہ ۱۵۳۵ء کے موسم گرما میں شیر تلیا گڑھی پر ضرور حملہ کرے گا۔ ہمایوں اس وقت اتنی دور ہو گا کہ شیر خاں کے دل میں اس کے حملہ کا کوئی خدشہ نہ ہو گا۔ چنانچہ اسے گڑھی کی حفاظت ہر قیمت پر خود ہی کرنی تھی۔ کیوں کہ بنگال کی حفاظت کے ہر پہلو سے گڑھی کا اس کے تسلط میں رہنا اشد ضروری تھا۔ انتہائی ناامیدی کی حالت میں سلطان نے پرتگالی سمندری ڈاکو کپتان "مارٹم افونسو ڈی میلو جسارٹے" سے مشورہ کیا جو اس وقت گوڑ میں قید تھا۔ پرتگالی کپتان نے سلطان کو ہر ممکن طریقہ کی مدد کا یقین دلایا بشرطیکہ سلطان گوا کے گورنر "نونو ڈا کنہا" سے اس متعلق بات چیت شروع کردے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ فی الحال جو چند پرتگالی جہاز اور سپاہی خلیج بنگال میں موجود ہیں وہ افغانوں کے گڑھی پر ہونے والے حملہ کو روکنے کے لیے کافی ہیں۔ سلطان نے پرتگالی قیدیوں کو فوراً رہا کر دیا۔ اور اس طرح مارٹم قید خانہ سے نکل کر سلطان کا معتبر فوجی مشیر بن گیا۔

وہ سلسلہ واقعات جن کی وجہ سے پرتگالی گوڑ میں آئے مختصراً قابل بیان ہے کیوں کہ سولہویں صدی کے ادبار بنگال میں اس سے ایک افسوس ناک باب کا آغاز ہوتا ہے۔

البوقرق کے عہد سے ہی پرتگالی بنگال کی پوشیدہ دولت کی راز افشانی کے لیے متواتر کوشاں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مشرقی بنگال کے سات گاؤں (موجودہ پولیس چوکی مگرا ضلع ہگلی۔ اب ایک ویرانہ) اور چٹگاؤں کی بندرگاہوں پر تسلط کر لیں۔ سات گاؤں تک پہونچنا تو آسان تھا مگر وہ بہت دور اندر کی طرف واقع تھا۔ جب چٹگاؤں کو کھوجنے کی پرتگالیوں کی کئی کوششیں ناکام ہوگئیں تب گوا کے گورنر لونو ڈا کنہا نے مارٹم افونسو ڈی میلو جسارٹے کو اس مقصد سے ایک پروانہ دیا کہ وہ چٹگاؤں کے بندرگاہ کی کھوج کرے لیکن اس کا جہازی بیڑہ جو ۶ جہازوں پر مشتمل تھا ایک طوفان کی زد میں آکر تتر بتر ہو گیا۔ اور اراکان کے سمندری کنارے پر جا لگا۔ مارٹم افونسو ایک چھوٹے سے جہاز میں چٹگانگ کے کنارے تک پہونچ گیا۔ لیکن وہ دریائے کرن

Marfat.com

فالی کو جس کے دہانہ پر یہ بندرگاہ واقع ہے نہ پہچان سکا۔ اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ خلیج بنگال میں اس مقام پر ۵۰ میل کے اندر اندر تین دریا آ کر ملتے ہیں۔ کرن فالی۔ سام کھا۔ مت مہری۔ پرتگالیوں نے سمندر سے کچھ مچھیرے گرفتار کر لیے۔ جو کہ اپنی ناؤں میں مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ اور ان کی مدد سے اپنے جہاز کو چٹگاؤں کی جانب لے گئے۔ مچھیرے اس جہاز کو مت مہری ندی کے دہانہ پر لے آئے۔ اس وقت سمندر جوار پر تھا۔ پرتگالی جہاز چکریا تک پہونچ گیا۔ یہ چھوٹا سا قصبہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ارکان کے راجہ کی ملکیت میں تھا۔ مت مہری دریا تنگ اور اتھلا ہے جب دریا کے جزر کا وقت آیا تو پرتگالی جہاز اس میں پھنس گیا۔ چکریا کے گورنر خدا بخش خاں نے مارٹم اور اس کے دیگر ملاحوں کو گرفتار کر لیا۔ اور بحری ڈاکو سمجھ کر قید خانہ میں ڈال دیا۔ انہوں نے ایک بار قید خانہ سے فرار ہونے کی کوشش بھی کی لیکن ناکام رہے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو اور بھی اندر لے جا کر بند کر دیا گیا۔ مارٹم کا ایک خوبصورت بھتیجہ تھا جس کو اوہام پرست ہندوؤں نے بطور قربانی دریا کی نذر کر دیا۔ کیوں کہ عموماً یہ قربانی سفید بھیڑ کی دی جاتی تھی۔ مارٹم کو محمود نے ۱۵۰۰ پونڈ جرمانہ لے کر بری کر دیا اور وہ ۱۵۳۳ء میں گوا واپس چلا گیا۔

۱۵۳۳ء میں گوا کے گورنر نے مارٹم افونسو کو دوبارہ اپنا نمائندہ بنا کر چٹگانگ بھیجا تا کہ وہ بنگال کے سلطان سے گوڑ میں فیکٹری قائم کرنے اور تجارتی رعائتیں حاصل کرنے کے متعلق بات چیت کرے۔ اور پر امن طریقہ سے تجارت کرنے کی اجازت لے لے۔ وہ ۵ جہاز لے کر روانہ ہوا۔ اس دفعہ چٹگاؤں کے مسلم گورنر نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ لیکن مارٹم کمینہ و رذیل تھا۔ اس نے عالی رتبہ پا کر بھی اپنا کمینہ پن نہیں چھوڑا۔ اس نے اپنے مال کو بلا چنگی دیے چوری سے اندر لانا شروع کر دیا۔ اور اپنے جارحانہ و غیر منصفانہ رویہ سے رعایا کو شاکی بنا دیا۔ مارٹم نے اپنا ایک سفیر مسمی "ڈوارٹے ڈی ازی ویڈو" کو بیش قیمتی نذر و تحفہ لے کر سلطان محمود کے دربار میں بھیجا۔ ان تحائف میں کچھ خوشبودار پانی کی بوتلیں بھی تھیں۔ جن پر چسپاں کاغذ جیسا کا تیسا تھا جس

Marfat.com

سے یہ ظاہر ہو گیا کہ ان کو کسی مسلم جہاز سے سمندر پر لوٹا گیا ہے اس بات سے ناراض ہو کر محمود نے مارٹم کے سفیر اور اس کے ساتھیوں کو قتل کا حکم دیدیا۔ لیکن ایک مسلم فقیر ولی اللہ کی سفارش سے ان کی جان بچی اور انہیں گوڑ کے قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ سلطان نے فرمان جاری کیا کہ چٹگانگ میں مارٹم اور اس کے سب ساتھیوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ چٹگانگ کے مسلم گورنر نے مارٹم اور اس کے ساتھیوں کو دعوت پہ مدعو کیا۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے دس سپاہی لڑتے لڑتے ہلاک ہو گئے۔ اور باقی ماندہ کو گرفتار کر کے گوڑ بھیج دیا گیا۔ جب اس گرفتاری کی خبر گوا پہونچی تو نونو ڈا کنہا نے ایک طاقتور جہازی بیڑہ اینٹونیوڈی سلوا مینیز کی کمان میں بھیجا اور تاکید کی کہ حتی الامکان پرامن طریقہ سے اور اگر ضرورت پڑے تو بذریعہ تشدد مارٹم اور اس کے ساتھیوں کی رہائی کا انتظام کرے۔ جب پرتگالی ایڈمرل اینٹونیو کو اس کی گستاخانہ مانگ کا کوئی جواب نہ ملا تو اس نے چٹگاؤں کے بندرگاہ کو نذر آتش کر دیا۔ اور بے گناہ رعایا کو تہ تیغ کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۵۳۴ء میں سرزد ہوا۔ اور ۱۵۳۵ء میں دوسرا پرتگالی کپتان "ڈا ایجو ربیلو" مشرقی بنگال میں سات گاؤں پہونچا۔ اور اس نے بندرگاہ کا گھیراؤ ڈال دیا۔ اس مرتبہ جب

جبر و تشدد سلطان محمود کے ارادہ کو بدلنے میں ناکام رہے تو قسمت نے پرتگالیوں کا ساتھ دیا۔ شیر کے حملہ کے ڈر نے سلطان کو پرتگالیوں کی مدد کا محتاج بنا دیا۔ سلطان کا پرتگالیوں سے امداد طلب کرنا بے معنی نہ تھا کیونکہ بے وفا اور شورش پسند ہونے پر بھی پرتگالی اپنے زمانہ کے سب سے بے باک لڑاکو اور بہترین نشانہ باز تھے۔

شیر کا گوڑ پر پہلا حملہ جنوری ۱۵۳۶ء

۱۵۳۵ء کے آخری پانچ مہینوں میں مغل فوج کی نقل و حرکت اور ہمایوں کے موہوم رخ نے شیر کو امید و بیم اور بے کاری کی کیفیت میں رکھا جو واقعات

Marfat.com

دور دراز بنگال اور بہار میں اس وقت ظہور پذیر ہو رہے تھے وہی صورتحال کی کلید تھے۔ شیر خاں کا خیال تھا کہ ہمایوں کو گجرات اور مالوہ فتح کرنے میں کافی عرصہ لگے گا لیکن بہادر صرف مٹی کا پتلا ثابت ہوا۔ مغلوں نے اس کا قلع قمع کر ڈالا اور اس کی پولٹیکل اہمیت کو مٹا کر اس کو بحر عرب تک کھدیڑ دیا۔

ہمایوں کے پاس یا تو خبر رسانی کا کوئی محکمہ ہی نہ تھا اور یا اس کے مخبر رشوت کھا کر شیر کے متعلق اس کو غلط خبریں پہونچاتے تھے جیسا کہ اس کی مشرقی معاملات سے متعلق جملہ کاروائیوں سے ظاہر ہوتا ہے اس کے برعکس عباس اور دیگر مورخ اس بات کو زور دیکر کہتے ہیں کہ شیر خاں کے جاسوس ہر جگہ موجود تھے خاص کر مغل کیمپ میں جہاں اس کے بلا علم ایک چوہا بھی نہ ہل سکتا تھا۔ ۱۵۳۵ء کے موسم خزاں میں جب کہ ہمایوں گجرات کے مسئلہ کو سلجھانے میں احمد آباد میں مصروف تھا مالوہ کے علاقہ پر بہادر شاہ کے طرفداروں نے دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس دفعہ باغیوں کے سرغنہ مانڈو کا ملو خاں تھا۔ اس کا سکندر خاں بنڈیا میانہ اور بنڈیا کا ہتر زبنور تھے۔ انہوں نے ہمایوں کے محافظ کتب خانہ "درویش خاں" کو اجین [1] سے باہر نکال دیا۔

مالوہ کی بغاوت کوئی غیر منسلکہ واقعہ نہ تھی۔ بلکہ یہ گجراتیوں کی منصوبہ بند اور متحدہ کارروائی تھی جس کا مقصد تھا ہمایوں کو بھالو کا شکار کھلانا یعنی مسلسل لڑائی لڑکر مغل بادشاہ کو کبھی مالوہ اور کبھی گجرات کی سمت میں دوڑانا

---

[1] بہادر شاہ کی موت کے ایک سال بعد ملو خاں نے قادر شاہ کا خطاب اختیار کر لیا۔ سکندر خاں افغانوں کے میانہ قبیلہ سے تھا۔ جو ۱۶ ویں صدی کے شروع سے مالوہ کے خلجی حکمرانوں کے یہاں کرایہ کے سپاہیوں کی حیثیت سے آباد ہو گئے تھے۔ شواس دریائے نربدا کے شمالی کنارے پر مانڈو کے مشرق میں اور اجین کے جنوب جنوب مشرق میں واقع ہے۔ بنڈیا نربدا کے جنوبی کنارے پر ٹھیک شواس کے بالکل سامنے ہے زبنور جتراپی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اس کے لقب سے ظاہر ہوتا ہے۔ شواس کو سیونی مالوہ سمجھنا چاہیے۔

Marfat.com

۱۵۳۵ء کی خزاں میں بہادر شاہ بھی اپنی جائے پناہ سے باہر آ گیا تھا۔ اور عارضی سیاسی خواب سے بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے ترکی کے سلطان کے پاس امداد مانگنے کے لیے ایک سفیر بھیجا اور گجرات و کاٹھیاواڑ کی سرزمین میں جہاں کی رعایا ابھی تک اس کی نمک خوار و وفادار تھی وہ مغلوں کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکا تا رہا۔ یہی وقت شیر خاں کے لیے سازگار تھا۔ وہ بنگال پر حملہ کرنے کے لیے جس موقع کا منتظر تھا۔ وہ اب قریب آ گیا تھا کیوں کہ ہمایوں اب شیر خاں پر دفعتہً حملہ نہ کر سکتا تھا۔

وسط جنوری ۱۵۳۶ء میں شیر خاں مونگیر سے محمود شاہ کے خلاف حملہ کرنے کے لیے پہلی بار روانہ ہوا۔ اس نے مونگیر مقام کا انتخاب اس لیے کیا کہ یہ گڑھی کے درّہ پر حملہ کرنے کے لیے سب سے زیادہ مناسب مقام تھا۔ افغان مورخین نے اس حملہ کے متعلق جو ذکر کیا ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی لڑائی میں غنیم کا صفایا ہو گیا۔ لیکن پرتگالی ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۳۶ء میں شیر خاں نے پہلا حملہ گورجی (گڑھی) کے مقام پر کیا۔ اور دوسرا حملہ ایک گمنام جگہ "قرن دوز" پر کیا۔ جس کا کوئی تعین آج بھی ممکن نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ شیر آسانی سے ان دونوں مقامات پر قابض ہو جاتا کیوں کہ یہاں پر محمود شاہ کے پرتگالی ان کی محافظت کر رہے تھے۔ پرتگالی مورخین کا بیان ہے کہ ان کے ہم وطن نہایت ہی دلیری اور جانبازی سے لڑے۔ اور انہوں نے شاہی اصطبل کے ایک ہاتھی کو پکڑ لیا۔ جس پر بہت دنوں سے سلطان کا دل آیا ہوا تھا۔ شاید یہ وہی ہاتھی تھا جو شیر خاں نے سورج گڑھ کی لڑائی میں چھین لیا تھا لیکن ان کی یہ مردانگی اور شجاعت کسی کام نہ آئی۔ شیر خاں اپنے ۴۰ ہزار گھوڑسوار ۱۶ ہزار ہاتھی اور ۳۰۰ کشتیاں لے کر ایک دوسرے راستہ سے گوڑ میں داخل ہو گیا۔ (کیمیاس صفحات ۳۰۵ تا ۳۰۸)۔ تاریخ کے طالب علموں کے لیے شیر کا یہ فوجی کرشمہ بظاہر حیرت انگیز ہے لیکن اس معمہ کی کلید یعنی کم محفوظ راستہ تاریخ داؤدی میں ملتی ہے اگرچہ اس کے مصنف کو پرتگالی مواد دستیاب نہ تھا۔ تاریخ داؤدی کا بیان ہے۔

Marfat.com

"شیر خاں بنگال کو فتح کرنے کے ارادہ سے ۔ ۔ ۔ پہاڑوں کے دامن سے گزرنے والے عام راستہ سے نہ جا کر جنگل کے ایسے راستہ سے داخل ہوا جہاں اس سے پیشتر کوئی انسان نہیں پہونچا تھا ۔ ۔ ۔ اور دفعتہً گوڑ کے سامنے آ پہونچا" (سرکار قلمی نسخہ صفحہ ۱۷۴)۔

تاریخ کے ہر مصنف کا یہ فرض ہے کہ وہ اس واقعہ کی تفصیل کا پتہ لگائے اور جغرافیہ کے علم کے بغیر ہم ایسا کرنے میں قاصر ہیں۔ تاریخ میں جو واقعہ غیر واضح اور مبہم ہے وہ جغرافیہ کی مدد سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ میدان جنگ کے طبعی جغرافیہ پر ایک نظر ڈالنے سے ہمیں اس راستہ کا بہت حد تک صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ جس پر اب سے پہلے کسی نے قدم نہ رکھا تھا۔ اور جس کو گوڑ پہنچنے کیلیے شیر شاہ نے اختیار کیا تھا تاکہ وہ گڑھی کے درّہ سے بچ کر نکل جائے اور راستہ میں پرتگالیوں سے تصادم نہ ہو۔ جو کہ فراندوز شہر کی حفاظت کے لیے تعینات تھے[1]

اس زمانہ میں بہار سے بنگال جانے کا سب سے چھوٹا راستہ مونگیر۔ بھاگلپور۔ کول گونگ سے گزرتا ہوا گڑھی کے درّہ سے گزرتا تھا۔ اس درہ کی حفاظت کے لیے بہار کی سرحد میں تیلیا گڑھی کا مستحکم قلعہ بنا ہوا تھا بہار کی سرحد سے گزر کر یہ راستہ مشرقی بنگال میں سنکری گلی کے میدان سے گزرتا تھا۔ اس کو عام زبان میں "سکری گلی" بھی کہتے تھے۔ سکری گلی سے یہ سڑک گنگا کے کنارے کنارے مشرق سے مغرب کی جانب ایک دم مڑ جاتی ہے۔ اور پھر گنگا کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ تیلیا گڑھی کا قلعہ جو درہ کے مغربی کنارے پر ہے اور جس کے کھنڈہر آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سڑک کے راستہ کو بالکل روکے ہوئے ہے۔ اس قلعہ کے ایک جانب راج

---

[1] پرتگالی تاریخ کا "فرندوز" شہر غالباً رینل کے نقشہ میں "پوانیٹی" ہے۔ یہ شہر دریائے گنگا کے داہنے کنارے پر گڑھی یا تیلیا گڑھی کے شمال میں دریا کے اس پار دس میل ہے۔ گوڑ سے جنوب میں ۵۰ میل ہے۔ اور اس زمانہ میں گوڑ سے یہاں تک ایک سڑک بنی ہوئی تھی۔

Marfat.com

محل پہاڑی سلسلہ کی ناہموار ناقابل عبور ڈھلوان چٹانیں ہیں جو جانب جنوب ۸۰ میل تک سنتھال پرگنہ اور بنگال کے بیر بھوم ضلع کی بیرونی حد تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس اونچے پہاڑی درّے کے نیچے گنگا جانب مشرق تیز گرداب بناتی ہوئی بہتی ہے۔ جس سے تیلیاگڑھی کے قلعہ کے شمال میں ایک گہری کھائی بن جاتی ہے گنگا کے دوسرے کنارے پر گڑھی کے درّہ کے ساتھ ساتھ بنگال کے حکمرانوں اور فرماں رواؤں نے پوائنٹی تک زبردست قلعہ بندی کی تھی۔ پوائنٹ سے گوڑ تک اس زمانہ میں ایک شاہی سڑک جاتی تھی۔ یہ درہ فنون حرب کے نقطہ نظر سے ایسا تھا کہ نہ تو اس پر حملہ ہی کیا جاسکتا تھا اور نہ اس کا محاصرہ ہی ممکن تھا کیونکہ اس زمانہ میں حملہ کرنے کے مقابلہ میں دفاعی ذرائع زیادہ بہتر تھے۔ اس مقام کو ہم قرون وسطیٰ کے گوڑ کی "گیلیپولی" کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ اتنی مستحکم قلعہ بندی کرنے میں حکمرانوں نے سالہا سال اپنی طاقت۔ عقل و ذرائع لگائے تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مہاراجہ لکشمن سنگھ بنگال نے ۱۲۰۰ء میں ترکوں کا انتظار کیا تھا۔ لیکن بختیار خلجی نے اس کو دھوکہ دے کر دوسرا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ اس واقعہ کے ٹھیک ۳۳۰ سال بعد بنگال کے آخری سید سلطان کے ساتھ بھی یہی دھوکہ ہوا۔

شیر نے گڑھی کی جانب کوچ کیا۔ اس نے بظاہر ایسا رخ اختیار کیا کہ وہ اس درّہ پر براہ راست حملہ کر کے قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ بنگال کے سلطان نے اس درہ کی حفاظت کے لیے جسے بنگال کا دروازہ کہتے تھے۔ دو جہازوں میں فوج روانہ کی تھی۔ ایک کی کمان "جوادڈی ولالوبرس" کے ہاتھ میں تھی اور دوسری ٹکڑی "جوادکوریا" کی کمان میں تھی (کیمپوس)۔ چنانچہ یہ بات تعجب انگیز نہیں ہے کہ شیر خاں نے اپنا اصلی مقصد چھپانے کی نیت سے گڑھی کے مقام پر دیدہ و دانستہ ہار برداشت کرلی ہو۔ شیر خاں کی ۳۰۰ کشتیاں جن کا حوالہ پرتگالیوں نے دیا ہے اس وقت دریائے گنگا پر کہیں بھی موجود نہ تھیں اگر وہ اس وقت دریا پر ہوتیں تو دونوں پرتگالی جہازوں کی گولہ باری انہیں خاکستر کر دیتی۔ لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ کشتیوں کی بڑی تعداد کے بغیر گنگا کے نیچے

Marfat.com

بہار سے ہو کر شیر خاں سکری گلی کے آگے پہونچ سکتا حقیقت یہ ہے کہ شیر خاں کشتیوں کو گاڑی پر لاد کر نہیں لے گیا تھا جیسا کہ اورنگ زیب نے خانگی جنگ کے دوران کیا تھا۔ بلکہ اس زمانہ میں بنگال کے دریاؤں میں کشتیوں کی افراط تھی۔ شیر خاں نے یہ کشتیاں وہیں دستیاب کرلیں۔ اب شیر خاں نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کرلیا۔ فوج کے ایک دستہ نے اس کے دوسرے لڑکے جلال خاں کی سپہ سالاری میں گڑھی درہ پر حملہ کرنے کا سوانگ بنائے رکھا اور دوسرے دستہ کی کمان جس میں زیادہ تر گھوڑ سوار تھے اس نے اپنے ہاتھ میں لی۔ اور اس دستہ کو لے کر راج محل کے پہاڑی علاقہ سے گزر کر جانب جنوب گمنام جگہ کے لیے چل دیا۔ یہ وہی پہاڑیاں ہیں جن کا ذکر تاریخ داؤدی میں آیا ہے۔ پھر وہ جنوب مشرق کی طرف گھوم کر جھار کھنڈ کے جنگلوں میں پہونچ گیا۔ اس زمانہ میں یہ ایسا ویران علاقہ تھا کہ جہاں یا تو رہزن لٹیرے بستے تھے یا اڑیسہ کو جانے والے مسافر آتے جاتے تھے۔ اس علاقہ میں کوئی سڑک نہیں تھی۔ صرف چھوٹی پگڈنڈیاں تھیں جو گرمی کے موسم میں انسان اور مویشیوں کے لیے قابل استعمال ہو جاتی تھیں۔ کیوں کہ گنجان خار دار جھاڑیاں مرجھا کر راستہ بنا دیتی تھیں اور تیز رو پہاڑی ندیاں خشک ہو جاتی تھیں۔

شیر نے گوڑ پہونچنے کے لیے غالباً کون سا راستہ اختیار کیا ہوگا۔ اس کو جاننے کے لیے ہمارے پاس دو ذرائع ہیں۔

(۱) ریاض السلاطین کا بیان ہے کہ گوڑ سرداروں نے ایک مہینہ تک تو گڑھی کی حفاظت کی بعد ہا وہ ہار گئے۔ چوں کہ شیر خاں کے پاس اسوقت بھاری توپ خانہ نہ تھا اس لیے گڑھی پر حملہ کر کے اس پر تسلط کرنا ایک سال میں ممکن نہ تھا۔ علیٰ ہذا گڑھی کی ظاہرہ ناکامیابی کے بعد شیر خاں کا ایک ماہ بعد گوڑ پہونچنا محض ایک قیاس ہے۔ علاوہ بریں کسی بھی پرتگالی مورخ نے یہ بیان نہیں کیا ہے کہ لڑائی میں بنگال کی فوج کی شکست ہوئی۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہر دو فریق میں جم کر لڑائی نہیں ہوئی۔ بلکہ جب درہ کے محافظین کو افغان فوج نے آگے اور پیچھے دونوں جانب سے گھیر لیا تو وہ خود ہی خوف زدہ

Marfat.com

ہو کر درہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مغلوں کے زمانہ میں اس مقام پر کئی مرتبہ بڑی لڑائی کے بار ہوئی ہے۔

(۲) ابوالفضل کا بیان ہے کہ ۲ سال بعد جب شیر بنگال فتح کر کے مال غنیمت کے ساتھ بہار واپس لوٹ رہا تھا تو مغلوں نے ۱۵۳۸ء میں گڑھی کے درہ پر اس کو روک لیا۔ اس وقت شیر خاں کا دوسرا لڑکا جلال خاں درہ کی حفاظت پر تعینات تھا۔ شیر خاں نے اس کو یہ ہدایت بھیجی کہ وہ (شیر خاں) جب شیر پور پہونچ جائے تو وہ درہ کو خالی کر دے۔ اور جلد سے جلد اس سے ملنے کی کوشش کرے۔ شیر پور ایک چوکی کا نام ہے جسے شیر خاں نے خود اپنے نام پر بسایا تھا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۵۳۶ء میں جب شیر خاں بہار سے بنگال گیا ہوگا تو اسی مقام سے ہو کر گیا ہوگا۔ ورنہ شیر خاں کے ذہن میں واپس لوٹتے وقت اس مقام کا نام آنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

رینل نے اپنے نقشہ میں شیر پور کو بہرام پور کے مغرب میں ۸ امیل دور دکھایا ہے۔ اس وقت مرشد آباد سے تیلیا گڑھی کو براستہ شیر پور ایک سڑک جاتی تھی۔ اور یہ سڑک بیر بھوم۔ ڈومکا۔ نونی (ڈومکا قصبہ سے ۷امیل شمال مشرق) درّہ (نونی سے ۲۰میل شمال۔ موجودہ ڈارنام) اضلاع سے گزرتی تھی چنانچہ شیر خاں کا گڑھی سے آگے کا سفر اسی راستہ ہوا ہوگا۔ شاید درّہ پہونچنے کے لیے شیر خاں نے چیری نالہ کی خشک تلہٹی کا (تیلیا گڑھی سے ۲میل مغرب) راستہ اختیار کیا ہوگا۔ درّہ سے ۲۰میل چل کر وہ دریائے مور کے شمالی حصہ میں پہونچا ہوگا۔ پھر دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ ڈومکا مقام تک گیا ہوگا۔ ڈومکا ۱۰میل مشرق دوار کا دریا کا شمالی حصہ ہے۔ شیر پور اسی دریا کے کنارے واقع ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ شیر خاں کی فوج نے سیدھے راستہ سے ۷میل روز اور اصل راستہ سے ۱۰ یا ۱۲میل روز سفر کیا ہوگا۔ تو شیر پور کے میدان تک پہونچنے کے لیے اس کو ۳۴ دن لگنے چاہئیں۔ شیر پور سے ۳۰میل شمال مشرق بھگوان گوڈ سے چند میل اوپر گنگا بہتی ہے۔ یہاں تک سفر کرنے میں شیر خاں

Marfat.com

کے گھوڑ سواروں کو ۲ دن لگے ہوں گے۔ شیر خاں کی جن ۳۰۰ کشتیوں کا ذکر تاریخ میں آیا ہے وہ اسی گنگا کے کنارے بسنے والے لوگوں سے فراہم کی ہونگی اور وہ روزانہ استعمال ہیں آنے والی معمولی قسم کی "کوسہ" "کھلوا" "رہواز" ہوں گی۔ مارچ کے مہینہ میں کسی بھی حملہ آور فوج کے لیے گنگا کا پاٹ کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ اس کو بڑی آسانی سے ناؤ کا پل بنا کر کشتیوں کے ذریعہ پار کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی مہم کی کامیابی کے لیے دو باتیں انتہائی ضروری تھیں۔ ایک تو تیزی عمل اور دوسری رازداری۔ شیر نے یہ سفر جنگل کے نامحرم علاقہ سے کیا تھا۔ اس سفر کا مقصد بھی دوگانہ تھا۔ نئے علاقوں کی چھان بین کرنا اور حملہ کے لیے راستہ بنانا۔ اس سفر میں اس کا نہ کوئی رہنما تھا نہ رہبر۔ نہ بیربھوم کے راجہ کی طرح کوئی معاون و مددگار۔ (راجہ مذکور نے ۱۶۵۹ء میں میر جملہ کی مدد کی تھی جب اس نے چالاکی سے صاحب گنج کے نزدیک تیلیا گڑھی اور سکری گلی کے درمیان تنگ گھاٹی میں شاہ شجاع کی فوج کو شکست فاش دی تھی۔)[1]

بہر حال افغان فوج دریائے گنگا کے پار اتر چکی تھی قبل اس کے کہ بنگالی سلطان محمود کے بیڑہ کو بمقام پو اینٹی (فراندوز) یا اس سے ۸۰ میل اوپر بمقام تیلیا گڑھی یہ خبر دے سکتے۔ گنگا کو عبور کرنے کے بعد شیر خاں کی فوج پنکھے کی طرح پھیل گئی۔ اس نے پو اینٹی سے گوڑ کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ گوڑ مہانند دریا کے ۶۰ میل بجانب شمال ہے۔ مہانند ندی دریائے گنگا کی معاون ندی ہے۔ روایت ہے کہ فراندوز شہر پر تسلط کرنے میں شیر خاں کو کچھ نقصان اٹھانا پڑا۔ کیونکہ اس شہر کی حفاظت کے لیے پرتگالی

---

[1] جب تیلیا گڑھی اور سکری گلی کے درمیان مارچ ۱۶۵۹ء میں شجاع نے اپنی فوجیں جما دیں تب میر جملہ نے چکر دار راستہ لیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ میر جملہ نے قریب تر راستہ اختیار کیا۔ (تاریخ اورنگ زیب جلد ۲۔ صفحہ ۲۴۲۔ فٹ نوٹ)۔ اس واقعہ کی مستند تفصیل دستیاب ہے۔

Marfat.com

فوج تعینات تھی اور اس شہر کو فتح کیے بغیر گوڑ کی جانب بڑھنا ممکن نہیں تھا
شیر کے شاندار طریقہ جنگ کا وہی انجام ہوا جس کی توقع تھی۔ بنگال کی فوج
تیلیا گڑھی سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ تاکہ دارالسلطنت کی حفاظت کر سکے۔
جلال خاں نے گڑھی کے درہ پر ایک ماہ کے عرصہ میں قبضہ کر لیا۔ (ریاض خاں
نے جلال خاں کے بجائے شیر خاں کا نام غلطی سے لکھ دیا ہے) اور شیر کی
فوج کا براہ راست تعلق بہار کے فوجی صدر کیمپ سے کر لیا۔
شہر گوڑ کی مستحکم قلعہ بندی۔ اس کی میلوں لمبی وسعت تیر
کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی تھی۔ شہر کے ہر چہار سو خندقیں اور
قلعہ کی مضبوط فصیلیں تھیں۔ جن کی چوڑائی کسی بھی جگہ دس گز سے کم
نہیں تھیں۔ شیر خاں کے گھوڑ سوار کے نزدیک اگر نہیں لڑ سکتے تھے
اور پیادہ فوج ان خندقوں اور فصیلوں کے بالمقابل چیونٹیاں معلوم
ہوتی تھیں۔ لیکن شاہ محمود کا دل اتنا مضبوط نہیں تھا۔ جتنی کہ قلعہ
کی فصیلیں۔ جری حوصلہ پرتگالی کپتان مارٹن ڈی اترنسوڈی میلو نے
اس کو مقابلہ جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ لیکن بزدل محمود پر اس کا
کوئی اثر نہ ہوا۔ خود شیر خاں کچھ سمجھوتہ کر کے واپس جانے کو بیتاب
ہو رہا تھا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب محمود اس سے نجات پانے
کے لیے کچھ دینے کو بھی تیار تھا۔ دوسری طرف شیر کو اپنے وطن کے
نزدیک مغربی مورچہ کی فکر سوار تھی محمود نے اپنے زیرک و ذی فہم
پرتگالی مشیر مارٹن کی مرضی کے خلاف شیر خاں سے صلح کی گفت و
شنید شروع کر دی۔ اور بالآخر صلح کی یہ شرط طے ہو گئی کہ محمود بطور
نذر یا جرمانہ شیر کو ۱۳ لاکھ طلائی سکہ یا ۵ لاکھ پچیس ہزار پر دما (ایک
پردما برابر تھا ۸ شلنگ ۶ پینس کے) ادا کرے۔ اور کول سے سکری گلی
تک کا تمام علاقہ جو وسعت میں ۹۰ میل اور چوڑائی میں کہیں کہیں ۳۰
میل تک تھا شیر خاں کے تصرف میں کر دے۔
اس فتح سے شیر خاں کو نہ صرف مالی فائدہ ہوا۔ بلکہ افغانوں اور

Marfat.com

دوست دشمنوں میں اس کا سیاسی اقتدار بالاتر ہو گیا۔ گڑھی کے درہ کو شیر کے قبضہ میں دے کر گویا محمود نے اس کے ہاتھ بنگال کی فتح کی کنجی رکھ دی۔ اب شیر خاں کو پوری آزادی تھی کہ وہ اپنی حسب مرضی اس درہ سے گزر کر جب چاہے محمود کی سلطنت سے خوں بہا وصول کرے اور جب چاہے اس کا تاج و تخت چھین لے۔

Marfat.com

باب 7 کا ضمیمہ

راکھی کی کہانی اور اس کے غیر مستند ہونے پر تبصرہ

تاریخ میں ایک روایت ہے کہ مہارانا سانگا کی بیوہ اور وکرماجیت واودے سنگھ کی والدہ نے جب سلطان بہادر شاہ چتوڑ کے قلعہ کا محاصرہ کیے ہوتے تھا۔ تب ایک راکھی ہمایوں کے پاس بھیجی اور اس سے منت و سماجت کی کہ وہ اس کی امداد کے لیے آجائے۔ ہمایوں کو یہ راکھی اس وقت راستہ میں ملی جب وہ بنگال کی جانب کوچ کر رہا تھا۔ جری حوصلہ ہمایوں بیوہ کی اپیل پر فوراً چتوڑ کے لیے لوٹ پڑا لیکن جیسا کہ اس کی زندگی کا معمول تھا اسے پہونچنے میں دیر ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چتوڑ فتح کر لیا گیا اور رانی جوہر کر کے خاکستر ہو گئی۔

ٹاڈ سب سے پہلا مورخ تھا جس نے اس روایت کو اشاعت دی۔ غالباً اس نے یہ کہانی کسی بھاٹ سے سنی ہو گی لیکن آج تک کسی نے اس پر تبصرہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کہ یہ روایت مستند ہے یا نہیں۔ ہم مندرجہ ذیل عنوان کے تحت اس کا تنقیدی جائزہ لیں گے۔

مہارانا سانگا کی بیوہ

نینسی نے اپنی کھیات میں رانی کو ہاڈا خاندان سے بتایا ہے اور کرمتی نام لکھا ہے۔ اس نے ان تمام عورتوں کے نام بھی لکھے ہیں جو مہارانی کے ساتھ جوہر میں شامل ہوئیں لیکن کسی جگہ راکھی کا ذکر نہیں کیا ہے (دیکھیے کھیات -۱- ۵۴ - ۵۵)۔ ایم۔ ایم ادجھا نے مہارانی کا نام کرم وتی لکھا ہے [1]۔

---

[1] بابر نے مہارانی کا نام پدماوتی لکھا ہے۔ اس نے عرصہ دراز تک مغل بادشاہ سے خط و کتابت کی۔ بابر سں سلسلہ میں سب سے پہلا مصنف ہے

Marfat.com

ایم۔ایم۔اوجھا نے بہادر شاہ کے چتوڑ پر دوسرے حملہ کے وقت مہارانی اور بادشاہ ہمایوں کے درمیان کسی قسم کی خط وکتابت کا حوالہ نہیں دیا۔ حالانکہ اس نے تاریخ گجرات کی نقل کرتے ہوئے ۱۵۳۳ء میں بہادر شاہ کے چتوڑ پر پہلے حملہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ (دیکھیے تاریخ گجرات۔مصنفہ بیلے) تاریخ بہادر شاہی کے مطابق چتوڑ کے پہلے حملہ کے وقت مہارانی نے ہمایوں کے پاس اپنا سفیر بھیج کر امداد کی درخواست کی تھی۔ لیکن ہمایوں نے کوئی مدد نہیں دی (دیکھیے راجپوتانہ کا اتہاس مصنفہ اوجھا جلد ۲ صفحہ ۷۰۰) ڈاکٹر بنرجی نے اپنی تصنیف میں رانی کا نام نہیں لکھا اور مدد کی درخواست کے متعلق لکھا ہے۔ "شاید اس قسم کی اپیل کی گئی"۔ (دیکھیے ہمایوں بادشاہ جلد ا صفحہ ۱۱۵)۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ایم۔ایم۔اوجھا کی نقل کرتے ہوئے مہارانی کو بہادر راجہ ارجن ہاڑا کی بہن لکھا ہے۔ اوجھا صاحب فرماتے ہیں "ارجن ہاڑا بوندی کے راؤ نربدا ہاڑا کا لڑکا تھا"۔ اوجھا نے اپنے اس بیان کی تائید میں جو دوسرے بہتر مورخوں کی رائے سے میل نہیں کھاتا کوئی تاریخی ثبوت پیش نہیں کیا ہے (دیکھیے راجپوتانہ کا اتہاس ۱۱۔ صفحہ ۱۰۔ فٹ نوٹ ۳)۔ بلاشبہ کرم وتی نربدا ہاڑا کی لڑکی تھی۔ لیکن ارجن وسرجن سورج مل بن راؤ نربدا کے لڑکے تھے۔ (دیکھیے نینسی کی کھیات ۱۔۷۔۴۔ اور ونس بھاس کو صفحہ ۲۰۰۷ و ۲۲۰۷)۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے چتوڑ کے پہلے محاصرہ کا ذکر کرتے ہوئے راکھی کی کہانی کو دوہرایا ہے۔ لیکن انہوں نے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ کوئی مسلم مورخ اس کہانی کی تائید نہیں کرتا۔

(ہمایوں۔ صفحہ ۶۵۔ فٹ نوٹ۔۳)

اور غالباً اس نام کے متعلق اس کے دماغ میں کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔
(میموئیرس۔ صفحہ ۶۱۲)

Marfat.com

ہمایوں اور بہادر کے خلاف اس کی مہم آرائی

راکھی کی کہانی کی جملہ صداقت کا انحصار ہمایوں کی اس نقل و حرکت پر ہے جو ۱۵۳۵ء کے شروع میں اس نے کی سوال محض یہ ہے کہ ۱۵۳۵ء میں ہمایوں کی فوجی نقل و حرکت بہادر شاہ کے خلاف تھی یا شیر خاں کے؟ گلبدن اور ابوالفضل نے حالانکہ اس مہم کی تاریخیں جداگانہ دی ہیں لیکن وہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ یہ فوجی نقل و حرکت گجرات کو فتح کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ میں نے اپنی پہلی تصنیف "شیر شاہ" میں (صفحہ ۱۳۰) ان مصنفین کو سند مان کر اس فوجی یورش کا منشا بہادر شاہ پر حملہ کرنا بتایا ہے[1] گلبدن

---

[1] ڈاکٹر ایشوری پرشاد اور ڈاکٹر بنرجی کا بھی یہی خیال ہے کہ ہمایوں کی یہ مہم شیر شاہ کے خلاف نہیں تھی بلکہ بہادر شاہ کے خلاف تھی۔ اپنی پہلی تصنیف "شیر شاہ" میں میں نے بھی یہی رائے ظاہر کی تھی۔ لیکن انہوں نے اس امر کی کوئی وضاحت نہیں کی کہ ہمایوں نے بہادر شاہ پر حملہ کرنے کے لیے اس قدر چکر دار راستہ کیوں اختیار کیا۔ (دیکھیے ہمایوں بادشاہ ۱۰۸-۱۱۱۔ ہمایوں صفحہ ۶۹) ڈاکٹر ایشوری پرشاد اس بات کی صفائی پیش کرتے ہوئے اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ہمایوں شکی مزاج نہیں تھا۔ وہ ہر کسی پر جلد ہی یقین کرتا تھا اور بہادر شاہ کی حرکات و سکنات در پردہ رہیں۔ ہمیں ڈاکٹر موصوف کی اس دلیل میں کوئی وزن نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ بہادر شاہ کی طاقت کوہ آتش فشاں کی طرح دفعتہ ظہور پذیر نہیں ہوئی تھی۔ اس نے جو بھی اقتدار حاصل کیا تھا اور طاقت فراہم کی تھی۔ وہ ہمایوں کی نظر کے سامنے کی تھی۔ اگر بیانہ پر تاتار خاں کے حملہ کے بعد بھی ہمایوں کے دماغ میں بہادر شاہ کے ناپاک ارادوں کے متعلق کوئی بدگمانی نہیں تھی اور اس وقت بھی آگرہ سے روانہ ہونے سے پیشتر وہ بہادر شاہ سے مصالحت کی بات سوچ سکتا تھا تو سوال یہ ہے کہ ہمایوں کے آگرہ سے روانہ کے بعد بہادر شاہ کی وہ کونسی حرکت تھی جس نے بادشاہ کو

Marfat.com

نے حملہ کی جو تاریخ لکھی ہے اس کو کچھ ترمیم کے ساتھ تسلیم کرنے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی دوسرا چارہ نہیں۔ لیکن اب میں جہاں تک فروری ۱۵۳۵ء کے حملہ کی غرض و منشا کا تعلق ہے دونوں فاضل مورخین کی رائے سے متفق نہیں ہوں اور اس اختلاف کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ اگر دراصل شروع میں ہی ہمایوں کا کوئی ارادہ بہادر شاہ کے خلاف فوج کشی کرنے کا ہوتا تو معقول بات یہ ہوتی کہ وہ مرزا عسکری کی فاتح فوج کی جانب مغرب راجپوتانہ میں داخل ہونے کا حکم دیتا۔ اور خود کو رائے سین کے بجائے اجمیر میں قیام پذیر کرتا۔ اگر ہمایوں ایسا کرتا تو بہادر شاہ دو پاٹوں کے درمیان پھنس جاتا۔ اس کے سامنے تو چتوڑ کا غیر مغلوب ہونا اور پشت پر مغل فوج۔ اس حالت میں مغلوں اور راجپوتوں کی متحدہ طاقت کے ڈر سے وہ اراولی پہاڑیوں کے اس پار سرپٹ بھاگ جاتا تب راکھی کی کہانی بھی سچ معلوم ہوتی اور کسی کو اس کی صداقت میں شبہ نہ ہوتا اور تاریخ میں ہمایوں کا نام ایک بیوہ کی عصمت کے محافظین میں لکھا جاتا۔

ب۔ ہمایوں کا اس وقت کا مصالحت آمیز رویہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے دماغ میں گجرات فتح کرنے کے مقابلہ میں اس سے بھی اہم کوئی اور نقشہ تھا۔ اور یہ تھا بنگال کو فتح کرنا۔ اور چوں کہ بہادر شاہ کے باغیانہ رویہ سے ہمایوں کے اس ارادہ کی تکمیل میں مزاحمت کا اندیشہ تھا۔ اس لیے اس نے فی الحال بہادر شاہ سے صلح کرنا زیادہ مناسب اور مصلحت آمیز

اس سے بدگمان بنا دیا۔ بعینہ یہی بات گلبدن اور ابوالفضل کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ انہوں نے ہمایوں کے دوبارہ آگرہ سے روانہ ہونے کا مقصد گجرات پر فوج کشی بتایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انجام سے آغاز کی قیاس آرائی کرتے ہیں کیونکہ اس مرتبہ ہمایوں کی فوجی نقل و حرکت کا نتیجہ گجرات کی فتح نکلا۔ وہ یہ بات بھول گئے کہ ابتدا میں ہمایوں کا منشا شاید یہ نہ تھا۔

Marfat.com

سمجھا۔ لہٰذا میں اپنی پہلی رائے میں ترمیم کرنے میں حق بجانب ہوں کہ فروری ۱۵۳۵ء میں ہمایوں نے بہادر شاہ کے خلاف فوج کشی کی۔ اب میرا نظریہ یہ ہے کہ دراصل ابتداء میں یہ حملہ بنگال کے سلطان کے خلاف تھا۔ لیکن راستہ میں ہی کسی وجہ سے جس کا تاریخ دانوں کو کوئی علم نہیں ہمایوں کے دماغ میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اور اس نے فوج کا رخ مالوہ کی جانب کر دیا۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے قول کے مطابق ہمایوں کے لیے اس کا نتیجہ اچھا نکلا لیکن بعد کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ترمیم ہمایوں کے لیے نہایت مضر ثابت ہوئی۔

راکھی کی روایت میواڑ میں کیسے پھیلی

راجپوتانہ میں کوئی تاریخی واقعہ اس وقت تک عوام کے ذہن نشین نہیں ہوتا جب تک اس میں کسی شاعر کے تخیل کی رنگ آمیزی نہ ہو۔ اس روایت کے مختلف اجزا مندرجہ ذیل تاریخی حقائق پر مشتمل ہیں۔

ا۔ چتوڑ کے پہلے محاصرہ کے وقت ۱۵۳۳ء میں رانی کی مدد کے لیے اپیل اور ہمایوں کا مداخلت سے انکار۔ (دیکھیے اوجھا کا راجپوتانہ کا اتہاس صفحہ ۷۰۸) بعد میں چل کر ایک خالص سیاسی حکمت کو راکھی کی پاک روایت سے منسوب کر دیا گیا۔ ہمایوں نے رانی کی یہ درخواست "اسلام" کے نام پر نامنظور کی تھی۔ جو غیر مدبرانہ اور اس کے شایان شان نہیں تھی۔ تاہم اس حقیقت کو اکبر کے زمانہ کے راجپوت بھاٹوں نے وقت کی فضا کو دیکھتے ہوئے نظرانداز کر دیا۔ اسی زمانہ میں اس روایت کی اشاعت ہوئی۔

ب۔ مہارانی کی پہلی درخواست رد ہو جانے کے بعد وہ دوسری بار اس قسم کی درخواست نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا ہمایوں نے بنگال جاتے ہوئے اپنی تجویز میں جو ترمیم کی اس سے اس واقعہ کا کوئی تعلق نہیں ہے پھر بھی راجپوت بھاٹوں نے اس روایت کی تشہیر سے ایک متعصب مغل بادشاہ کو راجپوت ہیرو بنانے کی کوشش کی ہے۔

Marfat.com

ج۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ ہمایوں چتوڑ گیا۔ لیکن یہ بات ۸ جون ۱۵۳۶ء کی ہے۔ جب ہمایوں باغی مرزا عسکری کو دبانے کے لیے گیا اور یہ واقعہ چتوڑ کی شکست کے ٹھیک ۱۵ ماہ بعد ہوا۔ اب اتنی دیر ہو چکی تھی کہ مہارانی کو موت سے بچانا ناممکن تھا (حالانکہ اس میں ہمایوں کا کوئی قصور نہیں تھا)۔

د۔ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ اس وقت چتوڑ پر مہاراجہ وکرماجیت کا قبضہ ہو گیا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کام میں اسے ہمایوں کی مدد براہ راست ملی یا بالواسطہ۔ لہٰذا لب لباب یہ ہے کہ اس کہانی کے مختلف اجزا ء تاریخی رو سے صحیح ہونے کے باوجود کلی طور پر یہ روایت غیر مستند ہے۔ ۱۵ مہینہ کے وقفہ کو نظر انداز کر کے جس شاعرانہ تخیل کی پرواز سے ان دونوں واقعات کو ایک جگہ ملایا گیا ہے وہ راجپوتانہ کے درباری شعرا کے لیے معمولی بات ہے۔

۴۔ اس روایت کے خلاف جوہر کے بیان کو کوئی درباری شاعر رد نہیں کر سکتا۔ اس نے صاف الفاظ میں لکھا ہے "ہمایوں اس وقت ارادۃً چتوڑ سے جانب مشرق . . اجین منڈسور میں بہت عرصہ تک اس لیے مقیم رہا کہ بہادر شاہ کو اپنے جہاد یعنی کافروں کے خلاف اپنی کاروائی سے فراغت نصیب ہو جائے۔" (دیکھیے سرکار، قلمی نسخہ، ترجمہ اسٹورٹ، صفحہ ۴)

Marfat.com

باب 8

بنگال کے لیے ہمایوں اور شیر شاہ کی جنگ

(۱۵۳۷ء ۔ ۱۵۳۸ء)

شیر کے اطاعت کیش رویہ سے ہمایوں کا فریب میں آجانا

جس وقت شیر خاں سنتھال پرگنہ کے پہاڑی علاقہ سے اپنی فوج کو آگے بڑھانے کے لئے خون پسینہ ایک کر رہا تھا۔ اس وقت بادشاہ ہمایوں اطمینان سے مانڈو میں آرام کر رہا تھا۔ (فروری لغایت ۱۵ مئی ۱۵۳۶ء) شیر خاں ہمایوں کی طرف سے بالکل بے فکر تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اسی سال کے موسم گرما میں ایک دوسری جانب سے غیر متوقع بلا نازل ہوگئی۔

اس دوران میں کور چشم سلطان مرزا شرقی صوبوں میں اپنے آدھے درجن من چلے اور جنگجو لڑکوں کو ساتھ لے کر رونما ہوا۔ اس کا مقصد تھا شیر خاں کے بالکل قریب بہار میں اپنی حکومت قائم کرنا۔ اس مرتبہ محمد سلطان مرزا نے اپنا دارالمقام منحوس قنوج کے بجائے بلگرام پسند کیا۔ اس کے بڑے لڑکے الغ مرزا نے جون پور تک تمام علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اور گورنر جنید[۱] برلاس پر دباؤ ڈالا۔ اس کے دوسرے لڑکے

---

[۱] فرشتہ کے مطابق جنید برلاس کی وفات ۹۴۳ ہجری یعنی ۲۰ جون ۱۵۳۶ء و لغایت ۹ جون ۱۵۳۷ء میں ہوئی۔ دیکھیے فارسی نسخہ صفحہ ۲۲۴ ۔ برگس جلد ۲ صفحہ ۸۳

Marfat.com

شاہ مرزا نے ہمایوں کے افسروں سے کڑا مانک پور کا علاقہ چھین لیا۔ الغ مرزا مشرق میں اودھ اور بنارس پر قبضہ کرنے کے لیے بھی جھپٹا۔ اور اس ارادے کی تکمیل کے لیے اُس نے ایسا راستہ اختیار کیا کہ جون پور کا مضبوط اور مستحکم قلعہ راستہ میں حائل نہ ہو۔ شیر شاہ کو ان سرگرمیوں کی خبر گوڑ میں ملی اور غالباً یہ بھی ایک وجہ تھی کہ شیر خاں نے بنگال کا تخت ہاتھ میں آتے آتے چھوڑ دیا۔ اور اُس نے جلدی میں محمود شاہ سے صلح کر لی۔

شیر خاں غالباً مارچ کے آخر تک بہار لوٹ آیا۔ اور اپنی فوج لے کر چنار کی جانب چل دیا۔ تاکہ اُس سرحد پر صورتِ حال کا جائزہ لے ہندال مرزا نے جس کو کہ ہمایوں نے آگرہ میں بطور اپنے نائب کے مقرر کیا تھا ایک قلیل فوج فراہم کی۔ اور مئی ۱۵۳۶ء کے قریب اپنے بھائی کی آمد کا انتظار کیے بغیر جنید برلاس کی امداد کے لیے چل پڑا۔ نوجوان ہندال کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب کہ اُس نے خود مختار طریقہ سے کسی فوج کی کمان سنبھالی۔ لیکن وہ فنِ حرب اور دلیری میں اپنے خاندان کا لائق نمائندہ ثابت ہوا۔ وہ بڑی تیزی سے کوچ کرتا ہوا بلگرام پہونچا تاکہ شاہ مرزا کڑا اور مانک پور سے ہٹ جائے اُس نے شاہ مرزا کو قبل اس کے کہ اس کا بڑا بھائی الغ مرزا جو اس وقت اجودھیا کی طرف گیا ہوا تھا۔ اُس کی مدد کے لیے پہونچے۔ جنگ کے لیے مجبور کر دیا۔ قسمت نے بھی جوان شہزادے کا ساتھ دیا۔ عین موقع پر ہوا کا ایسا خطرناک طوفان آیا کہ شاہ مرزا کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ (اس موسم میں تیز آندھی کا چلنا عام بات ہے) بعد ازاں اُس نے اپنا رُخ مرزا الغ کی جانب کیا اور اجودھیا کے نزدیک اُس کو ایک لڑائی میں شکستِ فاش دیدی۔ مرزا میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ ہندال نے شیر کے علاقہ میں بادشاہ کی اجازت کے بغیر داخل ہونا مناسب نہ سمجھا سلطان مرزا اور اس کے لڑکوں نے بھاگ کر شیر کے یہاں بھار کھنڈ میں پناہ لے لی۔ اس طرح ہندال کی مصلحت

---

۵ بہارکندہ (صحیح لفظ بھارکندہ) چنار سے ۵۰ میل جنوب میں ہے۔ ڈاکٹر ایس کے بنرجی نے اس مقام کا تعین کرنے میں اس قدر جدت سے کام لیا ہے کہ وہ اصل سے بہت دُور چلے گئے۔ انہوں نے اپنے نوٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ یہ مقام اصل میں بہار کھنڈ سے بگڑ کر بھار کندہ ہو گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں بہار کا

Marfat.com

اندیشی، صبر و تحمل نے شیر کو ایک مشکل سے آزاد کر دیا۔ لیکن شیر خاں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر سرجو کے مشرق کا مغلیہ علاقہ اور بنارس کے ضلع پر تسلط کر لیا۔ مفرور مرزا چوسہ کی لڑائی سے پہلے دو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک شیر خاں کی پناہ میں رہے۔ اس وقت ہمایوں کے بھائی مرزا عسکری نے بھی بغاوت کا پرچم کھول دیا جس سے مانڈو میں ہمایوں کے آرام میں خلل پڑ گیا۔ مرزا عسکری احمد آباد میں اپنے عہدہ کو خیر باد کہہ کر چلدیا۔ اور اُس نے ہمایوں کے افسر تاردی بیگ سے چمپانیر غصب کرنے کی کوشش کی اور اپنی شاہی کا اعلان کرنے کے لیے آگرہ کے لیے چل پڑا۔ ہمایوں اس بغاوت کو دبانے کے لیے فوراً روانہ ہو گیا۔ ۸ ر جون ۱۵۳۶ء کو وہ چتوڑ پہونچا۔ اگست ۱۵۳۶ء کے پہلے ہفتہ میں اپنے بھائی (جس کو اُس نے معاف کر دیا) اور اُس کے بدحواس مشیر ہندو بیگ کو لے کر آگرہ واپس آگیا۔ اب مرحوم جنید برلاس کی جگہ اُس نے ہندو بیگ کو جونپور کا گورنر بنایا۔ اور اس کو یہ ہدایت دی کہ وہ شیر خاں کی نقل و حرکت کی خبر دیتا رہے۔

میر ہندو بیگ شیر خاں کے لیے جنید برلاس سے زیادہ کارآمد ثابت ہوا۔ نیا گورنر اپنے آقا اور فرماں روا ہمایوں کے مفاد کے مقابلہ میں اپنی جیب بھرنا زیادہ ضروری سمجھتا تھا۔ سیاسی مسائل کو رشوت کے ذریعہ حل کرنے میں شیر خاں بہت ہی ماہر تھا۔ ہمارے پاس اس خبر پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ

علاقہ (ہمایوں بادشاہ۔ جلد ۱ صفحہ ۱۷۷) مقامات کا تعین کرنے میں جدت کے بمقابلہ نقشہ سے زیادہ مدد لینی چاہیئے۔

۵ ابوالفضل لکھتا ہے شیر خاں نے دفعتہً الغ مرزا پر حملہ کر دیا جو اس وقت سروا کے نزدیک تھا اور چال سے اس کو زیر کیا بعد ازیں اُس نے بنارس پر حملہ کیا۔ پھر وہ بہار گیا۔ سورج گڑھ کی لڑائی رزی اور گوڈ کا محاصرہ کیا (اکبر نامہ جلد ۱ صفحہ ۳۲۸) اس میں سورج گڑھ اور گوڈ کے واقعات کو مرزا کی بغاوت اور شیر خاں کے بنارس فتح کرنے کے بعد دکھایا ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ابوالفضل نے واقعات کے سلسلہ کو الٹا کر دیا ہے اس نے غلطی سے سرجو یا ریا سروار کو سروا لکھدیا ہے۔ سروا کے لیے دیکھیے ہوڈی والا اسٹڈیز صفحہ ۵۲۵۔

Marfat.com

ہندو بیگ[1] نے شیر کے متعلق بہت ہی اطمینان بخش رپورٹ بھیجی۔ ایک مشہور مقولہ ہے "جب رشوت دروازے سے داخل ہوتی ہے تو ایمانداری کھڑکی سے نکل کر بھاگ جاتی ہے"۔ اس باب میں عباس رقمطراز ہے:۔ "جب شیر خاں کو یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ بہار پر حملہ کرنے کا منصوبہ باندھ رہا ہے اس نے ہندو بیگ کے پاس پیش کش بھیجی اور اُس کو یہ لکھا "میں نے بادشاہ سے جو وعدہ کیا تھا اس سے میں نے بالکل انحراف نہیں کیا ہے۔ میں نے آپ کے علاقہ میں کوئی مداخلت نہیں کی ہے۔ کیا آپ از راہِ کرم میری وفاداری کی خبر بادشاہ کے حضور تک پہنچا دیں گے اور اُن کو اس بات پر راضی کر دیں گے کہ وہ اس علاقہ کی طرف رُخ نہ کریں میں آپ کا فرماں بردار اور وفادار آسامی ہوں" جب ہندو بیگ نے شیر کی پیش کش پر نظر ڈالی تو وہ بہت مسرور و متاثر ہوا۔ اُس نے شیر خاں کے وکیل سے کہہ دیا کہ وہ جا کر اپنے آقا سے کہہ دے کہ جب تک ہندو بیگ زندہ ہے شیر خاں پر کوئی مصیبت نہ آنے دے گا۔ بعد ازیں اُس نے شیر خاں کے وکیل کو اپنے ایک سفارشی کے ساتھ ہمایوں کے دربار میں بھیجا اور اُسے اپنے خط میں یہ لکھا کہ شیر خاں آنحضرت کا خادم ہے۔ وہ بادشاہ کے نام کے سکے چلاتا ہے اور اُن کے نام کا خطبہ پڑھتا ہے۔ اُس نے شاہی حدود میں کوئی بھی مزاحمت نہیں کی ہے۔ اور نہ اپنے کسی قول و فعل سے بادشاہ کو ناراضگی کا موقع دیا ہے۔ (عباس قلمی نسخہ صفحہ ۱۲۷ - ۱۲۸)

اس اثنا میں گوڑ سے واپس لوٹنے پر شیر خاں نے اپنی جنگی تیاریاں اور بھی تیز کر دیں۔ وہ وقت سے بازی لے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تضیع اوقات کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ بنگال میں جو اُسے ابھی کام کرنا ہے وہ

---

[1] ہندو بیگ قوچین بابر کا نہایت جری و معتبر سردار تھا۔ اُس نے پانی پت اور کنواہہ کی لڑائیوں میں حصہ لیا تھا وہ کچھ عرصہ تک سنبھل کا حاکم رہا جہاں اس نے بابر کے حکم پر ایک ہندو مندر کو مسجد میں بدل دیا جیسا کہ مسجد پر کندہ کتبہ سے ظاہر ہے (تزک بابری صفحہ ۶۸۷ فٹ نوٹ ۲)

Marfat.com

اور بھی دقت طلب ہو جائے گا۔ اگست ۱۵۳۶ء سے متواتر ایک سال تک

ہمایوں آگرہ میں مقیم رہا۔ اس وجہ سے شیر خاں بہار چھوڑ کر کہیں نہ جا سکا۔ حالانکہ ہندو بیگ کا پیغام پاکر ہمایوں نے بہار جانا ملتوی کر دیا تھا (عباس قلمی نسخہ صفحہ ۱۲۰) ہمایوں کے آگرہ لوٹنے کے ۶ ماہ کے اندر ہی بہادر شاہ نے نہایت تیزی سے اپنے کھوئے ہوئے مقبوضات یعنی مالوہ اور گجرات پر دوبارہ تسلط کر لیا اور اس قسم کے آثار نمایاں ہونے لگے کہ وہ مغربی ہند میں اپنا اقتدار و اثر پہلے کی طرح قائم کرلے گا۔ اس خبر سے شیر خاں کو بڑی راحت ملی۔ اس میں اُمید کی ایک جھلک دکھائی دی۔ لیکن جلد ہی یہ خوشی رنج میں بدل گئی۔ جب شیر خاں نے بہادر شاہ کی موت کی خبر سُنی۔ بہادر شاہ گوا کے پرتگالی گورنر سے مل کر واپس آرہا تھا کہ پرتگالی لوگوں نے دھوکے سے اُسے سمندر میں ڈبو دیا (۱۳ فروری ۱۵۳۷ء) ہمایوں کی توجہ پھر ایک بار گجرات کی طرف مبذول ہوئی۔ لیکن کوڑھ مغز بادشاہ بہادر شاہ کی وفات کے ۶ ماہ بعد تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ آیا وہ پہلے بہادر شاہ مرحوم کی جائیداد پر قبضہ کرے۔ یا بقید حیات شیر خاں کے پنجہ سے بنگال و بہار چھینے۔ بالآخر ۱۵۳۷ء کی خزاں میں جب شیر نے دوسری بار بنگال پر حملہ کر دیا تو ہمایوں کی شیر خاں کے متعلق آسودہ خاطری بیکار ہو گئی۔ اُس نے گجرات فتح کرنے کا خیال دل سے نکال دیا اور شیر کے خلاف فوج کشی کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت شیر خاں بنگال میں ہی تھا۔ ہم یہ بات جوہر اور ابوالفضل کے بیانوں کی بنا پر ہی کہتے ہیں۔ (اکبر نامہ جلد ا صفحہ ۳۲۶) اس طرح ہمایوں اور شیر شاہ میں ایک ایسی جنگ کا آغاز ہو گیا جو ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔

شیر کا بنگال پر دُوسرا حملہ (اکتوبر ۱۵۳۷ء)

جلال خاں کے بہار سے معزول ہونے کے بعد سے شیر کا رُتبہ 'خان' سے تو بالاتر ہو گیا تھا مگر وہ ابھی مکمل "شاہ" نہیں تھا۔ اُس نے ہنوز کوئی شاہی خطاب اختیار نہیں کیا تھا۔ یہ اُس کی محض ظاہرہ انکساری تھی۔ ابھی تک لودی عہد کے بڑے بڑے افغان سردار شیر خاں کو نودولتا اور حقیر سمجھتے تھے اور اُس کی نیتاگری اور سرپرستی کا

Marfat.com

مذاق اُڑاتے تھے۔ شروع شروع میں جن لوگوں نے اُس کی لیڈری کو تسلیم کیا اس میں سب ہی افغان فرقوں کے تمام آدمی تھے اُس کے خزانے سے وہ تنخواہ تو پاتے تھے اور اس کے حکم کی تعمیل بھی کرتے تھے مگر اُس کو صرف اپنا کپتان ہی تصور کرتے تھے۔ لودی تخت کے باطل دعویدار و چیدہ چیدہ افغان سرداروں نے باری باری سے مہارانا سانگا و بہادر شاہ گجراتی کو اپنا محافظ و سرپرست، معاون و مددگار بنا کر دہلی کا تاج واپس لینے کی کوشش کی لیکن مغلوں کی عظیم طاقت کے سامنے نہ توان کا جوش ہی کام آیا نہ گوریلا طریقہ جنگ۔ جس غمناک طریقہ سے بہادر شاہ کی طاقت کا شیرازہ بکھرا وہ افغانوں کے لیے حوصلہ شکن تھا۔ اب مغلوں کے خلاف انہیں پناہ دینے والا کوئی نہ تھا۔ یہ حُسنِ اتفاق ہی تھا کہ جس وقت بہادر شاہ کی قسمت کا ستارا بحرِ عرب میں ڈوب رہا تھا۔ شیر کی قسمت کا ستارا خلیج بنگال سے طلوع ہو رہا تھا۔ جس کی درخشانی مشرقی اُفق پر علی الاعلان اس امر کی شاہد تھی کہ اب بنگال کے سیدوں کے دن ختم ہو گئے ہیں چنانچہ اب شیر خاں تمام افغان قوم کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ وہ مغرور اور خود بین افغان سردار جو ابھی تک اس کو اپنا رہنما تصور کرنا باعث تحقیر سمجھتے تھے اس کی لیڈری کے معتقد ہو گئے۔ اب انہیں یہ یقین کامل ہو گیا کہ گوڑ کا تخت شیر کے قبضہ میں آنے والا ہے اور یہاں وجہ اس کی اطاعت کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ ان سرداروں میں دو اعظم ہمایوں ایک مسند عالی اور دیگر سردار شان اعلیٰ تھے۔ ان سرداران والاشان سے بلند تر ہونے کے لیے شیر خاں نے اب "حضرت اعلیٰ" کا خطاب اختیار کیا۔ ایک سال سے بھی کم عرصے میں یہ خطاب "اعلیٰ حضرت" میں بدل گیا۔ لفظی اعتبار سے اگر یہ خطاب دائیں سے بائیں نہ پڑھ کر بائیں سے دائیں پڑھا جائے تو "حضرت اعلیٰ" سے "اعلیٰ حضرت" بن جاتا ہے۔

شیر خاں نے بنگال کے معمور شاہ کے ساتھ جو باضابطہ صلح کی تھی اس کو کیوں توڑا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے۔ جس کا افغان مورخین کے پاس کوئی جواب نہیں۔ بنگال کا دوسرا حملہ کس مقام سے ہوا۔ لڑائی کا کیا طریقہ اختیار کیا گیا اور جنگ کے کیا کیا خاص واقعات تھے۔ ان جملہ باتوں پر وہ کوئی روشنی نہیں ڈالتے حتیٰ کہ عباس تو اس حملے کے اور گوڑ کے محاصرے کے سلسلہ میں شیر خاں کا نام تک غائب کر دیتا

Marfat.com

ہے۔ اس نے لکھا ہے۔ کہ شیر نے اس مرتبہ اپنی فوج کی کمان اپنے دوسرے لڑکے جلال خاں اور قابل سپہ سالار خواص خاں بزرگ کو سونپ دی (صفحہ ۱۸۱) ہمیں اس لڑائی کے معتبر واقعات کا پتہ پرتگالی ذرائع سے لگتا ہے جس کی کہ تائید بہت حد تک جوہر اور ابوالفضل کرتے ہیں۔

شیر خاں جب بنگال سے چنار واپس آیا تھا تب سے ہی اس نے بنگالی فوج کو جنگی پیمانہ پر آراستہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنگال پر حملہ کرنے کے لیے اُس نے ایک دوسری فوج بھی گڑھی کے تنگ درّہ اور قرب وجوار کے علاقہ میں جو بنگال کے سلطان نے سال گزشتہ میں صلح کے عوض دیا تھا اکٹھا کر لی تھی۔ یہ جگہ بنگال کے دارالسلطنت سے صرف سو میل دُور تھی۔ یہاں سے بنگال پر آسانی سے حملہ کیا جاسکتا تھا۔ محمود شاہ بھی آنے والے حملہ کے خطرہ سے بے خبر نہ تھا۔ مارٹن الفنسو ڈی میلو کی ماہرانہ صلاح کے مطابق گوڑ کی قلعہ بندی تو مستحکم کر لی گئی مگر دُور دراز اضلاع کو نظرانداز کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ گوڑ کی مورچہ بندی کی کمک کی غرض سے وہاں سے بنگالی فوجیں واپس بلالی گئیں۔ محمود چٹاگانگ اور سنگام بندرگاہ کے ذریعہ پرتگالی کمک کا انتظار کر رہا تھا بصورتِ حال یہ تھی کہ ہمایوں اور محمود تو غیر متعین عرصہ تک انتظار کر سکتے تھے لیکن شیر خاں کے لیے دیر مہلک ہوئی۔ مغل جمنا پر کشتیاں فراہم کر رہے تھے اور اُن کا بھاری توپ خانہ بدنام رومی خاں کی کمان میں آراستہ ہو رہا تھا۔ رُومی خاں پہلے بہادر شاہ کی فوج میں میر آتش تھا۔ شیر خاں نے اِن تیاریوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ مغلوں کا مقصد چنار اور گوڑ کے قلعوں پر تسلّط کرنے کا ہے۔ اب شیر کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ چنار اور گوڑ جن کے مابین ۴۴۶ میل سے کم فاصلہ نہ تھا (رنیل) دونوں مورچوں پر بیک وقت لوہا لینے کا خطرہ مول لے یا انتظار کر کے مغل بادشاہ محمود شاہ اور پرتگالیوں کی متحدہ طاقت کے مقابلے کی تیاری کرے۔

بالآخر شیر شاہ نے یہ طے کیا کہ التواء اور تساہل اُس کے حق میں مضر ہے۔ اس لیے ۱۵۳۶ء کی خزاں میں اُس نے بنگال کے محمود شاہ کے خلاف فیصلہ

Marfat.com

کُن جنگ کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ جہاں تک ہمیں پرتگالی ذرائع سے معلوم ہوتا ہے شیر خاں نے نقشۂ جنگ کچھ اس طرح مرتب کیا کہ گوڑ کے حملے کے وقت پرتگالی کمک بنگال تک نہ پہونچ سکے۔ چنانچہ اُس نے جلال خاں اور خواص خاں کو اپنی اپنی فوجیں لے کر مشرقی اور مغربی بنگال پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجدیا (یہ نہیں معلوم کس کو کون سے بنگال کے لیے بھیجا گیا۔) اور خود گنگا عبور کرکے شمالی بنگال اور گوڑ کا محاصرہ کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ شیر خاں نے یہ قدم بہت ہی مناسب اور ٹھیک ہی وقت پر اُٹھایا۔

پرتگالی ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر خاں نے بنگال پر حملہ کرنے سے پہلے یہ عجیب وغریب مانگ پیش کی کہ سلطان ایک سال کا خرچ جو اُس پر واجب ہوگیا ہے ادا کرے۔ خراج کی مانگ باضابطہ صلح کو توڑنے کا شیر کا محض ایک بہانہ تھا۔ اس کی ضرورت یہ پڑی کہ وہ ہمایوں اور محمود کی متحدہ فوجوں کے دام ہلاکت سے بچنا چاہتا تھا۔ بہادر شاہ کے انتقال کے بعد (فروری ۱۵۳۷ء) افونسو واز ڈی برٹو کوچین سے ایک جہاز لے کر بنگال آیا۔ پرتگالی گورنر نونوڈا کنہا کی مرسس کو یہ ہدایت تھی کہ وہ مارٹم افونسو ڈی میلو کو اپنے ساتھ لائے اور جو خط امداد کی بابت سلطان محمود شاہ نے لکھا تھا اُس کا جواب لے جائے۔ مگر اُس نے چٹگانگ میں لنگر انداز ہونے میں قدرے تامل کیا کیونکہ پرتگالیوں کے خلاف اس خبر سے سورش بپا تھی کہ انہوں نے کھمبات کے سلطان بہادر شاہ گجراتی کو قتل کر دیا ہے اور اُس کے مال و متاع کو لوٹ لیا ہے۔ لیکن ٹھیک

---

۵ " بنگال میں پرتگالی نام کی اپنی تصنیف میں کیمپاس نے یہ کہا ہے کہ افسو واز ڈی برٹو ۱۵۳۸ء میں آیا۔ مگر یہ یا تو سہو ہے یا ۱۵۳۷ء کی جگہ پر غلط چھپ گیا ہے ——— لیکن صفحہ ۴۲ پر اس نے یہ لکھا ہے کہ ۱۵۳۸ء کے موسم سرما میں واسکو پیرس ڈی سیم پاو ۹ جہاز لے کر محمود کی امداد کو آیا۔ اس وقت محمود گوڑ میں محصور تھا۔ اس طرح دونوں کپتانوں کی بنگال میں آمد کے درمیان چھ ماہ کا وقفہ تھا۔

Marfat.com

اسی وقت اینٹونیو مینز س کریسٹو ایک تجارتی مال کا جہاز لے کر وہاں پہنچا اور اپنے ساتھ گورنر کا ایک خط بھی لایا جس میں کھمبات کے واقعہ کی تشریح اور وضاحت کی گئی تھی چنانچہ سورش دفع ہوگئی اور افسونسو ڈ واڈ ڈی بر لوٹچٹگانگ میں اُترا۔ اور گوڈ پہونچ کر اُس نے سلطان سے افونسو ڈی میلو کو رہا کرنے کی درخواست کی اور گورنر کا خط سلطان کی خدمت میں پیش کیا جس میں لکھا تھا کہ کمبے میں جنگ شروع ہوجانے کی وجہ سے وہ اپنی فوج سلطان کی مدد کے لئے نہ بھیج سکا لیکن آیندہ سال وہ یقیناً ایسا کرے گا۔ محمود شاہ نے مارٹم افونسو اور اس کے ساتھیوں کو بنگال سے جانے کی اجازت دیدی۔ اُس نے صرف افونسو ڈی مرٹو اور اُس کے پانچ ہمراہیوں کو گورنر کے ایفائے وعدہ کی ضمانت کے طور پر روک لیا۔ مارٹم افونسو کی روانگی کے چند ماہ بعد ۱۵۳۸ء میں پرتگالی کپتان واسکو پیریس ڈی سمپایو چٹگانگ آیا اور اُس کے ساتھ گورنر نونو ڈا کنہا نے اپنے وعدہ کو پورا کرنے کے لیے ۹ جہاز بھی بھیجے لیکن اُس وقت تک حالات بدل چکے تھے۔ اب چٹگانگ بندرگاہ پر سلطان محمود کے گورنر خدا بخش کا قبضہ نہیں بلکہ شیر خاں کے افسر 'نوغازل' کا تسلط تھا۔ پرتگالی کپتان نے 'نوغازل' کے معاملات میں کوئی مزاحمت و مداخلت نہیں کی۔ اُس نے ایک دُور اندیش افسر کی طرح تب تک کے لیے غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا جب تک کہ واقعات کا رُخ اُس کے دوست بنگال کے سلطان کی موافقت میں نہ ہوجائے۔ جب شیر کی فوجی چال کا حصہ اوّل غیر متوقع طور سے کامیاب ہوگیا تو شیر نے جو ابھی تک افسرانِ فوج کے عقب میں حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کامیابی کا فائدہ اُٹھانے کے لیے اکتوبر ۱۵۳۷ء میں مع اپنی فوج کے گنگا پار کی اور جلال خاں و خواص خاں کے فوجی دستوں کو گوڑ کی جانب بڑھنے کا حکم دیا۔ شاید دسمبر ۱۵۳۷ء میں گوڑ کا محاصرہ شروع ہوگیا۔ لیکن اُس کے فوراً بعد ہی شیر خاں اس کام کو جلال خاں اور خواص خاں کی متحدہ کمان کو سپرد کر کے واپس لوٹ پڑا اور تین ہفتہ میں ۴۶۴ میل کا سفر طے کر کے گوڑ سے چنار آگیا تاکہ چنار کے قلعہ سے اپنے بیوی بچوں اور خزانہ کو ہٹا کر ۵۰ میل دُور

ۂ کیمپ اس صفحات ۳۰۔ ۴۰

Marfat.com

بھارکنڈ کے پہاڑی قلعہ میں بھیجدے۔ جنوری ۱۵۳۷ء میں ہمایوں نے چنار کا محاصرہ شروع کیا۔

ہمایوں کی بنگال کی مہم

(۱۵۳۷ء - ۱۵۳۸ء)

ایک سال تک ہمایوں چہ میگنم کی حالت میں رہا۔ وہ سوچتا رہا کہ گجرات اور بنگال میں پہلے کس طرف متوجہ ہو۔ بالآخر اُس نے فیصلہ بنگال کے حق میں کیا اور وہ اس وجہ سے کہ اس علاقہ میں شیر خاں کے عروج نے ایک تہلکہ بپا کر دیا تھا اس نے بنگال پر حملہ کرنے کے لیے فوج کو آراستہ کرنے کا حکم جاری کیا۔ یہ طے کیا گیا کہ اس مرتبہ شیر خاں کو مکمل طور پر دبا دیا جائے اور بنگال کو مغلیہ سلطنت میں ملا لیا جائے (اکبر نامہ جلد اصفحہ ۳۲۶) اس نے اس نامحرم علاقہ میں اپنی فوج لے جانے کی تمام تیاریاں مکمل کرلیں۔ اور حکومت کا انتظام اس خوش اسلوبی سے کیا کہ اس کی عدم موجودگی میں کسی قسم کی بدامنی کا امکان نہ رہے۔ فوجی تیاریاں اس پیمانہ پر اس سے قبل کبھی نہیں کی گئی تھیں۔ اس مرتبہ ہمایوں نے اس سے کہیں زیادہ جانفشانی، تندہی اور دُور اندیشی سے اس حملہ کی تیاریاں کیں جو بہادر شاہ کے حملہ کے وقت نہیں کی گئی تھیں۔ ہمایوں نے اپنے دو بھائی مرزا عسکری، مرزا ہندال و توپخانہ کے داروغہ بدنام غدار رومی خاں کو (جو دوبارہ مغل فوج میں شامل ہوگیا تھا) اس مہم پر تعینات کیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ دریاؤں کے ملک بنگال میں کشتیوں کی بھی ضرورت ہوسکتی ہے بہت سی کشتیاں بھی فراہم کی گئیں اور رومی خاں کے زیرِ اہتمام غیر معمولی وزنی توپیں جو محاصرہ کے وقت کارگر ثابت ہوں، اکٹھی کی گئیں۔ جولائی ۱۵۳۷ء[1] کے آخری ہفتہ

---

[1] ڈاکٹر ایس کے بنرجی نے ہمایوں کی آگرہ سے روانگی کی تاریخ ۱۸ صفر ۹۴۴ ہجری مطابق (صفحہ ۲۳۷ سے آگے) ۲۷ جولائی ۱۵۳۷ء دی ہے۔ انہوں نے چنار کے محاصرہ کا آغاز شوال ۹۴۴ ہجری مطابق لکھا ہے جو درحقیقت غلط ہے۔ جوہر کے تذکرہ سے ظاہر ہے کہ ہمایوں شب برات کے دن چنار سے ۵ میل کے فاصلے پر تھا شب برات ۸ جنوری ۱۵۳۸ء کی تھی۔ آگرہ سے ہمایوں نے دریا کے راستہ سفر کیا

Marfat.com

میں شاہی پیش خانہ آگرہ سے باہر نصب کر دیا گیا۔ اس عظیم الشان کثیر التعداد فوج کو مسلح اور منظم کرنے میں کافی وقت خرچ ہوا۔ غالباً بادشاہ اس انتظار میں تھا کہ موسم صاف ہو جائے۔ جمنا کا سیلاب اُتر جائے اور شیر بنگال چلا جائے۔ جس کی وجہ سے مغل فوج کو خشکی اور تری کے راستوں سے بلا مزاحمت آگے بڑھنے کا موقع مل جائے گا۔

اس زمانہ میں شیر کی نقل و حرکت کی خبر بنگال سے آگرہ ایک مہینہ میں پہونچتی ہوگی۔ اس حساب سے ہمایوں کی فوج غالباً نومبر ۱۵۳۷ء کے پہلے ہفتہ میں اس مہم کے لئے روانہ ہوئی ہوگی۔ مغل سپاہی رنگ رلیوں میں سرشار اس انداز سے آگے بڑھ رہے تھے گویا اُن کے لیے میدان رزم میدان بزم ہو۔ بہت سے سپاہیوں نے اپنے افسران اور شہنشاہ کی تقلید میں اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے لیا۔ ہمایوں خود ایک شاہی بجرہ پر رونق افروز ہوا۔ اس کے ساتھ اس کی پارسا خوبرو بیگمات برقعہ پہن کر سوار ہوئیں۔ عالی مرتبہ امرا اور اُس کے جگری دوستوں کی کشتیاں اس کے جلو و عقب میں ہمراہ تھیں۔ رسالہ اور توپخانہ سڑک سے، اور کشتیوں کا بیڑہ جمنا سے ہو کر ساتھ ہی ساتھ پریاگ تک پہونچا۔ اس مقام پر بقول عبّاس، ہمایوں نے اپنی جنگی کونسل کا اجلاس کیا تاکہ اس مہم کا نصب العین مقرر کیا جا سکے۔ ہمایوں نے بتایا کہ بزرگوں (پیران) کی رائے میں سب سے پہلے گوڈ پر حملہ کرنا زیادہ مناسب اور بہتر ہوگا۔ (عبّاس نسخہ صفحہ ۱۲۹)

تھا۔ یہ ۳۰۰ میل کا فاصلہ تھا۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہمایوں کی فوج نے اس فاصلے کو طے کرنے میں ۱۶۶ دن صرف کیے۔ غالباً ڈاکٹر بنرجی نے اس تاریخ سے سفر کی ابتدا دکھائی ہے جب ہمایوں کا پیش خیمہ آگرے کے میدان میں نصب کیا گیا تھا۔ یہ محض حملہ کی تیاری کی ابتدائی کیفیت تھی۔ ڈاکٹر بنرجی نے دونوں کو مخلوط کر دیا ہے (ڈاکٹر بنرجی کی تاریخ کے لیے دیکھئے۔ ہمایوں بادشاہ جلد ۱ صفحہ ۲۱۰) صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم ریاض السلاطین میں دی ہوئی تاریخ (جس کو ڈاکٹر بنرجی نے تسلیم کیا ہے) کا میل ہمایوں کے سفر سے جوڑ سکتے ہیں۔ ابوالفضل اور دیگر مورخین نے ہمایوں کے کوچ کی کسی تاریخ کا ذکر نہیں کیا ہے۔

Marfat.com

شیر خاں دل ہی دل میں اس خیال سے سب سے زیادہ خائف تھا۔ کاش ہمایوں اس تجویز کو عملی جامہ پہناتا اور شیر کی فوج پر پیچھے سے حملہ کر دیتا تو شیر کی حالت اس سے بھی بدتر ہو جاتی جتنی کہ چتوڑ کے حملہ کے وقت بہادر شاہ گجرات کی ہوئی تھی۔ لیکن اسے شیر کی بلند اقبالی کہیے یا ہمایوں کی بدنصیبی کہ بادشاہ نے خانخاناں یوسف خیل جیسے بزرگوں کی رائے کو ٹھکرا دیا اور رومی خاں و دیگر آرام طلب افسروں کی تجویز کو پسند کیا کہ پہلے چنار کے قلعہ پر قبضہ کیا جائے۔ بالآخر ۹۴۴ ہجری مطابق ۸ جنوری ۱۵۳۸ء کو بروز شب رات (جوہر قلمی نسخہ صفحہ ۲۱) شاہی فوج چنار کے نزدیک پہونچ گئی۔ اس مبارک رات کی صبح کو مغل فوج کا ہراول دستہ چنار کے قلعہ کے سامنے رونما ہوا اور غالباً ۱۰ جنوری ۱۵۳۸ء کو قلعہ کا باقاعدہ گھیرا ڈال دیا گیا۔

چنار کا قلعہ ایک پہاڑی کی نکلی ہوئی نوک پر واقع ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ تقریباً ۱۵۰ فٹ اونچا ہے۔ یہ قلعہ مرزا پور سے جو گنگا کے جنوبی کنارے پر ہے اور بنارس سے جو گنگا کے مغربی کنارے پر ہے۔ ۱۸ میل کے برابر فاصلہ پر واقع ہے۔ اس مقام پر گنگا چنار قلعہ کا ایک دائرہ بناتی ہوئی جانب شمال بہتی ہے۔ اس قلعہ

---

۵ میں نے اپنی پہلی تصنیف "شیر شاہ" کے صفحہ ۱۴۳ کی پانچویں سطر میں ایک غلطی کی تھی۔ عباس کا خانخاناں یوسف خیل لکھنا ٹھیک ہے۔ عباس کا منشا دلاور خاں لودی بن دولت خاں لودی یوسف خیل سے ہے جس کو بابر نے خانخاناں کا خطاب عطا کیا تھا۔ خان خاناں نے بنگال کی اس مہم کے دوران ہمایوں کے ساتھ وفاداری کا پورا ثبوت دیا۔

۵ سرکار کے جوہر کے تذکرۃ الواقعات کا قلمی نسخہ صفحہ ۲۱ میں اس مہم سے متعلق کسی تاریخ و سال کا ذکر نہیں ہے۔ اسٹوارٹ نے اپنے ترجمہ میں غلطی سے ۹۴۵ ہجری لکھ دیا ہے (۳۰ مئی ۱۵۳۸ء لغایت ۷ مئی ۱۵۳۹ء) ایلفنسٹن نے اس غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (دیکھئے ہسٹری آف انڈیا جلد ۶ صفحہ ۴۴۴) اور اس مہم کی تاریخ ۱۵ شعبان ۹۴۴ ہجری مقرر کی ہے جو کہ مطابق ۸ جنوری ۱۵۳۸ء بروز شب برات ہے۔ ڈاوسن نے (دیکھئے ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۳۴۹ فٹ نوٹ ۱) اس تاریخ کو صحیح مانا ہے۔ یہ تاریخ گلبدن بیگم کی تصنیف میں دیئے ہوئے حساب سے بھی ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ ایلفنسٹن کی دی ہوئی تاریخ میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ ہمارے پاس نہیں ہے۔

Marfat.com

کی لمبائی اگر اس کی نوک کو بھی شامل کر لیا جائے تقریباً ½ میل ہے اور چوڑائی سو گز سے لے کر ۳۰۰ گز تک ہے۔ اس قلعہ کے ہر تین جانب تیز رفتار گنگا بہتی ہے۔ جنوب میں اس کی پتلی نوک کسی زمانہ کے شارع عام اور پہاڑیوں سے ملحق ہو جاتی تھی۔ فنِ حرب کے نقطۂ نظر سے اس کا استحکام اور حربی اہمیت اس کے رقبہ کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ وزن دار ہے۔ اگر ہمایوں چنار کا محاصرہ ۱۵ دن پیشتر شروع کر دیتا تو اس کا یہ حملہ شیر شاہ کی کمر توڑ دیتا۔ اس وقت شیر خاں نہ تو افغان عورتوں بچوں کو قلعہ سے باہر نکال پاتا نہ اس کی حفاظت کے لیے مزید کمک ہی قلعہ میں بھیج سکتا تھا۔ اور نہ کافی رسد ہی فراہم کر سکتا تھا۔ لیکن اب وقت نکل چکا تھا۔ ہمایوں اپنی غفلت سے شیر کے تیار شدہ دام میں پھنس چکا تھا۔ شیر خاں چاہتا تھا کہ بنگال کی فتح سے قبل اس کا کوئی بھی نیا دشمن اس کی مزاحمت نہ کرے۔ چنار کے اس محاصرہ سے ہمایوں نے اس کی یہ خواہش پوری کر دی۔ شیر خاں نے غازی خاں سور اور سلطان سروانی کو قلعہ کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا اور خود وندھیاچل پہاڑی کے پیچھے بھارکھنڈ مقام سے مغلوں کی نقل و حرکت کی نگرانی بغیر کسی قسم کے تصادم یا مزاحمت کے کرتا رہا۔

چند مورخین کی رائے میں فنونِ حرب کے نقطہ نظر سے ہمایوں کے لیے چنار کا محاصرہ کرنا ضروری تھا اور موجودہ پیڑھی کے کچھ مصنف اس فیصلہ کو مصلحت آمیز سمجھتے ہیں۔ مگر ہمیں اس میں نہ کسی قسم کی مصلحت ہی دکھائی پڑتی ہے اور نہ کوئی ضرورت۔ الفنسٹن لکھتا ہے "چونکہ ہمایوں نے یہ سفر دریا کے راستے طے کیا تھا اور توپخانہ و رسد پہنچانے کے لیے بحری راستہ کی ضرورت تھی۔ لہٰذا چنار کا محاصرہ فوجی نقطہ نظر سے اشد ضروری تھا۔ مگر چنار کے جائے وقوع کو نقشہ میں

لہ ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنرجی نے ہمایوں کے فیصلہ کی تائید میں سات وجوہات بیان کی ہیں۔ لیکن وہ سب مثل ایک گھرے کے ہیں جن کو کہ مطالعہ کنندہ آسانی سے ہٹا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اپنے نرم الفاظ میں ہمایوں کے اس فیصلہ کو احمقانہ بتایا ہے۔ (دیکھئے ہمایوں بادشاہ جلد ۱ صفحہ ۲۰۰ - ۲۰۲ اور ہمایوں صفحہ ۱۱۸)

Marfat.com

دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں۔ کہ اس محاصرہ کی قطعاً ضرورت ہی نہ تھی۔ چنار کا قلعہ گنگا کے راستے میں نہ کوئی مزاحمت پیش کرتا ہے اور نہ کرسکتا تھا۔ مغلوں کا بحری بیڑہ بڑی آسانی سے بنارس اور غازی پور کے راستہ تک پہونچ سکتا تھا۔ فوج بھی اسی راستے سے آگے بڑھ سکتی تھی۔ اس سے پیشتر بھی بابر نے کئی بار اس راستے سے فوجی نقل و حرکت کی تھی۔ یہ راستہ اختیار کرنے سے ہمایوں کو دو فائدے ہوئے پہلا یہ کہ وقت اور پریشانی کم ہوتی، دوسرا یہ کہ یا تو شیر خاں جنگ آزمائی کے لیے مجبور ہوجاتا یا اس کے علاقہ پر مغلوں کا تسلط ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ چنار کا محاصرہ ہمایوں کے لیے قطعاً ضروری نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس یہ اُس کی ایک زبردست حماقت تھی جس کی قیمت اُسے اپنی سلطنت کھو کر ادا کرنی پڑی۔ موجودہ دَور کے مورخین جو ہمایوں کی حمایت میں آواز بلند کرتے ہیں۔ ہمایوں پر انگشت نمائی کرنے والے حضرات کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ چنار کے محاصرہ کے انجام بد کو دیکھ کر ہمایوں کی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اس کے فیصلہ پر اعتراض کرتے ہیں اور اپنے تئیں ہمایوں سے زیادہ قابل سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کا ایسا کہنا حق بجانب نہیں ہے حقیقتاً عیّار اور خودغرض شیر شاہ کے پھیلائے ہوئے جال میں ہمایوں کا پھنس جانا اُس کی عقلمندی نہیں کہی جاسکتی۔ جیسا کہ ہمایوں کے کچھ جانبدار سمجھ بیٹھے ہیں۔

چنار کے قلعہ کا محاصرہ تین[1] ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران قلعہ پر شدید بمباری ہوتی رہی مگر حملے ناکام رہے اور مغلوں کے جان و مال کا کافی نقصان ہوا۔

---

[1] اس تعلق سے میں نے اب پہلی رائے میں ترمیم کردی ہے۔ میں پہلے سمجھتا تھا کہ عباس کا یہ بیان غلط ہے۔ کہ شیر خاں کا گوڑ پر قبضہ ہوجانے سے پہلے ہی چنار کا قلعہ ہمایوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا لیکن مخزن سے عباس کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے۔ گوڑ پر قبضہ ہوجانے کی تاریخ ذیقعد ۹۴۴ ہجری مطابق ۶ر اپریل ۱۵۳۸ء ہے (دیکھئے ریاض ترجمہ صفحہ ۱۳۹) لہذا چنار کا محاصرہ مارچ ۱۵۳۸ء کے بعد نہیں ہوسکتا۔ اس حساب سے تین ماہ کا عرصہ ہوتا ہے۔ جوہر نے ۶ مہینہ لکھا ہے یہ اس کی یادداشت کی بھول ہے (دیکھئے شیر شاہ۔ صفحہ ۱۵۸۔ فٹ نوٹ)

Marfat.com

دراصل چنار کے قلعہ پر قبضہ کرنے کی پوری ذمہ داری توپخانہ کے افسر رُومی خاں کے سپرد تھی۔ باقی فوج کے لیے یہ مہم اس طرح تھی گویا وہ کسی دُور دراز علاقہ میں سیر و تفریح کے لیے آئے ہیں۔ پہاڑ کے دامن سے لے کر مغل سرائے تک ان کے خیمے گڑے ہوئے تھے غالباً اسی وقت سے اس مقام کا نام مغل سرائے پڑا ہوگا۔ کیونکہ مغل فوج آکر یہاں ٹھہری تھی۔ مغل فوج نے خشکی کے راستہ چنار کو تین طرف سے گھیر لیا تھا۔ اور بحری راستہ سے مغل کشتیوں کا بیڑا گنگا کے جنوبی کنارے پر قلعہ میں رسد بھیجنے کے دروازے بند کیے تھے۔ لیکن رُومی خاں کا توپخانہ نشیب میں ہونے کی وجہ سے قلعہ پر بااثر گولہ باری نہیں کر سکتا تھا۔ ۱۵۳۸ء کے حملہ میں اس کی گولہ باری اسی طرح ناکام تھی جیسی کہ ۱۷۶۴ء میں میجر ہیمیٹل کی۔ چنار کے قلعہ میں سیسہ و بارود کے علاوہ حفاظت کا وافر سامان تھا۔ وہاں بڑے بڑے وزنی پتھروں کا انبار تھا جو ایک ہی مار میں (کپتان بروم کے آدمیوں کو) دس دس، بیس بیس کو موت کی نیند سُلا دیتا تھا۔ بالآخر رُومی خاں نے ایک ترکیب نکالی۔ باہمی رضامندی اور مشورے سے ایک روز اس نے اپنے غلام خلالت (کلانت) پر کوڑے برسائے۔ غلام بظاہر اپنی جان بچانے کے لیے قلعہ کی طرف بھاگا۔ سادہ لوح افغانوں کو اُس پر رحم آگیا اور انہوں نے اسے قلعہ میں پناہ دے دی۔ آہستہ آہستہ غلام نے افغانوں کا اعتماد حاصل کر لیا۔ افغان اس سے یہ جاننا چاہتے تھے کہ رومی خاں کے توپ خانے کا مقابلہ کیسے کیا جائے۔ اس غرض سے انہوں نے غلام مذکور کو قلعہ کا کونہ کونہ دکھا دیا اور اپنی حفاظت کی سب ترکیبیں اُس کو بتا دیں۔

چند روز بعد ایک دن غلام چپکے سے قلعہ سے فرار ہوگیا۔ اور اپنے آقا رُومی خاں کو تمام راز سے آگاہ کر دیا۔ اس کے بعد جوہر نے لکھا ہے۔

"اب بادشاہ سے رُومی خاں نے کشتیوں پر ایک بلند منار بنانے کی اجازت چاہی۔ جس سے وہ غنیم کی پانی کی رسد کو روک سکے تاکہ اُن کی زندگی محال ہو جائے بادشاہ نے فرمان جاری کر دیا کہ وہ اپنی حسب خواہش ہر ضروری کارروائی کر سکتا

لہ دیکھیے کپتان ارتھر بروم کی "ہسٹری آف دی رائز اینڈ پروگریس آف دی بنگال آرمی صفحہ ۴۰۸، ۴۰۹

ہے۔ بادشاہ سے مکمل اختیارات مل جانے کے بعد اس نے چند مہینوں میں تین کشتیوں پر ایک ایسا بلند مینار تیار کر لیا۔ جہاں سے قلعہ کا ہر کونہ دکھائی دیتا تھا۔ مینار کی تیاری کے بعد اس نے بادشاہ سے اجازت لی کہ وہ اس مینار کو قلعہ کے نزدیک لے جائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی التجا کی کہ بادشاہ ہر چہار جانب سے اپنی فوج کو قلعہ پر حملہ کرنے کا حکم دیدیں۔ اور لڑائی تب تک جاری رکھی جائے جب تک قلعہ مکمل طور پر قبضہ میں نہ آجائے۔ بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔ لڑائی شروع ہو گئی۔ اور آدھی رات تک زور شور سے چلتی رہی۔ تقریباً ۷۰۰ مغل سپاہی ہلاک ہو گئے۔ اور انتہائی کوشش کے باوجود قلعہ پر قبضہ نہ ہو سکا۔ غنیم کی آتشبازی سے منار کا ایک حصہ بھی ٹوٹ گیا۔ دوسرے روز علیٰ الصبح اس کی مرمت کی گئی۔ جب افغانوں نے یہ دیکھ لیا کہ مغلوں کا ارادہ مستحکم ہے اور ایک نہ ایک دن وہ قلعہ پر ضرور قبضہ کر لیں گے۔ تو انہوں نے صلح کا پیغام بھیجدیا۔ اور قلعہ کو اس شرط پر بادشاہ کے حوالہ کرنا منظور کر لیا کہ وہ ان کی جان کی سلامتی کا وعدہ کر لیں بادشاہ نے اُن کو حفظِ جان کا یقین دلا کر قلعہ اپنے قبضہ میں کر لیا" (جوہر قلمی نسخہ ۱۳۱۔۱۳۴ ایلیٹ جلد ۵۔ ۱۳۹ - ۱۴۰)

قلعہ پر قبضہ کر لینے کے بعد مغلوں نے افغان خون کا دریا بہا دیا۔ ہمایوں نے رومی خاں کے دیے ہوئے وعدہ کو پورا کرنے کے لیے جو حکم صادر کیا تھا موید بیگ دلدائی نے جو دربار کا ایک معتبر افسر تھا اس حکم میں ردّ و بدل کر دیا اور اس میں لکھ دیا کہ افغانوں کے ہاتھ قلم کر دیے جائیں نتیجہ یہ ہوا کہ رومی خاں نے دو ہزار قیدیوں میں سے ۳۰۰ توپچیوں کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ ایلفنسٹن نے رومی خاں کی اس حرکت کی مذمت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے یہ کام اپنے پیشہ کے حسد کی وجہ سے کیا[1]۔

---

[1] مجھے افسوس ہے کہ میں ایلفنسٹن کی اس رائے سے متفق نہیں ہوں کہ رومی خاں نے حسد کی وجہ سے ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے (ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۴۴۷) ابوالفضل کی رائے اس سے بالکل ہی متضاد ہے اور صحیح معلوم ہوتی ہے (دیکھیے اکبر نامہ ۱۔ ۳۸۱) ایلفنسٹن نے یہ بات محض قیاس سے کہہ دی ہے کہ چونکہ شیر کے توپچی رومی خاں کے آدمیوں کے مانند اپنے فن میں ماہر تھے اس لیے رومی خاں نے حسد سے اُن کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔

Marfat.com

چنار رومی خاں کے سپرد کردیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد زہر سے رُومی خاں کی وفات ہوگئی مگر مویدبیگ بعدتک زندہ رہا۔ ہمایوں کے علاوہ تمام مغل اس کو دعائے بد دیتے رہے اور یہ سمجھتے رہے کہ اسی شیطان کی بدولت ہندوستان میں مغل سلطنت کا زوال ہوا

چنار کی وجہ سے نازک صورت حال پیدا ہوگئی

شیرخاں نے چنار کے قلعہ میں بارود اور رسد کا کافی ذخیرہ فراہم کرلیا تھا اور اس نے اس کی حفاظت کے لیے معمول سے زیادہ فوج مقرر کی تھی۔ اُسے یہ امید تھی کہ برسات شروع ہونے تک اس کی فوج قلعہ کی حفاظت کرسکے گی۔ بعد ازیں اس کی فوج کا کافی حصہ بنگال کی مہم سے فراغت پاکر قلعہ کی کمک کے لیے دستیاب ہوجائے گا۔ لیکن چنار نے اس کی یہ اُمید پوری نہ کی اور صرف تین مہینے[۲]

۲۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے جوہر کو مستند مان کر محاصرہ کی مدت ۶ ماہ بتائی ہے۔ لیکن ڈاکٹر (پچھلے صفحہ سے) موصوف نے اس کی کوئی تاریخ نہیں دی ہے (ہمایوں صفحہ ۱۱۹) بنرجی کے مندرجہ ذیل اقتباسات باہم ایک دوسرے کے متضاد ہیں اور گمراہ کن ہیں۔

(ا) جب نومبر ۱۵۳۷ء میں وہ چنار پہنچا۔ شیر بذاتِ خود قلعہ کی کمان نہیں سنبھالے تھا۔ بلکہ اس کی کمان اس کے دوسرے لڑکے جلال خاں اور بھائی غازی خاں سور کے ہاتھ میں تھی۔ (ہمایوں بادشاہ جلد اصفحہ ۱۹۹)

تنقید۔ یہ صحیح ہے کہ نومبر ۱۵۳۷ء میں شیر خاں چنار میں نہیں تھا بلکہ گوڑ میں تھا۔ ہمایوں بھی اس وقت چنار میں نہیں تھا۔ وہ عید (۸ جنوری ۱۵۳۸ء) کے بعد آیا تھا۔ شیر خاں کا کوئی بھائی غازی خاں نام کا نہیں تھا۔ جلیل خاں اور غازی خاں سور نے چنار کے قلعہ کی حفاظت نومبر ۱۵۳۱ء یعنی اب سے ۶ سال پیشتر کی تھی۔

(ب) ریاض اور اکبر نامہ کے مصنفین یہ بھول جاتے ہیں کہ جلال خاں کو زیادہ تر شہرت . . . . (وہی فٹ نوٹ ۵)

سلسلہ ۳۴۶ سے آگے تنقید:۔ درحقیقت مذکورہ بالا مصنفین نہیں بلکہ خود ڈاکٹر بنرجی اس بھول کے شکار ہیں کہ جلال خاں نے یہ شہرت اس وقت نہیں بلکہ اس سے چھ سال پیشتر حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر بنرجی

Marfat.com

کے اندر ہی گھٹنے ٹیک دیے (جنوری لغایت مارچ ۱۵۳۷ء) ابھی برسات شروع ہونے میں دو ماہ باقی تھے۔ مغل فوج اس دوران میں شیر خاں کا تعاقب کرسکتی تھی اور افغان فوج کے واپس بہار لوٹنے کے منصوبہ کو رد کرسکتی تھی۔ چنار کے محاصرہ کے وقت جو خبریں بنگال سے آرہی تھیں وہ حوصلہ افزا نہ تھیں۔ خواص خاں جو ملک سکھا (یہاں ابراہیم کا موروثی خاندانی غلام) کا سب سے بڑا لڑکا تھا قلعہ پر حملہ کرنے کی جان توڑ کوشش کرتے وقت گوڑ کی خندق میں ڈوب گیا تھا۔ شیر خاں نے اس کی وفات کے بعد خواص خاں کا خطاب اس کے چھوٹے بھائی صاحب خاں کو عطا کیا اور اس کے مرحوم بھائی کا رتبہ اور عہدہ بخشنے اس کو دے دیا۔ اُسے گوڑ کے محاصرہ میں اپنے لڑکے جلال خاں کا ہمرکاب بنا لیا۔ کہنے کو تو صاحب خاں شیر کے خاندان کا موروثی غلام تھا لیکن اس میں تاج پہننے کی صلاحیت تھی۔ اس میں ایک بہترین سپاہی اور شہزادہ بننے کے تمام اوصاف موجود تھے۔ صرف ایک ہی کمزوری تھی جو ہر افغان میں پائی جاتی ہے۔ وہ تھا مذہبی جوش جس پر صوفی اصولوں کی چھاپ تھی۔ صاحب خاں نے (جو تاریخ میں چھوٹا خواص

بنگال کے مورخوں سے یہ امید کیسے کرسکتے تھے کہ وہ اس وقت چنار کے محاصرہ میں جلال خاں کا نام جوڑ دیں گے جب کہ وہ دراصل گوڑ کے مورچہ پر تھا! ابوالفضل نے یہ کہہ کر غلطی نہیں کی کہ شیر خاں نے بنگال روانہ ہوتے وقت چنار کے قلعہ کی حفاظت کا کام قطب خاں کے سپرد کر دیا تھا۔ (اکبرنامہ ا۔ ۱۳۴) لیکن ہمایوں کی آمد سے قبل ہی قطب خاں قلعہ چھوڑ کر جا چکا تھا۔ بعد میں روہتاس کے قلعہ کی حفاظت کے لیے اس کا تقرر ہوا۔

ج۔ چنار کا محاصرہ ۶ مہینہ (اکتوبر ۱۵۳۷ء لغایت مارچ ۱۵۳۸ء) تک رہا۔ تنقید۔ اس کے متعلق کسی قسم کا تبصرہ بیکار ہے ہمیں صرف یہ یاد رکھنا چاہئے کہ چنار کی تسخیر کے بعد اور برسات شروع ہونے سے پہلے ہمایوں بھارکھنڈ کی جانب گیا اور پھر اس نے منیر کا رُخ کیا۔ شیر خاں سے بہت عرصہ تک صلح کی گفت و شنید جاری رہی۔ شیر خاں جانب گوڑ گیا اور روہتاس واپس آیا۔ برسات شروع ہونے سے پہلے ہمایوں نے گوڑ پر قبضہ کر لیا میں نے اس باب میں واقعات کے اس سلسلہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی پہلی تاریخوں میں ترمیم کر دی ہے۔

Marfat.com

خاں کے نام سے مشہور رہے) آگے چل کر شیرشاہ کے لیے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے۔

مارچ ۱۵۳۸ء کے آخری ہفتہ میں چنار کے قلعہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد شیرخاں کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ قلعہ کے خزانے اور بیوی بچوں کو کس جگہ حفاظت کے لیے منتقل کیا جائے۔ شیر کو معلوم تھا کہ بھارکھنڈ اس کام کے لیے بہت چھوٹی جگہ ہے اور ہمایوں اس پر حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ اس کا دُوسرا قلعہ شیرگڑھ بھی جو رہتاس سے جانب شمال اور سہسرام سے ۲۰ میل جنوب مغرب میں واقع ہے طویل محاصرہ کے لیے موزوں نہیں ہے۔ پھر شیرخاں نے مستورات و بچوں کو قلعہ سے باہر نکالنے کا کام شروع کر دیا۔ اس نے یہ کام اِس طریقہ سے کیا کہ مغلوں کی نظر میں یہ بات نہ آسکے۔ اس کام کے لیے اس نے اُن ناقابلِ عبور گھاٹیوں کا سہارا لیا جو کرم ناسہ اور سون ندی کے درمیان واقع ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اُس نے رہتاس کے راجہ کے پاس اس کے برہمن وزیر چوڑامن کے توسل سے ایک درخواست بھیجی کہ وہ افغان شرنارتھیوں کو عارضی طور پر قلعہ میں جگہ دیدے۔ اب سے کچھ سال بیشتر ایک بار راجہ نے شیرخاں اور اس کے خاندان کو اس قسم کی پناہ دی تھی جب چونکہ محمد خاں سوری نے اس کو باہر نکال دیا تھا راجہ کی رگوں میں راجپوتی خون تھا اس کی غیرت و حمیت اس بات کو گوارا نہ کرسکتی تھی کہ وہ مستورات اور بچوں کو پناہ دینے سے انکار کر دے۔ خواہ وہ دوسرے ہی مذہب کے کیوں نہ ہوں۔ راجہ اس بات کے لیے رضامند ہو گیا۔ افغان بیگمات ڈولیوں میں بیٹھ کر قلعہ میں داخل ہونے لگیں۔ راجہ نے یہ سمجھ کر کہ مسلمان عورتیں پردے کی قائل ہوتی ہیں ڈولیوں کی تلاشی کو معیوب سمجھ کر کچھ نہ کہا۔ لیکن شیرخاں نے پہلے سے ہی غداری کی تجویز بنا رکھی تھی جیوں ہی ڈولیاں قلعہ میں داخل ہوئیں افغان سپاہی تلوار کھینچ کھینچ کر ڈولیوں سے کود پڑے۔ اور راجہ اور راجپوت سرداروں کو قلعہ سے باہر نکال دیا۔ راجہ اور اس کے سردار افغان سپاہیوں کے اس غیر متوقع حملے سے ششدر و حیران ہو کر مقابلہ کی تاب نہ لاسکے۔ اس نفرت انگیز عیارانہ طریقہ سے شیرخاں نے رہتاس کے

Marfat.com

قلعہ پر قبضہ کر کے اپنے چنار کے نقصان کی تلافی کرلی۔ یہ قلعہ چنار کے مقابلہ چار گنا زیادہ بڑا اور مضبوط تھا۔ ٹھیک اسی وقت شیر کو خبر ملی کہ خواص خاں نے ۲۰ ذیقعد ۹۴۴ ہجری (مطابق اپریل ۱۵۳۸ء ریاض) کو گوڑ پر قبضہ کرلیا ہے۔

عباس نے شیر کی پُرفریب اور ریاکارانہ حرکت کو جو اس نے روہتاس کے راجہ کے ساتھ کی جس فخر و شان سے بیان کیا ہے۔ اس سے اس زمانہ کے عام افغانوں کی ظالمانہ ذہنیت ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کے افغان اخلاقی اصولوں کے نہ تو پابند ہی تھے اور نہ معتقد۔ عباس نے محض ایک افغان سردار کی شہادت پر جو خود بھی مستند نہیں ہے تمام ڈولی کی کہانی کو ناقابل اعتبار بتایا ہے۔ یہ سردار خان اعظم مظفر خاں بن جلال خاں بن ہیبت خاں تھا۔ اس سردار کا بیان ہے:"آپ کو معلوم ہے کہ میری بیوی اور بچے روہتاس میں تھے اور میں شیر خاں کے ساتھ پہاڑوں میں تھا" عباس نے اس بات کی ذرا بھی کوشش نہیں کی کہ خان اعظم سے جرح کر کے سچائی کا پتہ لگاتا کہ اگر ڈولی کی کہانی فرضی ہے تو افغانوں نے روہتاس کے قلعہ پر کس طرح قبضہ کیا۔ اس کے برعکس یہ بھی قرین قیاس ہے کہ خان اعظم اس ڈولی کی کہانی کو محض اس لیے فرضی بتا رہا ہو کہ غالبًا وہ خود بھی داڑھی مونچھ صاف کر کے اس شرمناک فعل میں شامل ہوا ہو۔ اس نے بھی صافہ کے بجائے اپنی بیگم کا دوپٹہ زیب سر کیا ہو۔ اور شیطان کے کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے ڈولی میں بیٹھ کر قلعہ میں داخل ہوا ہو۔ شہادت کے کسی بھی قانون کے مطابق (جدید یا اسلامی) کسی واقعہ کو سچ ثابت کرنے کے لیے کم از کم دو گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ محض ایک سردار کی شہادت پر ہم اس کہانی کی صداقت سے انکار نہیں کر سکتے جو کہ اس وقت تمام افغانوں میں عام تھی اس کے علاوہ کسی چالاکی و مکاری کے بغیر شیر کا اس وقت روہتاس کے قلعے پر قبضہ کرلینا بعید از عقل ہے خصوصًا جبکہ ہمایوں فاتح کی حیثیت سے چنار کے قلعہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور شیر کے پاس نہ کافی طاقت تھی نہ ذرائع۔ آیندہ سالوں میں شیر نے روہتاس کو ایک نعمت غیبی سمجھا اور اس نے پنجاب میں راولپنڈی کے نزدیک ایک دوسرا روہتاس آباد کیا تھا۔ اس واقعہ کے متعلق اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ اس وقت شیر کو افغان مستورات و بچوں کے لیے

Marfat.com

روہتاس جیسے قلعہ کی اشد ضرورت تھی جہاں وہ ان کو باحفاظت چھوڑ کر باطمینان مغلوں سے جنگ جاری رکھ سکے۔ اور اس لئے اس نے جعلسازی سے اس قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

روہتاس کا قلعہ ایک طمع انگیز انعام کے مانند تھا اس بنا پر کہ پناہ کے نقطۂ نظر سے شیر خاں کو اس کی اشد ضرورت تھی مکر و فریب سے اس کو حاصل کرنا نامناسب نہ تھا۔ غالباً اپریل ۱۵۳۸ء کے تیسرے ہفتہ میں اس قلعہ پر شیر خاں کا قبضہ ہو گیا۔ اس نے اپنے بیوی بچوں کو اپنے بڑے لڑکے عادل خاں اور چھوٹے لڑکے قطب خاں کی حفاظت میں وہاں چھوڑ دیا اور خود جگہ جگہ گھومتا رہا (عباس) شیر خاں کی یہ دشتِ نوردی بے معنی نہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ روہتاس کے قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد شیر خاں نے جھاڑ کھنڈ کے راجہ کے خلاف فوج کشی کی۔ جھار کھنڈ بنگال بہار اور اوڑیسہ کی سرحد پر ہے، جسے آج کل چھوٹا ناگپور کہتے ہیں۔ تاریخ سلاطین افغان میں لکھا ہے کہ اس فوج کشی کا مقصد وہاں کے راجہ سے اس کا نامور سفید ہاتھی موسوم شام چندر چھیننا تھا (ایلیٹ ۵ - ۳۶۲ فٹ نوٹ ۱) اگرچہ ضعیف الاعتقاد مورخ یہ کہہ کر کہ شیر خاں صرف مشہور سفید ہاتھی کی جستجو میں ہی جھار کھنڈ دوڑ گیا۔ اپنے کو اور شیر خاں دونوں کو ہی موضوع مذاق بنا لیتا ہے۔ پھر بھی یہ مہم ایک حقیقی واقعہ ہو سکتا ہے۔ فنونِ حرب کے نقطۂ نظر سے شیر شاہ کے لیے جھار کھنڈ (یہ چھوٹا ناگپور کا پرانا نام تھا) علاقہ کی چھان بین کرنا اور اس پر تسلط کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ ایک طرف تو اس علاقہ کی سرحد روہتاس قلعہ سے

---

۵ نقشہ میں روہتاس کا جائے وقوع بہار کے شاہ آباد ضلع میں ہے اور ۸۳ طول البلد اور ۲۴ عرض البلد پر واقع ہے۔ مارٹن اس کے متعلق لکھتا ہے کہ روہتاس کا قلعہ ایک پٹھار پر واقع ہے یہ مشرق سے مغرب غالباً ۴ میل اور شمالاً جنوباً تقریباً ۵ میل ہے۔ زمین زیادہ تر پہاڑی ہے۔ ویران چٹانیں ہیں: جنوب میں سون ندی کے کنارے راج گھاٹ ہے۔ جہاں سے اس قلعہ میں سب سے سہل طریقہ سے داخل ہوا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بہت ڈھالو ہے اور بہت دور تک عمودی ہے (اسلا گو[illegible] اسلسلہ [illegible]) وہاں زینہ لگا کر ہی چڑھ سکتے ہیں۔ اس کی دیواریں بہت مضبوط اور ناقابل عبور ہیں نیچے سے دکھائی نہیں دیتیں اور توپ کے گولے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا (ایسٹرن انڈیا ۱-۴۳۴ - ۴۳۵)

Marfat.com

ملتی ہے۔ دوسری طرف مغربی بنگال کے بیر بھوم ضلع کی سرحد تک پہونچنے کا یہ ایک پوشیدہ راستہ تھا خوفناک شیر ہوتے ہوئے بھی شیر خاں کبھی کبھی لومڑی بن جاتا تھا اور لومڑی کی مانند ایسے بل میں رہنا پسند کرتا تھا جو بہت سے منہ والا ہو۔ اگر ہمایوں چنار کی فتح کے بعد روہتاس کے قلعہ پر حملہ کر دیتا تو غالباً شیر خاں کو اپنے بچوں اور متعلقین کو کہیں اور ہٹانا پڑتا اور بوقت ضرورت بنگال میں بھی لیجانا پڑتا۔ اس امکان کو بہ نظر رکھتے ہوئے شیر خاں کو جھارکھنڈ پر قبضہ کرنا نہایت ضروری تھا۔ یہ بھی ممکن ہے اپنی صحرانوردی کے دوران شیر ربیع کی فصل کا لگان وصول کرنے کے لیے بہار سے ہو کر گزرا ہو (عباس)

چنار کے قلعہ کے ہاتھ سے نکل جانے سے شیر خاں کا جتنا نقصان ہوا اس سے کہیں زیادہ روہتاس کو شرمناک طریقے سے قبضہ کرنے اور ریاست بنگال کی تسخیر کی تکمیل کرنے سے اُس کا فائدہ ہوا۔ بنگال کے متعلق اس کو یہ خوش خبری ملی کہ اس کی فوج نے جلال خاں اور خواص خاں خورد کے کمان میں گوڈ پر گولہ باری کر کے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ (۶ اپریل ۱۵۳۸ء[ھ]) اور محمود شاہ حاجی پور کے راستہ سے ہمایوں سے ملنے کے مقصد سے بھاگ نکلا ہے گوڈ کی فتح کے بعد قرون وسطیٰ کے بنگال کی خود مختار ریاست کا شاندار دور ختم ہو جاتا ہے۔

ھ ۱۸ ویں صدی کے مصنف و مورخ 'ریاض السلاطین' سے پہلے ہمیں کسی فارسی تصنیف میں اس تاریخ یعنی ذی قعدہ ۹۴۴ ہجری مطابق ۶ اپریل ۱۵۳۸ء کا حوالہ نہیں ملتا۔ لہٰذا کسی ثبوت کی عدم موجودگی میں ہم کو یہی تاریخ مستند مان لینی چاہیے۔ اسی تاریخ کی مدد سے ہمیں چنار کے قلعہ کی فتح کی تاریخ کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ عباس اور مخزن کی رائے کے مطابق گوڈ کی فتح سے پہلے چنار ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ گوڈ کی فتح کی خبر شیر خاں کو تب ملی جبکہ وہ روہتاس پر قبضہ کر چکا تھا۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ اس خبر کے شیر تک پہنچنے میں ۱۵ دن لگے ہوں گے تو روہتاس پر اس کا قبضہ اپریل ۱۵۳۸ء کے تیسرے ہفتہ میں ہونا چاہیے اور اسی حساب سے چنار کی تسخیر کی تاریخ بھی بدلنی ہوگی۔ اور مئی کے وسط سے ہٹا کر مارچ کے آخری ہفتہ میں لے جانا ہوگا۔ افغانوں کا گوڈ پر قبضہ کرنے کے لیے دیکھیے ریاض ترجمہ صفحہ ۱۳۹

Marfat.com

صلح کی گفتگو ناکام اور گوڑ کے لیے دوڑ

چنار کی تسخیر کے کچھ دن بعد (مارچ ۱۵۳۸ء کے آخری ہفتہ میں) شہنشاہ نے بنارس کی جانب کوچ کا حکم دیا اور سارناتھ کے قرب وجوار میں اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں اس نے اشوک کی لاٹ کے ٹیلہ پر ایک چھتری بنوائی۔ اسی عرصہ میں شیر خاں بھی بھارکھنڈ واپس آگیا تھا وہ بھی اس ارادہ سے کہ بادشاہ کے مقصد کا اندازہ لگا سکے۔ جوہر لکھتا ہے "جب ہمایوں کو یہ خبر ملی کہ شیر خاں نے بنگال فتح کرلیا ہے۔ آنحضرت نے روہتاس اور بھارکھنڈ کے خلاف فوج کشی کرنے کا منصوبہ باندھا" (جوہر صفحہ ۲۵) حملہ کی دھمکی سے پہلے صلح کی جو بات چیت ہمایوں اور شیر شاہ کے درمیان ہوتی اس کے متعلق جوہر نے لکھا ہے۔

"جب شاہی فوج بھارکھنڈ کے قلعہ کے نزدیک پہونچی تو بادشاہ نے فضل حسین ترکمان کو بطور ایلچی کے شیر خاں کے پاس بھیجا اور شیر خاں کو یہ تاکید کی کہ وہ شاہی چھتر، بنگال کا تخت اور خزانہ بادشاہ کے پاس روانہ کردے۔ اس کے بالعوض شیر خاں کو اس کی حسب مرضی چنار، جونپور یا کوئی بھی پسندیدہ جگہ دینے کا وعدہ کیا گیا لیکن اس پر شیر خاں راضی نہ ہوا (وہ بنگال سے دستبردار نہ ہونا چاہتا تھا) اور اس نے کہا " میں نے بنگال کی تسخیر میں ۵-۶ سال جانفشانی کی ہے اور میرے بہت سے سپاہی مہم میں کام آئے ہیں۔ میں اب بنگال کیسے چھوڑ سکتا ہوں"۔ اسی دوران میں بنگال کے سلطان کا ایک با ادب عریضہ ہمایوں کو موصول ہوا جس میں یہ تجویز تھی کہ شہنشاہ منزل بہ منزل اپنے لشکر کو گڑھی تک لے آئے۔ جیوں ہی بادشاہ نے خط کے مضمون کو سنا اس نے فوراً ہی فوج کو کوچ کا حکم دے دیا۔ میاں فضل حسین بھی شیر خاں کے پاس سے واپس لوٹ آیا اور انہوں نے آنحضرت کو یہ اطلاع دی کہ شیر خاں نے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا ہے اور وہ پہاڑی کے عقب سے بنگال کی جانب جا رہا ہے۔[1]"

---

[1] جوہر نسخہ صفحہ ۲۰ اسٹوارٹ کا ترجمہ صفحات ۱۱-۱۲

Marfat.com

عباس سروانی نے صلح کی بات چیت سے متعلق دوسرا بیان دیا ہے بقول عباس شیر خاں نے ہمایوں کے سفیر سے کہا "اگر بادشاہ بنگال فتح کرنے کا ارادہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دے تو میں بہار کا علاقہ بادشاہ کے سپرد کرنے کو تیار ہوں اور جس کسی کے لیے بادشاہ کا حکم ہوگا اسی کو بہار حوالہ کر دوں گا۔ بہار اور بنگال کی سرحد بھی وہی رہے گی جو سلطان سکندر کی حکومت میں تھی۔ میں جملہ شاہی نشانات بھی مثلاً چھتر، تخت وغیرہ بادشاہ کی خدمت میں بھیج دوں گا اور بنگال سے دس لاکھ روپیہ سالانہ دیتا رہوں گا بشرطیکہ بادشاہ آگرہ واپس چلا جائے"۔ سفیر نے واپس آکر شیر خاں کی جملہ شرائط ہمایوں کے گوش گزار کر دیں۔ ہمایوں نے شیر خاں کے لیے ایک خلعت خاص اور گھوڑا دے کر سفیر کو اس کے پاس بھیجا اور اسے یہ ہدایت کی کہ وہ وہاں پہنچ کر یہ کہے کہ جملہ شرائط منظور کر لی گئی ہیں اور شیر خاں جلد از جلد ان پر عملدرآمد کرے۔ سفیر شیر خاں کے پاس گیا اور گھوڑا و خلعت دے کر بادشاہ کا پیغام اسے سنا دیا۔

شیر خاں کے پاس پیغام صلح بھیجنے کے تیسرے روز بنگال کے سلطان محمود کا سفیر ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے یہ عرض کیا "افغانوں نے گوڑ کے قلعہ پر قبضہ ضرور کر لیا ہے لیکن باقی ملک ہنوز میرے زیر تسلط ہے۔ براہ عنایت آنحضرت شیر خاں کے وعدہ پر اعتبار نہ کریں بلکہ فوج کو اس جانب کوچ کا حکم صادر فرمائیں اور قبل اس کے کہ افغان اس علاقہ میں اپنا سکہ جما سکیں ان کو بنگال سے نکال باہر کریں اور بغاوت پسپا کر دیں۔ میں بھی اس مہم میں بادشاہ کا معاون و مددگار ہوں۔ ابھی افغانوں میں بادشاہ کا مقابلہ کرنے کی ہمت و طاقت نہیں ہے" جیوں ہی سلطان محمود کی درخواست ہمایوں کے گوش گزار ہوئی اس نے اپنی فاتح فوج کو بنگال کی جانب کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ پھر خانخاناں یوسف خیل، برلاس سرداروں اور دوسرے امیروں کو حکم دیا کہ وہ اپنی فوج کو صف آرا کر کے بھارکھنڈ کی جانب جائیں۔ جہاں اس وقت شیر خاں مقیم تھا جب شیر خاں کو مغل فوج کی نقل و حرکت کا علم ہوا تو ہمایوں کے وعدہ پر اس کا اعتماد ختم ہو گیا۔ اس نے ہمایوں کے سفیر کو الوداعی سوغات و تحفہ دے کر رخصت کر دیا اور اس کے پاس جو بھی کچھ فوج تھی روہتاس کی حفاظت کے لیے روانہ کر دی۔ وہ خود گھوڑ سوار لے کر خفیہ طور سے وہاں سے گوڑ کے لیے روانہ ہو گیا۔

Marfat.com

جوہر اور عباس کے بیان میں کافی حد تک ہم آہنگی ہے۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ عباس نے ہمایوں کی وعدہ شکنی کو زیادہ نمایاں کر دیا ہے۔ پر ہمایوں کا بے جا و نازیب سلوک تو جوہر کے بیان سے بھی آشکارا ہے۔ اگر جوہر کے بیان کو تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہمایوں نے محمود شاہ کا عریضہ ملنے کے فوراً بعد بنگال کی جانب اپنی فوج کو کوچ کا حکم دے دیا۔ قبل اس کے کہ اس کو اپنے معتبر سفیر کے ذریعہ شیر خاں سے نامہ و پیام کا انجام معلوم ہوتا لہٰذا ظاہر ہے کہ فوج کو روانگی کا حکم دیتے وقت اس کو یہ علم نہیں تھا کہ شیر خاں نے اس کی شرائط کو نامنظور کر دیا ہے۔ ایک بار جب ہمایوں مخالفانہ قدم اٹھا چکا تھا تو پھر شیر خاں اس کی حدود معقولیت سے متجاوز شرائط کو تسلیم بھی کر لیتا تو صلح کی کہاں گنجائش تھی۔ ہمایوں کے ارادے میں جو تبدیلی ہوئی اس سے شیر خاں کی انکاری کا کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ صلح کے امکانات ختم کرنے کی تنہا ذمہ داری ہمایوں پر ہے۔ عباس کے بیانِ حقیقت کی تائید گلبدن کی شہادت سے بھی ہوتی ہے۔ گلبدن نے لکھا ہے "آنحضرت ابھی شیر خاں کی اس تجویز پر غور فرما ہی رہے تھے کہ شیر خاں کو کونسی جگہ دی جائے کہ بنگال کا مفرور زخمی سلطان اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وجہ سے انہوں نے شیر خاں کی درخواست پر کوئی توجہ نہیں دی اور گوڑ بنگال کی جانب کوچ کر دیا" (ہمایوں نامہ) اس سے بھی کم از کم اتنا تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہمایوں نے شیر خاں سے مناسب اور جائز صلح کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے پہلے وعدہ سے مکر گیا۔ خواہ ہم عباس کی رائے سے اتفاق نہ کریں اور اس کو دھوکہ دہی اور وعدہ خلافی کے جرم کا مرتکب نہ قرار دیں حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ نے شیر خاں کو خود ہی لڑائی کے لیے اشتعال دیا تھا اور خود ہی باعزت صلح کے امکانات ختم کر کے حماقت کی تھی ظاہر ہے کہ ہمایوں میں اپنے ذی حوصلہ اور عیار حریف کو شکست دینے کا کوئی دم نہیں تھا۔ جوں ہی اس نے شیر خاں سے چنار کا قلعہ لینے کی دھمکی دی۔ شیر خاں نے اس سے بھی زیادہ مستحکم قلعہ پر اپنا قبضہ جما لیا۔ ہمایوں شیر خاں کو کسی طرح مجبور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کھلے میدان میں آکر لڑے۔ اور نہ وہ مغلوں کی طاقت کا لوہا مان لے۔ شیر خاں کو

Marfat.com

کوئی فوجی صدر مقام ایسا نہیں تھا جس کی تسخیر کے بعد اس کی فوجی طاقت ختم ہو جاتی۔ اس کی نقل و حرکت سے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ناقابلِ عبور اور دشوار گذار پہاڑی علاقے میں اس حد تک پیچھے جانے کو تیار تھا جو کہ وسط ہند تک پھیلا ہوا تھا۔ چنار گڑھ کے قبضہ سے نکل جانے کے بعد بھی شیر خاں کو ہمایوں پر پوری فوقیت حاصل تھی۔

دراصل ہمیں شیر خاں کے اعتدال پسند اور اطاعت کیش رویہ کی داد دینی چاہیے۔ خط و کتابت سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس نے ہمایوں کی سب شرائط کو تسلیم کر لیا تھا۔ محض بنگال کی واپسی سے انکار کیا تھا۔ وہ اس بات کے لیے بھی رضامند تھا کہ بنگال کے سلطان کے شاہی نشان چھتر اور تخت ہمایوں کو سونپ دے۔ وہ بہار کا علاقہ بھی جس میں روہتاس کا قلعہ بھی شامل تھا ہمایوں کو حوالے کرنے کو تیار تھا۔ جیسا کہ بادشاہ نے صلحنامہ میں مانگ کی تھی۔ بنگال کے متعلق بھی اس کی شرائط معقول تھیں۔ وہ بحیثیت باجگذار ہمایوں کو سالانہ خراج دینے کو تیار تھا مختصر یہ کہ وہ بادشاہ کی حدود سلطنت سے بہت دور ایک گوشہ میں جا کر رہنے کو تیار تھا اور وہاں بھی خود مختار نہ بن کر بادشاہ کا باجگذار ہو کر ہی رہنا چاہتا تھا۔ وہ شاہی طاقت سے مرعوب تھا اور مغل فوج سے خائف۔ وہ حتی الامکان بادشاہ سے کسی قسم کی لڑائی لڑنا پسند نہیں کرتا تھا۔

جب ہمایوں نے بنگال کی طرف اپنی فوجیں بڑھا دیں تو شیر خاں اور ہمایوں کے درمیان جنگ نے ایک دوسرا ہی رُخ اختیار کر لیا۔ جب تک ہمایوں کا منشا شیر خاں کی طاقت کو کچلنا تھا وہ حق بجانب تھا۔ کیوں کہ مغلیہ سلطنت کی حفاظت و سلامتی کے لیے وہ قدم ضروری تھا۔ لیکن ہمایوں کا یہ مقصد اسی وقت پورا ہو

Marfat.com

گیا۔ جب شیر خاں نے اطاعت قبول کرلی۔ اور اس کی چپہ چپہ زمین جہاں تک ہمایوں اپنی سلطنت کی حد سمجھتا تھا اس کو واپس دینے کو تیار ہو گیا۔ اگر شیر خاں نے بنگال میں آزاد حکومت قائم کی ہوتی تو بھی ہمایوں کے پاس اس کے خلاف فوج کشی کرنے اور اسے بنگال سے باہر نکالنے کے لیے ایک عذر و حیلہ ہوتا۔ لیکن ہمایوں کی سب شرائط لینے کی دلیل ہے کہ وہ اسے ہر قیمت پر نیست و نابود کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیر خاں نے اپنے آقا ہمایوں کے خلاف جو لڑائی لڑی اس کا منشا نہ تو آزاد حکومت قائم کرنا تھا نہ اپنی سلطنت کی توسیع حدود بلکہ وہ اپنی مکمل حفاظت و سلامتی کے لیے لڑی جب کہ ہمایوں کے غیر مصالحتی رویے نے اس کو ایسا کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ جو بے صبری ہمایوں نے اپنے سفیر کے کام کے نتیجے کے انتظار میں دکھلائی۔ یعنی کہ اس کا انتظار نہیں کیا۔ اس سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ہی شرطوں کو پورا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جیسے کہ شیر خاں کو چنار، جونپور وغیرہ دینا۔

اگر ہمایوں بنگال پر حملہ آور نہ ہوتا تو شیر خاں تادم حیات دہلی کا شہنشاہ نہیں بن سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ بنگال کا خود مختار سلطان بن کر ہی قناعت کر لیتا۔ لیکن جب ایک مرتبہ وہ اپنے آقائے نامدار کے خلاف میدان جنگ میں اترنے پر مجبور ہو گیا تو اس کو اپنی قابلیت خود آشکارا ہو گئی۔ جب کہ ایک بار وہ یہ سمجھ گیا کہ اس میں ہمایوں سے زیادہ صلاحیت ہے تو پھر اس نے اپنی قابلیت سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ بنگال کی مہم غالباً مئی ۱۸۳۸ء کے پہلے ہفتے میں شروع ہوئی۔

Marfat.com

جب شیر شاہ نے ہمایوں کے بنگال پر حملہ کرنے کی خبر سُنی تب اس نے اپنی فوج کا بیشتر حصہ روہتاس کی جانب بھیج دیا۔ وہ خود ۵۰۰ گھوڑ سواروں کے ساتھ چپ چاپ گوڑ کی طرف روانہ ہو گیا۔ (ڈارن۔ا۔۱۱۲) ہمایوں نے شیر خاں کے تعاقب میں ایک فوجی دستہ بھیجا۔ لیکن شیر خاں اپنی چالاکی سے چکّر کاٹ کر

عقب میں پہنچا وہ سہسرام کی پہاڑیوں میں چھپا رہا۔ اس نے بادشاہ کے لشکر میں اپنے جاسوس بھیج دیے۔ تاکہ اسے بادشاہ کی نقل وحرکت کی برابر خبر ملتی رہے۔ تعاقب میں جانے والے دستے نے یہ خیال کیا کہ شیر خاں ان کے آگے بھاگ رہا ہے۔ لہٰذا وہ تیزی سے بڑھنے لگے۔ اور دریائے سون کے کنارے منیر مقام پر جا پہنچے۔ یہاں اُنھوں نے بادشاہ کی باقی فوج کا انتظار کرنے کے لیے پڑاؤ ڈالا۔ چند روز بعد بادشاہ بھی منیر پہنچ گیا۔ جہاں شاہ بنگال ان سے آکر ملا۔ ہمایوں نے شاہانہ کریم النفسی اور خوش اخلاقی سے بدنصیب سلطان کو بنگال کا تخت واپس دلانے کا وعدہ کر کے اس کو تسلّی دی (جوہر قلمی نسخہ صفحہ ۲۷)

چونکہ مغل فوج منیر کے مشرقی علاقے سے ناواقف تھی اور ان کو شیر خاں کا صحیح پتہ ونشان نہیں تھا۔ لہٰذا آگے بڑھنے کے لیے انتہائی احتیاط اور ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ہمایوں نے کئی مشہور ومعروف سرداروں کو (موید بیگ جہانگیر بیگ وغیرہ) مع تین ہزار گھوڑ سواروں کے بطور ہراول روانہ کر دیا اور یہ تاکید کر دی کہ وہ بادشاہ کے خاص رسالے سے ۷۔۸ کوس آگے رہیں۔ مرزا ہندال کو حکم دیا گیا کہ وہ منیر کے مقام پر مع اپنے رسالے کے گنگا کو پار کرے۔ اور دوسرے ساحل کے ہمکنار حاجی پور (پٹنہ کے سامنے) کی جانب کوچ کرے۔ فوج کی اس تقسیم وترتیب سے شاید ہمایوں کا یہ ارادہ تھا کہ بنگال سے لوٹتی ہوئی فوج کو راستے میں

Marfat.com

ہی روک دے۔ چنانچہ مغل فوج بڑھتی ہوئی مشرق کی جانب پٹنہ تک پہنچ گئی اور شیر شاہ کی فوج سے کوئی تصادم نہ ہوا۔

ادھر شیر خاں پوشیدہ طور سے شاہی فوج کے پیچھے پیچھے لگا ہوا تھا۔ منیر کے مقام پر مغل فوج کی محتاط ترتیب نے اُسے اس ضرورت کا احساس کرا دیا کہ اس کو شاہی فوج سے پہلے بنگال پہنچ جانا چاہیے تاکہ وہ اپنی فوج کو اس مشکل صورت حال سے بچا سکے۔ لہٰذا اس نے اس علاقے کے اندرونی حصہ میں ہوکر تیزی سے کوچ کیا تاکہ وہ مغلوں کے ہراول دستہ سے آگے نکل جاتے۔ پٹنہ سے چند میل مشرق میں مغلوں کے ہراول دستہ کو یہ خبر ملی کہ شیر خاں کہیں نزدیک میں ہی ہے۔ جب شہنشاہ پٹنہ پہنچ گیا اور اُس کا ہراول دستہ اس سے سات کوس آگے تھا اور ابھی اپنی جائے مقررہ پر نہیں پہنچا تھا کہ اُن کے خبر رساں ایک گاؤں میں آئے جہاں کہ اُنھوں نے ایک باغ میں چند گھوڑ سوار دیکھے۔ اُنھوں نے ان گھوڑ سواروں کی بہ نسبت دیہات والوں سے معلوم کیا۔ ایک نے بتایا کہ بذات خود شیر خاں ہے ہراول دستہ نے جب شیر خاں کا نام سُنا تو اس قدر ششدر رو حیران رہ گئے کہ اُنھوں نے یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس وقت شیر خاں کے ساتھ کتنی فوج ہے، وہ فوراً لوٹ پڑے اور انھوں نے یہ خبر مویدبیگ کو دے دی کہ شیر خاں فلاں موضع میں مقیم ہے۔ موید خاں کا خیال تھا کہ شیر خاں اس جگہ لڑائی کے ارادے سے خیمہ زن ہے۔ اس نے اپنا ایک ہرکارہ بادشاہ کی خدمت میں حکم حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا، مگر خود جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ اس نے شیر خاں کی تلاش میں جاسوس روانہ کر دیے۔ اسی دوران شیر خاں وہ گاؤں چھوڑ کر مونگیر کی جانب چل دیا۔ جب جاسوس خبر لے کر واپس آتے تب قریب شام ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس وقت

Marfat.com

شیر خاں کے تعاقب میں فوج نہ جا سکی۔ (عباس صفحہ ۱۴۴-۱۴۵)

دراصل اس روز شیر خاں مغلوں کی گرفت سے بال بال بچ گیا۔ مغلوں کو جب معلوم ہوا کہ شیر خاں کے ساتھ بہت کم فوج ہے۔ تب اُنھوں نے دوسرے روز سے ہی بہت سرگرمی سے اس کا تعاقب کیا۔ دونوں فریقوں میں فاصلہ روز بروز کم ہونے لگا۔ ایک روز شیر خاں کی جان افغان سردار سیف خاں اچھاخیل سروانی کی جانبازی اور ایثار کی بدولت بچ گئی۔ اس افغان سردار نے اپنے قبیلے کے تین سو جانبازوں کی مدد سے شیر خاں کا تعاقب کرنے والے مغل دستے کو گوگرا گڑھ[1] مقام پر گھنٹوں روکے رکھا۔ شیر خاں سیف خاں کے بیوی بچوں کو لے کر مونگیر کی جانب چل دیا۔ یہاں اس نے شجاعت خاں کو مونگیر کا قلعہ خالی کر کے گڑھور (گڑھی نہیں) جانے کا حکم دیا اور خود ایک تیز رفتار کشتی میں سوار ہو کر گوڑ کی طرف روانہ ہو گیا (عباس صفحہ ۱۴۹) نعمت اللہ کا بیان ہے کہ وہ دو رات اسی طرح دریا میں سفر کرتا رہا[2]۔ رتیل کے مطابق مونگیر اور مالدہ کا فاصلہ براستہ دریا ۱۴۸ میل ہے۔ جون کے آغاز سے اکتوبر کے آخر تک گنگا میں بہاؤ کے ساتھ کشتی کی رفتار ۱۲ گھنٹہ میں ۵۰ سے ۷۰ میل ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ سفر ۳۶ گھنٹے میں طے ہوا ہو گا۔ اس میں پہلی رات اور اس کے

---

[1] اس مقام کا تعین کرنے میں ہم ناکام رہے ہیں۔ سیاق عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ کہیں مونگیر کے مغرب میں ہونا چاہیے۔ یہ سورج گڑھ بھی ہو سکتا ہے۔

[2] اپنے سفر کو پوشیدہ رکھنے کے لیے شیر خاں نے اسے غالباً رات کی تاریکی میں کیا ہو گا۔ ڈوارن، ۱-۱۱۳)

Marfat.com

بعد کا دن و رات لگا ہوگا۔ بالفرض کشتی کی رفتار ۵ میل فی گھنٹہ رہی ہو اور ۶ گھنٹہ ملاحوں نے کھانا، پکانے، کھانے اور آرام کرنے میں لگاتے ہوں تو حساب ٹھیک بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح غالباً جون ۱۵۳۸ء کے آخر تک شیر خاں گوڑ پہنچا۔ گوڑ پہنچنے کے فوراً بعد شیر خاں نے اپنے لڑکے جلال خاں حاجی خاں بٹنی اور دیگر افغان سرداروں کو مع کئی ہزار فوج کے تیلیا گڑھی کے درّہ کی حفاظت کے لیے روانہ کر دیا۔ اس نے دونوں سپہ سالاروں کو یہ حکم دیا کہ وہ درّہ کے راستہ کو بالکل بند کر دیں اور اپنی توپیں اتنی اونچائی پر نصب کریں کہ ہمایوں کو خائف و مرعوب کیا جا سکے۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ بھی تاکید کی کہ وہ کسی بھی قیمت پر نہ تو درے سے پیچھے ہٹیں اور نہ مغلوں سے لڑائی کی نوبت ہی آنے دیں۔ (ڈوارن، ۱، ۱۱۴)

مغل فوج شیر خاں کے تعاقب میں کول گونگ[1] (کھل گاؤں) تک پہنچ گئی۔ یہ مقام گنگا کے جنوبی کنارے پر ہے اور تیلیا گڑھی سے ۲۳ میل مغرب میں ہے (جوہر قلمی نسخہ صفحہ ۲۸)

شہنشاہ نے اس مقام پر اپنے خیمے نصب کر دیے اور جہانگیر قلی بیگ اور دوسرے سرداروں کو تیلیا گڑھی پر قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ لیکن مغل سرداروں نے دیکھا کہ اس درّہ پر اس سے پیشتر ہی جلال خاں مع اپنی کثیر التعداد فوج کے قابض ہو چکا ہے۔ چنانچہ چند روز اسی کش مکش میں صرف ہوتے اور مغل دشمن کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ ہار کر انھوں نے درّے کے سامنے اپنے خیمے گاڑ دیے۔ جلال خاں نے شاہی فوج کے ہراول دستے پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن دوسرے

---

[1] یہ مقام دریائے گنگا کے جنوبی کنارے پر تیلیا گڑھی سے ۲۳ میل کے فاصلے پر ہے (دیکھیے جوہر قلمی نسخہ ۲۸)

Marfat.com

فوجی سرداروں نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ شیر خاں نے تو اس کو محض درّے کی حفاظت کے لیے مقرر کیا ہے نہ کہ جارحانہ لڑائی کا خطرہ مول لینے کے لیے۔ پر جلال خاں نے ان کی بات نہ مانی۔ اس نے ایک ہزار گھوڑ سوار تو درّے کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیے اور خود چھ ہزار فوج لے کر لشکر شاہی پر حملہ کر دیا اور سخت لڑائی کے بعد اس کو شکست فاش دی (عباس قلمی نسخہ صفحہ ۱۵)

نعمت اللہ نے اس لڑائی کا ذکر کرتے ہوتے لکھا ہے کہ جلال[1] خاں کو مغلوں پر یہ فتح اچانک حملہ کرنے کی وجہ سے نصیب ہوئی۔ دوسرے روز علی الصبح مغل حسب معمول اپنے گھوڑے دوڑا کر لشکر میں آ گئے۔ اُنھوں نے اپنے زرہ بکتر کھول دیے۔ گھوڑوں کی زینیں اُتار دیں۔ سپاہی آس پاس کے علاقے میں چارہ جمع کرنے چلے گئے اور افسر بستر تساہل پر آرام کرنے لگے۔ اس کے برعکس ٹھیک دوپہر کے وقت افغان درّہ کا دروازہ کھول کر جھپٹ پڑے۔ چند مغل سپاہی جن کے گھوڑے قریب ہی تھے سوار ہو کر لڑائی کے لیے آمادہ ہو گئے۔ لیکن کثیر تعداد اس اچانک حملے سے حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ مغلوں کے تمام خیمے، اسباب، گھوڑے ہاتھی فاتح افغانوں کے قبضے میں آ گئے۔ اور چند مغلوں کو چھوڑ کر تمام فوج موت کے گھاٹ اُتار دی گئی[2]

مغلوں پر اول فتح تو شیر خاں کی حکم عدولی کر کے ہی حاصل ہوئی

---

[1] جوہر لکھتا ہے (اسورٹ، ترجمہ صفحہ ۱۱۲) کہ جب مغل پہاڑیوں میں سے ہو کر راستہ تلاش کر رہے تھے۔ جلال خاں نے دفعتاً چھاپا مارا اور بہت سے مغل اور سردار قتل کر دیے۔ ممکن ہے جلال خاں نے یہ حملہ اُس وقت کیا ہو جب مغل راج محل کی پہاڑیوں میں دوسرا راستہ تلاش کر رہے تھے۔ مگر ہمارے نسخہ میں یہ نہیں لکھا ہے ساری عبارت پراگندہ ہے۔ (صفحہ ۲۷) ڈارن۔ [2] ڈارن ۱، ۱۱۵۔

Marfat.com

مگر اس کا اخلاقی اثر بہت ہی زبردست ہوا۔ افغانوں کی ابتدائی کامیابی نے ان کی ہمت اور خود اعتمادی میں روح پھونک دی۔ افغانوں کی نگاہ میں مغلیہ فوج کا غلبہ کم ہوگیا اور بادشاہ کا خوف بھی کم ہوگیا۔

جوہر نے لکھا ہے۔" جب یہ حسرتناک خبر بادشاہ کو ملی تو وہ رنجیدہ ہوگیا۔ بہت سے سردار جو میدان جنگ سے صحیح سلامت نکل آتے تھے وہ کھل گاؤں آگئے اور آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ بادشاہ نے فوراً گڑھی کی جانب کوچ کا حکم صادر فرمایا اللہ کے فضل سے بارش ہونے لگی۔ اس کے بند ہونے کے چند گھنٹے بعد مختلف قسم کے خیمے (چادر، خیمہ، سراپردہ) گڑھی کے نزدیک نئے احاطہ میں نصب کیے گئے۔ اور حاجی محمد بیگ کو حکم دیا گیا کہ وہ گڑھی اور جلال خاں کے متعلق اطلاعات فراہم کرکے بادشاہ تک پہنچاتے[1]۔" (جوہر صفحہ ۲۵)

مرزا ہندال جو اپنی فوج کے ساتھ گنگا کے شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ دریا کی جانب سے بنگال کے صدر مقام پر حملہ کرکے جلال خاں کو گڑھی اور شیر خاں کو گوڑ سے ہٹنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ لیکن ہمایوں کی حماقت نے اسے ایسا نہ کرنے دیا۔ اس نے مرزا کو مونگیر سے آگرہ لوٹ جانے کا حکم دے دیا۔

(طبقات اکبری۔ ایلیٹ جلد ۵ صفحہ ۲۰۱، نادری مسودہ صفحہ ۲۰۰)

جلال خاں نے گڑھی کے درہ کی حفاظت کا معقول انتظام کر لیا تھا اور وہ شاہی فوج کی پیشقدمی کو روکے رہا۔ اسی اثنا میں شیر خاں نے گوڑ کو خالی کرنے کے جملہ انتظامات مکمل کر لیے۔ پرتگالی مورخ نے لکھا ہے "شیر خاں نے شہر گوڑ کو جلایا اور لوٹا اور چھ کروڑ کا سونا تصرف میں کر لیا[2]۔ غالباً یہ لوٹ مار اور آتش زدگی

---

[1] عباس نے لکھا ہے کہ لڑائی کے دوسری رات زور کی بارش ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مئی ۱۵۳۸ھ کے آخر میں یہ ماقبل مانسون بارش ہوئی ہوگی۔

[2] یہ غلطی اس لیے ہوئی کہ پرتگالی مورخین کا خیال تھا کہ محمود شاہ کے خلاف (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شیر خاں کے گوڑ پہنچنے سے پہلے ہی سرزد ہوئی اور اس کا مرتکب تھا اس کا ظالم اور سنگدل لڑکا جلال خاں جو کہ اپنے والد کی عدم موجودگی میں وہاں کا مطلق العنان کارپرداز تھا۔"

شیر خاں نے محرم ۹۴۵ ہجری (جس کا آغاز ۳۰ مئی ۱۵۳۸ء میں ہوتا ہے) کے شروع میں فتح کی بنا پر بنگال کی ریاست پر اپنے دعوے کو پختہ کر لیا اور بنگال کے در یعنی گڑھی کے روبرو مغلوں کی توپوں کی گرج سے مطلق نہ خائف ہو کر شہر گوڑ میں رسم تاجپوشی ادا کی لے۔ جیسا کہ اس کے سکے پر کندہ عبارت سے ظاہر ہوتا ہے اس نے فریدالدین ابوالمظفر شیر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ بنگال کو دہلی کی سلطنت میں ملانے والا پہلا بادشاہ سلطان التمش تھا۔ اس کے ٹھیک ۳۰۰ سال بعد شیر خاں کو اوّل و آخر یہ امتیاز حاصل ہوا کہ وہ عربی و ہندی دونوں زبانوں میں اپنے نام کے سکے جاری کرے۔ اس نے سکّے پر اپنا نام "سری سرساہی" کندہ کروایا شیر خاں نے اپنی تاجپوشی کی یہ رسم گوڑ خالی کرنے سے مشکل سے ایک ہفتہ پہلے منائی تھی جو کہ سیاسی نقطہ نظر سے نہایت ضروری تھی یعنی اس کا یہ مطلب تھا کہ سیّد خاندان ختم ہو چکا تھا اور جو سیاسی خلا پیدا ہو گیا اُس کو پُر کر دیا گیا۔ کیونکہ بنگال کی رعایا اس خیال کی عادی ہو چکی تھی کہ تخت پر قبضہ کرنے کے لیے خواہ کتنے ہی قتل ہوں۔ خاندانی انقلاب ہوں لیکن گوڑ کی مسند کبھی خالی نہیں رہ سکتی۔ تخت نشینی کے دوسرے ہی دن شیر شاہ اپنا تمام سامان و مال غنیمت جمع کر کے عین

اس موقع پر جب ہمایوں گوڑ میں اس کا شکار کرنا چاہتا تھا اس کی نگاہوں سے بچ کر فرار ہو گیا۔ شیر خاں

شیر خاں اپنے ساتھ گوڑ سے اتنا ہی سامان لے گیا جو کہ ایک طویل سفر میں اپنے ساتھ رکھنا ممکن تھا روایت ہے کہ شیر نے گوڑ کا محل کافی دلاویز و دلکش

(گذشتہ صفحہ کا حاشیہ)

آخری حملے میں شیر خاں پورے وقت بنگال میں رہا لیکن اصل واقعہ یہ نہیں ہے (دیکھیے کپوس، صفحہ ۴)

لے شیر خاں کی تاجپوشی کے متعلق باب ہشتم کا ضمیمہ دیکھیے گا۔

Marfat.com

چھوڑا۔ اس کی دلفریبی محمود کے حرم کی دس ہزار بیگمات نے اور بھی بڑھا دی۔ (رکمپاس) شیرخاں نے ان بیگمات کو ارادتاً یہاں چھوڑ دیا تھا تاکہ چھتر اور طاعون کے باوجود مغلوں کو گوڑ میں بہشت کے کسی بھی لطف کی کمی کا احساس نہ ہو۔ شیرخاں نے جلال خاں کو بھی یہ تاکید کر دی کہ اس کے شیرپور پہنچنے پر وہ گڑھی خالی کر دے[1] شیرپور موجودہ قاسم بازار سے ۱۶ میل جانب مغرب ہے۔

ایک روز بوقت شب جلال خاں بھی اپنی فوج لے کر گڑھی سے نکل گیا۔ اور اپنے والد سے شیرپور میں جا ملا۔ مغل چتر رسانوں قفقشال اور مغل بیگ کو اصلی پتہ آدھی رات کو ہی لگ پایا۔ انھوں نے یہ خوش خبری بادشاہ دی۔ بادشاہ نے فوراً درہ پر قبضہ کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ گڑھی سے مغل فوج خوش و خرم گوڑ کی جانب روانہ ہوئی اور چار دن میں بنگال کی دارالسلطنت میں بادشاہ جلوہ افروز ہو گیا[2] جب شیردل سلطان یعنی شیرخاں اپنے شکار سے محروم ہو گیا تب وہ بادل ناخواستہ جھارکھنڈ کے راستے سے ہو کر ریتاس پہنچا اور جو بنگال میں مال غنیمت جمع کیا تھا اس کو وہاں رکھ کر وقت انتقام کی راہ دیکھنے لگا۔

---

[1] اکبرنامہ۔ ا۔ صفحہ ۲۲۴ دیکھیے گا۔

[2] جوہر قلمی نسخہ صفحہ ۴۸۔ عباس قلمی نسخہ صفحہ ۱۵۱۔ فرن ترجمہ ڈارن۔ ا۔ صفحہ ۱۱۵ اور دیگر مورخین نے باتفاق رائے لکھا ہے کہ شیرخاں نے جلال خاں کو اپنے روہتاس پہنچنے پر واپس بلایا ——— لیکن یہ لغو ہے جھارکھنڈ کے پیچیدہ راستے سے ہو کر گوڑ اور روہتاس کا فاصلہ ۵۰۰ میل ہے۔ شیرخاں ایسا ناتجربہ کار سپاہی نہیں تھا کہ اپنے اور اپنے لڑکے جلال خاں (جس کے پاس اس کی حملا ً ور فوج کا بھی کافی حصہ تھا) کے درمیان اتنا فاصلہ کر دیتا۔ عباس نے لکھا ہے (دیکھیے ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۳۷۳) کہ جلال خاں گڑھی میں ایک مہینہ تک رہا۔ ہمارے اندازے سے جو جوہر کی دی ہوئی تاریخوں پر مبنی ہے مغل فوج گڑھی میں ۲۰ دن سے زیادہ نہیں ٹھہری ہوگی اس حساب شماری میں ہم نے جوہر کی اس بات کو صحیح تسلیم نہیں کیا ہے کہ چنار کا محاصرہ ۶۵ مہینہ تک رہا۔ ریاض نے لکھا ہے کہ شیرخاں جھارکھنڈ کے جنگلات کی جانب بھاگ گیا (دیکھیے انگریزی ترجمہ صفحہ ۱۱۲) حقیقت یہ ہے کہ شیرخاں بھاگا

Marfat.com

(گذشتہ صفحہ سے آگے)

نہیں بلکہ اس نے باقاعدہ اپنی فوج کو پیچھے ہٹا لیا تھا۔ بھاگنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیوں کہ اس کی فوج گنگا کے اس کنارے پر تعاقب میں آنے والی کسی بھی مغل فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ نہ کسی فوج کے آثار ہی دکھائی پڑتے تھے۔

Marfat.com

باب 8 کا ضمیمہ

شیر شاہ کی تاجپوشی کی پہلی تاریخ

میں نے اپنی پہلی تصنیف "شیر شاہ" میں (دیکھیے ضمیمہ ۲۰۶-۲۰۸) شیر شاہ کی تاجپوشی کی تاریخ ۹۴۵ ہجری کے بجائے ۹۴۶ ہجری مقرر کی تھی۔ لیکن اب ڈھاکہ کے قرب و جوار میں کافی تعداد میں ۹۴۵ھ کے شیر شاہ کے سکے مل جانے کی وجہ سے مجھے اپنی پہلی رائے میں ترمیم کرنی پڑی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں جب میں نے اپنی پہلی کتاب "شیر شاہ" لکھی تھی میرے سامنے ٹامس کے ۹۴۵ھ کے سکہ کی نقل تھی۔ لیکن میں ونسنٹ اسمتھ کے اثر سے مغلوب تھا میں نے اسمتھ کی تقلید میں تاجپوشی کا سال ۹۴۶ھ تعین کیا۔ میں اس وقت علم مسکوکات کا محض نو آموز مبتدی تھا۔ میں نے اپنے دل میں تصور کیا کہ اسمتھ نے بھی ٹامس کے سکہ کو ضرور دیکھا ہوگا اور کسی خاص وجہ سے رد کر دیا ہوگا۔ اس لیے میں نے بھی اپنی رائے یہی قائم کی کہ شیر خاں چوسہ کی لڑائی کے بعد ۹۴۶ھ میں تخت نشین ہوا۔ لیکن اب جب کہ ایک سے زیادہ اور کافی تعداد میں ۹۴۵ ہجری کے سکے دستیاب ہو گئے ہیں تو میں اپنی نظر کو فریب نہیں دے سکتا اور اپنی پہلی رائے پر اصرار نہیں کر سکتا۔ مشرقی بنگال میں دستیاب سکوں سے پتہ چلتا ہے کہ شیر شاہ کی رسم تاجپوشی محرم ۹۴۵ھ کے آس پاس ہی ہوئی ہوگی کیونکہ تاریخ کے سلسلہ واقعات سے یہ بات ظاہر ہے کہ اس نے تاریخ کے بعد شیر شاہ گوڑ میں مقیم نہیں رہا۔

میں اپنی تصنیف "شیر شاہ" میں ہمایوں کی نقل و حرکت کے متعلق جو کچھ لکھا تھا اس کو صحیح مان کر میرے مرحوم دوست ڈاکٹر این کے بھٹسالی نے شیر شاہ

Marfat.com

کی رسم تاجپوشی اور سکہ جاری کرنے کا وقت جون ۱۵۳۸ء کے آخر سے ۱۵ر جولائی ۱۵۳۸ء تک کے درمیان بتایا ہے یعنی صفر ۹۴۵ھ کے وسط میں۔
(دیباچہ کیٹیلوگ آف کوائنس۔ تصنیف شدہ سیدا ے۔ ایم۔ ایس طیفور۔ ڈھاکہ میوزیم ڈھاکہ ۱۹۳۶ء)

ڈاکٹر صاحب موصوف کی یہ تاریخ مقرر کرنے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے عارضاً ہمایوں کے گوڑ میں وارد ہونے کا وقت تقریباً ۱۵ر جولائی ۱۵۳۸ء تعین کیا تھا۔ (دیکھیے شیر شاہ۔ صفحہ ۱۷۴)

لیکن اب میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرے حساب میں غلطی ہے۔ کیونکہ میں نے اپنی تاریخوں میں جوہر سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ردوبدل کر دیا تھا۔ جوہر نے اپنی یادداشت کی بھول سے چنار کے محاصرے کا وقت ۶ مہینے بتایا۔ علاوہ ازیں اس وقت میں اس بات پر بھی توجہ نہ دے سکا کہ ۱۵ر جون کے بعد بنگال میں زور شور سے مانسونی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت نہ ہمایوں گوڑ میں داخل ہو سکتا تھا نہ شیر خاں بنگال سے بچ کر نکل سکتا تھا۔ ان تاریخوں میں ترمیم کرنے کی اور بھی کئی وجوہات ہیں جو پہلے بتا چکا ہوں بہر حال میری اس غلطی کو تلاش کرنے کا سہرا ڈاکٹر بھٹسالی کے سر ہے۔

Marfat.com

باب 9

شیر خاں مغلوں کے سراغ میں

(جولائی ۱۵۳۸ء لغایت دسمبر ۱۵۳۸ء)

مغلوں کے خلاف شیر خاں کی جارحانہ کارروائی

۱۵۳۸ء کی برسات میں شیر شاہ نے اپنی فوج اپنے وطنی علاقہ سہسرام اور روہتاس میں اکٹھی کر لی تھی۔ جوں ہی برسات ختم ہوتی اس نے مغلوں کے خلاف جارحانہ کارروائی شروع کر دی۔ جس سے کہ سلطنت مغلیہ کی جڑیں ہل گئیں۔ شیر خاں نے اپنے منصوبے نہایت دور اندیشی اور دانشمندی سے مرتب کیے۔ اس نے خواص خاں کو یہ حکم دیا کہ وہ بہار کے علاقے پر از سر نو تسلط کرے اور بادشاہ کی نقل و حرکت پر نظر رکھے۔ تاکہ وہ ایسے وقت پر حملہ نہ کر دے جب کہ شیر خاں بہار کے باہر کہیں مصروف ہو۔ شیر خاں کا سب سے پہلا نصب العین تھا بنارس پر قبضہ کرنا۔ چنار پر مغلوں کا قبضہ بہت مستحکم تھا۔ چنانچہ اس نے بنارس کا محاصرہ کیا اور اس پر تسلط کرنے کے بعد وہاں کے گورنر میر فضلی کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد مغلوں کی بیشتر فوج کو بھی تہ تیغ کیا[1]

---

[1] اکبر نامہ ۱: ۳۴۶، ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۳۶۸۔

Marfat.com

بنارس[2] سے شیر شاہ جونپور روانہ ہوا اور اس نے جونپور[3] کا گھیرا بھی ڈال دیا۔ یہاں کے گورنر بابا بیگ جلایر نے قلعہ کی حفاظت کا معقول انتظام کر لیا تھا۔ وہ کچھ دنوں تک افغانوں سے لوہا لیتا رہا۔ اور اس نے کوڑا اور آگرے کو مزید کمک حاصل کرنے کے لیے پیغام بھیجے۔ اسی اثنا میں شیر خاں نے اپنے سردار ہیبت خاں نیازی، جلال خاں جالو، سرمست خاں سروانی اور دیگر سرداروں کو بہرائچ[4] پر حملہ کرنے کیلیے روانہ کیا۔ انھوں نے اس علاقہ سے مغلوں کو نکال باہر کیا۔ شیر خاں نے جونپور کی فتح کا انتظار نہیں کیا۔ اس نے مغلوں کی سلطنت میں قنوج تک کے علاقہ کو اپنے تصرف میں کر لیا۔ عباس لکھتا ہے

---

[2] جوہر کہتا ہے کہ "شیر شاہ نے ۷۰۰ مغل قتل کیے" نسخہ صفحہ ۲۹۔ لیکن اس نے یہ نہیں لکھا کہ یہ قتل کہاں ہوئے۔ غالباً یہ واقعہ بنارس کا ہی ہوگا۔ یہ تعداد اس معنی میں اہم ہے کہ چنار کے ان مقتول افغان توپچیوں کے برابر ہے جن کو مغلوں نے ہلاک کیا تھا۔

[3] عباس کہتا ہے کہ جونپور کا گورنر مارا گیا۔ یہ غلط ہے کیوں کہ بابا بیگ جلایر ہمایوں کے ساتھ چوسہ کی لڑائی میں موجود تھا۔ (گلبدن ہمایوں نامہ۔ صفحہ ۱۳۵۔ شاید عباس یوسف بیگ بن ابراہیم بیگ کو غلطی سے بابا بیگ لکھ دیا ہے۔ یوسف بیگ جونپور کے نزدیک ایک لڑائی میں جلال خاں کے ہاتھوں مارا گیا (اکبر نامہ، ا۔ صفحہ ۳۳۶۔)

[4] بہرائچ اودھ میں ایک مشہور جگہ ہے۔ یہ فیض آباد سے ۷۰ میل جانب شمال ہے ۸۲ طول البلد اور ۵ر ۲۷ عرض البلد کے درمیان واقع ہے۔ یہ فوج اودھ کے علاقہ پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی اور شاید شمالی بہار پر بھی۔

عباس لکھتا ہے کہ یہ فوج اپنی یورش میں دہلی سے ۸۰ میل دور سنبھل تک پہنچ گئی تھی سنبھل ۸ء ۷۰ طول البلد پر واقع ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ افغان فوج (باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱ سے آگے) اتنی دور تک کبھی نہیں پہنچ سکی۔ بادشاہ کے جانبداروں کا یہ کہنا ہے کہ شیر خاں نے قنوج کے علاقہ تک قبضہ کر لیا تھا۔ اس بیان کی صداقت میں شبہہ کرنے کی کوئی وجہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ علاوہ بریں یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ فوج کا ایک ہی دستہ پہلے جانب مشرق بہرائچ تک گیا ہو اور پھر گھوم کر جانب مغرب سنبھل تک پہنچا ہو (عباس۔ ایلیٹ صفحہ ۳۶۵)

Marfat.com

کہ شہنشاہ ہمایوں کی جانب سے جس کسی گورنر نے مزاحمت کی یا افغانوں سے لڑنے کی کوشش کی وہی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یا ہر اکر علاقہ سے بدر کر دیا گیا کہیں کہیں کچھ مغل سپہ سالاروں نے جم کر مقابلہ بھی کیا۔ لیکن ناکہ بندی ہو جانے کی وجہ سے ان کی ہار لازمی تھی محض وقت کا انتظار تھا۔ تقریباً دو اب کے باہر علاقہ میں شہنشاہ کے اقتدار حکومت کا خاتمہ ہی ہو گیا تھا۔ سارے قنوج علاقہ میں شیر شاہ نے بے ربط غارت گری نہیں ہونے دی بلکہ اس نے ایک خود مختار بادشاہ کی طرح عمل کیا۔ اس نے ہر خطّہ میں اپنے افسر مقرر کیے اور ان افسران کے ذریعہ فصل ربیع وخریف کا لگان وصول کیا[1]

بلا شک ملک کو پائمال کیے بغیر دولت فراہم کرنے کا یہ ایک عجیب و غریب اور خدا ترس طریقہ تھا۔ اغلب ہے کہ اس کے کچھ معاونوں نے کسی شہر کو تباہ و برباد بھی کیا ہو مگر کسانوں کو کوئی ضرر نہیں پہنچایا گیا۔ شیر شاہ کا غیظ و غضب مغلوں کے خلاف تھا نہ کہ بیچارے کسانوں کے۔ کیونکہ انھوں نے مجبور ہو کر مغلوں کی اطاعت قبول کی تھی۔ اس کا یہ قول تھا کہ "کاشت کار بے قصور ہوتے ہیں وہ تو صرف اقتدار کے مطیع ہوتے ہیں"[2]

اب صرف دو ہی مقام یعنی چنار اور جونپور ایسے رہ گئے تھے جو کہ شیر شاہ کے مقابلے میں ڈٹے تھے۔ ان دونوں کا محاصرہ کیا گیا۔ مغلوں کے اب ہوش ٹھکانے نہ تھے۔ جو مغل اس وقت آگرے میں تھے بادشاہ کی جانب سے ناامید ہو چکے تھے اور جو مغل بنگال میں تھے اُنھیں احساس ہو گیا تھا کہ جس مقام کو اُنھوں نے عشرت کدہ سمجھا تھا وہ اب اُن کے لیے قید خانہ ہو گیا تھا۔ جہاں سے نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ شیر شاہ نے پہلے آگرے کی جانب کوچ کیا۔ لیکن جیسے ہی اسے ہمایوں کے گوڑ سے روانہ ہونے کی خبر ملی وہ رُک گیا۔

---

[1] ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۳۶۰ دیکھیے گا۔ اکتوبر ۱۵۳۸ء سے فروری ۱۵۳۹ء تک تمام علاقہ شیر شاہ کے قبضہ میں رہا۔ ربیع وخریف کا لگان اسی دوران واجب ہوتا ہے۔

[2] عباس۔ صفحہ ۲۶۲

Marfat.com

۱۵ر جولائی ۱۵۳۸ء کے عنقریب گوڑ میں داخل ہونے کے بعد ہمایوں نے شہر کی مرمت اور صفائی کا حکم دیا۔ تاکہ جنگ کی تباہی و بربادی کے نشانات مٹا دیئے جائیں۔ افیون خور بادشاہ کو یہ مقام اس درجہ پسند آیا کہ اس نے اس کا نام بدل کر جنت آباد[2] رکھ دیا۔ اس صوبہ بنگال کو اپنے امیروں میں تقسیم کر دیا۔ بنگال کے ۹ مہینے کے قیام کے دوران وہ اس قدر عیش و مستی میں مبتلا رہا کہ ایک مہینے کے بعد کسی کو اعلیٰ حضرت کا دیدار نصیب نہ ہو سکا تھا۔ وہ ہمیشہ حرم کی چہار دیواری میں رہتا تھا۔ (جوہر قلمی نسخہ صفہ ۲۹)

عالی مرتبہ حاکم اور سپاہی بھی شہنشاہ کی تقلید کر کے عیش و آرام کے ذرائع فراہم کر کے عیاشی میں مست ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وسط ایشیا کے دلیر و جری سپاہیوں کی شجاعت بنگال کے نم میدانوں میں ختم ہو گئی۔ جیسا کہ ہنی بال کے سپاہیوں کا جوش "کالور" پہنچ کر ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ گوڑ جو چند مہینے پہلے جنت معلوم ہوتا تھا انجام کار ہمایوں کی عظمت کی گور یعنی قبرستان بن گیا۔

دسمبر ۱۵۳۸ء کے آخر میں شیر شاہ کی فتوحات کی خبر ہمایوں کے عیش میں مخل ہونے لگیں۔ وہ خواب سے بیدار تو ہوا لیکن کانوں سنی کا اس کو اعتماد نہ ہوا۔ جوہر لکھتا ہے "جب اعلیٰ حضرت نے یہ خبر سنی ان کو یقین نہ آیا کہ صورت حال اس قدر بدتر ہو چکی ہے۔" بقول جوہر اس نے یہ سوال کیا کہ "شیر خاں کو یہ سب کرنے کی جرات کیسے ہوتی ؟" بہر حال بادشاہ نے دارالسلطنت لوٹنے کا کچھ ارادہ کیا۔ اس نے اپنے سپہ سالاروں کا ایک خفیہ اجلاس منعقد کیا جس میں اس مسئلے پر غور کیا گیا کہ بنگال کا انتظام کس کے سپرد کیا جائے۔ اعلیٰ حضرت نے یہ فرمایا۔ "زاہد بیگ[3] ہم سے ترقی کے لیے اصرار کرتا ہے۔ بہتر ہو گا کہ اسے

---

[2] دیکھیے طبقات اکبری ایلیٹ ا، جلد ۵ صفہ ۲۰۱۔ پروفیسر ہودی والا کو اس نام پر اعتراض ہے۔ اس کے اعتراض کیلیے ملاحظہ کیجیے (اسٹڈیز صفہ ۵۰۸۔ فرشتہ کا یہ خیال درست ہو سکتا ہے کہ نام بدلنے کی وجہ یہ تھی کہ فارسی زبان میں گور کے معنی قبر کے ہیں۔ جلد ۱۔ صفہ ۲۱۶

[3] زاہد بیگ ہمایوں کی ملکہ بیگا بیگم کی بہن کا خاوند تھا۔

Marfat.com

بنگال کا گورنر بنا دیا جائے۔ زاہد بیگ سکتہ کے عالم میں آگیا اور بولا۔ "یہ کیا مابدولت کے خیال میں میرے ذبح کرنے کے لیے بنگال سے بہتر کوئی مدفن نہیں ہے" (جوہر)

ہمایوں اس جواب سے اتنا برافروختہ ہوا کہ زاہد بیگ کو سخت سزا دینے کی سوچنے لگا۔ لیکن اس سے حالت اور بھی بدتر ہو گئی۔ زاہد بیگ نے حاجی محمد اور جہاندار بیگ کو بغاوت کی ترغیب دی اور تینوں مل کر آگرہ بھاگ گئے۔ آگرہ پہنچ کر انھوں نے مرزا ہندال کو اُکسایا کہ وہ خود بادشاہ بن جائے اور اس کو ورغلایا کہ وہ شیخ بہلول کو قتل کر دے۔ ہمایوں نے شیخ کو مرزا ہندال کے پاس یہ پیغام لیکر بھیجا تھا کہ وہ جونپور میں مغل گورنر کی امداد کے لیے جائے مرزا ہندال پر باغیوں کی ترغیب سے رنگ چڑھ گیا۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور جونپور میں مغل فوج کی مدد کرنے کے بجائے وہ دہلی کی جانب روانہ ہو گیا اس نے شہر کا محاصرہ ڈال دیا۔

ہمایوں کی گوڑ سے واپسی

جب مرزا ہندال کی بغاوت اور شیخ بہلول کے قتل کی خبر گوڑ پہنچی تو تاخیر پسند بادشاہ نے بالآخر بنگال سے کوچ کا تہیہ کر لیا۔ یہ ۱۵۳۹ء کے آغاز کی بات ہے۔ ہر مغل سپاہی جلد از جلد اس موت کے شکنجے سے جو کہ افغانوں نے تیار کیا تھا نکلنے کے لیے مضطرب و بیتاب ہو رہا تھا۔ گوڑ کا گورنر کوئی بھی بننے کے لیے تیار نہ تھا۔ آخر کار ایک جری دلیر، وفادار و نمک خوار افسر جہانگیر قلی بیگ کو پانچ ہزار فوج دے کر گوڑ کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ آنے والے خطرہ کی اہمیت نے کچھ عرصہ کے لیے ہمایوں کی بیدار مغزی کو متحرک کیا۔ اس نے بنگال سے لوٹنے کے لیے گنگا کے شمالی کنارے کے تحفظ کا معقول انتظام کیا اور یہ دیکھ کر کہ شیر خاں نے اس خطہ سے پہلے ہی اپنی منتشر افواج کو ہٹا کر جنوبی بہار بلا لیا تھا۔

اس نے پہلے سے ہی مرزا عسکری کو بھاگلپور ضلع میں 'کول گانگ' پر

Marfat.com

قبضہ کرنے کے لیے ایک مضبوط فوج لے کر بھیجدیا تاکہ شیر شاہ کے متعلق صحیح خبر مل سکے اور مغلوں کے پیچھے ہٹتے ہوئے دستوں پر افغانوں کے دفعتاً حملہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ شہنشاہ نے خانخاناں لودی (دلاور یوسف خیل) کو مونگیر جانے کا حکم دیا اور اس کو یہ تاکید کر دی کہ اصل مغل فوج کے پہنچنے تک وہ وہاں انتظار کرے۔ (جوہر قلمی نسخہ صفحہ ۳۱)

فنون حرب کے نقطۂ نظر سے مونگیر کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اس کے غنیم کے ہاتھ میں چلے جانے سے دو زبردست خطرہ پیدا ہو سکتے تھے اول یہ کہ یہاں سے مرزا عسکری کے "کول گانگ" والے دستے کے خلاف جارحانہ کارروائی کی جا سکتی تھی دوئم یہ کہ گنگا کو عبور کر کے ہمایوں کے واپس لوٹنے کے راستے میں مزاحمت کی جا سکتی تھی۔ اسی اثنا میں مرزا عسکری نے بادشاہ کو یہ خبر دی کہ شیر خاں جو ابھی تک جونپور اور چنار کا محاصرہ کر رہا تھا اور جس نے قنوج کے سارے علاقہ پر اپنا تصرف کر لیا تھا اب اپنی فوجیں واپس ہٹا رہا ہے۔ اور اس نے اب اپنی پوری طاقت روہتاس کے نزدیک اکٹھی کر لی ہے اور سڑک کے راستے کو روک رہا ہے۔ (جوہر، صفحہ ۳۴)

اس خبر سے ہمایوں کو قدرے اطمینان ہوا کہ گنگا کے شمالی کنارے پر دشمن کا کہیں جماؤ نہیں ہے۔ اس نے فوج کو کوچ کا حکم دیا اور مونگیر کے مقابل پہنچ گیا۔ یہاں مرزا عسکری نے دوسرے کنارے سے آکر بادشاہ سے ملاقات کی۔ بادشاہ نے اپنے جملہ مرزاؤں کو بلا کر مشورہ کیا کہ اس مقام پر گنگا عبور کرنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ تمام سردار اس راستے سے متفق تھے کہ مغل فوج گنگا کے شمالی کنارے کے برابر آگے بڑھے۔ محض ایک شیطان موید بیگ ہی جو کہ ہمایوں کا منظور نظر تھا ایسا تھا جس نے اس راستے سے اختلاف کیا اور کہا "آپ عظیم الشان عالی مرتبت شہنشاہ ہند ہیں آپ کو لازم ہے کہ جس راستے سے آپ آئے تھے اُسی راستے سے واپس لوٹیں ورنہ شیر خاں کہے گا کہ اصل راستہ اختیار نہ کر کے شاہی فوج دوسرے راستہ سے دُم دبا کر بھاگ گئی۔" (گلبدن صفحہ ۱۳۵، جوہر قلمی نسخہ صفحہ ۲۲-۲۳)

Marfat.com

بادشاہ کی یہ کمزوری تھی کہ وہ اہم مسائل کا فیصلہ اکثر دوسروں پر ہی چھوڑ دیتا تھا۔ اس نے موید بیگ تجویز قبول کر لی اور سر ہلا دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ تمام مغل فوج نے مونگیر کے مقام پر دریا کو پار کیا۔ نہ کسی قسم کا حادثہ رونما ہوا اور نہ قرب وجوار میں شیر شاہ کی موجودگی کی ہی کوئی خبر ملی۔ خانخاناں مونگیر میں بادشاہ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن خدا کی مرضی کچھ دوسری تھی۔ اس نے بدنصیب بادشاہ کو شیر شاہ کے چنگل میں ڈال دیا۔ جب تک ہمایوں کی فوج شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ آگرے کی جانب جا رہی تھی۔ شیر شاہ کا کوئی ارادہ نہ تو اس سے ٹکر لینے کا تھا نہ راستہ بند کرنے کا۔ مونگیر میں مغل فوج کافی عرصہ تک پڑاو ڈالے رہی تاکہ کشتیوں کا بیڑہ جس پر ہمایوں کا سامان وحرم سوار تھا وہاں تک پہنچ جائے اور آگے کا سفر فوج کی حفاظت میں ہو سکے۔ (گلبدن)

بنگال کو بالکل خالی کرنے کا ہمایوں کا ذرا سا بھی ارادہ نہ تھا۔ اس لیے ہمارے پاس اس قیاس آرائی کے لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ گرھی کے درے اور مونگیر سے مغل فوج ہٹالی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہمایوں نے پٹنہ کی جانب اپنی فوج کو کوچ کا حکم دیا تو خانخاناں لودی کو یہیں چھوڑ دیا تھا۔ خانخاناں چوسہ کی لڑائی میں موجود نہیں تھا۔ خود ہمایوں اصلی فوج کی کمان کرتا ہوا پٹنہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ کشتیوں کا بیڑہ مستورات کو لے کر حاجی پور پٹنہ پہنچ گیا یہاں ان کو کشتیوں سے اتار کر شاہی خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ مغل فوج بلا کسی مزاحمت کے موجودہ داناپور کے نزدیک منیر مقام تک جہاں سون ندی گنگا میں ملتی ہے۔ آگے بڑھ گئی۔ شیر شاہ کو یہ اندیشہ تھا کہ مغل فوج روہتاس پر حملہ کرے گی۔ لہٰذا اس نے اپنی تمام فوج دریائے سون کے اوپری بہاؤ پر پہاڑی کی تلہٹی میں اکٹھی کر لی۔ لیکن جب مغل فوج منیر سے مغرب کی جانب چنار اور غازی پور کی طرف روانہ ہو گئی تو شیر شاہ کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ مغلوں کے خلاف حملہ کرنے کا منصوبہ باندھنے لگا۔

شیر خاں نے اپنے سرداروں کو بلایا اور ان سے مشورہ کیا کہ اب جب کہ

Marfat.com

بادشاہ کی فوج سراسیمہ اور پراگندہ ہے اور آگرے میں بغاوت کے آثار نمودار ہو چکے ہیں تب کیا کرنا چاہیے؟ اس نے کہا۔" اب بادشاہ میری طرف سے پیٹھ پھیر کر جا رہا ہے۔ خدا کے فضل سے اب میری حالت زیادہ پائیدار اور مستحکم ہے۔ اگر میرے عزیز و احباب مشورہ دیں تو اب میں قسمت آزمائی کر لوں۔ اس سے پیشتر میں کافی چوٹ کھا چکا ہوں۔ بادشاہ کے بنگال کی مہم پر روانہ ہونے سے پیشتر میں نے ان کو سالانہ خراج دینے کا وعدہ کیا تھا بشرطیکہ وہ بنگال میرے حوالے کر دے۔ بادشاہ نے مجھ سے وعدہ بھی کیا۔ لیکن بنگال کے سلطان کا سفیر پہنچنے کے بعد وہ وعدہ شکن ہو گیا میں نے بہار اور جونپور سے اس کی فوجوں کو نکال دیا ہے چنانچہ صلح نامہ کا دروازہ اب بند ہو گیا ہے۔" (عباس، صفحہ ۱۵۳-۱۵۴)

جب مغل فوج منیر سے آرا اور بکسر کی جانب بڑھ رہی تھی تب شیر خاں نے اپنی فوج لیکر مغل لشکر کے عقب پر چھاپہ مارا اور ان کو کافی نقصان پہنچایا جوہر نے شیر خاں کی مغل فوج کی اس غارت گری کا ایک واضح نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"ایک روز دنبالہ لشکر کے سپاہیوں نے خبر دی کہ افغان ہماری پشت پر دکھائی پڑتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے یہ حکم صادر کیا کہ یہ اعلان کر دیا جائے کہ دوران کوچ سپاہی برابر مسلح رہیں۔ دوسرے روز یہ خبر ملی کہ غنیم سے جھڑپ ہو گئی ہے اور دونوں طرف سے تیر و تفنگ چلے۔ تیسرے روز خبر ملی کہ دشمن نے ہماری وزنی کوہ شکن توپوں کو جن سے کہ چنار کے قلعہ کی میناروں کو زمین دوز کیا گیا تھا اور جو کشتیوں پر لدی ہوئی تھیں اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ شہنشاہ نے فوراً اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مسلح ہو کر گھوڑوں پر سوار ہو جائیں۔ چوتھے روز سپاہی زرہ بکتر پہن کر گھوڑوں پر سوار ہو کر چلنے لگے اور چوسہ پہنچ گئے جب کہ ایک پہر دن باقی تھا (یعنی تقریباً ۴ بجے تھے) ابھی سپاہیوں نے مشکل سے رکاب سے پیر نکالا ہی تھا کہ مشرقی اُفق پر ایک گہرا غبار دکھائی پڑا۔ بادشاہ نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ جا کر پتہ لگائیں کہ کس کی فوج ہے۔ بہت

Marfat.com

دیر بعد ہرکارے یہ خبر لائے کہ شیر خاں بذات خود مع اپنی فوج کے آپہنچا ہے
اور اس کی فوج لڑائی کے لیے صف آرا ہے۔ شہنشاہ نے اپنے امیروں
سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ قاسم حسین سلیمان جواب دیا۔ شیر خاں نے
آج ۱۸۔۱۹ کوس کا سفر طے کیا ہے۔ اس کے گھوڑے تھک چکے ہیں اور حملہ
کے قابل نہیں ہیں ہم کو اسی وقت انھیں جنگ کے لیے للکارنا چاہیے نصر من
اللہ فتح قریب (فتح و کامیابی کا انحصار خدا کی مدد و مرضی پر ہے)
—— شہنشاہ کو یہ تجویز پسند آئی مگر موید بیگ کی رائے اس کے برخلاف تھی
بادشاہ نے اس کی رائے کو ترجیح دی اور لڑائی ملتوی کرنے کا حکم دیا اور
کہدیا" لڑائی میں عجلت کی ضرورت نہیں۔" بادشاہ کا یہ حکم سن کر امیر و
سپاہی دونوں ہی بہت مایوس ہوئے۔ فوج رک گئی اور اس نے پڑاؤ ڈال
دیا۔ شیر خاں بھی نزدیک میں ہی شاہی فوج کے بالمقابل خیمہ زن ہو گیا۔ اس
نے اپنے لشکر کے ہر چار جانب مٹی کی دیوار بنوائی اور اپنے سپاہیوں کو اس فصیل کے
سایہ میں چھپا دیا۔"

(جوہر قلمی نسخہ صفحہ ۳۵-۳۶۔ اسٹورٹ کا ترجمہ نامکمل ہے۔ صفحہ ۱۰ اور بایں وجہ رد کر دیا گیا ہے)

جوہر کی یادداشت میں جو سہو ہوئے وہ قابلِ رعایت ہیں۔ کیوں کہ اس
نے منیر سے چوسہ تک کا جو سفر اپنے آقا کے ساتھ کیا تھا اس کے ۵۰ سال
بعد اس کے متعلق واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ جوہر کا بیان طبعی جغرافیہ کی رو سے
بھی درست نہیں ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ منیر سے چوسہ تک کا فاصلہ مغل
فوج نے چار روز میں طے کیا۔ یہ فاصلہ منیر کی طرف سون ندی کے کنارے
سے یعنی دریا کے مشرقی ساحل سے تقریباً ۸۰ میل ہے۔ یہ بات قرین قیاس نہیں
ہے کہ مغل فوجوں نے اتنا طویل سفر ۲۰ میل فی دن کی رفتار سے ۴ دن میں طے
کر لیا ہوگا۔ خصوصاً جب کہ شیر خاں اس کے دامن بہ دامن چل رہا تھا۔ فوجیں
کشتیوں کے ہمراہ چلتی تھیں۔ کشتیاں دریا کے بہاؤ کے مخالف جا رہی
تھیں اور فوج کو سون دریا عبور کرنے میں بھی کچھ وقت لگا ہوگا۔ ہمایوں نے
یہ سفر ۱۵۳۹ء کے موسم بہار میں کیا تھا۔ منیر سے کرم ناسا دریا تک جانے

Marfat.com

کے لیے اس نے وہی راستہ اختیار کیا تھا جس سے کہ بابر اپریل ۱۵۲۹ء کے پہلے ہفتہ میں گیا تھا۔ یعنی کہ رم ناسا دریا کے کنارے سے جو چوسہ کے مقابل ہے وہ چوسہ، بھوجپور، بکسر، بہیا اور آرا ہوتا ہوا منیر گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ دونوں کو ایک سی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ غالباً شیر خاں نے پٹنہ کے نزدیک مغل فوج کے عقب تک پہنچنے کے لیے دریائے سون کو روہتاس کے نزدیک راج گھاٹ یا سہسرام کے مقام پر پار کیا ہوگا تب وہ مشرقی کنارے پر پہنچا ہوگا اور پھر ہمایوں کی فوج کا پیچھا کرتے ہوتے منیر کے مقام پر دوبارہ دریا پار کیا ہوگا۔

مغل فوج کے عقب میں جو جھڑپ ہوئی تھی اور جس طرح شاہی توپخانے کو دشمن نے اپنے قبضہ میں کر لیا تھا اس کا حال ہمایوں نے آرا سے بکسر کے راستہ میں سُنا۔ یہ سفر اس نے غالباً تین دن طے کیا۔ چوتھے روز مغل فوج ذرہ بکتر سے لیس ہو کر بکسر کی سمت میں روانہ ہوتی۔ اس کا مقصد تھا چوسہ پہنچنا جو کہ ۸ میل جانب مغرب تھا۔ ہمایوں کا یہ پیچیدہ چکر دار راستہ اختیار کرنا۔ سورج غروب ہونے سے قبل شیر شاہ کا دفعتاً آنا اور پھر دوسرے دن یا اس کے بعد لاجنگ کیے ہوتے غالب ہو جانا یہ سب ہی باتیں پیش بندیاں اس منصوبے کے مطابق تھیں جس کو کہ شیر خاں نے پہلے سے ہی طے کر رکھا تھا۔ چنانچہ شیر شاہ کا یہ منصوبہ تھا کہ دوران سفر اس کو اتنا وقفہ مل جاتے کہ وہ چوسہ گھاٹ پر کرم ناسا ندی کو پار کر کے اس کے دوسرے کنارے پر اپنے لشکر کو اس طرح مرتب کرے کہ مغلوں کو کرم ناسا پار کرنے میں اڑچن پڑ جاتے شیر خاں کو اپنی جنگی طاقت پر اب بھی اتنا اعتماد نہ تھا کہ وہ کھلے میدان میں مغلوں سے لوہا لے سکے۔ کیونکہ اس سے کہیں زوردار صف آراتی پانی پت کنواہہ اور مندسور کے میدانوں میں مغلوں کے سامنے چھلکے کی طرح پاش پاش ہو گئی تھی۔ اسی لیے پہلے تو وہ مغلوں کی پیش قدم فوج تک بھوجپور کے نزدیک کسی مقام پر جا پہنچا (بھوجپور، بھوجپور بہیا کے نام سے زیادہ مشہور ہے) پھر وہ مغلوں کے ہراول کے سامنے اس طرح آ گیا کہ ایک طرف تو مغل فوج تھی اور دوسری

Marfat.com

طرف اس کی فوج تھی دونوں کے درمیان ایک دریا تھا۔ اس مقام کے متعلق بابر نے دس سال پیشتر یہ کہا تھا: "دندی[1] نالہ جو کہ سنا ہے آگے ہے۔" بابر اسے بچا کر نکل گیا تھا جب اس نے اپریل ۱۵۲۹ء میں بکسر و بھی یا کی جانب مشرقی مہم میں چوسہ میں پڑاؤ ڈالا تھا۔ مسٹر بیورج نے اس نالے کو تھورا ندی بتایا ہے۔ ان کی یہ شناخت صحیح ہے۔ موجودہ نقشوں میں اس کو اسی نام سے دکھلایا گیا ہے۔ یہ نالہ چوسہ سے ۵ میل جانب مشرق اور بکسر سے ۳ میل جانب مغربی گنگا سے ملتا ہے۔ ہمایوں کے چوتھے روز کا سفر بھی یا سے شروع نہیں ہو سکتا یہ مقام بھوجپور بھی یا سے ۲۰ میل جانب مشرق ہے۔ غالباً وہ بکسر سے روانہ ہوا ہو گا۔ اور تھورا ندی کے کنارے تک تین میل کا فاصلہ اس نے دوپہر سے پہلے طے کر لیا ہو گا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ مغل فوج یہ سفر ایسے حالات میں کر رہی تھی کہ ہر وقت اس کو دشمن کے چھاپے کا ڈر تھا۔ وہ کُلّی طور پر جنگ کے لیے مسلح اور صف آراتھی اور اس کے ساتھ ساتھ دھیمی رفتار سے توپخانہ چل رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں ۳ میل سے زیادہ سفر دوپہر سے پہلے نہیں ہو سکتا تھا۔ عباس نے اس دریا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس دریا کی چوڑائی مہانہ کے نزدیک صرف ۲۵ گز ہے۔ یہ بیان تھورا ندی کے حسب حال ہے اور مخزن کے بیان سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ مخزن نے لکھا ہے:[2]

"شیر شاہ نے اپنا پڑاؤ شاہی فوج کے سامنے ڈالا۔ یہ مقام شاتھہا (بقول ڈارن شویا، جلد ا صفحہ ۱۱۸) جھوسہ (چوسہ) اور بکسر کے درمیان ہے۔ اس لحاظ سے دونوں جانب کی فوج دریائے گنگا کے متقابل کناروں پر خیمہ زن تھیں۔ دونوں لشکروں کے درمیان ایک چھوٹی سی ندی تھی جس کے کنارے اس قدر ڈھلوان تھے کہ اس ندی کو بجز گھاٹ کسی جگہ بھی عبور کرنا مشکل تھا۔"

ہمایوں کے چند موجودہ سوانح نگاروں نے اس ندی کا تعین چوسہ اور

---

[1] دیکھیے تزک بابری مترجم صفحات ۶۰۹ لغایت ۶۶۰ اور فٹ نوٹ نمبر ۳

[2] مخزن نسخہ صفحہ ۳۱۲۔ ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۳۷۰ فٹ نوٹ نمبر ا

Marfat.com

بکسر کے درمیان نہ کر کے مغرب میں کیا ہے۔ ایک سوانح نگار نے تو یہاں تک لکھدیا ہے کہ ہمایوں نے کرم ناسا کو دو مرتبہ عبور کیا۔ ایک مرتبہ تو اُس وقت اور دوبارہ چوسہ گھاٹ سے دو ماہ تک اس کو عبور کرنے کی سعی لاحاصل کی۔ ایک دوسرے مورخ نے یہ خامہ سرائی کی ہے کہ ہمایوں نے چوسہ کے مقام پر گنگا کو پار کیا اور دوسری مرتبہ پھر اسی مقام پر شیر شاہ کی مہربانی سے اس کو عبور کیا۔[1]

شیر خاں کے رسالہ کے قدموں سے جو گرد کا بادل ہمایوں نے دیکھا تھا وہ اسی قسم کے کسی نالہ کے کنارے سے ہی دیکھا جاسکتا تھا۔ جس کی چوڑائی صرف ۲۵ گز ہو وہ دریائے کرم ناسہ کے کنارے چوسہ مقام سے ۳ میل کے فاصلہ پر نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ خصوصاً جب کہ درمیانی راستہ کڑی چٹان اور گنجان جنگلوں سے محیط ہو۔ علاوہ بریں کرم ناسہ کی چوڑائی بھی اتنی کم نہیں ہے۔ یہ ندی جہاں مرزا پور کے پہاڑی درّہ سے نکلتی ہے وہاں بھی اس کی چوڑائی ۲۵ گز سے زیادہ ہے۔ بہر حال خواہ ہم اسے کرم ناسہ کا ساحل تصوّر

---

[1] ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنرجی اور ڈاکٹر الشوری پرشاد کے بیانات پر تفصیلی تبصرہ کے لیے دیکھئے باب نہم کا ضمیمہ ا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ میں نے خود اپنی رائے میں ترمیم کر دی ہے۔ میں نے اپنی پہلی تصنیف "شیر شاہ" ص ۱۸۸ پر لکھا ہے کہ شیر خاں ہمایوں کی فوج کو ۲½ مہینے تک تھورا ندی پر روکے رہا۔ اور جب اس کیمپ میں سیلاب آگیا تو وہ کرم ناسہ دریا کے مغربی کنارے پر چلا گیا۔ میں نے یہ غلطی اس لیے کی کہ میں نے عباس کو بجنسہٖ نقل کر دیا۔ عباس نے لکھا ہے کہ صلح کی تمام گفت و شنید و لڑائی چوسہ کے نزدیک ایک نالہ کے کنارے ہوئی جس کی چوڑائی ۲۵ گز تھی۔ یہ ندی تھورا ندی ہی ہو سکتی ہے۔ میں نے عباس پر بھروسہ کر کے اس کے بیان کو جوہر سے جوڑ دیا حالانکہ یہ غلط ہے۔ کیوں کہ جوہر نے جو بمقابلہ عباس زیادہ معتبر ہے خود لکھا ہے کہ لڑائی و صلح کی بات چیت اس وقت ہوئی جب ہمایوں بلا مزاحمت چوسہ پہنچ گیا۔ علاوہ بریں موقع معائنہ سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ یہ جگہ ایسی ہے جہاں سے کسی بڑی فوج کو ایک ہفتہ کے لیے بھی نہیں روکا جاسکتا۔ حالانکہ تھورا ندی اپنے دہانہ پر ٹھیک ویسی ہی ہے۔ جیسا کہ بابر نے اپنی تزک اور مخزن نے اس کے متعلق لکھا ہے لیکن چند میل اوپر جانے پر وہ ایک ریت کا نالہ ہے جس کو پار کرنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی۔

Marfat.com

کریں یا تھوراندی کا دلدلی کنارہ۔ جوہر کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ شیر خاں کے گرد کا بادل مشرق سے نمودار ہوا یہ یقیناً مغرب سے ہوا ہوگا۔ مشرق کی جانب سے کوئی گرد کا بادل ہمایوں کو تشویش میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ کیوں کہ اس طرف اس کی فوج کا عقب کا حصّہ تھا اور اس کو پہلے ہی یہ خبر مل چکی تھی کہ شیر خاں اس کے دنبالہ لشکر کے تعاقب میں ہے۔ اس کے برعکس وہ مغرب کی سمت سے یہ اُمید کر رہا تھا کہ جونپور کی فوج اس کی کمک کو آرہی ہوگی۔ اسی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جوہر نے غلطی سے مغرب کے بجائے مشرق لکھ دیا ہے۔

اس جگہ اس بات پر بھی غور کرنا دلچسپ ہوگا کہ ہمایوں کے موجودہ سوانح نگاروں نے موید بیگ کو اس جرم کا مرتکب ٹھہرایا ہے کہ اس نے دوپہر بعد ایسے وقت میں جب کہ افغان اور اس کے گھوڑے محنت اور سفر سے تھک کر چور تھے اور کم تھکے ہوتے مغلوں کے حملہ کی زد میں آچکے تھے۔ ہمایوں کو شیر خاں پر حملہ نہ کرنے کی صلاح دی۔ اُنھوں نے موید بیگ کے اس ناعاقبت اندیش فیصلے کو اتنا اظہار تاسف کیا ہے کہ ایک حضرت نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اگر ہمایوں شیر شاہ پر اسی وقت حملہ کر دیتا تو شاید ہندستان کی تاریخ کی حقیقت دوسری ہی ہوتی۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر ہم اس دریا کو کرم ناسہ بھی تصور کرلیں تو محض ۲۵ گز کے فاصلہ پر دونوں فوجوں کا آمنے سامنے صف آرا ہونا تنہا ایک ایسا واقعہ ہے جس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر موید بیگ نے اپنی تمام زندگی میں کوئی نیک صلاح بے محابا ہمایوں کو دی تو وہ اس وقت تھی اور اگر ہمایوں نے زندگی میں کبھی عقل و فہم سے کام کیا تو وہ اس وقت لیا۔ جب اس نے موید بیگ کی اس رائے کو مان لیا۔ اگر ہمایوں شیر شاہ پر اس دلدل میں حملہ کر دیتا تو یہ ٹھیک شیر شاہ کے من کی بات ہوتی اور ہمایوں کی حالت ٹھیک دلدل میں پھنسے ہاتھی جیسی ہو جاتی۔ لہٰذا یہ شکوہ عبث و بیکار ہے کہ ہمایوں نے اس وقت حملہ نہ کر کے شیر شاہ پر غالب آنے کا ایک نایاب موقع ہاتھ سے کھو دیا۔

دوسرے روز بھی لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ نہ اس چھوٹی ندی کو پار

Marfat.com

کرنے کی کوئی کوشش کی گئی۔ اور ہمایوں بلا کسی حادثہ کے چوسہ پہنچ گیا۔ اسی اثنا میں شیر خاں آہستہ سے کرم ناسہ کے پار چلا گیا اور گنگا اور کرم ناسہ کے سنگم پر پہنچ گیا تاکہ ہمایوں کے راستے کو روکا جاسکے۔ اسی مقام پر ۱۵۳۹ء کے موسم گرما کے آغاز میں مغلوں اور پٹھانوں کے درمیان عقل و طاقت کی وہ فیصلہ کن جنگ شروع ہوئی۔

ہمایوں کی نازک حالت اور چوسہ میں صلح کی گفت شنید

ابتدا میں شیر شاہ کا طرز عمل مدافعانہ ہی تھا یعنی مغلوں کو کرم ناسہ عبور کرنے سے روکنا اور تب تک ان کو دوسرے کنارے پر صف آرا جمائے رکھنا جب تک کہ بارش کا موسم نہ آجائے جو نہ محض اس کی مدد کرے بلکہ حریف کی مشکلوں میں اضافہ کردے۔ چنار پہنچنے کے لیے ہمایوں کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا دریائے کرم ناسہ کو عبور کرکے۔ اوپر کافی دور تک کسی گھاٹ تک پہنچنے کے لیے کوئی کارآمد سڑک نہیں تھی۔ یہ بات بابر نے بھی اپنی تزک میں دس سال پہلے لکھی تھی۔ لہٰذا باخبر شیر خاں کو دھوکہ دے کر نکل جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس نے اپنے لشکر کی ہر سمت سے حفاظت کر رکھی تھی اور وہ ہر وقت مغلوں کی تاک میں لگا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑائی نے یہ شکل اختیار کرلی کہ مغل بار بار کرم ناسہ کو عبور کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کوشش میں کبھی کبھی ان کو زبردست نقصان بھی اٹھانا پڑتا۔ جس سے اس کی فوج کی ہمت اور ٹوٹنے لگی۔ دو مہینہ تک ہر روز اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں اور دونوں فریقوں کے سپاہی ہلاک ہوتے رہے۔ ۲½ مہینے کے بعد برسات زور شور سے شروع ہوگئی اور شیر خاں کے پڑاؤ میں سیلاب آگیا۔[۲]

---

[۱] مجھے اپنے سابقہ سہو پر افسوس ہے۔ دیکھیے فٹ نوٹ پہلے کا۔

[۲] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر خاں کا پڑاؤ گرانڈ ٹرنک سڑک کے شمال میں گنگا کے نزدیک تھا۔ مارٹن لکھتا ہے کہ گنگا کے اس بیسن میں ہر سال تین یا چار بار سیلاب آتا ہے۔

Marfat.com

(جوہر قلمی نسخہ صفحہ ۳۶)

شیر خاں کے پاس گنگا کے اس نشیبی علاقہ میں پڑاؤ ڈالنے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہ تھا شیر شاہ کے اس مقام پر پڑاؤ ڈالنے کے دو مقصد تھے اول یہ کہ وہ یہاں سے کرم ناسہ گھاٹ کی نگرانی کر سکتا تھا جہاں سے ہمایوں کی فوج کو دریا پار کرنا تھا۔ دوم یہ کہ وہ بنارس اور غازی پور سے آنے والی مغل کمک پر نگاہ رکھ سکتا تھا جس کو یہاں تک آنے کے لیے صرف یہی راستہ تھا۔ شیر خاں نے اب اپنا فوجی کیمپ مغربی کنارے پر او بچائی کی طرف منتقل کر دیا[1] جہاں سے مغل اس کی زد میں رہ سکیں ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنی جگہ بھی نہیں چھوڑی۔ اس خطہ میں جتنی تیزی سے سیلاب آتا ہے اتنی ہی تیزی سے ہٹ بھی جاتا ہے۔ شیر خاں کے پیچھے ہٹ جانے سے مغلوں کے اب دریا کے گھاٹ تک پہنچنے میں کچھ آسانی تو ہو گئی تھی۔ لیکن آگرہ اور دہلی سے جو خبریں موصول ہو رہی تھیں وہ اس قدر مایوس کن اور دل شکن تھیں کہ مغلوں میں نبرد آزمائی کے لیے کوئی حوصلہ و جوش باقی نہ رہا تھا۔ علاوہ بریں لشکر میں رسد کی کمی ہو چلی تھی۔ دوران سفر کافی خچر اور گھوڑے پامال ہو جانے سے ان کی کمی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

شیر شاہ اور ہمایوں دونوں آگرے سے آنے والی خبروں کے منتظر تھے۔ مفرور مرزاؤں سے (محمد سلطان مرزا اور اس کے لڑکے) شیر شاہ نے

---

[1] ہندوستان کے سروے کے نقشہ میں ایک جگہ "سار چیر بند" ہے جو چوسہ کے جنوب مغرب میں ۶ میل اور کرم ناسہ کے مغربی کنارے پر ہے۔ یہ وہی "چوپا گھاٹ" ہو سکتا ہے جس کے ادرچوسہ کے درمیان ہمایوں اور شیر خاں کی لڑائی ہونا بتلایا جاتا ہے۔ شیر شاہ کا پہلا پڑاؤ کرم ناسہ سے دو میل مغرب میں تھا۔ چوپا گھاٹ تک جانے کے لیے شیر شاہ کو ۸ میل پیچھے ہٹنا پڑا ہو گا۔ عباس اور مخزن کے قول کے مطابق شیر شاہ ہمایوں کے کہنے سے دو منزل پیچھے ہٹا تھا۔ لیکن جوہر (باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ) اس کی تائید نہیں کرتا کہ مغلوں کے پڑاؤ کے سامنے سے شیر خاں ۸ میل پیچھے ہٹا۔ اس واقعہ کو توڑ مروڑ کر شاید یہ کہانی بنائی ہو گی۔

Marfat.com

اچھا کام لیا تھا۔ ہمایوں کی توجہ اس طرف مبذول کرنے کے لیے اس نے (شیر خاں) انھیں بہار کھنڈ سے قنوج اور دہلی کی سمت روانہ کر دیا تھا اس کا منشا تھا کہ اگر مرزا ہندال جس کو ہمایوں نے سال گذشتہ میں مونگیر سے آگرہ بھیجدیا تھا بادشاہ کی کمک کے لیے فوج روانہ کرے تو اس کو یہاں تک پہنچنے میں تاخیر ہو۔ ہندال کو باغی مرزاؤں کے خلاف یورش کرنا پڑی جو دہلی تک چھاپہ مارنے لگے تھے۔ ہندال نے ان کو قنوج تک کھدیڑ دیا[1] شیر خاں کو بذات خود ان مرزاؤں پر کوئی اعتبار نہ تھا۔ وہ ان کی خصلت و کردار سے بخوبی واقف تھا۔ وہ انھیں تیموری نسل کے جنگلی باز سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ وہ اعلیٰ درجہ کے احسان فراموش و حق ناشناس ہیں۔ وہ جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں۔ ہمایوں کو محمد زمان مرزا پر اعتبار کرنے کی بڑی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ زمان مرزا تین بار بغاوت کر چکا تھا اور بادشاہ اسے تین بار معاف کر چکا تھا۔ یہ شاہی خاندان کا ایک جاہ طلب اور بوالہوس شہزادہ تھا۔ اعلیٰ درجہ عیاش اور بدکار۔ باوجود اس کے نہایت ہی مہذب و شائستہ، ظریف و خوش طبع۔ بغیر اس کی صحبت کے بابر کو معجون (بھنگ اور افیون کی آمیزش سے تیار کی ہوتی شے) کھانے میں کوئی لطف نہ آتا تھا۔ زمان مرزا نے بہادر شاہ کے انتقال کے بعد گجرات کے تخت پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ پھر کامران مرزا سے لاہور چھیننے کا خواب

---

[1] گلبدن ص ۱۳۷۔ جوہر اور دیگر مستند مورخین کے بیان کی روشنی میں اگر گلبدن کے ہمایوں نامہ کا مطالعہ کیا جائے تو شبہہ ہوتا ہے کہ اس کتاب میں واقعات کا سلسلہ ترتیب وار درج نہیں کیا گیا ہے اور یہ سلسلہ تاریخ سے میل نہیں کھاتا۔ کبھی کبھی پہلے ہونے والے واقعات کو بعد میں دکھایا گیا ہے مثلاً سلطان مرزا کے لڑکوں کی بغاوت ہمایوں کی ۱۴ دن کی بیماری کے بعد بیان کی گئی ہے۔ ہمایوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چوسہ سے آگرہ لوٹنے پر بیمار رہا تھا۔ اس وقت مرزاؤں نے جذبہ کے تحت ہمایوں کا ساتھ دیا تھا۔ اور بعد میں قنوج تک اس کے ساتھ گئے تھے۔ یہ بات مرزا حیدر سے معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے ان کی بغاوت غالباً چوسہ پہنچنے سے پہلے ہوئی ہوگی۔ گلبدن کے

Marfat.com

باطل دیکھا۔ بالآخر وہ ۱۵۳۸ء میں چنار کے محاصرے کے وقت ہمایوں کے پاس آگیا۔ اور آہستہ آہستہ اس نے ہمایوں کا اعتماد حاصل کر لیا۔ وہ ہرات کے مشہور و معروف سلطان حسین مرزا کا لڑکا تھا چوسہ کے عظیم حادثہ کے ماقبل پہلی رات اسی مرزا کو ہمایوں نے رات کی نگہبانی کا کام سونپا تھا۔

مگر اسی دوران واقعات اور وقت کا رخ بڑی تیزی سے ہمایوں کے خلاف بدلتا رہا۔ آگرہ اور دہلی سے آتے دن تشویشناک خبریں آرہی تھیں۔ کامران مرزا ۱۲ ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ اپنے چھوٹے کوتاہ اندیش بھائی کو دھمکانے کی غرض سے دہلی پہنچ چکا تھا۔ اور صرف اس دن کا انتظار کر رہا تھا۔ شہنشاہ کے متعلق کوئی خبر بد دہلی پہنچے جس کی اس کو قوی اُمید تھی مرزا حیدر مصنف تاریخ رشیدی ایک اعلیٰ خاندان کا سپاہی، کامران مرزا کا جگری دوست، لاہور سے مرزا کے ہمرکاب آیا تھا۔ اس نے چوسہ کی لڑائی سے قبل آگرے کی سیاسی فضا کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

بادشاہ کی جانب سے چوسہ سے متواتر پیغام آرہے تھے۔ جس میں اس نے اپنے بھائیوں سے جلد از جلد آنے کی تاکید کی تھی تاکہ شیر خاں کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ پیغام آتے رہے مگر بھائی اپنے باہمی عناد و مخاصمت میں مصروف رہے۔ چنانچہ دشمن کو سکون رہا۔ جب ان واقعات کی خبر کامران کو ملی وہ فوراً اپنی فوج لے کر چل پڑا[1] اس کی آمد سے رعایا کے بجھے ہوتے حوصلے پھر تازہ ہو گئے۔ پرانے تجربہ کار سپاہیوں نے چوسہ میں بادشاہ کو کمک پہنچانے کی ازحد کوشش کی مگر کچھ نمک حرام، بدمعاش مشیروں نے دوسرا ہی مشورہ دیا۔ اُنھوں نے کہا "چوسہ میں جا کر بادشاہ کی مدد کرنے کے معنی ہیں بادشاہ کو آزاد

بیان کے سیاق و سباق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت مرزاؤں کو جو سزا دی گئی اس کا تعلق ہندال کی بغاوت سے تھا۔

[1] گلبدن نے لکھا ہے کہ اس کے دماغ میں سلطنت کی چاہ پیدا ہوگئی۔ وہ ۱۲ ہزار مسلح رسالہ کے ساتھ دہلی آگیا۔ ہمایوں نامہ صفحہ ۱۳۷

Marfat.com

کرنا، دشمن کو برباد کرنا اور ہم کو چال میں پھنسانا۔" کامران نے اپنی حماقت اور ناتجربہ کاری سے اس مشورے کو کارِ دانش سمجھا اور بادشاہ کی مدد کو جانے میں تساہل کیا۔" (تاریخ رشیدی صفحہ ۴۷۰-۴۷۱)

کوئی راستہ نہ دیکھ کر مجبوراً بادشاہ صلح کے لیے جھکا۔ لڑائی روز بروز اس وقت تک ملتوی ہوتی رہی جب تک شیر خاں سے صلح کرنا ہی مناسب معلوم ہوا۔ ہمایوں نے شیخ خلیل کو جو شیخ فرید شکر گنج کے خاندان سے تھا۔ شیر خاں کے پاس صلح کا پیغام لے کر بھیجا۔ شیخ شیر خاں کے پاس گیا اور اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔ شیر خاں اس شرط پر راضی ہو گیا کہ چنار کا قلعہ مع قلعہ کے باہری مشرقی علاقہ اس کو دیدیا جائے۔ شیخ نے آنحضرت کو ایک مودبانہ خط بھیجا جس میں بیان کیا "شیر خاں کو چنار کے قلعہ پر کچھ اعتراض ہے۔ شہنشاہ کے امیر و سرداروں نے شیر خاں کو چنار سونپ دینا مناسب نہ سمجھا بالآخر صلح کی شرط رد ہو گئی۔ (جوہر قلمی نسخہ صفحہ ۳۶-۳۷)

چوسہ کی لڑائی ۲۶ جون

اس اثنا میں شیر خاں نے خواص خاں کے فوجی دستہ کو جو مہارتھ چیرو کے خلاف لڑائی میں مصروف تھا واپس بلا لیا۔ سپہ سالار اپنے آقا کے پاس پہنچ گیا اور اس نے شیر خاں کی ایما سے یہ خبر پھیلا دی کہ مہارتھ ایسی جگہ چلا گیا ہے کہ ہمارے جاسوس ابھی تک اس کا پتہ نہیں لگا سکے۔ مہارتھ افغانوں کو دھوکہ دے کر اچانک حملہ کرنا چاہتا ہے اور انھیں شکست دینا چاہتا ہے۔ شیر خاں کی کوشش سے تمام فوج اس خبر کا اعتبار کرنے لگی۔ اس کا یہ روز کا معمول ہو گیا کہ فوج کے کسی دستے کو ۴ میل کوچ کا حکم دیتا اور یہ ظاہر کرتا کہ وہ مہارتھ کی تلاش میں جا رہا ہے (عباس کے مطابق یہ فاصلہ ۴ کوس ہے اور زیادہ صحیح ہے۔) شام کو واپس لوٹنے پر بتایا جاتا کہ ہنوز مہارتھ کا کوئی نشان نہیں مل رہا ہے۔ فوج کی یہ نقل و حرکت ۵-۶ دن تک جاری رہی (عباس کے مطابق دو دن رہی) اور اس چال کا مغلوں کے دماغ پر اتنا اثر ہوا کہ وہ اپنے کو محفوظ سمجھنے لگے او۔

Marfat.com

خیال کرنے لگے کہ افغان فوج کی یہ نقل و حرکت کسی دوسرے دشمن کے خلاف ہے۔ (ڈارن، ا، صفحہ ۱۵)

ایک صبح اس نے خواص خاں کو ایک چیدہ اور تجربہ کار سپاہیوں کا دستہ اور کچھ تربیت یافتہ ہاتھیوں کو دے کر اپنے پڑاؤ سے روانہ کر دیا۔ کسی نے اس بات پر دھیان نہیں دیا۔ ہر ایک یہ سمجھتا رہا کہ حسب معمول یہ دستہ مہارتھ چیرو کے خلاف جا رہا ہے۔ لیکن شیخ خلیل کو کچھ شبہ ہو گیا اس نے فوراً بادشاہ کو پیغام بھیجا "میں نے شیر خاں کو صلح کے لیے تیار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ آج دوسری نماز کے وقت خواص خاں کو مع اس کی فوج کے جانے کی اجازت مل گئی ہے اور وہ شیر شاہ کے لشکر سے روانہ ہو گیا ہے۔ بادشاہ کو لازم ہے کہ ہوشیار رہے مبادا کوئی حادثہ پیش آجائے" اعلیٰ حضرت نے اس خط کی کوئی پرواہ نہ کی[1]۔

نیم شب سے کچھ قبل شیر خاں نے اپنے سرداروں کی ایک خفیہ کونسل منعقد کی اور حسب دستور ان کے سامنے شہنشاہ کے خلاف ایک ولولہ انگیز تقریر کی جس میں اس نے یہ بیان کیا کہ کس طرح وعدہ شکن بادشاہ نے صلح کے سب دروازے بند کر دیے ہیں۔ جب تمام ممبران کونسل جنگ کے لیے متفق الرائے ہو گئے تو شیر خاں نے اپنا خفیہ منصوبہ ان کے سامنے پیش کیا۔ کونسل برخاست ہونے کے بعد اس نے سب سرداروں کو حکم دیا کہ وہ جلد از جلد اپنے تمام سپاہیوں کو جنگ کے لیے صف آرا کر دیں اور ایسا ظاہر کریں کہ انھیں مہارتھ چیرو کے حملہ کا اندیشہ ہے۔ جب ایک پہر رات باقی تھی شیر خاں کے حکم کے بموجب تمام فوج مہارتھ کے علاقہ کی جانب ۲ ۱/۲ کوس تک آگے بڑھی۔ (ایلیٹ جلد ۴، صفحہ ۳۷۲)

---

[1] اسٹوارٹ نے اپنے ترجمہ میں حسب معمول اس واقعہ کو مختلف طریقے سے قلمبند کیا ہے جو غلط ہے بادشاہ کو اس خبر پر یقین نہیں ہوا کہ شیر خاں کوئی ایسا کام کر سکتا ہے جو خیانت پسندانہ یا مذہبی اصول کے خلاف ہو۔ انھوں نے بنا کسی احتیاط یا انتظام کے رات گزار دی۔ میموریس آف ہمایوں، صفحہ ۱۰۔

Marfat.com

اس نقل و حرکت کو مغلوں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے شیر خاں رات کو اپنے پڑاؤ سے کم از کم ۵ میل بجانب جنوب گیا ہوگا۔ خواص خاں بھی کرم ناسہ کے مغربی کنارے کے بالائی حصے میں گشت لگا رہا تھا۔ کیونکہ اس وقت دریا عبور کرنا خالی از علت نہ تھا۔ اول تو مغلوں کو شبہ ہو جاتا دوسرے وہ دفعتاً متحرک ہو کر خواص خاں کو اپنے آقا سے یکجا ہونے میں سد راہ بن جاتے چونکہ بمقابلہ مخزن عباس زیادہ مستند ہے اس لیے ہم یقیناً یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیر خاں نے خواص خاں کی روانگی کے تین دن بعد رات کو اپنے لشکر کو کوچ کا حکم دیا ہوگا۔ جیسا کہ پیشتر ہی طے ہو چکا تھا۔ ۸ر صفر ۹۴۶ ہجری مطابق ۲۵ر جون ۱۵۳۹ء کو خواص خاں ٹھیک آدھی رات کے وقت اپنے آقا سے جا ملا۔ اب متحدہ افواج دریائے کرم ناسہ کو پار کر کے مشرقی کنارے پر پہنچ گئی۔ جس مقام پر دریا کو عبور کیا گیا وہ دو شاخہ مقام مغل فوج کے پڑاؤ سے ۵ میل جانب جنوب تھا اور شمال میں دریائے گنگا اور مغرب میں کرم ناسہ کے درمیان واقع تھا۔ شیر خاں اور خواص خاں نے اب تک جنگ کا سب نقشہ پوشیدہ رکھا تھا۔ اب انھوں نے نہایت ہوشیاری سے مغل فوج پر دفعتہً حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ تمام افغان رسالہ جنگ کے لیے صف آرا ہو کر رات کی تاریکی میں شمال کی جانب بڑھا۔ خواص خاں کے دستہ کو حملہ کرنے کے لیے سب سے آگے رکھا گیا۔[1]

۲۶ر جون ۱۵۳۹ء کو بوقت فجر صبح کی ٹھنڈی ہوا مغلوں کو لوریاں دے کر سلا رہی تھی۔ افغان دفعتاً ان پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑے۔ شور سن کر جب مغل سپاہی بیدار ہوتے تو ان کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ وہ زرہ بکتر پہن کر جنگ کے لیے صف آرا ہو جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر کسی نے جان بچا کر

---

[1] چوسہ اور بلگرام کی لڑائیوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے سرکار کی تصنیف "ملٹری ہسٹری آف انڈیا" صفحہ ۶۲ لغایت صفحہ ۶۵۔ میری تصنیف "شیر شاہ" میں صفحہ ۱۹۳، سطر ۶ سے صفحہ ۱۹۴ سطر ۱۵ تک لکھی ہوئی عبارت قلم زد کر دی جائے۔

Marfat.com

بھاگنا ہی غنیمت سمجھا۔ جدھر جس کے سینگ سماتے چل پڑا۔ جب بادشاہ کے حکم سے جنگ کا نقارہ بجایا گیا تو کل تین سو سپاہی فراہم ہو سکے۔ اس قلیل فوج کی مدد سے بادشاہ بہادری کے ساتھ لڑا۔ لیکن وہ اپنے کم ظرف بزدل ساتھیوں میں کوئی جوش نہ پیدا کر سکا۔ اس کی ذاتی جرأت و دلیری مغلوں کو بھاگنے سے نہ روک سکی۔ بادشاہ کا بایاں بازو زخمی ہو گیا اور دشمن اس کو چاروں طرف سے گھیرنے لگے۔ اس کو گرفتاری سے بچانے کے لیے اس کے سپاہی اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر اسے میدانِ جنگ سے باہر گنگا کی جانب لے گئے۔ بادشاہ نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ لیکن گھوڑے سے گر پڑنے کی وجہ سے وہ غرق دریا ہونے والا ہی تھا کہ ایک بھشتی نظام نے جو ایک مشک کی مدد سے اس وقت دریا پار کر رہا تھا اسے ڈوبنے سے بچا لیا۔

تاریخ میں کوئی ناگہانی حملہ اس سے زیادہ کامیاب نہیں ہوا تھا۔ شاہی حرم کی بیگمات اور دوسرے عالی خاندانوں کی مستورات کی ایک کثیر تعداد افغانوں کے ہاتھ پڑی۔ ایرسکن کے اندازے کے مطابق ہمایوں کے تقریباً ۶ ہزار سپاہی ہلاک ہوئے ان میں سے آدھے میدان جنگ میں شہید ہوئے اور آدھے گنگا میں ڈوب گئے۔ شیر خاں نے بیکس مغل بیگمات اور بچوں کے ساتھ جو اس کے تصرف میں آ گئے تھے بہت ہی شائستہ اور مہذبانہ سلوک کیا۔ جب شہنشاہ ہمایوں کی ملکہ[1] دیگر سرداروں کی بیگمات و مستورات کا مجمع پردہ سے باہر نکلا تو شیر خاں انھیں دیکھتے ہی گھوڑے سے کود پڑا۔ انھیں تسلی و تشفی دی اور ہر طریقے سے ان کی عزت افزائی کی۔ اس نے

---

[1] ابوالفضل نے اکبر نامہ، ۱۔ صفحہ ۳۴۳ میں اس بیگم کا نام حاجی بیگم لکھا ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۲) لیکن یہ شاید بیگا بیگم تھی جس کا ذکر جوہر نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔ (دیکھیے قلمی نسخہ صفحہ ۳۰۔ اسٹوارٹ صفحہ ۱۴) وہ ہمایوں کے ساتھ گوڈ میں بھی موجود تھی۔ اسٹورٹ نے اس کا نام بڑے بیہودہ طریقے سے بیکا بیگم لکھا ہے

نقیب کو بلا کر حکم دیا کہ تمام لشکر میں اعلان کر دیا جائے کہ کوئی سپاہی کسی مغل عورت و بچے کو قیدی نہ بنائے بلکہ ان سب کو بیگم کے سراپردہ (یعنی ملکہ کا پاک خیمہ) میں لے آئے۔ افغانوں پر اس کے حکم کا اتنا خوف طاری ہوا کہ اس کی خلاف ورزی کرنے کا حوصلہ کسی کو بھی نہ ہوا۔ شام ہونے سے پہلے ہی مغلوں کی تمام بیگمات[1] مع اہل و عیال شاہی ملکہ کے ڈیرہ میں پہنچ گئیں اور ہر فرد کے لیے راشن مقرر کر دیا گیا۔ (عباس صفحہ ۱۶۶-۱۶۷۔ ایلیٹ ۴ صفحہ ۳۷۵-۳۷۶)

چوسہ کی لڑائی میں (۹ رصفر ۹۴۶ ہجری[2]) شیر خاں کی فتح سے سلطنت مغلیہ پر وہی اثر پڑا جو سورج گڑھ کی لڑائی کا بنگال کی ریاست پر ہوا تھا۔ اب شیر خاں کی خواہشات کا اُفق وسیع تر ہو گیا۔ اب سے ۱۲ ماہ پیشتر وہ سلطنت مغلیہ کا باجگذار بن کر بنگال میں رہنے سے خوش رہتا لیکن اب قسمت کے ایک داؤ نے اُسے بنگال و بہار کی ریاستوں کے علاوہ جونپور کی مسلم مشرقی ریاست کا بھی خود مختار حکمران بنا دیا۔ اب وہ دہلی کے شہنشاہ سے ہمسری کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ شیر خاں جیسے فاتح کے لیے اب دہلی دور نہ تھی۔

گنگا میں ڈوبنے سے بچ کر ہمایوں اپنی شکست خوردہ، پس ماندہ افواج سے غازی پور کی طرف والے گنگا کے کنارے پر جا ملا اور وہاں سے بنارس

---

[1] شیر خاں کی قابلِ تعریف کوششوں کے باوجود چند مستورات گم ہو گئیں۔ مثلاً عائشہ سلطان بیگم صفیہ بیگم، چاند بی بی (جو ۷ ماہ کی حاملہ تھی) شاد بی بی وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے آخر الذکر تین ہمایوں کے حرم سے منسوب تھیں (گلبدن، ہمایوں نامہ صفحہ ۱۳۶-۱۳۷)

[2] ابو الفضل کے اکبر نامہ میں (جلد ۱۔ صفحہ ۳۴۴) لڑائی کی تاریخ ۹ رصفر ۹۴۶ ہجری دی گئی ہے۔ انگریزی ترجمہ کرتے وقت یہ تاریخ بھول سے ۲۷ رجون کی بجائے ۷ رجون ہو گئی ہے۔ جو ٹھیک نہیں ہے۔ عربی مہینہ کے حساب سے صفر سال کا دوسرا مہینہ ہوتا ہے۔ ہجری ۹۴۶ سال ۱۹ رمئی ۱۵۳۹ء کو شروع ہوتا ہے۔ محرم کا مہینہ ۱۷ رجون کو ختم ہوتا ہے۔ اس حساب سے ۹ رصفر کو . . . . انگریزی تاریخ ۲۶ رجون ہونی چاہیئے۔ مجھے اپنی حساب کی پہلی غلطی پر افسوس ہے۔ "شیر شاہ" میں اس لڑائی کی تاریخ ۷ رجون لکھی ہوئی ہے۔ اسے رد سمجھنا چاہیے۔

Marfat.com

اور چنار کی طرف بھاگا۔ چنار اس وقت تک اس کے ہی افسروں کے قبضے میں تھا۔ بادشاہ نے تین روز تک قلعہ میں آرام کیا۔ شیر خاں کی آمد کی خبر سنکر ہمایوں نے چنار کا قلعہ خالی کر دیا۔ اور وہ گنگا کے جنوبی کنارے کی سڑک پر گامزن ہوا۔ برہم جیت گوڑ جو کہ سواروں کے رسالہ کا ایک آزمودہ افسر تھا اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس کو شیر خاں نے گنگا پار جانے کا حکم دیا تھا۔ انجام کار بادشاہ کو سنگم دکھائی پڑا۔ یہاں پریاگ کے مقام پر جمنا گنگا سے آکر مل جاتی ہے۔ یہاں وہ حیرت زدہ ہو کر رک گیا۔ کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ دریا کو کس طرح پار کیا جائے۔ اس نے کہا بغیر کشتیوں کے کیسے پار پہنچا جا سکتا ہے۔ اسی وقت راجہ یعنی اریل کا بیربھان (اریل الہ آباد قلعہ کے پار بالمقابل ہے) پانچ یا چھ سواروں کے ساتھ آگیا اور اس کو ایک گزرگاہ سے اس پار لے گیا۔ ۴۔۵ دن سے بادشاہ کے ساتھی بھوکے پیاسے تھے۔ راجہ نے ایک بازار کھلوا دیا۔ چنانچہ ان لوگوں نے کچھ وقت آرام سے گزارا۔ گھوڑوں کو بھی راحت ملی۔ پیادہ سپاہیوں نے نئے گھوڑے خرید لیے۔ قصہ کوتاہ راجہ نے نہایت ہی مناسب اور تابعدارانہ خدمت انجام دی (گلبدن۔ صفحہ ۱۳۶)

نسلی امتیاز سے بالاتر ہو کر راجہ نے ہمایوں کی مصیبت میں مدد کی تھی یہ مدد وفاداری کے جذبہ کے تحت نہ تھی بلکہ اس راجپوت کی دلیری و ایثار کا ثبوت تھی جو ہر راجپوت کے خون میں فطرتاً اور قدرتاً موجزن ہے۔ اسی اصول کی خاطر راجہ فاتح شیر خاں کے انتقام کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوا۔ اس نے ہمایوں کے تعاقب میں آنے والے فوجی دستہ کو اریل پر روک دیا۔ اریل اس زمانے میں ایک مضبوط و پائیدار قلعہ تھا۔ ایک سال بعد راجہ کو شیر خاں کے غیض و غضب کا شکار ہونا پڑا۔ اس نے مع اپنے خاندان و قبیلہ کے بندھیل کھنڈ کے جنگلات میں پناہ لی۔ جہاں اس نے ریوا کی خود مختار ریاست کی بنیاد ڈالی جو آج تک اس کے بہادر وارثوں کے ہاتھ میں ہے۔

اریل سے جمنا کے کنارے کنارے ہمایوں کالپی روانہ ہوا جسے وہ ابھی تک اپنا علاقہ کہہ سکتا تھا۔ اہل و عیال سے محروم قسمت کا مارا ہوا مایوس و افسردہ

Marfat.com

بادشاہ جولائی ۱۵۳۹ء کے دوسرے ہفتے میں آگرہ پہنچا۔ یہاں شاہی حرم کی بیگمات کی سرد آہوں اور گرم نالوں نے اس کا استقبال کیا۔ اس کی غیر متوقع آمد نے کامران کے خواب دلآویز کو چور چور کر دیا۔ کامران یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ دہلی کا تخت اس کی مٹھی میں ہے متواتر جسمانی مشکلات، دماغی کاوشں بیگمات کی جدائی کے صدمے نے ہمایوں کی صحت کو برباد کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ ۴۰ دن تک بخار میں مبتلا رہا۔

چونکہ ہم سب محض خاک کے پتلے ہیں اس لیے ہم کو شیر شاہ کی کامیابی اتنی مسرت خیز نہیں لگتی، جتنی کہ ہمایوں کی مصیبتیں دل میں درد پیدا کرتی ہیں۔ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ شیر خاں کی فتح و کامیابی کا سبب اس کی مکروریاکاری ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمایوں کی بدنصیبی ہنوز اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی اور ہر موقع پر اس کے صحیح فیصلہ کرنے میں مخل ہو رہی تھی۔ ہمایوں نے پورے دو مہینے میں کرم ناسہ دریا کے چوسہ گھاٹ کو پار کرنے کی کوشش میں صرف کیے اس کے بجائے اگر وہ چپکے سے غازی پور کے مقام پر گنگا کو پار کر لیتا تو اپنے دشمن شیر خاں کو دھوکہ دے سکتا تھا۔ اور اس حالت میں خواہ وہ اپنی عزت نہ بچا پاتا لیکن اپنی فوج و بیگمات کو جونپور، بنارس کے راستے آگرہ پہنچا سکتا تھا۔ لیکن زندگی کے واقعات انسان کی صلاحیت و حماقت کے تناسب سے بدلتے رہتے ہیں۔

مرزا حیدر لکھتا ہے "موسم برشکال کے وسط میں بھائی بھائی سے ملے۔ یہ واقعہ صفر ۹۴۶ ہجری کا ہے (تاریخ رشیدی، صفحہ ۴۷) ماہ صفر جنگ چوسہ کے ۲۰ دن بعد یعنی ۱۷ جولائی ۱۵۳۹ء کو ختم ہو چکا تھا۔ گلبدن بیگم کے بیان کے مطابق اگر حساب لگایا جائے تو ہمایوں کو آگرہ پہنچنے میں ۲۵ دن لگے۔ چوسہ میں شیر خاں کی غداری کے لیے دیکھیے اس باب کا ضمیمہ۔

Marfat.com

باب 9 کا ضمیمہ ا

ہمایوں کے موجودہ سوانح نگاروں کی

اس کے منیر سے چوسہ تک کے سفر کے متعلق رائے

ڈاکٹر ایس ۔ کے ۔ بنرجی (۱۹۳۷ء) اور ڈاکٹر ایشوری پرشاد میرے عالم و فاضل دوستوں نے ہمایوں کی سوانح عمریاں قلمبند کی ہیں ۱۵۳۹ء میں ہمایوں نے منیر سے چوسہ تک کا سفر کیا تھا۔ میں نے اس سفر کا ذکر اپنی تصنیف "شیر شاہ" میں جس طرح سے کیا ہے مذکورہ بالا مصنفین نے ہمایوں کی سوانح عمریاں لکھتے وقت اس سفر کا ذکر بالکل متضاد طریقے سے کیا ہے۔ ہمارا باہمی اختلاف کافی وسیع ہے۔ ہم یہ بات بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان متضاد بیانات میں سچائی کس کو نصیب ہے۔ اس لیے اس ناخوشگوار تنقید و تبصرہ کی ضرورت پیش آئی۔ ہم پہلے ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے بیانات پر غور کرتے ہیں۔

ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے "افغانوں نے اپنے ڈیرے ٹھیک بادشاہ کے راستہ میں لگا دیے تھے۔ اس مقام کا نام "بھی یا" ہے جو بکسر میں چوسہ کے مشرق میں ہے۔ دونوں جانب کی فوجیں گنگا کے ایک ہی کنارے پر خیمہ زن تھیں لیکن دونوں کے درمیان کرم ناسہ نام کا ایک دریا تھا۔ قاسم سلطان حسین نے فوراً حملہ کرنے کا حکم دیا کیوں کہ ۲۶ میل کا سفر کرنے کی وجہ سے افغان اس روز

Marfat.com

بُری طرح تھکے ہوئے تھے لیکن موید بیگ کی یہ رائے ہوئی کہ حملہ دوسرے روز تک ملتوی رکھا جاتے۔ اگر ہمایوں موید بیگ کے مشورۂ نیک کو مان لیتا تو ہند کی تاریخ کسی دوسرے ہی طریقہ سے لکھی جاتی۔ کرم ناسہ دریا کو عبور کرنے کی تجویز مان لی گئی۔ دریا پر ایک پُل بنایا گیا اور فوج نے دریا پار کر کے دوسری جانب ڈیرے ڈال دیے۔ کوئی لڑائی نہیں ہوئی (ہمایوں صفہ ۱۲۸-۱۲۹) ماہ اپریل سے جون تک دونوں فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل جمی رہیں۔ بادشاہ دشمن کی موجودگی میں نہ تو دریا ہی پار کر سکا نہ اُس کو میدان جنگ میں آنے کے لیے مجبور کر سکا۔" (ہمایوں۔صفہ ۱۳۲)

ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے واقعات کا یہ تانا بانا مختلف مورخین ابوالفضل عباس، مخزن وغیرہ سے اقتباس لے کر تیار کیا ہے جس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں۔

۱۔ کرم ناسہ نام کا ایک ہی دریا ہے جو آج بھی چوسہ کے مغرب میں کچھ فاصلہ پر بہتا ہے۔ اگر اپریل ۱۵۳۹ء میں ہمایوں کی فوج نے اس دریا کو پار کر لیا تھا تو شیر خاں نے ہمایوں کو دو مہینے کس مقام پر روکے رکھا؛ اور ہمایوں کو مغرب کی جانب کوچ کرنے کے لیے اس دریا کو عبور کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

۲۔ اگر شیر خاں کی فوج نے ۳۶ میل کا سفر ایک دن میں طے کر کے "بہی یا" کے مقام پر جو چوسہ کے مشرق میں ہے شاہی فوج کا راستہ روک دیا تھا تو کرم ناسہ دریا جو چوسہ کے مغرب میں ہے دونوں فوجوں کے درمیان کہاں سے آگیا؟ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے کلکتہ سے 'بہی یا' تک کا فاصلہ ۳۸۲ میل لکھا ہے لیکن بکسر اور چوسہ سے اس کا فاصلہ نہیں بتایا۔ ایسی حالت میں ۲۵ گز چوڑا دریا کرم ناسہ کے علاوہ کوئی دوسرا ہوتا۔

۳۔ 'بہی یا'، بکسر سے آرا جانے والی سیدھی سڑک پر واقع ہے (تزک۔صفہ ۶۶۲۔فٹ نوٹ ۲) اگر ہمایوں اور شیر خاں کی فوج 'بہی یا'،

Marfat.com

مقام پر جو بھوجپور کا ایک حصہ ہے ایک دوسرے پر بالمقابل تھیں تو دونوں فوجوں کے درمیان کرم ناسہ نام کا سیاہ دریا کیسے آگیا (دیکھیے اکبر نامہ صفحہ ۳۴۲) جس کا ذکر ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے۔

۴۔ اس باب میں مخزن[1] کا بیان ہے۔

شیر خاں نے اپنے خیمے بادشاہ کے بالمقابل موضع ساہتیہ میں نصب کیے۔ (ڈارن، صفحہ ۱۱۱۔ شویا) یہ موضع چوسہ اور بکسر (اس نام کا ذکر ڈارن نے نہیں کیا ہے) کے درمیان ہے۔ چنانچہ دونوں جانب کے ڈیرے گنگا کے ایک ہی کنارے پر تھے۔ دونوں فوجوں کے درمیان ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی اس دریا کے کنارے اس قدر عمودی تھے کہ مقررہ گزرگاہ کے علاوہ کسی اور جگہ اس کو پار نہیں کیا جاسکتا تھا" آگے چل کر ڈارن لکھتا ہے کہ اس دریا کو بغیر کشتی کے پار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کی سطح میں چپکا مٹی اور دلدل تھی انسان گھوڑے اور اونٹ اس میں پھنس جاتے تھے۔ اس مقام پر دونوں فوجوں کے ہراول دستوں نے اپنے ڈیرے ڈالے تھے۔

ڈاکٹر بنرجی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے 'بہی یا' مقام کا صحیح پتہ لگایا ہے اور مشتبہ مقام "ساہتیہ" یا "شویا" کو نظر انداز کر دیا ہے

---

[1] مخزن جیسا کہ ایلیٹ نے جلد ۴ صفحہ ۳۷۰، فٹ نوٹ نمبر ۱ میں لکھا ہے کہ مخزن کا جو قلمی نسخہ سرکار کے پاس ہے اس میں اس تفصیل کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اس میں صرف یہ لکھا ہے "شیر خاں چوسہ کے نزدیک آیا اور شاہی فوج کے بالمقابل کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنے لشکر کے ہر چہار جانب مٹی کا قلعہ تیار کیا۔" (صفحہ ۳۰) لکھنؤ یونیورسٹی میں مخزن کا قلمی نسخہ بجنسہ انھیں الفاظ میں اس واقع کو بیان کرتا ہے (صفحہ ۲۳۴) ایک ہی تصنیف کے مختلف نسخوں میں میلان و مطابقت کرنے سے کوئی اضافہ یا ترمیم پائی جاتی ہے تو مروجہ اصول یہ ہے کہ اس کو تب تک درست مان لینا چاہیے جب تک وہ غلط ثابت نہ ہوں۔ میں نے بھی اسی اصول کو صحیح تسلیم کیا ہے اور ڈارن و ایلیٹ کے نسخہ کو صحیح تصور کیا ہے۔

Marfat.com

ہیں پہلے اس مقام کا تعین نہیں کر سکا تھا (شیر شاہ صفحہ ۱۸۷، فٹ نوٹ نمبر ۱)
ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اس مقام کے تعین میں ڈاکٹر بنرجی سے مدد لی ہے۔ حالانکہ اُنھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر بنرجی کے اس مقام کا تعین ہم تب تک صحیح تسلیم نہیں کر سکتے جب تک اس سیاہ دریا کا پتہ نہ چل جاتے (مخزن) جو بقول عباس ۲۵ گز چوڑا تھا۔ اس کے متعلق ڈاکٹر بنرجی نہایت ہی مبہم ہیں۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ابوالفضل کو سند مان کر اس دریا کا نام کرم ناسہ لکھ دیا ہے۔ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ یہ دریا چوسہ اور 'بہی یا' کے درمیان بہتا ہے۔ اس امر کو نظر انداز کر کے اُنھوں نے اپنے کو ایسی اُلجھن میں پھنسا لیا کہ جس سے وہ نکل نہ سکے۔

اس خطّہ میں صرف ایک ہی چھوٹا دلدلی دریا ہے جو مخزن کے بیان سے میل کھاتا ہے۔ یہ دریا چوسہ کے مشرق میں ہے۔ یہ وہی دریا ہے جسے بچا کر یعنی ایک طرف چھوڑ کر بابر نے کشتی سے گنگا پار کی تھی اور اس جگہ سڑک کے بندوبست میں بابر ایک دن تک ٹھہرا رہا۔ مسز بیورج نے اس ندی کا نام صحیح طور پر "تھور" ندی لکھا ہے اور یہی نام نقشہ میں بھی ہے۔ یہ دریا چوسہ سے ۵ میل جانب مشرق۔ اور بکسر سے تین میل جانب مغرب گنگا میں ملتا ہے۔ کسی کسی مقام پر اس کی چوڑائی ۲۵ گز ہے۔ یہ موسم گرما میں خشک رہتا ہے۔ اس میں گہری چکنی دلدل ہے جس میں ناواقف راہ گیر شہد میں مکّس کی مانند پھنس جاتے ہیں۔

دوسرا سوال بہی یا شویا مقام کے تعیّن کا ہے۔ بہی یا تھورا ندی کے مشرقی کنارے پر بھوجپور سے ۲۰ میل جانب مشرق میں واقع ہے اس لیے بہی یا وہ مقام نہیں ہو سکتا جہاں ہمایوں اس روز ٹھہرا تھا۔ رنیل کے نقشہ میں یا جی ایس۔ آئی کے نقشہ میں ساہتیہ یا شویا نام کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ لیکن ہمیں بابر کی تزک سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اس چھوٹے گندے نالے کے مشرقی کنارے پر واقع موضع

Marfat.com

بھوجپور گیا تھا۔ اس لیے ہمایوں کے ٹھہرنے کا مقام نہی یا نہ ہو کر بھوجپور ہی یا تھا۔ اس جگہ کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے تاکہ قنوج کے نزدیک بھوجپور نام کے دوسرے موضع سے یہ موضع مخلوط نہ ہو جاتے۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد میں یہ خاص وصف ہے کہ وہ تاریخ کے مرکب ناموں کو مفرد بنا دیتے ہیں مثلاً خواص پور ٹانڈہ کو ایک موضع سمجھ کر وہ خواص پور اور ٹانڈہ دو مقام سمجھ لیتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا تقریباً مناسب ہوگا کہ ہمایوں تھوراندی کے کنارے موضع بھوجپور میں مقیم رہا۔

ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنرجی کی ناواقفیت بھی پورے طور پر واضح ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "ہمایوں بھی یا گیا جو بھوجپور کا ایک سب ڈویژن ہے بعد ازیں چوسہ گیا جہاں اس نے دریا کو دوبارہ عبور کیا۔

(ہمایوں بادشاہ جلد ا صفحہ ۲۲۳ فٹ نوٹ نمبر ا)

آگے چل کر بنرجی نے صاف صاف لکھا ہے کہ اس نے دریائے گنگا کو دوبارہ پار کیا اور مشرقی کنارے پر آیا (ایک مرتبہ پہلے چوسہ کے مقام پر پار کیا تھا) شیر خاں ہمایوں کو دریا پار کرنے کا موقع دینے کے لیے پیچھے ہٹ گیا۔ یہ شیر خاں کی شجاعت کی دلیل ہے کہ اس نے ہمایوں پر اس وقت حملہ نہیں کیا جب وہ دریا پار کر رہا تھا۔ شاید شیر خاں ہمایوں کو مکمل طور پر شکست دینا چاہتا تھا ـــــ اس لیے اس نے ہمایوں کو کوئی ضرر نہیں پہنچایا۔ (ہمایوں بادشاہ۔ صفحہ ۲۲۳)

ہمایوں نے ایک اور غلطی یہ کی کہ لڑائی کو ملتوی کر دیا۔ صرف فوری حملے سے ہی فتح کا امکان تھا شیر شاہ نے بھی اس وقت تک حملہ نہیں کیا۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل جم گئیں۔ (وہی صفحہ ۲۲۴)

مغل دو دریاؤں گنگا اور کرم ناسہ کے درمیان پھنس گئے (ایضاً صفحہ ۲۲۶)

چنانچہ ڈاکٹر بنرجی کے قول کے مطابق ایک بار ہمایوں نے غازی پور ضلع میں گنگا کو پار کیا۔ پھر اس نے یہ سوچا کہ گنگا کو دوبارہ پار کیا جاتے

Marfat.com

تاکہ اس کی فوج گنگا اور کرم ناسہ کے سنگم کے نزدیک چوسہ مقام پر دو[2]
دریاؤں میں پھنس جاتے۔ اس عرصہ میں شیر خاں ہمایوں کے پیچھے بے فکری سے
گھومتا رہا اور اس کے دریا پار کرنے کا تماشہ دیکھتا رہا۔ اور اپنی شجاعت و
اعتماد نفسی کا اظہار کرتے ہوئے اس کو ہر قسم کی سہولیت بہم پہنچاتا رہا تاکہ وہ بغیر
کسی مزاحمت کے دریا پار کرلے۔ لیکن یہ سب ڈاکٹر موصوف کے اپنے دماغ
کی اختراع ہے اور ہوائی باتیں ہیں۔ مزید براں نہ تو قرون وسطیٰ کے اور نہ
موجودہ دور کے مورخین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شیر خاں کا سلوک
اپنے ہمسایہ لوگوں کے ساتھ بااخلاق وجانبازانہ تھا البتہ اتنا کہا جاسکتا ہے
کہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ وہ اُلجھنے سے گریز کرتا تھا۔

Marfat.com

باب 9 کا ضمیمہ 2

شیر خاں پر ہمایوں کیساتھ غداری کا الزام

ہمایوں کے کچھ ثنا خوانوں نے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ چوسہ کے مقام پر ہمایوں کی کراری ہار کا سبب شیر خاں کی غداری تھی۔ موجودہ دور کے چند مورخین نے بھی اس بات کو صاد کیا ہے اور جوہر اور ابوالفضل نے جو غداری کا الزام شیر شاہ پر عاید کیا ہے اُس کی تائید کی ہے اُنھوں نے اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے جو شہادت پیش کی ہے اُس کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا ہے۔ ابوالفضل نے اس معاملہ میں جوہر سے زیادہ شگوفہ بازی کی ہے۔ حالانکہ جوہر اس واقعہ کا چشم دید گواہ تھا۔ اور ابوالفضل کو اس کے مقابلے میں اصل حالات سے کم واقفیت تھی۔ بدایونی نے جو کہ شیر شاہ کا مداح تھا اور اچھا مسلمان تھا نہ صرف اس الزام کی تائید ہی کی ہے بلکہ اس میں کچھ اور روایتوں کا اضافہ بھی کر دیا ہے۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد جو کہ دور حاضر میں ہمایوں کے جدید ترین سوانح نگار ہیں شیر خاں کے اتنے پیچھے پڑ گئے ہیں جیسے کہ بغض نکال رہے ہوں۔ وہ رقم طراز ہیں "شاید ہی ہند کی تاریخ میں غداری اس سے زیادہ کہیں کامیاب ہوئی ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس لڑائی کا فیصلہ کرنے میں بے وفائی اور نمک حرامی کا زیادہ حصہ رہا۔ حتیٰ کہ افغان مورخ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ شیر خاں وعدہ شکن تھا۔ اس نے مغلوں پر اس وقت حملہ کیا جب کہ وہ اس کے لیے ذرا بھی تیار نہ تھے۔

Marfat.com

(ہمایوں صفحہ ۱۳۵)

مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں شیر خاں کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے خلاف دستیاب شہادت پر ایک تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ سب سے پہلے ہم ان مورخین کے بیان پر غور کریں گے جنھوں نے اکبر کے زیر سایہ اپنی تصانیف مرتب کی ہیں۔

۱۔ جوہر تذکرۃ الواقعات

جوہر چوسہ کی لڑائی میں بذات خود موجود تھا۔ وہ شہنشاہ کا ساغر بردار تھا اس لیے اس کی شہادت زیادہ معتبر ہے۔ ہم نے انگریزی ترجمہ میں جوہر کے واضح اقتباسات قلمبند کیے ہیں جس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ صلح کی گفت وشنید چنار کو شیر خاں کے حوالے کر دینے کے مسئلہ پر آ کر ختم ہو گئی۔ جوہر نے صاف لکھا ہے" بالآخر صلح کی بات چیت رد ہو گئی اور یہ سب کچھ اعلیٰ حضرت کے سرداروں کے مشورے وایما سے ہوا۔
حالانکہ اسٹوارٹ کا کیا ہوا۔ جوہر کا ترجمہ، جوہر کے دیگر نسخوں کی روشنی میں کم مستند ہے پھر بھی اس سے مندرجہ ذیل اقتباس کیا جاتا ہے:

"بالآخر ہمایوں کو شیر خاں کی گستاخانہ مانگ کے سامنے سر جھکانا پڑا اور صلح ہو گئی"۔

ہمیں اس انشاپردازی پر غور کرنا چاہیے۔ یہ الفاظ خود یہ شبہ پیدا کرتے ہیں کہ یہ تحریر ہمایوں کے کسی خادم کی نہیں ہو سکتی۔ جوہر نے کسی بھی جگہ شیر خاں کے گستاخ رویہ کا ذکر نہیں کیا۔ نہ کہیں یہ لکھا ہے کہ اس کے آقائے نامدار نے شیر خاں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ یہ بات بھی حیطۂ تصور وگمان سے باہر ہے کہ شہنشاہ اور اس کے ضدی امیر جو کہ شکست میں بھی فتح کے خواب دیکھتے تھے چنار کو شیر خاں کے حوالے کر دینے کی توہین کو برداشت کر لیتے۔ خاص کر جب کہ صورت حال اس درجہ ان کے موافق ہو گئی تھی کہ شیر خاں نے اپنا ڈیرہ سیلاب کی وجہ سے دوسری جگہ

Marfat.com

منتقل کر لیا تھا۔ دریا کو عبور کرنے کے لیے کشتیوں کا پل قریب قریب تیار ہو چکا تھا اور ہمایوں کے راستے کی دقت ختم ہو گئی تھی۔ جوہر کے تمام بیان سے شیر خاں کی وعدہ خلافی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا طرز جنگ پُر فریب تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ جوہر نے یہ بات بھی محض اس لیے لکھ دی ہو کہ اس کو اپنے آقا مرحوم شہنشاہ کی حمایت منظور تھی۔ کوئی نمک خوار خادم اپنے آقا کی عصمت دری پسند نہیں کرتا۔

۲۔ ابوالفضل اور اکبر نامہ

شیر خاں از حد چالاک تھا۔ وہ کبھی باا ثر لوگوں کو ہمایوں کے پاس صلح کا پیغام لے کر بھیجتا اور کبھی لڑائی کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتا۔ بالآخر اس نے شاطرانہ چالوں سے کام لیا۔ اس نے کچھ توپخانہ اور چند پیادے تو بادشاہ کے بالمقابل چھوڑ دیے اور باقی لشکر لے کر بادشاہ کے عقب میں ڈیرہ ڈال دیا۔ شاہی فوج شیر خاں کے اس فریب کو سمجھنے میں قاصر رہی۔ ایک شب محمد زمان مرزا پہرے پر تھا۔ اس نے غفلت دکھائی۔ روباہ سیرت خاں جو کہ موقع کے انتظار میں تھا رات بھر کوچ کرتا ہوا صبح کے نزدیک شاہی فوج کے عقب میں آگیا (اکبر نامہ صفحہ ۳۴۳)

ہم ابوالفضل کی ہر بات کو جو اس نے شیر شاہ کے متعلق لکھی ہے تسلیم کرتے ہیں۔ محض ایک بات سے ہم اتفاق نہیں کرتے کہ صلح کی پیش قدمی شیر خاں کی جانب سے ہوئی۔ اس سے کسی کو انکار نہیں کہ شیر خاں عیار و مکار تھا۔ لیکن عموماً سب ہی مدبر جو گمنامی سے شہرت و ترقی کے زینے پر چڑھے ہیں ان کا یہی دستور عمل رہا ہے اور رہے گا۔ غالباً سیاست کے میدان میں ظفر و کامرانی کے لیے یہ لازمی بھی ہے ابوالفضل نے شیر خاں کی دماغی حالت کا بلاشبہ صحیح نقشہ پیش کیا ہے کہ وہ صلح و جنگ کے درمیان عالم تذبذب میں تھا۔ باوجود اس ہرزہ گوئی کے جو عباس نے افغانوں کی ہمت افزائی کے لیے شیر خاں کے منہ سے کہلوائی ہے

Marfat.com

حقیقت تو یہ ہے کہ شیر خاں کا دل ابھی بھی بابر کے پسر نامدار سے میدانِ جنگ میں لوہا لینے کے لیے لرز رہا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ فن حرب میں مغل بنگالیوں کے مانند نہیں ہیں۔ بلاشبہ یہ بھی صحیح ہے کہ جنگ چوسہ عیاری کی مثال تھی لیکن اس معنی میں ہائیڈاسپیس سے لے کر جنگ پلاسی تک جتنی بھی لڑائیاں ہوتی ہیں وہ بھی سب اسی طرح کی تھیں۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ وہ شہادت کہاں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ شیر خاں نے شرائط صلح کی خلاف ورزی کی کیوں کہ شیر خاں کی روایتی عہد شکنی کو ثابت کرنے کے لیے یہ نہایت ہی لازمی ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اس کو مان لیا ہے۔ جنگ میں لڑائیاں جیتنے کے لیے حکمت عملی جائز

ہوتی ہے اسی قسم کی حکمت عملی کا تاریخ و قانون میں استعمال ہوتا ہے اور سیاہ کو سپید اور سپید کو سیاہ کر دکھایا جاتا ہے لیکن حکمتِ عملی کو ہم غداری یا دھوکہ دہی نہیں کہہ سکتے۔

۳۔ گلبدن بیگم۔ ہمایوں نامہ

گلبدن بیگم نے نہایت ہی اختصار سے حقیقت بیان کی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں۔

"تب اللہ کی مرضی یہی تھی۔ اُنھوں نے بغیر کسی احتیاط کے ڈیرے ڈال دیے اور شیر خاں ان پر ٹوٹ پڑا۔ صفحہ ۱۳۵۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد لکھتے ہیں (دیکھیے ہمایوں نامہ، صفحہ ۱۳۵ فٹ نوٹ نمبر ۳) کہ گلبدن کی اس عبارت سے بھی شیر خاں کی غداری کی جھلک ملتی ہے۔ جیسا کہ ابوالفضل کا بیان ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ڈاکٹر موصوف کا یہ کہنا ٹھیک ہے؟ ابوالفضل اور گلبدن کی راتے ہیں شیر خاں کی غداری یہ تھی کہ اس نے مغل فوج پر چپ چاپ اس وقت حملہ کیا جب کہ اس کی نگہداشت کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ اس نے شہنشاہ کو اپنے حملہ کی کوئی اطلاع پہلے سے نہ دی۔ نہ اس نے مغلوں کو اتنا موقع دیا کہ وہ اپنے بستر استراحت سے اُٹھ کر باآرام زرہ بکتر پہن

Marfat.com

سکیں۔ شاید ڈاکٹر موصوف شیر خاں کو مہابھارت کے زمانہ کے قانون جنگ سے تولنا چاہتے ہیں جب کسی خوابیدہ غنیم پر حملہ کرنا نا قابل شرم و مذمت سمجھا جاتا تھا۔

اب ہمیں ان افغان مورخین کے بیانات کا جائزہ لینا ہے جو ڈاکٹر پرشاد کے قول کے مطابق شیر خاں پر غداری کا الزام لگاتے ہیں۔

۴۔ عباس سروانی

جب ہمایوں بادشاہ نے سُنا کہ شیر خاں روہتاس کی پہاڑیوں سے نیچے اُتر رہا ہے تو اس نے شیر خاں کی جانب رُخ کیا۔ شیر خاں کو جب یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ اس کے خلاف فوج کشی کر رہا ہے تو اس نے ایک مؤدبانہ خط بادشاہ کے نام لکھا کہ اگر جہاں پناہ بنگال کا علاقہ اپنے اس بندہ کو عطا کر دیں تو یہ کمترین بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھے گا۔ ان کے نام کے سکے رائج کرے گا۔ یہ بندہ بھی اعلیٰ حضرت کے خادموں میں سے ایک ہے۔ شیر خاں منزل بہ منزل اپنے پڑاؤ تک کوچ کرتا رہا اور اپنے اور شاہی فوج کے مابین ایک دریا کو پناہ بنا کر اقامت گزیں ہو گیا۔ اس دریا کی چوڑائی صرف ۲۵ گز تھی۔ اس نے خواص خاں کو اپنے حضور میں بلایا اس کو پہلے مہارتھ چیرو کے خلاف بھیجا گیا تھا۔ جب شیر خاں کا خط بادشاہ کو موصول ہوا۔ تب وہ دریا کے کنارے پر شاہی فوج کے بالمقابل خیمہ زن تھا۔ بادشاہ نے فرمایا "اگر شیر خاں کو بادشاہی کا لحاظ ہے تو اس کو لازم ہے کہ وہ اپنی فوج یہاں سے پیچھے ہٹائے اور دریا کی گزرگاہ خالی کر دے تاکہ شاہی فوج دریا پار کر کے دو تین منزل تک اس کے عقب میں کوچ کرے۔" شیر خاں نے بادشاہ کی اس شرط کو مان لیا اور دریا کے گھاٹ کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا اور گزرگاہ کا راستہ صاف چھوڑ دیا۔ اعلیٰ حضرت نے دریا پر ایک پُل بنایا اور اپنے خیمے کو چھوڑ کر اپنے عزیز و اقارب و نیز دیگر اشخاص کو دریا کے دوسرے کنارے پر لے گیا اور وہاں شاہی خیمہ نصب کر دیا۔ ہمایوں نے شیخ خلیل کو جو شیخ فرید شکر گنج

Marfat.com

کی اولاد سے تھا اپنا سفیر بنا کر شیر خاں کے پاس یہ پیغام لے کر بھیجا کہ "شیر خاں بغیر راستے میں قیام کیے روہتاس واپس کوچ کر جائے کچھ دور تک شاہی فوج اس کے عقب میں چلے گی اور پھر واپس آجائے گی۔ بعدازاں بنگال کی جاگیر کا فرمان جس کا کہ اعلیٰ حضرت نے وعدہ کیا ہے اس کے نام جاری کر دیا جائے گا۔"

شیر خاں نے بظاہر بادشاہ کے حکم کو مان لیا اور شیخ خلیل کی خاطر و تواضع میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا اس نے شیخ سے کہا۔" بادشاہ کا قول ہی میرے لیے کافی ہے۔ اس نے شیخ خلیل کو مالوہ اور بنگال کے متعدد زری اور ریشم کے پارچہ جات انعام میں دیے جن کو پا کر شیخ مرغ کی طرح پھول گیا۔ بعدازاں اس نے شیخ کو خلوت میں طلب کیا اور اس کی منت و سماجت کر کے اس سے یہ استدعا کی کہ وہ اپنی سچی رائے اس معاملے میں دے کہ جنگ کرنا چاہیے یا صلح۔ بہت تامل کے بعد شیخ نے کہا " تمہارے حق میں صلح کی بہ نسبت جنگ ہی بہتر ہے۔ بادشاہ کے لشکر میں ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ نہ اُس کے پاس خچر ہیں نہ گھوڑے۔ اس کے بھائیوں میں بغض و نفاق کی آگ بھڑک رہی ہے۔ بادشاہ نے ضرورت سے مجبور ہو کر تمہارے پاس صلح کا پیغام بھیجا ہے۔ مصلحت اور دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ اب صلح نہ کی جائے۔ تم اپنی خوش قسمتی سمجھو۔ ایسا سنہری موقع پھر کبھی نصیب نہ ہوگا۔ جب شیخ خلیل نے شیر خاں کو صلح نہ کرنے کا مشورہ دیا اور جنگ کے لیے ترغیب دی تو شیر خاں نے خواص خاں کو مہارتھ کے خلاف مہم سے واپس بلا لیا (اس کے بعد مہارتھ کے خلاف فرضی مہم کا ذکر کیا گیا ہے اور اس ولولہ انگیز تقریر کا ذکر ہے جو اس نے اپنے سپاہیوں کے سامنے کی۔ اس تقریر میں اس نے تفصیل سے اپنی خدمات کا ذکر کیا ہے اور بادشاہ کے برے سلوک کا شکوہ کیا ہے)

افغانوں کی بات کا جواب دیتے ہوئے شیر خاں نے کہا۔" میں تو محض صلح کا بہانہ کر رہا تھا۔ لیکن حقیقتاً میں نے صلح کو فسخ کر دیا ہے تاکہ خدا پر بھروسہ

Marfat.com

کر کے جنگ کر سکوں۔ (اس کے بعد شیر خاں نے خواجہ نظامی کا حوالہ دیا ہے۔
(قلمی نسخہ صفحہ ۱۵۶-۱۶۵)

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ بادشاہ کے سفیر نے اس کے ساتھ غداری کی۔ اور یہ غداری افضل خاں کے برہمن سفیر کی غداری سے بھی زیادہ شرمناک اور افسوسناک تھی جو اس نے شیواجی کی منت و سماجت سے اپنے آقا کے ساتھ کی تھی۔ عباس سروانی کے بیان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں نے شیر خاں کے پاس صلح کا پیغام بھیجا جس میں اس قسم کی طفلانہ شرائط تھیں جن پر کہ شیر خاں کو ہنسی آنا لازمی تھا۔ نہ تو سنجیدگی کے ساتھ کوئی ہوئی اور نہ توڑی گئی جو صلح کی تجویز معرض التوا میں پڑ گئی تھی بقول جوہر اس میں شیر خاں نے چنار کی مانگ کا اضافہ کر دیا۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ بدایونی کے بیان سے عباس کی کہاں تک تائید ہوتی ہے کیوں کہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کا خیال ہے کہ بدایونی عباس سے متفق ہے۔

۵۔ بدایونی منتخب التواریخ۔ جلد اصفحہ ۳۵۱

بدایونی نے لکھا ہے "کہا جاتا ہے کہ جس عرصہ میں چوسہ کے مقام پر ہمایوں اور شیر شاہ کی فوج ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا تھیں ایک روز بادشاہ نے ملا محمد عزیز کو جسے شیر خاں کے ساتھ قرابت تھی اپنا سفیر بنا کر شیر شاہ کے پاس بھیجا جس وقت سفیر شیر خاں کے لشکر میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ شیر خاں آستین چڑھاتے ہاتھ میں کدال لیے تیز گرم ہوا میں مٹی کھود کر خندق بنانے میں مصروف ہے۔ جب ملا محمد اس کے پاس پہنچا تو اس نے اپنے ہاتھ دھوتے اور ایک شامیانہ لگانے کا حکم دیا۔ وہ بلا تکلف فرش پر بیٹھ گیا اور اس نے بادشاہ کے پیغام کو سنا۔ اس نے سفیر سے کہا کہ "آپ از راہ کرم میری ایک بات بادشاہ کے گوش گزار کر دیں کہ حضرت لڑنا چاہتے ہیں مگر ان کی فوج لڑنا نہیں چاہتی۔ اس کے برعکس

Marfat.com

میں جنگ کے خلاف ہوں اور میری فوج لڑائی کے لیے مضطرب۔ اب جیسا جو بادشاہ کے مزاج میں آتے۔"

شیر خاں نے اپنے پیرو مرشد میر خلیل کو صلح کی تجویز لے کر بادشاہ کی خدمت میں بھیجا اور عرض کیا کہ وہ بنگال کے علاوہ تمام علاقہ بادشاہ کے حوالے کرنے کو تیار ہے، بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھوانے اور سکہ رائج کرنے کے لیے بھی تیار ہے۔ ان شرائط کو ماننے کے لیے ہر دو فریق نے قرآن پاک کی قسم کھا کر وعدہ کیا۔ اس کی جانب سے بادشاہ کو اطمینان کلی ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے روز صبح سے بادشاہ کے لشکر میں لاپرواتی اور غفلت ہو گئی

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بدایونی اور عباس کے بیان میں کوئی ہم آہنگی ہے؟

۶۔ مخزن

بدایونی کے ۲۵ سال بعد مصنف مخزن نے اسی کہانی کو اپنی تصنیف میں جگہ دی۔ محض اتنی سی تبدیلی کر دی کہ قرآن پاک کی قسم کھا کر اس میں دیگر باتوں کا اضافہ کر دیا۔ مخزن کا بیان ہے۔

شیر خاں نے اپنی جانب سے شیخ خلیل کو حضرت جنت آشیانی کے حضور میں بھیجا اور کچھ روز تک صلح نامہ و پیام جاری رہے۔ آخر کار شیر شاہ راضی ہو گیا اور اس نے شیخ خلیل کے ذریعے بادشاہ کے پاس یہ پیغام بھیجا "میں گڑھی کی حد سے لے کر ہند کا تمام علاقہ اعلیٰ حضرت کے سپرد کرتا ہوں۔ اعلیٰ حضرت صرف بنگال کا علاقہ میرے لیے چھوڑ دیں۔ میں بنگال میں بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھوں گا۔ ان کے نام کے سکے جاری کروں گا۔ ہمایوں نے یہ شرائط منظور کر لیں اور صلح ہو گئی۔ بادشاہ کا درد سر ختم ہو گیا۔ شاہی فوج کے سپاہی روزانہ بلا کسی شک و شبہ یا ڈر کے افغانوں کے لشکر میں آنے لگے اور تماشہ دیکھنے لگے اور اسی طرح یہ سلسلہ آمدورفت رہا۔ شیر خاں نے چوسہ کے نزدیک دریا پر ایک پل بنایا اور تین روز تک

Marfat.com

متواتر وہ اپنے پڑاؤ سے آگے بڑھتا رہا۔ بادشاہ شیر خاں کے اس مکروفریب سے بے خبر رہا۔

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ بدایونی نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ دوسروں سے سن کر لکھا ہے اسے کسی واقعہ کا ذاتی علم نہ تھا قرآن پاک کی قسم کے متعلق بھی اس نے ایک افواہ سُنی ہوگی۔ چنانچہ ابوالفضل اور جوہر کے مقابلے میں اس کو مستند نہیں مانا جاسکتا۔ حالانکہ مصنف مخزن شیر خاں کے خلاف نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے ایسے ناقابلِ اعتبار واقعات کا اضافہ کر دیا ہے جس کی تائید کسی دوسری تصنیف سے نہیں ہوتی، جوہر، ابوالفضل اور عباس کے بیانات کا موازنہ کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اگر شیر خاں کے مخالف مورخین نے یہ واقعات قلمبند نہ کیے ہوتے تو شیر شاہ کے مداحوں نے شیر شاہ کی اور زیادہ مٹی خوار کی ہوتی جیسا کہ شیواجی اور افضل خاں کے معاملہ میں "سبھا سد بکھار" کے مصنف نے شیواجی کی کرکری کی تھی حالانکہ وہ شیواجی کا مداح تھا۔

ہماری راستے میں شیر خاں کے خلاف دھوکہ دہی کا جو الزام ڈاکٹر موصوف نے عائد کیا ہے اس کو ڈاکٹر صاحب ثابت کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ جن مصنفین کے بیانات کو انھوں نے بطور شہادت پیش کیا ہے وہ بیانات خود اس قدر متضاد اور مبالغہ آمیز ہیں کہ ان پر یقین نہیں لایا جاسکتا۔ ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنرجی نے اس معاملہ میں فہم و اعتدال سے کام لیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے چنار دینے سے انکار کر دیا تھا۔ لہٰذا صلح کی بات چیت ختم ہوگئی

(ہمایوں بادشاہ۔ جلد ا صفحہ ۲۲۵)

اس کے بعد شیر خاں نے محض یہ کیا کہ اپنی ترکیب و چال سے مغلوں کو لاپرواہ و غافل بنا دیا۔ اس نے ایک نئی چال چلی۔ یعنی مہارتھ چیرو کے خلاف حملہ کرنے کا کرشمہ دکھایا۔

Marfat.com

میں ڈاکٹر بنرجی سے ۷ اسال پہلے بھی اسی خیال کا حامی تھا اور آج بھی ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی تمام شہادت کو چھان لینے کے بعد اپنی رائے پر ثابت و قائم ہوں۔ حالانکہ ان تمام واقعات پر تنقید و تبصرہ کرنے سے یہ بیان کافی طول اور ناگوار خاطر ہو گیا ہے لیکن تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے استفادہ کے لیے یہ سب لکھنا بہت ضروری تھا کیوں کہ کسی بھی واقعہ سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے اور کسی رائے میں ترمیم کرنے کا آخری حق مطالعہ کرنے والوں کو ہی ہوتا ہے۔

Marfat.com

باب 10

ہمایوں پر آخری فتح

(سنہ ۱۵۴۰ء)

۱۔ بنگال کی دوبارہ فتح و دوسری رسم تاجپوشی

الہ آباد تک ہمایوں کا تعاقب کرنے کے بعد شیر خاں کا سب سے پہلا کام تھا بنگال پر دوبارہ قبضہ کرنا۔ مغل فوج کی پیش قدمی کی وجہ سے اسے پہلے بنگال خالی کرنا پڑا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے فوج کا ایک دستہ حاجی خاں بٹنی اور جلال خاں بن جالو کی کمان میں جہاں گیر قلی خاں کے خلاف بنگال کی جانب روانہ کیا اور دوسرا دستہ خواص خاں کی کمان میں خانخاناں دلاور خاں لودی کو جو کہ مونگیر کے قلعہ پر قابض تھا نیست و نابود کرنے کے لیے بھیجا۔ خواص خاں نے اچانک حملہ کر کے قلعہ کے نزدیک شہر پر تسلط کر لیا۔ اغلب یہ ہے کہ شیر خاں کے بہار پہنچنے سے قبل ہی خانخاناں نے قلعہ چند شرائط پر افغانوں کے حوالے کر دیا[1]۔ شیر شاہ کو خانخاناں سے

---

[1] خواص خاں نے مونگیر پر کب اور کیسے تسلط کیا اس کے متعلق میں اب عباس کے بیان کو رد کرتا ہوں (شیر شاہ ص ۱۵۸) اس کے حاشیہ کے نوٹ کو بھی رد سمجھا جائے۔ مونگیر کا قلعہ اس قدر

Marfat.com

اپنی رنجش دیرینہ کا انتقام لینا تھا لیکن ہر افغان جس سے شیر خاں نے اس بارے میں مشورہ لیا کہ یہی خیال کا نکلا کہ خانخاناں ایک عالی مرتبہ افغان ہے اسے معاف کر دینا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ حاجی خاں صاحب نے جس کو شیر خاں نے ایک سیاسی مشن پر مالوہ بھیجا گجرات بھیجا تھا۔ شیر خاں کو آگاہ کرتے ہوئے لکھا "اگر ہمایوں نے خانخاناں کی تجویز پر عمل کیا ہوتا تو تیری قوت کی بنیاد ہی تہہ و بالا ہو جاتی۔ یہ تیرے اقبال کا کرشمہ ہے کہ ہمایوں نے خانخاناں کی بات کی قدر نہ کی۔ اسے یقیناً سزائے موت کا حکم ملنا چاہیے۔ اسے حراست میں رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔" (عباس) قصہ کوتاہ یہ ہے کہ شیر خاں نے خانخاناں سے جو کچھ بھی وعدہ کیا تھا اس کی مطلق پرواہ نہ کی اور اس کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ جہاں اس کو بطور خوراک روزانہ ½ سیر جو خام ملتے تھے۔ بعد میں اس بد نصیب کو جیل میں ہی قتل کر دیا گیا شیر خاں نے خانخاناں کو اس لیے قتل نہیں کیا کہ اس نے افغان قوم کے ساتھ غداری کی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو خود شیر خاں اور دوسرے قوم پرست افغان اسی سزا کے موجب ہوتے لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ خانخاناں کا سیاسی اقتدار اس قدر بلند تھا کہ ایسے نازک وقت میں جب ہمایوں کے خلاف شیر خاں کی قسمت کا آخری فیصلہ ہونا تھا اسے معاف کر دینا خطرہ سے خالی نہ ہوتا۔ بہر حال یہ ایک ایسی ریاکارانہ اور ظالمانہ حرکت تھی جس نے شیر خاں کی چوسہ کی فتح پر داغ لگا دیا۔ ایسا ہی پُر فریب اور ظالمانہ سلوک شیر خاں نے جہانگیر قلی کے ساتھ بھی کیا۔ جیسے ہی چوسہ کی لڑائی کی خبر جہانگیر قلی کے پاس پہنچی اُس نے گوڑ خالی کر دیا اور اپنی فوج لے کر گڑھی لوٹ آیا۔ یہاں سے اُس کا ارادہ آگرہ جانے کا تھا۔ بنگال میں چاروں طرف منتشر مغل فوج بھی اپنے وطن واپس جانے کو یہاں جمع ہو گئی لیکن حاجی خاں اور جلال خاں بن جلو کے

مستحکم و پائیدار تھا کہ خواص خاں ایک ہی حملہ میں اس پر قبضہ نہیں کر سکتا تھا۔ نہ دلاور خاں کو ہی قید کر سکتا تھا۔ اگر خواص خاں دلاور خاں سے اس کے تحفظ جان و مال کا وعدہ نہ کرتا تو شاید وہ قلعہ خواص خاں کے حوالے نہ کرتا اور ایسی صورت میں قلعہ کو فتح کرنے کے لیے طویل محاصرہ کرنا پڑتا عباس نے یہ سب کچھ اس لیے نظر انداز کر دیا ہے کہ تا کہ شیر شاہ پر ظلم و دغا بازی کا الزام نہ عائد ہو۔

Marfat.com

افغان فوج کے ساتھ پہنچنے سے ان کی سب امیدوں پر پانی پھر گیا مغلوں نے گڑھی کے درّہ پر اس قدر مضبوط مورچہ لگا رکھا تھا کہ افغانوں کے لیے انھیں وہاں سے ہٹانا ناممکن تھا۔ مخزن کا بیان ہے کہ چوسہ کی لڑائی کے تین ماہ بعد شیر خاں بنگال کی جانب گیا اور جہانگیر قلی خاں کو گڑھی میں گھیر لیا۔ متعدد حملوں کے بعد جہانگیر قلی شہید ہو گیا[1] لیکن مخزن کا بیان خالص سچ نہیں ہے۔ ابوالفضل نے لکھا ہے[2] کہ جہانگیر قلی خاں کے ساتھ ایک فرضی سمجھوتہ کیا گیا جس کی وجہ سے وہ باہر نکل آیا۔ اس بیان پر یقین نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ عباس نے شیر خاں کی ریاکاری پر پردہ ڈالنے کی غرض سے یہ نہیں بتایا کہ آخر جہانگیر قلی خاں مع اپنی ۶ ہزار فوج کے شیر خاں کے ہاتھ کیسے پڑ گیا۔ عباس لکھتا ہے کہ شیر خاں نے قلی خاں کے قتل کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ۶ ہزار مغل سپاہی بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ بندیوں کی فوج میں جتنے ہندو سردار تھے ان سب کی جان بخشی کر دی گئی اور انھیں جانے کی اجازت دیدی گئی[3] ابوالفضل نے لکھا ہے کہ درویش مقصود بنگالی جو جہانگیر قلی خاں کے ساتھ پیچھے رہ گیا تھا محض ایک ایسا سردار تھا جو زندہ بچ گیا[4]

اس طرح جہانگیر قلی خاں شیر خاں کی غداری کا شکار ہو گیا۔ وہ کسی اصولی جنگ میں نہیں مارا گیا۔ شاید اسے ہمایوں کے گناہوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اس دور کے مقابلہ میں ہمارے زمانے کا اخلاقی معیار نہ تو اتنا جارحانہ ہے اور نہ اتنا سفاکانہ۔ چنانچہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ مغلوں اور افغانوں کی خصلت کے آشکارا اور عام عیب تھے فریب دہی اور حلف دروغی۔ جب اسلام کی تبلیغ باہر ہونے لگی اور اس کے دوران غیر عربی نسل کے لوگ بھی مسلمان بننے لگے تو وعدہ وفائی کا وہ اعلیٰ معیار

---

[1] مخزن قلمی نسخہ صفحہ ۲۵ [2] اکبر نامہ جلد ۱ صفحہ ۳۴۵۔

[3] عباس قلمی نسخہ صفحہ ۶۴۔ [4] اکبر نامہ جلد ۱ صفحہ ۳۴۹۔

Marfat.com

(خواہ وہ قول کافروں سے ہی کیوں نہ کیا گیا ہو) جس کی بنیاد رسول اللہؐ نے ڈالی تھی اور جس کو خلفائے راشدین نے اپنے سیاسی امور میں جاری رکھا وہ فراموش ہو گیا۔ اسلام کے زمانہ زوال میں مذہب پر قومیت غالب ہو گئی اور مسلمانوں میں دروغ حلفی انتہائی درجہ پر پہنچ گئی۔

۱۵۳۹ء یعنی ۹۴۶ ہجری میں جب شیر خاں گوڑ پہنچا تو بڑے کرّوفر سے اس کی دوبارہ رسم تاجپوشی ہوئی[1] شیر خاں کی پہلی رسم تاجپوشی ایک سال پیشتر جب کہ ہمایوں کی توپیں گڑھی کے درہ پر گرج رہی تھیں بہت ہی عجلت میں ہوئی تھی۔ بنگال کے لوگ اس کی سیاسی اور اخلاقی اہمیت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے اور شیر خاں کے چلے جانے کے بعد انھوں نے مغلوں کو اپنا جائز حکمران سمجھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ اس لیے شیر خاں کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ دوسری بار شاہی طرز سے جشن تاجپوشی منائے جس سے اس کی عہد حکومت کی افتتاح و اشاعت ہو سکے۔ عباس کو دوئم تاجپوشی کا پتہ ہی نہ تھا۔ اس نے چوسہ کی لڑائی کے بعد پہلی تاجپوشی کی جگہ اور تاریخ کا ذکر بھی مبہم طریقہ سے کیا ہے البتہ عباس نے اپنے ایک مورث سروانی کی اس بات کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے کہ اس نے شیر خاں کی توجہ جو اس وقت "چہ می کنم" تھا۔ شاہی خطاب اختیار کرنے کی جانب رجوع کی۔ اس نے بڑی تفصیل سے شیر خاں کی مجلس کا ذکر کیا ہے جس میں کہ عیسٰی خاں سروانی نے ولولہ انگیز تقریر کی اور ٹھیک ویسی ہی دوہری اداکاری کی جیسی کہ لبمارک اور ریویوریا کے ایک شہزادہ نے مل کر ۱۸۷۱ء میں جرمنی شہزادوں کی ایک مجلس میں ورسائی کے محل میں کی تھی۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ عباس میاں کو یہ علم بھی نہ تھا کہ شیر خاں نے کیا خطاب اختیار کیا۔ اس نے "شاہ عالم" لکھا ہے۔ شیر شاہ کے زمانے کے

---

[1] مخزن ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنگال میں شیر خاں کی رسم تاجپوشی ادا ہوئی لیکن اس میں دوسری مرتبہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

Marfat.com

سکوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ غلط ہے [1]

کہا جاتا ہے کہ شیر خاں نے اپنی تخت نشینی کے لیے نجومیوں سے ساعت سعید (شبھ مہورت) نکلوائی تھی۔ شیر خاں جونپور اسکول کا مولوی تھا۔ خواہ اسے علم نجوم میں یقین تھا یا نہیں لیکن وہ یہ بات بخوبی سمجھتا تھا کہ گاہے گاہے بادشاہ کے لیے اپنی رعایا کی اوہام پرستی کی خاطر بے وقوفی کا مظاہرہ کرنا مفید ہوتا ہے۔ بہرحال اس موقع پر شیر خاں نے فیاضی اور دریا دلی سے کام لیا۔ وہ سات روز تک متواتر رعایا کے جوشیلے جشن میں شرکت کرتا رہا۔ عباس نے اس واقعہ کی تصویر اپنے الفاظ میں یوں کھینچی ہے۔

"سات روز تک جشن و شادمانی کے نقارے بجتے رہے۔ ہر افغان قبیلہ سے جوانوں کی ٹولیاں دربار میں آتی رہیں اور افغان رسم و رواج کے مطابق رقص کرتی رہیں۔ شیر خاں نے مطربوں کو دل کھول کر انعام دیا اور اس کے خدمت گاروں نے رقاصوں کے سر پر مشک عنبر، زعفران آمیز رنگا رنگ عرق گلاب چھڑکا۔ دستر خوان پر لذیز کھانے چُنے گئے۔ جن سے کہ خلد بریں کے کھانوں کی مہک نکلتی تھی جشن منانے والوں کو ہا منم شربت پلاتے گئے۔ جو شراب[2] طہور کی یاد دلاتے تھے۔ گھر گھر میں جہاں بھی شیر خاں کا فتح نامہ پہنچا اسی قسم کے جشن منائے گئے۔" [3]

شیر خاں بنگال میں اپنی حکومت کو منظم کرنے کے زیادہ دن نہ ٹھہر سکا۔ نہ وہ بنگال میں زیادہ فوج ہی رکھ سکا۔ البتہ اس نے مغربی بنگال کے چٹگانگ اور ستگام بندرگاہوں پر اپنا مستحکم تسلط کر لیا تاکہ پرتگالی اس علاقے پر دست

---

[1] ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی رائے کے لیے اس باب کا نوٹ نمبر ۲ ملاحظہ کیجیے گا۔ میں نے عباس کی بر جہاں گیر قلی خاں کی نسبت جو لکھا تھا غلط ہے (شیر شاہ، صہ ۱۹۸-۱۹۹)

[2] صوفیوں کی زبان میں ایک قسم کی محبت ایزدی کا نشہ ہے جو راہ معرفت کے سالکان پر چھایا رہتا۔

[3] عباس قلمی نسخہ صہ ۱۰۳

Marfat.com

اندازی نہ کر سکیں۔ اس کا یہ اصول تھا کہ وہ مقامی حکومت کے لیے وہیں کے لوگوں کو بھرتی کرتا تھا اور مقامی ہندو و مسلم امرا و سرداروں کو اپنے یہاں نوکری دیتا تھا تاکہ مقبوضہ علاقے کے لوگوں کو کم سے کم انتظامیہ کی تبدیلی کا احساس ہو۔ بنگال سے روانہ ہوتے وقت اس نے خضر خاں[1] نام کے ایک ترک کو جس کے حسب و نسب کا کوئی پتہ نہیں بنگال کا گورنر مقرر کر دیا۔ شاید وہ بنگال کے قدیم ترکی امیروں میں سے کوئی با اثر سردار ہو گا جس کو پرانے سیّد خاندانوں سے رنجش تھی۔ شیر خاں کا یہ تجربہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ جیسا کہ ایک سال کے بعد کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ حالانکہ انجام کو دیکھتے ہوتے ہم شیر خاں کے اس فیصلے کو غلط کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت کے نازک حالات کو دیکھتے ہوتے یہ بہترین حل تھا خود شیر خاں کے لڑکے اور دربار کے عالی مرتبہ سردار بنگال کا گورنر بننے کے خواہشمند تھے۔ لیکن شیر خاں اگر ان لوگوں میں سے کسی کا تقرر اس عہدہ پر کر دیتا تو باقی ماندہ لوگوں کے دلوں میں بغض پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

---

[1] خضر خاں کے نام کے ساتھ خاندانی لقب کیا تھا اسکے متعلق مختلف رائے ہیں۔ ایلیٹ نے عباس کے ترجمہ میں خضر خاں بیرک لکھا ہے۔ سرکار کے پاس جو عباس کا مسودہ ہے میں نے اس میں ترک پڑھا ہے۔ میں اس کو ترجیح دیتا ہوں۔ نعمت اللہ اور دیگر مصنفین بھی ترک لکھتے ہیں۔ پروفیسر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہودی والا کی رائے میں 'بیرک' غلط ہے، شاید 'سرک' صحیح ہے۔ لودی قبیلہ کے مورثوں کی ایک شاخ 'سرک' بھی ہے اس لحاظ سے خضر خاں کو افغان کہہ سکتے ہیں۔ لیکن تاریخ اس قیاس آرائی کو درست نہیں مانتی کہ خضر خاں سرک افغان تھا۔ افغانوں کی تاریخ میں یہ نام کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔ اگر شیر خاں کسی افغان کو بنگال کا گورنر بنانا چاہتا تھا تو درجنوں قابل افغان اس امتیاز کے مستحق تھے۔ مثلاً ہیبت خاں نیازی وغیرہ۔ شیر خاں کے نظریہ کے مطابق خضر خاں میں ایک ہی خوبی تھی کہ وہ افغان نہیں تھا۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اس کا نام خضر خاں سروانی لکھا ہے۔ یہ نام خود عباس سروانی کو حیرت میں ڈال دے گا۔ (دیکھیے ہمایوں نامہ صفحہ ۱۶۳) ہودی والا کی رائے کے لیے دیکھیے (اسٹڈیز صفحہ ۴۵۴)

Marfat.com

۲۔ بے سود سفارت اور فوجی سانحہ (۱۵۳۹ء-۱۵۴۰ء)

ایک روایت ہے کہ چوسہ کی شکست کے بعد جب ہمایوں آگرے سے جانب قنوج روانہ ہوا تو شیر خاں نے مسند عالی عیسٰی خاں کو اپنا سفیر بنا کر مالوہ اور گجرات بھیجا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رائسین اور چندیری کے بھیا پورنمل اور رہنڈیا کے معین خاں بن سکندر خاں میانہ نے شیر خاں کے خطوط کے جواب میں اسے یقین دلایا کہ شیر خاں کے لڑکے کے مالوہ پہنچنے پر وہ مغلوں کے خلاف وفاداری سے اس کی مدد کریں گے۔ ملو خاں نے قدیم خلجی دارالسلطنت مانڈو اور اس کے گرد و نواح کے ماتحت علاقہ سارنگ پور، اجین، بھیلسہ پر اپنا تسلّط کر لیا۔ ملو خاں نے یہ کام اس وقت کیا جب کہ ہمایوں نے گوالیار کے علاوہ تمام مالوہ خالی کر دیا تھا۔ اب وہ محض "خان" نہ رہ گیا تھا بلکہ ۱۵۳۷ء میں قادر شاہ کا خطاب اختیار کر کے وہ خود مختار بادشاہ بن گیا تھا۔ چنانچہ یہ روایت اس کو پسند نہ آئی کہ شیر شاہ شاہی مہر لگا کر اس کو کوئی فرمان بھیجے اور اسے اپنا ماتحت سمجھے۔ قادر شاہ نے شیر خاں سے اپنی توہین کا بدلہ یوں لیا کہ اس نے شیر خاں کے خط کے جواب میں ایک گستاخانہ خط لکھا۔ جس پر اس نے اپنی شاہی مہر ثبت کی لیکن شیر خاں کو مالوہ کے دیگر سرداروں کی وفاداری اور اطاعت پر کامل یقین تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے قطب خاں کو ایک فوج لے کر چندیری بھیجا تا کہ وہ مالوہ کے دیگر سرداروں کی فوج کی مدد سے دہلی اور آگرہ کے قرب و جوار میں بدامنی پھیلاتے۔ شہنشاہ نے اپنے دو بھائیوں مرزا عسکری اور ہندال مرزا چندیری کی جانب روانہ کیا۔ جب مالوہ کے حکمرانوں نے مرزاؤں کی آمد کی خبر سنی تو انھوں نے قطب خاں کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قطب خاں چندیری سے اپنی فوج ہٹا کر "جاندہ" کی جانب چلا گیا۔ جہاں قطب خاں اور مغلوں میں ایک لڑائی ہوئی جس میں قطب خاں ہلاک ہوا[1]۔

---

[1] عباس قلمی نسخہ صفحہ ۱۶۷، ۱۶۸، ایلیٹ کا ترجمہ غلط ہے۔

Marfat.com

لیکن مالوہ اور گجرات سے شیر خاں کے سیاسی تعلقات کی یہ محض ایک داستان ہی ہے۔ حقیقت اس سے بہت دور ہے۔ پھر بھی قرون وسطیٰ اور موجودہ دور کے ہمایوں اور شیر شاہ کے سوانح نگاروں[1] نے جن میں یہ مصنف بھی شامل ہے۔ اس ہوائی قصہ کو خوب اشاعت دی ہے۔ یہ کہانی اس زمانہ کی مالوہ کی سیاسی فضا سے میل نہیں کھاتی اور اور شیر خاں کی عادات واطوار کے برعکس ہے۔ دو سال بعد شیر خاں کے پاس مالوہ پر ناجائز حملہ کرنے کی اور ملو خاں کی طاقت کو برباد کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی اس لیے عباس نے شیر خاں کے اشتعال انگیز کارناموں کی حمایت میں یہ دلیل پیش کی ہے جو بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہے ازمنہ وسطیٰ کے نامہ نگار کسی واقعہ کی تشریح کرنے میں سیاسی تعلقات سے زیادہ ذاتی تعلقات پر زور دیتے ہیں غور کرنے سے مطالعہ کرنے کے بعد عباس کی کہانی کا لب لباب یہ ہے:-

۱۔ شیر شاہ نے قادر شاہ کے پاس جو فرمان بھیجا تھا اس پر اپنی مہر ثبت کی تھی۔ یہ بات سفارتی رسم ورواج کے خلاف اور بین الاقوامی اصولوں کے برعکس تھی[2] شیر شاہ کا یہ فعل اپنے پڑوسی بادشاہ کے حق میں اشتعال انگیز تھا۔ قادر شاہ نے شاہی خطاب شیر شاہ سے

---

[1] مثلاً فرشتہ (جلد ۲ صفحہ ۲۷۰) نظام الدین احمد (ٹی۔ اے صفحہ ۵۹۱) ڈاکٹر ای الشوری پرشاد، ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنرجی قانون گو (شیر شاہ صفحہ ۲۰۸۔ ۲۱۳) اب میں اس کہانی کو بلا تامل متروک و مسترد کرتا ہوں۔

[2] پروفیسر ہودی والا نے بڑی وضاحت سے اس بات کو بیان کیا ہے کہ قرون وسطیٰ میں ایک حکمران دوسرے حکمران کو کس طرح نامہ و پیام بھیجتا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ عباس نے مہر کے واقعہ کو ایماندارانہ طریقے سے بیان نہیں کیا ہے اور نہ اس نے سالم واقعہ ہی بیان کیا ہے۔ اس نے اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے کہ سب سے پہلی اشتعال انگیز حرکت شیر شاہ کی جانب سے ہوئی۔ (دیکھیے اسٹڈیز صفحہ ۴۵۶) سب سے پہلے پروفیسر موصوف نے ہی اسی غلطی کی طرف اشارہ کیا تھا جس کی وجہ سے مجھے عباس کے بیان کا تنقیدی جائزہ لینا پڑا۔

Marfat.com

ایک سال قبل اختیار کیا تھا پورے مالوہ اور مالوہ کے کچھ حصوں نے اس کا تسلط تسلیم کر لیا تھا۔ شیر شاہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے اس بات کا علم نہ تھا۔ اگر وہ ایسا سمجھتا تو وہ شاہی خطاب کا نا اہل تھا۔ بالفرض یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ شیر شاہ کا یہ فعل غیر ارادی تھا تو مسند عالی عیسیٰ خاں کے متعلق کیا صفائی پیش کی جا سکتی ہے۔ وہ قادر شاہ کے پاس مدد مانگنے کے لیے شیر خاں کا سفیر بن کر گیا تھا۔ پھر اس قدر مکروہ و گستاخانہ خط اس کو دیا تو اس کو احمق کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

۲۔ یہ حقیقت نہیں ہے کہ ملو خاں کے علاوہ مالوہ کے دیگر سرداروں نے مثلاً راستے سین کے پورنمل، ہنڈیا کے معین خاں (نربدا کے جنوب میں ہے) شیر شاہ کے خط کا دوستانہ جواب دیا۔ اور شیر شاہ کے لڑکے کو امداد کا یقین دلایا۔ یہ بات محض اس لیے گھڑی گئی ہے تاکہ دیگر سرداروں کے اطاعت کیش رویہ کے بالمقابل ملو خاں کا اہانت آمیز رویہ زیادہ نمایاں ہو جاتے۔ ہمیں تاریخ کے اس واقعہ کو ذہن میں رکھنا ہے کہ ۲ سال پہلے ملو خاں کی دعوت پر ہی پورنمل میواڑ سے چل کر مالوہ آیا تھا اور ملو خاں نے راستے سین اس کے حوالے کر دیا تھا اور ملو کے ایما سے ہی اس نے چندیری پر قبضہ کر لیا تھا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ مالوہ کی سیاست میں ملو خاں ہی چوٹی کا مہرہ تھا۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ جب قادر شاہ (ملو خاں) افغان قید میں تھا اور شیر شاہ دہلی کا بادشاہ تھا اس وقت بھی شیر خاں کا سلوک اس کے ساتھ برادرانہ ہی تھا۔ عباس کی اس کہانی پر جو اس نے سروانی ذرائع سے سُنی ہے یقین کرنے کے معنی ہیں کہ ہم شیر شاہ کے اخلاق کے نمایاں پہلو سے منکر ہوں۔ شیر شاہ کے قلم اور زبان میں یہ وصف تھا کہ وہ کٹر سے کٹر دشمن کو بھی اپنے ارادے سے باخبر رکھتا تھا جب تک اس پر حملہ کرنے کی تیاریاں مکمل نہ کر لے۔

۳۔ کیا شیر خاں فنون جنگ سے اس قدر بے بہرہ تھا کہ وہ اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکا کہ مالوہ کی جانب سے ہی آگرہ اور دہلی پر فوج کشی کرنا خلاف مصلحت

Marfat.com

ہے کیوں کہ کالپی اور گوالیار ابھی تک مغلوں کے قبضہ میں تھے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ شیر شاہ کے ذہن میں قطب خاں کو چندیری بھیجنے کا احمقانہ خیال بالکل ہی نہیں تھا۔ نہ قطب خاں کبھی فوج لے کر اس طرف گیا جہاں ہمایوں کے بھائیوں نے اسے ہلاک کیا ہو۔ جیسا کہ عباس نے ذکر کیا ہے۔ مرزا حیدر نے جو کہ بذات خود ہمایوں اور کامران مرزا کے پاس موجود تھا اس ضمن میں یہ لکھا ہے کہ شیر شاہ نے ایک فوج گنگا کے اس پار اٹاوہ اور کالپی فتح کرنے کے لیے بھیجی اور ہمایوں نے اس کے مقابلہ کے لیے ایک فوج تین افسروں کی کمان میں یعنی حسین سلطان۔ یادگار ناصر مرزا (ہمایوں کا چچا) اور سکندر سلطان (کامران کا ایک افسر جسے اس وقت کالپی دیا گیا تھا) روانہ کی۔ مرزا حیدر کے بیان کے مطابق کالپی کے قرب و جوار میں لڑائی ہوئی اور قطب خان ہلاک ہوا۔

مرزا حیدر کے بیان سے شیر شاہ کی لڑائی کا نقشہ پورے طریقہ سے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

شیر اپنی فوج لے کر لکھنؤ سے چل کر گنگا کے کنارے پریاگ تک آیا۔ (دیکھیے گلبدن) یہاں سے اس نے جمنا کے کنارے کنارے قطب خاں کو کالپی کی جانب روانہ کیا۔ کالپی دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے۔ قطب خاں کے ساتھ جو فوج بھیجی گئی تھی اس کا مقصد مغلوں سے لڑنا نہیں تھا بلکہ مغل فوج کو دو حصوں میں منقسم کرنا تھا تاکہ اگر ہمایوں کالپی و اٹاوہ کے راستے جونپور یا قنوج کی جانب کوچ کرے تو اسے عقب و بازو سے گھیر لیا جائے۔ بہر حال شیر شاہ کی یہ ناعاقبت اندیشی تھی کہ اس نے یہ کام ایک ایسے ناتجربہ کار جوان کے سپرد کیا جس کی جلد بازی کی وجہ سے اس کی تباہی ہوئی۔

---

[1] تاریخ رشیدی۔ ترجمہ صفحہ ۴۷۲۔ عباس نے لڑائی کا مقام بھی ٹھیک نہیں بتایا۔ چاندھ (صحیح نام چندوار ہے) اٹاوہ متھرا سڑک پر آگرہ سے ۲۵ میل مشرق میں ہے۔ (دیکھیے تزک صفحہ ۵۸۱، فٹ نوٹ ۸) یہ جگہ چندیری اور کالپی سے بہت دور ہے۔

Marfat.com

عیسیٰ خاں کو مالوہ اور گجرات کی سفارت جیسا کہ عباس کے بیان سے ظاہر ہے سیاسی نقطۂ نظر سے سعی لاحاصل نہ ثابت ہوتی۔ لیکن یہ رائے درست نہیں ہے۔ شیر شاہ کا مقصد ان سے فوری امداد مانگنا نہیں تھا بلکہ مستقبل کے لیے وہ دوستوں کی تلاش کر رہا تھا۔ اگر ہمایوں کے خلاف لڑائی طول پکڑنے میں ایسی ضرورت پیش آجاتے

۳۔ چوسہ کی لڑائی کے بعد مغلوں کی حالت

۱۵۳۹ء کی برسات کے ختم ہوتے ہوتے چوسہ کی شکست کے اثرات بھی کم ہونے لگے تھے۔ بادشاہ ۴۰ دن کی علالت سے شفایاب ہو چکا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ افسردہ دلوں میں اُمید کی روشنی جھلملانے لگی تھی۔ ہمایوں نے چوسہ کے حادثہ کو قابلِ تعریف مستقل مزاجی اور شاندار سکونِ قلب سے برداشت کیا۔ اس کے بھائیوں نے اس کی غیر حاضری میں جو ناز یبا رویہ اختیار کیا تھا وہ اس کے نادم و تائب تھے۔ بادشاہ نے صدق دل سے ان کی عذر و معذرت کو منظور کر لیا تھا اور ان کو دوبارہ آغوش الفت میں جگہ دیدی تھی۔ افغانوں کے ہاتھوں مغلوں کی شکست نے خاندان تیموری کے قومی جذبہ کو برانگختہ کر دیا تھا۔ اُنھیں افغانوں سے دلی نفرت تھی۔ وہ افغانوں کو سینکڑوں بار میدان جنگ میں پسپا و مغلوب کر چکے تھے۔ یہ خیال کہ اب افغان ان پر غالب آجائیں ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سخت سے سخت تیموری باغی بھی ہمایوں کی طرف آنے لگے تھے۔ محمد زماں مرزا چوسہ کی لڑائی میں ہمایوں کی جانب سے لڑتا ہوا شہید ہو چکا تھا ضعیف سلطان مرزا اور اس کے بہادر لڑکے جواب تک افغانوں سے سازش کیے ہوتے تھے آئے اور اپنی خدمات ہمایوں کو پیش کیں اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ ان کی تلواریں بار بار میانوں سے باہر نکل پڑتی تھیں۔ آگرہ میں مغلوں کی تقریباً ایک لاکھ فوج جمع تھی۔ رومی خان کے لڑکے کی کمان میں مغل توپخانے کی از سر نو تنظیم کی گئی

Marfat.com

اسی وقت مغل دارالسلطنت میں بادشاہ کی زندگی کا ایک دوسرا غمناک و مضحکہ خیز پہلو بھی پیش نظر ہوا۔ ہمایوں فطرتاً شریف اور سنکی بادشاہ تھا۔ دوسرے متکبر اور مغرور بادشاہوں سے اس کا مزاج مختلف تھا۔ وہ ان میں سے نہ تھا جو کہ نہ ادنیٰ اشخاص کی خدمتوں کا اعتراف کرتے ہیں اور نہ دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرتے ہیں۔ ۱۵۴۰ء کے آغاز میں جب شیرشاہ مع اپنی فوج کے لکھنؤ کے نزدیک پہنچ رہا تھا۔ دہلی کے دربار میں ایک دوسرا سوانگ ہو رہا تھا۔ چوسہ کی لڑائی کے بعد جب ہمایوں غرق آب ہونے والا تھا ایک بھشتی نظام نے اس کی جان بچائی تھی۔ اس وقت ہمایوں نے اس سے کچھ وعدہ کر لیا تھا۔ اب اس وعدہ کو عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا۔ گلبدن نے لکھا ہے کہ اس وقت اعلیٰ حضرت نے نظام بھشتی کو تخت پر بٹھایا اور تمام امیروں کو آداب بجالانے کا حکم دیا۔ بھشتی نے جس عہدے پر جس کو چاہا سرفراز کیا اور جس کو جو چاہا انعام دیا۔ اس طرح شہنشاہ نے بھشتی کو دو روز تک کے لیے شاہی اختیارات سپرد کر دیے۔ مرزا ہندال اس وقت دربار میں موجود نہیں تھا (اس کا مطلب ہے کہ باقی سب لوگ موجود تھے) جوہر نے بھی اس واقع کی تصدیق کی ہے اور لکھا ہے کہ بھشتی نے تین روز تک حکومت کی۔

اس وقت مغل دربار میں ایک طرف جشن و شادمانی کا دور تھا اور دوسری طرف سازشوں کا جال بھی پھیل رہا تھا جو مستقبل کے لیے نیک فال نہ تھا۔ شاید بابر کی اولاد کا ایک جگہ اکٹھا ہونے کا یہ آخری موقع تھا۔ ہمایوں اپنی خوش طبعی اور ظریفانہ ادا سے خاندان کے جملہ افراد کا دل خوش کر رہا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہمایوں اور کامران شکار کے لیے گئے۔ انھوں نے شہر سے باہر جا کر دیکھا کہ ایک سگ ناپاک ایک مسلمان کی قبر پر پیشاب کر رہا ہے۔ کامران نے ازراہِ مذاق کہا کہ یہ قبر کسی شیعہ کی معلوم ہوتی ہے۔ ہمایوں نے (جو اس وقت تک شیعہ نہیں تھا) فوراً یہ جواب دیا۔ اگر یہ سچ ہے تو یہ کتا ضرور سنی ہوگا۔" ہمایوں کامران کو دہلی کے تخت کے سوا سب کچھ دے چکا تھا۔ آخر میں اپنی الفت و مروت کے ہدیہ میں

Marfat.com

اس کو کالپی کی جاگیر بھی دیدی۔ لیکن ہمایوں کا کوئی فعل کامران کے دل کو نہ بدل سکا۔ بظاہر وہ ہمایوں کا وفادار تھا اور لاف زنی کرتا تھا کہ وہ تنہا ہی شیر خاں کو پامال کرنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن حقیقتہً اس ہرزہ گوئی میں کوئی بھی صداقت نہ تھی۔ یہ محض نام و نمود تھا۔ اسی اثنا میں کامران بیمار ہوگیا اور اس کو یہ شبہ ہوگیا کہ اس کو اس کے بڑے بھائی نے زہر دلوا دیا ہے۔ ہمایوں جیسے نیک طبع اور بھائی کی محبت کے دیوانے کے متعلق اس قسم کے شکوک دل میں پیدا کرنا کامران کی انتہائی ذلالت و کمینہ پن تھا۔

اسی اثنا میں یہ خبر موصول ہوئی کہ شیر شاہ گنگا کے مغرب میں آگیا ہے اور اپنے سب سے چھوٹے لڑکے قطب خان کی شہادت کا بدلہ لینے پر آمادہ ہے جب شیر خاں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمایوں نے ہر بھائی سے فوج فراہم کرنے کی درخواست کی تو کامران مرزا نے کوئی بھی فوجی امداد دینے سے صاف انکار کر دیا۔ مرزا حیدر جس کو کامران کے واقعات سے پوری واقفیت تھی لکھتا ہے:۔

"بادشاہ نے کامران مرزا سے زور دے کر یہ کہا کہ وہ اپنے کچھ سردار اور فوج بطور کمک کے یہاں چھوڑ دے۔ لیکن کامران نے اس کے خلاف ہی رویہ اختیار کیا۔ اس نے حتی الوسع جو لوگ کہ آگرہ میں تھے اُن کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ترغیب دی اور سنگدلی سے اپنی فوج کو چھوڑنے کی تجویز کو رد کر دیا۔ کامران نے نہایت بے حیائی سے سکندر مرزا کو مع اپنے ایک ہزار سپاہیوں کے بطور کمک چھوڑ دیا اور خود لاہور چل دیا۔

کچھ مورخین نے کامران مرزا کے اس نازک موقع پر لاہور چلے جانے اور اپنے بھائی کے ساتھ غیر موزوں سلوک کرنے کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ چغتائی اقتدار کے زوال اور شیر شاہ کے عروج کا سنگ بنیاد ہے۔ کچھ حضرات نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اگر یہ واقعہ سرزد نہ ہوتا تو شاید شیر شاہ ہمیشہ کے لیے تخت و تاج سے محروم رہتا لیکن یہ سب تخیل کی پرواز ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک کامران نہیں اگر ایسے درجنوں کامران بھی شیر شاہ کے خلاف آجاتے تو بھی شیر شاہ کو اس

Marfat.com

کے نصب العین سے باز رکھنا ناممکن تھا۔ ہاں ایسی صورت میں لڑائی طول ضرور پکڑ لیتی۔ کامران باوجود اس لاف زنی اور شیخی کے وقت آنے پر پنجاب کو بھی نہ بچا سکا۔ ۱۵۴۰ء کے افغان جوش و شجاعت میں ان افغانوں سے بالکل مختلف تھے جن کو مغلوں نے پانی پت کی لڑائی میں زیر کیا تھا۔ اس وقت ان کا سپہ سالار ابراہیم لودی نہ ہو کر شیر شاہ تھا۔ البتہ اسے مغلوں کی خوش نصیبی کہیے کہ عین وقت پر کامران مرزا دہلی سے چلا گیا جس سے وہ ایران کے صاحب اختیار شہنشاہ شاہ طہماسپ کے حملے سے کابل اور قندھار کو بچا سکا۔ ورنہ مغلوں کی حالت یہ ہوتی کہ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا، نہ تو ہندوستان میں ہی ان کی حکومت رہتی نہ دریائے سندھ کے پار شیر خاں سے بچنے کے لیے سر چھپانے کو جگہ ملتی۔

اس بات سے جنگ کی نوعیت و انجام پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ مغلوں نے کتنا قیمتی وقت تیاریوں میں ضائع کیا۔ ہمایوں ۱۵۴۰ء سے پیشتر میدان جنگ کے لیے نہیں جا سکتا تھا۔ کافی عظیم دشواریوں اور مشکلات کے باوجود ہمایوں نے شیر شاہ سے کہیں عظیم الشان فوج اکٹھی کر لی تھی۔ اس کے توپخانے کی طاقت کہیں زیادہ مہلک تھی۔ اس نے تجربہ کار افسر مقرر کیے سب انتظام کرنے کے بعد ہمایوں نے قنوج کی جانب کوچ کیا جہاں افغانوں نے اپنی فوج جمع کر رکھی تھی۔

جنگ بلگرام عرف جنگ گنگا

۱۷ مئی ۱۵۴۰ء

مغل فوج نے آگرہ سے مین پوری کے راستے ہوتے ہوئے گنگا پہنچنے کا سب سے چھوٹا راستہ اختیار کیا۔ یہ راستہ موجودہ فرخ آباد کے شمس آباد کے مقام سے گزرتا تھا۔ مغل فوج کی سب سے پہلی جھڑپ شیر شاہ سے بھوجپور

لے ایشوری پرشاد۔ ہمایوں ص ۱۳۹۔

Marfat.com

کے گھاٹ پر ہوتی۔ سولہویں صدی میں یہ کشتی کا گھاٹ گنگا کے مغربی کنارے پر تھا۔ لیکن اب دریا کے بہاؤ کے بدل جانے سے مشرقی کنارے پر ہو گیا ہے۔ اس زمانے میں اس گھاٹ کے ذریعہ بہت آمدورفت ہوتی تھی۔

آئین اکبری میں یہ مقام "سرکار قنوج" میں بتایا گیا ہے۔ موجودہ نقشہ میں یہ مقام فرخ آباد سے ۸ میل جنوب مشرق اور قنوج سے ۲۰ میل شمال مغرب میں ہے شیر شاہ نے پہلے ہی اپنی فوج گنگا کے اس پار ہٹالی تھی اور اس کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ قنوج کے مقام پر مغلوں کو اس وقت تک دریا پار کرنے نہیں دے گا جب تک ایسا کرنا فن حرب کے نقطۂ نظر سے اس کے لیے موافق نہ ہو۔ اس نے گنگا پر دستیاب سب کشتیوں کو پکڑ لیا تھا اور ان کو گنگا کے مشرقی کنارے پر جمع کر لیا تھا۔ شیر شاہ کی کشتیوں کا ایک بیڑہ متواتر دریا پر گشت لگا رہا تھا اور مغربی کنارے پر مقیم افغان فوج سے رابطہ بنائے ہوئے تھا۔ یہ بیڑہ ضلع اُناؤ کے بھوجپور سے لیکر بانگر مئو تک کے تمام گھاٹوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ شیر شاہ کو پہلے یہ امید تھی کہ ہمایوں سے اس کی مڈبھیڑ قنوج کے نزدیک کسی جگہ پر ہو گی۔ لیکن جب مغل فوج کی نقل و حرکت سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ اس کا ارادہ اوپر جانے کا ہے تو وہ جلدی سے بھوجپور گھاٹ پر آ گیا۔

شیر خاں ایک کثیر التعداد فوج لے کر گنگا کے اس جانب آ گیا۔

اعلیٰ حضرت نے اپنے قلیل فوجی دستہ کے ساتھ دریا پار کرنے کا ارادہ کیا کچھ ہی عرصہ میں بھوجپور کے گھاٹ پر ایک پُل تیار کیا گیا۔ ۱۵۰۰ جری حوصلہ نوجوان لڑائی کے لیے تیار ہو کر شیر کی مانند دریا میں کود پڑے اور اس پار پہنچ کر افغانوں کی بہت بڑی فوج کو تتر بتر کر دیا۔ افغان فوج کو پسپا کرنے کے بعد جب وہ اپنے صدر مقام کو واپس آ رہے تھے اور پل کے نزدیک پہنچے تو افغانوں نے اپنے لشکر کا ایک ہاتھی 'گرد باز'، جو چوسہ کی لڑائی میں غنیم کے ہاتھ لگ گیا تھا پُل توڑنے کے لیے بھیجدیا۔ ہاتھی نے پل کے سہاروں کو مسمار کر دیا عین اسی وقت شاہی توپخانے کے ایک گولے سے ہاتھی کے پیر کٹ گئے اور دشمن جو

Marfat.com

ہر چہار جانب سے دباؤ ڈال رہا تھا بھاگ کھڑا ہوا[1]۔

بھوجپور کے مقام پر زک اٹھا کر (حالانکہ ابوالفضل نے اسے ہمایوں کی فتح بتایا ہے) ہمایوں نے اپنا منصوبہ بدل دیا۔ اس کی فوج پر شیر شاہ کا خوف طاری تھا۔ اس کے سپاہی چوکنے ہو کر آہستہ آہستہ دریا کے کنارے چلنے لگے۔ ان کا ارادہ تھا کہ منزل بہ منزل قنوج پہونچ جائیں۔ راستہ میں غنیم کی کشتیاں نظر آئیں۔ شاہی توپخانے نے گولہ باری کی۔ چنانچہ غنیم کی ایک بڑی کشتی پارہ پارہ ہو گئی۔ قنوج کے نزدیک دونوں جانب کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل صف بستہ کھڑی رہیں۔ مغل لشکر کے پڑاؤ کے سامنے تو دریائے گنگا تھا اور اس کے عقب میں قنوج کا پرانا شہر تھا جہاں سے ان کو برابر فوج کے لیے رسد ملتی تھی۔ شہر قنوج جو کسی زمانے میں گنگا کے کنارے آباد تھا اس وقت وہ جانب مغرب ۵ میل دریا سے دور ہو گیا تھا۔

قنوج کے دوسری جانب مشرقی کنارے پر بلگرام[2] ہی ایک ایسا مقام تھا جس کو کہ افغان لڑائی کے لیے اپنا مرکز بنا سکتے تھے۔ یہ مقام بعد کے مہدی گھاٹ سے شمال مشرق میں سیدھے ۶ میل تھا۔ مشہور مہدی گھاٹ بلگرام کی جانب گنگا کے کنارے پر ہے اور قنوج سے شمال مشرق ۶ میل کے

---

[1] اکبر نامہ جلد ۱ صفحہ ۳۴۹-۳۵۰) اس بیان سے ابوالفضل کی ناتجربہ کاری اور لاعلمی ظاہر ہوتی ہے۔ اس نے ہمایوں کی شکست کو فتح میں بدلنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اگر مٹی تیار تھا تو گھوڑ سوار حملہ آوروں نے دریا کود کر کیوں پار کیا؟ یہ محض ابوالفضل کی مبالغہ آمیزی ہے کہ ۱۵۰ مغل سواروں نے افغان فوج کو تتر بتر کر دیا۔

[2] بابر لکھتا ہے "مغرب سے آتے ہوئے ہم قنوج سے گزرے اور گنگا کے مغربی کنارے پر پہنچے پڑاؤ ڈالا"۔ (فروری ۱۵۲۸ء) تزک صفحہ ۵۹۹۔ بقول ابوالفضل ہمایوں شمال کی - - - - - - - - - - - - جانب سے آیا اور دریا کے کنارے کنارے قنوج تک پہنچا وہ قنوج سے آگے نہیں بڑھا۔

[3] آئین اکبری جلد ۲ صفحہ ۱۶۸-۱۶۹۔ بلگرام میں ایک اینٹوں کا قلعہ تھا اور ہردوئی کا محال دونوں لکھنؤ کی سرکار میں تھا۔

Marfat.com

فاصلے پر ہے۔ ابوالفضل کے بیان سے ظاہر ہے کہ بھوجپور سے قنوج کے سامنے تک افغان فوج مع دریائی بیڑہ ہمایوں کی فوج کے متوازی آگے بڑھ رہی تھی۔ شیر شاہ نے اپنے کیمپ سے جو غالباً مہدی گھاٹ کے نزدیک کہیں رہا ہوگا۔ شاہی فوج کو ایک ماہ تک روکے رکھا۔ نہ تو ہمایوں اور نہ شیر شاہ گنگا کو پار کرنے کے لیے تیار تھا دونوں فریقین میں سے کوئی یہ نہیں چاہتا تھا کہ بوقت جنگ دریا ان کی پشت پر ہو۔ لہٰذا دونوں اس بات کے منتظر تھے کہ پہلے کون دریا پار کر کے لڑائی شروع کرتا ہے۔ ابتدا میں شیر شاہ نے یہ کوشش کی کہ وہ ہمایوں کو دریا پار کرنے سے روکے کیونکہ اس وقت وہ خواص خاں کی فوج کا جو پالامتو کے چیرو لوگوں کی سرکوبی میں مصروف تھا، انتظار کر رہا تھا۔ بعد میں جب ہمایوں نے دریا پر پل بنانے کی کوشش کی تو شیر شاہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اس کی غالباً کیا وجہ ہو سکتی تھی؛ عباس نے اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے:۔

جب شیر شاہ کو یہ علم ہو گیا کہ خواص خاں کی فوج نزدیک آگئی ہے تو اس نے اپنے ایک وکیل کے ذریعۂ بادشاہ کے پاس یہ پیغام بھیجا "اعلیٰ حضرت کی مرضی پر منحصر ہے کہ یہ طے کر لیا جائے کہ آیا میں گنگا پار کر کے لڑائی لڑوں یا میں گھاٹ کا راستہ چھوڑ دوں تاکہ شاہی فوج گنگا پار کرے" بادشاہ نے بذریعہ وکیل خبر دی کہ شیر شاہ کو گھاٹ کا راستہ چھوڑ دینا چاہیے تاکہ شاہی فوج دریا پار کر کے لڑائی کا بگل بجا دے۔ شیر شاہ گھاٹ کو چھوڑ کر کئی کوس پیچھے ہٹ گیا بادشاہ نے گنگا پر پل بنا لیا اور دریا پار کر لیا۔ (عباس صفحہ ۱۷۷-۱۷۹)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شیر خاں نے اپنی مرضی سے گھاٹ چھوڑا اور ہمایوں کے دریا پار کرنے میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی لیکن جن الفاظ میں عباس نے شیر خاں کا تمکنت آمیز پیغام بادشاہ کی خدمت میں بھیجا ہے وہ ضرور مشتبہ ہے۔ جن واقعات و حالات سے مجبور ہو کر ہمایوں نے گنگا پار کی وہ بالکل مختلف قسم کے تھے اور شیر خاں کے گھاٹ سے ہٹنے کی وجہ کوئی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی جانبازی نہیں ہو سکتی

Marfat.com

ممکن ہے اس کو یہ علم ہو گیا ہو کہ مغل لشکر میں بہت بڑی تعداد میں بھگدڑ مچ گئی ہے اور ہمایوں دریا پار کرنے میں تامل کر رہا ہے اس لیے اس نے ہمایوں کو دریا پار کرنے کی ترغیب دی ہو۔ تاکہ وہ اپنی حسب مرضی مناسب موقع ملنے پر جب اور جہاں چاہے حملہ کر سکے۔ بقول عباس اس نے اپنا پڑاؤ کئی میل پیچھے ہٹا لیا۔ اب وہ بلگرام کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہاں اس نے حسبِ معمول اپنے لشکر کے چاروں طرف خندق کھودی اور اس کو قلعہ بند کر لیا۔ خندقوں کی پشت پر اس نے اپنا توپخانہ

اور توپچی مقرر کر دیے۔ تاکہ وہ ہر وقت لڑائی کے لیے کمربستہ رہیں۔ اس اثنا میں ہمایوں کی فوج میں بڑے پیمانے پر بھگدڑ مچ گئی۔ اس کی فوج کی تعداد کم ہونے لگی۔ یہ بات سچ ہے یا جھوٹ کہ محمد سلطان مرزا اور اس کے لڑکے شیر شاہ کی ایما سے ہمایوں کا ساتھ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے لڑائی میں شیر شاہ کا ساتھ نہیں دیا اور بہت دنوں تک کابل میں ہمایوں کی خدمت کرتے رہے اور بعد میں اکبر کے لیے دردِ سر بنے۔ اس واقعہ کو سپاہی مورخ مرزا حیدر نے جو لڑائی کے وقت بذات خود موجود تھا وضاحت سے بیان کیا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"شاہی فوج گنگا کے کنارے جیسے تیسے پہنچ گئی اور وہاں اس نے ڈیرہ ڈال دیا۔ ایک مہینہ تک دونوں فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل جمی رہیں۔ شہنشاہ دریا کی جانب اس طرف، افغان فوج دریا کی جانب اُس طرف۔ دونوں طرف دو دو لاکھ سے زیادہ فوج تھی محمد سلطان مرزا (جو پہلے بھی ایک مرتبہ بغاوت کر چکا تھا اور معاف کر دیا گیا تھا) شیر شاہ کی سازش سے ہمایوں کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس سے ایک نیا راستہ کھُل گیا۔ ہر کوئی فوج سے بھاگنے کی سوچنے لگا طرفہ یہ تھا کہ جو بھاگتے تھے شیر شاہ سے جا کر نہیں ملتے تھے۔ چونکہ انھیں اس سے کسی صلہ کی اُمید نہ تھی۔ تمام فوج میں ایک انتشار کی لہر دوڑ گئی۔ ہر ایک کی زبان پر یہی ایک کلمہ تھا۔ "اپنے وطن لوٹ چلو اور آرام کرو"، کامران کی

Marfat.com

امدادی فوج کے کتنے ہی سپاہی ہمایوں کا ساتھ چھوڑ کر لاہور بھاگ گئے ایسی حالت میں جب کہ فوج میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی یہی مناسب معلوم ہوا کہ بغیر لڑے ہوتے برباد ہونے سے یہ بہتر ہوگا کہ دشمن سے مورچہ لے لیا جائے۔ دوسرا خیال یہ تھا کہ اگر دریا پار کر لیا جائے تو شاید بھگوڑاپن کچھ کم ہو جائے اس لیے ہم نے دریا پار کر لیا۔ دونوں طرف کی فوجوں نے مورچہ بنا لیا۔ روزانہ جوشیلے سپاہیوں میں جھڑپیں ہونے لگیں لیکن مانسون شروع ہوتے ہی یہ سب کارروائی بند ہو گئی۔ مغل پڑاؤ کا مقام بارش سے بھر گیا اور وہاں کیمپ کا رہنا دو بھر ہو گیا۔ چنانچہ اب تجویز یہ ہوئی کہ پڑاؤ کسی اونچی جگہ پر منتقل کیا جائے جہاں کہ سیلاب نہ پہنچ سکے۔ یہ جگہ دشمن کے سامنے تھی

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ہمایوں نے گنگا پار کر کے پہلے گنگا کے کچھار یعنی کھادر کے سپاٹ مسطح میدان میں ڈیرہ ڈالا تھا جہاں بارش میں سیلاب آجاتا تھا۔ یہ جگہ موجودہ گھاٹ سے بلگرام کی جانب ۳ میل سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ چونکہ ہمایوں نے اپریل ۱۵۴۰ء کے آخر میں اپنے ڈیرے یہاں لگائے تھے گنگا میں سالانہ سیلاب آنے کا جلدی کوئی امکان نہ تھا۔ اس پڑاؤ سے گنگا تک آسانی سے پہنچا جا سکتا تھا۔ دریا پار کرنے کے لیے جو پل بنایا گیا تھا وہ مضبوط اور سالم رہا۔ مغل کیمپ کے بائیں جانب ایک چھوٹا سا نالہ تھا۔ جیسا کہ مرزا حیدر نے گنگا کی لڑائی میں ذکر کیا ہے۔ فوج کے سامنے خندق کھودی گئی۔ توپخانہ کی گاڑیوں کو اپنی جگہ مسلط کیا گیا اور مورچے بنا دیے گئے ۳۔ مختصر یہ کہ ہمایوں نے شیر شاہ کے خلاف جنگ کرنے کے لیے وہی طرز اختیار کیا جو بابر نے ابراہیم لودی کے خلاف پانی پت کے میدان میں کیا تھا۔ اس کا نیا فوجی پڑاؤ شیر خاں کو حملہ کی تحریک دینے کے لیے ایک چال تھی۔ اس کے سامنے خندق تھی اور پشت پر گنگا تھی۔ بائیں طرف دوسرا نالہ تھا اور توپخانہ جگہ بہ جگہ نصب تھا۔ پانی پت کے میدان جنگ میں درویش محمد سروانی نے جو بات بابر سے کہی تھی بجنسہٖ وہی بات مرزا

Marfat.com

حیدر بابر کے فرزند ارجمند سے کہہ سکتا تھا "اتنی تیاریوں اور احتیاط کے بعد غلیم یہاں تک آنے کی ہمت کیسے کرسکتا ہے[1]"۔ لیکن آخر میں وہ ہوا جس کی مغلوں کو اُمید نہ تھی۔ شاید علم نجوم کے دلدادہ ہمایوں کا ستارہ ہی گردش میں تھا۔ ۱۶ رمئی ۱۵۴۰ء کو بادِ سموم اور گرد کے طوفان کے بعد از قبل از وقت بارش شروع ہو گئی[2] اور مغلوں کی چھاؤنی سیلاب کی زد میں آ گئی۔ چنانچہ ہمایوں وہاں سے اپنا پڑاؤ اونچی جگہ منتقل کرنے کو مجبور ہو گیا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ فوج کو دوسری جگہ کیسے منتقل کیا جائے یہ کام تب تک آسان نہیں تھا جب تک کہ غنیم کے ارادوں کا پتہ نہ چلے اور یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ اس کام میں کوئی رخنہ اندازی نہ کرے گا۔ کیوں کہ غنیم کی فوج سامنے ہی کمربستہ اور صف آرا تھی۔ چنانچہ مرزا حیدر نے اس موقع پر ایک تجویز پیش کی جس کو سب نے تسلیم کیا۔ تجویز یہ تھی کہ ہمارے لیے مناسب یہ ہوگا کہ ہم توپوں اور زرکھیلوں کو سامنے جمائیں اور تقریباً پانچ ہزار بندوقچی توپوں کے ساتھ کھڑے ہوں۔ اگر شیر خاں حملہ کرنے کے لیے باہر آ جاتے تو اس مقام سے بہتر جگہ توپوں کے لیے نہیں ہو سکتی اگر وہ مورچوں کے اندر ہی رہتا ہے تو ہم دوپہر تک اسی طرح جمے رہیں گے اور پھر اپنے مقام پر لوٹ آئیں گے۔ دوسرے روز بھی ہم ایسا ہی کریں گے۔ تب آگے آگے ہمارا سامان جائے گا ہم اس کے پیچھے پیچھے

---

[1] تزک، صفحہ ۴۷۔ [2] عجیب بات یہ ہے کہ ابوالفضل جو ہندوستان کے موسم اور علم نجوم سے بخوبی واقف تھا لکھتا ہے: "اس وقت خط سرطان پر پہنچگیا اور بارش شروع ہو گئی۔ (اکبر نامہ۔ ۱، صفحہ ۳۰۱) یہ شمالی ہندوستان میں مئی کا وسط ہے۔ مخزن نے تاریخ نظامی سے نقل کیا ہے اور تاریخ نظامی نے ابوالفضل سے نقل کیا ہے۔ ہمایوں کی شکست کا باعث سورج کا خط سرطان پر پہنچنا تھا۔ ہندی مہینے کے حساب سے ساون کا مہینہ تھا جو ہر سال کا پہلا مہینہ ہوتا ہے۔ پہلے ہی دن اس قدر زور سے بارش ہوئی اس کو مانسون سے پہلے کی بارش نہیں کہہ سکتے۔ (مسودہ صفحہ ۲۹)

Marfat.com

ہوں اور اس مقام پر جا کر جم جائیں گے[1] بلاشبہ یہ منصوبہ نہایت ہی دانشمندانہ نہ تھا لیکن غیر متوقع واقعات نے اس پر پانی پھیر دیا اور گنگا کے اس پار مغلوں کو کل دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

جہاں تک ہم مرزا حیدر کے بیان سے میدان جنگ میں مغلوں کی صف آرائی و ترتیب و تنظیم کا اندازہ لگا سکتے ہیں وہ اس طرح کا تھا ہمایوں خود فوج کے قلب میں ایک ممتاز جگہ کھڑا تھا۔ مرزا حیدر چار صد چیدہ سپاہیوں کے ساتھ جس میں سے ۵۰ زرہ بکتر سے مسلح تھے بادشاہ کے بائیں طرف تھا (یعنی قلب کے بائیں جانب تھا، تمام فوج کے بائیں جانب نہیں) مرزا کا داہنا بازو بادشاہ کے بائیں بازو پر تھا۔ مرزا حیدر کے بائیں جانب ۲۷ امیروں کا مجمع تھا۔ سب کے پاس اعزازی طوغ تھے اس کے پیچھے چھوٹے نالے کے پاس (نہ کہ گنگا کے) بایاں لڑائی کے لیے تیار کھڑا تھا۔ مرزا حیدر دائیں بائیں اور سامنے کے سپہ سالاروں کے بارے میں خاموش ہے اس کا علم ہمیں دوسرے ذرائع سے دستیاب ہوتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں ابوالفضل کی رائے سے اتفاق کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس نے لکھا ہے "مرزا ہندال، یادگار ناصر مرزا اور مرزا عسکری بالترتیب سامنے دائیں اور بائیں بازو پر تھے۔ مرزا ہندال نے اپنے بیان میں تلمہ دستہ کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے نہ کہیں لڑائی کے وقت اس دستہ کی کوئی کارروائی سامنے آئی۔ تلمہ دستوں کے بغیر ہمایوں کی فوج اس عقاب کی مانند دکھائی پڑتی تھی جس کے پنکھ کاٹ لیے گئے ہوں۔

دوسری طرف افغان لشکر کی تنظیم پر نظر ڈالیے۔ شیر شاہ اپنے مورچہ سے صرف ۱۵ ہزار گھوڑ سوار لے کر میدان میں آیا۔ قریب قریب اتنے ہی فاضل گھوڑ سوار اس نے اپنے مورچہ کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیے۔

---

[1] تاریخ رشیدی

Marfat.com

مورچے میں اس نے اپنا توپخانہ، ہاتھی، پیادہ فوج اور رسامان سب کچھ
لیس و خبردار رکھا۔ شیر شاہ کے پاس جتنے فوجی افسر و سردار تھے۔ ان کا
کام تھا اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کرنا اور جنگ کرنا۔ بحث و مباحثہ، حجت و دلیل
سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ افغانوں کو میدان جنگ میں شیر شاہ کی
صلاحیت پر اعتماد کلی تھا۔ چنانچہ انھوں نے فتح کی کامل امید کے ساتھ
مغل فوج پر دھاوا بول دیا۔ شیر شاہ کو خوب تجربہ تھا کہ میدانِ کارزار
میں جوشیلی تقریریں کتنا اثر رکھتی ہیں۔ ہمیں اس طویل تقریر کا ترجمہ
پیش کرنے کی ضرورت نہیں جو بقول عباس شیر شاہ نے اپنے سپاہیوں
اور سرداروں کے سامنے کی تھی۔

مرزا حیدر اور عباس کے بیان میں اختلاف ہونے کی وجہ سے
ہمیں صحیح طور پر معلوم نہیں ہوسکتا ہے کہ میدان جنگ میں شیر کی فوج نے
کس طرح صف آرائی کی۔ بظاہر اس باب میں شیر خاں کے پاس کتنی فوج تھی
اور اس کو میدان جنگ میں کس طرح ترتیب دی گئی۔ مرزا حیدر کا بیان
زیادہ معتبر ہے۔ کیونکہ وہ چشم دید گواہ ہے وہ لکھتا ہے :-
شیر خاں ایک ہزار سپاہیوں[1] کے ۵ ڈویژن لے کر آیا۔ اس کے

---

[1] اس حساب میں ذرا غلطی معلوم ہوتی ہے۔ شاید فوج کے ہر ڈویژن میں دو ہزار سپاہی تھے۔ اس طرح کل دس ہزار ہوتے ہیں۔ تین ہزار فوج جلو میں تھی۔ کلا ملا کر ۱۳ ہزار کا حساب ہوتا ہے۔ یہ مرزا حیدر کے اندازے سے قریب قریب ملتا ہے۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے بیان کے مطابق ہر ڈویژن ایک ہزار کا لگایا جائے تو کل ۵ ہزار سپاہی ہوتے ہیں اور تین ہزار جلو میں۔ کل ملا کر ۸ ہزار ہوتے ہیں۔ اس حساب سے ۵ ہزار کم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بیان کے مطابق فوج کی تنظیم حسب معمول دائیں، بائیں، قلب، میمنہ میسرہ اور فاضل کی شکل میں کی گئی تھی (ہمایوں ص ۱۴۶) لیکن فوج کی تنظیم کا یہ طریقہ مغلوں میں مروج تھا افغانوں میں نہیں تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شیر شاہ نے اپنی ۸ ہزار فوج کی تنظیم اس طریقہ سے کی ہو اس میں اتنی گہرائی نہ ہو کہ وہ مغلوں کے ۴۰ ہزار رسالہ کے حملہ کو برداشت کر سکے۔ قلب کی پشت پر جو فاضل فوج لگی ہوئی تھی اس کو مرزا حیدر نے نہیں دیکھا ہوگا۔ لہٰذا اس کے اندازہ شمار

Marfat.com

جلو میں تین ہزار فوج تھی۔ کل فوج ۱۵ ہزار سے کم ہو گی۔ چغتائی فوج کا اندازہ ۴۰ ہزار ہو گا سب کے سب گھوڑوں پر سوار تھے۔ زرہ پہنے ہوتے تھے۔ وہ سمندری لہروں کی طرح آگے بڑھ رہے تھے۔ عباس نے افغان فوج کی تنظیم ان کے پرانے طریقے دایاں بازو، بایاں بازو اور قلب کے مطابق دکھائی ہے اور سرداروں کا حوالہ اس طرح دیا ہے:

شیر خاں ہیبت خاں نیازی کے ساتھ جس کو بعد میں اعظم ہمایوں کا خطاب ملا تھا قلب میں تھا۔ دائیں بازو پر جلال خاں اور دوسرے سردار تھے۔ بائیں بازو کی کمان شیر شاہ کا بڑا لڑکا عادل خاں، قطب خاں نائب[1] برہم جیت گوڑ، رائے حسین جلوانی وغیرہ کے ہاتھ میں تھی۔ فوج کے جلو میں تین ہزار جری جوان تھے جو کہ خواص خاں[2] کی کمان میں تھے۔ شیر شاہ نے ہر سپہ سالار کو اپنی اپنی فوج

میں لے سے شامل نہیں کرنا چاہیے۔ افغان فوج میں میمنہ میسرہ تو تھے ہی نہیں اور نہ کبھی حرکت میں آتے۔ علاوہ بریں یہ خیال کہ شیر شاہ کی ۸ ہزار فوج نے مغلوں کی ۴۰ ہزار فوج کو پسپا کر دیا بعید از عقل و قیاس ہے۔ ہمایوں کی فوج کا ایک بازو بائیں جانب نالہ تک پھیلا ہوا تھا اور دوسرا بازو مغل چھاؤنی کی خندقوں تک تھا۔ اتنی وسیع فوج کو ہرانا ایک ایسا کرشمہ تھا جو مراٹھن کی جنگ کے تجربہ کار قابل سپہ سالار ملٹیاڈیز کے لیے بھی ناممکن تھا۔ ڈاکٹر ایس کے۔ بنرجی نے شیر شاہ کی فوج کو ۷ ڈویژن میں منقسم کیا ہے (ہمایوں بادشاہ جلد اصفحہ ۲۴۳۔۲۴۴) اس کی تفصیل کیلئے دیکھیے گا اس باب کا ضمیمہ ۲

[1] پروفیسر ہودی والا نے قطب خاں کے عرف کے متعلق ایک علیحدہ نوٹ لکھا ہے۔ بنیت نائب، نامب وغیرہ عرف کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کی رائے میں نائب عرف زیادہ موزوں و درست ہے (دیکھیے اسٹڈیز صفحہ ۵۰۴) میری رائے میں ان کا خیال درست ہے اس لیے میں نے بھی لفظ نائب استعمال کیا ہے اور "شیر شاہ" میں لکھے لفظ بنیت کو رد کر دیا ہے۔

[2] عباس خاں نے یہ نہیں لکھا کہ خواص خاں کس جگہ پر تعینات کیا گیا تھا۔ غالباً وہ (باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ــــ سے آگے) فوج کے سامنے کے حصے میں تھا۔ عباس نے لکھا ہے کہ خواص خاں نے ہمایوں کا بادشاہ کا کام ختم کر دیا خواص خاں کے کارنامے کا یہ ٹھیک جائزہ ہے۔ اس نے پہلے ہمایوں کے دائیں بازو پر حملہ کیا تھا۔ شیر خاں کا بایاں بازو اس کی مدد پر تھا۔ یہی حملہ فیصلہ کن ثابت ہوا۔

Marfat.com

کے ساتھ رہنے کا حکم دیا۔ جب سپہ سالار اپنی اپنی جگہ کھڑے ہوگئے تو شیر خاں نے صفوف جنگ کا معائنہ کیا اور باری باری سے ہر فوجی دستہ کو" خدا حافظ " کہا۔

مرزا حیدر نے " گنگا کی لڑائی " کا ذکر مندرجہ الفاظ میں کیا ہے۔ یہ لڑائی بلگرام کے قرب وجوار میں لڑی گئی تھی۔ یہ مقام یو۔پی کے موجودہ ہردوئی ضلع کی ایک تحصیل ہے۔

" ۱۰ محرم ۹۴۷ ہجری مطابق ۱۷ مئی ۱۵۴۰ء ہم نے فوج کی صف بندی کی۔ گاڑیاں، منجنیق توپخانہ اور چھوٹی بندوقیں قلب میں رکھی گئیں۔ توپخانہ کی کمان محمد خاں رومی، احمد رومی، حسنین خلیفہ اور استاد علی کے لڑکوں کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے توپخانہ اور گاڑیوں کو مناسب مقام پر جما دیا انھیں آپس میں زنجیروں سے باندھ دیا۔ دوسرے دستوں کے سپہ سالار کوئی تجربکار سربرآوردہ لوگ نہ تھے۔ وہ محض نام کے امیر تھے۔ انھوں نے ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن ان میں اس زمانہ جیسی عاقبت اندیشی، علمی قابلیت، فیاضی دریا دلی، دماغی تمکنت اور وقار نام کو نہ تھا۔"

شہنشاہ نے اس کتاب کے مصنّف کو اپنے بائیں بازو پر تعینات کیا تھا جب شیر شاہ کی فوج مورچہ سے باہر آئی تو فوج کے دو ڈویژن جو چار ڈویژن کے برابر معلوم ہوتے تھے اس مقام پر کھڑے ہوگئے اور تین ڈویژن نے دشمن پر حملہ شروع کر دیا۔ اپنی جانب میں فوج کے قلب کو اس مقام پر لے جا رہا تھا جو میں نے لڑائی کے لیے چنا تھا۔ لیکن جب ہم اس جگہ پہنچے تو ہم اس مقام پر قبضہ نہ کر سکے۔ کیوں کہ چغتائی فوج کا ہر امیر و وزیر خواہ وہ غریب تھا یا امیر اپنے ساتھ غلام رکھتا تھا اگر امیر کے پاس سو لڑاکو سپاہی تھے تو کم از کم ۵۰۰ خدام اور غلاموں کی بھیڑ تھی۔ یہ خدام و غلام بروز جنگ اپنے آقا کی کوئی مدد نہیں کرتے تھے بلکہ خود قابو سے باہر ہو جاتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جہاں کہیں لڑائی ہوتی یہ بھیڑ قابو سے باہر ہوگئی۔ جب ان کے آقا میدان جنگ میں مارے گئے تو ان پر خوف و انتشار طاری ہوگیا اور وہ خوف زدہ

Marfat.com

ہو کر بے سوچے سمجھے ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ مختصر یہ کہ میدان جنگ میں جم کر لڑائی نہ ہو سکی۔ انھوں نے پشت کو دبانا شروع کیا۔ انھوں نے فوج کے قلب کو ان زنجیروں پر دھکیل دیا جو کہ توپخانہ کی گاڑیوں میں کھنچی ہوئی تھی۔ آپس میں خوب ٹکر ہونے لگی۔ پیچھے والے لوگوں نے سامنے والوں کو اتنے زور سے دھکا دیا کہ زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ جن لوگوں کو زنجیروں کے پاس رہنے کا حکم دیا گیا تھا وہ ان سے آگے نکل گئے۔ فوج کے قلب کی یہ حالت تھی۔ دائیں جانب شیر خاں صف بندی کے ساتھ آگے بڑھا لیکن ابھی اس کی کمان سے ایک تیر بھی نہ نکلا تھا کہ غلاموں میں ایسی بھگدڑ مچ گئی جیسے کہ ہوا کے سامنے بھوسہ اُڑ جاتا ہے۔ غلام صفیں توڑ توڑ کر قلب کی طرف بڑھ چلے۔ جن غلاموں کو سپہ سالاروں نے سامنے کی صفوں میں تعینات کیا تھا وہ ان ہی کی جانب دوڑنے لگے اور اس طرح فوج کی پوری ترتیب درہم برہم و منتشر ہو گئی۔ قصہ کوتاہ میر کارواں سے جدا ہو گیا اور کارواں اپنے میر سے علیحدہ۔ جب فوج کے قلب میں بدنظمی پھیل گئی تو دائیں بازو سے بھاگ کر آنے والے سپاہی بھی اس میں شامل ہو گئے اور صورتِ حال کو زیادہ ابتر کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کے کمان سے ایک تیر بھی نہ نکلا تھا کہ مغل فوج تتر بتر ہو گئی میں نے غلاموں اور شاگرد پیشہ لوگوں کو چھوڑ کر چغتائی فوج کا اندازہ ۴۰ ہزار لگایا تھا۔ وہ دس ہزار افغان فوج کے سامنے بھاگ کھڑی ہوئی۔ میدان جنگ میں شیر شاہ کو فتح نصیب ہوئی اور مغلوں کو شکست۔ نہ کسی دوست کو ضرر پہنچا نہ کسی دشمن کو زخم۔ نہ توپخانہ کام آیا نہ رتھ۔

جب چغتائی فوج بھاگ کھڑی ہوئی تو ان کے اور گنگا کے درمیان غالباً ایک فرسنگ یا کوس کا فاصلہ رہا ہو گا جملہ امیر و سردار سلامتی جان کے لیے دریا کی طرف بھاگے۔ ان میں سے کسی کے بدن پر ایک بھی زخم نہ تھا۔ غنیم نے تعاقب کیا۔ جب ہم دریا کے اس پار پہنچے تو اعلیٰ حضرت جن کی خدمت میں اس روز وقت دوپہر ۱۷ ہزار خدمت گار تھے اب برہنہ سر برہنہ پا محض ایک گھوڑے پر سوار تھے اور یہ گھوڑا بھی تردی بیگ نے بادشاہ کو دیا تھا۔ ایک

Marfat.com

ہزار خدام اور مصاحبوں میں سے صرف آٹھ آدمی دریا سے باہر نکل پاتے تھے باقی کے لیے ردا، آب کفن کی چادر بن گئی۔ اس واقعہ سے اس جنگ کے نقصان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔[1] (تاریخ رشیدی صفحہ ۴۷۲-۴۷۷)

ایک کھلاڑی کی بہ نسبت ایک تماش بین کھیل کا زیادہ مناسب جائزہ لے سکتا ہے۔ چنانچہ مرزا حیدر کے شرح و مفصل بیان میں ویسی ہی خامی ہے جیسی کہ ایک ہاری ہوئی ٹیم کے سنٹر فارورڈ کے طرز بیان میں ہو سکتی ہے اس کے مقابلے میں ایک غیر جانبدار ماہر کی سرسری تفسیر زیادہ موزوں اور قابلِ اعتبار ہوتی ہے۔ مرزا حیدر کے بیان میں شروع سے آخر تک یاس و حزن کی جھلک دکھائی پڑتی ہے۔ وہ مرزا عسکری، مرزا ہندال اور ان کے عم بزرگوار ناصر مرزا جنھوں نے افغانوں اور گجراتیوں کے خلاف یورش میں نام کمایا تھا کے سپاہیانہ اوصاف کی مذمت کرتا ہے۔ مرزا حیدر کے میسرہ کے ۲۷ امیروں کے ساتھ صریحاً زیادتی کی ہے۔ یہ سب مرزا عسکری کی کمان میں تھے اور انھوں نے مرزا ہندال کی امداد سے شیر خاں کے میمنہ کو جو اس کے تیز دم دوسرے لڑکے جلال خاں کی کمان میں تھا پیچھے ہٹا کر درہم برہم کر دیا تھا۔ عباس اس کا شاہد ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جوں ہی مرزا حیدر اپنی فوجیں لے کر آگے بڑھا تو وہ نئے مقام کو گرفت میں کرنے کے خیال میں اتنا ڈوب گیا کہ اسے باقی میدانِ جنگ کی صورت حال کا اندازہ کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ چنانچہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جہاں تک فریقین کے قلب کا واسطہ ہے کسی بھی فرد کو دشمن خواہ دوست ایک خراش بھی نہ لگی ہو کیونکہ ان کو معرکہ آرائی کا موقع ہی ہاتھ نہ لگا تھا لیکن میمنہ اور میسرہ کے متعلق ایسا

---

[1] اس لڑائی کو ہم بلگرام کی لڑائی کہہ سکتے ہیں۔ نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑائی چھوٹا گرہ اور گنگا کے درمیان کے خطہ میں ہوئی تھی۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ گنگا کے موجودہ مشرقی کنارے سے کتنے فاصلہ پر ہوئی۔ کیوں کہ گزشتہ ۳۸۰ سال میں قنوج کے پاس دریائے گنگا نے اپنے بہاؤ کو مشرق کی جانب کافی بدل دیا ہے۔ یہ واقعہ کہ ہمایوں کے خیمے سیلاب کی زد میں آ گئے تھے ثابت کرتا ہے کہ ہمایوں کی فوج گنگا کے کچھار یعنی نشیبی علاقہ میں خیمہ زن تھی۔ جو دریا کے بہاؤ کے بدلنے سے ظہور میں آیا ہوگا۔

Marfat.com

خیال درست نہیں ہے۔ ان میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ اگرچہ تھوڑی ہی دیر کے لیے ہوئی ہو۔ یہ کہنا کہ جنگ میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرا غلط بیانی ہوگا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ گنگا نے بمقابلہ تعاقب کرنے والے افغانوں کی تلوار کے زیادہ مغل سپاہیوں کی جان لی۔

پھر بھی مرزا حیدر اور افغانوں کے بیان جنگ میں چنداں اختلاف نہیں ہے۔[1] شیر خاں نے جو تین ڈویژن حملہ کے لیے میدانِ جنگ میں بھیجے تھے وہ تھے میمنہ جلال خاں کے کمان میں میسرہ عادل خاں کے کمان میں اور ہراول خواص خاں کے کمان میں۔ مرزا ہندال کے کمان میں مغل ہراول تھا۔ اس نے غلطی یہ کی کہ بجائے اس کے کہ غنیم کے ہراول پر نگہداشت رکھ کر اور اُسے اُلجھا کر اس کی پیش قدمی کو روک دے وہ خم کھا کر جب جلال خاں کے میانہ پر چوٹ کرنے چلا تو وہ خواص خاں کی اردب میں آ گیا۔ جلال خاں اس وقت مرزا عسکری کے کمان میں میسرہ پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ اگرچہ فوری اثر اس چال کا یہ ہوا کہ بلاشبہ افغان میمنہ ہار کھا کر درہم برہم ہو گیا۔ مگر فتحیاب مغل میسرہ جو کہ مرزا ہندال کے کمان میں تھا موقع سے فائدہ نہ اُٹھا پایا اور وہ شیر خاں کے قلب پر جو کہ بے پناہ تھا حملہ آور نہ ہوا۔ تب تک مغل قلب تو اتنے فاصلے پر ہو گیا تھا کہ اس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ شیر خاں کے جلو سے برسر کارزار ہو سکے۔ مرزا ہندال اپنی پرانی جگہ پر اس خوف سے واپس نہ آ سکتا تھا مبادا شیر خاں مزاحمت کر دے۔ مرزا ہندال کی اس غلطی کا خواص خاں نے پورا فائدہ اُٹھا کر دشمن کے کمزور ترین حصہ پر حملہ کر دیا۔ یہ حصہ

---

[1] مخزن کا بیان ہے کہ اس اثنا میں جب کہ شاہی فوج اپنی پہلی جگہ چھوڑ کر نئی جگہ پر خیمہ لگانے اور اسباب لے جانے میں مصروف تھی کسی کو بھی اس روز جنگ کی اُمید نہ تھی شیر خاں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اپنی فوج کو جنگ کے لیے لیس کیا اور مکمل طور پر مسلح ہو کر مغل فوج پر دھاوا بول دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغل فوج بغیر لڑائی کے ہی ہار گئی (دیکھیے مخزن صفحہ ۲۹-۳۰)

Marfat.com

تھا یادگار ناصر مرزا کے بازو کا انتہائی کنارہ جو کہ مغلوں کے عقب کا تحفظ کر رہا تھا۔ وہ غلاموں اور خدمت گاروں پر آندھی کی طرح ٹوٹ پڑا اور دم زدن میں ان کو سنگریزوں کے مانند بکھیر دیا۔ بچاؤ کے مقصد سے یہ لوگ مغل میمنہ اور میسرہ کی طرف بھاگے۔ اس طرح کی بھگدڑ سے مغل میمنہ کی نقل و حرکت شل ہو گئی اور اس کو اپنے ہی بھگوڑوں کے دل بادلوں کے دباؤ سے اپنے قلب پر جھکنا پڑا نہ کہ غنیم کے میسرہ پر حملہ کی جھونک کی وجہ سے۔ اس طرح مغلوں کا رسالہ جو کہ قلب میں تھا نہ تو آگے قدم اٹھا سکتا تھا اور نہ بازو کی طرف مڑ سکتا تھا۔ نہ توپخانہ ہی گولہ باری کر سکتا تھا کیوں کہ دشمن تو بالمقابل تھا نہیں۔ بلکہ اپنے ہی مفرور سپاہیوں کا ہجوم تھا جو ان زنجیروں پر ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ اس پرآشوب گھڑی کو غنیمت سمجھ کر شیر خاں بذاتِ خود مغل میسرہ پر حملہ آور ہوا۔ اس کی یہ چال فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ مغل میسرہ اپنے مقام سے کھدیڑ دیا گیا اور وہ بھی بے چارے قلب پر آپڑے۔ اس وجہ سے مرزا حیدر نے میسرہ کے امیروں پر لعنت ملامت کی ہے چنانچہ مغل قلب بے کار ہو گیا۔ افغانوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے ہی شکستہ بازوؤں میمنہ اور میسرہ کے دباؤ سے اور غیر جنگ جو غلام اور خدمتگاروں کے اژدہام سے۔

مغل فوج کی میدان جنگ میں صف آرائی و ترتیب پر کسی قسم کی نکتہ چینی کرنا بے سود ہے، نہ ان کے سپہ سالاروں کے عمل پر تبصرہ کرنے سے کوئی فائدہ۔ اگر ہمایوں کی شکست کی کوئی تنہا وجہ تھی تو وہ نہ تو اس کے سپاہیوں کی ناقابلیت تھی نہ اس کی فوج کی اخلاقی پستی۔ جس کا ذکر مرزا حیدر نے مبالغے کے ساتھ کیا ہے۔ بلکہ یہ تھی محض ہمایوں کی بدقسمتی جو بے وقت بارش کی شکل میں نمودار ہوئی۔ جس سے کہ موسم گرما میں مغل خیمہ سیلاب کی گرفت میں آگیا۔ اگر ہمایوں کو اس بلائے ناگہانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا تو وہ اپنی مضبوط مورچہ بندی سے کیوں باہر آتا۔ اگر شیر شاہ

Marfat.com

بھی ان حالات میں اور ایسی جگہ سے مغل فوج پر حملہ کرتا تو یقیناً اس کا بھی
وہی حشر ہوتا جو ہمایوں کا ہوا۔ مغل فوج کی یہ تنظیم ایک جگہ جم کر لڑنے اور
دشمن کے حملے کو پیچھے ہٹانے کے لئے تو بہت موزوں اور بہترین قسم کی تھی
لیکن متحرک دشمن کے سامنے بالکل بے کار و ناکام تھی۔ اس قدر کثیر التعداد
فوج کو اگر ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کرنا پڑے تو ایک باخبر غنیم کو اس
پر اچانک حملہ کرنے کے بہت سے موقع مل جاتے ہیں۔ ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ
میں صرف اورنگ زیب نے ہی ایسی مثال پیش کی ہے جو اس قدر کثیر فوج
کو کافی دور لے جا کر ساموگڑھ کے مقام پر دارا شکوہ کو ہرا سکا۔ مختصر یہ کہ شیر
شاہ کی فتح کا دارومدار اس بات پر تھا کہ وہ اپنے طریقہ جنگ میں صورت
حال کے مطابق تبدیلی کر لیتا تھا۔ جب کہ ہمایوں کے فنون حرب میں لچک
اور تبدیلی کی گنجائش نہ تھی۔

Marfat.com

باب 10 کا ضمیمہ ا

شیر شاہ کی تاجپوشی

ڈاکٹر ایشوری پرشاد لکھتے ہیں "ڈاکٹر قانونگو کا یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ عباس نے شیر شاہ کی تاجپوشی کا وقت و مقام نہیں لکھا ہے احمد یادگار اور عبداللہ دونوں نے یہ لکھ کر کہ چوسہ کی لڑائی کے بعد رسم تاجپوشی کی گئی۔ عباس کے بیان کی تائید کی ہے۔" (ہمایوں صفحہ ۱۳۷ فٹ نوٹ ۱)

میں نے تاریخ داودی کے مورخ عبداللہ سے اقتباس کیا ہے پھر بھی مجھے عباس بالکل ہی خاموش نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر موصوف کی ترجمانی عباس کی خاموشی سے زیادہ گمراہ کن ہے۔ جہاں تک تاجپوشی کے مقام کا سوال ہے ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ چوسہ کے مقام پر ہوتی ہوگی اور وقت چوسہ کی لڑائی کے بعد کا ہوگا۔ لیکن نہ تو کسی دوسرے مستند مورخ نے نہ عباس نے جس کا حوالہ ڈاکٹر موصوف نے دیا ہے۔ کہیں بھی چوسہ کی فتح اور قنوج کی روانگی کے درمیان لفظ 'بعد' یا 'درانجا' استعمال نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے اطمینان سے عباس کے سلسلہ واقعات سے 'وقت' اور 'مقام' کا اندازہ لگا لیا ہے جبکہ میں ایسا کرنے میں قاصر ہوں انھوں نے اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے کہ چوسہ کی لڑائی کے بعد

Marfat.com

رسم تاجپوشی بنگال میں ہوئی تھی جس کا ذکر مخزن (قلمی نسخہ صفہ ۳۵) نظام الدین احمد (فارسی زبان۔ نولکشور پریس۔ صفہ ۲۳۰) اور فرشتہ (اصل صفہ ۲۳۶) نے واضح طور پر کیا ہے۔ محض عباس کے سلسلۂ واقعات کو ہم کوئی اہمیت نہیں دے سکتے۔ اس کو تو یہ علم بھی نہ تھا کہ تخت نشینی کے بعد شیر شاہ نے کیا لقب اختیار کیا۔ اس پر بھی ڈاکٹر موصوف نے عباس کی کورانہ تقلید کی ہے۔ جس سے ان کی بات کی تائید مشکل ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال خود ڈاکٹر موصوف کی کتاب میں ہے۔ جہاں اُنھوں نے یہ لکھ کر کہ "شیر خاں نے شاہ عالم کا خطاب اختیار کیا۔" (ہمایوں صفہ ۱۳۷) عباس کی لاعلمی کا پردہ فاش کر دیا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب کا یہ قول نہ صرف شیر شاہ کے موجودہ تمام دستیاب سکوں کے برخلاف ہے بلکہ ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بزجی کی عباس کی تنقید کو بھی اُنھوں نے نظرانداز کر دیا ہے۔ (دیکھئے ہمایوں بادشاہ، جلد ا صفہ ۲۳۲۔ فٹ نوٹ ۱)

اگر ہم یہ تسلیم کریں کہ شیر شاہ کی تاجپوشی چوسہ کی لڑائی کے بعد ہوئی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیر کے ۹۴۵ ہجری کے سکے کہاں سے آگئے۔ یہ سن ہجری انگریزی تاریخ کے مطابق ۱۸ رمئی ۱۵۳۹ کو ختم ہوتا ہے چوسہ کی لڑائی سے ٹھیک ۴۰ دن پہلے ہے۔

واقعات پر عمیق نظر ڈالنے سے بھی ڈاکٹر موصوف کے بیان کی تائید نہیں ہوتی کہ رسم تاجپوشی چوسہ کی جنگ کے بعد ہوئی اور فوراً بعد ہوئی۔ اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ چوسہ کی لڑائی کے بعد بھاگتے ہوتے مغلوں کا تعاقب کرنے کے بجائے شیر خاں نے اپنا وقت رسم تاجپوشی و جشن منانے میں ضائع کیا تو یہ بات غلط ہو جاتی ہے کہ اس نے قنوج تک مغلوں کا تعاقب کیا جو کہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس کے بعد شیر شاہ کبھی لوٹ کر چوسہ واپس نہیں گیا۔ یہ بات بھی بحث و دلیل کے بعد ٹھیک ثابت نہیں ہوتی کہ مونگیر میں خانخاناں میں یوسف خیل و بنگال میں جہانگیر قلی بیگ کو پائمال کرنے سے پہلے شیر خاں

Marfat.com

نے دوسری مرتبہ تخت نشینی کا جشن منایا۔ مختصر یہ ہے کہ ۹۴۵ ہجری کے سکّے باآواز بلند ڈاکٹر موصوف کے قول کی تردید کرتے ہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد اور ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنرجی دونوں نے ہی ایک مرحوم شخص کی زبان سے شیر خاں کو تاج پہننے کی رغبت دلواتی ہے۔ یہ مرحوم شہید بتّن ہے جو دوراہہ کی جنگ ۱۵۳۱ء بایزید فاملی کے ساتھ شہید ہوا تھا۔ یہ لڑائی رسم تاجپوشی کی تاریخ سے ۸ سال پہلے ہوئی تھی (جوہر)

لہ جوہر کے مقابلے میں عباس زیادہ مستند نہیں۔ جوہر نے صاف طور پر بتّن کی وفات دوراہہ کی لڑائی میں دکھائی ہے۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد اور ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنرجی نے اس موقع پر لکھا ہے

(۱) عیسیٰ خاں کی تائید اعظم ہمایوں سروانی اور میاں بتّن لودی نے کی (بنرجی ہمایوں صفحہ ۲۳۴)

(۲) اس کے فوراً بعد میاں بتن لودی اور دیگر سرداروں کے مشورے سے شیر خاں نے شاہی خطاب اختیار کیا (ہمایوں صفحہ ۱۳۷)

عباس نے بتّن کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سلطان سکندر لودی کا ایک امیر تھا۔ ظاہر ہے اس کا منشا کسی دوسرے سے نہیں ہو سکتا۔ (ہودی والا۔ اسٹڈیز، صفحہ ۴۸۶)

Marfat.com

باب 10 کا ضمیمہ 2

گنگا کی لڑائی اور موجودہ مورخ

سب سے پہلا مصنف اس لڑائی کا نام جو ہمایوں اور شیر شاہ کے درمیان ہوئی "گنگا کی لڑائی" بتاتا ہے۔ اس زمانے کے مورخوں کے محاوروں کے مطابق یہ بات بالکل درست ہے۔ حالانکہ یہ لڑائی نہ تو دریائے گنگا کے بیچ لڑی گئی نہ دریائے گنگا کی خاطر لڑی گئی۔ بلکہ محض دریائے گنگا کے کنارے لڑی گئی[1]۔ عباس اور دوسرے مورخ اس لڑائی کو "قنوج کی لڑائی" سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ صریحاً غلط ہے کیونکہ جغرافیہ اس کی تائید نہیں کرتا۔ اور وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ یہ لڑائی نہ تو قنوج کے قرب وجوار میں لڑی گئی اور نہ گنگا کے قنوج والے کنارے پر لڑی گئی۔ بلکہ گنگا کے اس جانب ہوئی جہاں بلگرام واقع ہے۔ ہمیں مرزا حیدر سے پتہ چلتا ہے کہ اصل لڑائی گنگا کے مشرقی کنارے سے ٹھیک ۴ میل دور ہوئی۔ یہ مقام بلگرام کے نزدیک پہنچتا ہے۔ وہ قنوج سے دور تھا۔ اس وقت قنوج خود گنگا کے مغربی کنارے سے ۶ میل دور تھا۔

---

[1] اس زمانے کے مورخین کا یہ عام دستور تھا مثلاً محمود کی "جنگ راہب" جو قنوج اور باری کے درمیان لڑی گئی (دیکھیے ہودی والا اسٹڈیز جلد ۱ صفحہ ۱۴۹) دوسری مثال بابر کی "جنگ سرجو" کی ہے جو بلیا ضلع میں سرجو کے سنگم پر لڑی گئی۔

Marfat.com

ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے دوبارہ اس بحث کو تازہ کیا ہے کہ یہ لڑائی کس مقام پر لڑی گئی۔ قابل مورخ نے بڑی کاوش اور جانفشانی کے بعد اس لڑائی کا مقام دریا کے دوسری جانب 'اونچی جگہ' پر مقرر کیا ہے۔ یہ شیر گڑھ اور نانامئو گھاٹ کے درمیان تھی۔ (ہمایوں صفحہ ۱۵۰) اور اسی وجہ سے انھوں نے لڑائی کا وہی نام پسند کیا جو عباس نے تجویز کیا تھا یعنی "جنگ قنوج" انھوں نے اپنی رائے کی تائید میں 'حدیقۃ العالم' کا حوالہ دیا ہے۔ جس میں اس جگہ کا نام جہاں ہمایوں نے اپنی فوج کے ساتھ دریا پار کیا تھا "نانامئو گھاٹ لکھا ہے۔ یہ کتاب مسمی مرتضےٰ احسن نے لکھی ہے جو اللہ یار بلگرامی کے نام سے زیادہ موسوم ہے۔ یہ کپتان جوناتھن کا فارسی منشی تھا۔ اور یہ کتاب اس واقعہ کے ۲۴۰ سال بعد لکھی گئی۔ اس کتاب کا ۱۸۷۹ء کا ایڈیشن نولکشور پریس میں موجود ہے اور میں نے اسے ۱۹۲۰ء میں دیکھا تھا۔ اس مصنف نے عباس کی تقلید کی ہے اور یونہی اس لڑائی کا نام 'جنگ قنوج" لکھ دیا ہے۔ اس نے اپنی جانب سے محض یہ اضافہ کیا ہے کہ ہمایوں نے یہ دریا نانامئو گھاٹ پر پار کیا۔ میں نے اس جگہ کو دیدہ و دانستہ رد کیا ہے کیونکہ یہ بات ابوالفضل کی رائے کے بالکل متضاد ہے۔ اس نے بھوجپور سے قنوج کے گھاٹ تک مغل فوج کے سفر کا پورا حال وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے نانامئو گھاٹ کا جائے وقوع قنوج سے ۱۵ یا ۱۶ میل بتایا ہے۔ نقشہ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ گنگا قنوج سے جانب مشرق ۱۵ یا ۱۶ میل نہیں ہو سکتی اگر ایسا مان لیا جائے کہ گنگا قنوج سے ۱۵ میل دور تھی تو بگرام کا فاصلہ جانب مشرق اور زیادہ ہو جائے گا۔ اس لیے 'حدیقۃ العالم' میں تحریر شدہ "نانامئو گھاٹ" محض سنی سنائی بات پر مبنی ہے جو کہ حقیقت سے بہت دور ہے۔ اگر اس کتاب کی کوئی تاریخی اہمیت ہوتی تو پروفیسر ہودی والا اس لڑائی کے تبصرہ کے سلسلہ میں اس تصنیف کا حوالہ ضرور دیتے کیونکہ فارسی زبان میں لکھی گئی تمام ہندوستانی تاریخ کی کتابوں کے

Marfat.com

نام اس کو از بر بختے (دیکھیے اسٹڈیز صفہ ۴۵۶)

۱۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے تین مختلف واقعات کو یعنی (۱) یہ کہ ہمایوں نے نانامئوگھاٹ' پر دریا پار کیا (۲) یہ کہ لڑائی گنگا کی لڑائی ہے (۳) یہ کہ شیر شاہ نے شیر گڑھ عرف قنوج کی بنیاد ڈالی .... مخلوط کر کے اپنے کو اور بھی زیادہ اُلجھن اور غلطیوں میں ڈال دیا ہے۔ ہم مندرجہ ذیل وجوہات سے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔

۱۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمایوں نے شیر گڑھ کے بالمقابل دریا کو پار کیا۔ یہ جگہ قدیم قنوج سے ۵ - ۶ میل مغرب میں ہے شیر گڑھ کے پاس دریا کا کنارہ آج بھی اتنا ہی عمودی ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ جگہ جہاں ہمایوں نے دریا پار کیا ہوگا۔ اس کے آس پاس کہیں ہوگی (ہمایوں صفہ ۱۵۰) نانامئوگھاٹ اس جگہ سے اور بھی آٹھ میل نیچے ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہمایوں نے دریا پر پُل بنانے کے لیے اس ڈھلوان گھاٹ کو کیوں پسند کیا۔ خصوصاً موسم گرما میں جب دریا میں پانی بہت کم ہو جاتا ہے بڑے سے بڑا دہقانی بھی گنگا کو اس جگہ پار نہیں کر سکتا جہاں اس کا کنارہ عمودی ہو۔

اس ضمن میں پیشتر میرا یہ دعویٰ تھا اور آج بھی ہے کہ ہمایوں نے قنوج سے کئی میل نیچے دریا پار کیا اور یہ لڑائی ضلع ہردوئی میں بلگرام کے نزدیک کہیں ہوئی۔ (شیر شاہ صفہ ۲۱۶، فٹ نوٹ) میرے خیال میں یہ جگہ دریا کے اوپر کی جانب شمال میں ہونی چاہیے۔ کیونکہ ابوالفضل نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ بھوجپور سے چل کر مغل فوج قنوج کے نزدیک پہنچی (قنوج نہیں پہنچی)۔ اس لیے کیا مرزا حیدر اور ابوالفضل کی بات کا نہ ماننا محض اس لیے حق بجانب ہوگا کہ ۱۸ ویں صدی کے ایک غیر مستند مصنف نے جس نے ادھر اُدھر کی افواہیں سن کر اپنی کتاب لکھی ہے یہ کہہ دیا ہے کہ ہمایوں نے نانامئوگھاٹ پر دریا پار کیا۔

Marfat.com

۲۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی دلیلوں میں سب سے زیادہ دلچسپ اور مضحکہ خیز بات وہ ہے جو انھوں نے عباس کے حوالے سے شیر گڑھ کے متعلق لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"اس کے علاوہ شاید بلگرام سے دریا پار کرکے قنوج بآسانی پہنچا جاسکتا تھا اور وہاں شیر شاہ نے اپنی فتح کی یاد میں شیر گڑھ بنایا۔"

(ہمایوں صفحہ ۱۵۱)

اس کے معنی یہ ہوتے کہ ہم یہ یقین کریں کہ ہمایوں کی شکست کے بعد سب سے اہم کام شیر شاہ کے سامنے اپنی فتح کی یادگار قائم کرنا تھا اور وہ بھی اس غلط جگہ پر جہاں بقول ایشوری پرشاد یہ لڑائی نہیں لڑی گئی۔ دراصل یہ شیر گڑھ عرف قنوج کوئی فتح کی یادگار نہیں تھا بلکہ یہ تو شیر شاہ کی عام کمزوری تھی کہ وہ اکثر قلعہ تعمیر کراتا اور اس کا نام شیر گڑھ رکھتا تھا یا مقامات کے قدیم نام بدل کر "شیر گڑھ" کر دیتا تھا۔ مثلاً شیر گڑھ عرف حضرت دہلی جہاں کوئی لڑائی نہیں ہوئی یا شیر گڑھ عرف سکھر یا ٹھکر" جہاں شیر شاہ کبھی نہیں گیا۔

شاید ازمنہ وسطیٰ کے مورخ اس لڑائی کو "قنوج کی لڑائی" کے نام سے موسوم کرنے کو تیار ہوں لیکن آج جب عوام کو جغرافیہ کی واقفیت پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی ہے۔ تب اس لڑائی کو اس نام سے منسوب کرنا بیحد گمراہ کن ہے۔ لہٰذا بہتر ہوگا کہ ہم اس غلطی کو اب درست کریں اور اس لڑائی کو "بلگرام کی لڑائی" کے نام سے موسوم کریں۔ یہ مقام شیر شاہ اور اور اکبر کے زمانے میں بھی تھا اور آج بھی ہے یہ لڑائی قنوج کے مقابلہ بلگرام کے زیادہ نزدیک لڑی گئی۔

تاریخ کے ایک اوسط درجہ کے طالب علم کے لیے اس لڑائی کے متعلق خواہ ہم اسے کسی بھی نام سے موسوم کریں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ موجودہ مورخوں کے اس اختلاف رائے کا گہرا مطالعہ کریں جو ہمایوں اور شیر شاہ کی اس آخری لڑائی کے بدلتے ہوتے صورت حال کے متعلق ان

Marfat.com

میں پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ایس ۔ کے ۔ بنرجی اور ڈاکٹر ایشوری پرشاد حالانکہ اس کے متعلق ایک دوسرے کی رائے سے کلی اتفاق نہیں کرتے لیکن دونوں نے اپنی تصنیفوں میں جنگ کا نقشہ کھینچا ہے جس میں دونوں فوجوں کی ترتیب و تنظیم دکھائی ہے۔ دونوں قابل مورخ دو باتوں میں ایک دوسرے سے متفق ہیں :۔

۱۔ شیر خاں کی فوج ، حصّوں پر مشتمل تھی۔
۲۔ ہر فوج کے قلب کے سامنے ایک خندق تھی۔

اس میں سے پہلی بات کی تصدیق کسی معتبر ذرائع سے نہیں ہوتی اور دوسری بات عقل سلیم کے خلاف ہے۔ کوئی بھی حملہ آور فوج جب لڑائی کے لیے اپنے مورچہ بندی سے باہر نکلتی ہے تو اس کے قلب کے سامنے تازہ خندق تیار کرنا محض حماقت ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر بنرجی اور ڈاکٹر ایشوری پرشاد دونوں نے مرزا حیدر کے مندرجہ ذیل اقتباس سے جو ابوالفضل نے اپنی تصنیف میں قلمبند کیا ہے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ مرزا حیدر نے لکھا ہے۔ "شیر شاہ نے اپنی فوج کو ۵ ڈویژن میں منقسم کیا۔ ان میں سے دو بڑے ڈویژن پہلے خندق کے سامنے صف آرا ہوتے۔ اور پھر وہ آگے بڑھے۔" (اکبر نامہ جلد ا صفحہ ۳۵۱)

ان قابل مورخوں نے بیورج کے حاشیہ پر لکھی ہوئی ہدایت کی طرف مناسب توجہ نہیں کی۔ انھوں نے لکھا تھا "اقتباس صحیح نہیں ہے دیکھئے تاریخ رشیدی' ۱۹۱۹ء میں اس نوٹ کا خیال کر کے میں نے مختلف حوالے دیکھے اور میدان جنگ میں خندق کے اس وجود سے انکار کر دیا۔ جس کا کہ ذکر ابوالفضل نے مرزا حیدر کے نام سے کیا تھا۔

ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اس لڑائی میں ہمایوں کی شکست کی وجوہات بتاتی ہیں جو اپنی جدت سے دوسروں کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ یہ وجوہات مندرجہ ذیل ہیں :۔

۱۔ ہندوستان کی آب و ہوا کا اثر ہمایوں کی فوج کی صحت پر خراب

Marfat.com

ہوا ہوگا اور بنگال کی معتدل ہوا نے انھیں کافی حد تک کمزور کر دیا ہوگا۔
(ہمایوں۔ صفحہ ۱۵۲)

یہ آواز انگریز مورخین کی آواز باز گشت معلوم ہوتی ہے۔ جن کا یہ عام خیال تھا کہ ہندوستان کی آب و ہوا انسان کو کمزور بناتی ہے۔ اب یہ خیال فرسودہ اور لایعنی ہے۔

۲۔ مغل فوج میں ایسے ناتجربہ کار ناآزمودہ رنگروٹ بھرتی تھے جو جری اور دلیر افسران کی گولہ باری کی تاب نہ لاسکے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ گولہ باری کس جانب سے ہوتی۔ مرزا حیدر نے تو لکھا ہے کہ توپخانے کا استعمال بالکل نہیں ہوا۔

۳۔ ہمایوں کا پالا ایسے غنیم سے پڑا تھا جو عیاری اور فنون حرب کا استاد تھا۔ دھوکہ دینے اور دفعتہً حملہ کرنے میں طاق تھا۔ شیر خاں کی فطرت میں جالبازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی اس کو وعدہ شکنی میں قطعاً تامل نہ ہوتا تھا (ہمایوں۔ صفحہ ۱۵۳)

حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی میں یہ پہلی لڑائی تھی جو شیر شاہ نے ایماندارانہ طریقے سے لڑی۔ اس لڑائی کے دوران نہ اس نے کوئی وعدہ کیا۔ نہ وعدہ شکنی۔ نہ کسی مکروفریب سے کام لیا۔ ممکن ہے فاضل فوج نے شیر خاں کے متعلق یہ فقرہ کہکر بات ٹال دی ہو، ایک شریف کا شیطان سے کیا مقابلہ، لیکن بدقسمتی تو یہ ہے کہ سیاست کے میدان میں ایسے شیطانوں کی ہی بھرمار ہے جو کہ ہمایوں جیسے شریف نفس کو جو نہ خود کسی مسئلہ پر سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں نہ اپنے مفاد و تحفظ کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ کبھی مار کر ہٹا دیتے ہیں۔

۴۔ ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنرجی نے لڑائی کی شکست کی ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ ہمایوں کی دماغی صحت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ دماغی توازن کھو چکا تھا ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے (دیکھیے ہمایوں بادشاہ جلد اول صفحہ ۲۴۵ اور ہمایوں صفحہ ۱۵۴)

Marfat.com

ڈاکٹر موصوف کے اس قول کا انحصار محض ایک داستان پر ہے کہ مغلوب ہمایوں آگرہ سے سرہند کے سفر میں ہر جگہ یہ کہتا پھرتا تھا کہ میدان جنگ میں درویشوں کا ایک گروہ دیکھا تھا جو مغل گھوڑوں کے منہ پر چوٹ مار رہے تھے۔ ہمایوں نے یہ بات شیخ رفیع الدین صفوی اور شیخ محی الدین سرہندیؒ سے بھی کہی تھی۔

جو بات کہ ہمایوں نے ان مقدس صوفیوں کو بتائی ہوگی وہ اتنی ہی سچ ہو سکتی ہے جیسی کہ پیغمبرؐ کے جانثاروں نے بدر کی فتح کے بعد کہی تھی۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ ہم نے پیغمبرؐ کی جانب سے قریشی کافروں کے خلاف جبرئیل فرشتہ کو لڑتے دیکھا تھا اور لڑائی کے بعد اس کو گردوغبار سے رسول اللہؐ کے مکان میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ ہم خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اس قسم کی غیبی امداد کی روائتیں ہار اور جیت دونوں کے متعلق زبان زد کر لیتے ہیں اور جو لوگ اس پر یقین کرتے ہیں ان کے توازن طبع میں کوئی بھی گڑبڑ دکھائی نہیں دیتی ہے۔ اس لیے فاضل ڈاکٹر کی یہ دلیل کہ ہمایوں کی شکست کی ایک وجہ اس کا دماغی توازن خراب ہو جانا تھا۔ جرح اور دلیل کی کسوٹی پر کھری نہیں اُترتی۔ یہ کہانی دراصل بڑی عقل مندی سے تراشی گئی ہے۔ اس سے ہر دو فریق فاتح و مفتوح دونوں کو یہ خیال ہو گیا ہو گا کہ غیبی امداد ان کی جانب ہے مغلوں کو تو اس سے سکون قلب حاصل ہوا اور افغانوں کے امید و حوصلہ میں افزائش ہوگی

۵۔ اہل ہنود نے فوج کی شکست عظیم کو معمولی سانحہ سمجھ کر اس کی طرف بالکل توجہ نہ کی۔ اس سے قبل بھی نازک موقعوں پر وہ ناکامیاب ہوئے تھے۔ چنانچہ ۱۵۴۰ء میں ان سے بہتر اُمید رکھنا بے سود تھا۔ اگر اہل ہنود نے شیر خاں کے مقابلہ میں ہمایوں کا ساتھ نہ دیا تو یہ ان کی غلطی نہ تھی وہ شیر شاہ کو ہمایوں پر ترجیح دیتے تھے اور اسکے لیے انکے پاس معقول وجہ تھی۔

بہر حال ہر ذی شعور و ذی عقل انسان کو ان مسئلوں پر خود فیصلہ کر لینا چاہیے اور مورخوں سے بحث و مباحثہ کی اُلجھنوں سے دور رہنا چاہیے۔ کیونکہ مورخ کوئی ولی اللہ تو ہوتے نہیں وہ ہر واقعہ کی تشریح اپنی قابلیت و رجحان کے مطابق کرتے ہیں اور اسی کو سچ سمجھتے ہیں۔

Marfat.com

باب ۱۱

سلطنت ہند کی از سر نو تعمیر

جنگ بلگرام کے بعد ہندوستانیوں کے دامن سے وہ داغ دھل گئے جو کہ پانی پت کے بعد پیہم شکستوں کی وجہ سے اس پر لگ گئے تھے۔ اس جنگ کا مآل کار یہ بھی ہوا کہ بابر اور اس کے لڑکوں کی سندھ کے اس پار ہم اسالہ جدوجہد کے نتائج کالعدم ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک تو تیموری حکومت زوال پذیر پٹھان سلطنت کی طوفانی موجوں پر ایسے تیرتی رہی جیسے کہ پانی پر تیل تیرتا ہے کیونکہ ہندوستان کی سیاسی حیثیت سے وہ میل نہ کھا سکی تھی۔ اگرچہ تیموری سلطنت کا یہ اولین باب زیادہ تر تخریبی و جنگی ہی رہا پھر بھی وہ سبق آموز تھا اور اس سے سبق سیکھے بھی گئے۔ مثلاً افغانوں نے اتحاد کا سبق سیکھا۔ حالانکہ وہ چند روزہ تھا۔ ان کو یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ سرزمین ہند پر فرقہ وارانہ اور قبائلی طرز کی حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ شیر شاہ کی کامیابی کا یہ مطلب نہ تھا کہ ترکوں کی ناقابل برداشت اور متعصبانہ حکومت کا از سر نو آغاز ہو یا بہلول اور سکندر کے عہد کی قبائلی حکومت کو فروغ ہو۔ برعکس اس کے اب ہندوستان میں ایک ایسی سلطنت کی بنیاد پڑی جس میں سوریوں کی سربراہی میں بھی اپنے ہندوستانی وطن میں افغان دوسرا رویہ بنانے کا خواب نہیں دیکھ سکتے تھے۔ صاحب اختیار

Marfat.com

لودی سلطنت کے زوال کے بعد افغان قبیلوں میں برسرِ اقتدار سوری قبیلہ سب سے زیادہ کمزور اور کم معروف تھا۔

اب ہم بلگرام کی لڑائی کے بعد کے واقعات پر نظر ڈالتے ہیں۔ ۱۰ محرم ۹۴۷ ہجری مطابق ۱۷ مئی ۱۵۴۰ء دوپہر کے قریب جب مغلوں کی عظیم الشان فوج اپنے غلام اور خدمت گاروں کی بھگدڑ سے حواس باختہ ہو گئی تو گنگا کے پل کی جانب جو میدان جنگ سے تقریباً ۵ میل تھا عام دوڑ شروع ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پل ٹوٹ گیا۔ بہت سے کچل کر مر گئے اور بہت سے دریا میں ڈوب کر مر گئے۔ حالانکہ دریا کا پانی مشکل سے ۵۰۰ گز چوڑا تھا۔ جس وقت ہمایوں کا ہاتھی گنگا میں کودا تھا۔ تب اس کے آس پاس ایک ہزار سپاہی تھے مگر جب وہ اس پار پہنچ کر دریا سے باہر نکلا تو شہنشاہ کے علاوہ صرف آٹھ آدمی رہ گئے تھے۔ کامران کے سپاہیوں نے میدان جنگ کے مقابلے میں دریا پار زیادہ اچھی خدمت انجام دی۔ ان میں سے ایک تھا شمس الدین محمد اتکہ خاں، یہ شہنشاہ کو خشک زمین پر لے آیا۔ دوسرا تھا تردی بیگ۔ اس نے شہنشاہ کو اپنا گھوڑا نذر کیا برہنہ سر برہنہ پا معدودے چند کے ساتھ حواس باختہ ہمایوں آگرے کی طرف چل پڑا۔ اس بدشگون سال کا ۱۰ محرم واقعی مغلوں کے لیے تو کربلا ہی ثابت ہوا۔ مگر ہمایوں کا حشر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے کم دردناک نہ تھا۔ افغانوں سے ایک رات پیشتر ہی ہمایوں چل چکا تھا۔ دوسرے روز صبح انھوں نے گنگا پار کی اور وہ قنوج جا پہنچے۔

اگر ابوالفضل کی بات کا اعتبار کیا جائے تو ہمایوں تقریباً ۹ روز میں دہلی کے نزدیک پہنچا۔ وہ قصبہ مین پوری کے نزدیک 'بھوگاؤں' والے راستہ سے آگرہ گیا اور آگرے میں ایک روز قیام کر کے فتح پور سیکری گیا۔ فتح پور سیکری میں اس نے ایک روز قیام کیا اور پھر موجودہ بھرت پور کے شمالی حصہ میں کاما پہاڑی کے سنسان راستہ سے گزرتا ہوا ریواڑی پہنچ گیا اگر اس سفر کا معمولی اندازہ لگایا جائے تو قنوج سے آگرہ ۱۷۰ میل دور

Marfat.com

ہے اور کاما پہاڑیوں کے چکر دار راستہ سے آگرہ سے ریواڑی ۱۳۰ میل دور ہے۔ اس حساب سے مغلوں نے یہ سفر ۵۰ میل روزانہ کے حساب سے طے کیا ہوگا۔ اس شمار میں سے تین دن نکال دینے چاہییے جبکہ ہمایوں نے جگہ جگہ قیام کیا تھا[1]

جب ہمایوں کا قافلہ قنوج اور آگرہ کے درمیان بھوگاؤں[2] کے نزدیک پہنچا تو قرب وجوار کے بد اندیش مسلح دہقانیوں نے مزاحمت کی اور رسد دینے سے انکار کیا اور بھولے بھٹکوں کو قتل کر دیا۔ ہمایوں نے اپنے بھائی ہندال وعسکری و چچا یادگار ناصر کو حکم دیا کہ ان گستاخ سرکشوں کی سرکوبی کریں۔ مرزا عسکری ہمایوں کے حکم کی تعمیل نہ کرنا چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یادگار ناصر اور عسکری میں گرما گرم بحث ہوگئی اور ناصر کو اپنا چابک چلانا پڑا۔ ناہنجار دیہاتیوں نے جو غالباً لیٹرے جاٹ تھے مرزاؤں سے ڈٹ کر لوہا لیا۔ لیکن آخر میں شکست کھا کر فرار ہو گئے۔ جاٹوں کی ہمیشہ سے یہ خصلت رہی ہے کہ وہ مصیبت زدہ کے سامنے بھیڑیے کی طرح غراتے ہیں لیکن جب کسی زبردست سے پالا پڑتا ہے تو سہمیہ ہو جاتے ہیں۔ مرزا عسکری نے یادگار ناصر کی ہمایوں سے شکایت کی مگر ہمایوں کو اپنے چچا سے جواب طلب کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ لہٰذا مرزا عسکری ناراض ہو کر اپنی جاگیر سنبھل ومراد آباد چلا گیا اور دوسروں کو ان کی قسمت کے حوالے چھوڑ دیا۔ ہمایوں اور دیگر مرزا جس میں سپاہی و مورخ مرزا حیدر بھی شامل تھا بھوگاؤں سے جانب مغرب روانہ ہوئے اور دوسرے یا تیسرے روز شام سورج غروب

---

[1] ہمایوں کے فرار ہونے کے لیے دیکھئے تاریخ رشیدی صفحہ ۴۸۴۔ اکبر نامہ جلد ا صفحہ ۳۵۴-۳۵۵)

[2] فارسی تاریخوں میں اس مقام کا نام مختلف طریقے سے ملتا ہے جو حیران کن ہے۔ پروفیسر ہودی والا نے ایلیٹ کی غلطیوں کو درست کر کے اس کا نام "بھوگاؤں" مقرر کیا ہے۔ یہ مین پوری سے ۱۰ میل دور ایک ریلوے اسٹیشن ہے۔ شاید اس کا پہلا نام "بھان گاؤں" تھا یہ کسی چوہان سردار کے نام کا آخری لفظ ہوگا۔ (ہودی والا اسٹڈیز صفحہ ۴۰۵-۴۰۶)

Marfat.com

ہونے کے بعد آگرہ کے نزدیک پہنچے۔ افسردہ دل بادشاہ نے قلعہ میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ دوسرے روز وہ شیخ رفیع الدین صفوی کے مکان پر گیا جس نے اس کو لاہور جا کر اپنی قسمت آزمانے کا مشورہ دیا۔

شہنشاہ ہمایوں منتشر مزاج ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت کوئی بھی فیصلہ کر لینے کے قابل نہ تھا۔ اس نے ہندال کو حکم دیا کہ وہ شاہی حرم کی بیگمات کو قلعہ سے لے آئے۔ ان بیگمات میں اس کی سوتیلی بہن وسوانح نگار گلبدن بھی شامل تھی۔ بادشاہ نے ان سب بیگمات کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے کا ارادہ کیا تاکہ ان کا انجام اتنا رقت آمیز نہ ہو جتنا کہ عقیقہ آغا جا کا چوسہ کی لڑائی کے بعد افغانوں کے ہاتھ میں پڑنے سے ہوا تھا۔

مگر ہندال نے بادشاہ کی اس تجویز پر اعتراض کیا اور ان بیگمات کو لاہور تک صحیح سلامت پہنچانے کا بیڑا اٹھایا۔ دوپہر بعد شہر کو اپنی قسمت پر چھوڑ کر آگرہ سے چل پڑا اور ۲۲ میل جنوب میں جا کر فتح پور سیکری میں مقیم ہوا یہ مغلوں کے ہندوستان سے ہجرت کرنے کا آغاز تھا۔ چاروں طرف عالم حشر بپا تھا۔ گویا حضرت اسرافیل نے اپنا صور بجا دیا۔ ہر چار سو آہ و فغاں، نالہ و شیون ہو رہا تھا۔ لیکن انسان کی رذیل خصلت آخر وقت تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ ہمایوں کے اپنے ہمراہیوں میں ابھی تک غداری کا خیال موجود تھا۔ فتح پور سیکری میں کسی گمنام شخص نے ہمایوں پر تیر کا ایک وار کیا اور اس کے ایک ساتھی کو زخمی کر دیا۔

سوانح نگار بلگرام کے فاتح کے متعلق نہیں لکھتے جتنا کہ انھوں نے ہارے ہوئے ہمایوں کی بابت لکھا ہے۔ افغانوں کے خواب و خیال سے باہر بے شمار دولت اور مال غنیمت شیر شاہ کے ہاتھ لگا۔ فقط ایک ہی جھٹکے سے اس کو اتنے ہاتھی، گھوڑے اور توپیں مل گئیں کہ ہندوستان کی فتح کے لیے اس کو آلات حرب کی کمی نہ رہی۔ چنگیز خانی مغلوں کی طرح سروں کا ایک مینار بنا کر اس نے اپنی فتح کا جشن نہیں منایا بلکہ لڑائی کے بعد جیسی کہ روایت ہے اس نے فتح دینے والے خدائے پاک

Marfat.com

کی خدمت میں دعا کی۔ غالباً دوسرے دن اس کی فوج نے گنگا کو پار کیا اور اس نے قنوج میں قیام کیا۔ قنوج سے شیر خاں نے برہم جیت گوڑ کو ایک فوج لے کر آگے بھیجا لیکن اس کو ہدایت دی کہ بادشاہ سے تصادم کی نوبت نہ آنے دے۔ اس نے ایک دوسرا فوجی دستہ ناصر خاں کی کمان میں سرکار سنبھل کی جانب بھیجا۔ ان چند روز میں اس نے اس علاقہ کا بندوبست کیا اور پھر وہ آگرے کے لیے روانہ ہو گیا۔ (عباس صفحہ ۱۸۱۔ ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۳۸۲)

چونکہ مغل ایک روز پیشتر ہی چل چکے تھے اس لیے تعاقبی دستوں کی ان سے کہیں بھی چھیڑ چھاڑ نہ ہوتی۔ مغلوں پر بیحد خوف و ہراس طاری تھا۔ وہ آگرہ اور دہلی کی جانب سر پر پیر رکھ کر بھاگے جا رہے تھے۔ ان کے تعاقب میں فوج روانہ کرنے سے شیر شاہ کا پہلا مقصد تو یہ تھا کہ وہ لڑائی کے لیے دوبارہ کہیں جم نہیں سکیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم منشا یہ تھا کہ پیچھے ہٹتے وقت مغل شاہی دارالسلطنت کو برباد نہ کر دیں شیر خاں خود آہستہ آہستہ اطمینان سے آگے بڑھا۔ اور جیسا کہ اس کا طرز عمل تھا جس علاقہ کو اس نے فتح کیا اس کا انصرام و انتظام بھی ساتھ ساتھ کر دیا۔ شیر شاہ کا سپہ سالار برہم جیت گوڑ مغلوں سے ایک دن بعد ہی آگرہ کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہ مغلوں سے ایک ہی منزل پیچھے تھا۔ لہذا ہمایوں وہاں سے جلد ہی بہ سمت جنوب فتح پور سیکری بھاگا۔ وہ افغانوں کو اپنی منزل مقصود کا پتہ نہ دینا چاہتا تھا۔ مرزا حیدر نے لکھا ہے۔ "جب ہم آگرہ پہنچے ہم نے وہاں قیام نہیں کیا۔ ہمارے دل ٹوٹ چکے تھے۔ حوصلے پست تھے۔ ہماری حالت ناگفتہ بہ و دل شکن تھی۔ اسی عالم میں لاہور کے لیے چل پڑے"۔ عباس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ برہم جیت گوڑ کے آگرہ میں داخل ہونے اور شیر شاہ کے وہاں پہنچنے میں ایک ہفتہ کا وقفہ تھا۔

ایک سال پیشتر چوسہ کی لڑائی کے بعد گنگا کے مغرب میں سرکار قنوج میں شیر خاں مغلوں کا تعاقب کرتے ہوئے گامزن تو ہوا تھا۔ مگر

Marfat.com

اس وقت اس نے وہاں کوئی معقول بندوبست نہ کیا تھا۔ کیونکہ جنگ بلگرام سے قبل اس کو یہ علاقہ خالی کرنا پڑا تھا۔ صحیح طور پر یہ نہیں معلوم ہے کہ آگرہ روانہ ہونے سے قبل اس نے اس علاقے کا کیا انتظام کیا۔ شیر خاں کی نظر میں ایک وسیع سلطنت کا انتظام کرنے اور سہسرام کی شقداری میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ اسے صرف نوکرشاہی کے انہی شکنجہ کو ضروری ترمیم وتنسیخ کر کے پھیلانا تھا تاکہ اس کی وسعت پذیر سلطنت مستحکم ہو جاتے پانی پت کی شکست کے بعد افغانوں کو گنگا پار کے علاقے میں پیر جمانے کا موقع ہی نہ مل پایا کیوں کہ ان کے زیر تسلط چنار کے قلعہ کی طرح کوئی بھی مرکز مقاومت نہ رہ گیا تھا۔ شیر شاہ میں دشمن کی طاقت کا اندازہ لگانے کا خاص وصف تھا۔ چنانچہ دائم اس کو یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ ہمایوں واپس آنے کے لیے ہی چلا گیا ہے۔ اس امکان کی روک تھام کو مدنظر رکھتے ہوتے اس نے قنوج کے لیے قلعہ بند شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام "شیر گڑھ" رکھا۔ ٹھیک اسی طرح بھوجپور سے اوپر کی جانب گھاٹوں کے تحفظ کے لیے اس نے شمس آباد کے قریب ایک نیا قصبہ بسایا اور ایک نیا قلعہ بنایا اور اس کا نام رسول پور رکھا۔[1]

جب شیر خاں آگرہ پہنچا تو اس نے برہم جیت گوڑ کو بہت لعنت وملامت کی کیوں کہ اس نے ان غیر مسلح لوگوں کو جو کہ پیچھے ہٹتی مغل فوج سے الگ ہو گئے تھے بیدردی سے قتل کر ڈالا تھا۔ اس نے فوراً ایک فوجی دستہ خواص خاں اور شیطان سیرت برہم جیت گوڑ کے کمان میں بھرت پور اور الور کے دشوار گزار راستے سے بھاگتے ہوتے مغلوں کا پیچھا کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اس نے بہار کے شجاعت خاں کو حکم دیا کہ وہ اپنی فوج لے کر فوراً گوالیار پر دھاوا کر کے اس کا محاصرہ کرے۔ یہ قلعہ اس وقت ہمایوں کے

(حاشیہ گذشتہ صفحہ کا) تحصیل قائم گنج ضلع فرخ آباد میں شمس آباد سے تین میل فاصلے پر کسی زمانے میں قصبہ کھور تھا۔ اس کو برباد کر کے سلطان التمش نے یہاں شمس آباد قائم کیا۔ یہ گنگا کے کنارے تھا۔ رسول پور میں اس کی ایک ٹکسال تھی (داستندیہ۔ ہودی وال امت ۲۹۰)

ایک اطاعت شعار و وفادار افسر ابوالقاسم بیگ کے تسلط میں تھا۔ اسی وقت شیر شاہ کو اپنے وفادار و جانثار دوست شجاعت خاں کو یہ خبر دینا پڑی کہ اس کا لڑکا محمد خاں لڑائی میں کام آگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکا بلگرام کی لڑائی میں ہلاک ہوا تھا۔ شیر شاہ نے خبر لے جانے والے ہرکارہ کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ یہ خبر شجاعت خاں کو روہتاس کے قلعہ میں پہنچنے سے قبل نہ دی جائے۔ کیوں کہ شیر خاں خود اپنے نور نظر کی موت کا زخم کھا چکا تھا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ یہ چوٹ کتنی گہری ہوتی ہے۔ بظاہر شیر شاہ نے شجاعت خاں کو گوالیار کے قلعہ کا محاصرہ ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن اس کا اصل منشا مالوہ کے مخالف سرداروں کو مرعوب کرنا تھا۔ اور جب وہ مغل شہنشاہ کے تعاقب میں چلا جاتے تو آگرہ اور اس کے قرب و جوار کے حالات کی نگرانی کرنا بھی تھا۔ شیر شاہ کو پنجاب میں آسان کامیابی کی زیادہ اُمید نہ تھی۔ مرزا کامران کے پاس عظیم الشان فوج تھی اور ضرورت پڑنے پر بابر کے وطن کابل اور قندھار سے مزید کمک منگائی جاسکتی تھی۔ شیر شاہ نے

ایک نہایت قابل سپہ سالار و اعلیٰ منتظم حاجی خاں بتنی کو[1] جو الور میں تعینات تھا میوات کا فوجدار مقرر کر دیا۔ یہ حاجی خاں بتنی بعد میں راجپوتوں کی تاریخ میں حاجی پٹھان کے نام سے مشہور ہوا۔

شیر شاہ نے آگرہ میں دو ہفتہ سے زیادہ قیام نہیں کیا۔ اس دوران میں ناصر خاں نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ عین وقت پر مفرور شہنشاہ اور بھی زیادہ خوف زدہ ہو گیا۔ یہ فوجی سپہ سالار گنگا کے اوپر دوآبہ پر طوفان کی مانند دہلی سے گزرا، اور اپنی جھوک سے مرزا عسکری اور بیرم خاں کو سنبھل

---

[1] بتنی کا صحیح املا ہے۔ باتانی جن کو آج کل بھٹانی کہتے ہیں۔ یہ اب بھی گومل کے اتری حصے میں آباد ہیں۔ سوری، لودی لوہانی اور سروانی بتنی کی لڑکی ماتو کی اولاد ہیں ماتو نے شاہ حسین غوری سے شادی کی تھی۔ شاید اس روایت کی اشاعت افغانستان میں بیسویں صدی میں ہوئی۔ تبانیوں کے شجرہ کے لیے دیکھیے روز کی گلاسری جلد ۲ صفحہ ۲۲۲ ۔ عباس نسخہ صفحہ ۱۸۸

Marfat.com

سے اُکھاڑ پھینکا۔ وہ ۲۵ رمئی کو دہلی پہنچا۔ اس طرح اس نے ۷ دن میں ۲۰۰
میل سے بھی زیادہ فاصلہ طے کیا۔ اسی دن ہمایوں کے دہلی کے قرب وجوار
میں ہونے کی اسے خبر تھی ۔ ۲۶ رمئی کو کچھ مفرور مغل (شاید وہ دہلی سے
آتے تھے) ہمایوں کے ساتھ ہولیے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگرہ سے
شیر شاہ نے حاجی خاں سروانی کو ایک فوج دے کر دہلی پر تسلط
کرنے کا حکم دیا تھا ۔ اور وہ اس وقت تک کے لیے جب تک شیر شاہ
خود دہلی نہ پہنچے ۔ لیکن جب ہمایوں دہلی کے گرد و نواح سے سرپٹ بھاگا
تو شیر شاہ کو فرصت مل گئی اور اس نے آگرے سے چلنے سے پیش تر
یہ ضروری سمجھا کہ اپنی عدم موجودگی میں آگرہ کے انتظام کا معقول انتظام کر دے
شیر شاہ نے آگرہ سے دہلی کا سفر قدیم لودی راستہ سے اختیار نہیں
کیا جو جمنا کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ فروزآباد سے گزرتا ہے ۔ بلکہ
اس نے یہ سفر متھرا ، ہوڈل ، پلول کے راستہ کیا جو گنجان جنگل اور مخدوش

جرائم پیشہ لوگوں کے علاقے سے گزرتا ہے ۔ غالباً آگرہ اور دہلی دونوں صدر
مقاموں کو ملانے کے لیے اس راستہ کا تمہیدی معائنہ کیا ہوگا ۔ یہ دہلی اور
آگرے کے درمیان اس وقت کے موجودہ سبھی راستوں میں سب سے
چھوٹا اور آرام دہ راستہ تھا ۔ آگے چل کر اسی شاہراہ کا نام گرانڈ ٹرنک روڈ پڑا ۔
شیر شاہ موسم برسات شروع ہونے سے پہلے ہی دہلی پہنچ گیا
اس نے پوری برسات دہلی میں گزاری ۔ اس کے سامنے ابھی مستقبل
صاف نہیں تھا ۔ ابوالفضل نے اس وقت کی صورت حال کا غالباً صحیح
اندازہ ان الفاظ میں لگایا ہے ۔

" شیر خاں دہلی پہنچا لیکن اس سے آگے نہیں بڑھا ۔ اسے یہ تو
دکھلائی پڑ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے اس کی قسمت کا کھیل ہے ۔ لیکن اس
کو یہ دہشت کھائے جا رہی تھی کہ آگے بڑھنے سے کہیں حالات زیادہ
خراب نہ ہو جائیں اور اُسے واپس لوٹنا پڑے ۔ وہ اس خبر سے بھی خوفزدہ

Marfat.com

تھا کہ لاہور میں اس کے خلاف زبردست طاقتوں کا مجمع ہو رہا ہے[1]
اگر شیر شاہ کے دل میں اس قسم کے شک وشبہات تھے۔ اگر اس نے غور وخوض کے بعد اپنے مستقبل کا راستہ بنایا تو یہ شیر شاہ کے لیے کوئی بدنامی کی بات نہیں تھی۔ سلطنت کا بنانا دوڑ کا میدان نہیں ہے جہاں بھاگتے وقت انسان اپنے سامنے آنے والی رکاوٹوں کی پرواہ نہ کرے۔ اگر ہندوستان کے فرماں روا (شیر شاہ جن سے مستثنیٰ ہے) ہندوستان کی پرانی سیاست کا اصول یاد رکھتے اور اس پر عمل کرتے تو شاید ہندوستان کو بُرا دن نہ دیکھنا پڑتا[2]۔ وہ اصول یہ ہے کہ سیاست کے میدان میں انسان کو ایک قدم تب اُٹھانا چاہیے جب دوسرے سے نیچے کی زمین کو ٹٹول کر دیکھ لے۔ شیر شاہ کو برسات میں پنجاب کے علاقے میں جانے سے پہلے ایک بار نہیں دس بار سوچنا چاہیے تھا کیوں کہ پانچ دریاؤں کو پار کر کے اس علاقے میں جانا تھا جہاں دو لاکھ مغل (حالانکہ اس میں بچے اور مستورات بھی شامل تھے) دوبارہ رشتہ اتحاد میں وابستہ ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ ابھی اس کو ستلج کے اس پار بھی بہت سے دشمنوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ سہسرام کے باغی جاگیرداروں کی حیثیت سے جب وہ مغل حکومت کے خلاف سر اُٹھا رہا تھا تو کچھ لوگ اس سے دلی ہمدردی رکھتے تھے اور کچھ غیر جانب دار تھے۔ اب جب کہ مشیت ایزدی اور یاوریٔ قسمت نے اُسے دہلی کا بادشاہ بنا دیا تو ممکن ہے وہی لوگ اس کے مخالف ہو جائیں اس قسم کے لوگوں میں سب سے زیادہ خطرناک مالوہ کا ملّو خاں عرف قادر شاہ اور جودھپور کا راٹھور راجہ مالدیو تھا۔ ۱۵۲۶ء سے جب ہمایوں نے گجرات اور مالوہ خالی کر دیا تب ملّو خاں نے ایک وسیع سلطنت قائم کر لی۔ جو کہ رنتھمبور سے چندیری اور گوالیار سے ست پڑا کی پہاڑیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب بہادر شاہ کے دیو کے نزدیک سمندر میں ڈوب جانے

---

[1] اکبر نامہ۔ جلد ا صفحہ ۳۲۸۔ [2] چانکیہ کا مقولہ

سے اس کا اقتدار راجپوتانہ میں ختم ہوگیا تو مالدیو نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت منظم کرلی۔ راجپوتانہ میں اس کے روز افزوں اقتدار سے شیر شاہ کے دماغ میں شبہ پیدا ہونا لازمی تھا۔ گجرات میں حالانکہ اس وقت باہمی خانہ جنگی پھیلی ہوئی تھی۔ مگر یہ بھی ممکن تھا کہ گجرات کی مدد سے مالوہ اور جودھپور ایک ہو جائیں اور مصیبت زدہ ہمایوں کی مدد کے لیے اس کے خلاف ہتھیار اٹھالیں۔ ہم ایک بار پھر ابوالفضل سے متفق الرائے ہیں۔ وہ لکھتا ہے "قسمت نے ایک بار پھر شیر شاہ کی یاوری کی۔ اللہ نے اس کے دشمنوں کی عقل پر پردہ ڈال دیا۔ ان میں باہمی اتفاق و اتحاد نہ ہو سکا۔" شیر شاہ نے لاہور کی جانب روانہ ہوتے میں دیدہ و دانستہ تساہل سے کام لیا۔ یہ دیری اس کے حق میں مفید ثابت ہوئی۔ جیوں جیوں وقت گزرتا گیا مرزاؤں کا باہمی اتحاد ختم ہوگیا اور ان میں باہمی اختلاف رونما ہو گئے اور وہ بابل کی مینار بنانے لگے۔

اگر شیر شاہ فوراً ہی ستلج کے پار اپنی فوج لے جاتا تو مغل ذاتی تحفظ کے لیے متحد ہو کر شیر خاں کے خلاف اس طرح لڑتے جیسا کہ چیتا گھر جانے پر عاجز ہو کر لڑتا ہے۔ لیکن مرزاؤں کا جوش عارضی و وقتی تھا کچھ دن بعد ان میں اختلاف و نفاق پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ ستلج کے اس جانب فوج لے جانے کے معنی محض بدقسمت ہمایوں کے خلاف لڑنا نہیں تھا بلکہ بہادر و چالاک کامران کا مقابلہ کرنا تھا جس کی طاقت ابھی تک مستحکم تھی اور جو کابل و قندھار کا حکمران تھا۔ لیکن قسمت کی گردش نے کامران مرزا کو بھی شیر شاہ کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بنا دیا اور دریائے سندھ کے اس جانب چپہ چپہ زمین سے مغل حکومت کا نشان مٹانے اور افغان حکومت قائم کرنے میں مرزا کامران شیر شاہ کا ایجنٹ بن گیا۔

سہسرام اور جونپور سے دہلی بہت دور معلوم ہوتی تھی۔ فرید کے کم سنی کے خوابوں سے وہ اور بھی زیادہ دور تھی۔ لیکن وہی دہلی اب شیر شاہ کے قدموں میں تھی۔ یہ شیر شاہ کی ڈھلتی عمر کی آخری بہار تھی۔

Marfat.com

حالانکہ اس کی سیاسی زندگی کا اوج کمال تھا۔ شاہی دارالسلطنت نے
اپنے اس آقا کی تبدیلی پر جشن منایا۔ ایک ضعیفہ نے یہ کہہ کر دہلی کے ہر فرد کے
جذبات کی ترجمانی کردی جب وہ جوشش مسرت سے بولی۔ "آخر دہلی
کو اپنا شوہر مل گیا" اس نے شیر شاہ کی شان میں یہ الفاظ اس کے پس پشت
کہے تھے۔ سولہویں صدی کے اس ضعیفہ کے دماغ میں شوہر کی تصویر
موجودہ زمانے کی عورت کی طرح کسی مطیع نمائشی شوہر کی نہیں تھی بلکہ
قرون وسطیٰ کے زبردست شوہر کی تھی جو اپنی عورت کی حفاظت کرتا ہے
پرورش کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ چابک سے مرمت بھی کرتا ہے۔
یہ تصویر ایک ایسے شوہر کی تھی خواہ وہ جوان ہو یا سن رسیدہ، خوب صورت
ہو یا کریہہ المنظر، لیکن منصف مزاج، سخت و بہادر ہو۔ لہٰذا اگر دہلی نے
شیر شاہ کی آمد پر جشن منایا، شیر شاہ کی تعریف کی، اسے پسند کیا تو یہ کوئی
تعجب کی بات نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ شیر شاہ نے دہلی پہنچکر جب اپنی شکل
آئینہ میں دیکھی تو وہ اپنے داڑھی کے سفید بال دیکھ کر دست تاسف
ملنے لگا۔ اس بازاری کہانی کے علاوہ اس زمانہ کے شاعر اعظم ملک محمد
جائسی نے بھی شیر شاہ کو اپنی ہندی شاعری میں خراج تحسین ادا کیا
شاعر موصوف نے اپنی مشہور کتاب پدماوتی ۹۴۷ ہجری میں شروع کی تھی
یہ شیر شاہ کی تخت نشینی کا سال تھا۔ حالانکہ شاعر موصوف شیر شاہ کا درباری
شاعر نہ تھا اور دنیاوی سرپرستی سے بے نیاز تھا۔ لیکن اس نے شیر شاہ
کو منصف مزاج، فیاض، سخت و جلیل القدر حکمران بنایا ہے۔ جائسی کے
ان الفاظ میں گویا ہندوستان کی روح بولتی ہے " بادشاہ تم جگت کے،

جگ تمہارا محتاج " یعنی تم دنیا کے بادشاہ ہو اور خلق خدا تمہاری محتاج ہے
یہ حسن اتفاق ہے کہ جائسی اور شیر شاہ اپنی تمام کروفر وعظمت میں اکبر و تلسی داس
کے علمبردار ہیں جس طرح شیر شاہ نے اکبر اعظم کی شہرت وعظمت کی بنیاد
ڈالی اسی طرح جائسی نے بھی تلسی کے لیے اودھی بولی میں شعر و شاعری کا راستہ
صاف کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آنے والے زمانے میں ہندی زبان پر اودھی

Marfat.com

کا غلبہ ہو گیا۔

نیک سیرت سلطان فیروز تغلق کی موت کے ساتھ ہی دہلی کی شان اور اس کی حکومت کا جلال ختم ہو چکا تھا۔ امیر تیمور کے ہاتھوں دہلی کی لوٹ کے بعد اب دہلی فیروز کی دہلی نہ تھی۔ بلکہ اس شوکت دیرینہ کا ایک بھوت بن کر رہ گئی تھی۔ سید اور لودی حکمرانوں نے کوئی دہلی آباد نہیں کی۔ نہ ہی ہمایوں کی جدت طبع کوئی نئی دہلی آباد کر سکی۔ حالانکہ اس نے 'دین پناہ' نام سے ایک شہر کی بنیاد ڈالی۔ اس شہر کو بھی اس کی سلطنت کی طرح شیر شاہ نے ہضم کر لیا۔ سو سال بعد شیر شاہ کی یہ دہلی بھی "پرانی دہلی" کے نام سے مشہور ہو گئی۔ جیسا کہ اب سے پہلے اور بعد ہر دہلی کا حشر ہوا دہلی میں تخت نشین ہونے کے بعد شیر شاہ کے کندھوں پر ذمہ داری آ گئی کہ وہ دہلی سلطنت و دہلی دارالسلطنت دونوں کو دوبارہ زندہ کرے۔ شیر شاہ یہ دونوں کام بیک وقت ہی کرنا چاہتا تھا۔ جب شیر شاہ نے ہمایوں کے خلاف مہم کا آغاز کیا تو اس نے دہلی بنانے کا کام بھی شروع کر دیا۔ اس کام کے لیے اس نے وہی جگہ تجویز کی جو ہمایوں پسند کر چکا تھا۔ گویا اس نے اس طرح اپنے مغلوب دشمن کو خاموش و مناسب خراج عقیدت پیش کیا جس کا ہمایوں مستحق تھا۔ اس شہر کا سرکاری نام "شیر گڑھ عرف حضرت دہلی" رکھا گیا۔ آج پرانے قلعہ کی فصیلیں اور اس کے اندر کے کچھ کھنڈر اس شہر کی کہانی اپنی خاموش زبان سے کہہ رہے ہیں۔

---

[1] روایت ہے کہ ایک رات شیر شاہ اپنے دوستوں کے ساتھ قصبہ بلیا کے بازار میں ٹہل رہا تھا ایک مجذوب "فقیر" کی نگاہ اس پر پڑی۔ وہ بڑبڑایا۔ دیکھو دہلی کا بادشاہ پیدل آ رہا ہے۔ جب شیر خاں نے اس مرد خدا کی بات سنی تو اس نے اپنی پگڑی میں ایک گرہ لگا لی اور دہلی کا بادشاہ بننے کا خیال اس کے دماغ میں آ گیا۔ (تاریخ خاں جہاں لودی قلمی نسخہ صفحہ ۲۲۹، مؤرخ نے بھی اس روایت کو بجنسہ قلمبند کیا ہے۔ مگر اس نے بلیا کے بجائے پٹنہ لکھ دیا ہے (قلمی نسخہ صفحہ ۲۲-۲۵)۔ [2] عباس نسخہ صفحہ ۱۰۶۔ [3] اکبر نامہ۔ جلد ۱ صفحہ ۳۵۴

Marfat.com

روایت ہے کہ ایک بار کسی مجذوب نے جو یو۔پی میں مقیم تھا۔ شہر بلیا کے بازار میں شیر شاہ کے متعلق پیشن گوئی کی تھی کہ وہ دہلی کے تخت پر بیٹھے گا۔ کم ازکم مخزن کی ضعیف الاعتقاد مصنف کا قول ہے کہ ہم اس داستان کو سچ مان لیں۔ عباس نے چونکہ اکبر کی خوشنودی طبع کے لیے لکھا تھا۔ اس لیے اس نے اللہ کی مرضی کی وضاحت کردی۔ وہ لکھتا ہے "خدا کا حکم تھا کہ شیر شاہ اور اس کی اولاد چند روز تک سکندر اور فریدوں سے بھی زیادہ جاہ و حشمت کے ساتھ دہلی پر حکومت کریں اور بعد میں یہ تخت ہمایوں اور اُس کی اولاد کو نصیب ہوئے۔ ابوالفضل نے اپنے فلسفیانہ انداز میں شیر شاہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے" بلگرام کی لڑائی میں ہمایوں کی شکست دنیا کی اصلاح کا باعث ثابت ہوتی ہے" تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ابوالفضل کے ان الفاظ میں کسقدر صداقت مضمر ہے۔ نظام حکومت کے سلسلے میں شیر شاہ نے کسقدر اصلاح و درستی کی۔ یہ ہم آئندہ صفحات میں دیکھیں گے۔

نئے نظام حکومت کا مقصد تھا رعایا کا اعتماد حاصل کرنا چنانچہ جب شیر شاہ کو یہ پتہ چلا کہ اس کے منظور نظر سپہ سالاروں نے مسکینوں اور غریبوں پر کیا کیا ظلم توڑے ہیں تب اس نے ان کو سختی سے سخت سزا دینے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ اس نے برہم جیت گوڑ کو سخت فہمائش کی اور دہلی میں وارد ہونے کے بعد اس کا سب سے پہلا کام تھا فاتح جنرل ناصر خاں کا تنزل کرنا۔ کیوں کہ اس نے سنبھل کی رعایا اور خدمت گاروں کے ساتھ جارحانہ سلوک کیا تھا۔ شیر شاہ نے دہلی سے لکھنؤ تک کے تمام علاقے کا حاجی خاں سروانی کو فوجدار مقرر کر دیا اور اس کے ماتحت ناصر خاں کو سنبھل کا نائب فوجدار بنا دیا۔ ان باا ثر حکام کو ان کی بے عنوانیوں کی سزا دینے کی وجہ سے ہی شیر شاہ اتنا ہر دلعزیز و کامیاب حکمران ثابت ہوا۔

Marfat.com

ہندوستان سے مغلوں کی ہجرت

افغان فوج کے آگے آگے مغل گھرانوں کے کثیر التعداد لوگ دوابہ چھوڑ کر آگرہ اور دہلی کی سمت بھاگے۔ مغلوں کو افغانوں کے تسلط میں رہنا ناگوار خاطر تھا۔ نہ وہ روپوش ہی ہو سکتے تھے۔ ہندوستان میں تو وہ اجنبی تھے ہی۔ ان کی شکل و شباہت بھی عجیب تھی۔ خصی بکرے جیسی ان کی داڑھی اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں ان کے مغل ہونے کی دلالت کرتی تھیں۔ کوئی کوئی ترک بھی ایسا تھا۔ مثلاً بیرم خاں جس کا حلیہ آرین لوگوں سے زیادہ مشابہت رکھتا تھا ایسے ترکوں پر البتہ افغان ہونے کا دھوکہ ہو سکتا تھا۔ جب بھگوڑوں کے انبوہ کے انبوہ آگرہ پہنچے تب پریشانی اور بھی بڑھ گئی یعنی اولاً ان کے آنے سے پیچھے ہٹتی ہوئی فوج میں اضافہ ہو گیا اور پراگندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ دوسرے جان و مال کا مسئلہ بھی پیچیدہ ہو گیا۔ کچھ لوگ تو تتر بتر ہو کر راجپوتانہ کی جانب چلے گئے، کچھ لوگ ہندال کے قافلے کے ساتھ ہو لیے جو مغل بیگمات کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ ہندال نے آگرہ سے الور کی سمت رخ کیا اور اس سفر کے لیے اس نے وہ راستہ اختیار کیا جو آگرہ اور الور کے درمیان جاٹ علاقے سے ہو کر جاتا ہے اور جنگلوں سے بھرا ہوا ہے۔ گلبدن نے لکھا ہے کہ اس سفر میں اس نے جری گنواروں کے پر زور حملوں کا مقابلہ کیا اور انھیں کھدیڑ دیا۔[1] ہندال اپنی جاگیر پہنچ کر کچھ دن وہاں مقیم رہا تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کو دوبارہ مسلح کر سکے اور جو کچھ مال متاع یہاں سے لے جا سکے اسے اکٹھا کرے۔ ہمایوں کے قافلے نے بھی دہلی پہنچنے کے لیے کاما اور پہاڑی[2] کے جاٹ علاقے میں سے گزرنے کے لیے اسی راستہ کو

---

[1] گلبدن صفحہ ۱۴۳۔

[2] ڈاکٹر ایس۔ کے بنرجی لکھتے ہیں ''ہمایوں بھاگ کر دریاتے (؟) کنیر (باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

اختیار کیا جو کہ ۲۰۰ سال بعد باجی راؤ راول کے رسالہ نے بھرت پور کے بدن سنگھ جاٹ کی مدد سے اختیار کیا تھا۔

کسی مستند و معتبر ذرائع سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ لاہور کی جانب واپس جاتے وقت ہمایوں دہلی میں داخل ہوا یا نہیں۔ محض ابوالفضل نے صرف اتنا لکھا ہے کہ قاسم حسین سلطان نام کا ایک سردار ۲۶ رمئی ۱۵۴۰ء کو ہمایوں سے دہلی کے نزدیک ملا[1]۔ اور بادشاہ کی خدمت کے لیے بہت سے آدمی جمع ہو گئے۔ شاید یہ وہ لوگ تھے جو دہلی سے بھاگ آتے تھے اور اب راستہ میں ریواڑی سے دہلی کے سفر میں ہمایوں کے ساتھ ہو لیے تھے۔ انھیں یہ پتہ نہ تھا کہ دہلی پر افغانوں کا پہلے ہی تسلط ہو چکا ہے دو دن بعد ہمایوں روہتک کی جانب چل دیا۔ روہتک دہلی سے ۴۴ میل مغرب میں ہے اور ہمایوں ۳۰ رمئی کو وہاں پہنچ گیا۔ روہتک ہمایوں کے تسلط میں نہیں تھا۔ بلکہ ہریانہ کا ایک حصہ تھا۔ جسے شہنشاہ نے تخت نشینی

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) پر واقع "بجونہ" پہنچا۔ اس کے بعد اُنھوں نے حاشیہ کے نوٹ میں لکھا ہے کہ ایک بجونہ ضلع علی گڑھ میں خیر کے جنوب مغرب میں ہے لیکن یہ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ ہمایوں اپنے سفر میں اس ضلع سے گزرا ہوگا (ہمایوں بادشاہ جلد ا صفحہ ۴۵) ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اس واقعہ کو نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ ڈاکٹر بنرجی نے بجونہ مقام کی تلاش غلط سمت میں کی لیکن اس حوالہ سے اس راستہ کا پتہ چلتا ہے جسے ہمایوں نے اس سفر کے لیے اختیار کیا یہ راستہ ریاست بھرتپور سے (جو اب ریاست نہیں رہی) ہو کر گزرا تھا۔ آج بھی نقشہ میں بجنہ نام کی ایک جگہ فتحپور سیکری سے ۱۲ میل دور شمال مغرب بھرتپور ریاست میں ہے۔ کاما اور پہاڑی یہ دونوں جگہ اور بھی شمال مغرب میں متھرا سے ۳۹ میل شمال مغرب میں ہیں۔ یہ صوبہ آگرہ کے "سرکار سہر" کی محالوں کے نام ہیں۔ (دیکھیے آئینِ اکبری جلد ۲ صفحہ ۱۹۵) کنبیر شاید گھمبیر دریا کا نام ہے جو جے پور کے علاقہ سے بھرتپور ہو کر بہتا ہے

[1] اکبر نامہ جلد ا صفحہ ۳۵۵۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ابوالفضل کے الفاظ "دہلی کے نزدیک" کے بجائے "دہلی" لکھا ہے۔ لیکن اس کا کوئی قاطع ثبوت ان کے پاس نہیں ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

کے بعد ایک قصیدہ کے انعام میں مرزا کامران کو بخش دیا تھا۔ لہٰذا یہ کوئی حیرت و تعجب کی بات نہ تھی کہ روہتک کے فوجی دستہ نے اس مصیبت کے وقت میں ہمایوں کو شہر میں داخل نہ ہونے دیا اور شہر پناہ کا دروازہ بند کر لیا مرزا ہندال بھی اسی وقت الور سے آگیا اور روہتک کے مقام پر ہمایوں سے آملا۔ ہمایوں کے سپاہیوں نے شہر پر حملہ کر دیا اور شہر کے محافظی دستہ کی تعزیر کی۔ اس حملہ کا منشا یہ نہ تھا کہ ہمایوں اس شہر میں ٹھہرنا چاہتا تھا بلکہ یہ اس نے اپنی عزت و آبرو بچانے کے لیے کیا تھا۔ مرزا روہتک سے جانب شمال سرہند کی طرف بھاگے۔ وہ دائم خوفزدہ رہتے تھے کیونکہ روزانہ وحشتناک خبریں موصول ہوتی تھیں کہ آج شیر شاہ ۱۳ میل آگے بڑھ آیا، آج ۶ میل ..... اسی حالت میں ہمایوں سرہند کے نزدیک پہنچ گیا۔[2]

دراصل شیر خاں ہمایوں کا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ برہم جیت گوڈا اور خواص خاں اس کام کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ اگر شیر شاہ کی یہ ہدایت نہ ہوتی کہ بھاگنے والے مغلوں کے راستہ میں کوئی مزاحمت نہ کی جاتے اور لڑائی کی نوبت نہ آنے دی جاتے تو وہ بھاگتے ہوئے مغلوں سے اتنی دور نہ رہتے۔

ہمایوں روزانہ ۲۰-۲۵ میل کا فاصلہ طے کر کے سرہند پہنچا۔ سرہند ہے۔ شاید اس نے قدیم ترکی راستہ لیا ہو گا جو کہ سمانا ہوتا ہوا موجودہ جنید و پٹیالہ سے گزرتا ہے۔[3] ۱۷ صفر مطابق ۲۳ جون ۱۵۴۰ کو ہمایوں

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ)

ڈاکٹر بنرجی نے ایک جگہ (ہمایوں بادشاہ جلد ا صفحہ ۲۵۲) تو لفظ "شاید" کا استعمال کیا ہے لیکن دوسرے مقام پر بلا کسی سند کے وہ لکھتے ہیں۔ "دہلی سے روانہ ہونے کے بعد ہمایوں ...." یہ گمراہ کن ہے۔ [2] گلبدن صفحہ ۱۴۴۔

[3] سمانہ انبالہ سے ۷ میل جنوب مغرب میں ہے۔ برنی نے لکھا ہے کہ اس مقام پر علاؤالدین

Marfat.com

کا پورا قافلہ سرہند پہنچ گیا۔ مرزا ہندال کو اس جگہ اس غرض سے تعینات کیا گیا کہ وہ ستلج والے اس راستہ کی نگرانی کرے جو کہ ماچھیوارا کے سامنے سے لدھیانہ سے ۲۷ میل سمت مشرق تھا اور جدھر سے اصلی فوج کوچ کرتی ہوتی آ رہی تھی۔ اب ہمایوں کو اپنے تواقب کرنے والے دشمنوں کا کوئی ڈر نہ تھا اور وہ جالندھر پہنچ کر ٹھہر گیا اور سرہند سے مرزا ہندال کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ جالندھر کے مقام پر ہندال کو یہ کام پھر سونپا گیا کہ بیاس ندی پر ہو کر گزرنے والے راستہ کی حفاظت کرے تاکہ ہمایوں کو راستہ میں کوئی ضرر نہ پہنچے۔ مرزا ہندال نے دریائے بیاس پر افغانوں کو روکنے کا کام مظفر بیگ کے ذمہ چھوڑ دیا اور خود سلطان پور دریا عبور کر کے پیچھے ہٹ گیا شیر شاہ نے اپنے سپہ سالاروں کو یہ تاکید کی تھی کہ لڑائی کا موقع نہ آنے دیں بلکہ مغلوں کو متواتر آگے کھدیڑتے رہیں۔ اس لیے افغانوں نے سرہند کے مقام پر ہندال سے لڑائی کی نوبت نہیں آنے دی۔ اور نہ انھوں نے ستلج کے پار مغلوں کا تعاقب ہی کیا۔ خواص خاں نے دریا کے اس جانب اپنے خیمہ لگا دیے اور شیر شاہ کے آئندہ احکام کا انتظار کرنے لگا۔ ۱۵۴۰ء[1]

نے منگولوں کے حملہ کو روکنے کے لیے ایک قلعہ بنوایا تھا۔ اس مقام پر دو سڑکیں فیروز پور اور سرہند سے ستلج کو پار کرتی ہوئی متصل ہوتی ہیں۔ ہمایوں نے روہتک سے سرہند آتے ہوئے جو راستہ لیا تھا اس راستہ پر کسی بھی مورخ نے سمانا یا کسی دوسری جگہ کا (باقی اگلے صفحہ پر) صاف ذکر نہیں کیا ہے۔ مجھے یہ نام محض اس لیے لکھنے پڑے کہ ڈاکٹر ایس۔ کے۔ بنرجی کے غلط اور گمراہ کن اندازے کو صحیح کر سکوں۔ ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے کہ "جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ افغان ان کا پیچھا نہیں کر رہے ہیں تو وہ انبالہ یا راجپور سے عام راستہ پر آ گئے اور سرہند پہنچے" ان کے بیان کے پہلے جز کی تائید کسی مستند ذرائع سے نہیں ہوتی اور دوسرا جز عقل و جغرافیہ کے خلاف ہے۔ ہمایوں ایسا نہیں کر سکتا تھا کہ وہ پہلے شاہراہ سے دہلی سے انبالہ جاتا اور پھر مغرب کی جانب گھوم کر سرہند پہنچتا

[1] میں نے پہلے لکھا تھا "یکم ربیع الاول مطابق جولائی ۱۵۴۰ء کے آغاز میں افغان

کی برسات میں لاہور شہر ایک قسم سے شرنارتھیوں کا پراگندہ کیمپ بن گیا تھا۔ ہر مغل دوست دشمن اعلیٰ وادنیٰ، محرم ونامحرم، حواس باختہ لاہور کی جانب بھاگا آرہا تھا۔ مرزا عسکری نے بھوگاؤں کے مقام پر ہمایوں کا عین وقت پر ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس نے اوپر کے مقام پر دریا کو پار کیا اور اپنے مصیبت زدہ خاندان سے لاہور آکر ملا۔ حتیٰ کہ وہ شوخ غدار سلطان مرزا اور اس کے لڑکے جنھوں نے کہ قنوج کے مقام پر ہمایوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ نئی قسمت آزمائی کے خواب میں دربدر بھٹک کر شیر شاہ سے خوفزدہ ہوکر خراب وخستہ حالت میں لاہور آپہنچے۔ کچھ وقت کو تو فضا اس طرح بدلی ہوئی معلوم ہونے لگی کہ یہ بلائے ناگہانی تمام مغلوں کو پھر ایک جا متحد ومتفق کردے گی۔ ہر فرد صلح ومصالحت کی بات کرنے لگا۔ ربیع الاول کی پہلی تاریخ مطابق جولائی ۱۵۴۰ء کے پہلے ہفتے میں شہنشاہ ہمایوں کی صدارت میں رشتۂ یگانگت ویک جہتی کو مضبوط کرنے کے لیے مغلوں کا ایک جلسہ ہوا۔ ہمایوں نے اپنے شاہی اختیارات اس مجلس کے حوالے کردیے۔ مرزا حیدر نے جو کہ اس جلسہ میں خود موجود تھا جلسہ کی کارروائی کا ایک مفصل بیان لکھا ہے جسے ابوالفضل نے بالاختصار نقل کیا ہے[1] مغلوں کا یہ جلسہ پٹھان جرگہ کی طرح

سلطان پور دریا پر پہنچ گئے۔ یہاں خواص خاں رکا اور تین مہینے تک انتظار کرتا رہا۔" یہ بیان اب رد سمجھا جاتے۔ وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ گلبدن نے لکھا ہے" ہمایوں نے یہ خبر بھیجی کہ لاہور میرے تسلط میں رہنے دو اور سرہند جہاں تم مقیم ہو میری اور آپ کی درمیانی حد بن جاتے" (ہمایوں نامہ صفحہ ۱۴۴) دراصل سرہند میں شیر خاں خود مقیم نہیں تھا۔ بلکہ وہاں اس کا سپہ سالار تھا۔ ہمایوں کو شاید اس کا پتہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ ابوالفضل نے صاف صاف لکھا ہے کہ مغل سفیر شیر شاہ کے پاس دہلی آیا۔

۱۔ یہ قابل یقین نہیں کہ شیر خاں نے خود سرہند پہنچنے سے قبل جب موسم برسات زوروں پر تھا افغان فوج کو دریائے ستلج پار کرنے کا حکم دیا ہو۔ یہ بات شیر شاہ کی عادت کے خلاف تھی۔ وہ ہر کام بہت غور وخوض سے کرتا تھا اور پوری احتیاط سے کرتا تھا۔ اگر افغان ستلج کو پار کرلیتے تو ہمایوں یہ تجویز کیسے پیش کرسکتا تھا کہ سرہند اس کے اور شیر خاں کے درمیان کی سرحد بنادی جاتے

Marfat.com

نہیں تھا جس کا فیصلہ ہر خاص و عام پر لازم ہوتا تھا۔ خواہ وہ اس فیصلہ سے متفق ہو یا نہ ہو۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے ایک "تذکرہ" یعنی اتفاق و مصالحت کا عہد نامہ تحریر کیا گیا جس پر تمام مرزا، سلطان، امیر و اخواندوں نے اپنے دستخط کیے۔ اس کے بعد فاضل بادشاہ نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا جس میں مستقبل کے لیے کوئی ٹھوس عملی تجویز نہ تھی۔ شہنشاہ نے اپنی تقریر اس اپیل کے ساتھ ختم کی۔

"حضرات۔ اگر ہم لوگوں کی باہمی نااتفاقی، بغض و کینہ کی وجہ سے ہندوستان تیموری خاندان سے نکل کر ناکسوں کے تسلط میں چلا گیا تو اہلِ عقل ہم کو کیا کہیں گے۔"

جیوں ہی بادشاہ نے اپنی فاضلانہ لیکن بے اثر تقریر ختم کی سب کی زبانیں کھل گئیں۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ مجلس کے سامنے اپنی تجویز پیش کرے اور لوگ اس کو تسلیم کر لیں۔ مرزا کامران، مرزا ہندال، (معہ یادگار ناصر) اور مرزا حیدر ہر کوئی اپنی تجویز پر بہ ضد تھا۔ مرزا کامران نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ خاندان کی سب بیگمات کو کابل چھوڑ آئے اور وہاں سے ایک فوج لے کر واپس آئے۔ اس عرصہ میں بادشاہ اور تمام مغل پہاڑیوں میں پناہ گزیں رہے۔ اس تجویز کی سب نے پرزور مخالفت کی۔ کوئی نہیں چاہتا تھا کہ بیگمات کو مردوں سے علیحدہ کر دیا جائے۔ مرزا ہندال نے ہندوستان کو دوبارہ فتح کرنے کی قابلِ تعریف تجویز پیش کی۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ شیر شاہ سے لڑنے کا ارادہ ملتوی کر دیا جائے۔ سندھ کو فتح کر کے کچھ کے راستے سے گجرات پر قبضہ کر لیا جائے اور پھر وہیں تب تک انتظار کیا جائے جب تک کہ حملہ کرنے کا کوئی اچھا موقع نہ آئے۔ مرزا حیدر نے

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ)

(ہمایوں نامہ جلد ۱ صفحہ ۳) یہ ڈاکٹر بنرجی کے لیے بڑی تعریف کی بات ہے کہ انھوں نے میری غلطی کو نہیں دہرایا۔

[1] اکبر نامہ جلد ۱ صفحہ ۳۵۷-۳۵۸۔

Marfat.com

کشمیری غداروں کی مدد سے کشمیر فتح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تاکہ وقت ضرورت سب مغل وہاں پناہ لے سکیں۔ اس نے کہا "تمام مرزاؤں کو سارنگ سے لے کر سحر ہند[1] تک کے پہاڑی ڈھالوں پر قبضہ کر لینا چاہیے اور وہیں سکونت اختیار کر لینی چاہیے۔ شیر خاں کو اس پہاڑی علاقہ تک پہنچنے میں ۴ ماہ کا عرصہ لگ جائے گا وہ اس خطہ میں اپنی توپ گاڑی نہ لا پائے گا جو میدان جنگ میں اس کا خاص سہارا ہے چنانچہ کچھ ہی عرصہ میں افغان فوج برباد ہو جائیگی۔

مرزا کامران نے اس تجویز کو ناقابل عمل بتایا اور کہا کہ اس سے دو لاکھ خاندان تباہ ہو جائیں گے۔ ادھر ہندال سندھ فتح کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اُدھر مرزا عسکری کامران کی رائے سے متفق تھا۔ ہمایوں کو مرزا حیدر کی تجویز پسند تھی۔ بالآخر جلسہ تو تو میں میں کے بعد ختم ہو گیا اور پیشتر سے بھی زیادہ دل شکنی اور اختلاف پیدا ہو گیا۔ ہر فرد اپنا راستہ تلاش کرنے لگا ہمایوں کا اپنے بھائیوں اور دیگر مرزاؤں پر رعب ختم ہو گیا۔ وہ اور بھی زیادہ غمزدہ و ناشاد ہو گیا۔ وہ مرزا حیدر کو کشمیر فتح کرنے کے لیے ..۴ موالی اور غلام مہیا کر سکا۔ سب سے پہلے مرزا حیدر ہی لاہور سے روانہ ہوا۔

---

[1] ڈاکٹر بنرلیس۔ کے۔ بنرجی نے سحر ہند کو سرہند لکھا ہے۔ اس سے تمام پڑھنے والے کے دماغ میں اس کا تعین غلط ہو جاتا ہے۔ وہ سحر ہند کو سرہند سمجھے گا جو کہ ستلج کے جنوب میں ہے۔ (ہمایوں بادشاہ جلد ۲ صفحہ) بدقسمتی سے بیورج کے حاشیہ کا نوٹ بھی گمراہ کن ہے (اکبر نامہ جلد صفحہ ۳۵۶) وہ لکھتا ہے "مرزا حیدر کا خیال تھا کہ مغلوں کو سندھ اور کشمیر سے نیچے پہاڑی سلسلہ پر قبضہ کر لینا چاہیے یعنی جنوب مشرق میں سرہند سے لے کر شمال مغرب میں راولپنڈی تک" اگر لاہور سے سمت کا اندازہ لگایا جائے تو جنوب مغرب میں سرہند پڑتا ہے جو ستلج پر واقع ہے۔ اس سے دریائے سندھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہمیں اس "سحر ہند" کی تلاش راولپنڈی اور پونچھ کے درمیان کہیں کرنا چاہیے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ ۲۲ رجب مطابق ۲۲ نومبر ۱۵۴۰ء کو مرزا حیدر پونچھ کے درہ سے داخل ہوا اور کشمیر فتح کر لیا (اکبر نامہ جلد ۱ صفحہ ۴۰۲)

Marfat.com

یہ غالباً اگست ۱۵۴۰ء کی بات ہے وہ جموں سے مغرب، شمال، مغرب میں نوشہرہ[1]
کے لیے روانہ ہوا جہاں اس کے کشمیری معاون و مددگار اس کا انتظار کر رہے
تھے۔ اس عرصہ میں چونکہ موسم برسات کی وجہ سے فوجی مہم ملتوی ہو گئی تھی اس
لیے ہمایوں کو کچھ تقویت ہوئی اور اس نے شیر شاہ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے
لیے آخری کوشش کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے اس کام کے لیے مظفر بیگ
ترکمان اور کامران کے صدر قاضی عبداللہ کو چنا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قاضی عبداللہ
شیر خاں کے پاس اپنے آقا کامران کی جانب سے کوئی خفیہ پیغام لے گیا ہو
ہمایوں کی اس آخری اپیل کو پڑھ کر دل بے اختیار درد سے بھر آتا ہے۔ اس
اپیل میں ہمایوں نے شیر شاہ سے منت و سماجت کی تھی کہ وہ اس کے
لیے کم از کم سر سند کے پار پنجاب کا علاقہ چھوڑ دے۔ سفیر شیر شاہ سے دہلی میں
ملا۔ لیکن کیا گفت و شنید ہوئی اس کا کچھ پتہ نہیں۔ گلبدن کے بیان کے
مطابق شیر شاہ نے طعنہ آمیز الفاظ میں کہا "میں نے تمہارے لیے کابل چھوڑ

---

[1] ڈاکٹر ایشوری پرشاد لکھتے ہیں: "یہ بات طے ہو گئی کہ نوشہرہ کے مقام پر فوج اکٹھی کی جائے
خواجہ کلاں کو دوسری فوج لانے کا کام سونپا گیا۔ اگر نوشہرہ مقام کا تعین نہ کیا جائے تو عام آدمی اس
سے نوشہرہ کی فوجی چھاؤنی کا اندازہ لگائے گا۔ جو اٹک کے قریب اور دریائے سندھ کے مغربی
کنارے پر ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے یہ مقام ابوالفضل کے نوشہرہ سے اخذ کیا ہے (اکبر نامہ جلد ۱
صفحہ ۳۶۔۴۰۲)۔ ڈاکٹر صاحب کی بات پر ابوالفضل کو خود تعجب ہوتا ہے کیونکہ اس وقت دریائے
سندھ کے مغرب میں نوشہرہ مقام نہ تھا۔ لیکن اس غلطی کی زیادہ ذمہ داری بیورج پر ہے۔ اس
نے اکبر نامہ کا ترجمہ کرتے وقت اس مقام پر نوشہرہ کا تعین کرنے کے لیے ایک حاشیہ کا نوٹ لکھ
دیا ہے "ضلع پشاور میں" پھر دوبارہ صفحہ ۴۰۲ پر لکھ دیا ہے کہ نوشہرہ کشمیر میں ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

اور جموں کے مغرب۔ شمال مغرب میں ہے۔ اس مقام کا انڈین گزیٹیر سے پتہ نہیں چلتا۔ یہ قدیم
دارالسلطنت تھا۔ مرزا حیدر نے اس موقع پر دریائے سندھ پار نہیں کیا تھا۔ اس لیے یہ مقام موجودہ
نوشہرہ نہیں ہو سکتا۔ یہ راولپنڈی اور پونچھ کے درمیان کوئی جگہ ہونی چاہیے۔ یہ مقام پونچھ کو جانے
والے درہ کے دوسری جانب کہیں ہونی چاہیے۔

Marfat.com

دیا ہے، وہیں چلے جاؤ[1] یہ الفاظ اب تک روایت کی تشکل میں زبان زد ہیں کسی نے ان کی صداقت پر شبہ نہیں کیا۔ لیکن مندرجہ ذیل واقعات سے جن کو ابوالفضل نے قلمبند کیا ہے اور تمام مورخوں نے (معہ ڈاکٹر قانونگو) صحیح تسلیم کیا ہے۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیر شاہ کا یہ طنز محض ایک سُنی سنائی روایت ہی ہے۔ اس عقیدے کے لیے حسب ذیل وجوہات ہیں:۔

۱۔ دہلی سے لوٹتے وقت ہمایوں کے سفیر کے ساتھ شیر شاہ کا سفیر بھی تھا۔ مرزا کامران کے باغ میں اس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا اس موقع پر لاہور کے تمام لوگ ۷ سال کی عمر سے لے کر ۷۰ سال تک کی عمر کے بادشاہ کے حسب الحکم حاضر تھے۔ اس موقع پر کوئی صلحنامہ نہیں ہوا۔ اور سفیر اسی روز رخصت کر دیا گیا۔[2]

مندرجہ بالا واقعہ سے گلبدن کی یہ کہانی فرضی معلوم ہوتی ہے کہ شیر شاہ کے طنز یہ جواب سے ہمایوں کے دل پر کچھ خراب اثر پڑا۔ گلبدن نے لکھا ہے "یہ قیامت کا دن تھا۔" لیکن جس قیامت کے دن کی طرف گلبدن کا اشارہ ہے وہ اس واقعہ سے ایک ماہ سے بھی زیادہ بعد میں آیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے شیر خاں نے ہمایوں کے خط کا جواب ٹال مٹول کے الفاظ میں دیا جس میں کر دکھاوٹی انکسار تھا۔ غنیم کے کیمپ کی کیفیت کو بغیر صحیح طور پر جانے ہوئے گفت و شنید کو توڑنا کہاں کی عقل مندی ہوتی۔ اس نے وقتِ واپسی اپنے سفیر کو شاید اس غرض سے بھیجا تھا کہ وہ ضروری اطلاع فراہم کر سکے اور ممکن ہو تو کامران کو بھی اپنے دامِ سیاست میں پھنسا لے۔

۲۔ اس قسم کے گستاخانہ جواب سے اس موقع پر ہمایوں سے زیادہ

---

[1] گلبدن۔ صفحہ ۱۴۳-۱۴۴۔

[2] جوہر قلمی نسخہ صفحہ ۵۸۔ اسٹورٹ صفحہ ۲۶۔ اکبر نامہ میں صفحہ ۳۵۸-۳۵۹ پر اس واقعہ کو ذرا بدل کر پیش کیا ہے۔ میں نے پہلے گلبدن کے بیان کو درست مان لیا تھا (شیر شاہ صفحہ ۲۲۸) ڈاکٹر بنرجی (ہمایوں بادشاہ جلد ۲ صفحہ ۲) اور ڈاکٹر ایشوری پرشاد (ہمایوں صفحہ ۱۵۹)

Marfat.com

کامران کی توہین ہوتی۔ کیوں کہ پنجاب تو کامران کے تسلط میں تھا۔ اس سے شیر شاہ کا منشا بھی فوت ہو جاتا۔ وہ کامران کو اس دھوکہ میں رکھ کر کہ ستلج کے اس جانب کا علاقہ اسی کے تسلط میں رہے گا، دونوں بھائیوں میں نفاق و اختلاف ڈلوانا چاہتا تھا۔ یہ بھی روایت ہے کہ ہمایوں نے جو سفیر قاضی عبداللہ شیر شاہ کے پاس بھیجا تھا وہ کامران کی جانب سے بھی ایک خفیہ پیغام لے گیا تھا۔ اس بات کی تائید تاریخ چغتائی سے بھی ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ اس واقعہ کے دو صدی بعد لکھی گئی تھی۔ کامران نے سفیر کے ذریعہ شیر شاہ کو یقین دلایا تھا کہ اگر پنجاب کا علاقہ اس کو دے دیا جائے تو وہ دوستی کے پردے میں ہمایوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرے گا کہ کوئی دشمن بھی نہیں کر سکتا[1] دراصل مستقبل میں کامران نے ایسا ہی کیا بھی۔ اس کی تائید ابوالفضل کے لکھے ہوئے لاہور کے واقعات سے ہوتی ہے۔

خیر اصلیت کچھ بھی ہو۔ نقصان تو ہو ہی گیا۔ شیر شاہ نے قاضی عبداللہ کو اس طرح اپنی طرف ملا لیا جس طرح جنگ چوسہ سے پیش تر اس نے ہمایوں کے سفیر شیخ خلیل کو اپنی طرف توڑ لیا تھا۔ قاضی سے اس کو یہ بھی علم ہو گیا کہ ہمایوں اور اس کے بھائیوں میں جو صلح اور مصالحت کی بات چل رہی تھی وہ ختم ہو چکی ہے۔ اور اب اور بھی زیادہ اختلاف رونما ہو گئے ہیں۔ چنانچہ قاضی کی غداری نے شیر شاہ کو یہ ترغیب دی کہ وہ اکتوبر ۱۵۴۰ء کے پہلے ہفتے میں دہلی سے سرہند کی جانب روانہ ہو گیا۔ اسی وقت اس نے خواص خاں کو اپنا فوجی دستہ لے کر ستلج پار کرنے کا حکم دیا۔ کامران مرزا کے دل میں ہنوز امید کی کرن باقی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر قاضی عبداللہ کو سرہند کے مقام پر شیر شاہ سے ملنے بھیجا۔ شیر شاہ نے قاضی کو بہت انعام و اکرام دینے کا وعدہ کیا۔ اور اس نے جا کر کامران مرزا کو یہ کہہ کر ڈرایا کہ شیر شاہ کی نیت میں فتور ہے۔ کامران مرزا ہمایوں کو لاہور میں چھوڑ کر "بھیرا" کی

در

---

[1] برجی نے اس کا حوالہ دیا ہے (ہمایوں بادشاہ جلد ۲، صفحہ ۹)

Marfat.com

جانب فرار ہو گیا جو اٹک سے جنوب مغرب میں ۹۰ میل ہے۔ اس نے سیاست کی بساط پر پنجاب کو بچانے کی آخری بازی لگادی۔ اور نمک حرام و غدار قاضی کو پھر صلح کا پیغام لے کر بیاس کے مشرقی کنارے پر واقع سلطان پور بھیجا۔ قاضی آیا اور اس نے خواص خاں سے زور دے کر یہ کہا کہ وہ سلطانپور دریا کو جلد از جلد عبور کرے (ابوالفضل نے خواص خاں کے بجائے شیر خاں لکھا ہے یہ غلط ہے[1] مظفر ترکمان نے، جس کو سلطان پور دریا کے نزدیک نگرانی و جاسوسی کے لیے مقرر کیا گیا تھا، بادشاہ کے پاس یہ خبر لایا کہ دشمن نے بیاس دریا پار کر لیا ہے اور اس کے بھائی کے لڑکے جنید بیگ کو قتل کر دیا گیا ہے[2] اگر ہم یہ مان لیں کہ اس واقعہ اور مظفر بیگ کے لاہور پہنچنے میں ایک ہفتہ کا وقفہ رہا ہو گا تو خواص خاں کے کمان میں جو ہراول دستہ تھا اس نے سلطان پور کے دریا کو اکتوبر ۱۵۴۰ء کے تیسرے ہفتے میں عبور کیا ہو گا۔ جیسا کہ ابوالفضل کا بیان ہے کہ "اواخر جمادی الثانی یعنی اکتوبر کے آخری ہفتے میں شہنشاہ جہانبانی اور دیگر مرزاؤں نے دریائے لاہور یعنی راوی جو کہ اس وقت پایاب تھا عبور کیا اور وہ منزل بہ منزل چناب کی سمت میں چل پڑے۔"

مظفر بیگ کی سلطان پور سے آمد نے لاہور میں روز قیامت بپا کر دیا لئہ کہ ہمایوں کے سفیر کی واپسی نے جو کہ شیر خاں کے پاس سے سنگدل جواب لایا تھا۔ اگرچہ گلبدن بیگم اس وقت لاہور میں ہی موجود تھیں مگر ۵۰ سال بعد اس کی یادداشت نے اس کو دھوکہ دے دیا۔ تاہم لاہور سے مغل ہجرت کا جو نقشہ گلبدن نے پیش کیا ہے وہ درحقیقت بہت واضح اور صحیح ہے۔ وہ لکھتی ہیں " جیسے ہی یہ خبر بدملی اعلیٰ حضرت نے لاہور سے

---

[1] ابوالفضل نے لکھا ہے کہ نمک حرام قاضی نے شیر خاں کے سامنے دریا عبور کرنے کی تجویز رکھی۔ (اکبر نامہ صفحہ ۳۵۹) دراصل شیر خاں ابھی یہاں تک پہنچا ہی نہ تھا۔ سب سے پہلے خواص خاں نے ہی دریائے بیاس پار کیا تھا۔ [2] اکبر نامہ۔ صفحہ ۳۵۹

Marfat.com

کوچ کر دیا۔ ہر چہار سو حشر بپا ہو گیا۔ لوگوں نے اپنے آراستہ مکان و پیراستہ فرنیچر کو جہاں کا تہاں چھوڑا اور جیسے بھی بنا نقدی اپنے ہاتھ کر لی۔[1]

اکتوبر ۱۵۴۰ء کے آخری ہفتے میں مغل خاندانوں کا دو لاکھ کا ایک قافلہ طوفانی دھار کی مانند دریائے راوی کو پار کر کے مغرب کی سمت بے سرو سامانی بھاگا چلا جا رہا تھا۔ یہ سماں نہایت ہی دردناک و رقت آمیز تھا پھر بھی یہ نظارہ اس سانحہ سے کم اندوہ گین تھا جو کہ ۴۰۷ سال بعد برطانوی حکومت کے سایہ میں ہمارے ہی ملک کے لوگوں کے سامنے پیش آیا۔ جب کہ کلکتہ اور لاہور میں ان کو جان و مال کی بربادی و تباہی سے دوچار ہونا پڑا اور ناگفتہ بہ مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔ کامران مرزا ایسے وقت میں بھی اپنی بد طینتی و تنگ ظرفی سے باز نہ آیا۔ سب کچھ برباد ہونے کے بعد بھی وہ اپنے سفلہ پن سے چپکا رہا۔ چناب کے کنارے پر پہنچنے کے بعد وہ اپنے سپاہیوں اور متوسلین کو ساتھ لے کر علیحدہ ہو گیا اور تیزی سے 'بھیرا' کی جانب چل پڑا۔ بھیرا ایک نہایت ہی اہم مقام تھا۔ یہاں سے تین سڑکیں تین طرف جاتی تھیں پہلی پیشاور سے گزرتی ہوئی کابل جاتی تھی۔ دوسری جنوب سے ہوتی ہوئی بنگاش (کوہاٹ) کے علاقے کو جاتی تھی۔ اور تیسری کلر علاقہ میں ہو کر کشمیر کی جنوبی سرحد تک پہنچتی تھی کشمیر کلر علاقہ کے شمال میں پڑتا تھا۔ ہمایوں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ اگرچہ وہ سندھ پر تسلط کرنے کے متعلق مرزا کامران کی تجویز کو منظور کرنے کے حق میں نہ تھا۔ لاہور پہنچنے کے فوراً ہی بعد ہمایوں نے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ بدخشاں جانا چاہتا ہے۔ مگر یہ شبہ کر کے کہ وہ کہیں کابل پر قابض نہ ہو جائے کامران نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ ہمایوں اپنے بھائی کے شبہ کو تاڑ گیا۔ اور پھر اس نے اس بات کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ وہ بابر کی ایسی نیک طینت اولاد تھا کہ اس کو یہ گوارا نہ تھا کہ جو کچھ اس کے والد نے اس کے چھوٹے بھائی کو دیا تھا وہ اس کو چھین لے

---

[1] گلبدن صفحہ ۱۴۴۔

Marfat.com

وہ اتنا ایماندار تھا کہ جو دست راست سے ایک بار دے چکا تھا۔ اس کو دست چپ سے واپس لینے کی بات کو کبھی سوچتا بھی نہ تھا مگر ہمایوں کے متعلق کامران کا باطن شبہات سے سیاہ تھا۔ وہ ہمایوں سے کچھ ہی روز قبل بھیرا پہنچا تھا۔ ہمایوں نے خواجہ کلاں بیگ کو یہ ہدایت دے کر بھیجا تھا کہ وہ پونچھ کے درہ کے دہانے پر بمقام سحر ہند (سرہند نہیں) اس کے قافلے کے پہنچنے کا انتظار کرے۔ مگر وہ اپنے وطن سیالکوٹ کو بھاگ گیا۔ اس پر کامران نے اُسے قید کر لیا اور اس کا مکان مسمار کر دیا کامران کے اس رویہ سے ہمایوں کو بہت غم ہوا۔ اس میں اس کو توہین کا بھی احساس ہوا۔ اس کے ساتھی طیش میں آ گئے اور جبار قلی قرچی تو کامران کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اگر ہمایوں نے اپنے سوتیلے بھائیوں کے ساتھ برادرانہ بلکہ پدرانہ سلوک نہ کیا ہوتا تو شاید ایسے نازک ہنگامہ میں اس کی حالت اتنی ناگفتہ بہ نہ ہوتی اور اس میں بھی شک نہیں کہ اگر کامران قتل ہو جاتا تو ہزاروں مغل مہاجرین کو پریشانی اور موت کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔

اس طرح کامران نے ہمایوں کے کشمیر جانے کے منصوبہ پر پانی پھیر دیا۔ سکندر توپچی، کشمیری افسر، جو نمک کی پہاڑی کے پاس ہمایوں کی ہم رکابی کے لیے انتظار کر رہا تھا۔

وہ مرزاؤں کے باہمی جھگڑوں کی خبر سن کر بہت پست ہمت ہو گیا تھا۔ ہمایوں کا دماغ ابھی بھی تذبذب میں تھا۔ کامران کے متعلق ہمایوں کے نرم رویہ اور پس وپیش نے مرزا ہندال اور یادگار مرزا کے صبر کے پیالے کو لبریز کر دیا تھا۔ بالآخر ہمایوں ان کی تجویز مان کر بادل ناخواستہ سندھ جانے کے لیے تیار ہو گیا اور اس نے جہلم کے مشرقی کنارے سے ہوتے ہوئے ملتان پہنچنے کے لیے جنوب کی سمت کوچ کر دیا۔ کچھ منزلوں تک مرزا ہندال اور یادگار ناصر اس کے ساتھ رہے بعد از شاید بے مروتی کے جذبے سے سرشار ہو کر اس سے (غالباً خوشاب اور سرگزار کے بیچ کسی مقام پر) علیحدہ ہو گئے۔ اس

Marfat.com

اثنا میں شیر شاہ کی فوج بھاگتے ہوئے مغلوں کے قریب آتی جا رہی تھی اب ہمایوں کے پاس دوسرا چارہ نہ رہا۔ وہ مغرب کی سمت بھاگا اور دریائے جہلم عبور کر کے اس پار چلا گیا۔ اپنے بھائیوں اور چچا کی بے وفائی سے تنگ آ کر وہ خوشاب کی طرف شتابی سے چل پڑا۔ خوشاب بھیرا سے جنوب مغرب ۴۰ میل پر ہے۔ وہ شاید خوشاب مرزا کامران سے ایک دو روز ہی قبل پہنچا تھا۔ یہاں بھائیوں میں اتفاق سے ملاقات ہو گئی۔ مگر ان کی کشیدہ خاطری اور بھی زیادہ ہو گئی اور کامران کی بدطینتی صاف ہو کر سامنے آ گئی سندھ نہ جا کر جو ہمایوں مغرب کی جانب مڑ پڑا تھا۔ اس سے کامران کے دل میں شک پیدا ہو گیا۔ اس نے ہمایوں کو اور ذلیل کرنا چاہا اس نے شاہی لقب اختیار کر لیا اور اپنے نام کا خطبہ بھی خوشاب میں پڑھوایا۔ اس وقت شیر شاہ جہلم کے دوسرے کنارے پر تھا۔ دہشت زدہ ہو کر دونوں ہی بھائی سندھ (دریا) کی طرف ۸ کوس تک بھاگتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک تنگ درہ کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں سے سڑک دو جانب جاتی تھی۔ ایک بہ سمت جنوب ملتان کو اور دوسری کوہاٹ ہوتی ہوئی کابل کو۔ اب کامران کو یہ شک ہوا کہ اگر ہمایوں کی فوج درہ میں پہلے داخل ہو گئی تو اس کو درہ کے دہانہ پر ہی رکنا پڑے گا۔ اور ممکن ہے ہمایوں کابل جانے کا ارادہ کرے۔ اور بنگاشن علاقے کے بیچ سے ہوتا ہوا کابل پہنچ کر اس علاقے پر قبضہ کرے۔ مگر یہ خیال تو ہمایوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا پھر بھی یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ درہ کون پہلے پار کرے دونوں رقیبوں نے میان سے باہر تلواریں نکال لیں۔ ہمایوں کے لیے تو سبقت کا سوال یوں تھا کہ وہ عمر میں کامران سے بڑا تھا اور بادشاہ تھا۔ ادب کا بھی یہی تقاضا تھا کہ وہ درہ میں پہلے داخل ہو۔ ایام مصیبت میں بھی اس کو خودداری کا بے حد لحاظ تھا جب وہ آگے سے بھاگ رہا تھا تو اتفاقاً اس کے ایک وفادار ساتھی میر فخر الدین نے اپنا گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ اس بے عنوانی کی سزا قتل ہوتی مگر بادشاہ نے ضبط سے کام لیا، ایسا تھا ہمایوں چھوٹے

Marfat.com

چھوٹے معاملوں میں تو اتنا باخبر اور ہشیار تھا ۔ مگر قسمت کی گردش کی جانب سے لاپرواہ اسی وجہ سے اس کو یہ دن دیکھنا پڑا ۔ بالآخر اس ناخوشگوار واقعہ کا فیصلہ ابوالبقا نام کے ایک فقیر نے مداخلت کر کے کرایا ۔ دونوں فریقوں نے سبقت کا سوال کا حل اسی پر چھوڑ دیا ۔ فقیر نے اپنا فیصلہ ہمایوں کے حق میں دیا ۔ لیکن یہ صاف کہدیا کہ یہ ترجیح اس لیے نہیں ہے کہ وہ بادشاہ ہے بلکہ اس لیے ہے کہ وہ کامران کا بڑا بھائی ہے ۔ ہمایوں کی رہنمائی میں مصیبت زدہ مہاجرین نے درہ پار کر لیا[1] اور چند میل دور جا کر جہاں سڑک دو حصوں میں تقسیم ہوتی تھی ۔ دونوں بھائی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے بعد مدت کے دونوں بھائی کابل کے قلعہ کے نیچے ملے جہاں ان کے باہمی تنازعے پھر شروع ہو گئے

شیر شاہ کا لاہور اور خوشاب کیلئے سفر

۱۵۴۰ء کی برسات میں شیر خاں کے جاسوس اس کو لاہور کے واقعات کی متواتر خبر دیتے رہے ۔ قاضی عبداللہ نے خاص طور سے وہاں کے پورے حالات کی رپورٹ دی ۔ اس کے بعد ہی شیر شاہ نے دریائے بیاس پر واقع مغل چوکیوں پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا ۔ خواص خاں کو جو کہ سرہند میں ڈیرہ ڈالے ہوتے تھا ۔ اکتوبر کے شروع میں ستلج پار کرنے کا حکم ملا ۔ شیر شاہ خود بھی معہ فوج کے ستلج پہنچ گیا ۔ وہ چاہتا تھا کہ ہمایوں کے تعاقب میں جانے سے قبل سرہند کی سرکار کا معقول بندوبست کر دے ۔ سرہند کو

---

[1] جغرافیہ میں یہ مقام صاف طور پر خوشاب تحصیل میں سکیسر پہاڑی . . . . کی تلہٹی میں دکھایا گیا ہے ۔ یہ میاں والی سے بروئے مشرق ۲۵ میل شمال میں ۳۲ء۳۱ اور مشرق میں ۵۸ء۱۰ کے درمیان واقعہ ہے ۔ یہ پہاڑی اس سرے کا نقطہ ہے جہاں پر پہاڑی سلسلے کے دو حصوں کا اتصال ہوتا ہے ۔ (دیکھیے امپیریل گزیٹ جلد ۲۱ ۔ صفحہ ۳۰۹)

Marfat.com

خواص خاں کے تصرف میں دے دیا گیا۔ لیکن خواص خاں اس وقت فوجی مہم میں مصروف تھا۔ سرہند کے بندوبست کی ذمہ داری اس کے ایک غلام ملک بھگونت کو دیدی گئی جو ایک ہندو غلام تھا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔

شیر شاہ کا مغلوں سے لڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ یہ چاہتا تھا کہ ان کو دریائے سندھ پار کرنے میں کوئی مزاحمت نہ کی جاتے۔ اسے محض یہ خوف تھا کہ کہیں ہمایوں سندھ یا کشمیر نہ پہنچ جاتے۔ جیسا کہ مرزا ہندال اور مرزا حیدر چاہتے تھے۔ چنانچہ شیر شاہ کو تعاقب کی اس قسم کی تجویز بنائی تھی۔ جس سے مغلوں کو سندھ یا کشمیر میں جاتے اقامت حاصل کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جاتے۔ لہٰذا اکتوبر کے تیسرے ہفتہ میں شیر شاہ نے ستلج پار کرکے خواص خاں کے ساتھ آگے بڑھنے کا پروگرام بنایا۔ اس نے خواص خاں کو حکم دیا کہ وہ لاہور پہنچنے کے لیے جالندھر امرتسر کا براہ راست راستہ لے۔ کیونکہ یہ راستہ چھوٹا تھا اور وہ خود اپنی اصل فوج کے ساتھ اس تاک میں رہا کہ اگر مغل لاہور سے کسور کے راستہ باری دواب میں سے (راوی اور ستلج کے درمیان) گزر کر ملتان جانا چاہیں تو افغان فوج راستہ میں حائل ہو جاتے۔ جب شیر شاہ کو یہ خبر ملی کہ تمام مرزا لاہور سے جانب مغرب بھاگ گئے ہیں تب دونوں سمت سے افغان فوج لاہور پہنچ چکے تھے۔

کسور سے ۳۵ میل دور لاہور پہنچنے کے بعد شیر شاہ نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ بلکہ وہ مغلوں کے تعاقب میں تیزی سے مغرب کی جانب روانہ ہو گیا۔ جب وہ چناب کے کنارے پر پہنچا تو اُسے یہ معلوم ہوا کہ ہمایوں اپنے بھائیوں سے جُدا ہو گیا ہے۔ یہاں سے اس نے قاضی عبداللہ کی کمان میں ایک فوجی دستہ جنوب میں ملتان کی جانب مرزا ہندال اور یادگار مرزا۔ کے تعاقب میں روانہ کیا اور خود بھیرا کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس کو یہ پیش بندی کرنی تھی کہ ہمایوں نمک کی پہاڑیوں کے راستہ کشمیر نہ چلا جاتے۔ بھیرا سے وہ خوشاب کی جانب گیا۔ اور جب وہ

Marfat.com

ہمایوں سے تین منزل پیچھے تھا تو اس کو یہ معلوم ہوا کہ ہمایوں اور کامران ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ہیں اور مختلف راستوں پر چلے گئے ہیں اس نے خوشاب میں قیام کیا اور تمام قابل افسروں کو فوجی دستوں کے ساتھ مغلوں کی تلاش میں اطراف و جوانب بھیجا۔ خواص خاں کو حکم دیا کہ وہ جہلم کے مغربی کنارے کنارے ہمایوں کے تعاقب میں جائے۔ قطب خاں نائب (جسے غلطی سے بنیت لکھدیا ہے) جو کہ ایک قابل اور تجربہ کار افسر تھا۔ کامران کی فوج کا پیچھا کرنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ خواص خاں کو یہ بھی صاف صاف ہدایت دی گئی کہ بادشاہ سے لڑائی کی نوبت نہ آنے دے بلکہ متواتر اس کا پیچھا کرتا رہے جب تک کہ وہ سلطنت کی حدود سے باہر نہ چلا جائے (عباس) شیر شاہ کا رخ اب کامران کی جانب زیادہ سخت ہو گیا۔ کیوں کہ وہ بابر اور ہمایوں کی طرح بادشاہ بننے کی فکر میں تھا۔

کچھ ہی عرصہ بعد شیر شاہ کو قاضی عبداللہ کی زبوں حالت کی خبر ملی۔ دہشت سے عاجز آکر مرزا ہندال اور یادگار ناصر ملتان اور اوچہ میں سنسان راستوں سے سفر کرتے رہے۔ نہ تو ان کو اپنی منزل مقصود کا گمان تھا نہ اپنے مغل کا یقین[1] قاضی عبداللہ میں ضرورت سے زیادہ جوش تھا۔ وہ مرزاؤں کی تلاش میں ایک اسکاؤٹ دستہ لے کر نکل پڑا اور انجام کار ان کے ہاتھوں پڑ گیا تمام افغان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ مگر بابا دوست کی سفارش پر قاضی عبداللہ کی جان بخشی کر دی گئی۔ بابا دوست مرزا ہندال کے استاد اور حمیدہ بانو بیگم کے والد تھے۔ جہاں مولوی اور پنڈت علم و تقدس کا نمائشی نقاب پہنتے ہوں، جہاں عقل پر اوہام پرستی کا غلبہ ہو وہاں قاضی عبداللہ جیسے غداروں اور مفسدوں کو بھی موت سے امان مل جاتی ہے اور وہ سوسائٹی کی مذمت اور نکتہ چینی سے بچ جاتے ہیں۔

ہمایوں اور مرزا ہندال کچھ عرصہ بعد اوچ کے نزدیک ملے۔ اس سے

---

[1] مرزا ہندال کی صحرا نوردی کے لیے دیکھیے (اکبر نامہ۔ جلد ا صفحہ ۳۶۰-۳۶۱)

Marfat.com

پیش تر دونوں بھائیوں کی نقل وحرکت کے متعلق مورخین میں اختلاف رائے ہے۔ عباس نے محض اتنا ذکر کیا ہے کہ خواص خاں کو جب یہ خبر ملی گئی کہ ہمایوں اوچہ اور ملتان سے باہر چلا گیا ہے تب وہ واپس ہوگیا۔ لیکن ابوالفضل نے زیادہ مفصل لکھا ہے وہ صحیح ہے۔ مورخین کے مختلف بیانات سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ خواص خاں کسی بھی جگہ ہمایوں کے بہت نزدیک نہیں گیا۔ جب وہ سندھ کی جانب پیچھے لوٹ رہا تھا۔ یہ بات یوں بھی سمجھ میں آتی ہے کیونکہ پنجاب کے علاقہ سے پہاڑی افغانوں کی بہ نسبت مغل زیادہ واقف تھے۔ یہ علاقے اس قسم کے خانہ بدوش جنگ جو قبائل سے آباد تھے جو کسی سرکار کے مطیع نہ تھے بلکہ زر کے عوض اپنی خدمات ہر طلب گار کو سونپ دینے کو تیار رہتے تھے۔ دوسرے پہاڑی علاقے کے نشیب وفراز درہ و گھاٹی میں شیر خاں کی فوج کی نقل وحرکت کے لیے وہ آزادی حاصل نہ تھی جو انھیں گنگا کے دوآب یا دہلی کے میدانوں میں نصیب تھی۔

بہر حال ہمایوں خوشاب سے سندھ پہنچنے کے لیے جنوب کی جانب مڑا۔ یہ نومبر ۱۵۴۰ء کے وسط کا واقعہ ہے۔ اس کا تعاقب کرنے والے کم از کم سات منزل اس سے پیچھے تھے۔ غالباً خواص خاں کو یہ بات معلوم کرنے میں کچھ دن صرف ہو گئے کہ آیا ہمایوں دریائے سندھ کے مشرقی کنارے سے ہوتا ہوا سندھ گیا ہے یا ملتان اور اوچہ کی جانب گیا ہے جو ابھی تک شیر شاہ کی حکومت سے باہر تھے۔ ہمایوں کے اس سفر کے متعلق دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ پہلے اوچہ پہنچا نہ کہ ملتان۔ اس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمایوں نے یہ سفر جہلم ندی کے مغربی کنارے سے ملتان کے اس پار تک کیا جس کے نزدیک جہلم اور بیاس کا سنگم ہے۔ اس نے اس دریا کو غالباً اوچہ[1]

---

[1] ڈاکٹر بنرجی لکھتے ہیں کہ ہمایوں دریا کے مغربی کنارے سے ہوتا ہوا اوچہ پہنچا۔ جو ملتان سے سو میل جانب شمال ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے قلم نے بھول سے جنوب کی بجائے

Marfat.com

اور ملتان کے درمیان کسی جگہ پار کیا ہوگا۔ وہ ارادتاً ملتان سے بچ کر نکلا۔ اسے اندیشہ تھا کہ مبادا اس کی نقل و حرکت میں افغان مداخلت نہ کردیں۔ اس طرح سفر کرتے ہوتے ہمایوں شعبان یعنی ۹۴۰ھ کے آخری دنوں میں صحیح سلامت اوچھ[1] پہنچ گیا۔

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ابوالفضل ہم کو یقین دلاتا ہے کہ خواص معہ ایک کثیر افغان فوج کے ہمایوں کے تعاقب میں آرہا تھا۔ مغل فوج تعداد میں کم تھی پھر بھی خواص خاں کی یہ ہمت نہ ہوسکی کہ انھیں لڑائی کے لیے للکارے[2]۔ یہ ابوالفضل کے قلم کا ایک کرشمہ ہے جو اپنے آقا مغلوں کی شہرت و ناموری کی خاطر سیاہ کو

شمال لکھ دیا ہے۔ (ہمایوں نامہ جلد ۲ صفحہ ۱۹) ملتان آج بھی اپنی پرانی جگہ پر ہے۔ اگرچہ دریائے بیاس نے اپنا راستہ بدل دیا ہے۔ اوچھ اب کھنڈر بن چکا ہے اور ملتان سے ۷۰ میل جنوب میں ہے۔ پنج ند دریائے سندھ میں پٹھان کوٹ کے مقام پر ملتا ہے جو اوچھ سے ۴۸ میل جنوب میں ہے۔ یہ دریا بابر کی سلطنت اور سندھ کی خود مختار ریاست کی حد تھی۔ اوچھ کے متعین کیلئے دیکھیے ہودی والا اسٹڈیز صفحہ ۲۶-۲۸

[1] یہ اور آئندہ کے دو اقتباس اکبرنامہ سے ماخوذ ہیں بیورج کی قدر کرتے ہوئے بھی ہم یہ کہنے کو مجبور ہیں کہ اوچھ کے تعین کے لیے جو انھوں نے حاشیہ کے نوٹ لکھے ہیں اس نے ہمایوں کے سوانح نگاروں کو گمراہ کردیا ہے۔ بیورج نے لکھا ہے کہ "ہمایوں اوچھ کے بالمقابل پہنچا اس کا قافلہ چناب ندی کے مغربی کنارے سے سفر کررہا تھا جو چناب اور سندھ (باقی اگلے صفحہ پر) کے درمیان ہے"۔ اصل عبارت بالکل صاف ہے۔ اس میں غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس میں لکھا ہے "اوچھ پہنچا"، آگے چل کر ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اس مقام پر دریا پار کرنے کے لیے بخشو لنگاہ نے کشتیاں مہیا کیں۔ اس سے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہمایوں اوچھ کے سامنے کیسے تھا۔ کیونکہ یہ دریا بھکر جانے کے لیے مقام پر پار کرنا تھا۔ اوچھ سے ....

.... بھکر جانے کے لیے جو دریا پار کرنا تھا وہ ستلج ہے جو پٹھان کوٹ جاکر اوچھ سے ۴۸ میل دور جنوبی پنجاب کے دیگر چار دریاؤں سے ملتا ہے۔ اس لیے ہمایوں اور خواص خاں چناب کو عبور کرکے اس کے مغربی کنارے پر اوچھ سے کچھ دور شمال پہنچے ہوں گے۔

Marfat.com

سفید اور سفید کو سیاہ بناتا ہے۔ یہ وہی خواص خاں تھا جس نے کہ دوبار چوسہ اور بلگرام میں ہمایوں کی فوجوں کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ ہمایوں سے کسی قسم کا تصادم نہ ہونا خواص خاں کی کمزوری نہ تھی بلکہ وہ شیر شاہ کے آہنی ضبط و نظام کا ثبوت ہے۔ شیر شاہ دور بیٹھے ہوتے بھی اپنے احکام سے اپنی فوج کی نقل و حرکت کی رہنمائی کر سکتا تھا اور خواص خاں جیسا جری سپہ سالار بھی اس کے احکام کی خلاف ورزی کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ ملتان اوچہ کا درمیانی علاقہ ایک نومسلم کے تسلط میں تھا جس کا نام بخشو لنگاہ تھا۔ یہ لنگا قبیلہ سے تھا۔ اور مرزا کامران کا باجگذار تھا۔ افغان فوج ابھی فاصلہ پر تھی بخشو لنگا نے ہمایوں کے ساتھ موانست کا سلوک کیا۔ بادشاہ نے اسے خان جہاں کا خطاب عطا کیا۔ بادشاہ کا یہ فعل ایسا تھا گویا وہ دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہے اور اعزاز و خطاب بخشنے کا اسے حق حاصل ہے۔ بخشو لنگاہ نے ہمایوں کی مدد اس ڈر کی وجہ سے نہیں کی تھی بلکہ وہ ارغونوں سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس نے بھکر کے راستہ میں دریا پار کرنے کے لیے بہت سی کشتیاں دیں[1] ستلج دریا کو اس کے سنگم سے کچھ اوپر ان کشتیوں کی مدد سے پار کرنے کے بعد ہمایوں کا قافلہ پنج ند دریا سے فاصلے پر ہی رہا کیونکہ اسے افغانوں کے تعاقب کا اندیشہ تھا۔ اس طرح یہ قافلہ سندھ کے ریگستان میں داخل ہو گیا اور بقول عباس اٹکل پچو اور قیاساً بھکر کی جانب چل دیا۔ آخر ایک روز ان لوگوں نے نقارہ کی آواز سنی معلوم ہوا کہ مرزا ہندال اور یادگار مرزا یہاں سے تین کوس دور ہیں اور راہ تلاش میں کوشاں[2]۔

---

[1] ابوالفضل صفحہ ۳۶۴ [2] ہم نے ابوالفضل کے واقعات کو از سر نو ترتیب دی ہے۔ کیوں کہ کہیں کہیں ان میں غلطی ہے۔ ابوالفضل نے اپنے واقعات کے سلسلے میں ہمایوں کو مرزا ہندال اور یادگار مرزا سے ملاقات ۱۵۴۰ء کے آخری دنوں میں اوچ پہنچنے سے پہلے دکھائی ہے۔ (اکبر نامہ جلد ا صفحہ ۳۶۳) لیکن یہ غلط ہے۔ ہندال اور ہمایوں کو اوچ پہنچنے سے پہلے ریگستان کہاں مل گیا۔ جہلم اور سندھ کے درمیانی کوئی ریگستانی علاقہ اس قسم

Marfat.com

افغان مورخ عباس ونعمت اللہ (مصنف مخزن) نے اس امر پر بہت کم روشنی ڈالی ہے کہ شیر شاہ کے سپہ سالاروں نے مغل فوج کا تعاقب کس طرح کیا۔ ان کے بیانات پراگندہ اور تاریک ہیں انھوں نے زبانی روایتوں پر انحصار کیا ہے جو کہ نہ تو مکمل ہی ہوسکتی ہیں نہ صحیح۔ جہاں تک پنجاب میں شیر شاہ وافغان فوج کی نقل وحرکت کا سوال ہے۔ مصنف مخزن بمقابلہ عباس زیادہ واقف کار معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی ان قصہ کہانیوں کی بنا پر اس وقت کی تاریخ لکھنا کسی مورخ کے لیے آسان نہیں۔ دوسری دقت یہ ہے کہ اگر ان واقعات کی کڑی تنقید اور چھان بین کی جاتے تو اندیشہ ہے کہ کچھ اصل باتیں کہیں نظر سے اوجھل ہوجایئں اور اگر ان کو ہوبہو نقل کردیا جاتے تو یہ لغو اور از بعید از عقل معلوم ہوتی ہیں[1]

مصنف مخزن نے لکھا ہے کہ "جب وہ تین منزل کے فاصلہ پر تھا شیر شاہ نے سُنا کہ ہمایوں اور کامران ایک دوسرے سے جدا ہوگئے ہیں۔ یہ علیحدگی خوشاب سے چند میل مغرب میں ہوتی۔ اسس

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ)

کا نہیں نہ خوشاب اور اوچہ کے درمیان ہی کوتی ریگستان ہے۔ اس قسم کا ریگستان کافی دور جاکر مشرق میں ملتا ہے۔ جو قافلہ گزرنے کا راستہ ہے ہنمال ۲۰ روز تک لاہور ملتان سڑک سے دور بھاولپور ریگستان کے شمال مغربی علاقہ میں چکر کاٹتا رہا۔

[1] میں نے اپنے شیر شاہ کے اول ایڈیشن میں اسی سخت نظری سے کام لیا جو کہ ایک نوآموز کو صحیح سمت میں رکھتی ہے۔ لیکن اب جبکہ ہم کو قرون وسطٰی کے سوانح نگاروں کی ذہنی بناوٹ سے زیادہ واقفیت حاصل ہوگئی ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میں نے ان کے متعلق صبر وانصاف سے کام نہیں لیا۔ چنانچہ میں نے ایسے واقعات کو مسترد کردیا ہے جن کو کہ ان کے مناسب ماحول میں سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے تھا۔ مگر میں تو ان کے متضاد بیانوں سے اس قدر برافروختہ ہوگیا تھا کہ میں نے ان کی بالکل پرواہ نہ کی لیکن اب میں نے اس غلطی کی تلافی کردی ہے۔

Marfat.com

نے اپنی فوج کا ایک بڑا حصہ خوشاب کی جانب مغلوں کا پیچھا کرنے کے لیے بھیجدیا۔ اور اس طرح وہ خوشاب سے ایک منزل اور آگے بڑھ گیا۔ یہاں شیرشاہ کی حالت نازک ہوگئی ہے کیوں کہ اس کے ہمراہ قلیل فوج رہ گئی تھی۔ لہٰذا خواص خاں کو اپنی فوج دو حصّوں میں منقسم کرنا پڑی۔ وہ خود سندھ کے کنارے کنارے چلا اور قطب خاں اور دیگر سرداروں کو کوہاٹ کے راستہ بھیجدیا۔" یہ واقعہ ہے کہ خوشاب کے اس پار شیرشاہ کی حالت نازک ہوگئی تھی لیکن یہ خطرہ کہاں سے پیدا ہوا۔ ایک خطرہ یہ ہوسکتا تھا کہ مغلوں کا کوئی دستہ یکایک سامنے آگیا ہو۔ جو محمد سلطان مرزا اور اس کے لڑکے الوغ مرزا اور دوسرے سرداروں کی کمان میں ملتان سے بھاگ نکلا تھا اور پیچھا کرنے والی افغان فوج کی نظر سے بچ گیا ہو ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس سے قبل کہ کامران نے سندھ کو دھنکوٹ[2] کے مقام پر (تزک میں دین کوٹ لکھا ہے) عبور کیا۔ یہ مغلوں کا فوجی دستہ کامران سے آکر مل گیا۔ اس زمانے میں سندھ ندی کے کنارے دھنکوٹ ایک مشہور گھاٹ تھا۔ یہ کالاباغ سے ۷ میل کے فاصلہ پر تھا۔ مگر اب تہہ آب ہوگیا ہے۔ کالاباغ خوشاب سے تقریباً سو میل شمال مغرب میں ہے اور وہاں کو جانے والی سڑک خوشاب کے پاس سے

گزرتی ہے۔ لہٰذا یہ مرزا لوگ شیرشاہ کی نگاہ بچا کر بھاگے ہوں گے جس سے شیرشاہ کو یہ خدشہ ہوگیا ہوگا کہ کہیں اور زیادہ مغل فوج پیچھے سے نہ آرہی ہو یہ بھی واقعہ ہے کہ کامران مرزا کو مغلوں کا پتہ نہ لگ سکا تھا۔ دراصل کامران مرزا کی پوری جماعت کسی جگہ چھپی رہی اور قطب خاں کا فوجی دستہ

۱؎ دیکھیے ڈاران، جلد اول صفحہ ۱۳۰۔ اس جملے کے مختلف حصے تو اصل واقعات پر مشتمل ہیں مگر اگر اس کو پورا پڑھا جائے تو بیان غلط معلوم ہوتا ہے۔

۲؎ دیکھیے اکبرنامہ، جلد ۱۔ صفحات ۴۰۷-۴۰۸۔ دھنکوٹ کا جائے وقوع ہے ۳۲/۵۸ عرض البلد اور ۱۴ء ۷۰ طول البلد۔ ہودی والا۔ اسٹڈیز صفحہ ۱۶۵۔

Marfat.com

ان کے پاس سے ہو کر نکل گیا۔ اسی اثنا میں دوسرے مرزا لوگ بھی اوچہ سے آکر اس سے آکر مل گئے ہوں گے۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ انھوں نے شیر شاہ کی قلیل فوج پر حملہ نہیں کیا۔ بلکہ وہ دھنکوٹ گھاٹ کی طرف تیزی سے چلے گئے جہاں وہ قطب خاں کو دھوکہ دے کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے یہی ایک ممکن وجہ ہو سکتی ہے جس سے شیر شاہ کو خطرہ پیدا ہوا ہو۔

یہ واقعہ بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ جب خواص خاں ہمایوں کی فوج کا پیچھا کرتا ہوا جنوب کی جانب کوچ کر رہا تھا تو اس نے دریائے بیاس کو پار کر کے ملتان پہنچنے سے پہلے اپنی فوج کے دو ٹکڑے کیے تھے۔ ہمیں مخزن سے معلوم ہوتا ہے کہ خواص خاں کافی دن تک ملتان میں رہا جب تک فتح خاں، غازی خاں بلوچ اور اسماعیل خاں بلوچ واپس نہ آگئے۔ بعد ازاں سب سردار اپنے آقا کے پاس خوشاب گئے۔ اور وہاں اس کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ دو وجوہات سے خواص خاں کو اپنی فوج کے دو ٹکڑے کرنے پڑے۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ خواص خاں کی کمان میں جو فوجی دستہ ہمایوں کی تلاش میں جہلم کے کنارے کنارے جا رہا تھا اس کے بائیں بازو کی حفاظت ضروری تھی۔ دوسرے اس کو بیاس اور سندھ کے درمیان سندھ ساگر علاقہ کے نصف مغربی حصہ کی چھان بین کرنی تھی۔ جہاں سے سلطان مرزا کے ساتھی گزر کر خوب گئے تھے۔ علاوہ ازیں ایک شبہ یہ بھی تھا کہ ہمایوں اس راستے سے ڈیرہ غازی خاں ہوتا ہوا سندھ کے اوپری حصہ میں نہ پہنچ جاتے۔ اس لیے یہ قرین قیاس ہے کہ خواص خاں نے اپنے بلوچی سردار فتح خاں، اسماعیل خاں وغیرہ کی کمان میں ایک فوجی دستہ جہلم اور چناب کے سنگم کے نزدیک سے جو قریب قریب خوشاب اور ملتان کے درمیان ہے، روانہ کر دیا۔ ان فوجی سرداروں نے اپنا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ انھوں نے ارغونوں کی حد تک دریائے سندھ کے دونوں کنارے کے علاقوں کو خوب اچھی طرح روند ڈالا۔ اسی لیے انھیں ملتان کے مقام

Marfat.com

پر اصل فوج سے جا کر ملنے میں کافی دیر ہو گئی۔ یہاں خواص خاں سندھ کی ارغون سلطنت کی سرحد سے لوٹ کر ان کا انتظار کر رہا تھا۔

مصنف مخزن نے اس واقعہ کو بہت یقین کے ساتھ لکھا ہے کہ خواص خاں سندھ کے کنارے تک گیا۔[1] اسی مصنف نے دوسری جگہ یہ لکھا ہے کہ شیر شاہ خود بھی تھٹھ[2] کے قرب وجوار میں پہنچ گیا۔ لیکن یہاں مصنف کا منشا تھٹہ شہر سے نہ تھا بلکہ ارغون سلطنت سے تھا۔ جس کی دارالحکومت تھٹہ تھی۔ لیکن مغل سلطنت اور ارغون سلطنت کے درمیان یہ سرحد کہاں تھی؟ شاہ حسین ارغون نے ملتان فتح کر لیا تھا۔ لعد میں ضرورت سے مجبور ہو کر اس نے یہ علاقہ بابر کی نذر کر دیا تھا اور بابر نے یہ علاقہ اپنے دوسرے لڑکے کامران مرزا کو دے دیا تھا۔ جیسا کہ تزک سے پتہ چلتا ہے۔ لہٰذا مغل سلطنت اور ارغون حکومت کی قدرتی سرحد دریائے ستلج کا نیچے کا حصہ اور شمال کا حصہ ہو سکتا ہے۔ اسی علاقہ میں ملتان اور اوچہ کے قدیم شہر بھی شامل تھے جن پر کامران کا تسلط تھا۔ جیسا کہ عباس سے معلوم ہوتا ہے۔ خواص خاں کو مغلوں کا تعاقب کرنے اور انھیں حدود سلطنت سے باہر نکالنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس لیے خواص خاں ان کا پیچھا کرتے کرتے ستلج کے شمالی کنارے پر اس جگہ تک پہنچا ہو گا۔ جہاں اوچہ سے ۳۳ میل جنوب پٹھان کوٹ کے مقام پر یہ دریا پنجاب کے دوسرے چار دریاؤں سے ملتا ہے[1] یہاں سے خواص خاں کو ہمایوں کے راستہ کا

---

[1] ڈارن صفحہ ۱۳۰ [2] ڈارن صفحہ ۱۳۱

[1] ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے لکھا ہے کہ "حقیقت یہ ہے کہ مغل فوج کا پیچھا شمال میں صرف ملتان تک ہی کیا گیا تھا۔ اس کے بعد نہیں"۔ ہمایوں صفحہ ۲۰۳۔ لیکن ڈاکٹر موصوف کے اس بیان کی کیا سند ہے؟ اس کے برعکس ہم نے جو واقعات لکھے ہیں ان کی تائید میں مختلف مورخین کی شہادت قلمبند کی ہے۔ آگے چل کر ڈاکٹر صاحب حاشیہ کے نوٹ میں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

پتہ نہ لگ سکا۔ کیوں کہ ہمایوں روہری کی سیدھی سڑک چھوڑ کر جنوب مشرق کی جانب مڑ گیا تھا۔ ہمایوں ۲۶ر جنوری ۱۵۴۱ کو ہندال اور یادگار مرزا کے ساتھ روہری پہنچ گیا جہاں بھکر قلعہ کے گورنر نے بڑی گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا۔ مغرور بادشاہ نے گورنر کی اس مہمان نوازی کو اس کی کمزوری سے منسوب کیا اور فوراً حکم دیا کہ گورنر اطاعت قبول کر کے قلعہ کو اس کے حوالے کر دے۔

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ)

فرماتے ہیں کہ تمام ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ خواص خاں مغلوں کے تعاقب میں گیا۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ابوالفضل افغانوں سے اس قدر متعصب ہے کہ وہ لکھتا ہے " حالانکہ خواص خاں کے پاس کافی بڑی فوج تھی۔ لیکن اس میں شاہی فوج سے لڑنے کی ہمت نہ ہوتی" ابوالفضل نے یہ لکھ کر کوئی دروغ گوئی سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اپنے خاص انداز سے صداقت کا اظہار کیا ہے۔ اگر خواص خاں کہیں راستہ میں مغلوں کے سامنے بھی آجاتا تو بھی اس کو یہ حکم تھا کہ لڑائی کی نوبت نہ آنے دے۔ جب تک مغل پہلے اپنی جانب سے حملہ آور نہ ہوں۔ ڈاکٹر موصوف کا یہ کہنا کہ افغان مغلوں کے تعاقب میں ملتان سے آگے نہیں گئے غلط ہے اور ابوالفضل کی غلط ترجمانی پر مبنی ہے۔

Marfat.com

باب 12

شیر شاہ کے مسائل اور پنجاب کی سرحدی پالیسی

شیر شاہ اور سندھ پار کے قبائل

شیر شاہ تقریباً دو ماہ خوشاب میں مقیم رہا۔ تاکہ نو مفتوح علاقہ کا بندوبست اور تنظیم و تحفظ کر سکے۔ مستقبل کے متعلق اب بھی اُس کے دماغ میں شکوک و شبہات تھے۔ اس کو ہمایوں جو کہ سندھ میں تھا کامران جو کہ کابل میں تھا اور مرزا حیدر جو کہ کشمیر میں تھا۔ ان کے متعلق غور و خوض کرنا تھا۔ ان میں سے کسی کو بھی پسپا کرنے کے لیے پیش قدمی کی پالیسی اختیار کرنا مریحاً ناقابلِ عمل تھا۔ لہٰذا اُس نے یہ ہی مناسب سمجھا کہ ان میں سے جو جہاں ہے اس کو وہیں مصروف رہنے دے۔ اور ان کو اس کے لیے متحد نہ ہونے دے کہ وہ پنجاب پر تسلط کرنے کے لیے کوئی بھی نیا منصوبہ بنا سکیں۔ نہ وہ ہمایوں کا تعاقب کرتے ہوتے سندھ میں ہی دست درازی کر سکتا تھا۔ کیوں کہ اس سے ارغون فرمانروا کو خوفزدہ ہو جانے کا اندیشہ تھا پھر بھی ہمایوں کی اس علاقہ میں موجودگی باعث تشویش تھی۔ خاص کر ایسی حالت میں جب کہ راجپوتانہ بدظن تھا اور گجرات ناقابلِ اعتبار۔ اور یہ دونوں ہی سندھ سے ملحق تھے۔ اسی طرح کامران اور مرزا حیدر بآسانی پشاور کی

Marfat.com

گھاٹی میں اپنی فوجوں کو متحد کر سکتے تھے۔ اور قندھار ایک ایسا حربی نقطہ تھا کہ اگر ارغون حکمران چاہتا تو ان دونوں کے ساتھ مل کر اپنے مشترکہ دشمن شیر شاہ کے خلاف کمربستہ ہو جاتا۔ لہٰذا وقت اور حالات کا یہی تقاضا تھا کہ شیر شاہ دریائے سندھ کے اس جانب تین محاذوں پر غنیم کا مقابلہ کرنے کے لیے مکمل تیاری کرے۔ اور اس جانب بلوچ اور پٹھانوں کو رضامندی سے تابع کر کے سیاسی اور حربی مفاد حاصل کرے۔ یہ بھی حیطہ امکان سے باہر نہ تھا کہ مرزا حیدر پنجاب کے میدانوں میں اُتر آتے۔ چنانچہ اس کی روک تھام بھی ضروری تھی اور اس کے لیے نیم خود مختار گکھر ریاست پر تسلّط کرنا لازم تھا۔ یہ ریاست وادی کشمیر اور نمک کی پہاڑی کے درمیان واقع تھی۔

سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ شیر شاہ اپنے آبائی وطن روہ میں آباد پٹھان قبیلوں کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ بدقسمتی سے ہمارے پاس اس بات کو سمجھنے کے لیے بہت کم ذرائع ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ شیر شاہ اور پٹھانوں کے باہمی تعلقات کیسے تھے۔ اور اس علاقہ کے باشندگان پر شیر شاہ کے تسلّط کی کیا نوعیت تھی۔ ہمارے پاس کوئی معتبر شہادت نہیں جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ شیر شاہ نے اس پٹھان علاقہ میں کوئی ٹکسال قائم کیا۔ اور نہ اس بات کی ہی تائید ہوتی ہے کہ شیر شاہ نے دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر کوئی فوجی چھاؤنی قائم کی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ بقول مخزن شیر شاہ کی فتح سے روہ کے پٹھانوں میں ایک مسرّت کی لہر دوڑ گئی اور افغان قبیلہ کے بزرگ و سردار شیر شاہ سے ملنے کے لیے خوشاب آتے۔ یہ بھی قیاس آرائی کی جا سکتی ہے کہ شیر شاہ نے ان کو خالی ہاتھ واپس نہ بھیجا ہو گا۔ کیوں کہ یہ بات اُس کی خصلت سے بعید تھی۔ بعد کی تاریخ سے یہ مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ ان قبائلیوں کے فاتح اور مفتوح

Marfat.com

دونوں میں سے جو کوئی بھی ان کی سرحد پر آیا اس سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ قبائلیوں کے لیے جنگ و ابتری کا زمانہ بالخصوص خوش حالی اور فارغ البالی کا زمانہ ہوتا تھا۔ برعکس اس کے بحالت امن مضبوط حکومت کے تحت میں تو اُنھیں بھوکوں مرنے کی نوبت آجاتی تھی۔ وہ کمزور کے سامنے شیر تھے اور طاقت ور کے لیے کاسۂ گدائی لے کر بھیک مانگ لیتے تھے۔ اورنگ زیب کے زمانے کے اخبارات ان کے اس اخلاق کو نمایاں کرتے ہیں۔

ہندوستانی پٹھانوں کو دوبارہ سلطنت ہاتھ لگی تھی ان کی مسرت بجا تھی مگر سندھ کے مغرب میں رہنے والے پٹھان ان سے کہیں زیادہ خوش تھے۔ ان کا وطن ۱۴۰ سال بعد ناقابلِ برداشت تیموری تسلط سے آزاد ہوا تھا۔ جب کہ ان کے ہندوستانی بھائیوں کو ۱۴ سال بعد صرف ان کی سلطنت واپس مل گئی تھی۔ صدیوں تک یعنی سکندر اعظم سے لے کر شہاب الدین غوری تک فاتحوں کے لیے ان کا ملک مثل شارع عام تھا۔ لیکن بابر اور کامران کے لیے ۳۰ سال تک وہ ان کے سیاسی عنصر خاص میں رہا۔ لہٰذا فرق تو بیّن تھا ہی۔ کیونکہ بہ نسبت دوسرے اجنبی حکمرانوں کے افغانوں کو بابر نے زیادہ ستایا تھا۔ روہ میں اس نے خوش اسلوب نظام حکومت کے نام پر چنگیز خانی غلبہ قائم کر دیا تھا۔ سارے علاقے کو تومانوں میں منقسم کر دیا اور زمینوں سے بھی ایک لاکھ "شر رخیہ" بطور مالگذاری وصول کیا جو کہ حوصلہ شکن تھا۔ اور اگر کسی نے سر اُٹھایا تو اُس کو سختی سے کچل دیا۔

روہ کے زیادہ تر قبائل بنگاش اور گردیز کے تومانوں میں آباد تھے اور جیسا کہ بابر کی تزک سے معلوم ہوتا ہے۔ اُنھیں کو سب سے زیادہ ایذا و تکلیف اُٹھانی پڑی۔ بنگاش کے تومان میں زیادہ تر مہمند، عثمان خیل، غلزئی، کھٹک، آفریدی اور اورک زئی قبیلے رہتے تھے

Marfat.com

سوکوہاٹ اور گردیز (جو کابل سے ۷۰ میل جنوب مشرق میں ہے) میں وافر فوج رہتی تھی۔ کوہاٹ کابل سرکار کا موسم سرما کا صدر مقام تھا جگہ جگہ انتظام کے لیے مغل داروغہ اور تحصیل دار مقرر تھے۔ پٹھان ان سے ازحد نفرت کرتے تھے۔ مغل فوج کی نقل وحرکت کے لیے خیبر و کوہاٹ کے دروں کو کھلے رکھنے کی ذمہ داری قبائلیوں کی تھی۔ ان کی حالت ان کی اولاد سے ذرا بھی بہتر نہ تھی جب کہ دو سو سال بعد نادر شاہ نے تلوار کی نوک سے ان سے وہی کام لیا۔ یعنی درہ خیبر کو چوڑا کروایا اور اس کو صاف کرایا۔ جنھوں نے ذرا بھی سرکشی کی انھیں تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان میں سے کچھ مثلاً عیسیٰ خیل، نیازی اوپری علاقہ سے بھاگ کر دریائے سندھ کے نزدیک میاں والی ضلع میں آکر آباد ہوگئے۔ پٹھانوں کی اس ذلت و بربادی کی خاص وجہ ان کا باہمی نفاق تھا۔ اب "شرمِ افغانی" کا نعرہ ان کے لیے بے معنی تھا۔ چند مٹھی بھر لوگوں نے اپنے سے زیادہ قوی وجری لوگوں کو مغلوب کر دیا۔ اس کی جتنی بہتر مثال بابر اور کامران کے دورِ حکومت میں پٹھانوں کے ملک میں ملتی ہے تاریخ میں دوسری نہیں ہے۔ یہ محض اس لیے ممکن ہوسکا کہ ایک قبیلہ دوسرے کی گردن کاٹنے کو ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ مغلوں نے ان کے اس باہمی نفاق سے فائدہ اٹھایا۔ علاوہ بریں مغلوں کے پاس اپنا بندوق و توپ خانہ تھا جس کی وجہ سے سولھویں صدی میں بزدل اور کمزور لوگوں نے بہادر قوم کو آزادی سے محروم کر دیا۔

ان حالات میں جب شیر شاہ کی فوج کامران کے تعاقب میں سندھ کے پار پہنچی تو وہاں کے لوگوں نے اسے اپنی آزادی کا مسیحا اور اپنی توہین کا بدلہ لینے والا سمجھ کر خوشی منائی ہوگی۔ شیر شاہ نے ایک فوج اپنے موروثی وطن بھیجی جس کا کام محض غنیم کا تعاقب کرنا اور نعرہ لگانا نہیں تھا بلکہ افغانوں کی خودداری کو بیدار کرنا تھا تاکہ

Marfat.com

ان کی امداد سے وہاں مغل حکومت کا نام و نشان ختم کر دیا جاتے دریائے سندھ کے اس جانب کوہاٹ کے نزدیک کسی جگہ شیر شاہ کی فوج کا مقابلہ کامران مرزا سے ہوا۔ بنو، خیبر، کوہاٹ برباد کر دیے گئے لیکن شیر شاہ کی فوج اس سے آگے نہیں بڑھی[1]

عباس سے ہمیں شیر شاہ کی کسی پالیسی کا صاف پتہ نہیں چلتا۔ البتہ اس نے اتنا بتفصیل ضرور لکھا ہے کہ آخری وقت میں شیر شاہ کو اس بات بہت افسوس رہا کہ خداوند تعالیٰ اس کو چند سالوں کی مہلت اور دے دیتا تو وہ روہ کے پٹھانوں کے لیے کچھ کر جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ عباس نے حب الوطنی کے جوش میں روہ کے پٹھانوں کی فلاح و بہبودی کے

---

[1] مندرجہ ذیل واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ کی فوج نے کامران کا تعاقب کرتے ہوئے سندھ کو پار کیا۔

۱۔ مخزن کا بیان ہے کہ کسی کسی جگہ کامران مرزا اور خواص خاں کی فوج میں جھڑپ ہوئی لیکن جب پٹھانوں نے حملہ کیا تو مغل اپنا نقدہ چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس جگہ خواص خاں نام یقیناً غلط ہے۔ کیوں کہ بیک وقت خواص خاں دو جگہ موجود نہیں ہو سکتا۔ ایک ملتان کے نزدیک اور دوسرے کوہاٹ کے نزدیک۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ فوج قطب خاں نائب کی کمان میں گئی تھی اور دریائے سندھ کے اس جانب مغلوں سے ٹکر ہوئی تھی۔

۲۔ ابوالفضل نے لکھا ہے "اکتوبر، ۱۵۵۴ء میں شیر شاہ کے خان کی حکومت ختم ہو جانے کے بعد جب ہمایوں نے ہندوستان کا رُخ کیا تو سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ بلگرام پشاور کے قلعہ کی از سرِ نو تعمیر کرائی، جسے پٹھانوں نے برباد کر دیا تھا" (اکبر نامہ جلد ۱ صفحہ ۶۰۸)

۳۔ اسلام شاہ کے زمانے تک پشاور سوری حکومت میں شامل تھا۔ احمد یادگار مصنف سلاطین افغانیہ موسومہ "تاریخ شاہی" مورخہ ۱۶۴۴ء نے لکھا ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب ہمایوں کی حرکت کی خبر اسلام شاہ کو ملی تو اس نے لاہور کے فوجدار قطب خاں کو پیغام بھیجا: "تم فوراً لاہور سے روانہ ہو کر پشاور کے نزدیک جاؤ۔ میں سرہند پہنچ رہا ہوں" یہ ہم ولور کو مع کثیر فوج کے پنجاب بھیجا گیا۔ (دیکھیے تاریخ شاہی صفحہ ۲۵۷)

Marfat.com

خواب دیکھے تھے۔ ان کو جبراً شیر شاہ کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ شیر شاہ جیسا سلیم الطبع اور پیش اندازہ کرنے والا فرد اس قسم کے خواب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ عباس نے لکھا ہے کہ مرتے وقت شیر شاہ کی تین حسرتیں باقی تھیں۔ یہ تینوں ہی لغو اور گپ تھیں:۔

۱۔ روہ علاقہ کے سب پٹھانوں کو دریائے سندھ کے اس جانب لاکر انھیں شوالک کے پہاڑی علاقہ سے لے کر اٹک اور موجودہ پٹھان کوٹ تک آباد کرنا اور روہ کو ویران کر دینا۔

۲۔ ہندوستان کے نیک سنّیوں کے لیے (رافضی) ایران کے راستہ سے عرب کی زیارت کا اہتمام کرنا۔ اس کام میں اسے عثمانی ترکوں کی مدد لینی تھی جو ایران کے مخالف تھے اور اسلام کے مقدس مقامات کے محافظ۔

۳۔ لاہور شہر کو برباد کرنا۔ جہاں سے ہندوستان کے ہر حملہ آور کو کافی تعداد میں فوج فراہم کرنے اور مسلح کرنے کا سامان مل جاتا ہے۔

اگر ہم بالفرض یہ تسلیم بھی کرلیں کہ یہ دراصل شیر شاہ کی زندگی کی آخری خواہشیں تھیں اور عباس نے جو لکھا ہے وہ محض غپ شپ نہیں ہے تو ہمیں پاک پروردگار عالم کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ شیر شاہ کی موت ۵ سال کے قلیل عرصہ میں ہوگئی۔ یہ شیر شاہ اور روہ کے پٹھانوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اپنی ان خواہشات کی تکمیل نہ کر سکا اور اس کی یہ حسرتیں باقی رہ گئیں۔ ان کو عملی شکل دینے سے نہ صرف روہ کے پٹھان برباد ہو جاتے بلکہ خود شیر شاہ کی عظمت و شہرت بھی ختم ہو جاتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیر شاہ میں بمقابلہ عباس توازن طبع کہیں زیادہ تھا۔ دارا، زرزیس، محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری جیسے عظیم الشان فاتح بھی کبھی یہ خیال نہ کر سکے کہ پختون لوگوں کو راستہ سے ہٹا کر کہیں دور لے جاکر لبا دیں۔ حالانکہ اپنی سلطنت میں ان حکمرانوں نے رعایا کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل

Marfat.com

کیا۔ کابل اور سندھ کے درمیان خلا پیدا کرنے اور لاہور کو مسمار کرنے میں کونسی حکمت عملی پنہاں تھی؟ یہ تجویز تو ہو بہو محمد تغلق جیسی احمقانہ معلوم ہوتی ہے جس نے ۱۴ ویں صدی میں منگولوں کے حملہ سے بچاؤ کے لیے دہلی کو برباد کر دیا۔ اور دارالسلطنت دہلی سے دولت آباد دکن لے گیا۔ تاکہ لاہور کے بجائے وہ دولت آباد سے منگولوں کے حملوں کا جواب دے سکے یقیناً پختون بھی شیر شاہ کو دعا خیر نہ دیتے۔ اگر وہ انہیں دریائے سندھ کے اس جانب شیر و شہد والے اس خطہ میں لاکر لبا دیتا۔ ویدک زمانہ سے ہی پختون لوگوں کو اپنے بزرگوں کے اس بنجر وطن سے برابر دلی لگاؤ و نسبت رہی ہے۔ یہاں کے خشک پہاڑ اور گہرے غار انھیں اتنے ہی عزیز ہیں جیسے کہ اہلِ عرب کو اپنا ریگستان یا منگولوں کو وسط ایشیا کے گھاس کے میدان۔

افغانوں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں سرکش و باغی ہند و علاقہ میں بسانے کے اصول پر سلاطین دہلی نے بلبن کے زمانہ سے ہی عمل کیا تھا۔ لودی اور مغل حکمرانوں نے بھی اسے جاری رکھا۔ بابر نے لودیوں کو مرعوب کرنے کے لیے کسور میں یوسف زائیوں کی ایک آبادی بسائی تھی۔ شیر شاہ نے بھی اسی حکمت عملی سے کام لیا۔ لیکن اس نے بہلول لودھی کی طرح باشندگان روہ کو دعوت نامہ نہیں بھیجا کہ افغان وہاں سے آکر ہندوستان میں سکونت اختیار کریں۔ لودی عہد حکومت میں گومل کی وادی سے غلزئی قبیلہ کے سروانی، لوہانی، پٹھان ہندوستان میں آکر بس گئے تھے۔ چند نارمولی اور سوری خاندان بھی ان کے ساتھ یہاں آگئے تھے۔ جو قبائل اور خاندان لودی حکومت کے لیے دردسر بن گئے تھے شیر شاہ نے ان کو ترجیح دینا بند کر دیا۔ سوری حکومت کے زمانے میں عیسیٰ خیل نیازی کے علاوہ غلزئی قبیلہ کا کوئی خاندان پنجاب میں نہیں آپایا۔ شیر شاہ نے زیادہ تر اپنی فوج میں خطہ بنگاش سے " گھر

Marfat.com

گشتی" قبیلہ کے پٹھان مثلاً کرانی، کاکر، پانی، تارن بھرتی کیے۔ شیرانی لوگ بھی پہلی بار شیر شاہ کی فوج میں بھرتی ہوتے تھے۔ یوں تو قلیل تعداد میں مختلف قبیلوں سے سلسلۂ آمد و رفت جاری رہا لیکن شیر شاہ یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ سندھ ندی کے اس جانب اس کے شرّی عزیز و اقارب کثیر تعداد میں آجائیں اور اس کے لیے سر درد ثابت ہوں۔

اگرچہ ہم شیر شاہ کی پالیسی کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ مگر اس کے اثرات اظہر من شمس ہیں۔ کابل کی حکومت کے متعلق ابھی تک تو افغانوں کا رخ مجہول سا ہی تھا۔ نہ انھوں نے تیمور سے لیکر ہمایوں کے عہد تک جو حملے روہ کو پار کر کے ہوتے تھے ان میں ہی کوئی دلچسپی لی تھی۔ مگر شیر شاہ کی ہمایوں کے خلاف آخری کامیابی کے ۱۷ ماہ کے اندر ہی اندر اس علاقے میں لہ تو کامران کی اور نہ ہمایوں کی دال گلنا حیطہ امکان میں رہ گیا۔ جب ۲۰ سال بعد ہمایوں نے پشاور کی ازسر نو تعمیر کرائی تو ہندوستان کی سرکار کی بلا امداد یا تحریک ہی کے افغانوں نے بیدھڑک اس پر دھاوا کر دیا۔ مگر سوال تو یہ اٹھتا ہے کہ شیر شاہ نے اس قومی بیداری کو اپنی سلطنت کے تحفظ کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ کیا۔ اس عملی کارروائی کے متعلق کچھ قیاس ہی کیا جاسکتا ہے۔ وہ مندرجہ ذیل ہے:۔

۱۔ شیر شاہ نے پٹھانوں کے علاقہ میں کوئی فوجی پیش قدمی کی پالیسی اختیار نہ کی۔ نہ اس نے وہاں کوئی قلعہ یا فوجی چھاؤنی بنائی نہ اپنے سپاہیوں کو وہاں تعینات ہی کیا۔

۲۔ اس نے اندرونی اور بیرونی دونوں ہی جگہ افغانی قومی بیداری کی طاقت کو مغلوں کے خلاف استعمال کیا۔ اس نے یہ بخوبی سمجھ لیا کہ ہندوستان کی سلطنت کے تحفظ کے لیے بہترین احتیاط پختون قبائلیوں کی اپنے ہی وطن میں قومی بیداری ہے۔ اس نے ان کے مستقبل

Marfat.com

نصب العین کے حصول کے لیے دہلی اور لاہور کے بجائے ان کی توجہ کابل اور قندہار کی طرف مبذول کر دی۔ مغلوں کے خلاف اپنی کامیابی کا سبق سکھا کر اور اس کی مثال پیش کر کے شیر شاہ نے پختونوں میں قومیت کے بیج بو دیے۔ لیکن جس سرزمین میں قبائلی جھگڑوں کا ہی زہریلا ماحول ہو وہاں تو قومیت کی جڑیں دیر میں ہی پائیدار ہو پاتی ہیں۔ پھر بھی جب مغل سلطنت دوبارہ عروج پر پہنچی اور پٹھان اُس کے سامنے منہ کے بل پڑے ہوتے تھے۔ تب جالندھر سے پیر روشن (یعنی شیخ بایزید انصاری) وہاں گیا اور افغان سرزمین میں آزادی کی ٹمٹماتی ہوتی شمع کو از سر نو روشن کیا جس کو اکبر اور اورنگ زیب جیسے طاقت ور شہنشاہ بھی نہ بجھا سکے۔

مختصر یہ کہ شیر شاہ نے سندھ کے مغرب میں اپنی سلطنت کی توسیع کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس نے قبائلی علاقے کے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تاکہ سرحد پر ایک فاضل ریاست کا وجود بنا رہے۔ اس نے روہ میں اپنی طاقت و حکومت کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا بلکہ اس نے پختونوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا گویا وہ مغلوں کے خلاف مہم میں ان کے معاون و شریک ہوں۔ اس نے اپنی فوج دریائے سندھ کے اس جانب ہٹا لی۔ ۱۵۴۱ء میں موسم بہار کے آغاز میں شیر شاہ خوشاب میں ایک مضبوط فوج چھوڑ کر بھیرا کے لیے روانہ ہو گیا تاکہ کشمیر سرحد پر رہنے والے قبیلوں کے خلاف ضروری کارروائی کر سکے۔

سرحد کشمیر پر شیر شاہ کی کارروائی

پنجاب کی فتح کے بعد شیر شاہ کو اپنی سرحدوں پر دھیان دینا لازمی ہو گیا۔ یعنی کہ کابل، کشمیر اور سندھ، ان میں سے ہر ایک ہی شیر شاہ جیسے فاتح کے لیے دلکش تھا۔ کیونکہ ان پر تسلط کر لینے

Marfat.com

کے بعد ہی ہندوستان کی سلطنت محفوظ ہو سکتی تھی اور اس کی سرحدیں قدرتی اور معقول شیر شاہ کے پاس ان علاقوں میں باری باری سے فتح کرنے کے لیے کافی جنگی اور اقتصادی ذرائع بھی تھے۔ مغل تو اس وقت زیر ہو چکے تھے۔ اگر شیر شاہ اس وقت پختونوں کے طوفانی فوجی جذبہ سے فائدہ اٹھا کر محض ایک مظاہرہ ہی کر دیتا تو ہند سے بھاگے ہوتے مغل ہندوکش کے اس پار پہنچکر ہی دم لیتے۔ اسی طرح شاہ ارغون بھی ایسا ہی تھا جیسے مگرمچھ کے منہ میں مکھی۔ ضرورت صرف یہ تھی کہ مغلوں کے خلاف لنگاہوں اور بلوچیوں کی قدیمی نفرت کی آگ کو شعلہ زن کر دینا اور مغلوں کی سندھ میں چیرہ دستی کا ڈنکا پیٹنا۔ پھر کیا تھا لنگاہوں اور بلوچیوں کو شیر شاہ کی مدد ملتی اور وہ مل کر ارغونوں کو اسی طرح ملک بدر کر دیتے جیسا کہ ہندوستان میں مغلوں کا حشر ہوا تھا مگر کشمیر کا معاملہ زیادہ صاف تھا۔ وہ ہندوستان کا ایک تکمیلہ جز تھا۔ اگر اس کا حوصلہ مند مرزا حیدر کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا جاتا تو اس سے اس خطرے کا امکان تھا کہ مغل سلطنت تو گھاٹی میں مستحکم ہی ہو جاتی۔ زاں بعد مرزا حیدر ہمایوں اور کامران سے ہم آہنگ ہو کر کوئی دوسرا ہی گل کھلاتا۔

کامرانی کی جھونک میں اعتدال قدمی ایک ایسا وصف ہے جو کہ ایک ایک ظفریاب سپاہی یا مدبر میں کمیاب ہوتا ہے۔ شیر شاہ کو اپنے جارحانہ طرز عمل میں اسی وجہ سے کامیابی حاصل ہوئی تھی کہ اس نے ہر موقع پر اعتدال سے کام لیا۔ اور اتنا ہی ٹکڑا کاٹا جتنا کہ وہ آسانی سے چبا سکتا تھا۔ جیسا کہ اس نے چوسہ اور سورج گڑھ کی لڑائیوں کے بعد کیا تھا۔ لہٰذا اب اس نے عزم بالجزم کر لیا کہ وہ مغل حیطہ اقتدار سے جس کو اس نے بلگرام کی جنگ کے بعد درہم برہم کر دیا تھا۔ جب تک باہر قدم نہ رکھے گا جب تک کہ وہ اپنا بندوبست حکومت ان وسیع علاقوں پر مستحکم نہ کرے جن کو گذشتہ بارہ ماہ میں اس کی فوجوں نے تسخیر کیا

Marfat.com

تھا۔ مگر کابل اور سندھ کے بمقابلہ کشمیر کا مسئلہ اس کو زیادہ برافروختہ کیے ہوتے تھے۔ مرزا حیدر ایک چوٹ کھائے ہوتے سانپ کے مانند تھا جو کہ شیرشاہ کی پگڑی کے پیچوں میں بیٹھا ہوا تھا۔

شیرشاہ کو مرزا حیدر کی کشمیر میں موجودگی سے جتنی پریشانی تھی اتنی ہمایوں اور کامران کے بالترتیب سندھ اور کابل بھاگ جانے سے نہیں تھی اور یہ پریشانی بلاسبب نہ تھی۔ گومل، بومن، خیبر دروں کو بند کر کے اس پار سے مغلوں کے دفعتہً حملوں کو روکنا نسبتاً زیادہ سہل تھا۔ کیونکہ اس نے درہ کے قبیلوں کو سیاسی رشوت اور اپنی غیر جارحانہ پالیسی سے اپنی طرف ملا لیا تھا مگر یہ نسخہ کشمیر کے متعلق کارگر ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ کیوں کہ کشمیر کے جنوبی، مغربی پہاڑی ڈھالوں پر رہنے والی قومیں غیر افغانی تھیں۔ مثلاً ججنجو، گلکھر، جاٹ، گوجر اوان وغیرہ۔ جن کے ساتھ شیرشاہ کے تعلقات برادرانہ نہ تھے۔ بلگرام کی لڑائی کے ۱۲ سال بعد ایک بار جب ہمایوں نے قرآن شریف سے فال نکال کر جاننا چاہا تھا کہ وہ کشمیر میں داخل ہو یا نہیں جواب میں یوسف کی کہانی ملی تھی۔ جس میں لکھا تھا کہ وہاں پہنچنے پر اسے یا تو قید نصیب ہوگی یا کنواں۔ اگر ۱۵۴۱ء میں شیرشاہ بھی فال نکال کر دیکھتا تو بہت ممکن ہے اس کو بھی یہی جواب ملتا۔ کیونکہ مرزا حیدر نہایت حوصلہ مند، جری سپہ سالار و غضب کی سوجھ بوجھ کا انسان تھا۔ ایک مرتبہ اس سے پیشتر مارچ ۱۵۳۳ء میں مرزا حیدر کاشغر[1] (چترال) کے سلطان سعید خاں کی فوج لے کر لار کر کے درہ سے گزر کر کشمیر میں داخل ہوا تھا۔ اس کے ایک حصہ کو لوٹا اور تین مہینہ بعد تب واپس گیا تھا جب کہ کشمیر کا سلطان محمد شاہ صلح کے لیے رضامند ہو گیا۔ اور سلطان نے یہ وعدہ کیا کہ وہ اپنی ایک لڑکی کی شادی سلطان سعید خاں کے لڑکے سے

---

[1] اکبر نامہ۔ جلد اول صفحہ ۲۰۵۔ ابوالفضل کا کاشغر اور چترال ایک ہیں۔ دیکھیے آئین جلد ۲۔ فٹ نوٹ۔

Marfat.com

کر دے گا۔ ۱۵۳۵ء میں نازک شاہ نے اسی محمد شاہ کو تخت سے معزول کر اپنا تسلّط کر لیا۔ اور محمد شاہ چوتھی بار اس انتظار میں تھا کہ کس طرح کشمیر کا تخت اس کو دوبارہ واپس مل جاتے۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لیے کشمیر سرداروں کا ایک فرقہ جو کہ چکوں کا مخالف تھا دوبارہ مرزا حیدر کو بلا کر لایا تھا۔[1]

کشمیر کی وادی کے جنوب میں واقع نمک کی پہاڑیوں میں گلگر قوم آباد ہے۔ کشمیر سے ہندوستان آنے کے لیے ۲۶ مختلف راستے ہیں لیکن بھمبر اور پاکھلی کے راستے سب سے اچھے ہیں ان راستوں سے گھوڑوں کے ذریعے سفر کیا جا سکتا ہے۔ بھمبر کا راستہ سب سے زیادہ نزدیک ہے۔ اس میں بھی کئی راستے ہیں جن میں تین اچھے ہیں۔ (۱) ہستی بھنج۔ پہلے فوج کی نقل و حرکت کے لیے یہی راستہ استعمال ہوتا تھا (۲) پیر پنجال[2]۔ بھمبر کے راستے سب سے زیادہ آمد و رفت ہوتی تھی۔ پہلا راستہ نوشہرہ سے سیدھا پیر پنجال اور شوپیاں جاتا ہے (یہ نوشہرہ وہ مقام ہے جس کا ذکر ابوالفضل نے کیا ہے یہ اٹک کے مغرب والا نوشہرہ نہیں ہے) دوسرا راستہ راجوری سے علیحدہ ہو کر پونچھ دریا تک جاتا ہے اور وہاں دوسرے راستے سے مل جاتا ہے۔ سوپیاں کا راستہ پیر پنجال سے گزرتا ہے۔ ہستی بھنج ہی ایک ایسا راستہ ہے جس سے ہاتھی گزر سکتے ہیں اور آج تک جموں سے ہاتھی اسی راستے سے کوٹلی ہوتے ہوتے پونچھ جاتے ہیں اور پھر حاجی پیر ہوتے ہوتے اوری[1] چلے جاتے ہیں۔ پاکھلی سے ہندوستان آنے والے

---

[1] مرزا حیدر کی دوبارہ کشمیر میں آمد کے لیے دیکھیے تاریخ رشیدی صفحہ ۴۲۳ اور اکبر نامہ جلد ا صفحہ ۴۰۳ فٹ نوٹ۔ [2] آئین جلد ۲ صفحہ ۳۴۷-۳۴۸۔

[1] جیرٹ۔ رادھا کرشن کے مقولہ کے مطابق وہی فٹ نوٹ نمبر ۲۔ [2] روز ر گلاسری (iii) صفحہ ۲۵۴

راستہ کے قرب و جوار میں (یہ راستہ موجودہ ہزارہ، ایبٹ آباد سے گزر کر راولپنڈی جاتا ہے) اس وقت تک فریغ ترک آباد تھے۔ ان ترکوں کو ۱۳۹۹ء میں امیر تیمور نے بحیثیت حکمران امرا کے لبایا تھا تاکہ یہ راجپوت نسل کے جاٹوں اور دوسرے قبیلوں کو مرعوب رکھ سکیں بعد میں چل کر انھوں نے پاکھلی نام کی ایک ریاست قائم کی تھی۔ یہ فریغ ترک قدرتی طور پر افغانوں کے دشمن اور مغلوں کے دوست تھے اور کابل و کشمیر کے درمیان آمدورفت کے تمام راستے ان کے قبضہ میں تھے۔

شیر شاہ کو مرزا حیدر کے کشمیر میں برسر اقتدار ہونے سے اور کامران مرزا کے مفرور سلطان کے بجائے شاہی خطاب اختیار کرنے سے جو خطرات پیدا ہوتے تھے وہ سب اس کے پیش نظر تھے۔ شاہ حسین اور ارغون اور مرزا حیدر[۲] نے بالترتیب سندھ اور کشمیر میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا تھا۔ اور یہ تینوں مل کر اس سازش میں شریک تھے کہ اگر ہندوستان پر دوبارہ قبضہ نہ ہو سکے تو کم از کم پنجاب اور ملتان کو ضرور فتح کر لینا چاہیے۔ گکھڑ اور افغانوں میں نسلاً عداوت تھی۔ گکھڑ لوگ نمک کی پہاڑیوں کے نچلے حصوں اور اس کے پٹھار میں آباد تھے۔ بابر نے جنجوہا ؤں کے خلاف ان کی مدد کی تھی۔ فریقین میں یہ جھگڑا اس بات پر تھا کہ اس علاقہ میں کس کا حکم اور اقتدار رہے۔ اس مدد کی وجہ سے گکھڑ لوگوں نے خوشی سے بابر کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ وہ ہنوز ہمایوں کے وفادار تھے اور انھوں نے شیر شاہ کی اطاعت تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کر دیا تھا۔ اس لیے شیر شاہ نے یہ تہیہ

---

[۲] اکبرنامہ جلد ا صفحہ ۲۰۲ فٹ نوٹ۔ ان تینوں کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں اتفاقیہ لیکن منتشر حوالے ہیں۔

[۱] مخزن صفحہ ۱۴۱۔ ڈارن جلد ا صفحہ ۱۱۳۔

Marfat.com

کر لیا کہ وہ گکھڑ لوگوں کے اس پردے کو ضرور چاک کرے گا۔ کیوں کہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ پس پردہ، ہمایوں، کامران اور مرزا حیدر متحد ہو کر پنجاب کے میدان پر شمال کی جانب سے حملہ نہ کر دیں۔ اور جنوب سے ملتان کے راستے شاہ حسین ارغون ان کی کمک کے لیے نہ پہنچ جاتے۔

اپنی سلطنت کی شمالی سرحد کو مستحکم اور پائیدار بنانے کے لیے شیر شاہ نے کیا قدم اٹھائے۔ افغان مورخین نے اس مضمون پر کم روشنی ڈالی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ نے گکھڑ علاقہ کو تباہ و برباد کر ڈالا اور آس پاس کے پہاڑی علاقہ کا دورہ کر کے ایک جگہ تلاش کی جہاں اس نے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ اس قلعہ کا نام بعد میں روہتاس کا قلعہ ہوا۔

محیطی پہاڑوں کے دورے کا صرف اتنا ہی مقصد نہ تھا کہ گکھڑوں کے علاقہ میں قلعہ کی تعمیر کے لیے مناسب مقام کی جستجو کی جائے بلکہ اس میں ایک اور غرض بھی تھی اور وہ تھی کشمیر کے جنوب مغرب میں جہلم اور سندھ کے اوپری حصوں میں واقع پہاڑی علاقہ کا ابتدائی فوجی جائزہ۔ تاکہ ۱۵۴۱ء کے موسم بہار میں شیر شاہ صورت حال کا صحیح اندازہ کر سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ کی فوج نمک کی پہاڑیوں کے سلسلے کے اندر تک گھس گئی۔ اور اس نے سلطنت مغلیہ کے صوبہ کابل کی سرکار پاکھلی اور سرکار میوات کو (جس کا صرف کچھ حصہ ہی کابل میں شامل تھا) زیر تسلط کر لیا۔ ابوالفضل نے اس کے متعلق لکھا ہے "سرکار پاکھلی کی لمبائی ۳۵ میل اور چوڑائی ۲۵ کوس ہے۔" اس کے مشرق میں کشمیر شمال میں کٹور (کنار) جنوب میں گکھڑ کا علاقہ اور مغرب میں اٹک بنارس ہے۔ سوات کی سرکار تین اضلاع پر مشتمل ہے۔ بھمبر، سوات، بجور۔ پہلے ضلع بھمبر کا طول ۱۶ میل اور عرض ۱۲ میل ہے۔ اس کے مشرق میں پاکھلی شمال میں کٹور، ادی کاشغر (صحیح ہے کنار اور چترال) جنوب میں اٹک بنارس

Marfat.com

اور مغرب میں سوات ہے۔ ہندوستان سے اس مقام کے لیے دو راستے آتے ہیں۔ ایک شیر خانی درّہ سے اور دوسرا بلاندری سے۔

دوسرے ضلع سوات کا طول ۴۰ کوس اور عرض ۱۵ کوس ہے اس کے مشرق میں بھمبر، شمال میں کٹوراور کاشغر جنوب میں بلگرام اور مغرب میں بجور ہے۔ اس علاقے میں بہت سی گھاٹیاں ہیں۔ ہندوستان سے یہاں آنے کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک مالکھنڈ باج (مالکھنڈہ) سے اور دوسرا شیرخانہ سے۔

تیسرا ضلع بجور ۲۵ میل لمبا اور ۵ میل سے دس میل تک چوڑا ہے

اس میں کابل کی جانب کئی درّے ہیں۔ اس علاقہ کے پہاڑ اور میدان دونوں جگہ میں یوسف زائی ہی فرقہ حکمران ہے۔[1]

شیر شاہ نے اس تمام علاقہ کا فنون جنگ کے نقطہ نظر سے دورہ کیا۔ اس فوجی معائنے میں ایک سیاسی چال پنہاں تھی۔ وہ تھی کابل کی حلقہ بندی اور کشمیر کو الگ کرنا۔ بہر حال بھمبر پر شیر شاہ کا مستحکم قبضہ رہا۔ اور یہ مقام اس کے وارث کے عہد کے اختتام تک سوری سلطنت میں شامل رہا۔ بھمبر سے ہی شیر شاہ نے مرزا حیدر کے خلاف کشمیر کے چک سرداروں سے سازش شروع کی۔ چک مرزا حیدر سے بدظن تھے۔ شیر شاہ یوسف زائی علاقے میں داخل ہوا۔ اسی طرح اس نے دریائے سندھ کے پار کے قبائلی علاقہ میں قدم نہ رکھا۔ کیوں کہ وہ پٹھانوں کی زود حسی خصلت سے خوب واقف تھا وہ تو اپنے چچازاد بھائی کا بھی بنا بلائے گھر آنا پسند نہ کرتے تھے۔ یہاں بھی شیر شاہ نے سیاسی رشوت اور حکمت عملی سے اپنا کام نکالا

---

[1] دیکھیے آئین جلد اصفحہ ۳۹۰ لغایت صفحہ ۳۹۳ (پہلا ایڈیشن) شیر شاہ اور اکبر کے بیچ کسی بھی شیر خاں نام کے فرد کا یہاں آنے کا حوالہ نہیں ملتا ہے۔ جب کوئی سرحدی پٹھان اس نام کو اپنی زبان سے نکالتا ہے تو وہ سننے میں شیر خاں ہی آتا ہے۔ اغلب ہے کہ شیر خاں وہاں شیر شاہ کی آمد کی یاد دلاتا ہو۔

Marfat.com

شیر شاہ نے جی کھول کر پٹھانوں کو انعام و اکرام دیے اور اس کو اپنا سیاسی راس المال تصور کیا۔ غیر افغان قبائل کے ایک جانب تو یوسف زئی اور دوسری جانب شیر شاہ کی سلطنت۔ اس طرح چکی کے دو پاٹوں کے درمیان وہ بالکل ہی بے ضرر ہو گئے۔

شیر شاہ نے کشمیر میں کیا سازشیں کیں۔ اس کے متعلق یہ بات حیرت انگیز ہے کہ افغان مورخین کو اپنے مورثوں سے کچھ بھی نہ معلوم ہوا۔ حتیٰ کہ انھوں نے اس کے متعلق کسی کیمپ افواہ کا بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ نہ کہیں کشمیر کی شہزادی سے اس کی آخری شہزادی کا حوالہ ہی دیا ہے۔ اگر ابوالفضل، نظام الدین اور فرشتہ کشمیر کی تاریخ کا سرسری ذکر نہ کرتے تو ہمیں شیر شاہ کے کردار کی جھلک نہ مل پاتی اور اصل تاریخ کا ایک جز ہماری نظر سے پوشیدہ رہ جاتا۔ شیر شاہ کی خارجہ پالیسی کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس سرزمین بہشت میں اسلام کی آمد کے بعد سے کشمیر کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور سولھویں صدی کے پہلے ۵ سال میں جو سیاسی بدامنی و ابتری وہاں پھیلی ہوتی تھی اس کا جائزہ لیں۔

تیرھویں صدی کے اختتام تک کشمیر میں ہندو فرمانروا ہی حکومت کرتے تھے۔ یہ سرزمین علم و ہنر کا سرچشمہ تھی۔ یہاں کی تہذیب و تمدن کا معیار اعلیٰ تھا۔ دہلی میں اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد سے ہندوستان کے میدانوں میں کسی جگہ کے معاشرتی نظام میں ایسی لچک نہیں تھی جو کہ وادی کشمیر میں پائی جاتی تھی۔ حالانکہ یہاں کے فرماں روا راجپوت نسل سے تھے لیکن ہندوؤں کی آبادی میں برہمن اکثریت میں تھے۔ یہاں کی تمام تجارت انھیں لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ نظام حکومت کے ہر صیغہ میں اور ہر فوجی عہدہ پر انہیں لوگوں کا بول بالا تھا اسی ہندو ریاست کو یہ فخر اوّلین حاصل ہے کہ اس نے کلہن جیسا مورخ جسے کشمیر کا ابوالفضل کہتے ہیں پیدا کیا۔ ہمیں اس کی تصنیف "راج ترنگنی"

Marfat.com

کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے برہمن ہریجنوں کے علاوہ باقی سب کام کرتے تھے۔ وہ ہر تجارت میں سرغنہ تھے وہ باورچی بھی تھے اور فوج کے کپتان بھی۔ لبساطی بھی تھے اور وزیر اعظم بھی۔ کاشت کار بھی تھے اور کاری گر بھی۔ مسخرے بھی تھے اور سفیر بھی۔ حالانکہ ریاست میں مطلق العنان نظام حکومت تھا۔ لیکن بڑے بڑے زمین دار اور فوجی افسر بادشاہ کو کٹھ پتلی کی طرح نچاتے تھے۔ انھیں کے اشارے پر بادشاہ تخت پر بیٹھتے اور اترتے تھے۔ ۱۴ ویں صدی کے آغاز میں جب راجہ سنگھ دیو نے ایک مسلمان شاہ امیر کو وزیر اعظم مقرر کر دیا تو کشمیر کے برے دن شروع ہو گئے۔ یہ امیر ارجن اور پانڈوں کو اپنا مورث اعلیٰ بتاتا تھا اس نے قندھار سے غیر ملکی مسلمان مجاہدین کو کشمیر پر قبضہ کرنے کے بلا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے مخالف چک سرداروں نے تبت کے راجہ سے مدد مانگی۔ راجہ نے اپنے لڑکے کی کمان میں ایک ملکی فوج روانہ کی۔ جس نے قندھاریوں کو کشمیر سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اور کشمیر کو دوبارہ راجہ کو سونپ دیا۔ شاہ امیر پھر بھی وزیر اعظم کے عہدہ پر بنا رہا۔ اس نے راجہ سے کہا کہ اس کی تمام مشکلات کا واحد حل یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کر لے۔ انجام کار چالاکی اور عیاری سے امیر نے سابق ہندو راجہ کی بیوہ سے شادی کر لی اور ۱۳۲۵ء میں سلطان شمس الدین کا خطاب اختیار کر کے تخت پر اپنا قبضہ کر لیا۔

ایک صدی تک سنی حکومت کے دور میں کشمیر کی رعایا پر مذہب کی آڑ میں ہر قسم کے ظلم و ستم ہوتے رہے۔ ان سنی حکمرانوں کا خاص سہارا باہر سے آنے والے کرائے کے ٹٹو مسلمان تھے۔ بالآخر زین العابدین کا زمانہ آیا (۱۴۲۲ء سے ۱۴۷۲ء) یہ ایک روشن خیال حریت پسند مسلمان تھا۔ اس کے زمانے میں رعایا نے آرام کی سانس لی۔ اس نے شیر شاہ اور اکبر سے ایک صدی پہلے نظام حکومت کی اصلاح کی اور مذہبی عقید

Marfat.com

جانبداری اور رواداری کا راستہ دکھایا۔ اس نے یہ اصلاحات کشمیر کی نشنیل باڈی کے زیر اثر غیر ملکی سُنّی فرقہ سے دور رہ کر کیں۔ راج ترنگنی کے زمانہ میں اس قسم کی اصلاحات و مذہبی رواداری کی جھلک ملتی ہے لیکن زین العابدین صحیح معنوں میں پہلا قومی مسلم بادشاہ ہوا۔

اس قسم کی ایک روایت ہے کہ زین العابدین نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ چک خاندان کے عہد حکومت میں کشمیر پر ہندوستان کے بادشاہ کا قبضہ ہو جائے گا۔[1] کسی زمانہ میں چک کشمیر کے سب سے زیادہ با اثر طاقتور برہمنوں کا طبقہ تھا۔ لیکن فی زمانہ ان میں سے ۵۰ فیصدی اسلام کی آغوش میں چلے گئے ہیں۔ اور بقیہ کشمیر سے باہر منتقل ہو گئے ہیں چک شیعہ مسلمان ہو جانے کے بعد بھی قومی جماعت کے رہنما بنے رہے اور غیر ملکی کٹر سنّی لوگوں کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ زین العابدین کے پوتے فتح شاہ کے عہد حکومت میں (۱۴۹۶ء سے ۱۵۰۵ء) کشمیر کے اصل ہندو باشندوں میں سے تقریباً ½ شیعہ مسلمان ہو گئے۔ اسی زمانہ میں شاہ قاسم انور کا ایک شاگرد میر شمس الدین عراق سے ہندوستان آیا۔ اور اس نے نوربخشی اصولوں کی اشاعت کی۔ تب سے کشمیر میں شیعہ و سنّی اختلاف رونما ہوتے۔ شیعہ مسلمان چک برہمنوں کی طرح قومیت کے علمبردار بن گئے۔

۱۵۳۵ء میں قاضی چک نے محمد شاہ کو تخت سے اُتار کر نازک شاہ کو حکمران بنایا۔ پھر ۵ سال تک ۵ حکمران ہوئے۔ ان میں سے کبھی ایک تخت پر بیٹھتا تھا اور کبھی دوسرا۔ ان میں تغیّر و تبدل ہوتا رہتا تھا۔ یہ کشمیر کے سیاسی تنزل کا خاکہ تھا۔ اس دوران میں چک کی مخالف جماعت کی یہی کوشش رہی کہ مغلوں کی امداد حاصل کر کے نازک شاہ کو معزول کر دے بالآخر ان کو کامیابی حاصل ہو ہی گئی اور مرزا حیدر ان کی امداد کو آگیا

---

[1] آئین جلد ۲ صفحہ ۳۸۹۔

Marfat.com

اس طرح جب قاضی چک مات کھا گیا تو وہ بھمبر آیا اور جب کہ شیر شاہ پہاڑوں کا دورہ کر رہا تھا تب اس سے ملاقات کی۔ چنانچہ شیر شاہ کو زین العابدین کی پیشین گوئی پوری کرنے کا موقع ہاتھ آیا کہ کشمیر دہلی سلطنت کے احاطہ اقتدار میں کر لیا جاتے۔ اگر ان واقعات کے لیے ابوالفضل ہی ہماری خاص سند ہے مگر اس نے ان واقعات کو کاٹ چھانٹ کر ہی قلمبند کیا ہے۔" وہ لکھتا ہے کہ "قاضی چک نے جب یہ دیکھا کہ مرزا حیدر خود مختار رہنا چاہتا ہے تب عیاری اور مکاری سے ..... وہ کشمیر سے نکل کر شیر خاں کے پاس پہنچا۔ کیوں کہ مرزا حیدر کو ملک میں لانے کا مقصد تھا اپنی مطلب براری۔ اپنی طاقت کی توسیع جب اس کا یہ منشا پورا نہ ہوا اور اس کے برخلاف صورت حال نے دوسری شکل اختیار کر لی تو اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور دوسرا منصوبہ باندھا۔ اس نے محمد شاہ کے ایک لڑکے کی لڑکی کو شیر خاں کے حوالے کر دیا۔ جب وہ اس طرح منظور نظر ہو گیا تب وہ علاول خاں، حسن خاں سروانی وغیرہ کے ساتھ ۲ ہزار سپاہی لے کر کشمیر آ گیا۔ اسی اثنا میں مرزا حیدر کے باورچی مسمی ابدال مکری کی استسقاء سے موت ہو گئی۔ مرزا حیدر اپنے عیال و اطفال کو اندر کوٹ میں چھوڑ آیا تھا۔ چنانچہ اس کی حالت پناہ گزیں کے مانند تھی۔ کشمیر کے لوگوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا پھر بھی کچھ اس کے ساتھ رہ ہی گئے تھے۔ تین ماہ تو وہ پہاڑ کی وادیوں میں بھٹکتا رہا۔ انجام کار دوشنبہ ربیع الثانی ۹۴۸ ہجری مطابق ۱۶ اگست ۱۵۴۱ء کو نبرد آزمائی ہو ہی گئی۔ حالانکہ دشمن کی فوج میں ۵ ہزار سے زیادہ گھوڑ سوار تھے جس میں سے کچھ افغانی تھے اور کچھ کشمیری۔ لیکن نمک حرامی اور غداری کی وجہ سے وہ ہار گئے۔ یہ خبر سن کر شیر شاہ نے علاول خاں اور حسن خاں سروانی کی کمان میں قاضی کو چک کی مدد کے لیے دو ہزار گھوڑے اور دو ہاتھی بھیجے جو کہ بھمبر کے راستے سے کشمیر گئے۔ یہی ایک ایسا راستہ تھا جس سے ہاتھی جا سکتے

Marfat.com

تھے۔ یہ فوج بھی موسم برسات میں چک لوگوں کی باہمی مخالفت کی وجہ سے ہار گئی۔ مرزا حیدر نے قاضی چک کے ایک رشتہ دار ریگی چاک کو توڑ لیا۔ نظام الدین لکھتا ہے " ریگی چاک کے ساتھ مرزا حیدر قاضی چاک سے لڑنے گیا۔" یہ واقعہ بھی صحیح نہیں ہے کہ مرزا حیدر نے قاضی چاک کو بالآخر ہرا ہی دیا۔ نظام الدین لکھتا ہے " قاضی چاک نے بیرم کولا (بارامولا) میں جاکر اپنا تسلط کر لیا۔ جہاں سے بعد میں اُسے بڑی دقتوں سے ہٹایا جاسکا۔"

بہر حال شیر شاہ کی کشمیر کے معاملات میں دخل اندازی ایک مصلحت آمیز پالیسی تھی اور اس کا انجام بھی اچھا ہوا۔ مرزا حیدر چکوں کیخلاف اپنی مشکلات میں اُلجھا رہا۔ دس سال بعد چک لوگوں نے اسے ہرا دیا اور مار ڈالا۔ بالآخر ۱۵۵۱ء میں قاضی چاک کا لڑکا غازی خان کشمیر کا سلطان بن گیا۔ شیر خاں سُنی تھا۔ کشمیری شیعوں سے مصالحت کا یہ واقعہ شاید عباس نظر کر دیتا کیوں کہ یہ بات شیر خاں کی بظاہر شیعوں سے نفرت کے متضاد ہوتی اور قدیم زمانہ میں سُنی کو شیعہ سے نفرت کرنا لازمی تھا۔ مگر شیر شاہ تو سیاست اور مذہب یا دین اور دنیا کو الگ ہی رکھتا تھا۔ اگر گھر پر سُنی اور باہر شیعہ کی پالیسی سے وہ یہ سمجھتا کہ اُسے کچھ سیاسی فائدہ ہوگا تو وہ اس کو اختیار کرنے میں ذرا بھی گریز نہ کرتا۔ حق تو یہ ہے کہ جو فوجی امداد اس نے چکوں کو دی وہ مصلحت اور ضرورت دونوں ہی پہلوؤں سے مناسب تھا۔ کیونکہ اس سے کشمیر مسئلہ فوراً حل ہو جاتا تھا۔ اس دور میں سیاسی ایمانداری کا نہ تو کوئی معیار ہی تھا نہ اس کا کسی کو خیال ہی ہوتا تھا اور شیر شاہ کے دل میں تو اس کی کوئی توقیر ہی نہ تھی۔ دوم یہ کہ کشمیر کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے یہ لازمی تھا۔ چک لوگوں کو اپنے ملک میں اپنی حکومت بنانے کا پورا حق تھا۔ زین العابدین نے کشمیر میں جو اصلاحات اور سدھار کیے ابوالفضل نے ان کو مرزا حیدر کی جانب منسوب کر دیا۔ اور

Marfat.com

اس طرح مرزا کو ایک نمونہ کا حکمران ثابت کیا ہے اور چک لوگوں کو باغی اور سرکش بتایا ہے۔ شیر شاہ کی یہ پالیسی اسلام شاہ کے دور میں حق بجانب ثابت ہوتی جب کشمیر کے حکمراں نے باغی ہیبت خاں نیازی کو پناہ دینے سے انکار کر دیا اور اس کو قید کر کے دہلی حکومت کے سپرد کر دیا۔

شیر شاہ اور نمک کی پہاڑی کے قبیلے

دہلی میں مسلم حکومت کے آغاز سے ہی نمک کا پہاڑ انڈو آرین قوم کے لوگوں کے لیے (مثلاً جاٹ، گوجر، بھاتی، کھوکھر) جن کو کہ مغربی پنجاب کے میدانوں سے مسلم حملہ آوروں نے نکال دیا تھا۔ ان کے لیے پناہ گزیں ہونے کا مقام بن گیا تھا۔ نمک کے پہاڑ کا علاقہ حقیقتاً ایک پُر از سورش نیم مسلط سرحد تھی جس کی جانب دہلی کی سرکار کوئی توجہ نہ کرتی تھی۔ کھوکھر پہلے تو خوشاب کے اس پار دریائے سندھ کے کنارے آباد تھے اور ان کا شمار کشتریوں میں ہوتا تھا۔ یہ اپنا نسلی رشتہ نمک کے پہاڑ کے روایتی اور مشہور بھاتی ہیرو راتے سال

لے نمک کی پہاڑ کو مسلم سوانح نگار "کوہ جود" کہتے ہیں۔ یہ ان پہاڑی سلسلوں کا عام نام ہے جو جہلم شاہ پور، میاں والی اضلاع کے شمال میں ۴۱ ۳۲ سے ۵۶ ۳۲ تک اور جنوب میں ۴۲ ۷۱ سے ۳۰ ۷۳ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا بیان اس طریقہ سے کیا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ خاص سلسلہ چائل کی مرتفع پہاڑی سے شروع ہوتا ہے۔ یہ سطح سمندر سے ۳۷۰۱ فٹ ہے۔ یہاں جہلم ندی سے نکلے ۔ ۔ ۔

ہوئے تین پہاڑی سلسلے ملتے ہیں اور دریا کی ایک گھاٹی انھیں کشمیری ہمالیہ پہاڑیوں کے خط سے علیحدہ کرتی ہے۔ ان سلسلوں میں جو سب سے زیادہ شمال میں ہے وہ سلطان پور کے پاس ندی کنارے سے یکدم نمایاں ہوتا ہے اور ۲۵ میل تک دریا کے تقریباً متوازی جاتا ہے اور ۱۲ میل کے بعد اصل پہاڑ سے جا ملتا ہے۔ اس سلسلے کا مقامی نام نیلی پہاڑی ہے۔ دوسرے سلسلہ کا نام سلسلہ روہتاس ہے جو نیلی پہاڑی اور دریا کے بیچوں بیچ واقع ہے اور دونوں کے متوازی

Marfat.com

سے بھی جوڑتے تھے۔ بعد کو ان کھوکھروں کی ایک شاخ تو راجپوتانہ چلی گئی اور وہاں پہنچکر ناگور میں آباد ہوگئی۔ یہاں اس نے راٹھوروں اور دیگر راجپوتی قبائل سے ازدواجی تعلقات قائم کیے اور اپنی طاقت کو مستحکم بنایا۔ چنانچہ محمد غوری کے حملہ کا پہلا وار انھیں کھوکھروں کو سہنا پڑا۔ فاتح نے ان کو جبراً مسلمان بنایا۔ مگر ان لوگوں کے دلوں میں انتقام کی آگ جلتی رہی۔ اور انھوں نے تب تک دم نہ لیا جب تک کہ دھامیک کے مقام پر اپنے دشمن کو تہہ تیغ نہ کر ڈالا۔ ان کھوکھروں کی دوسری شاخ جو کہ جنجوہا کہلاتی تھی۔ مشرق کی طرف بڑھی اور گکھروں کے علاوہ جو کہ نمک کے پہاڑ کے علاقہ کے اصلی مالک تھے۔ وہاں پر آباد تمام دیگر قبائل پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ کچھ راجپوت قبائل کی طرح گکھر بھی غالباً مشہور "یوحی ستھین" کے خاندان سے تھے۔ فرق صرف اتنا ہی تھا کہ ان کے الگ تھلگ پہاڑیوں میں رہنے کی وجہ سے ان میں برہمنی تہذیب و تمدن کی تبلیغ نہ ہو پائی تھی۔ اس لیے ان میں قدیمی نامانوس وحشیانہ پن، عجیب رسم و رواج اور جنگ جو خصلت جیسی کی تیسی رہ گئی۔ اس لیے ان دیگر ہندوستانی قبائلیوں کے وہ پچھڑے ہی رہے۔

۱۲ویں صدی سے آگے کی اس خطہ کی تاریخ جنجوہا اور گکھروں کے باہمی جنگ و جدل سے بھری پڑی ہے۔ ان لڑائیوں کا مقصد تھا۔ اس

ہے۔ اسی سلسلہ میں روہتاس کا قلعہ ہے اور ٹیلہ پہاڑی ہے۔ جو جہلم ضلع میں سمندر کی سطح سے ۳۲۴۲ فٹ اونچی ہے۔ تیسرے کا نام "پبتی" سلسلہ ہے۔ یہ جہلم کے جنوب میں شروع ہوتا ہے اور چاتل کی درمیانی چوٹی سے جا ملتا ہے۔ یہاں سے پھر دونوں سلسلے میں ایک ہو کر دو متوازی قطاروں میں مغرب کی جانب جاتے ہیں اور آخر میں سکیسر پہاڑی سے مل جاتے ہیں۔ سکیسر پہاڑی خوشاب کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ میں اس رائے سے متفق نہیں کہ کھوکھر گکھروں سے پہلے نمک کے پہاڑ سے آتے (امپریئل گزیٹر جلد ۱۲۔ صفحہ ۱۲۴)

Marfat.com

خطہ میں اپنا اقتدار و غلبہ جمانا۔ گاہ بگاہ دہلی کے سلاطین بھی اس علاقے میں اپنی فوجیں بھیج دیتے تھے لیکن ان کا منشاء یہ نہ تھا کہ وہ اس علاقہ کو زیر کر کے مستقل طور پر دہلی سلطنت میں ملالیں۔ بلکہ وہ اس طرح اپنی شان و شوکت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ جب کشمیر میں سیاسی انقلاب ہوتے تھے۔ تب وہ وہاں دست اندازی کرتے تھے اور شکست خوردہ فریق کی امداد کرتے تھے اور وہاں کے حکمران کو تخت سے ہٹا دیتے تھے بابر کے ہندوستان میں آنے کے وقت بھی جنجوہا اور گکر لوگ باہمی لڑائیوں میں اُلجھے ہوتے تھے[1] پہلے اس نے گکر لوگوں کے خلاف جنجوہوں کی مدد کی تھی لیکن جب راتے سارنگ گکر مستقل طور پر مغلوں کا وفادار و معاون بن گیا تو بابر نے اپنی پالیسی بدل دی۔ اس وقت سے راتے سارنگ مغلوں کا جانبدار بن گیا۔

فن حرب کے نقطہ نظر سے نمک کے پہاڑ کے علاقہ کی اہمیت اتنی زیادہ رہی ہے کہ یونانی، یوچی، غزنی اور غوری حملہ آوروں سے لے کر بابر اور شیر شاہ کوئی بھی حکمراں اس کو نظر انداز نہیں کر سکا اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ شمال مغرب سے آنے والا کوئی بھی حملہ آور اس پہاڑی علاقے سے اپنی فوج دفعتاً پنجاب کے بیچوں بیچ اس طرح لا سکتا ہے کہ اس کی فوج کی نقل و حرکت کا کسی کو گمان بھی نہ ہو چنانچہ

---

[1] گکر اور کھوکھر میں اب غلط فہمی نہ ہونا چاہیئے۔ دیکھیے بریورٹی کی طبقات ناصری صفحہ ۴۵۵ اور صفحہ ۷۴۴ کا نوٹ۔ انڈین اینٹی کویری جلد ۳۶ (۱۹۰۷ء) صفحہ ۱۔ میرا اس رائے سے اتفاق نہیں کہ کھوکھر نمک کی پہاڑیوں میں گکروں سے پہلے آئے۔ فرشتہ گکروں کے بارے میں بہت کچھ نہ جانتا تھا۔ اس لیے اس نے ان کو بدکردار بتایا ہے۔ اس کا یہ بیان کہ ان میں چند شوہری رائج تھی عرب مورخ ابن الاثیر پر مبنی ہے۔ لیکن اس نے ان قبائل کی طرف اشارہ کیا ہے جو کہ پشاور کے مغرب میں آباد تھے چنانچہ یہ بیان تو گکروں کے اور نہ ان کے دشمنوں کے لیے مستند ہے۔ فرشتہ نے شیخا اور جسرتھ گکروں کا حوالہ دیا ہے مگر یہ کھوکھروں کے شجرے کے مطابق باپ بیٹے تھے۔ (دیکھیے گلاسری جلد ۲ صفحہ ۲۷۴-۲۷۵)

Marfat.com

شیر شاہ نے گکر علاقہ پر اپنا تسلط مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شیر شاہ اس علاقہ میں داخل ہوا اور اس نے گکر سرداروں کو اپنے دربار میں حاضر ہونے کا حکم نامہ بھیجا تو ان لوگوں نے چند تیر اور دو شیر کے بچے بھیج دیے۔ یہ داستان محض گپ معلوم ہوتی ہے۔ اور حقیقت سے اتنی ہی دور جتنا کہ یہ کہنا کہ گکر سردار رائے سارنگ اور آدم خاں نے بغیر لڑائی کے اطاعت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

ابوالفضل نے گکر سرداروں کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بتاتی ہے کہ بابر اور ہمایوں کے ان لوگوں پر بہت احسانات تھے[1] اور اسی وجہ سے وہ ان کے زیادہ وفادار اور شکر گزار تھے۔ ابوالفضل جو کہ مغلوں کا درباری مورخ تھا ایسی تصویر پیش کرنے میں انتقامی مزا آتا ہے کہ گکروں نے اس افغان فوج کو جو کہ ان کی سرکوبی کے لیے بھیجی گئی تھی اس بری طرح ہرایا کہ بہت سے افغان تو قید کر لیے گئے اور بطور غلام بیچ دیے گئے[2]۔ مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ گکر لوگوں کو قسمت نے برا دن دکھایا۔ یہ بات درست ہے کہ کچھ گکروں نے مقابلہ کیا۔ لڑائی ہوتی اور لڑائی کے بعد وہ جنگلوں اور پہاڑیوں میں جا کر روپوش ہو گئے۔ ان کے ملک کو افغانوں نے جی بھر کر لوٹا۔ شیر شاہ نے جنجوہاؤں اور گکروں کو آپس میں لڑا دیا۔ اس واقعہ کا ذکر بھی ابوالفضل نے کسی دیگر ضمن میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہمایوں نے دوبارہ ہندوستان آنے کے بعد جنجوہ لوگوں کو پسپا کیا۔ اور گکروں کا علاقہ ان کو واپس دلا دیا۔ شیر شاہ نے گکروں سرداروں کے خلاف فوج کشی کرنے کے لیے اپنا صدر مقام ہاتھی پور[3] بنایا۔ یہ نام ہاتھی گکر کے نام پر رکھا گیا تھا اور روہتاس و راولپنڈی کے درمیان واقع ہے۔

مخزن کا بیان ہے کہ شیر شاہ نے گکر علاقہ کو چھوڑنے سے پہلے

---

[1] اکبر نامہ جلد ا صفحہ ۲۹۵ - ۲۹۹۔ [2] اکبر نامہ [3] اکبر نامہ۔

Marfat.com

ان کے دلوں میں اتنا زخم کاری لگا دیا کہ وہ روز قیامت تک اس کے درد سے بیتاب رہے[1] اس نے ٹیلہ پہاڑ کی چوٹی پر (جسے جوگی بالاناتھ کا ٹیلہ بھی کہتے ہیں) ایک مقام پسند کیا۔ جہاں ایک قلعہ کی تعمیر کی جو بہار کے روہتاس قلعہ کا ثانی تھا اور اتنا ہی مضبوط اور ناقابلِ تسخیر تھا۔ اور اس کا نام بھی روہتاس رکھا۔ اس عرصہ میں وہ پنجاب سے محکمہ مال کے قابل افسران کا انتخاب کر رہا تھا۔ ان میں سے لاہور کا ایک کھتری ٹوڈرمل تھا۔ اس نے ابھی ملازمت شروع ہی کی تھی۔ شیر شاہ نے روہتاس کے قلعہ کی تعمیر کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ یہ قلعہ شیر شاہ کے انتقال کے بعد ہی مکمل ہو سکا۔ اس قلعہ کی شان کو دیکھ کر ہم شیر شاہ کے دماغ کی بلندی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

روہتاس قلعہ کے کھنڈر جو اسلام شاہ کے زمانہ میں مکمل ہوا تھا آج بھی تحصیل و ضلع جہلم میں دیکھے جا سکتے ہیں اور قصبہ جہلم سے ۱۰ میل شمال مغرب میں ہیں۔ یہ قلعہ اس گھاٹی کے دہانہ پر واقع ہے۔ جہاں کشمیر سے کاہن دریا ٹیلہ پہاڑی کو توڑ کر گزرتا ہے۔ اس کا محیط تقریباً ۲ ½ میل ہے۔ اس کی دیواریں ۳۰ فٹ موٹی اور ۳۰ فٹ سے ۳۸ فٹ تک بلند ہیں۔ اس کی چار دیواری میں بارہ صدر دروازے ہیں اور ۶۸ برج ہیں۔ سب سے شاندار دروازہ 'سہال' ہے جو ۷۰ فٹ بلند ہے اور پٹھان فن عمارت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کی دیواروں میں بہت خوبصورت شہ نشینیں ہیں۔

دریائے سندھ پر واقع دھنکوٹ اور نمک کے پہاڑ پر واقع بھیرا کے درمیانی علاقہ کے لیے کیا نظام حکومت اور فوجی انتظام کیا جاتے۔ شیر شاہ کے سامنے یہ اہم مسئلہ تھا۔ اس علاقہ میں مستقل امن قائم

---

[1] مخزن نسخہ صفحہ ۱۴۷۔ ڈارن جلد ۱ صفحہ ۱۳۱۔

[2] میں اس روایت سے اتفاق نہیں کرتا کہ ٹوڈرمل یوپی کا ایک کائستھ سکینہ تھا۔

Marfat.com

کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ یہاں کے باشندگان کے متضاد مفاد میں ہم آہنگی پیدا ہو۔ بابر نے لکھا ہے "بھیرا لودی حدود سلطنت سے باہر تھا۔ اس کے مغرب علاقہ میں جاٹ، گوجر اور بلوچ لوگ آباد تھے۔ نہ کہ افغان۔ شیر شاہ نے یہ دیکھا کہ بھیرا اور خوشاب میں ڈوڈی بلوچ ہیں اور یہی بلوچ ہیں اور یہی بلوچ یہاں کے حکمران ہیں۔ شیر شاہ بلوچیوں کے معاملہ میں دست اندازی پسند نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ لوگ اس کے مخالف ہو گئے تو ۵ ہزار گھوڑ سواروں کی فوج بہ آسانی فراہم کر سکتے تھے۔ بلوچ سردار فتح خاں ڈوڈانی، اسماعیل خاں، غازی خاں وغیرہ نے ہمایوں کا تعاقب کرنے میں خواص خاں کی مدد کی تھی۔ وہ شیر شاہ سے خوشاب کے مقام پر ملے تھے اور شیر شاہ نے سندھ میں اور اس علاقہ میں ان کی جاگیریں بحال رکھیں۔ باجور سے لے کر بھیرا تک کا پہاڑی علاقہ اسماعیل خاں بلوچ[1] کی امداد کے بغیر اپنے تسلط میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے اسماعیل خاں کی فوج کو اپنی فہرست سپاہیان میں شامل کر لیا اور ان کو بھی شاہی فوج کی طرح شاہی خزانہ سے تنخواہ ملنے لگی۔ تیمور کے واپس جانے کے بعد پوری پندرہویں صدی بھر بلوچوں کے ڈوڈا در ہوت قبائل شمال کی سمت میں سندھ کے کنارے کنارے خانہ بدوشوں کی طرح گھومتے رہے۔ وہ اس وقت بولن کے مہانے سے لے کر گومل کے درّے تک اس تمام علاقہ پر قابض تھے۔ جو کہ سلیمان پہاڑی پہاڑی کے سلسلے کے جنوب میں تھا۔ بلوچیوں کا رند قبیلہ ملتان کے راجپوت لنگا خاندان سے دہشت زدہ ہو چناب، راوی اور ستلج کی وادیوں میں جا کر بس گیا تھا۔ ان کا پیشہ تھا کرایہ کے سپاہی بننا یا آزادانہ ڈاکہ زنی کرنا ڈوڈائی اور ہوت نئے وطن کی تلاش میں جہلم اور سندھ کی وادیوں میں اوپر کی جانب چلے گئے۔ لہٰذا بلوچیوں اور پٹھان قبائل میں ٹکر لازمی ہو گئی۔

---

[1] دیکھیے بلوچ گلاری۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۱۔

Marfat.com

کامران کی ۱۴ سالہ حکومت کے دوران بلوچ اور پٹھانوں میں باہمی کشیدگی اور بھی زیادہ ہو گئی۔ کیوں کہ ان دونوں فرقوں کو آپس میں لڑاتے رکھنا ہی کامران کی پالیسی تھی۔ جب شیر شاہ خوشاب کے مقام پر مقیم تھا تو روہ کے جلا وطن افغان قبیلہ بلوچیوں کے خلاف یہ شکایت لے کر آتے کہ اُنھوں نے افغانوں کے علاقہ پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کو بیدخل کر دیا ہے۔ ان آنے والے لوگوں میں عباس سروانی مورخ کے مورث بھی شامل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شیر شاہ نے بلوچیوں پر دباؤ ڈال کر سندھ کے علاقہ کی آراضی سروانیوں کو واپس دلوا دی اور اس کے عوض میں بلوچیوں کو نمک کے پہاڑ کی تلہٹی میں نندنا اور گرجھک[1] کا علاقہ دے دیا یہ دونوں علاقے اور ان کے درمیان موجودہ جہلم ضلع کی شمالی سرحد جنگی اعتبار سے بڑے اہم تھے۔ غالباً یہ علاقہ اسماعیل خاں بلوچ کو دے دیا گیا تھا۔ جس نے گومل درہ کے دہانہ پر اور پٹھان علاقہ کے نزدیک ڈیرہ اسماعیل خاں آباد کیا تھا۔

اگرچہ عباس نے لکھا ہے کہ شیر شاہ نے بلوچیوں سے سروانی علاقہ واپس دلایا تھا۔ کیونکہ اس کو عباس کے قدیمی مورث اعلیٰ کا بیحد احترام تھا لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ یہ تو شیر شاہ کی پالیسی تھی اور بلوچیوں کو ایک قسم کی تنبیہ تھی کہ وہ روہ کے پٹھانوں کے خلاف ان کی جارحانہ کارروائی برداشت نہ کی جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان ایک بلوچ خطہ مضبوط کرنا چاہتا تھا (جو کہ وہاں پہلے سے ہی موجود تھا) تا کہ دریائے سندھ کے پار کے قبائلیوں کو روک سکے۔ شیر شاہ اپنے عزیزو

---

[1] بہت سے قلمی نسخوں میں اور ایلیٹ کی جلد ۴ صفحہ ۳۹۰ میں 'پدمان' کو صحیح کرنے کے بعد 'ندنا' نندنا اور ندونہ کئی طریقہ سے لکھا ہوا ہے۔ صرف پروفیسر ہودی والا جیسا قابل مورخ ہی اس کو 'نندنہ' لکھ سکا نندنہ جہلم قصبہ سے ۱۲ میل دور ایک پہاڑی پر واقع ہے جہاں سے ہو کر نمک کے پہاڑ کو راستہ جاتا ہے۔ گرجھک، جلال پور کے نزدیک ہے۔ جہلم سے ۳۰ میل جنوب میں ایک تنگ وادی ہے۔ افغانستان سے ہندوستان آنیوالے راستوں میں سے ایک بڑا راستہ یہاں سے گزرتا ہے۔ (دیکھئے ہودی والا اسٹڈیز صفحہ ۴۵۹-۴۶۰)

Marfat.com

اقارب سے محبت تو کرتا تھا مگر ان کی جانب سے مشتبہ بھی رہتا تھا اس کے سامنے لودی سلطان کی مثال تھی۔ بانیٔ سلطنت ہونے کی حیثیت سے اس کو یہ لازم تھا کہ وہ اس علاقہ میں آباد لوگوں کے موروثی تنازع، باہمی نفرت ادنیٰ خواہشات اور مالی مفاد کو مدنظر رکھ کر کام کرے اور ان سے فائدہ اٹھا کر اپنی حکومت کو مستحکم بناتے اور سندھ کی دوسری جانب اپنا اثر پھیلاتے۔

ملتان میں شیر شاہ کی پالیسی کا آغاز

۱۵۴۱ء کے موسم گرما کے شروع میں شیر شاہ نے بالآخر اپنی توجہ ملتان کی جانب مبذول کی۔ جہاں خواص خاں ابھی تک صورت حال پر قابو پاتے ہوتے تھا۔ اور وہ ستلج کے جنوبی کنارے کے پار واقعات پر بھی نظر جماتے ہوتے تھا۔ شیر خاں کو یہاں ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا جس کے سلجھانے کے لیے اس کے پاس بہت کم وقت تھا۔ مخزن کا بیان ہے۔

جب شیر شاہ ٹھٹھہ میں مقیم تھا اور سیر و شکار میں مصروف۔ اس کو یہ اطلاع ملی کہ خضر خاں سرک نے ذترک ؛ جو کہ بنگال کا گورنر تھا سلطان محمد کی ایک لڑکی سے شادی کر لی ہے[1] اس خراب خبر نے شیر خاں کو ملتان سے فوراً واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ شیر شاہ اس علاقہ میں سیر و شکار

---

[1] عباس اور ابوالفضل لکھتے ہیں کہ شیر شاہ کو بنگال کے گورنر کی بغاوت کی خبر گکھر علاقہ میں ملی اور وہ فوراً آگرہ واپس چلا گیا۔ انھوں نے کسی بھی جگہ ملتان کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن اس معاملہ میں دونوں ہی غلط ہیں۔ چنانچہ مجھے بھی اپنی پہلی رائے میں ترمیم کرنی پڑی ہے۔ کیوں کہ وہ رائے ابوالفضل کی سند پر مبنی تھی۔ اب میں مخزن کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں جو زیادہ صحیح ہے۔ یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ شیر شاہ سندھ کے سرحدی مسئلہ کو حل کیے بغیر پنجاب چھوڑ گیا ہو۔ خصوصاً جب سندھ کے بالائی حصہ کو فتح کرنے کے لیے ہمایوں جدوجہد کر رہا تھا۔

Marfat.com

سے دل بہلا رہا تھا یا کسی تجویز پر غور کر رہا تھا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ شیر شاہ اوچھ اور ملتان کے علاقہ سے ہوتا ہوا ٹھٹھہ کے شاہ حسین ارغون کی سلطنت کی شمالی سرحد تک پہنچ گیا تھا اور راستہ میں اس کو کسی قسم کی مزاحمت پیش نہ آئی تھی۔ کیونکہ اس علاقہ سے خواص خاں کی فوج پہلے ہی گزر چکی تھی۔ اس علاقہ میں نظام حکومت کے لیے اس نے کیا قدم اٹھاتے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ دو سال بعد اس کے سپہ سالار ہیبت خاں نیازی کو جاٹ اور بلوچیوں سے ملتان کو دوبارہ فتح کر کے پنجاب میں ملانا پڑا۔ ان جاٹ اور بلوچیوں کو اوچہ کے بخشو لنگا کی حمایت حاصل تھی۔ بخشو لنگا نے مغلوں کے فرار ہونے کے وقت ان سے دوستانہ سلوک کیا تھا۔ اس عرصہ میں شیر شاہ کی سیاسی پالیسی کو سمجھنے کے لیے ملتان کی گذشتہ تاریخ پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

ساتویں صدی کے آخری نصف میں جب عرب حملہ کے بعد ملتان اور سندھ کو امیہ سلطنت میں ملا لیا گیا تھا تب سے ان کی سیاسی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگیا۔ چونکہ یہ علاقہ برہمن تہذیب و تمدن سے دور تھا اس لیے خلیفہ دوم عمرؓ کے زمانے میں اس علاقہ میں آباد انڈو آرین لوگوں نے جن میں راجپوت، جاٹ اور بلوچ شامل تھے جلد ہی اسلام قبول کر لیا۔ اس پاک سرشت خلیفہ نے اپنے موروثوں کی پالیسی کو بدل دیا اس سے پیشتر خلیفہ اپنی رعایا کو اسلام قبول کرنے کی شہ نہ دیتے تھے۔ کیونکہ اس سے جزیہ دینے والی رعایا کی تعداد میں تخفیف اور سرکاری خزانہ کی آمدنی پر اثر پڑتا تھا۔ علاوہ بریں چونکہ امیہ لوگ نیم مسلم تھے۔ اس لیے انھوں نے غیر عرب قوموں کی سیاسی آزادی کو اسلام سے ہم آہنگ کر دیا اور اس طرح مذہب اسلام کی اشاعت کو دھکا لگا۔ لیکن خلیفہ عمر دوم کو ناپاک امیہ شہنشاہیت سے زیادہ اسلام کی اشاعت کی فکر تھی۔ ان کا یہ مقولہ تھا کہ "اللہ نے اپنا رسولؐ اس لیے زمین پر نہیں بھیجا تھا کہ وہ عوام

Marfat.com

سے جزیہ وصول کرے، لوگوں کے ختنہ کراتے، جہاد کے نام پر دوسری قوموں کی آزادی اور زمین پر قبضہ کرے۔ بلکہ اس کا خاص مقصد امن و محبت کے ساتھ خدا کے پیغام کو گھر گھر پہنچانا تھا۔

خلیفہ نے یہ عام اعلان کر دیا تھا کہ آئندہ اسلام قبول کرنے والی جماعت مسلمانی حملہ سے محفوظ رہے گی اور اس فرقہ کی سیاسی آزادی برقرار رہے گی۔ اس اعلان کا فوری اثر یہ ہوا کہ جو ہندو سردار عرب حکومت کی غلامی سے بچنے کے لیے ہندو مذہب سے چھٹے ہوتے تھے وہ فوراً ہی مسلمان ہو گئے۔ لیکن خلیفہ عمر دوم کی وفات کے بعد جب قدیم اُمیہ پالیسی کا از سر نو اطلاق ہونے لگا اور رعایا پر پھر وہی ظلم و ستم ہوا۔ جزیہ پھر سے نافذ ہو گیا تو وہی ہندو سردار دوبارہ پھر ہندو ہو گئے۔ مسلمانوں کے خلاف اس تحریک کی لیڈری راجپوتوں نے کی اور ملتان و سندھ میں مسلم حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اب ان دونوں ریاستوں میں مسلمانوں کے ستائے ہوئے دیگر اسلامی عقائد کے ماننے والے لوگ جنھیں یہ لوگ کافر کہتے تھے۔ مثلاً خارجی، کرماتھین، اسماعیلی اور دوسرے شیعہ فرقے جوق در جوق پناہ گزیں ہونے لگے۔ ان لوگوں نے دوسرے باشندوں کو اپنے عقائد کا پیرو بنانے کی کوشش کی اور سرکاری اسلامی اتحاد میں رخنہ اندازی کی۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان دونوں ریاستوں کی کل آبادی مسلمان ہوتے ہوئے بھی ہر مسلم حملہ آور کو مثلاً محمود غزنوی، شہاب الدین محمد غوری، التمش، اور محمد تغلق کو یہاں زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

مذہبی اختلاف کے علاوہ احمقانہ باہمی نسلی عداوت اور فرقہ وارانہ کش مکش ان صوبوں کی سیاسی زندگی کے نمایاں پہلو تھے۔ ۱۵ ویں صدی کے آخری نصف سے ۱۵۲۶ء تک یعنی ۸۰ سال ملتان کی لنگا حکومت نے اس سورش پسند علاقہ میں سیاسی امن و امان قائم رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی پنجاب میں بلوچ لوگوں کا سیلاب آگیا اور دہلی کی لودی سلطنت

Marfat.com

اور سندھ کے پار رہنے والے پٹھان قبیلوں کے مابین ایک کھائی بن گئی۔

لنگاہ چالوکیہ یا سولنکی راجپوتوں کی ایک شاخ تھی۔ نویں صدی میں جب غزنی میں بھاٹی لوگوں کی حکومت تھی تب یہ لوگ موجودہ بلوچستان کے سیبی علاقہ میں حکومت کرتے تھے۔ جب بلوچ لوگوں نے ان کو پیچھے سے دبایا تو لنگاہوں نے نام نہاد کے لیے اسلام قبول کر لیا اور سندھ کی جانب بڑھے لنگاہ سردار رائے سہارا نے شیخ یوسف سے جو ملتان میں حکومت کرتا تھا اپنی ایک لڑکی کی شادی کر کے دوستی کر لی اور بعد ازاں لنگاہوں نے دھوکہ دے کر ملتان پر قبضہ کر لیا اور راجپوتوں کے مکروہ فریب کی ایک مثال قائم کر دی۔ رائے سہارا نے قطب الدین کا لقب اختیار کیا اور ۵ سال تک ۱۴۴۵ء؍۱۴۵۰ء تک ملتان میں حکومت کی۔ ملتان کے قرب و جوار میں سید خانی بلوچوں کا تسلط تھا۔ چنانچہ قطب الدین سلطان کے وارث سلطان حسین کو کئی مرتبہ ان سے لڑنا پڑا۔ اس نے راوی کے کنارے شمال پر واقع شور یا شورکوٹ (یہ پرانی شمالی مغربی ریلوے کا ایک جنکشن تھا) پر حملہ کیا۔ جو غازی خاں سید خانی کی حکومت میں تھا۔ ان سید و خانی بلوچ امیروں نے شورکوٹ کے شمال میں اور شمال مغرب میں بھیرا خوشاب، موجودہ جھنگ ضلع میں چنوٹ تک کا جو بھیرا کا جنوب میں ۶۰ میل ہے علاقہ آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ سید و خانی بلوچوں کے آنے سے پہلے چنوٹ کا داروغہ بنبیہ[1] کھوکھر تھا۔ سلطان حسین لنگاہ نے اپنی جارحانہ کارروائی جاری رکھی اور دھن کوٹ سے کوٹ کہرور تک تمام علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ بہلول لودی نے اپنے لڑکے بایزید اور اپنے سپہ سالار

---

[1] دیکھئے ہودی والا "اسٹڈیز" جلد ا صفحہ ۱۰۲۔ نظام الدین نے اس کو منیبھا لکھا ہے۔ ہودی والا نے اس کو صحیح کر کے بنبیہ لکھا ہے۔ جو کہ بمانیو کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ ٹھٹھہ کے جاموں کا لقب تھا (شاید یہ قبیلہ اصل میں برہمن نسل سے تھا اور سندھ کے داہر کی اولاد تھا)

Marfat.com

تاتار خاں کو ملتان فتح کرنے کے لیے بھیجا۔ افغان فوج ملتان شہر کی عیدگاہ تک پہنچ گئی۔ اس وقت سلطان حسین میاں والی ضلع میں دریائے سندھ کے کنارے دھن کوٹ کے قریب تھا۔ وہ مصیبت سے بال بال بچ گیا۔ افغان فوج مغلوب ہوگئی لیکن انھوں نے چنوٹ کو لوٹ لیا اور وہاں کے فوجی دستہ کو قتل کردیا۔ افغانوں سے خوفزدہ ہوکر لنگاہ سرداروں نے نووارد بلوچ قبیلہ سے امداد مانگی۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ کچھ (گنڈوا) اور کران سے ملک سہراب دودائی اور اس کے دونوں لڑکے اسماعیل اور فتح خاں معہ اپنے تمام قبیلے اور عیال و اطفال کے دریائے سندھ کو عبور کرکے شمالی کی جانب بھٹکتے ہوتے ملتان پہنچ گئے تھے۔ سلطان حسین لنگاہ نے ملک سہراب اور اس کے لڑکوں کو دھن کوٹ سے کہرور تک کا تمام علاقہ بطور جاگیر دے دیا۔ یہ علاقہ ملتان سے ۵۰ میل جنوب مشرق پرانی بیاس ندی کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔ نظام الدین لکھتا ہے کہ "اس خبر کو سن کر بہت سے بلوچ اور بلوچ علاقہ کے لوگ سلطان حسین کی نوکری میں آگئے۔ اور آہستہ آہستہ شوار[1] سے دھنکوٹ تک تمام علاقہ بلوچ لوگوں سے آباد ہوگیا۔ سندھ کے دو مفرور سلطان جام بایزید اور جام ابراہیم بھی سلطان کے دربار میں حاضر ہوتے۔ سلطان نے راوی پر واقع شور کوٹ کا سرحدی علاقہ جام بایزید کو دیدیا۔ اور اوچہ کا جنوبی علاقہ جو سندھ سے ملا ہوا تھا جام ابراہیم کو دیدیا۔ سلطان بہلول لودی کی وفات کے بعد سلطان حسین نے سکندر لودی سے صلح کرلی۔ اور طے پایا کہ کوئی ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔

---

[1] طبقات اکبری۔ صفحہ ۲۵۔ شوار شاید غلط ہے۔ فرشتہ نے جیت پور لکھا ہے۔ شاید .... دھن کوٹ سے مطلب ہے شمالی حد۔ اس لیے سوار جنوبی حد ہوگا۔ یہ آئین کا ست پور ہو سکتا ہے جو کہ چنید کے پار سندھ اور بہیٹ کے مابین سندھ ساگر دواب میں واقع ہے۔ (دیکھئے آئین جلد ۲ صفحہ ۳۳۱) ست پور اسلام خاں کے ماتحت نابر افغانوں کا صدر مقام تھا۔ یہ بہلول لودی کے رشتہ دار تھے۔ بنیلز گرہ ضلع میں واقع ہے۔

Marfat.com

سلطان حسین لنگاہ کی حکومت ۱۴۶۰ء سے ۱۵ ویں صدی کے آخر تک رہی۔ بعدازاں ۲۶ سال کے عرصہ میں دو حکمران ہوتے۔ فیروز شاہ اور محمود، سلطان محمود لنگاہ کے زمانہ میں سورش پسند شرنارتھی جام بایزید نے ملتان پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ سلطان محمود نے ایک لڑائی میں اسے ہرا دیا جس کے بعد جام بایزید دریائے راوی پر واقع شور کوٹ کے قلعہ میں چلا گیا اور وہاں سلطان سکندر لودی کے نام کا خطبہ پڑھنے لگا۔ اس نے لنگاہ سلطان کے خلاف سکندر لودی سے اپیل کی۔ جب سلطان محمود لنگاہ نے شور کوٹ پر حملہ کیا تو سکندر لودی نے پنجاب کے گورنر دولت خاں لودی یوسف خیل کو جام بایزید کی مدد کرنے کا حکم دیا۔ دولت خاں نے سلطان محمود لنگاہ کو مجبور کر دیا کہ وہ شور کوٹ کا قلعہ دہلی کے سلطان کے حوالے کر دے اور دریائے راوی کے نیچے کے حصہ کو دونوں سلطانوں کے درمیان کی حد مان لے۔ چونکہ لنگاہ ریاست میں ڈوڈائی بلوچ بہت زیادہ ہی طاقتور ہو گئے تھے۔ اس لیے جام بایزید نے ان کے پشتینی دشمنوں یعنی رند بلوچوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ اپنے بدنام سردار مسمی چاکراند کی رہنمائی میں اپنے قبیلے کے ساتھ ملتان ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ میر چاکراند مع دو لڑکوں یعنی اللہ داد و شاہ داد کے ساتھ بلوچستان میں واقع سیبی کی جانب سے ملتان آ گیا۔

ڈوڈ بلوچ اور رند بلوچ اپنے وطن بلوچستان میں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے وہ مسلمان ہونے سے پہلے بھی دو مختلف راجپوت فرقوں سے تھے۔ اور ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے مسلمان ہونے کے بعد بھی اس مخالفت کو تازہ رکھنے کے لیے ایک فرقہ شیعہ بن گیا۔ دوسرا سنی۔ ان کی یہ پشتینی دشمنی سمرا اور سما لوگوں کے زمانہ سے چلی آ رہی تھی۔ جو سندھ پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے لڑا کرتے تھے۔ ڈوڈ بلوچ سمرا نسل سے تھے اور رند سما راجپوت تھے پنج ند دریا کے مشرق میں بلوچ لوگوں کے تین قبیلہ ہجرت کر کے آتے

Marfat.com

تھے۔ سب سے پہلے غازی خاں اور سید وخانی آتے اور اس کے بعد میر چکر کی قیادت میں رند بلوچ۔ انھوں نے اپنی دیرینہ عداوت کو جہلم اور بیاس کی وادیوں میں بھی آکر زندہ رکھا۔ ان میں بمقابلہ پٹھان سیاسی بیداری اور صلاحیت کم تھی۔ اس لیے وہ کبھی اپنی حکومت قائم کرنے کی غرض سے متحد نہ ہو سکے۔ رند لوگوں نے ڈوڈ بلوچوں کے علاقہ سے دور رہنا ہی بہتر سمجھا اور وہ جام بایزید اور جام ابراہیم کے ماتحت علاقہ شورکوٹ اور اوچہ میں جاکر آباد ہو گئے۔ ملک سہراب کے لڑکوں نے ملتان میں اور بنگاس علاقہ سے پیچھے دریائے سندھ کے دونوں جانب اپنی طاقت مضبوط کرلی۔ اور لنگاہ سلطان کے وفادار حلقہ بگوش بنے رہے۔

اس کے بعد ہمیں بلوچوں کے ہندوستان آنے کی مزید تواریخ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی ہجرت نے شیر شاہ کے لیے ایک عظیم مسئلہ پیش کر دیا۔ اندرونی اختلافات نے لنگاہ کی طاقت کو کمزور بنا دیا۔ ان میں سے دو خاص سردار قیوم خاں اور لنگر خاں بھاگ کر شاہ حسین ارغون کے پاس چلے گئے جو کہ ٹھٹھہ کا مغل حکمران تھا۔ ان غداروں کی مدد سے ارغون ومغلوں نے محمود کی فوج کو ۱۵۲۴ء کی ایک لڑائی میں ہرا دیا۔ اس فوج میں زیادہ تر جاٹ اور بلوچ قبائل تھے۔ مغلوں کے پاس بہتر توپ خانہ تھا اور ان کی فوج کا ضبط و نظام بھی اعلیٰ تھا اور یہ ہی ان کی فتح کی وجہ تھی۔ ۱۵۲۶ء میں شاہ حسین نے ملتان بابر کے حوالے کر دیا بابر نے یہ علاقہ کامران مرزا کو دیدیا۔ کامران نے لنگر خاں لنگاہ کو لاہور بلایا۔ یہ شاہ حسین کی جانب سے ملتان کا گورنر تھا اور اسے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ملتان کے عوض پائل (تعبضہ پٹیالہ سے ۴۳ میل مغرب) لے لے۔ تب سے متواتر کامران کے افسر ملتان پر قابض رہے اور کھکے عام سلطان مرزا اور انوع مرزا سے جا ملے۔ دونوں مرزا خوشاب پہنچ گئے تھے۔ اس وجہ سے کچھ عرصہ کے لیے شیر شاہ کو اس جانب

Marfat.com

خطرہ پیدا ہو گیا۔

سندھ کی سرحد کے متعلق شیر شاہ کی پالیسی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۵۴۱ء میں جب کہ شیر شاہ نے یہ کوشش کی کہ حالات بدستور سابق رہیں۔ اور دوسرا دور ۱۵۴۳ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ ہیبت خان نیازی کی کمان میں فتح و توسیع کی کیفیت رہی۔ ۱۵۴۱ء میں شیر شاہ اس حالت میں نہیں تھا کہ بلوچوں کے ساتھ سختی کر سکے اور اگر اس موقع پر شیر شاہ بلوچوں پر سختی کر کے ان کی جاگیریں ضبط کر لیتا اور ان کے مفاد میں دست اندازی کرتا تو ممکن تھا تمام بلوچ متفق ہو کر اس کے خلاف وفاق بنا لیتے۔ کیونکہ بلوچوں اور پٹھانوں میں پشتینی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ اگر اس وقت بلوچ متحد ہو کر سورش پسند جاٹوں سے ساز کر لیتے تو بھی حالت نازک ہو جاتی۔ یہ جاٹ قبائل لکھی جنگل میں آباد تھے (ضلع مونٹگمری) اور بہت طاقتور اور کثیر تعداد میں تھے۔ وہ بڑی آسانی سے ایک لاکھ گھوڑ سوار فراہم کر سکتے تھے جو کہ شیر کے چند ہزار پٹھانوں کا صفایا کرنے کو کافی ہوتے۔ شیر شاہ ان اضلاع کے انتظام کے لیے اس سے زیادہ فوج نہیں رکھ سکتا تھا۔ علاوہ بریں اگر شیر یہ غلطی کر بیٹھتا تو یہ بھی اندیشہ تھا کہ یہ فوجی قبیلے بغاوت کر کے ہمایوں اور شاہ حسین سے میل نہ کر لیں۔ ایسی حالت میں شیر کے خلاف ایک نیا اتحاد بن جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا۔ لہٰذا شیر نے نہایت سیاست اور مدبرانہ طریقے سے اس مسئلے کو سلجھایا۔ اس نے لنگاہوں کو جن کا علاقہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا یہ امید دلائی کہ وہ ارغونوں سے انتقام لینے کے لیے اس کی مدد کرے گا، اور وہ اوچہ کے زمیندار بخشو لنگاہ پر فوج کشی کرے گا۔ بلوچ حکمرانوں کی دو شاخیں تھیں۔ بڑی کا نمائندہ فتح خاں ڈوڈانی، اور چھوٹی کا نمائندہ اسماعیل خاں تھا۔ یہ دونوں شاخیں ملک سہراب کے دو لڑکوں کی نسل سے تھیں، جن کے لقب غازی خاں اور اسماعیل خاں تھے۔ اور یہ لقب پشتینی ہو گئے تھے۔

Marfat.com

زیادہ تر مورخوں کی یہ رائے ہے کہ شیر شاہ نے ان دونوں سرداروں کا اپنے اپنے علاقہ پر قبضہ تسلیم کر لیا اور یہ بھی سچ ہے کہ بنگال روانہ ہونے سے پہلے شیر شاہ نے ملتان یا اوچ میں اپنی فوج نہیں رکھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ نے فتح خاں ڈوڈانی کو ملتان میں اپنا فوجدار مقرر کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب اسماعیل خاں شیر شاہ سے ملنے آیا تو اس نے یہ عرض کیا کہ گھوڑوں کے داغنے کا تو ذکر ہی کیا وہ اور اس کی فوج کا ہر فرد اپنے شانوں پر شاہی داغ لگوانے کو تیار ہے۔ شیر شاہ پر اس چاپلوسی کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے اسماعیل خاں کے گھوڑوں پر شاہی داغ لگوانے کا خیال بالکل ترک کر دیا۔ یہ لیکن پٹھانوں کی محض سخن سازی ہے جس کے پردہ میں انھوں نے حقیقت کو پنہا کر دیا ہے۔ اصل واقعہ تو یہ ہے کہ شیر شاہ نے یہ نرمی اپنی مہربانی سے نہیں کی بلکہ اس وقت کے حالات کو مدنظر رکھ کر کی۔ بلوچ سردار طاقتور تھے، با اثر تھے۔ ان پر داغ کے سخت قانون کا نفاذ دقت طلب ہوتا۔

اب ہم شیر شاہ کی سندھ پالیسی کے دوسرے دور کا مطالعہ کریں گے جو پہلے دور کی تکمیل ہے۔

ملتان میں ایک ماہ تک مقیم رہنے کے بعد برسات شروع ہونے سے پہلے شیر شاہ لاہور واپس آگیا۔ اس نے پنجاب کے انتظامیہ امور کو مکمل کر دیا۔ اور لاہور سے ملتان تک ایک سڑک بنوانے کا کام شروع کر دیا۔ یہ سڑک اٹک سے دہلی جانے والی گرانڈ ٹرنک سڑک سے جو کہ لاہور سے گزرتی تھی مل جاتی۔ اس سڑک کی تعمیر شروع ہو چکی تھی۔ شیر شاہ کی نظر میں سڑکوں کے جال کی وہی اہمیت تھی جو کہ تسخیر ممالک اور جنگی فتوحات حاصل کرنے کے لیے اس کے توپخانہ اور تربیت یافتہ فوجی دستہ کی تھی۔

اس نے بوقت روانگی اپنے تجربہ کار سپہ سالار خواص خاں، ہیبت خاں نیازی، عیسیٰ خاں نیازی وغیرہ کی مشترکہ کمان میں ۵۰ ہزار فوج یہاں چھوڑ دی اور سول و فوجی نظام کے لیے اس نے مشترکہ طور پر خواص خاں اور ہیبت خاں

Marfat.com

نیازی کو ذمہ دار بنایا۔ ہیبت خاں نیازی کا پنجاب میں رہنا اشد ضروری تھا۔ ایک تو پٹھان قبیلو پر اس کا گہرا اثر تھا۔ دوسرے خود اس کا جنگ جو اور دلیر قبیلہ اس کی پشت پر تھا۔ نیازیوں کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ وہ اپنے آقا اور سپہ سالار کا آنکھ میچ کر ساتھ دیتے تھے اور خدا کے علاوہ کسی کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ شیر شاہ نے ہیبت خاں نیازی کو اس علاقہ میں مقرر کر دیا تھا۔ لیکن اس کی یہ خصلت تھی کہ وہ کسی کا زیادہ اعتبار نہ کرتا تھا۔ اسی لیے اس نے خواص خاں کو احتیاطاً اس کے ساتھ رکھ دیا تھا۔ مبادا نیازی اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں جیسا کہ یوسف خیل نے لودی حکومت[1] کے ساتھ کیا تھا۔

شیر شاہ نے اس علاقے کے لیے جو انتظامات کیے وہ باا ثر و دیرپا ثابت نہیں ہوتے۔ جیسا کہ آئندہ کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ حالانکہ ہیبت خاں نیازی اور خواص خاں دونوں اپنے آقا کے وفادار و نمک خوار تھے اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن ان میں باہمی بغض و کینہ تھا۔ ایک سال یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ میں ان کے اختلافات حد سے تجاوز کر گئے۔ خواص خاں نے شیر خاں کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ وہ ان میں سے کسی ایک کو واپس بلالے۔ شیر شاہ نے مئی ۱۵۴۲ء کے قریب خواص خاں، عیسیٰ خاں اور

دیگر سرداروں کو پنجاب سے واپس بلالیا اور ہیبت خاں کو تن و تنہا پنجاب کا گورنر بنا دیا۔ اس کو ۳۰ ہزار گھوڑوں کی کمان دے دی۔ شیر شاہ نے خواص خاں کو اُس لیے نہیں بلایا تھا کہ اس کو خواص خاں پر اعتماد نہ تھا بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ اب شیر شاہ جودھپور کے راجہ مالدیو کے خلاف مہم

---

[1] کتاب میں یہ الفاظ ہیں "از دو کس یک را در تخت اقدم خود طلبدہ" (عباس۔ صفحہ ۲۱۷) ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۳۹۷) میں اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے "اس سے یہ درخواست کی گئی کہ ہر ایک کا قائم مقام بھیجا جائے مگر اس کا مفہوم پراگندہ ہے۔" اس لیے مسترد کر دیا گیا۔

Marfat.com

آراتی کرنے کا منصوبہ باندھ رہا تھا اور اس کام میں اسے خواص خاں کی مدد کی ضرورت تھی۔

پنجاب کے گورنر ہیبت خاں کا ملتان اور شمالی سندھ فتح کرنا

۹۴۱ - ۹۵۰ ہجری

حالانکہ اس موضوع پر بات کرنے سے تاریخی سلسلہ بگڑ جائے گا لیکن مناسب یہی ہے کہ شیر شاہ کی سندھ اور ملتان پالیسی کا آخری انجام بھی دیکھ لیا جائے اور ساتھ ساتھ یہ بھی مطالعہ کر لیا جائے کہ شیر شاہ نے لکھی جنگل (موجودہ ضلع مونٹگمری) اور ملتان کے بڑے بلوچ اور جاٹ سرداروں کو کس طرح دبایا۔ ملتان اور سندھ کے اوپری حصہ کو فتح کر کے کس طرح اپنی سلطنت میں ملایا کیونکہ اس کے بعد شیر شاہ اپنی زندگی میں کبھی بھی پنجاب نہیں آیا۔ شیر شاہ کی آئندہ تاریخ میں پنجاب کا کہیں ذکر نہیں آئے گا۔

اب ہم اس سلسلہ کی دوسری کڑی شروع کرتے ہیں۔

قرون وسطی کے مورخوں نے شیر شاہ کے ان بنیادی منشاؤں پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے کہ اس نے ملتان میں اپنی پہلی صلح کن پالیسی کو کیوں بدلا اور اس کی جگہ پر تعدی اور الحاق کی پالیسی کیوں اختیار کی۔ تاریخ میں کہیں ایسا ثبوت بھی نہیں ملتا کہ بلوچ سرداروں نے کبھی غداری یا بے وفائی کا سلوک کیا ہو۔ البتہ یہ شکایت ضرور تھی کہ ملتان میں فتح خاں ڈوڈائی کا نظام حکومت خراب ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بلوچوں کے دوران حکومت میں ملتان میں خوشحالی و فارغ البالی پیدا نہ ہو سکی۔ رعایا بلوچیوں کے ظالمانہ رویہ سے تنگ تھی۔ شیر شاہ نے ملتان کے بلوچ اور کوٹ قافلہ کے فتح خاں جاٹ پر حملہ کرنے کے لیے ۱۵۴۳ء کا سال چنا اور لڑائی باری دواب کے مقام پر ہوئی۔ یہ علاقہ سرکار دیپالپور میں دریائے بیاس اور ستلج کے نیچے کے حصوں کے درمیان

Marfat.com

واقع ہے ۔ جہاں آج کل مونٹگمری ہے ۔ یہ وہ سال تھا جب کہ ہمایوں ماروار میں پہنچا تھا اور شیر شاہ کی فوج ناگورا ور میرٹھ کی جانب روانہ ہوئی تھی ۔ ممکن ہے ان دونوں واقعات میں فن جنگ کے اعتبار سے کوئی باہمی تعلق ہو ۔ شیر شاہ کے حکم کے بموجب ہیبت خاں نیازی نے جو فوج کشی کی اس کا منشا تھا کوٹ کابلہ کے سرکش سردار فتح خاں کی بربادی، ملتان سے بلوچوں کا اخراج، اور وہاں کی خوشحالی کی تجدید[1] اس کے علاوہ جن سربرآوردہ سرداروں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا وہ تھے فتح خاں جاٹ ۔ ایک دیگر فتح خاں (شاید ڈوڈائی) ایک لیڈر (صحیح سید و خانی) بلوچ) اور ہیبت خاں نیازی کا کارآمد لنگاہ معاون یعنی اونچہ کا بخشو لنگاہ ۔ ان پر کیا الزامات لگاتے گئے وہ ان الزاموں سے صاف اور یقین ہو جاتے ہیں جو کہ فتح خاں جاٹ پر لگاتے گئے تھے ۔

فتح خاں جاٹ نے لکھی جنگل کے تمام علاقہ کو تباہ کر دیا تھا اور لاہور سے دہلی تک کے علاقہ میں اتنی ابتری پھیلا رکھی تھی کہ اس کے ظلم و تشدد کی شکایتیں متواتر دربار میں پہنچ رہی تھیں[1] حالانکہ عباس کے اس بیان میں مبالغہ ہے اور مقاموں کے تعین میں بھی اس نے غلطی کی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ فتح خاں جاٹ کے خلاف زیادہ تر شکایتیں سچ تھیں ۔ اس کا صدر مقام کوٹ کابلہ تھا ۔ جو ستلج کے شمال میں تقریباً ۳ میل آج کے مونٹگمری ضلع میں یا دیپالپور کی پرانی سرکار لکھی جنگل[2] میں ہے ۔

---

[1] عباس نسخہ صفحہ ۲۱۸ ۔ ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۳۹۸ ۔

[1] وہی اور نسخہ ۔ ڈارن ۔ جلد ا صفحہ ۱۳۴-۱۳۵ ۔ [2] خلاصۃ التواریخ میں دیپالپور کے جنگل کے متعلق دل چسپ معلومات ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے تک یہ لیٹرے اور ڈاکوؤں کا مسکن تھا ۔ کوئی سردار یا شاہی سپہ سالار ان کو نہ تو تباہ ہی کر سکا اور نہ ان کی تادیب ہی کر سکا (انڈیا آف اورنگ زیب صفحہ) یہ کہنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ برطانیہ حکومت کے زمانہ میں بھی حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو پائی ۔ مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے ۔ ایک بار جب میں لکھا ولی سڑک سے ہریا

Marfat.com

لکھی جنگل کی حد شمال مشرق میں کسور سے چند میل دور تک ہے اور جنوب مشرق میں بیکانیر علاقہ یعنی جنگل دیس سے ملی ہوتی ہے۔ اس لیے لاہور اور دہلی کو جانے والے تمام مسافر غالباً اس کے شکار ہوتے ہوں گے۔ شیر شاہ کے تخت کے سایہ میں اس قسم کی غارت گری صرف بلوچوں کی شہ اور اغواسے پہنچتی ہوگی۔ فتح خاں کے ایک خاص معاون کا نام "سید و بلوچ" تھا۔ یہ کسی شخص کا نام معلوم نہیں ہوتا بلکہ کسی قبیلہ کا نام ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس آدمی کا تعلق قدیم ترین بلوچ نسل سے تھا۔ جس نے جھنگ ضلع میں چنوٹ (بھیرا کے جنوب میں ۶۰ میل) سے لے کر شور کوٹ (راوی کے شمالی کنارے) تک تمام علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں نووارد ڈوڈائی بلوچوں نے جب ان کو اس علاقہ سے نکال دیا تو یہ سید و خانی بلوچ لکھی جنگل کے جاٹوں سے مل کر لوٹ مار کرتے ہوں گے۔ سب سے بعد میں آنے والے رند بلوچ بھی جن کا سرغنہ چکراند تھا۔ فتح خاں جاٹ کی غنڈہ گردی میں شریک تھے۔ ان کا خاص صدر مقام ست گرہ تھا جو ے قلعوں کا ایک مرکز تھا[1] اور لاہور سے جنوب مغرب میں ۶۵ میل پر واقع تھا۔ چکراند کے علاقہ کی دوسری سرحد جنوب مشرق میں دیپالپور تک پھیلی

جا رہا تھا تو ڈاکوؤں سے سابقہ پڑا۔ مقامی آدمی لاہور سے مونٹگمری ہوتی ہوئی ملتان جانے والی سڑک کو اسی نام سے پکارتے ہیں۔ اس سڑک کو شیر شاہ نے بنوایا تھا۔ کوٹ کوبولہ ۳۶ ک ۳ ، طول البلد اور ۱۱ ک ۳۰ عرض البلد کے درمیان واقع ہے (ہودی والا اسٹڈیز صفحہ ۴۶۱)

[1] ان مقامات کا تعین اس طرح کیا جا سکتا ہے (۱) کوٹ کابولہ عرض البلد ۱۱ ک ۳۰ شمال۔ طول البلد ۳۶ ک ۳ ، مشرق سرکار دیپالپور صوبہ لاہور میں واقع ہے۔ (آئین جلد ۲ صفحہ ۳۶۷) موجودہ مونٹگمری ضلع میں ستلج سے ، میل شمال میں ہے۔ (۲) چنوٹ۔ عرض البلد ۳۴ ک ۳۱ شمال طول البلد ۳۶ ک ۳ ، مشرق۔ بھیرا سے ۶۰ میل جنوب (۳) ، ست گرہ عرض البلد ۳۴ ک ۳۱ شمال طول البلد ۲۶ ک ۳ ، مشرق صوبہ لاہور کی جنوبی سرحد سے ، قلعوں میں سے اب کسی کا نشان باقی نہیں ہے۔ چکراند کا مقبرہ ضرور ہے۔

Marfat.com

ہوئی تھی جو لاہور اور اوچہ کے تقریباً وسط میں قدیم دریائے بیاس کے جنوبی کنارے پر تھا۔ فتح خاں ڈوڈاتی جو ملتان کا فوجدار اور شیر شاہ کا باجگذار تھا اس وقت اوچہ کے بخشو لنگاہ کے علاقہ پر دست اندازی کرنے میں مصروف تھا۔ یہ لنگاہ سردار ملتان خاندان کی کھوئی ہوئی عظمت کی آخری یادگار تھا۔

تواریخ سے بہت کم معلوم ہوتا ہے کہ ہیبت خاں نیازی نے کس طرح فتح خاں جاٹ کو دبایا۔ ملتان فتح کیا اور بلوچوں کو باہر نکالا۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ فنون حرب اور سیاسی ریاکاری میں ہیبت خاں اپنے آقائے نامدار کا شاگرد ارجمند ثابت ہوا۔ اور اس نے یہ فوج کشی نہایت ہی خوش اسلوبی سے کی۔ غالباً ۱۵۴۳ء کے موسم سرما میں ہیبت خاں نے نہایت تیزی سے لاہور سے کوچ کیا اور سات گڑھی کے مقام پر پہنچکر حکمرانوں کو حیرت میں ڈال دیا اور اسے مجبور کیا کہ افغان فوج کی حراست میں وہ اس کے ہمرکاب ہو۔ اسے بتایا گیا کہ دیپالپور میں اس کی فوج کا معائنہ وشماری ہوگی۔ اسی وقت بخشو لنگاہ کو بھی یہ ہدایت دی گئی کہ اوچہ سے اپنی فوج کے ساتھ مشرق کی جانب روانہ ہو اور دیپالپور کے نزدیک آکر اس سے ملے۔ سات گڑھ پہنچنے کے دو روز کے اندر ہی ہیبت خاں کی فوج پاک پٹن تک پہنچ گئی۔ یہ یہ مقام سات گڑھ سے ۴۴ میل جنوب میں ہے[1] اس کے ایک طرف ملتان میں فتح خاں ڈوڈاتی تھا اور دوسری طرف کوٹ کابولہ میں فتح خاں جاٹ تھا۔ پاک پٹن پہنچنے سے اس کو نہ صرف یہ فائدہ ہوا کہ وہ دونوں دشمنوں کے بیچ سد راہ بن گیا بلکہ جنگی اعتبار سے بھی وہ اپنی حسب مرضی جس دشمن پر چاہتا حملہ کرسکتا تھا۔ فتح خاں ڈوڈاتی ملتان سے ہٹا نہیں لیکن فتح خاں جاٹ اپنے قلعہ فتح پور سے جنوب مغرب کی سمت میں بھاگ گیا

---

[1] عباس نسخہ صفحہ ۲۱۹۔ ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۳۹۸۔

Marfat.com

پر ہیبت خاں فتح خاں کے لیے زیادہ تیز رفتار ثابت ہوا۔ جب کہ وہ اپنے قبیلہ کو لاکھی جنگل سے راجپوتانہ کے ریگستان کی طرف لیے جا رہا تھا۔ راستہ میں اس نے فتح پور اور کہرور[1] کے نزدیک کسی مٹی کے قلعہ میں پناہ لی۔ اور اس نے صلح کی بات شروع کر دی۔ ہیبت خاں کو اسے اپنے جال میں پھنسانے کا ایک موقع مل گیا۔ اس نے شیخ ابراہیم کو اپنا سفیر بنا کر اس کے پاس بھیجا۔ شیخ ابراہیم شیخ فرید شکر گنج کی اولاد میں سے تھا۔ شیخ فرید شکر گنج افغانوں کی نظر میں فقرا اور ان کا سرپرست و ولی تھا۔ خداوند تعالیٰ نے اسے یہ معجزہ بخشا تھا کہ وہ ایک ہی نگہہ میں مٹی کے ڈھیروں کو شکر کے تودوں میں بدل دیتا تھا شیخ ابراہیم نے خلوص دل سے اس صلح کے کام کرنے کا ذمہ لیا۔ جب فتح خاں جاٹ اور سید و بلوچ[2] کو ان کی حفظ جان کا صاف صاف وعدہ

---

[1] کہرور کو آج کل کرور کہتے ہیں۔ یہ قدیم بیاس دریا کے جنوبی کنارے پر ملتان سے ۵ میل جنوب مشرق میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بکرما دتیہ نے اسی مقام پر سکوں کو ہرایا تھا۔ فتحپور آج کل جغرافیہ میں فتحپور ہے۔ کہرور سے ۷ میل شمال مشرق میں ہے۔ شاید فتح خاں جاٹ نے . . . . .

جس قلعہ میں پناہ لی۔ وہ موجودہ نقشہ میں موسیٰ کوٹھ کے نزدیک کہیں ہے جو کہرور سے ۵ میل جنوب مشرق میں اور فتحپور سے ۱۰ میل جنوب مغرب میں ہے۔ مزید اطلاع کے لیے دیکھیے ہودی والا۔ صفحہ ۸۲ اور صفحہ ۳۹۹۔ [2] پروفیسر ہودی والا لکھتے ہیں: "شیر شاہ' میں پروفیسر قانونگو نے شیخ ابراہیم کو شیخ فرید گنج کا لڑکا بتایا ہے۔ یہ غلطی انھوں نے ڈاؤسن کے ترجمہ کو پڑھ کر کی ہے۔" میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔ ۱۹۲۱ء میں شیخ کے متعلق میری معلومات زیادہ نہیں تھیں۔ شیخ فرید شیر شاہ سے ۴۰۰ سو سال پہلے ہوا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ پروفیسر ہودی والا جیسے نقاد دنیا میں اور زیادہ پیدا ہوں تاکہ مورخین کی اصلاح و رہنمائی ہوتی رہے۔ [3] ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۳۹۰ ۔ ڈارن جلد ۱ صفحہ ۱۳۵ جو عباس کا نسخہ ہمارے پاس ہے اس میں منڈ بلوچ لکھا ہے۔ مخزن میں میٹھ بلوچ لکھا ہے۔ ایلیٹ نے سہند و بلوچ لکھا ہے۔ میں نے اس کی سند کو ترجیح دی اور منڈ و اور میٹھ والفاظ کو تسلیم نہ کیا۔ ان سب کو صحیح کر کے اب ان کو سید و یا سید و خانی بلوچ پڑھنا چاہیے اس کے وجوہات دیے جا چکے ہیں۔

Marfat.com

شیخ نے کر دیا اور اس کی ہیبت خاں نے تصدیق بھی کر دی تو بلا کسی شک و شبہ کے دونوں شخص یعنی فتح خاں جاٹ اور سیدو بلوچ ہیبت خاں کے روبرو حاضر ہوتے۔ اس پر ہیبت خاں نے دونوں کو گرفتار کر لیا اور ان بدنصیبوں کی قسمت کو اتنا پوشیدہ رکھا کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوتی۔ اتنا ہی نہیں اس نے شیخ کو یہ کہہ کر بیوقوف بنایا کہ میں تو شیر شاہ کا زماں بردار خادم ہوں جو اس کا حکم ہوتا ہے وہی کرتا ہوں۔ شاید شیخ کی بددعا ہی ہیبت خاں کو لگ گئی۔ کیوں کہ شیر شاہ کے انتقال کے بعد اس کے عروج تاباں کا ویسا ہی حسرتناک انجام ہوا جیسا کہ اس کے دو بدنام قیدیوں کا ہوا تھا۔

لیکن سیدو خاں بلوچ اسی رات کو مع اپنے خدمت گار کے جس کا نام سعید[1] تھا ہیبت خاں کی حراست سے بچ نکلا اور اس نے فتح خاں کی گرفتاری کی خبر اس کے آدمیوں کو قلعہ میں جا کر دے دی۔ دو روز تک فتح خاں کے سپاہیوں نے دشمن کا بڑی مستعدی سے مقابلہ کیا۔ زاں بعد انھوں نے اپنے بیوی بچوں کو قتل کر ڈالا اور سیدی بلوچ کی رہبری میں تین سو اولوالعزم سورما جان کی بازی لگا کر افغان محاصرین کی قطاروں کو چیر کر نکل بھاگے۔ مگر دوسرے ہی روز بخشو لنگاہ نے بلوچ سردار کو گرفتار کر لیا اور قیدی کو ہیبت خاں نیازی کے حوالے کر دیا۔

اسی مہم کے دوران ملتان اور اس کے گرد و نواح کے علاقہ کو بھی ہیبت خاں نیازی نے فتح کر لیا۔ یہ بات ذرا تعجب کی ہے کہ عباس نے ڈاکو سردار کی کہانی تو اس قدر وضاحت سے لکھی ہے لیکن ملتان کی فتح کو نظر انداز کر دیا ہے۔ عباس نے فتح خاں ڈوڈائی اسماعیل خاں اور غازی خاں کیخلاف کسی لڑائی کا ذکر نہیں کیا اور نہ ملتان کی

---

[1] ڈارن۔ جلد ا صفحہ ۱۳۵ [2] دیکھئے ڈارن۔ جلد ا صفحہ ۱۳۵

بلوچوں کے بھاگنے کا ہی کوئی بیان دیا ہے۔ اس کے متعلق ہمیں مخزن سے محض یہ پتہ چلتا ہے۔

"شیر شاہ کے حکم کے بموجب ہیبت خاں نے فتح خاں کے خلاف فوج کشی کی۔ ایک زبردست لڑائی ہوئی جس میں فتح خاں کی شکست ہوئی اور ملتان شیر شاہ کے قبضہ میں آگیا۔[۲]"

گذشتہ پچاس سالوں میں بلوچوں کو ملتان سے اس سے بھی زیادہ انسیت پیدا ہوگئی تھی جتنی کہ مغلوں کو آگرہ اور دہلی سے نہ ہو پائی تھی۔ ملتان کی فتح کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت بڑی تعداد میں بلوچ ملتان سے بھاگ کر دریائے سندھ کے اس جانب اپنے وطن چلے گئے۔ رند لوگ بلوچستان میں سیبی کی جانب بھاگ گئے اور ان کا سردار چکر اند شیر شاہ کے سوری خاندان کے بعد تک زندہ رہا۔ اس نے مغلوں کو دوبارہ ہندوستان فتح کرنے اور اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو واپس پانے میں بڑی مدد کی۔ سات گڑھ میں اس کا مزار بلوچوں کی زیارت گاہ ہے وہ لوگ اس کو اپنی قوم کا قابل توقیر پیر مانتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ اس طرح سے بلوچ سرداروں کا سوری عہد حکومت کی تواریخ سے اخراج ہوگیا۔ اگرچہ بلوچوں سے وابستہ جو چند ہندوستانی قبائل تھے۔ ان میں سے معدودے چند پیچھے رہ گئے۔ جن کی اولاد آج بھی ملتان اور منٹگومری اضلاع میں زراعت کا پیشہ کرتی ہے۔ عام طور سے اس وقت تک بلوچ بہ نسبت پٹھانوں کے حقیقتاً و عادتاً زیادہ صحرا نورد تھے۔ ان کو پیشہ

---

[۲] مخزن نسخہ صفحہ ۷۶۔ نعمت اللہ (یعنی مخزن) کی نقل جس کا کہ حوالہ ڈارن نے دیا ہے۔ اس میں یہ بیان نہیں ملتا (دیکھیے ڈارن جلد ا صفحہ ۱۳۵) لیکن تاریخ داؤدی (نسخہ) اور فرشتہ میں بجنسہ یہی الفاظ ملتے ہیں۔ اس لیے ہم نے جس طرح ..... ہم نے مخزن کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کی تائید ہوتی ہے۔ ان مورخوں نے نظام الدین سے نقل کی ہے اس نے اس کا تذکرہ مجملاً کیا ہے (دیکھیے نظام الدین صفحہ ۲۳۵)

Marfat.com

زراعت اور مستقل سکونت سے بے حد نفرت تھی۔ وہ چند سری حکومت کے دلدادہ تھے۔ اور اسی حیثیت سے کسی جگہ سکونت پذیر ہو سکتے تھے۔ وہ نہایت ہی خود سر اور وحشی لوگ تھے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کا جو سلوک ہوتا تھا اُس سے ایرانی برتری مترشح ہوتی تھی۔ پٹھانوں کو تو وہ چالاک وحشی تصور کرتے تھے۔ اور پٹھان اس اعزاز کا ترکی بہ ترکی جواب یہ کہہ کر دیتے تھے کہ بلوچ ریگستانی چور ہیں۔ راجپوتوں کے ماسوا دیگر ہندوستانیوں کو بلوچ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور ان کو محض رعایا ہی سمجھتے تھے گویا کہ وہ خود میر یا ملک ہوں۔ اونٹ کا کوہان ہی ایک بلوچ کا گھر ہوتا تھا اور اس کا مال و متاع تھا۔ بکریوں کا گلہ بکریوں سے ہی اس کی گوشت و دودھ کی ضروریات ہوتی تھیں۔ بلوچ اور اس کی بکریاں زراعت کی جانی دشمن تھیں۔ دونوں ہی تیز قدم تھے اور ایک کھونٹے سے بندھے رہنا پسند نہ کرتے تھے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ملتان کا صوبہ اُجڑ گیا تھا۔ اور ہیبت خاں نے اسے از سرِ نو آباد کیا لیکن ہمارے پاس کوئی بھی ایسا مواد نہیں جس کی بنا پر ہم اس بات کا اندازہ لگا سکیں کہ بلوچوں کو ہجرت کے بعد اس علاقہ کی آبادی میں کیا ردو بدل ہوا۔ صرف آئین میں مندرج اعداد و شمار سے اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ سوری عہد کے آخر میں اس علاقہ میں تقسیم آبادی کا کیا ڈھانچہ تھا۔ اتنا تو ہم قیاس ہی کر سکتے ہیں کہ ان حصّوں میں افغان نوواردوں کی بستیاں آباد کر دی گئی تھیں اور افغانوں کے دباؤ سے متاثر ہو کر بلوچ راجستھان کے ریگستان اور دریائے سندھ کی جانب چلے گئے۔

صوبہ لاہور میں اب بلوچوں کی آبادی نسبتاً برائے نام ہی ہے ان کا غلبہ ختم ہو چکا ہے۔ آئین سے پتہ چلتا ہے کہ خوشاب اور اس کے گرد و نواح میں جہاں پہلے بلوچوں کی آبادی کا تناسب بہت زیادہ تھا نیازی اور عیسیٰ خیل آکر بس گئے۔ عیسیٰ خیل غالباً دریائے سندھ پار کر کے دھن کوٹ کے مغرب سے ہیبت خاں نیازی کی ترغیب پر آئے

Marfat.com

ہوں گے۔ اس طرح بھیرا میں بھی بلوچوں کی آبادی ختم ہو گئی تھی۔ شاید آوان بھی (جو کہ ازمنہ قدیم کے فسانائی ہیرو بیانی کی اولاد تصور کیے جاتے ہیں) ایبٹ آباد کے قرب وجوار میں رہتے تھے اور اب بھی وہاں آباد ہیں۔ متذکرہ بالا پالیسی کے تحت میں دھنکوٹ کی جانب منتقل کر دیے گئے۔ دھن کوٹ بنگاش علاقہ کے بالمقابل ہے۔ آئین کی رو سے صوبہ ملتان میں سندھ ساگر دواب (پانچ دریاؤں کے پار) کے دو پرگنوں یعنی جیمسر اور ڈوڈائی میں ہی ڈوڈائی اور بلوچ آباد تھے۔ لیکن اہم تر حقیقت یہ ہے کہ جیت پور (فرشتہ نے یہی نام دیا ہے۔ مگر آئین میں اس کا نام ہے ست پور) جس کو کہ لنگاہ خاندان کے عہد میں بلوچوں نے ناہر افغانوں سے چھین لیا تھا۔ اس کو غالباً شیر شاہ نے ناہروں کو پھر سے واپس دلا دیا۔ اس وقت سے یہ علاقہ خالصتاً افغانی علاقہ ہو گیا۔ دور اکبری میں یہاں سے ایک ہزار گھوڑ سوار ۲۰ ہزار پیدل مقامی فوج میں بھرتی کیے جا سکتے تھے۔ یہ بات اس وقت لکھی گئی تھی جب ہیبت خاں اور بلوچوں کی لڑائی کو صرف ۵۰ سال گزرے تھے۔ ہیبت خاں نے یقیناً سرکار دیپالپور میں بلوچوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ بلوچ لوگ اکبر کے عہد میں وہاں آباد تھے۔ وہ آج بھی ملتان و مونٹگمری اضلاع میں کھیتی کرتے ہیں۔ یہ غالباً رند قبیلے کے ہیں جو کہ چکر اند کے ساتھ واپس آ گئے تھے۔

اس بیان سے یہ بیان واضح ہے کہ شیر شاہ نے اپنی سلطنت کی حفاظت کے لیے بہت بڑی تعداد میں ایک علاقے کی آبادی کو دوسرے علاقہ میں بزور تلوار منتقل کیا۔ رعایا کو اپنے مورثوں کے وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ اور شیر شاہ نے ان کی آہ و زاری کی مطلق پرواہ نہ کی۔

ہیبت خاں کو اس کی خدمات کے سلسلہ میں اعظم ہمایوں کا خطاب ملا۔ اس کو ۳۰ ہزار گھوڑوں کا منصب دار بنا دیا گیا۔ شیر شاہ کے زمانے میں اتنا بڑا اعزاز کسی سردار کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ علاوہ بریں لاہور کے صوبے

Marfat.com

کے ساتھ ساتھ ملتان کا صوبہ بھی اس کے تحت میں دے دیا گیا تاکہ مستقبل میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ مغل حکومت میں یہ دونوں صوبے دردسر تھے۔ اور تجربہ شاہد ہے کہ جب کبھی یہ دونوں صوبے مختلف صوبے داروں کے نظام میں دیے گئے صورت حال بد سے بدتر ہو گئی۔ اتنا کچھ کرنے پر بھی شیر شاہ مطمئن نہ تھا۔ کیوں کہ اس نئے نظام سے ہیبت خاں کی طاقت میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ برابر اس موقع کی تلاش میں رہا کہ کسی بہانے سے ہیبت خاں کو لاہور سے واپس بلالے۔ لیکن یہ موقع اس کی زندگی میں اسے کبھی بھی نصیب نہ ہوا۔ فتح خاں جاٹ اور سید بلوچ کو پھانسی دی گئی۔ بخشو لنگاہ کو وہ سب علاقہ واپس دے دیا گیا جو بلوچوں نے اس سے چھین لیا گیا۔ اسے اوچہ کا زمین دار مامور کیا۔

ہیبت خاں نے فتح جنگ خاں کو پنجاب کا نائب گورنر بنا کر ملتان کا صوبہ اس کے تحت میں دے دیا۔ فتح جنگ خاں نے اسے دوبارہ آباد کیا۔ اور رعایا کے ساتھ اتنی ہمدردی اور مروت کا سلوک کیا کہ ملتان لنگاہ حکومت کے زمانے سے بھی زیادہ فارغ البال، سرسبز و شاداب ہو گیا اس نے ملتان کے علاقہ میں ایک نیا شہر آباد کیا جس کا نام "شیر گڑھ" رکھا شیر شاہ کی یہ خاص کمزوری تھی کہ وہ اپنے نام کا بہت دلدادہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے نام پر متعدد قلعے اور شہر تعمیر کروائے۔ ایک وہ زمانہ آیا جب کہ افغانوں کے ہاتھ سے ہند کی حکومت چلی گئی۔ لیکن یہ شہر و قلعہ آج بھی اس شیر شاہ کی یاد تازہ کرتے ہیں اور اس کی عظمت و شہرت کی گواہی

میں نے اپنے پہلے "شیر شاہ" میں شیر گڑھ کا تعین غلط کیا تھا۔ یعنی جنوب مشرق کے بجائے جنوب مغرب میں کیا تھا۔ میری اس غلطی پر پروفیسر ہودی والا نے بجا اعتراض کیا ہے اب میں اس غلطی کو تسلیم کرتا ہوں اور پروفیسر صاحب کا ممنون و مشکور ہوں۔ شیر گڑھ مقام آئین اکبری میں فتح پور اور کہرور کے علاقہ میں دکھایا ہے۔ (آئین اکبری۔ جلد ۲ صفحہ ۳۲۹) لہٰذا پروفیسر موصوف کی رائے بالکل درست ہے۔

Marfat.com

دیتے ہیں۔ فتح جنگ کا بسایا ہوا یہ شہر دریائے بیاس کے داہنے کنارے پرساتت گڑھ سے ۲۰ میل جنوب مشرق میں ہے۔ ایک دوسرا شہر "شیر شاہ" بھی جو ملتان سے ۸ میل جنوب مغرب میں ہے۔ اسی فتح جنگ نے ہی بسایا تھا۔

ملتان کی فتح کے بعد یہ لازمی تھا کہ دوسرا قدم شمالی سندھ کی فتح کے لیے اٹھایا جاتے۔ جہاں بھکر اور سیوان جیسے مشہور قلعے تھے۔ اس فتح کا علمبردار اوچہ کا صاحب اختیار زمیندار بخشو لنگاہ تھا اور ۱۵۴۳ء میں کسی وقت ہیبت خاں نے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچایا اس وقت قلعہ کا گورنر محمود بھکری تھا۔ قلعہ کے گرد و نواح کا علاقہ بھی اس کی جاگیر میں تھا۔ جب اپنے آقا شاہ حسین ارغون کے بلانے پر وہ ٹھٹھ گیا تو اس نے قلعہ میں کافی فوج اس کی حفاظت کے لیے نہ چھوڑی۔ یہ اس لیے ہوا کہ شاہ ارغون اس وقت اپنی دارالسلطنت ٹھٹھ کو ہمایوں کے چنگل سے بچانے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا اور اس نے گورنر کو قلعہ سے بلا لیا تھا۔ مارواڑ سے بھاگ کر ہمایوں اگست ۱۵۴۲ء کے آخری ہفتہ میں امرکوٹ پہنچ گیا تھا۔ وہاں امرکوٹ کے سوڈا سردار کی مدد سے اس نے راجپوت اور جاٹوں کی ایک کثیر تعداد فوج فراہم کرلی۔ اور اسی سال کے ماہ اکتوبر میں وہ ٹھٹھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ شاہ حسین ارغون کی فوج کو شکست دے کر وہ "جن" پہنچ گیا۔ یہ مقام امرکوٹ سے جنوب مغرب میں ۷۵ میل اور ٹھٹھ سے شمال مشرق میں ۵۰ میل ہے۔ اس وقت شاہ حسین اور ارغون مغلوں کو ہرا کر بھکر میں جشن منا رہا تھا۔ اس نے یادگار ناصر مرزا کو دلفریب خواب دکھا کر ہمایوں سے توڑ لیا تھا۔ اس کو اپنی لڑکی سے شادی کرنے اور اپنے ہونے والے خسر کی مدد سے دہلی کے تخت کو دوبارہ حاصل کرنے کا لالچ بھی دیا تھا۔ مگر انجام کار یہ وعدہ وعید خواب سے بہتر ثابت نہ ہوتے اور وہ مجبور ہو کر قندھار کی جانب بھاگ گیا۔

Marfat.com

اب شاہ حسین کا صدر مقام خطرہ کی زد میں آگیا تھا۔ اس احساس نے اسے حواس باختہ کردیا۔ وہ فوراً محمود بھکری کو لے کر تیزی سے ٹھٹھہ کی جانب روانہ ہوا اور قلعہ کو غیر محفوظ چھوڑ دیا۔ جنگ کے باوجود سندھ کا فرماں روا ہمایوں سے "جن" واپس نہ لے سکا اور اسے صلح کرنے کے لیے ہمایوں کی یہ شرط منظور کرنی پڑی کہ شاہ ہمایوں کو "جن" سے قندھار تک کے سفر (جولائی ۱۵۴۳ء) کے لیے کشتیاں، اونٹ اور رسد مہیا کرے گا اور یہ سفر سیبی کے راستہ ہوگا۔ اس طرح شاہ حسین نے ٹھٹھہ کو تو ہمایوں کے پنجہ سے بچا لیا لیکن اسی اثنا میں بھکر اور سندھ کے اوپری

حصوں پر افغانوں کا قبضہ ہوگیا۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ کسی بھی افغان مورخ نے شیر شاہ کے زمانہ میں افغانوں کی بھکر فتح کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ یہ تاریخی واقعہ حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ شیر شاہ کے زمانہ کے سکوں سے اس واقعہ کی تائید ہوتی ہے[1] غالباً سندھ کی یہ فتح ۹۵۰ ہجری سے پیشتر ہوتی تھی۔ جو انگریزی تاریخ کے حساب سے ۱۶ اپریل ۱۵۴۳ء کو شروع ہوتا ہے۔ "تاریخ معصومی" میں جسے سندھ کی تاریخ کہا جاتا ہے صرف یہ ذکر آیا ہے کہ اوچہ کے بخشو لنگاہ نے بھکر فتح کرنے کی ایک ناکام کوشش کی تھی[2] لیکن اس ذرا سے اشارے کی مدد سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہیبت خاں نیازی نے سندھ کے اوپری حصے کی فتح کیسے کی۔ ابوالفضل نے اس امر کی چند بالواسطہ شہادت مزید پیش کی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

---

[1] دیکھئے ایچ۔ این۔ رائٹ۔ کیٹلاگ آف کوائنس ان انڈین میوزیم صفحہ ۸۴-۱۰۹۔ شیر شاہ کے سکے شیر گڑھ عرف شکر بھکر کی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے۔ ۹۵۰ اور ۹۵۱ ہجری۔

[2] تاریخ بیگ ہسٹری آف سندھ صفحہ ۸۸-۸۷۔ عباس، نعمت اللہ بدایونی۔ ابوالفضل نے شیر شاہ کے زمانہ کی تاریخ لکھتے وقت بھکر کی فتح کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے نہ نظام الدین نہ فرشتہ نے شاہ حسین ارغون کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ بھکر اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

Marfat.com

۱۔ یادگار ناصر مرزا کے بھاگ جانے کے بعد مرزا کامران نے شاہ حسین کو لکھا کہ بھکر کے علاقہ میں بڑی تعداد میں مغل مرد عورتیں ہیں۔ آپ انھیں کابل پہنچانے کا انتظام کر دیں۔ چنانچہ شاہ حسین نے اس قافلہ کو ریگستان کے ذریعہ بھیجا جہاں نہ پانی نصیب ہوا نہ چارہ۔ ان میں سے بہت سے تو راستہ میں ہی مر گئے۔ جو بچے وہ "شال" پہنچ گئے۔ اس قافلہ کے دو یا تین ہزار مہاجرین میں سے صرف معدودے چند ہی قندھار پہنچ سکے۔ اگر دریائے سندھ کے مغرب میں بھکر اور سیوان کے گرد و نواح کا تراتی کا علاقہ اس وقت شاہ حسین کے تحت میں ہوتا تو اس کو اس قافلہ کو خشکی کے راستے شال بھیجنے کی کیا ضرورت تھی اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ افغانوں کے ڈر اور شیر شاہ کے خوف کی وجہ سے مغلوں کے لیے بولن اور گومل کے درہ بند ہو چکے تھے اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ہیبت خاں نیازی، ڈیرہ اسماعیل خاں و ڈیرہ غازی خاں کی جانب سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اور بلوچ یہاں سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اسی وجہ سے آج تک ان دونوں قصبوں میں افغانوں کی اکثریت ہے۔

۲۔ معصوم نے لکھا ہے (حالانکہ اس کی صداقت میں شبہ ہے) کہ ہمایوں کے قندھار روانہ ہونے کے ۲ ماہ بعد بخشو لنگاہ نے لنگاہ بلوچ اور ناہڑ[2] قبیلوں کی ایک فوج "جن" کے کنارے ملتان کے بالمقابل کسی قلعہ میں فراہم کی۔ اس کا منشاء تھا بھکر قلعہ پر حملہ کرنا۔ کیونکہ اس کو یہ خبر مل چکی تھی کہ شاہ حسین ٹھٹھہ چلا گیا ہے۔ اور اس کے سب سردار و جاگیردار وہیں پر اس کے ساتھ ہیں۔ اس مقصد کو مدنظر رکھ کر اس نے اپنی فوج کو ۵۰ کشتیوں پر سوار کیا۔ اور اس کو اس منشا سے

۱؎ اکبر نامہ جلد ۱ صفحہ ۱۱۰-۴۱۱

۲؎ میں نے غلطی سے ناہر لوگوں کو اہیر سمجھا تھا۔ اس زمانے میں دریائے سندھ (باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

آگے روانہ کر دیا کہ وہ رات میں چھاپہ مار کر جزیرے پر قبضہ کر لیں۔ لیکن یہ حملہ ناکام رہا۔ حملہ آوروں کو کشتیوں کی جانب بھگا دیا گیا۔ دوسرے روز بخشو لنگا دوپہر کے وقت خود نقارہ بجاتا ہوا آیا۔ اسے یہ اُمید تھی کہ اس کے آدمیوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا ہوگا۔ لیکن جیسے ہی وہ قلعہ کے نزدیک پہنچا قلعہ کی فصیل سے بندوقوں اور توپوں سے گولیوں کی بوچھار شروع ہو گئی اور اسے جان بچا کر "لوہری" بھاگنا پڑا۔ یہاں اس نے تین روز تک قیام کیا اور اس علاقے کے چند دیہاتوں کو لوٹنے کے بعد وہ ملتان واپس پہنچا۔ یہ واقعہ ۱۴ر جمادی الثانی ۹۵۰ ہجری مطابق ۱۴ ستمبر ۱۵۴۳ء کا ہے۔

جونپور (جُن) کے سامنے ندی کا کنارہ سندھ کا مغربی کنارہ ہے بخشو لنگا جیسا معمولی سردار ہیبت خاں نیازی کی مدد کے بغیر اتنی ہمت کیسے کر سکتا تھا کہ وہ اس خطرے کو مول لے لیتا۔ شاہ حسین نے تھٹہ سے اپنے سردار ہمایوں کے قندھار جانے کے ۲ ماہ بعد نہیں بلاتے تھے بلکہ اس واقعہ سے پہلے بلاتے تھے۔ البتہ معصوم کے بیان سے ایک بات کی تائید ضرور ہوتی ہے کہ ہیبت خاں نے شاہ حسین کے علاقہ پر اس وقت حملہ کیا ہوگا جب وہ ہمایوں کی فوج کا مقابلہ کرنے میں "جن" کے مقام پر مصروف تھا۔ افغان فوج اور ان کی لڑائی کا سامان ملتان سے

(گذشتہ سے پیوستہ) کے مغرب میں اہیروں کی تعداد بہت کم تھی لہٰذا ناہر کوئی دوسرا قبیلہ ہے۔ غالباً یہ ناہر وہی لوگ تھے جو سیلورٹی کے قول کے مطابق گرگشتی پٹھانوں کی ایک شاخ تھی۔ اسلام خاں کی رہبری میں ناہروں کو اقتدار حاصل ہوا۔ اسلام خاں بہلول لودی کا کوئی رشتہ دار تھا اور ملتان کے جنوبی حصہ کا حاکم تھا۔ اس علاقہ میں ست پور (جو اب مظفر گڑھ میں ہے) کن (جو ڈیرہ غازی خان میں ہے) اور کشمور (جو سندھ میں ہے شامل ہیں۔ یہ تمام ..... مقام دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر ہیں۔ ناہروں کو ۱۴۸۳ء میں اس علاقہ سے نکال باہر کر دیا گیا تھا۔ (دیکھیے گزیٹیئر گلاسری۔ جلد ۳ صفحہ ۱۳۹-۱۴۰)

Marfat.com

بھکر دریا کے راستہ جلدی اور بآسانی پہنچ سکتا تھا۔ ٹھٹھہ سے دریا کے بہاؤ کے خلاف کوئی فوج اتنی آسانی سے نہیں جا سکتی تھی۔ ممکن ہے بھکر پر جب پہلا حملہ ہوا ہو تو بخشو لنگاہ ہار گیا ہو۔ لیکن آخر میں شیر شاہ کی توپ خانہ کی مار کے سامنے جو اس کی فوج کے ساتھ ہمیشہ رہتا تھا قلعہ زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ معصوم کے بیان سے ہم کو بھکر کی فتح کی تاریخ معلوم ہو سکتی ہے۔ لیکن اس نے بخشو لنگاہ کی ہار کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ اس وقت شیر شاہ کے لیے سندھ کے اوپری حصہ کو فتح کرنا سیاسی اور جنگی نقطہ نظر سے ملتان کی فتح سے کہیں زیادہ اہم تھا۔ اس سے سندھ کے ریگستان پر اس کا پورا قبضہ ہو گیا اور اب اس کے علم کے بغیر وہاں کوئی سازش نہیں ہو سکتی تھی۔ اس حملہ سے ٹھٹھہ حکمران بھی خائف ہو گیا اور میواڑ کی طرف جانے کے لیے اس کو ایک بالواسطہ دروازہ مل گیا۔ اب وہ راجہ مالدیو کو ہمایوں کی مدد کرنے کے لیے سزا دے سکتا تھا۔

Marfat.com

باب 13

شیر شاہ اور بنگال

ستمبر لغایت دسمبر ۱۵۴۱ء

شمالی ہند کا پریشان کن مسئلہ۔ بنگال

ہندوستان کی تاریخ کی ابتدا سے ہی بنگال سیاست، تمدن و لسانیات کو لے کر ایک پیچیدہ مسئلہ رہا ہے۔ اس بیان کا جتنا اطلاق ہندو زمانہ کی تاریخ میں ہوتا ہے اتنا ہی قرون وسطیٰ کی تاریخ پر بھی۔ آریوں کی آمد کے ساتھ ہی یہ کش مکش شروع ہو گئی تھی۔ پہلے بنگال نے آرین تہذیب و تمدن سے ٹکر لی لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہا۔ ہرش سے لے کر اکبر کے زمانہ تک بنگال اپنی سیاسی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے ہمیشہ جدوجہد کرتا رہا، خواہ وہ لڑائی ہندو حکمراں کے خلاف ہو، خواہ مسلم حکمراں کے۔ پھر بھی قوی حملہ آوروں کو اس نے اپنے خون میں جذب کر لے اپنے جوہر کو مضبوط کیا۔ یہ کوئی سحری کرشمہ نہ تھا جس کے لیے بنگال بدنام ہے، بلکہ یہ اس کی تہذیب کی قوت حیات اور اللہ پاک کی نعمتوں کی برکت تھی، جو کہ کسی دوسرے علاقہ کو نصیب نہ ہوئی۔ حالانکہ بنگال کی آب و ہوا مضر، یہاں کی سرزمین مچھروں کا گھواہ، یہاں کا پانی گندا اور یہاں مچھلی کی بہتات تھی پھر بھی یہاں کی لاتعداد دولت کی کشش شمال و جنوب سے جانباز لوگوں کو قسمت آزمائی کے لیے اپنی جانب کھینچتی رہی۔ خاص بات یہ تھی کہ جس نے ایک بار یہاں قدم

Marfat.com

رکھا وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ انکی نظروں میں یہاں کی مٹی میں واقعی جادو کا اثر تھا۔ انہیں اس خیال سے ہی نفرت ہو جاتی تھی کہ واپس جا کر کسی دوسرے علاقہ میں، جہاں کہ قدرت اتنی سخی نہ ہو، سردی گرمی کی پریشانی برداشت کر کے محنت و مشقت کی زندگی گزاریں۔ ۱۶ ویں صدی کا مغل بنگال میں نوکری کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اگر کسی کو وہاں بھیجا جاتا تھا تو دوگنا بھتہ مانگتا تھا۔ ۱۷ ویں صدی کے عظیم الشان مغل فرمانروا بنگال کو "دوزخ پر نعمت" کہہ کر اس کی مضحکہ انگیز مدح سرائی کرتے تھے، لیکن پٹھان دوسری ہی مٹی کے بنے تھے۔ انھوں نے بنگال کو اپنا وطن بنا لیا اور مغلوں سے لوہا لینے کا مستحکم قلعہ۔ پٹھانوں کو یہ سبق شیر کی دوراندیشی نے سکھایا تھا، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ بنگال کو دہلی سلطنت میں ملانے کے لیے جتنی مشکلات کا سامنا شیر کو کرنا پڑا، مملوک و سلاطین سے لے کر تغلق بادشاہوں تک کسی کو بھی نہ کرنا پڑا۔

ابتدا سے ہی بنگال میں مسلم حکومت کا نشوونما دہلی سلطنت سے علیحدہ ہی ہوا۔ بنگال کا سب سے پہلا فاتح محمد بختیار اور اس کے وارث جنہوں نے کہ سلطان کا لقب اختیار کیا، وہ غلام نہ تھے، بلکہ آزاد منش، قسمت آزما سپاہی تھے۔ التتمش سب سے پہلا دہلی کا بادشاہ تھا جس نے ۱۲۲۶ء/۱۲۲۷ء میں بنگال کو فتح کر کے اسے دہلی کا ایک صوبہ بنایا۔ اس نے سلطان غیاث الدین عوض خلجی کو جو اس وقت بنگال کا کامیاب سلطان اور دلیر سپاہی تھا لڑائی میں ہرایا۔ غیاث الدین اپنی اوائل زندگی میں مغربی افغانستان میں اپنے وطن "گرم سیر" میں گدھے چرایا کرتا تھا۔ ۱۲۲۶ء سے لے کر ۶۱ سال تک، جب ۱۲۸۷ء میں بغرا خاں (سلطان غیاث الدین) نے بنگال کی آزادی کا اعلان کیا، بنگال میں متعدد صوبیدار رہے۔ ان میں سے دو صوبیداروں — عزالدین طغرل خاں (۱۲۳۳ء سے ۱۲۴۴ء) اور اختیار الدین یا مغیث الدین طغرل خاں (۱۲۴۶ء لغایت ۱۲۵۷ء) نے گیارہ گیارہ سال تک حکومت کی اور تقریباً پورے

---

[1] ۱۲۸۷ء لغایت ۱۵۳۸ء بنگال خود مختار سلطانوں کے زیر نگیں رہا۔ اس میں صرف ۹ سال کا ایک وقفہ پڑا، یعنی ۱۳۳۰ء لغایت ۱۳۳۹ء۔ یہ وقفہ اس سے ماقبل تھا جبکہ سلطان محمد تغلق کے عہد میں ایاس شاہی خاندان کی بنا پڑی۔

Marfat.com

عرصہ دہلی سے بغاوت کرتے رہے اور قریب قریب خود مختار حاکم بن کر رہے! انہوں نے جونپور اور اودھ تک کا علاقہ فتح کر کے بنگال میں ملا لیا۔ بقیہ ۹۳ سال کے عرصہ میں ۱۳ گورنر ہوئے یعنی اوسطاً ہر ایک گورنر تین سال تک برسر اقتدار رہا اور کسی نہ کسی شکل میں دہلی کے مملوک سلطانوں کے زیر نگیں رہا۔ بنگال سے کبھی کوئی لگان یا محصول دہلی کے خزانہ کو نہیں بھیجا گیا۔ وقتاً فوقتاً دہلی سلاطین کے لیے ریشمی کپڑا ہاتھی ہیرے جواہرات بطور نذر یا سوغات بھیج دیے جاتے تھے۔ مغرب کے علاوہ اس صوبہ کی کوئی سرحد نہیں تھی۔ بنگال کے حکمراں اکثر اپنے مالی ذرائع کے مطابق فوج رکھتے تھے۔ کوئی من چلا اپنے حوصلوں کو پورا کرنے کے لیے اس میں وقتِ ضرورت اضافہ کر لیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ شاہی حکومت کے دار المقام دہلی سے جو صوبہ اس قدر دور ہو (تقریباً ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے) اور اس قدر وسیع و متمول ہو، وہاں کا فوجی صوبیدار کبھی دہلی کی اطاعت پسند نہ کرے گا اور ہمیشہ غلامی کا جوا اتارنے کے لیے کوشاں رہے گا۔ ہند کے قدیم مسلم سلاطین کے پاس بھی اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ اس قدر دور دراز صوبہ کا انتظام کسی فوجی گورنر کو سونپ دیں، جو کہ وہاں کے نظم و نسق کا پورا مالک ہو۔ اس زمانہ میں مرکزی حکومت کے پاس یا تو ایسے ذرائع نہ تھے اور اگر تھے بھی تو کم تعداد میں، کہ وہ دہلی سے دور دراز علاقوں کے انتظام کی دیکھ بھال کر سکیں۔ عام طور پر بنگال کی رعایا گوڈ کے حکمراں کو اپنا سلطان تصور کرتی تھی اس کے حکم کی تعمیل کرتی تھی۔ انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا کہ گوڈ کا سلطان اپنے دہلی کے آقا کے حکم کی تعمیل کرتا ہے یا نہیں۔ یا وہ قتل کر دیا گیا ہے یا اپنے عہدہ سے برطرف کر دیا گیا ہے۔ جب کبھی کوئی ذی اختیار، ہر دلعزیز صوبیدار بنگال سے ہٹایا جاتا تھا تو صرف ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ایک خاندان کی حکومت ختم ہو کر دوسرے خاندان کی حکومت قائم ہوئی ہے۔ ایسی حالت میں پھر ایک بار بنگال کے لوگوں کو ایک نئے خارجی حملہ کے جبر و تشدد کو برداشت کرنا پڑتا تھا، جو کہ دہلی کے گورنر کی حکم عدولی کی سزا ہوتی تھی۔

شمالی ہندوستان کے اکثر صوبوں میں حکام اور رعایا کے درمیان قومی اور مذہبی اختلاف رہا کرتا تھا جس کا کہ فائدہ دہلی کے سلطان اٹھاتے تھے۔ لیکن بنگال اس قسم کی کمزوری سے مستثنیٰ تھا۔ بنگال کی ہندو رعایا کو عموماً گوڈ کے مسلم حکمرانوں سے

Marfat.com

کوئی شنیع و شکایت نہ تھی۔ گوڑ کی حکومت میں کسی تغیر و تبدل سے وہاں کی ہندو رعایا پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ بنگال کے سلاطین اپنی ہندو رعایا کے مذہبی و تمدنی معاملات میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ شاذ و نادر ہی کوئی ایسا کٹر صوبیدار ہوتا تھا جو اس قسم کی حرکت کرتا تھا۔ بنگال میں اسلام کی اشاعت میں حکومت نے کوئی خاص حصہ نہیں لیا بلکہ اس کا سہرا وہاں کے مذہبی پیرؤوں کے سر رہا۔ ان کو اہلِ ہنود اللہ کا پاک بندہ سمجھ کر ان سے ڈرتے تھے اور ان کا ادب بھی کرتے تھے۔ اس علاقہ میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور حکومت بڑے بڑے زمینداروں کے ہاتھ میں تھی، جو کہ قریب قریب خود مختار ہوتے تھے۔ مذہب کی بنا پر ہندوؤں کو اعلیٰ عہدوں سے محروم نہیں رکھا جاتا تھا، خواہ وہ عہدہ سول ہو خواہ فوجی اہلِ ہنود کو فارسی زبان پر مہارت تھی اور اکثر اس میں وہ مسلمانوں سے بھی سبقت لے جاتے تھے۔ وہاں کی سوسائٹی میں مذہب کی بنا پر نفاق کا بیج بونا آسان نہیں تھا۔ وہاں کے ہندو و مسلم اپنے سیاسی مستقبل کے متعلق دہلی کا منہ نہیں دیکھتے تھے۔

بنگال میں جو مسلم سیاسی نظام تھا وہ شیر شاہ کے نقطۂ نظر سے میل نہیں کھاتا تھا، کیونکہ وہ ایک مستحکم مرکزی حکومت کا حامی تھا۔ پال اور سین حکمرانوں کے عہد میں جو بنگال میں انتظامیہ حلقے تھے مسلمان فرمانرواؤں نے انہیں کو برقرار رکھا صرف نام بدل دیے۔ مثلاً بارند جو کہ پاندرا وردھن بھکتی یعنی شمالی بنگال کے مساوی تھا۔ رادھ جو کہ وردھن بھکتی یعنی مغربی بنگال کے مترادف تھا۔ بنگ یعنی مشرقی بنگال یا سورن گرام بھکتی اور آرا ئیش بنگال، جس میں کہ میگنا کے اس پار کی آراضی اور دریائے برہم پتر اور پدما کے درمیان کا مثلث علاقہ شامل تھا، ہریکلا کے مساوی تھا۔ گوڑ کے خود مختار سلاطین نے بارند کے علاوہ باقی سب علاقوں کے لیے گورنر مقرر کیے تھے۔ بارند کو وہ اپنا وطن سمجھتے تھے۔ دوسرے علاقوں پر یا تو شاہی خاندان کا کوئی شہزادہ مقرر کیا جاتا تھا یا کوئی دوسرا فوجی افسر۔ اس کو سرِ شکر کہتے تھے۔ بنگ یعنی مشرقی بنگال کا علاقہ ولی عہد کی جاگیر سمجھا جاتا تھا۔ یہ ولی عہد کبھی کبھی بلا تامل خود بادشاہ کا لقب اختیار کر لیتا تھا اور اپنے نام کے سکے جاری کرتا تھا۔ مشرقی، مغربی اور شمالی بنگال کے باشندوں میں مقامی حب الوطنی کا جذبہ و باہمی بغض و حسد رہا کرتا تھا جو گورنر

Marfat.com

بغاوت کرنا چاہتے تھے، وہ عوام کی اس کمزوری سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔

بنگال میں جنگی امکانات نہایت ہی پُر معنی تھے۔ ملک مالا مال تھا۔ باشندے ہتھیاروں کے استعمال سے واقف تھے اور چونکہ زمینداروں میں متواتر چھوٹے موٹے جھگڑے ہوتے رہتے تھے یا اکثر فوج کشی ہو جاتی تھی اس لیے ان میں کچھ تنظیم و تربیت کا بھی مادہ پیدا ہو گیا تھا۔ بنگال کے سلطانوں کی فوجی طاقت کا انحصار تھا یا تو ان کے بے شمار پائکوں یعنی نیزہ انداز پیادوں پر یا ڈھالیوں یعنی شمشیر بازوں پر

فوج کی بھرتی زیادہ تر غیر زراعت پیشہ لوگوں میں سے ہوتی تھی۔ یہ لوگ قوی جثہ شورش پسند و جنگجو ہوتے تھے۔ فوج کے افسر یا تو زمیندار ہوتے تھے یا اعلیٰ خاندان ہندو۔ ریاست کی طرف سے ان کو زمین ملتی تھی جس پر لگان معاف رہتا تھا ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ گھوڑ سواروں کو ملتی تھی۔ اگر کبھی لڑائی کے لیے دریا کے راستہ کے استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی تو چشم زدن میں مختلف قسم کی کشتیوں کا عظیم بیڑہ فراہم ہو جاتا تھا۔ یہ کشتیاں دریائی علاقہ کے زمیندار رکھتے تھے اور ریاست کی طرف سے انہیں اس کے لیے جاگیر ملتی تھی۔

ابتدا میں شیر نے قدیم رواج کے مطابق بنگال میں ایک فوجی گورنر مقرر کیا لیکن اسکی یہ تدبیر کامیاب نہ ہو سکی۔ اگر خضر خاں میں ایک اصلی ترک کا دم خم ہوتا تو شیر کے لیے صورت حال بہت نازک ہو جاتی اور اگر اس نے افغان گورنر کو مقرر کر کے آزمائش کی ہوتی تو خطرہ اور بھی سنگین ہو جاتا۔ شیر شاہ جاگیروں اور زمینداروں کو مسدود کر کے بنگال کے ماضی کو طاق نسیاں میں نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ ایسا کرنے سے تمام بنگال میں شورش پھیل جاتی اور یہ اس کی پالیسی کے خلاف تھا، لیکن اس کو ان کی سرکشی کی قوت کو توڑنا ہی تھا۔ موجودہ حالات میں کسی اساسی اصلاح کی گنجائش نہ تھی۔ صرف دور اندیشی سے بنگال کے قدیم اور مقدس نظام حکومت کی کچھ ترتیب ہو سکتی تھی۔ نظام حکومت کے متعلق شیر شاہ کے روبرو یہ مسائل تھے جن کو کہ اسے حل کرنا تھا۔ اس کو تین صدی پرانی ایک

Marfat.com

خود مختار ریاست کو دہلی کے مرکزی نظامِ حکومت کے سیاسی شکنجے کی گرفت میں لانا تھا۔

بنگال کے نظامِ حکومت کا نیا ڈھانچہ

جنوری ۱۵۴۰ء میں جب شیر مغلوں سے لڑنے کے لیے قنوج کی جانب روانہ ہوا تو اس نے خضر خاں کو بنگال کا گورنر مقرر کر دیا۔ شیر ایک سال سے زائد عرصہ تک بنگال سے غیر حاضر رہا۔ اسی اثنا میں بہار کی افغان فوج بھی شمالی ہندوستان میں لڑنے کے لیے بلالی گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خضر خاں بنگال کا خود مختار بادشاہ بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے بنگال کے آخری سلطان محمود شاہ کی لڑکی سے عقد کر لیا۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ بنگال کی رعایا اور قدیم مسلمان اس کو بنگال کے تخت کا جائز وارث سمجھنے لگے، حالانکہ خضر خاں نے ظاہرہ طور پر شاہی خطاب نہیں اختیار کیا تھا لیکن شیر شاہ کو یہ خبر ملی کہ وہ سلاطین بنگالہ کی طرح ٹوکی پر بیٹھنے لگا ہے۔

---

[1] عباس، قلمی نسخہ صفحہ ۲۰۵۔ ایلیٹ جلد ۴۔ صفحہ ۳۹۰۔ ٹوکی لفظ کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرونِ وسطیٰ کی بنگالی زبان کا لفظ "ٹونگی گھر" ہے جس کے معنی ہیں مینار نما عمارت۔ عباس لکھتا ہے کہ ٹوکی کے معنی ہیں بام خانہ یعنی مکان کی چھت۔ خضر خاں ترک بنگال کے سلاطین کی طرح محل کی چھت پر بیٹھنے لگا تھا (تاریخ خاں جہاں لودی۔ ایلیٹ جلد ۵ صفحہ ۱۱۵) لیکن ہمارے پاس جو قلمی نسخہ ہے اس میں مخزن نے ٹوکی یا بام خانہ کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ اس میں صرف یہ لکھا ہے کہ خضر خاں رعایا سے اس قسم کا سلوک کرتا ہے گویا وہ خود مختار بادشاہ ہو۔ (لکھنؤ یونیورسٹی میں تاریخ خاں جہاں لودی کے قلمی نسخہ میں ہو بہو یہی عبارت ہے صفحہ ۲۴۵) لیکن یہ ٹوکی ہے کیا؟ ظاہرہ یہ بنگالی لفظ معلوم ہوتا ہے لیکن بنگالی ادب میں ٹوکی بامعنی لفظ نہیں ہے بلکہ مہمل ہے اس کے معنی بام خانہ نہیں ہیں جس طرح عام بول چال میں کہیں کہیں ——— . . . . کلمہ مہمل ساتھ ساتھ آتے ہیں جیسے چائے کے لیے "چا۔ وا" آم کے لئے "آم تام" اسی طرح یہ لفظ بھی چوکی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے "چوکی ٹوکی"

Marfat.com

جب شیر شاہ کے جاسوسوں نے اس کو یہ خبر دی، وہ اس وقت ملتان واوچہ کے قرب و جوار میں موجود تھا۔ جون ۱۵۴۱ء کے آخر میں وہ فوراً بنگال کے لیے چل پڑا اس خبر سے خضر خاں دنگ رہ گیا۔ جب ۱۵۴۱ء کی برسات کے بعد شیر اپنی فوج کے ساتھ دفعتہً گڑھی کے نزدیک آپہونچا تو خضر خاں کے تمام منصوبوں پر پانی پھر گیا وہ طوعاً و کرہاً اس کے استقبال کے لیے حاضر ہوا۔ شیر نے اسے گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا اور اپنے تمام سرداروں اور سپہ سالاروں کو، جو وہاں موقع پر موجود تھے، ان الفاظ میں فہمائش کی "جو کوئی بھی تم میں سے میرے حکم کی خلاف ورزی کرے گا اس کا یہی حشر ہوگا۔"[1]

پٹھان مورخوں نے بنگال میں ۱۶ ویں صدی کی پٹھان حکومت کے متعلق بہت کم روشنی ڈالی ہے۔ جہاں تک صوبہ بنگال کے بندوبست کا تعلق ہے، عباس نے محض اتنا لکھا ہے کہ اس نے بنگال کو مختلف علاقوں میں تقسیم کر دیا اور اس نے قاضی فضیلت کو، جسے اکثر لوگ "قاضی فضیحت" کہتے تھے، بنگال کا امین مقرر کر دیا۔[2]

عام طور پر بادشاہ دربار کے وقت کسی اونچی جگہ پر بیٹھا کرتے ہیں۔ یہ بادشاہ کا امتیازی حق ہوتا ہے اس لیے ٹوکی کے معنی ہیں وہ تخت جو قد آدم سے اونچا ہو جیسا کہ دہلی اور آگرہ کے قلعہ کے دیوانِ عام میں "جھروکہ مسند" تھا۔ یہ بھی اغلب ہے کہ سلاطین گور بوقت دربار محل کی چھت پر شامیانہ کے سایہ میں بیٹھتے ہوں، کیونکہ وہاں بادشاہ اکثر قتل کر دیے جاتے تھے۔

بہارستان غیبی (انگریزی ترجمہ۔ جلد ا۔ صفحہ ۲۱۳) میں لکھا ہے کہ جہانگیر کا ایک وائسرائے اسلام خاں بھی بادشاہوں کی طرح اونچے تخت پر بیٹھنے لگا تھا۔ اس لیے جہانگیر نے حکم جاری کیا تھا کہ کوئی بھی صوبیدار ایسے تخت پر نہیں بیٹھ سکتا جو قد آدم نصف سے زیادہ اونچا ہو۔

[1] مخزن نسخہ صفحہ ۲۲ عباس نسخہ صفحات ۲۰۵۔ ۲۰۶

[2] اصل الفاظ یہ ہیں "ملک بنگالہ را ملوک الطوائف ساخت وقاضی فضیلت کہ با قاضی فضیحت اشتہار یافتہ بود امین بنگالہ ساخت" اس کا ترجمہ ایلیٹ نے جلد ۴ میں اس طرح کیا ہے "اس نے بنگال کی سلطنت کو مختلف صوبوں میں تقسیم کر دیا۔" اس طریقہ سے اصل عبارت کا مفہوم پورا نہیں ہوتا البتہ یہ کہنا صحیح ہے کہ شیر نے بنگال کو مختلف سرکاروں میں تقسیم کیا۔ یہ

Marfat.com

عباس کے بیان کا پہلا جز گمراہکن ہے اور شیر کے نظام سلطنت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اگر ہم اس سے یہ سمجھ لیں کہ شیر نے بنگال کو چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تقسیم کر دیا کو۔ یہ تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب ہم ملوک الطوائف کو ملک الطیف پڑھیں۔

عباس نے بنگال میں شیر شاہ کے عہد حکومت کی کچھ بھی تفصیل نہیں دی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کوئی بھی سردار بنگال سے شمالی ہند کو اپنے قبیلوں سے وہاں کی کہانی بتانے کے لیے واپس نہیں لوٹا۔ یہ اور بھی عجیب وغریب بات ہے کہ ۱۵۳۸ء میں سید محمود شاہ کی شکست اور تخت سے دست بردار ہونے کے ۲۰ سال بعد تک کسی پرتگالی مورخ[1] نے بنگال کی تاریخ کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ پرتگالی اس عرصہ میں اراکان کے ساحل اور مشرقی سمندروں میں متواتر اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے پھر بھی بنگال کے واقعات کے متعلق انکی خاموشی حیرت انگیز ہے۔ پرتگالی سوانح نگاروں کی یہ خاموشی ایک معنی میں شیر شاہ نے جس مستحکم پٹھان بندوبست کی اس علاقہ میں بناڈالی تھی اسکی داد وتحسین ہے۔ اگرچہ زبان

انتظامیہ اکائی سلطان سکندر کے زمانہ میں تو رائج تھی مگر سید خاندان کے زمانہ میں نہ تھی۔ عباس کا شاید یہ مطلب ہے کہ شیر نے بنگال کو مختلف قبائل میں تقسیم کر دیا جیسا کہ شمالی ہند میں افغانوں نے اپنی فتح کے دور اوائل میں کیا تھا۔

قاضی فضیلت "کا نام قاضی نضیحت" کیوں پڑا؟ اس کے متعلق ایک پُر مذاق کہانی ہے جو حقیقت بھی ہو سکتی ہے۔ یہ نیک طینت قاضی بنگال میں امین (امن قائم رکھنے) کے عہدہ پر فائز تھا اور شیر شاہ کے اعلیٰ افسران میں اس کا نام مشہور ہو گیا جھگڑالو قاضی مشرقی بنگال میں یہ کلمہ زبان زدعام ہو گیا۔ صرف ہندوؤں نے فضیحت کو "فزت" میں بدل دیا۔ مجھے اپنی کتاب "شیر شاہ" لکھتے وقت اس کا علم نہ تھا۔

(شیر شاہ صفحہ ۲۴۲)

[1] اس ۲۰ سال میں پرتگالیوں کو کوئی قابلِ ذکر واقعہ بنگال کی تاریخ میں لکھنے کو نہیں ملا۔ اس ملک کے مورخوں نے بھی پرتگالیوں کی آمد کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی ہسٹری آف بنگال جلد ۲ صفحہ ۳۵۸۔

Marfat.com

سے اس کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ اب پرتگالی قزاق چٹگاؤں اور ستگاؤں (مغربی بنگال) کے بندرگاہوں تک لوٹ مار کرنے یا معصوم عورتوں، بچوں اور آدمیوں کو قید کرنے آسانی سے نہ آسکتے تھے، نہ وہ خشکی کے راستہ سے ایماندارانہ طریقہ سے تجارت کر سکتے تھے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شیر شاہ نے بنگال کو محض چھوٹے چھوٹے علاقوں میں منقسم کر کے ان کو قبائل کے حوالہ ہی نہ کر دیا اور انتظام حکومت چلانے کے لیے صرف ایک قاضی کو ہی مامور نہ کیا اور ایسا قاضی جس کی مدد کو کوئی فوج بھی نہ ہو۔ بلکہ اس نے کچھ اور بھی کیا۔ بنگال کی سیاسی، تمدنی اور اقتصادی تاریخ میں سید خاندان کے زوال اور ۵۰ سال بعد افغان حکومت کے اختتام کے درمیان جو یہ کمی دکھلائی پڑتی ہے اسکی تکمیل اسی طرح سے ہو سکتی ہے کہ اکبر اور جہانگیر کے عہد کے صوبہ بنگال کے حالات کا مطالعہ کر کے ان کا رشتہ شیر شاہ کے عہد سے جوڑا جائے اس سلسلہ میں بالخصوص ٹوڈرمل کی جمع[1] پر غور کرنا ہوگا، وہ بھی اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ بعد میں پٹھان حکومت کی توسیع قرب و جوار کے اضلاع تک ہو گئی تھی اور کرّانیوں نے بھی نئی بستیاں آباد کر لی تھیں۔ درباری مورخ جنگ و

---

[1] بلوچ مین کا یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہے کہ ٹوڈرمل نے بندوبست کے وقت جو موقع پر دیکھا لکھ دیا، مثلاً بنگال کے کتنے حصے ہیں۔ ہر حصہ کا کیا لگان تھا۔ بنگال جہانگیر کے عہد میں فتح کیا گیا تھا، اور شہزادہ شجاع نے از سرِ نو اس کا بندوبست کیا۔ (ہسٹری اینڈ جیوگرفی آف بنگال اے۔ آر۔ اے ایس۔ بی۔ ۱۸۷۳) شروع میں جب مغلوں نے بنگال فتح کیا تو ٹوڈرمل بھی مغل فوج میں تھا اس نے مالگذاری کے کاغذات مرتب کیے۔ وہ پرانے پٹھان زمانہ کے کاغذات کی بنا پر کیے ہونگے، ورنہ ٹوڈرمل اور ابوالفضل سلہٹ اور چٹگاؤں کا ذکر اپنے کاغذات میں کیسے کرتے کیونکہ اس زمانہ میں ان دونوں محالوں کا کوئی وجود نہ تھا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ زمانہ حال کے مورخین نے بھی عباس کا اعتماد نہ کر کے یہ لکھ دیا ہے کہ شیر نے بنگال کی سیاسی بیماری دور کرنے کے لیے اس کو مختلف جاگیروں میں تقسیم کر دیا۔

ہمارے پاس یہ لکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ شیر کے زمانہ کی سیاسی اکائی اکبر کے زمانہ کی ۱۹ سرکاروں سے ملتی ہے۔ (ڈھاکہ یونیورسٹی۔ ہسٹری آف بنگال جلد ۲، ص ۱۷۷)

Marfat.com

سیاست و مال کے دائرہ سے باہر کسی واقعہ کو شمار میں نہیں لاتے ہمیں اس کمی کو اضلاع کی تواریخوں کے مطالعہ سے پورا کرنا ہوگا، جو کہ دور حال میں بنگالی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں مارٹن اور ہیملٹن نے بنگال کے متعلق قرونِ وسطیٰ کے بنگالی

ادب میں جو لکھا ہے اس پر بھی نظر ڈالنی ہوگی۔ بدقسمتی سے اس زمانہ کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں اور جو بھی ہیں، وہ مشتبہ ہیں لہٰذا شیر کے بنگال کے نظامِ حکومت اور مالی اصلاحات کے متعلق صرف ایک خاکہ ہی دیا جا سکتا ہے۔

شیر کو اپنی زندگی میں شاہی دارالسلطنت آگرہ اور دہلی میں کبھی ۴ مہینے سے زیادہ ٹھہرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ لہٰذا یہ قیاس آرائی بہت حد تک صحیح ہوگی کہ اسی وقفہ میں شیر نے نظام حکومت کا ڈھانچہ تیار کیا ہوگا اور مالی اصلاحات پر عمل درآمد کیا ہوگا۔ علاوہ ازیں سڑک بنانے کا کام بھی اسی دور میں ہوا۔ شاہراہ عام کی حفاظت کے لیے جگہ جگہ پولیس مقرر کی گئی۔ اشیائے درآمد و برآمد پر ٹیکس لگایا گیا۔ اس دور میں شیر کے کارناموں کا مندرجہ ذیل نقشہ تیار کیا گیا ہے، جو کافی حد تک معتبر ہے اور اس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا ہے۔

۱۔ شیر نے بنگال کے اندرونی علاقہ کا تیزی سے دورہ کیا۔ یہ بات ان "شیر پور" اور "شیر گڑھ" نام کے مقامات سے ظاہر ہے، جو شیر نے آباد کیے، کیونکہ شیر شاہ کو اپنی یادگار قائم رکھنے کے لیے اپنے نام پر مقامات کے نام رکھنے کا ازحد شوق تھا۔

۲۔ بنگال کی زمین کی باضابطہ پیمائش شروع ہوئی۔

۳۔ شیر شاہ نے اصلاحات نافذ کرتے وقت دوراندیشی اور مصلحت سے کام لیا اس نے قدیم شرائط کے بموجب ہی زمینداروں کی جاگیریں ان کے پاس رہنے دیں اور ان میں کوئی مداخلت نہیں کی۔

۴۔ شیر شاہ نے بنگال میں متعدد نئے زمیندار بنائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال پٹھانوں کا دوسرا وطن بن گیا۔ شمالی ہند سے لا کر اس نے راجپوت زمیندار بھی آباد کیے، جس سے وہاں کے قدیم ہندو زمیندار سر نہ اٹھا سکیں۔

(۵) ایک مضبوط جہازی بیڑہ کی بنیاد ڈالی۔

Marfat.com

(۶) سڑکیں تعمیر کرائیں۔
(۷) فوجی حکومت کی جگہ سول حکومت قائم کی۔

شیر شاہ کے زمانہ میں بنگال کے حدود اربعہ کیا تھے؟ اس کو تعین کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی ذرائع نہیں ہیں۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس کے عہد سے ابوالفضل اور ٹوڈر مل کے زمانہ تک اس صوبہ کی مغربی سرحد میں کوئی خاص ردّو بدل نہیں ہوا۔ اس مغربی سرحد کا خط تھا دریائے کوسی کا کنارہ اس مقام تک جہاں اس کا سنگم دریائے گنگا سے ہوتا ہے۔ پھر یہ خط گنگا سے پار ہو کر گڈھی کے مغربی دہانے سے مڑکر جنوب کی سمت اراج محل کی پہاڑیوں اور جھارکھنڈ کے جنگلوں کے بیچ سے ہو کر بیر بھوم اور شکھر بھوم تک چلا جاتا ہے۔ اکبر کے عہد میں شکھر بھوم کا نام تھا پرگنہ شیر گڑھ۔ شمالی سرحد کے خط کی ابتدا تھی مشرق و جنوب مشرق میں کوسی ندی کا کنارہ (موجودہ جلپائی گوری اور سلی گوری اضلاع اس سے باہر تھے) جو کہ کوچ بہار تک پھیلا ہوا تھا (کوچ بہار اس وقت ایک بااختیار اور وسعت پذیر ریاست تھی) یہاں سے یہ حد سلہٹ اور ٹپرا کی پہاڑیوں کو چھوڑ کر برہم پترا کی گذرگاہ کے جنوب میں چلی جاتی تھی۔ اس کے بعد بنگال کا علاقہ تنگ ہوتا ہوا لوسائی سلسلہ اور بنگال کی کھاڑی کے مابین محدود ہو گیا۔ اس کا جنوب مشرق ترین نقطہ چٹاگاؤں میں واقع ماتاموہری دریا رہا ہوگا۔ جنوب میں شیر شاہ کی ریاست کی حد مدناپور ضلع میں فی الواقع ہجلی اور چندر کونا رہی ہوگی۔ ضلع بانکورا کا بیشتر حصہ اس کے باہر تھا۔

بنگال کے گذشتہ دستور کے بموجب اور سلطان سکندر کے سرکاری ملکیت کے نظریہ کے مطابق شیر شاہ نے پورے صوبہ کو ملک محروسہ قرار دیا جس میں سے وہ کسی حصہ کو بھی بطور جاگیر یا زمینداری بہ تحت ضابطہ معہود عطا کر سکتا تھا یا بحال کر سکتا ہے۔ ان حدود کے اندر کی آراضی کو شیر نے نہایت ہوشیاری سے سرکاروں محالوں اور پرگنوں میں گزشتہ عہد کے دستور کی بنا پر تقسیم کیا۔ یہ تقسیم من مانے طریقہ سے نہیں کی گئی اور نہ اس مفروضہ سے کی گئی کہ سرکاروں کا رقبہ مساوی ہو جائے یا مالگذاری کے مساوی بنادیے جائیں۔ ان سرکاروں کا رقبہ مختلف تھا

Marfat.com

علیٰ ہٰذا القیاس ان کی مالگذاری میں بھی فرق تھا۔ ان سرکاروں کے وہی نام تھے جو ہم کو آئین میں ملتے ہیں۔ اگر ٹوڈر مل نے پٹھان عہد کے باقیماندہ بندوبست کے آثار کو ہی اپنا لیا تھا، تو یہ خیال بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ شیر شاہ نے بھی گذشتہ دور کی مالگذاری کی اکائیوں یعنی محال اور پرگنہ کو اپنایا ہوگا۔ شیر شاہ نے جو نئی سرکاریں قائم کیں، ان کا نام ہر ایک سرکار کے مشہور ترین حصے کے نام پر رکھا۔

شیر سے پہلے بنگال میں کسی بھی نظمی اکائی کا نام "سرکار" نہیں تھا۔ لودی سلطنت کے زمانہ میں سلطان سکندر نے اپنی سلطنت کو سرکاروں میں تقسیم کیا تھا۔ اس سے بہتر کوئی دستور شیر کی سمجھ میں نہ آیا، چنانچہ اس نے اسی طریقہ کو بنگال میں مروّج کیا۔ سلطان سکندر کے زمانہ میں "سرکار" کا حاکم فوجدار کہلاتا تھا، یا یہ علاقہ کسی فوجی سردار کو بطور جاگیر دے دیا جاتا تھا یا شاہی خاندان کے کسی شہزادہ کو بطور معاش دے دیا جاتا تھا۔ لودی حکومت میں قاضی کے علاوہ انتظامیہ شعبہ کے دو بڑے افسر اور ہوتے تھے، شقدار اور عامل۔ آئین سے اس بات کی وضاحت نہیں ہوتی کہ سرکار کے انتظام کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ بنگال کا انتظام کرتے وقت شیر کا اصل مقصد کوئی نئی اصلاح جاری کرنا نہ تھا، بلکہ اس نے پرانے قاعدہ کو ہی از سر نو ترتیب دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر نے سرکار کے لیے تین افسر رکھے، (۱) شقدار اعلیٰ (۲) منصف اعلیٰ (۳) قاضی اعلیٰ۔ اسلامی قانون کے مطابق حکومت کے عدالتی صیغہ کو انتظامیہ صیغہ پر فوقیت حاصل ہوتی ہے، لہٰذا قاضی کو شقدار اعلیٰ کی حکم برداری سے مبرّا رکھا گیا۔ شقدار اعلیٰ کا کام تھا قاضی کے فیصلوں کا نفاذ۔ بہت حد تک شقدار اعلیٰ کا عہدہ اور فرائض برٹش حکومت کے ضلع مجسٹریٹ کے مشابہ تھے۔ اس کا فرض تھا اپنے علاقہ میں امن و امان قائم رکھے۔ بڑے شہروں اور قصبوں میں یہ کام کوتوال کے ذمہ تھا۔ شقدار اعلیٰ ہی نقص امن کے فوجداری مقدمات فیصل کرتا تھا۔ اس کے تحت میں فوج کا ایک دستہ بھی رہتا تھا، جو کہ حلقہ میں پولیس کا کام بھی کرتا تھا اور سرکش محالوں سے مالگذاری وصول کرنے میں امداد دیتا تھا۔ شقدار اعلیٰ کے بعد دوسرا درجہ منصف اعلیٰ کا تھا، جو مالی مقدمات فیصل کرتا تھا۔ مثلاً لگان کا تعین اور وصول مالگذاری

Marfat.com

وہ مالی افسران کی بے عنوانیوں اور زیادتیوں سے بھی رعایا کو بچاتا تھا۔ اکبر کے زمانہ میں شقدار اعلیٰ کا عہدہ ختم ہوگیا اور اس کے مجسٹریٹی اختیارات "فوجدار" کو منتقل کر دیے گئے اور مالی اختیارات دیوان ضلع کو۔ مغلوں کے عہد حکومت میں منصف اعلیٰ کا عہدہ بھی ختم ہوگیا اور اس کے اختیارات بھی دیوان کو دیدیے گئے اور اس طرح آگے چل کر عدالتی صیغہ کے دو حصے فوجداری اور دیوانی ہوگئے۔

"سرکار" نظمی شعبہ کی سب سے بڑی اکائی تھی اور سب سے چھوٹی اکائی تھی "پرگنہ"۔ ان دونوں حصوں کے درمیان اور کوئی چھوٹی اکائی نہ تھی۔ شیر شاہ کے زمانہ میں پرگنہ کے انتظام کے لیے وہی افسر تھے جو اکبر کے زمانہ میں تھے۔ ہر پرگنہ کے لیے ایک عامل (آئین میں اسے عمل گذار لکھا ہے) ایک شقدار، ایک خزانچی (فوطہ دار) اور دو منشی تھے۔ ایک منشی محکمہ مال کے کاغذات خام (ہندی میں کچی بہی اور بنگالی میں خسرہ) تیار کرتا تھا اور دوسرا منشی اسکی نقل فارسی زبان میں کرتا تھا[1]۔ بنگال میں افسران سرکار اور پرگنہ کے وہی فرائض رہے ہوں گے جو کہ شیر کی سلطنت کے دوسرے حصوں میں تھے۔ لہٰذا اس پر تبصرہ بوضاحت کسی دوسری جگہ کیا جائے گا۔ بہرحال سرکاری طرزِ بیان سے شیر شاہ کے زمانہ کے صیغہ مال و بنگال کے پرگنہ و سرکار کے نظمی شعبہ کی تنظیم و ترتیب کی پوری تصویر

---

[1] اس سے قبل کہ ٹوڈر مل مقامی زبان کے بجائے دفتر دیوانی میں فارسی کو مروج کرے، جمع کے اصلی کاغذات کی فارسی نقل کی شیر شاہ کو اشد ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ کیونکہ بنگالی زبان تو اس کے اور اس کے اہلکاران محکمہ مال کے لیے یونانی زبان تھی یعنی کہ اسکو سمجھنا محال تھا۔ مسلم فتح کے بعد سے ہی بنگال میں فارسی سرکاری زبان ہوگئی تھی، چنانچہ اہل ہنود نے اس کو اتنی ہی تیزی سے سیکھا جیسے کہ بعد میں انگریزی زبان کو سیکھا اور سلطانوں کے عہد میں ساری سرکاری نوکریاں ہتھیالیں۔ کبھی کبھی تو ہندو فارسی زبان کی لیاقت میں مسلمانوں سے بھی بازی لے جاتے تھے مثلاً روپا، جو کہ علاؤ الدین حسین شاہ کا دبیر خاص تھا۔ دبیر خاص مغلوں کے عہد کا "منشی الملک" تھا۔

Marfat.com

ہمارے سامنے نہیں آتی۔ ہم اس کمی کو اس مالگذاری اور تحصیلداری کی پرانی روایات سے کر سکتے ہیں جو کہ ان گھرانوں میں آج تک چلی آرہی ہیں جو کہ مسلم عہد حکومت میں ان عہدوں پر فائز تھے۔ بنگال کی مسلم حکومت میں جو موروثی اعزازی عہدیدار تھے ان میں "چودھری"[1] کا خطاب مسلم حکومت سے زیادہ قدیم ہے۔ حالانکہ یہ خطاب ہندو مسلم دونوں خاندانوں میں ملتا ہے۔ چودھری کو عموماً وصولی کام فیصدی بطور دستوری ملتا تھا۔ چودھری کے فرائض کی صاف تفصیل کسی جگہ نہیں ملتی ہے اکبر کے عہد میں چودھری ہم پیشہ لوگوں کی انجمن کا سرغنہ ہوتا تھا اور اگر قصبہ کے کسی کوچہ میں رہنے والے، اس کی انجمن کے کسی فرد سے کوئی جرم سرزد ہوجاتا تھا تو چودھری ذمہ دار ٹھہرایا جاتا تھا۔ دیہاتی علاقہ میں چودھری معمولی درجہ کے مجسٹریٹ کا کام کرتا تھا اور ہمارے زمانہ میں چودھری کو ہر پیٹھ میں سبزی، مچھلی اور چاول کی دکانوں سے ایک تولہ نہ بازاری ملتی ہے۔ بلاشبہ چودھری کوئی اعلیٰ حاکم ہوتا ہوگا، کیونکہ آج کل بھی بنگال کے بڑے زمیندار گھرانے صرف "رائے" کے خطاب سے مطمئن نہیں ہوتے جب تک کہ ان کے نام کے سامنے "چودھری" نہ جوڑا جائے مثلاً میمن سنگھ کے آچاریہ رائے چودھری۔ بنگال کی تاریخ میں ۱۶ دیں صدی تک "قانون گو" کے عہدہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ شاید یہ عہدہ اس وقت قائم ہوا ہوگا جب شیر کے زمانہ میں پہلی مرتبہ زمین کی پیمائش شروع کی گئی اور بنگال میں جمع بندی مرتب ہوئی۔ مغلوں کے عہد حکومت میں مال کے متعلق کوئی کاغذات صوبیدار کی منظوری و دستخط کے لیے پیش نہیں کیے جاسکتے تھے جب تک ان پر چودھری اور قانون گو کے دستخط نہ ہوں[2] شیر شاہ کے زمانہ سے پہلے بنگال میں پٹواری بھی نہیں

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پال اور سین لوگوں کی حکومت کے زمانہ سے ہی یہ عہدہ چلا آرہا تھا۔ یہ محکمہ پولیس کا ایک اعلیٰ عہدہ مانا جاتا تھا اور اسے "چور دھارنکا" کہتے تھے۔ (ڈھاکہ یونیورسٹی ہسٹری آف بنگال صفحہ ۲۰۹، ۳۰۹) میرے ایک برہمن چودھری دوست نے بتایا کہ اصل لفظ ہے "چتر دھاری" یعنی ۴ چیزیں رکھنے والا۔ لیکن یہ جواب تسلی بخش نہیں ہے، جب تک وہ چار چیزیں معلوم نہ ہوں یا چودھری کو نظمی اکائی پہ کیوں مقرر کیا گیا تھا۔

[2] ہمیں بہارستان سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسور کی جمع بندی کا کاغذ اسلام خاں کی منظوری کے لیے

Marfat.com

ہوتے تھے، ہر دیہہ (موضع) کے مکھیا کو "منڈل" کہتے تھے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلم۔ لیکن دیہاتی علاقہ میں پٹواری بڑا حاکم ہوتا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج بھی مشرقی بنگال میں پٹواریوں کے مسلم خاندان موجود ہیں۔ پٹواری کو عام زبان میں "پٹھاری" کہتے ہیں۔ دوسرا حاکم، حالانکہ اس کا محکمہ مال سے کوئی تعلق نہیں تھا، محال نویس تھا جو بنگالی زبان میں "محال نویس" بن گیا۔ یہ محکمہ فوج کے منشی ہوتے تھے، جن کا کام تھا، سپاہیوں کا حلیہ لکھنا۔ اس عہدہ کا نفاذ اس لیے ہوا کہ شیر شاہ نے علاؤالدین کی طرح، فوج میں، محلی و سکوط، (داغ و محلی) کو جاری کیا تھا۔

مغلوں کے نظامِ حکومت کی ایک جھلک، جو کہ ایک طریقہ سے شیر کے نظام کی نقل تھی، کچھ روز پیشتر تک جے پور اور حیدر آباد کی ریاستوں میں دیکھنے کو ملتی تھی (اب یہ معدوم ہو گئی ہے) اسی طرح شیر شاہ کے محکمہ مال کی اصلاحات کی ایک جھلک ہمیں بنگال کے زمینداری سررشتہ میں ملتی ہے۔ یہ تصور کرنا مناسب ہی معلوم ہوتا ہے کہ نقص مرکزیت کے تحت پرگنہ کو اور چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کر دیا ہو گا جیسا کہ موضع، جو کہ ایک نہیں بلکہ چند دیہات کا ایک مجموعہ ہوتا تھا۔ تشخیص و وصول مالگزاری کے لیے پرگنہ کو دہی اور دہی کو کئی موضعوں میں تقسیم کیا گیا تھا، شہزادہ شجاع کے زمانہ میں دہی کو بدل کر چکلہ کہنے لگے لیکن

چودھری اور قانون گو کے دستخط سے پیش ہوتا تھا۔ (بہارستان، جلد ۱، صفحہ ۱۵۷)

لہ فارسی لفظ "دہ" کو بنگالی زبان میں "دہی" کہنے لگے، لیکن جہاں تک زمینداری کے کاغذات کا تعلق ہے، لگان کے رجسٹر (جمع بندی) میں دہی کے معنی گاؤں نہیں ہیں۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے مورث اپنے زوال کے زمانہ میں ان الفاظ کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ مثلاً دہی عبداللہ پور (ہمارے گاؤں سے ۳۰ میل شمال میں ہے)، دہی نظام پور (نواکھالی) دیہی کے تحت میں ایک سے زیادہ گاؤں تھے۔ اکبر کے زمانہ میں ایک بنگالی شاعر دیہی دار محمد شریف کی دست درازی کی شکایت کرتا ہے، جس کے حلقہ میں اس کا اجڑا ہوا گاؤں تھا۔ یونین بورڈ کے شروع ہونے سے پہلے بھی حالت ایسی ہی تھی۔ یونین بورڈ، چکلہ کی دوسری نئی تصویر تھی، جو کہ دوسرے ہی مقصد سے جاری کیے گئے تھے۔ مثلاً میرا اپنا گاؤں "قانون گو پارا"، "موضع اموچیہ" اور چکلہ "ہادلا" کے حلقہ میں تھا۔ ہادلا ہمارے گاؤں

Marfat.com

مشرقی بنگال میں زمیندار لوگ وہی پرانا نام لیتے رہے مثلاً ایشور دہی، مہیشور دہی۔ بعدازیں یہی نام پرگنوں کے ہو گئے۔

پرگنوں کے افسران مثلاً شقدار، عامل، خزانچی، منشی کا تقرر شقدار اعلیٰ (شقدار شقداران) کرتا تھا۔ وہ پرگنہ کے مالی انتظام اور پولیس کے لیے براہ راست مرکزی حکومت کو جواب دہ تھا۔ ہر پرگنہ میں شقدار اور عامل بالترتیب مجسٹریٹ اور کالکٹر کے فرائض انجام دیتے تھے۔ مغلوں کی حکومت میں قانون گو اور چودھری کا تقرر صوبہ دار کی مہر اور سند سے ہوتا تھا۔ غالباً اس سے پیشتر بھی اس قسم کا رواج رہا ہوگا۔ انتظامیہ معاملات میں منڈل کی جگہ موضع کے "پٹواری" نے لی۔ اور وہی حکومت کی طرف سے ذمہ دار افسر سمجھا جاتا تھا۔

اگر ہم یہ فرض کریں کہ صوبہ بنگال کا پانچواں حصہ جس میں ٹوڈرمل کی جمع کی ۲۴ سرکاریں شامل تھیں، مابعد کا اضافہ ہے تو یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ شیرشاہ نے ۱۹ سرکاروں کو ازسرِنو منظم کیا۔ اس کے عہد میں ۱۹ شقدار شقداران تھے مگر ان کے زیرِ حکم فوجیں نہ تھیں اور یہ سب امین بنگلہ کے ماتحت تھے۔ امین سپہ سالار نہ تھا بلکہ قاضی تھا۔ بنگال کے نظام کو اپنی تنگ گرفت میں لینے کے مقصد سے شیر شاہ نے جگہ بہ جگہ تھانے مقرر کر دیے۔ تھانوں میں فوجیں مقرر کر دیں اور ان فوجوں کا سال بہ سال تبادلہ کر دیا جاتا تھا۔ شیرشاہ نے گوڑ کو بنگال کا صدر مقام بنائے رکھا (فقط تبدیلی اتنی ہی سی کی کہ) یہاں پر قاضی فضیلت بطور ایک سویلین

۱؎ باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے نزدیک ایک دوسرے گاؤں کا نام ہے۔ پرگنہ میں ضلع کے صدر مقام کے علاوہ لگان وصول کرنے کی جگہ کو "دیہی کچہری" کہتے تھے جن کا حلقہ مقرر ہوتا تھا۔ لگان وصولی کے موقع پر صدر کچہری کا نائب افسر مختلف دیہی کچہریوں میں جا کر کاشتکاروں کی سہولت کے لیے موقع پر ہی قسط وصول کرتا تھا۔ یہ کچہریاں موجودہ زمانہ کے خاص محال کچہریوں کی طرح تھیں۔ کبھی کبھی سب ڈپٹی دورہ کرتے تھے۔ بنگال کا سب ڈپٹی شمالی ہندوستان کے نائب تحصیلدار کی طرح تھا۔ سب ڈپٹی ان زمینوں کا لگان دابواب وصول کرتے ہیں جو بندوبست استمراری کی زد سے باہر ہوتی ہیں۔

Marfat.com

(غیر فوجی) نائب کے رہنے لگا۔ اس کی حیثیت ایک ثالث کی سی تھی اور اس کا کام تھا یہ دیکھنا کہ صوبائی حکومت خوش اسلوبی سے چل رہی ہے یا نہیں۔ اس کی ہستی ایک فوجی حاکم مطلق کے مانند نہ تھی اور نہ اس کو یہ حق حاصل تھا کہ مساوی الاختیار شقداروں کے باہمی تنازعات کا فیصلہ کرے۔ اس طرح سے شیر شاہ نے بنگال کی دائمی شورش پسندی کی جڑ پر ہی وار کر دیا۔ یہ اغلب نہ تھا کہ یہ ۱۹ شقدار یکجا اور متحد ہو کر دہلی کے خلاف بغاوت کرنے پر تل جائیں گے بلکہ یہ ممکن تھا کہ ہر شقدار بادشاہ کا منظور نظر بننے کی تمنا سے ایک دوسرے سے بڑھ کر وفاداری اور نمک حلالی کا ثبوت دے گا اور اس طرح سیاسی توازن بنا رہے گا۔ اس طرح سے شیر شاہ نے شہنشاہیت کے اصول قدیم یعنی "پھوٹ ڈالو اور راج کرو" پر عمل کیا۔ مگر رعایا کو اس سے کوئی ضرر نہ پہونچا۔ اس نے اس کا نفاذ صرف افغانوں کو جاگیر تقسیم کرتے وقت ہی کیا۔ بنگال اب افغانوں کا وطن ثانی ہو گیا۔ شیر شاہ خواہ کہیں بھی ہوتا اس کے خفیہ نویس اور صوبہ کے واقعہ نویس ڈاک چوکیوں کے ذریعہ دربار کو برابر رپورٹ بھیجتے رہتے تھے اور اس طرح بادشاہ کی انگلیاں صوبہ بنگال کے واقعات کی نبض پر برابر ٹٹولتی رہتی تھیں۔ اس نے قاضی فضیلت کا انتخاب کر کے اپنی دانشمندی اور عاقبت اندیشی کا ثبوت دیا، کیونکہ قاضی نے نہایت ہی مستعدی اور وفاداری سے کام کیا۔ اگر سرکاروں میں کہیں بے عنوانی ہوتی تو وہ اس کا فوراً ہی تدارک کرتا تھا۔ اس وجہ سے بنگال کے عہدہ دار ان اس کو قاضی فضیحت کہنے لگے۔

بنگال کی سڑکیں اور تجارت

ملک بنگال میں سڑکیں تو خراب تھیں، مگر دریاؤں کے راستہ آمد و رفت میں زیادہ آسانی تھی۔ چونکہ شمالی ہندوستان سے اس صوبہ کو کوئی اچھی سڑک

---

[1] جہانگیر کے عہد میں وہی کیفیت ہو گئی جو کہ پٹھانوں سے ماقبل تھی۔ اس کے عہد کے ایک شاعر مسمی عثمان نے جو کہ چترا ولی کا مصنف ہے یہ لکھتا ہے کہ "تب رانی کا نامہ بر گڑھی کے دروازہ پر پہونچتا ہے۔ یہ ایک ہی ایسی سڑک تھی جس سے سفر کیا جا سکتا تھا۔ اس

Marfat.com

نہ جاتی تھی' اس لیے دہلی سلطنت سے یہ علاقہ تقریباً بالکل علیحدہ ہی رہا سوانح نگار ضیاء الدین برنی نے صحیح ہی لکھا ہے' صاحب الرائے اور صاحب علم لوگ لکھنوتی کو (لکھشمن وتی جسے آخری سین بادشاہ نے آباد کیا تھا) بلغاک پور یعنی فساد کا شہر کہتے ہیں' کیونکہ جب سے سلطان محمد سام نے دہلی فتح کیا' جو بھی گورنر دہلی سے لکھنوتی بھیجا گیا' اس نے دہلی سے دور دراز فاصلہ اور عمدہ سڑکوں کے نہ ہونے کا فائدہ اٹھایا اور دہلی کے خلاف بغاوت کی۔ اگر کسی گورنر نے خود بغاوت نہیں کی تو اس کے خلاف کسی دوسرے نے کی۔ اس کو قتل کیا اور اس کے ملک پر قبضہ کرلیا۔ (ایلیٹ جلد ۳ ص ۱۱۲)

مسلمانی عہد میں صوبہ کے اندر فوجی شارع عام نہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف علاقائی تنفر کو تقویت ملتی تھی' بلکہ بغاوت کو بھی اشتعال ملتا رہتا تھا۔ جو سڑکیں فوج کشی کے وقت بنائی جاتی تھیں صلح کے زمانہ میں ان کی نگہداشت نہ ہوتی تھی اور بارش کے موسم میں تو وہ بالکل بند ہو جاتی تھیں۔ مسافروں کے لیے جو سڑکیں تھیں بھی' ان کو رہزنوں اور چوروں کے خوف سے کوئی بھی استعمال نہ کرتا تھا۔ شیر شاہ کے لیے بنگال میں ایسی صورت حال ناقابل برداشت تھی۔ اس نے اٹک سے لے کر دہلی تک ایک شارع عام کی تعمیر شروع کروادی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ آگے چل کر یہ سڑک سونار گاؤں سے ملادی جائے، جو اندرونی تجارت کے لیے بنگال کا سب سے بڑا بندرگاہ تھا۔ سونار گاؤں حالانکہ اب اپنی عظمت دیرینہ کھو چکا تھا۔ یہ اب سلطنت کا صدر مقام بھی نہیں تھا' تاہم فنون حرب کے نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت اب تک قائم تھی۔ یہ اب ایک معمولی دیہات تھا' جو اب شان ماضی کی ایک دھندلی سی نشانی رہ گیا تھا۔ یہ لکھیا اور میگھنا دریاؤں کے درمیان ڈھاکہ سے براہ راست ۱۶ میل ہے۔ کبھی یہ سمندری جہاز رانی کا بندرگاہ تھا۔ ابن بطوطہ

راستہ سے وہی سفر کرسکتا تھا' جو عالی حوصلہ ہو، جو بلا آگا پیچھے سوچے سفر کرتا ہے' یا تو راستہ میں قتل کردیا جاتا ہے یا لوٹ لیا جاتا ہے۔ پانچ مہینہ متواتر زمین تہ آب رہتی ہے۔ ایسی حالت میں بجز کشتی' سفر کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ خشکی کے راستے رہزنوں سے بھرے رہتے ہیں۔ اگر تم ایک کشتی لو تو دہلی پہونچ سکتے ہو۔"

Marfat.com

اسی بندرگاہ سے جاوا ہوتا ہوا چین کو روانہ ہوا تھا۔ یہ ڈھاکہ سے ۲۵ میل جنوب مشرق میں ہے، یہ شیرشاہ کی عظیم الشان شاہراہ کا آخری مقام تھا۔ یہ سڑک شمال کی جانب نرائن گنج جاتی ہے جس کی حد میں چاہ سرائے ہے جس کو اب چاٹرا کہتے ہیں اور یہ اب ریل کا پھاٹک ہے۔ چاہ سرائے سے یہ سڑک ڈھاکہ کے شمال سے گزرتی ہے، جو اس وقت خاموش دیہاتی علاقہ تھا۔ ڈھاکہ سے یہ سڑک بھوال زمینداری سے گزرتی ہوئی شیرپور ایٹہ پہونچتی ہے، جو موجودہ میمن سنگھ ضلع میں ہے۔ شیرپور ایٹہ سے، جو میمن سنگھ سے شمال مغرب میں ۴۰ میل ہے، یہ سڑک مغرب کی جانب گھوم کر شہزادپور[1] پہونچتی ہے، پھر کروتویا دریا پار کر کے اس کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ بہاؤ کے خلاف شمال کی جانب شیرپور مورچہ تک جاتی ہے، جو بوگرا سے ۲۰ میل جنوب مشرق میں ہے۔ شیرپور مورچہ سے مغرب کی جانب گھوم کر راج شاہی ضلع سے گزرتی ہوئی گوڈ پہونچتی ہے، جہاں سے گنگا کے کنارے جنوب کی جانب راج محل کے سامنے سے قدیم راستہ کے ساتھ ساتھ گڑھی سے گزر کر بہار چلی جاتی ہے۔[2] بنگال کی سرزمین سیدھی سڑک بنانے کے لیے موزوں نہیں تھی۔ اتنے عرصہ بعد اب شیرشاہ کی تعمیر شدہ سڑکوں کا پتہ معلوم کرنے کے لیے سرائے اور کنووں کی تلاش عبث و بیکار ہے۔ بنگال میں تالاب اور دریا یونہی کافی تعداد میں ہیں۔ عام طور سے یہ سڑکیں ان کے نزدیک سے ہی گزرتی ہونگی، چنانچہ یہ ضروری نہ تھا کہ شیرشاہ نے ان سڑکوں کے نزدیک

---

[1] شہزادپور پبنا ضلع میں کروتویا ندی کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔

[2] میرے ایک دوست، جنہوں نے کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے لیے ہسٹری آف بنگال کا پٹھان حکومت کا باب لکھا ہے، رقمطراز ہیں "سرایوں کی تعمیر ایک فرضی کہانی ہے، جیسا کہ ایک ضعیفہ کی کہانی، جو ٹوکری میں سونا بھر کر بنا کسی ڈر کے چلی جاتی تھی" یہ میرے فاضل دوست فارسی کے فنِ کلام سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے ادبی مبالغہ کو سچ ماننے کی بھول کی ہے، جو فارسی زبان کا کوئی طالب علم نہیں کر سکتا۔ میرے یہ مرحوم دوست وشو بھارتی پروفیسر این۔ بی۔ رائے تھے۔

Marfat.com

کہیں کنوئیں تعمیر کیے ہوں۔

ہمارے پاس اس بات کے بھی ثبوت ہیں کہ شیر شاہ نے قدیم راستوں کو ازسر نو درست کیا۔ خصوصاً وہ سڑک، جو شیر پور مورچہ سے شمال میں گھوڑا گھاٹ تک جاتی ہے، اور پھر شمال مغرب میں گھوم کر نیج پور پورنیا پہونچ جاتی تھی، جو مہانندؔ دریا کے مشرق میں واقع ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ دوسری سڑک بنگال کو دربھنگہ اور گورکھپور ہو کر اودھ سے ملاتی تھی۔ دریائے میگھنا کے دوسرے کنارے پر ایک تیسری سڑک تھی، جو چاند پور کے نزدیک سے ہوتی ہوئی میر سرائے سے (بنگالی میں اسے میریشوری کہتے ہیں) چٹگانگ ضلع کے اندر چکریا تک جاتی تھی، جو ماتا مہری دریا پر واقع ہے۔ شیر شاہ کے نصف صدی بعد دریائے میگھنا نے دفعتہً اپنا رخ بدل دیا اور نواکھالی ضلع میں بھلوا تک کا تمام علاقہ اس کی زد میں آگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راستہ کی تمام آبادی اور سڑکیں کالعدم ہو گئیں اور اب ان راستوں اور سڑکوں کا صحیح پتہ لگانا ممکن نہیں ہے [1]

اس طرح شیر نے بنگال کی سیاسی اور طبعی علیحدگی کو مٹا کر اسے دہلی سلطنت

---

[1] مجھے یہ اطلاع میرے مرحوم دوست ڈھاکہ کے حکیم حبیب الرحمان نے دی تھی۔ انہوں نے شیر شاہ کے زمانہ میں تعمیر شدہ سڑکوں کے متعلق مواد فراہم کیا تھا۔ ان میں وہ سڑکیں بھی شامل تھیں، جو بنگال کو ہندوستان کے اوپری حصوں سے جوڑتی تھیں۔ جب تک مجھے انکے مکمل کاغذات دستیاب ہوں، میرا یہ بیان آیندہ تحقیق کرنے والے طالب علموں کے لیے بنیاد کا کام کرے گا۔ میرے مرحوم دوست حکیم صاحب کے پاس مشرقی اور شمالی بنگال میں رہنے والے مسلمانوں میں رائج روایتوں کا ایک ذخیرہ تھا، جو آج تک قلمبند نہیں کیا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ آئین میں جو متعدد شیر پوروں کا ذکر آیا ہے، وہ دیہاتوں کے نام نہیں تھے، بلکہ پولیس چوکیوں کے تھے، جو سڑکوں کے جنکشن پر بنائی گئی تھیں۔ ہم حکیم صاحب کی رائے کی نہ تائید کر سکتے ہیں نہ تردید، کیونکہ ہمارے پاس تاریخی ذرائع کی کمی ہے، لیکن بظاہر ان کی بات قابل تسلیم معلوم ہوتی ہے۔ شیر پوروں کے جائے مقام کے لیے دیکھئے ضمیمہ ۱۔

Marfat.com

کا ایک جز بنا دیا۔ اس نے یہاں کے نظام حکومت کے لیے وہی سرکار اور پرگنوں کا طریقہ اختیار کیا، جو باقی ہندوستان میں مروّج تھا اور سڑکوں کا ایک جال بچھا کر اس صوبہ کو شمالی ہندوستان کی آخری حد تک ملا دیا۔ اس علیحدگی کے وجود کو دور کرنے میں سیاسی یکجہتی سے زیادہ تجارت نے مدد کی۔ شیر بنگال کی تجارت کو فروغ دینا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے دو طریقے اختیار کیے۔ پہلا یہ کہ سڑکوں کے ذریعہ مال کی آمدورفت محفوظ ہو اور دوسرا یہ کہ مال پر ٹیکس وصول کرنے کا طریقہ آسان کر دیا جائے۔

اس زمانہ میں، جب کہ ہر چار سو بدامنی اور سرکشی کا دور دورہ تھا، کوئی بھی حکومت رعایا کی جان و مال کے تحفظ کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتی، خواہ اس کا محکمہ پولیس کتنا ہی باضابطہ اور مکمل کیوں نہ ہو جب تک کہ شریر و مخدوش جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ نہ کیا جائے۔ بنگال میں دریائے برہمپتر اور پدما کے کنارے آباد لوگ پہلے سے ہی سمندری رہزنی اور ڈکیتی کے لیے بدنام تھے۔ ان دریاؤں کی کثیر وسعت اور ان کے معاون دریاؤں کے پھیلاؤ نے ان ڈکیتیوں میں مزید اضافہ کر دیا اس کے تدارک کے لیے سب سے پہلی ضرورت تھی کہ فوجی کشتیوں کا ایک بیڑہ دریاؤں کی سطح پر متواتر گشت و نگرانی کرتا رہے۔ دوسرے شورش پسند علاقوں میں پولیس تھانے قائم کیے جائیں۔ شیر نے یہ سب تو کیا ہی، اس کے علاوہ اس سے بھی زیادہ موثر قدم اٹھایا۔ اس نے ہر دیہات میں مشترکہ ذمہ داری کا قانون نافذ کر دیا اور یہ ہدایت کر دی کہ ہر گاؤں اپنی حدود میں اپنی نگرانی کا کام خود ہی کرے گا بعد میں اس تجربہ سے حکومت برطانیہ بھی مستفید ہوئی۔ اس نے چٹگانگ کے تخریب پسند گروہ کو پسپا کرنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ جو لوگ اپنی جان کی سلامتی چاہتے تھے خواہ وہ ایماندار ہوں یا شریر، انہیں ہر وقت مستعد رہنا پڑتا تھا خصوصاً گاؤں کے مکھیا کا یہ سب سے اہم فرض تھا۔ گاؤں کے مکھیا اور زمینداروں پر سڑکوں کی حفاظت کی پوری ذمہ داری ڈال دی گئی تھی۔ انہیں ہر وقت اپنی جان کا خطرہ رہتا تھا، کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ شیر شاہ کی حکومت میں نرمی اور تامّل کی گنجائش نہیں ہے۔

Marfat.com

عباس اور دیگر مورخین شیر شاہ کے جنگی بیڑے کا کوئی ذکر نہیں کرتے ٹھیک اسی طرح جیسے کہ وہ بنگال کی مالی اصلاحات کے متعلق خاموش ہیں[1]۔ اس میں کلام نہیں کہ آیندہ ۲۰ سال تک بنگال میں پرتگالیوں کی تجارت اور بحری ڈاکہ زنی ٹھپ رہی۔ پرتگالیوں کے زیادہ مسلح و منظم بیڑہ سے چٹاگانگ، سنگام، سونار گاؤں، جیسے بندرگاہوں کی حفاظت عرصہ دراز تک محض کاغذی ناؤں سے نہیں ہوسکتی تھی۔ مسٹر اسٹیپل ٹن نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شیر شاہ جنگی ناؤں کو تربیت دینے میں خاص دلچسپی رکھتا تھا، جیسا کہ اس کے زمانہ کی توپوں اور توڑے دار بندوقوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ بنگال نے مغل شہنشاہیت سے آزاد رہنے کی آخری جدّوجہد تک بھی اپنی بحری سبقت کو ہاتھ سے نہ نکلنے دیا۔ شیر نے خود سلطان محمود کے بیڑے کو دھوکہ دیا تھا۔ اس کا سامنا کرنے کی کبھی بھی ہمت نہ کی۔ مسلمانوں کی حکومت کے آغاز سے ہی بنگال کے تمام حکمراں یعنی گوڈ کے سلطان غیاث الدین سے لے کر نصرت شاہ تک جنگی ناؤں کا ایک مضبوط بیڑہ رکھتے تھے، جو ان کے تحفظ اور جارحانہ کارروائیوں کے لیے فوج کا ایک ضروری حصّہ تھا۔

سلطان محمود کا بحری بیڑہ جو بعد میں شیر کے ہاتھ آگیا تھا اس میں ادنیٰ ذات کے ہندوؤں کی بہتات تھی۔ اس کے افسر توارامحالوں کے ہندو زمیندار و جاگیردار تھے۔ انہیں نہ تو شیر نے اور نہ ٹوڈرمل نے ہی ایجاد کیا تھا[2]۔ شیر کا شروع سے ہی

---

[1] بنگال کے سرکاری نوارہ کا اسی طرح انتظام ہوتا ہوگا جیسے کہ دوسرے اداروں کا ہوتا تھا۔ ابر رقمطراز ہے "زمانہ قدیم سے بنگال میں یہ دستور رہا ہے کہ خزانہ عامرہ کے بار کے عوض پرگنے دیدیے جاتے تھے۔ ان اخراجات کو برداشت کرنے کے لیے زمین پر کوئی محصول نہیں لگایا جاتا ہے" (ذنزک صفحہ ۴۸۳)

[2] مشرقی بنگال میں نوارہ جاگیروں کی جو اسناد میری نظر سے گزری ہیں، ان میں سے زیادہ تر شہزادہ شجاع کے زمانہ کی تھیں۔ پدما اور برہم پتر دریاؤں کے علاقہ میں رہنے والے کچھ زمینداروں کو عام لوگ ۲۲ کوسہ یا ۲۶ کوسہ کہتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان

Marfat.com

یہ اصول تھا کہ وہ کسی جماعت یا فرقہ کے حقوق میں کوئی دست درازی نہیں کرتا تھا بلکہ ان کو ویسا ہی قائم رکھ کر ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس لیے یہ بات قرین قیاس ہے کہ اس نے اِن نوارا ‍وں کی جاگیروں کو ضبط نہیں کیا ہوگا، کیونکہ ایسا کرنے سے ایک تو نوار محال کے طبقوں میں اضطراب پیدا ہوتا، دوسرے شیر کو جنگی بیڑے کے لیے ملّاح و سپاہی ملنے میں دِقّت آسکتی تھی، لیکن شیر بنگالی ملاحوں کی وفاداری پر پورا اعتماد نہیں کرسکتا تھا خصوصاً جب کبھی ان کو اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف لڑانا پڑے۔ اکبر کے زمانہ میں مغل سپہ سالاروں کو اس بات کا ثبوت بھی مل گیا تھا، جس سے ان کو کافی نقصان بھی اٹھانا پڑا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے شیر نے اس بیڑہ میں سرہنگ اور سرداروں کے عہدہ پر افغانوں کی بھرتی کی۔ ایک دو نسلوں کے بعد افغانوں نے اس پیشہ میں اتنی مہارت حاصل کرلی کہ مغلوں کے لیے ان کو شکست دینا دشوار ہوگیا۔[1]

جاگیروں کا رواج بنگال کے خود مختار حکمرانوں کے زمانہ سے ہی چلا آرہا تھا۔ شیر نے بھی انکو بحال رکھا اور مغل حکمرانوں نے ان کو مستقل کردیا۔

[1] سرہنگ فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں 'ملاح'، سردار ایک خطاب ہے جو بحر دار کے ساتھ ملحق ہے۔ مثلاً بنگال کے جنوب مشرق کے سردار بحردار۔ یہ سردار لوگ جنگی بیڑہ کے کپتان ہوتے تھے۔ افغانوں میں سرہنگ اور سردار کے عہدوں کا ذکر پہلی مرتبہ جہاں تک مجھے معلوم ہے بہارستان میں ہوا ہے۔ یہ سرہنگ شیر کے زمانہ کی افغان قوم سے ہیں۔ یہ بات اس سے ثابت ہوتی ہے کہ بہارستان میں شیر شاہ اور سلیم شاہ کا ذکر آیا ہے۔ خواجہ عثمان لوہانی کے بیڑہ کے برباد ہوجانے کے بعد یہ سرہنگ افغان فوج میں بھرتی ہوگئے تھے، اور اس کی وفات کے بعد انہوں نے افغان سردار خواجہ ولی کے خلاف بغاوت کردی۔ بعد میں وہ مستقل طور سے سلہٹ، نواکھالی اور چٹاگانگ اضلاع میں آباد ہوئے۔ اب یہ اضلاع ہندوستان میں شاید بہترین جہاز راں پیدا کرتے ہیں ان میں افغانوں جیسی جیوٹ اور قوت برداشت ہے۔ ان لوگوں کی ایک ادنیٰ سی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کسی جہاز پر بھرتی ہوجائیں اور بے فکری سے دنیا میں چکر مارتے رہیں۔ یہ لوگ اپنے کو پٹھان نسل کا کہتے ہیں۔ میں نے یہ بات اپنے مرحوم دوست ڈھاکہ کے شفاء الملک حبیب الرحمان خاں سے سنی تھی۔

Marfat.com

اب ہم شیر کے محاصل بحری پر غور کریں گے۔ مالگذاری کے بعد گوڑ کے سرکاری خزانہ کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ چٹگاؤں اور ستگاؤں کے بندرگاہوں پر اشیاء درآمد برآمد پر چنگی تھی، مگر مالگذاری کی طرح اس آمدنی کا بیشتر حصہ بھی چنگی وصول کرنے والے راشی اور بے ایمان عملہ کی جیب میں پہونچ جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر گھاٹ پر مال پر چنگی دینا پڑتی تھی اور ہر ایک ذی اختیار جاگیردار اپنے علاقہ میں راہداری وصول کرتا تھا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ تجارت زوال پذیر ہو گئی اور تجار مصیبت زدہ ہو گئے چنانچہ عوام کو اپنی روزانہ ضروریات کی اشیا مثلاً سمندر کے ساحل پر بنا ہوا نمک کی قیمت زیادہ دینی پڑتی تھی۔ لیکن تجارت و محاصل بحری کی نگرانی مالگذاری کی نگرانی سے دس گنی دقت طلب تھی۔ شیر شاہ نے اس پیچیدہ مسئلہ کو یوں سلجھایا کہ اس نے اندرونی تجارت پر جملہ ابواب معاف کر دیے، خواہ وہ سرکار وصول کرتی ہو خواہ زمیندار و جاگیردار۔ عباس کہتا ہے کہ بنگال جانے والے مال پر صرف سرحد پار کرتے وقت گڑھی پر چنگی دینا پڑتی تھی مگر بحری تجارت پر بنگال کے بندرگاہوں پہ کس طرح سے چنگی وصول ہوتی تھی اس کا وہ کچھ بھی ذکر نہیں کرتا ہے۔ چنانچہ یہ فرض کر لینا نامناسب نہ ہوگا کہ بندرگاہوں پر بحری محاصل کا نفاذ اسی طرح ہوتا رہا جیسا کہ مغلوں کے عہد میں رواج جاری رہا، بہرحال شیر کے عہد میں بنگال میں تجارت کو بہت فروغ ملا، کیونکہ اس نے ضابطوں کا سختی سے نفاذ کیا۔ تجاروں کے مال کی حفاظت کی اور سڑکیں تعمیر کرائیں جن سے کہ نقل و حرکت میں آسانی بہم ہوئی۔ گذشتہ دستور کے مطابق صرف مقام کے تبدیل پر ہی چنگی ادا کرنی پڑتی تھی۔

شیر نے بنگال کو افغانوں کا دوسرا وطن بنایا

عباس نے لکھا ہے کہ شیر نے بنگال کو مختلف افغان قبیلوں میں منقسم کر دیا مگر مصنف کا یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ اس نے ہمیشہ کے لیے بنگال کو افغانوں کا وطن بنا دیا۔

قرون وسطیٰ میں بنگال میں پٹھانوں کی نوآبادیاں کیسے قائم ہوئیں اس کا

Marfat.com

تذکرہ ابھی تک کسی مورخ نے تفصیلاً نہیں کیا ہے۔ فارسی زبان میں خامہ فرسائی کرنے والے مصنّفوں نے اس بات کی طرف براہِ راست کم ہی اشارہ کیا ہے کہ شیر شاہ نے بنگال میں کس طرح افغان قبائل کو آباد کیا۔ اگر زمانہ حال میں سرجادوناتھ سرکار نے بہارستان غیبی کا پتہ نہ لگایا ہوتا تو اس موضوع پر صرف ابوالفضل ہی ہماری سند رہ جاتا اور وہ سند نہایت ہی مہمل ہے۔ بنگال کی فضا اور تمدّن نے پٹھانوں کی ایسی کایا پلٹ کر دی کہ اب ان کو پہچاننا دشوار ہے۔ بہارستان میں افغان قبیلوں اور ان کے گڑھوں کے نام دیے ہوئے ہیں، مگر یہ تفصیل اس وقت سے پچاس سال بعد کی ہے، یعنی جبکہ بنگال میں سوری عہد کے زوال کو ۵۰ سال ہو چکے تھے۔ جو افغان جہانگیر کے وایسرائے اسلام خاں سے میدان کارزار میں جوجھے تھے، وہ شیر کے زمانہ کی تیسری پشت کے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بنگال میں ۱۶ ویں صدی میں پٹھان نوآبادیوں کی مکمل تصویر تب ہی پیشِ نظر ہو سکے گی جب کہ وہاں کے مسلمانوں کا اتنا ہی تفصیلی جائزہ لیا جائے جیسا کہ ہندوؤں کا لیا جا چکا ہے۔ اس اہم کام کے لیے جاں نثار لوگوں کی ایک جماعت کو اس علاقہ کا دورہ کرنا ہوگا۔ عوام سے جا کر ملنا ہوگا اور پٹھانوں کی ان روایات کو فراہم کرنا ہوگا جو اب مٹتی جا رہی ہیں، کیونکہ راج شاہی، دیناپور، پبنہ، میمن سنگھ، باری سال، پٹرا، سلہٹ اور چٹگاؤں اضلاع کے شیخ و سید وہاں کی پٹھان آبادی کو پیسے ڈال رہے ہیں۔ ایک صدی پہلے ایک پٹھان حمید الدین خاں ساکن چٹگاؤں نے ایک تاریخ موسومہ "تاریخ چٹگاؤں" لکھی تھی، لیکن اسے اپنی قوم کی بہ نسبت وطن سے زیادہ پیار تھا۔[1] شیر نے افغانوں کے ایک ہی قبیلہ یا خیل کو ایک ہی جگہ

---

[1] یہ افسوس کی بات ہے کہ ڈھاکہ کے بزرگ محب الوطن شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن خاں مرحوم کی موت کے ساتھ ہی بنگال کے افغانوں کی غیر مورخہ تاریخ بھی ضائع ہو گئی۔ خدا ان کی روح کو سکون دے۔ مجھے ۱۵ سال تک انکی محبت کے سایہ میں رہنے کا فخر حاصل ہوا ہے اور پٹھانوں کے متعلق ان کی معلومات سے میں برابر مستفید ہوا ہوں۔ وہ خود شیرانی پٹھان تھے اور مغلوں سے پہلے زمانے کے تھے۔ انہوں نے تمام زندگی پٹھان - - - - - - - - -

Marfat.com

نہیں بسایا تھا، کیونکہ اس کی خرابیاں لودی عہد میں ظاہر ہو چلی تھیں۔ سب سے پہلے سید محمود شاہ کے زمانہ میں بنگال میں پناہ لینے کے لیے لوہانی افغان آئے تھے۔ بعد میں وہ اڑیسہ بھاگ کر چلے گئے اور وہیں آباد ہو گئے۔ بعد میں راجہ مان سنگھ نے ان کو اڑیسہ سے نکال دیا اور دوبارہ بنگال میں بسا دیا۔ شیر شاہ کے زمانہ میں افغانوں کے مختلف قبیلوں کے پٹھان بنگال میں آکر آباد ہو گئے۔ مثلاً کاکر، پانی، طبانی، استرانی (سروانی قبیلہ کی ایک شاخ) تارین (شرانی قبیلہ کے چچازاد بھائی) محمود خیل (موسیٰ خیل، پانی اور کاکر کے رشتہ دار) وغیرہ۔ شمالی بنگال اور بہار میں کاکر پٹھانوں کی اکثریت تھی۔ یہاں سلیم شاہ کی وفات کے بعد انہوں نے کرّانیوں کے خلاف سخت جدوجہد کی۔ ان میں سے کچھ سرداروں کو مجلس اعلیٰ کا خطاب دیا گیا۔ ان

- - - - - - . خاندانوں کے شجرہ حسب و نسب، ان کی مقامی روایات، دور دراز علاقوں میں صوفیوں کی قبریں و مزار، بنگالی پٹھانوں کے رسم و رواج کے متعلق واقفیت فراہم کی تھی۔ ان کو گذشتہ صوفیوں، ہم عصر پٹھانوں و بنگال کے ہندوؤں کی لکھی ہوئی فارسی تصانیف کے (جو اب کم دستیاب ہیں) پڑھنے کا شوق بہت تھا۔ وہ ایک اصل پٹھان کی طرح ضعیف الاعتقاد اور صداقت پسند تھے، اور برطانوی حکومت کے خاتمہ کے بعد دوبارہ بنگال میں پٹھان حکومت کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ ان کا یہ خواب دلچسپ تھا۔ مجھے ان کے تمام کاغذات کو پڑھنے کا موقع ملا۔ میں نے شیر کی سڑکوں، سرایوں اور بنگال میں پٹھان آبادی کی تقسیم کے متعلق جملہ اطلاعات ان کاغذات سے ہی حاصل کی ہیں۔ انہوں نے شیر شاہ کی سڑکوں کا نقشہ بنایا تھا۔ میں نے انکے اس مواد سے کوئی نوٹ نہیں لیے۔ نہ چوری سے ان کی کوئی نقل کی۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا اپنے مرحوم سرپرست سے اعتماد شکنی ہوگی انھوں نے کئی رسالے بھی مرتب کیے تھے، جن میں اختصار سے ان سب اطلاعات کا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے ایک کم مشہور رسالہ "آسودگان ڈھاکہ" اپنی حیات میں ہی شائع بھی کیا تھا۔ اس میں ان صوفیوں کا ذکر کیا تھا جو گمنام ہیں۔ وہ اس رسالہ کو نیک فال سمجھتے تھے۔ اس چھوٹی سی کتاب سے آپ کو یہ علم ہو سکتا ہے کہ مرحوم کو تاریخی مواد فراہم کرنے کا کتنا شوق تھا اور ان کی واقفیت کتنی وسیع تھی۔

Marfat.com

میں سے ہی ایک جری مجلس اعلیٰ قطب فتح آبادی ضلع فرید پور کا مورث ہوگا۔ اگر یہ فرض کریں کہ جب تک افغان زمینداروں کو مغل وایسرائے اسلام شاہ نے پسپانہ کردیا وہ متواتر انہیں مقاموں پر آباد رہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شیر نے زیادہ تر ان پٹھانوں کو شمال اور مشرقی بنگال کے دریائی علاقہ میں بسایا ہوگا اور جنوب مشرق میں یہ لوگ چٹگاؤں کے بندرگاہ تک پھیل گئے تھے، جہاں ابھی تک دوسرے مقاموں کی طرح پٹھان ٹولی موجود ہے۔ افغان مہاجرین نے مغربی بنگال میں بردوان، بیر بھوم، ہجلی، چندر کونہ مقامات کو اپنا نیا وطن بنایا۔ یہ مقام یا تو سرحد پر تھے یا ہندو زمینداروں کے درمیان اندرونی اہم علاقہ میں تھے۔

بنگال میں شائستہ خاں کے چٹگاؤں فتح کرنے اور شاید اس کے بعد تک افغان مہاجرین کا سلسلہ جاری رہا۔ جب چٹگانگ ضلع پر مغلوں کا قبضہ راموتک ہوگیا تو یہاں کے اصل باشندے جو باگھ لوگوں سے مل کر مغلوں کے خلاف لڑتے رہے تھے، مغلوں کی سرحد سے باہر چلے گئے۔ ان کی اولاد آج بھی ناف دریا کے اس جانب چھوٹا اناک (چھوٹا ارا کان) میں ہے۔ قوی جثہ لمبے بال، قانون کی خلاف ورزی، ان کے امتیازی نشانات ہیں[1]

شیر نے بنگال میں صرف پٹھانوں کی ہی بستیاں آباد نہیں کیں بلکہ شمالی ہند کے راجپوتوں کو بھی وہاں بسایا تھا۔ بیر بھوم کے بیر ہمیر اور مدنا پور ضلع میں چندر کونہ کے زمیندار چندر بھان کے نام ہی یہ دلالت کرتے ہیں کہ ان کے مورث بنگال سے باہر سے آئے تھے۔

بنگال کے ہندو مغلوں کو تو اجنبی سمجھ کر ان سے نفرت کرتے تھے لیکن پٹھان ان کی نظر میں ہم وطن تھے۔ جب پٹھانوں کا اقتدار ختم ہوگیا تو انہوں نے ہندو زمینداروں کے یہاں نوکریاں کریں اور وہ آخر دم تک مغلوں کے خلاف لڑتے رہے۔

---

[1] پٹھان آج تک کشتیاں لڑنے کے بعد بے شرمی سے ناچتے ہیں۔ پھر جم کر مکا بازی کرتے ہیں میں نے ان کا یہ تماشہ اپنے بچپن میں پیڑ کی چوٹی پر بیٹھ کر دیکھا تھا۔

Marfat.com

باب 13 کا ضمیمہ ا

صوبہ بنگال میں شیر پور

ہم آئین میں مذکور کچھ شیر پور نام کے مقاموں کا تعین ذیل میں درج کرتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بیانات مقامی روایات سے میل نہیں کھاتے۔

(۱) شیر پور جو کہ شیر پور فرنگی کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ بکرم پور ضلع ڈھاکہ میں واقع ہے۔ کسی زمانہ میں تجارتی مرکز اور لٹیروں کا اڈا تھا۔ (دیکھیے اکبر نامہ جلد ۳۔ صفحہ ۶۷۲) یہ سرکار سونار گاؤں میں میگھنا دریا کے اس جانب کنارے کے نزدیک واقع تھا اور میگھنا ندی کے دوسرے کنارے تک پھیلا ہوا تھا۔ اسی میں پرگنہ چاند پور شامل تھا (دیکھیے آئین جلد ۲۔ صفحہ ۱۳۸) شیر کی ایک سڑک کے ذریعہ یہ سونار گاؤں بندرگاہ سے ملحق تھا۔ شیر پور کی یہ سڑک چاند پور سے شروع ہو کر میر سرائے، کوٹ گڈھ (موجودہ وقت کا سیتا کنڈ) ہوتی ہوئی چٹگانگ تک جاتی تھی۔

(۲) شیر پور عطیہ۔ ابو الفضل نے اس شہر کو 'مہمان شاہی' کے نام سے پکارا ہے (دیکھیے آئین جلد ۲۔ سرکار بردہہ۔ صفحہ ۱۳۸) اس نے اس شیر پور عطیہ کو شریف آباد سرکار میں بتایا ہے، جو گنگا کے دوسرے کنارے پر نادیہ سے بردوان تک ہے

(آئین جلد ۲۔ صفحہ ۱۴۰) پروفیسر ہودی والا نے جیرٹ کی تائید کی ہے اور شیر پور عطیہ کا تعین مرشد آباد سے ۱۸ میل جنوب مغرب میں کیا ہے۔ لیکن صدیوں سے بنگالی اس مقام کو موجودہ قصبہ میمن سنگھ کے شمال، شمال مغرب میں ۱۰۴ میل دور جانتے آرہے ہیں۔ یہ بات کیسے ہوئی؟ ابو الفضل کا بیان تاریخی کاغذات اور جمع کے

Marfat.com

دستاویزات پر مبنی ہے۔ اس لیے کہیں کچھ گڑ بڑ ضرور ہو گئی ہے۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ راجہ مان سنگھ نے عثمان لوہانی کو شیرپور عطیہ کے نزدیک شکست دی تھی پروفیسر ہودی والا نے اس واقعہ کی تائید کی ہے (دیکھیے اسٹڈیز صفحہ ۵۷۷) یہ کہنا کافی ہے کہ عثمان لوہانی اپنی زندگی کے طوفانی دور میں کبھی بھی بعد کے مرشد آباد سے آگے نہیں بڑھا۔ راجہ مان سنگھ اور عثمان کی اس لڑائی کے متعلق سرجادو ناتھ نے لکھا ہے "مشرقی بنگال میں شیرپور عطیہ کے نزدیک مان سنگھ نے عثمان کو ہرایا" بعد میں مان سنگھ ڈھاکہ ضلع کو چلا گیا (ڈھاکہ یونیورسٹی ہسٹری آف بنگال جلد ۲۔ صفحہ ۲۱۳) اس سے یہ بحث ختم ہو جاتی ہے۔

ابوالفضل نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے "معصوم کابلی شیرپور میں تھا" اور یہ ٹھیک لکھا ہے۔ لیکن بیورج نے اس شیرپور پر ایک نوٹ لکھ کر اس کو ڈھاکہ ضلع میں شیرپور فرنگی بتا کر مغالطہ پیدا کر دیا ہے۔ بیورج کا یہ قیاس غلط ہے، کیونکہ اس زمانہ میں سالم بکرم پور معصوم علی کے دوست عیسٰی خاں کے قبضہ میں تھا۔ معصوم جو بنگال میں شاہی علاقوں پر حملہ کر رہا تھا بکرم پور پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے ہم کو بیورج کے حاشیہ کے نوٹ پر زیادہ توجہ نہیں کرنی چاہیے۔

(۳) شیرپور مورچہ۔ اس مقام کے تعین میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (دیکھیے آئین جلد ۲۔ صفحہ ۱۳۸) یہ قصبہ بوگرا کے جنوب میں ہے۔ (دیکھیے ہودی والا اسٹڈیز صفحہ ۵۷۷ اور بہارستان جلد ۲۔ صفحہ ۸۱۲)

(۴) شیرپور۔ یہ لکھنوتی سرکار میں ہے۔ (دیکھیے آئین جلد ۲ صفحہ ۱۳۱) اس مقام کا صحیح تعین نہیں ہو سکا۔

(۵) شیرپور اور شیر شاہی۔ یہ سرکار اودینر میں (جسے عام آدمی ٹانڈہ کہتے ہیں) محالوں کے نام ہیں (دیکھیے آئین جلد ۲ صفحہ ۱۳۱) یہ شیرپور راج محل کے جنوب مغرب میں ہو سکتا ہے۔ اس مقام پر شیر نے جلال خاں کی واپسی کا انتظار کیا تھا، جب وہ گڑھی سے لوٹ رہا تھا۔ اس مقام سے غالباً دو سڑکیں جاتی تھیں جو بنگال کے خود مختار سلطانوں کے زمانوں میں موجود تھیں۔ ایک بردوان سے سنگھاؤں کو جاتی تھی اور دوسری جنوب مغرب میں ناگر کو جاتی تھی (پرانی تاریخوں میں اس کا

Marfat.com

نام لکھنو لکھا ہے اب بیر بھوم ضلع میں وہاں سوری ہے) بعد میں اس سڑک کو شیر خاں نے مدارانِ سرکار میں واقع شیر گڑھ اور جھارکھنڈ کی سرحد پر واقع شیکھر بھوم عرف شیر گڑھ تک بڑھادیا تھا (دیکھیے آئین جلد ۲۔ صفحہ ۱۴۱)

(۶) شیرپور باری۔ (شیرپور تہالی) یہ سرکار محمود آباد میں واقع ہے۔ اس کا صحیح تعین نہیں ہے (دیکھیے آئین جلد ۲ صفحہ ۱۳۳)

(۷) شیرپور کوٹی باری۔ یہ سرکار گھوڑا گھاٹ میں ہے اس کا صحیح تعین نہیں ہے

(۸) شیرپور۔ یہ سرکار شریف آباد میں ہے (دیکھیے آئین جلد ۲ صفحہ ۱۴۰) کسی جگہ اس کا نام شیرپور عطیہ لکھا ہے، جو درست نہیں ہے۔ شیرپور مرشد آباد سے جنوب مغرب ۱۸ میل ہے، جہاں سے غالباً ایک سڑک سرکار فتح آباد اور خلیفتہ آباد کو جاتی تھی (آج کل اس جگہ جیسور اور کھلنا اضلاع واقع ہیں)

(۹) شیرپور (آئین جلد ۲، صفحہ ۱۳۷) یہ سرکار بربک آباد (شمالی بنگال) میں واقع ہے۔ جگہ کا صحیح تعین نہیں ہے۔

بنگال کے فرمانرواؤں میں شیر نام کا صرف ایک ہی بادشاہ ہوا ہے اور اس کی یہ کمزوری ظاہر خاص و عام تھی کہ وہ اپنے نام کی تشہیر حتی الامکان کیا کرتا تھا۔ اس لیے عام خیال یہ ہے کہ یہ تمام شیرپور یا شیر گڑھ اسی ایک بادشاہ نے آباد کیے۔ نقشہ میں ان مقامات کا صحیح تعین ہونے سے کوئی خاص فائدہ نہیں۔ ان میں سے کچھ کے متعلق مقامی روایات کا صحیح علم مجھے نہیں ہے میں نے ڈسٹرکٹ گزیٹیر کا مطالعہ کیا ہے، جس کی تائید لازمی ہے۔ اس لیے میں نے ان میں سے چند شیرپور کا اس امید میں صحیح تعین نہیں کیا ہے کہ شاید کچھ نوجوان تاریخی تحقیق کے شوق میں بنگال میں شیر کے کارناموں کا اور زیادہ گہرا مطالعہ کریں۔

Marfat.com

باب 14

مالوہ کی فتح

فروری لغایت مئی ۱۵۴۲ء

مالوہ کے باشندے اور طبعی حالات

زمانہ قدیم میں مالوہ ایک جن پد کا بھی نام تھا اور ایک کشتریہ قبیلہ کا بھی، جو کہ مالوؤں کا ایک گن تھا۔ سکندر اعظم کے حملہ کے وقت مالوہ ایک دوسرے رشتہ دار قبیلے سیبی کے ساتھ دریائے راوی کی نچلی وادی میں آباد تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں پہلے یہ لوگ دریائے سندھ کے اس پار سوستان کے علاقہ سے پنجاب میں آئے ہوں گے۔ سوستان کے خطہ میں یہ ویدک قبائل پختہ (پختون) لوگوں کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ بظاہر مالو ایک قوم معلوم ہوتی ہے۔ غالباً یہ بہت سے قبیلوں اور جماعتوں کی آمیزش ہے، جو زمانہ قدیم میں اونچے پٹھار پر، جسے سنسکرت زبان میں "مالو بھومی" کہتے ہیں، رہتے ہوں گے، جبکہ ان کے پڑوسی زرخیز ترائی کے علاقہ میں رہتے تھے۔ آج بھی ستلج کے جنوب میں جاٹوں کی دو شاخیں پائی جاتی ہیں، مالوا اور رمانجھ، جو ستلج کی شمالی وادی میں رہتے ہیں۔ مہاراشٹر میں بھی پہاڑی علاقہ کے 'ماولے' لوگ 'دیش' کے باشندوں سے مختلف ہیں۔

موجودہ مالوہ کی آبادی میں قدیم مالو لوگوں کی نشانی تلاش کرنا بے سود ہے۔ میں راسخ العقائد صاحبان سے معافی مانگتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تاریخی نقطہ نظر سے سرزمین ہند خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ کی کھولتی دیگ کے مانند ہے، جس میں عرس کے زمانہ میں اجمیر شریف میں کھانا پکایا جاتا ہے۔ اس دیگ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں

Marfat.com

کھانے کی کوئی بھی چیز ڈال دی جائے فوراً کھچڑی بن جاتی ہے اور پھر اس کے مختلف اجزا کو علیحدہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ بعینہ سرزمین ہند میں جس قوم نے بھی قدم رکھا مثلاً آریہ۔ آریوں سے پہلے اور بعد کے لوگ اناریہ، یونانی، شاک، ہن، ترک، منگول تاتار اور حال ہی میں یوروپین، وہ سب ہندوستانی قوم کی کھچڑی میں جذب ہو گئے، خواہ کسی قوم نے اپنی انفرادیت، مذہب یا قوم کے نام پر برقرار رکھنے کی کتنی ہی جان توڑ کوشش کیوں نہ کی ہو۔ یہی بات ہندوستان کی تہذیب و اس کے تمدن کے متعلق بھی سچ ہے حالانکہ اس کا بنیادی جز ہنوز برہمن اور لنگوٹی ہے لیکن یہ اپنے ارتقا کے دور ان بودھ، ایرانی اور عیسائی تہذیب کے اتصال میں آکر دھوتی، اچکن اور پتلون کی وقتاً فوقتاً حامی رہی ہے۔

چھٹی صدی سے پہلے کسی نامعلوم زمانہ میں مالو اور مدھیامکا (مانجھ جو سیبی لوگوں کا نام ہے) لوگ موجودہ مالوہ اور میواڑ میں آکر بس گئے ہوں گے اس زمانہ تک آتے آتے ہندوستانی قبیلوں نے اپنے مقامی نام اختیار کر لیے تھے مثلاً مالو اور مانجھ یعنی درمیانی۔ جب مالو لوگ مالوہ میں آکر آباد ہو گئے، ان کے دوسرے ساتھی اراولی کی پہاڑیوں کی جانب چلے گئے، جہاں موجودہ میواڑ میں انھوں نے مادھیامکا نام کا شہر آباد کیا (پالی زبان میں اسے مجھیمکا اور پنجابی زبان میں مانجھ کہتے ہیں) ان دونوں قبیلوں کے باہمی سیاسی اور سماجی تعلقات غالباً اِس قسم کے تھے جیسا کہ تاریخ کے اہم دور میں مالوہ اور راجپوتانہ کی راجپوت قوموں کے رہے۔ جلد ہی مالو لوگ اور ان کے دوسرے ساتھی اس خطے کے اصل باشندوں کے ساتھ مل کر اپنی انفرادیت کھو بیٹھے، لیکن وسط ہند کا زرخیز پٹھار ہمیشہ کے لیے ان کے نام سے موسوم ہو گیا یہ وہ علاقہ ہے جس کے مغرب میں گجرات اور راجپوتانہ، مشرق میں بندھیل کھنڈ اور گونڈوارہ، شمال میں دریائے چمبل اور جنوب میں نربدا۔ مالوہ کے وسطی میدان کو شمالاً جنوباً بہنے والے چار دریاؤں نے مساوی حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔ ان دریاؤں کے نام ہیں ماہی اور چمبل اور ان کے دو معاون دریا پاروتی اور بیتوا۔ اس سارے خطے کا مالوہ نام بہت بعد میں پڑا۔ زمانہ قدیم میں مغربی مالوہ کو اونتی اور مشرقی حصہ کو اپارا کہتے تھے۔ زمانہ قدیم سے آج کے دور تک مالوہ نے ہندوستان کی

تاریخ و تمدن پر گہرا اثر ڈالا ہے کیونکہ جغرافیائی اعتبار سے اس کا مرکزی جائے وقوع شمال جنوب اور مشرق و مغرب کے درمیان ایک کڑی کا کام کرتا ہے۔ اگر تاریخ کے اہم دوروں میں مالوہ ہر شمالی ہند کی سلطنت کا ایک حصّہ نہ ہوتا تو عہد قدیم اور قرون وسطیٰ کی تاریخی خصوصیت یعنی تنوع میں یک رنگی معدوم ہو جاتی اور یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب کبھی پاٹلی پتر، قنوج یا دہلی کی سلطنت میں مالوہ شامل نہیں رہا تو اس حکومت کو ہندوستانی حکومت کہلانے کا حق حاصل نہیں ہوا۔

مگدھ کی سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان نے علوم و فنون تہذیب و تمدن کے میدان میں جو امتیاز حاصل کیا اس میں جزِ اعظم مالوہ کا ہے۔ یہ وہ خطہ ہے جہاں تاریخ کی مشہور و معروف مایہ ناز ہستیاں پیدا ہوئیں۔ مثلاً بکرما دتیہ اور اس کے نو رتن، دھارا نگری کا راجہ بھوج وغیرہ۔ اس خطہ میں سنسکرت علم و ادب اپنے عروج پر پہونچا۔ یہیں برہمنوں کے کٹر مذہب کا غلبہ رہا۔ یہاں کے راجپوتوں نے دو صدیوں تک غیر ملکی حملہ آوروں کا مقابلہ بڑی شجاعت اور دلیری سے کیا۔ ترکوں کے حملے کے وقت بھی ہندو کافی عرصہ تک اس علاقہ میں جمے رہے بعد میں مجبور ہو کر وہ جنوب کی جانب چلے گئے۔ پرمار حکمرانوں کی شکست و زوال کے بعد یہاں کی شہرت کم ہو گئی۔ یہ وہ حکمراں تھے جو کبھی کہا کرتے تھے کہ سارا ملک پرماروں کا ہی ہے۔ بعد میں پرمار لوگ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں مالوہ، راجپوتانہ، سندھ اور ہند کے ریگستانوں میں منتشر ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق کچھواہا لوگ بندھیل کھنڈ کے راستے سے مالوہ میں داخل ہوئے، اور ایک عرصہ تک مجوتی یا "جیجا کا بھکتی" میں رہے، جسے آگے چل کر کچھوار کہنے لگے۔ موجودہ کھجوراؤ اسی سے بگڑ کر بنا ہے۔ ان کا مورث اعلیٰ راجہ نل نرور میں راج کرتا تھا۔ کچھ دنوں تک اس خاندان کے لوگوں نے گوالیار میں بھی حکومت کی جب کچھواہہ لوگ مغرب کی جانب راجپوتانہ کی طرف بڑھ رہے تھے تو ناڈول کے جنگجو چوہان مشرق کی سمت سے مالوہ میں داخل ہو رہے تھے۔ ان چوہان لوگوں کو کھینچی[1] کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے مورث مانک راؤ چوہان

---

[1] دیکھیے ٹینسی جلد ا صفحات ۵-۱۸۴

Marfat.com

نے اپنی بھوک مٹانے کے لیے کسی نیچ قوم کے ہاتھ کی بنی ہوئی پکھی کھائی تھی، جبکہ وہ اس اونٹ پر سوار اس علاقہ پر قبضہ کرنے کے لیے متواتر سفر کر رہا تھا، جس کا اس کے والد نے وعدہ کیا تھا۔ بہرحال یہ چوہان اپنے سفاکانہ رویہ کی وجہ سے اس لقب کے مستحق تھے۔ یہ اپنے دشمنوں کو شربتِ مرگ پلایا کرتے تھے، جسے ان کی راجپوتی زبان میں "کھینچ پلانا" کہتے تھے۔ ان کھینچی لوگوں نے مالوہ سے ڈوڈو لوگوں کو، جو پمار راجپوتوں کی ایک دور کی شاخ تھی، بھگا دیا اور خود مشرق کی جانب پھیل گئے۔ ۱۳ ویں صدی میں فاتح مسلمانوں سے گھر جانے پر یہ کھینچی لوگ اس خطہ میں ایک جگہ اکٹھے ہوتے جسے آج کل "کھینچی وارا" کہتے ہیں۔ یہ اکبر کے زمانہ تک متواتر مسلمان حکمرانوں کو پریشان کرتے رہے۔ چنانچہ مسلمان بادشاہوں کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی کہ وہ راٹھور راجپوتوں کو ان کی خدمات کے سلسلہ میں مالوہ میں جاگیر دیا کرتے تھے تاکہ مالوہ کے قدیم راجپوتوں کو مرعوب کیا جا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز میں ہی ان نوواردوں نے کھینچی راجپوتوں کا سماجی اور سیاسی درجہ بہت نیچے گرا دیا۔

تور لوگ (سنسکرت میں تومر کہتے تھے) بھی مالوہ کی راجپوت آبادی کا ایک اہم جز تھے۔ ۱۵ ویں صدی میں یہ لوگ گوالیار کے حکمراں بن گئے، اور پھر سلطان ابراہیم لودی کے زمانہ تک انہوں نے مالوہ کے خلجی سلطان اور دہلی کے فرمانرواؤں کے خلاف اپنی آزادی کو برقرار رکھا۔ بعد میں تور لوگ جنوب کی جانب بھی پھیل گئے اور رائے سین کے راجہ پورنمل کے والد ماجد جنگجو سلہاری کی کمان میں انہوں نے چندیری اور رائے سین پر بھی قبضہ کر لیا۔ جب شیر شاہ نے مالوہ کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملانا چاہا تو اس کا مقابلہ رائے سین کے تواروں سے ہی ہوا۔

دہلی اور مالوہ کے حکمرانوں کے باہمی تعلقات

۸۰۴ ہجری میں (۱۴۰۱-۱۴۰۲ء) مالوہ کے ایک گورنر دلاور خاں غوری نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور سلطنت مالوہ کی بنیاد ڈالی۔ اس کے مشہور لڑکے سلطان ہوشنگ غوری نے اپنی فتوحات سے سلطنت کی سرحد گوالیار اور کالپی تک

Marfat.com

بڑھالی۔ سلطان ہوشنگ کے لڑکے محمود کو اس کے وزیر محمود خان خلجی نے تخت سے ہٹا کر ایک نئے خاندان کی حکومت قایم کی، جو ایک صدی تک مالوہ میں برسرِ اقتدار رہی۔ سلطان محمود نے ۱۴۳۵ء سے ۱۴۶۹ء تک حکومت کی۔ وہ ایک منصف مزاج اولوالعزم اور قابل حکمراں تھا۔ اسکی ۳۴ سالہ حکومت کا زمانہ مالوہ کی قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں سنہری زمانہ ہے۔ محمود کے لڑکے سلطان غیاث الدین نے ۱۴۶۹ء سے ۱۵۰۰ء تک حکومت کی۔ ایک عرصہ تک دم خم کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد وہ خودسر و عیاش ہوگیا۔ اب اس کا محض ایک ہی شوق رہ گیا، وہ تھا راجہ اور زمینداروں کی لڑکیوں کو اپنے حرم میں جبراً داخل کرلینا۔ اپنے شاہی عہدہ کے فرائض کو نظرانداز کرکے، وہ شب و روز حسن پرستی میں محو رہنے لگا۔ اس کے بعد ۱۵۰۰ء میں سلطان ناصر الدین تخت پر بیٹھا۔ اس نے ۱۵۱۲ء تک حکومت کی۔ حالانکہ وہ ایک شرابی اور ظالم حکمراں تھا، لیکن اس نے اپنی سلطنت کا انتظام بہت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے لڑکوں میں تخت کے لیے خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ ان میں سے ایک لڑکا محمود ایک راجپوت سردار کی مدد سے تخت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے راجپوت سردار کو میدنی رائے کا خطاب دیا۔ میدنی رائے ایک اچھا سپاہی اور دوراندیش سیاست داں تھا سلطان محمود خلجی دوم میں ذاتی حوصلہ و جسمانی قوت کی کمی تو نہ تھی، لیکن وہ مصلحت اور سیاست اندیشی سے بے بہرہ تھا۔ یہ اوصاف ایک فرمانروا کے لیے لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میدنی رائے نے ایک ایک کرکے اس کے تمام مسلم سرداروں کو، جو کہ نمک حرام تھے، دربار سے نکال دیا اور خود مطلق العنان حکمراں بن گیا۔ سلطان نے گجرات کے بادشاہ کی امدادی فوج کی مدد سے اس کو مانڈو سے بدر کردیا۔ لیکن جب اس نے اس کو بالکل ہی پسپا کرنے کا منصوبہ باندھا تو وہ اس میں ناکامیاب رہا۔ میواڑ کا رانا سانگا میدنی رائے کی مدد کو آپہونچا۔ اس نے سلطان کو شکست فاش دیدی، اور اس کو ہمیشہ کے لیے قید کرلیا۔ بعد میں رانا سانگا نے سلطان کو آزاد کردیا اور اس کو سلطنت کے دارالمقام مانڈو اور اس کے قرب و جوار میں حکومت کرنے کی اجازت دیدی۔ مالوہ کا باقی علاقہ رانا

Marfat.com

نے اپنی سلطنت میں ملالیا (۱۵۱۸ء)

سلطنت مالوہ کے زوال اور رانا کی طاقت میں غیر معمولی اضافے سے ہندوستانی سیاست میں توازن قوت میں خلل پڑ گیا۔ ۱۲۵ سال پیشتر سے اب تک مالوہ، گجرات اور میواڑ تینوں ریاستیں اپنی وسعت و قوت میں ہم پلہ تھیں۔ اس طرح سے ان میں ایک قسم کا توازن تھا اور سیاسی تقابل بھی انکی باہمی کشیدگی، جنگ و جدل سے دہلی کی کمزور طاقت کو راحت نصیب ہوئی، لیکن گجرات اور مالوہ کی مشترکہ افواج پر رانا سانگا کی فتح نے راجپوتوں کی جارحانہ پالیسی کو فروغ دیا راجپوت طاقت کا یہ ارتقا دہلی حکومت کے تحفظ کے لیے نہایت ہی اندیشہ ناک تھا۔ کیونکہ اتنی صاحب اختیار ریاست کا اس قدر وسیع علاقہ پر قابض ہو جانے کے بعد دہلی حکومت سے ٹکراؤ لازمی تھا۔ اس طرح رانا سانگا نے میواڑ کے اقتدار کو عروج دے کر سلطان ابراہیم لودی کے زمانہ میں لودی حکومت کے لیے مستقل خطرہ بنا دیا اور یہ خطرہ بابر کے لیے بھی اس وقت تک برابر بنا رہا، جب تک کہ اس فاتح اعظم نے کنواہہ کی لڑائی میں (۱۵۲۷ء) اس راجپوت کو مکمل طور پر زیر نہ کر دیا۔ لیکن میواڑ کے اس زوال سے اس خطہ میں سیاسی توازن قائم نہ ہو سکا۔ اس شکست سے گجرات کے عروج و اقتدار کا راستہ صاف ہو گیا۔ بہادر شاہ نے ۱۵۳۰ء میں مالوہ پر حملہ کر کے مانڈو پر قبضہ کر لیا اور سلطان محمود دوم اور اس کے لڑکوں کو حراست میں لے لیا۔ مالوہ گجرات سلطنت میں ملا لیا گیا اور اب بہادر شاہ نے مغلوں کے خلاف اسی قسم کا بغض و عناد آمیز رخ اختیار کر لیا جیسا کہ پہلے رانا سانگا کا تھا اور یہ خطرہ تب دور ہوا جب ہمایوں نے ۱۵۳۵ء، ۱۵۳۶ء میں گجرات پر حملہ کر کے بہادر شاہ کو بالکل نیست و نابود کر دیا۔

فروری ۱۵۳۷ء میں بہادر شاہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وفات سے مالوہ لاوارث ہو گیا، کیونکہ اس کا وارث جو محض ایک نابالغ لڑکا تھا صرف نام ہی کا بادشاہ تھا۔ مالوہ کا قدیم خلجی خاندان ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گیا۔ مغل بادشاہ بھی مالوہ کا خیال چھوڑ کر بہار کی بغاوت کو دبانے میں مصروف ہو گئے۔ اس طرح مالوہ کا میدان بالکل صاف ہو گیا۔ اب کوئی بھی نئی طاقت یہاں اپنا پیر جما سکتی تھی۔ اس سیاسی

Marfat.com

خلا کو پُر کرنے کے لیے ملوخاںؒ و پسر ملوخاں اول میدان میں آئے۔ یہ دونوں پہلے غلام تھے مالوہ کے خلجی سلطانؒ محمود دوم کے زمانہ میں ترقی کر کے امیر بن گئے۔ اس عرصہ میں جب چند روز کے لیے مالوہ میں بہادر شاہ کی حکومت ہو گئی تھی ملوخاں بادشاہ کا منظور نظر ہو گیا۔ چند روز کے بعد اس غلام نے اپنے آقا کی جگہ لے لی اور ۵۳۷ھ کے قریب قادر شاہ کا خطاب اختیار کر کے مانڈو کا سلطان بن گیا۔ گجرات نے بڑی خوشی سے ایسی نئی حکومت کے وجود کو تسلیم کر لیا اور نابالغ سلطان محمود سوم کی جانب سے اس کے وزیر اعظم عماد الملک نے ایک شاہی چھتر اور سکّہ ڈھالنے کا پٹہ قادر شاہ کی حکومت کے صدر مقام مانڈو بھیجا۔ قادر شاہ میں ایک اچھے حکمراں کے تمام اوصاف موجود تھے وہ عقل و دانش کا پتلا تھا اور مصالحت پسند تھا۔ بہادر شاہ نے پہلے جن راجپوت ریاستوں کو پسپا کیا تھا قادر شاہ نے ان کے علاقہ تک اپنے احاطہ تسلط کو توسیع دی

لہ مسز بیورج نے ملوخاں جس کا کہ بابر نے حوالہ دیا ہے اور اس ملوخاں کو جس نے کہ چندیری کے نزدیک تالاب کھدوایا اور جس کا کہ عرف قادر شاہ تھا ایک ہی فرمانا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ ملوخاں نے ۵۳۲ اور ۵۳۳ھ میں شاہی خطاب اختیار کیا صریحاً غلط ہے۔ ہمیں فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ملوخاں پہلے خلجی حکمرانوں کے غلام تھے بعد میں ترقی کر کے امیر بن گئے۔ ایک دوسری جگہ اسی مصنف نے لکھا ہے کہ ۱۵۰۱ء میں ملوخاں نام کے ایک سردار کو چندیری کی بغاوت دبانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ شاید اسی ملوخاں نے وہ تالاب کھدوایا ہوگا۔ (فرشتہ جلد ۲۔ صفحہ ۲۷۰، ۲۷۱)

ہ میراۃ سکندری صفحہ ۲۷۳۔

اور اپنی سلطنت کی حدود اجمیر اور آمیر کی سرحد تک پہونچا دی اور رنتھمبور کے قلعہ کو جو کبھی بہادر شاہ کے قبضہ میں تھا خان خاناں نام کے ایک گجراتی افسر کو دے دیا۔

قادر شاہ نے اپنی دور اندیشی کا پہلا ثبوت یہ دیا کہ اس نے مالوہ کے راجپوت علاقہ میں راجپوت طاقت کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کو دہلی کے سلطان سے مورچہ لینا ہی ہوگا خواہ وہ ہمایوں ہو خواہ شیر شاہ اس حملہ کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ قدیم خلجی حکومت کے راجپوت اور مسلم جاگیرداروں کی حمایت حاصل کرے۔ اس پالیسی کے ماتحت اس نے سلہادی

Marfat.com

پوربیہ[1] کے خاندان کو جو کنواہہ کی لڑائی کے بعد میواڑ جا کر بس گیا تھا مالوہ واپس بلالیا۔ سلہادی کے لڑکے بھوپت کا چھوٹا بھائی بھیا پورنمل اور بھوپت کا نابالغ لڑکا اپنے اہل وعیال ومتعلقین کے ساتھ مالوہ آگئے۔ بھوپت کے لڑکے پرتاپ کو رائےسین کا سردار بنادیا گیا اور پورنمل کو اس کا ولی وسرپرست۔ قادر شاہ نے مشرقی مالوہ کا کافی بڑا حصہ جس میں چندیری بھی شامل تھی پورن مل کو دیدیا اور اس طرح اس کو اپنا وفادار نائب ومددگار بنالیا۔ ایک بار برسرِ اقتدار ہونے کے بعد راجپوتوں نے حسبِ معمول اپنی جارحانہ کاروائیاں شروع کردیں اور عرصہ قلیل میں پورنمل اس قدر طاقتور ہوگیا کہ مالوہ کا کوئی بھی حکمراں اس کے اقتدار کو نظرانداز نہ کرسکتا تھا۔ خلجی عہد میں میانہ افغان، جو سردانی اور تارن لوگوں کے چچازاد بھائی تھے، مالوہ میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ یہ لوگ ہنڈیا میں نربدا کے جنوبی کنارے پر رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ افغان دریا کے جنوبی کنارے کے ساتھ ساتھ ہنڈیا اور ہوشنگ آباد کے درمیان مشرق وجنوب مشرق میں گونڈوانہ اور سیونی مالوہ کی سرحد تک پھیل گئے۔ سکندر خاں میانہ ان کا حکمراں تھا۔ عباس نے اسے ہنڈیا اور سیونی کا جاگیردار بتایا ہے۔[2] اس

---

[1] پوربیہ کے لفظی معنی ہیں مشرق کا رہنے والا۔ اس لفظ کا اطلاق تمام راجپوتوں پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ کسی نسل، فرقہ یا قبیلہ کے کیوں نہ ہوں اور خواہ ان کے پاس راجپوتانہ سے باہر جمنا اور چمبل کی وادی اور اس کے باہر جاگیریں ہوں۔ مورخوں میں اس معاملہ میں اختلاف ہے کہ پورنمل اور سلہادی کس خاندان کے تھے اور وہ اختلاف یہ ہے کہ ہم ان کو پرتھوی راج کے خاندان کے چوہان کہیں، جو رنتھمبور کے۔ اوُہمیر کی نسل سے ہیں یا ٹوڈ کے مطابق تور سمجھیں۔ مجھے ٹوڈ کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ میری پہلی تصنیف شیرشاہ شائع ہونے کے بعد ریوا حکمرانوں کے زمانہ کی ایک سنسکرت زبان میں لکھی ہوئی تاریخی نظم سے بھی میری اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن پروفیسر ہودی والا کی رائے میں زیادہ ثبوت ٹوڈ کے موافق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پروفیسر ہودی والا کی رائے میرے مقابلہ میں زیادہ درست ہے۔ اس لیے میں پورنمل کو چوہان کے بجائے تور سمجھتا ہوں۔ (ہودی والا اسٹڈیز صفحہ ۴۶۰۔ ۴۶۱) [2] اس کے متعلق مزید معلومات کے لیے اس باب کا ضمیمہ اوّل دیکھیے۔

Marfat.com

وقت اس کا متبنٰی معین خاں اس کی جگہ کام کر رہا تھا۔ پورن مل کی طرح اس کی حیثیت بھی قادر شاہ کے ایک ماتحت کے مانند تھی۔

قادر شاہ کو اپنے پڑوس میں ہی ایک ہندو سرکش سردار بھوپال سے مقابلہ کرنا تھا یہ سردار کسی زمانہ میں خلجی بادشاہوں کا جاگیردار تھا۔ وہ خاندیش کی سرحد پر نمار ضلع میں مہیشور اور بجے گڑھ کے راستوں کے محافظ کا کام کرتا تھا۔ ۱۵۳۶ء میں ہمایوں کی آگرہ کی واپسی کے بعد جب مغل مانڈو خالی کر کے چلے گئے تو بھوپال نے پیش قدمی کر کے اس شہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ قادر شاہ کی چال کا اندازہ کر چکا تھا اور جانتا تھا کہ قادر شاہ خود بھی مانڈو پر قبضہ کرنے کا خواہشمند ہے۔ بعد میں قادر شاہ نے اس سے یہ علاقہ چھین لیا لیکن مہیشور اور بجے گڈھ پر کوئی دست درازی نہ کی۔

اس طرح ۱۵۴۳ء میں اگر مالوہ کے جملہ سردار ملّو خاں عرف قادر شاہ کی رہنمائی میں متحد ہو جاتے تو مالوہ کی سیاسی فضا شیر شاہ کے لیے نہایت ہی وحشت ناک ہو جاتی کیونکہ اسی وقت اس نے اس علاقہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ باندھا تھا۔ شیر کو اس بات کا علم تھا کہ جب تک کہ وہ مالوہ کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا ۔۔۔ تک ہی وہاں کے سردار اس سے دوستی نباہتے رہیں گے اور یہ لوگ اس کو ملّو کے خلاف اپنا محافظ و سرپرست سمجھتے رہیں گے۔ مگر شیر شاہ کو خود قادر شاہ کے متعلق شبہ و وسوسہ تھا، کیونکہ راجپوتوں اور گجرات کی موانست سے اس کی حیثیت نہایت ہی مستحکم تھی۔ اس ملّو خاں ہی نے (جو بعد میں قادر شاہ کے نام سے مشہور ہوا) اس سے پیشتر مغلوں کو مات دینے کے لیے مالوہ کو گجرات کے بہادر شاہ کے حوالہ کر دیا تھا اور اب پھر وہ اس کو میواڑ کے راؤ مالدیو کو دے سکتا تھا۔ راؤ مالدیو ارادے راسخ و بلند حوصلے حکمراں تھا وہ راجپوت سیاست میں اپنی جارحانہ پالیسی سے دوسرا راناسانگا بننے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اگر ملّو خاں اس تجویز پر عمل کرتا تو شیر شاہ کے سامنے صورت حال اس قدر نازک ہو سکتی تھی جیسی کہ کنواہہ کی لڑائی سے قبل بابر کے سامنے تھی۔ علاوہ بریں ہمایوں ابھی دریائے سندھ کے اس جانب مقیم تھا اور شیر شاہ کے خلاف کسی بھی سازش میں شریک ہونے کو تیار تھا اور گجرات کے راستہ راؤ مالدیو کی مدد سے دہلی پر حملہ کر سکتا تھا۔ اگر شیر شاہ کو بنگال کے وائسرائے خضر خاں ترک کی بغاوت دبانے

Marfat.com

کے لیے اپنی توجہ بنگال کی جانب مبذول نہ کرنا پڑتی، تو وہ ہمایوں کے تعاقب سے واپس لوٹتے ہی مالوہ کے سرکش سرداروں کو پسپا کر ڈالتا۔ یہ بات اِس فعل سے ظاہر ہے جس کے بموجب اس نے اپنے جنرل شجاعت خاں کو بہار سے ہٹا کر گوالیار بھیجا اور مالوہ پر حملہ کی علم برداری کرنے کے بجائے اس کو یہ تاکید کی کہ وہ اس علاقہ کے سیاسی حالات کا جائزہ لیتا رہے اور اس پر نگاہ رکھے۔ شجاعت خاں نے لفظ بہ لفظ شیر کی ہدایات پر عمل کیا اور اپنی مدبرانہ دانشمندی سے مالوہ کے سرداروں کا اعتماد حاصل کر لیا اور ان کو شیر شاہ کے خلاف متحدہ محاذ بنانے سے روکے رہا۔

شیر کی مالوہ پر چڑھائی

فارسی کے تمام مورخین نے شیر کے مالوہ پر حملہ کرنے کی وجہ صرف یہ بتائی ہے کہ اس کو مالوہ کے خلاف ذاتی دیرینہ کینہ تھا اور وہ اس سے انتقام لینا چاہتا تھا یہ صرف عباس کی صدا کی بازگشت ہے۔ روایت ہے کہ ملو خاں عرف قادر شاہ نے ایک مرتبہ شیر شاہ کی توہین کی تھی اور پورنمل و دیگر سرداروں سے شیر اس لیے ناراض تھا کہ انہوں نے اسکے مرحوم لڑکے قطب خاں کی مدد کرنے میں غفلت کی تھی۔ عباس نے قطب خاں کی کالپی مہم کے اغراض و مقاصد کے متعلق جو بے بنیاد باتیں لکھی ہیں انکی تردید اس سے پیشتر ہی ہم کر چکے ہیں۔ شیر کے اس حملہ کے پسِ پشت کوئی انتقام کا جذبہ نہ تھا۔ یہ اس کی جارحانہ کاروائی تھی اور دہلی کی توسیع سلطنت کی دیرینہ پالیسی سے ہم آہنگ تھی۔ دہلی کے سب ہی حکمرانوں نے اسی طرز عمل کو اپنایا خواہ وہ ہمایوں ہو خواہ شیر شاہ۔ شیر شاہ کا مقصد صریحاً دکلیتاً سیاسی تھا اور اگرچہ اس نے مالوہ کو مشکوک ذرائع سے ہی فتح کیا تو بھی بہ نسبت بہادر شاہ کے اس کا یہ فعل زیادہ حق بجانب تھا کیونکہ بہادر شاہ گجراتی تو راجپوتانہ کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر ایک قدم عرب ساحل پر اور دوسرا قدم بندھیل کھنڈ کے جنگلی علاقوں میں جما کر سلطنت دہلی کو پست کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ دہلی اور مالوہ کے حکمراں نزدیکی پڑوسی تھے اس لیے فطرةً وہ ایک دوسرے کے دشمن رہا کرتے تھے صرف خود غرضی، ذاتی

Marfat.com

وقار یا سیاسی مصلحت ہی ان پر مہمیز کا کام کرتی تھی۔ مالوہ کی طاقت و اتحاد دہلی حکمرانوں کے سینہ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا کیونکہ جنوب سے آنے والے کسی بھی حملہ آور کے لیے مالوہ سے ہی راستہ مل سکتا تھا۔ اس کے برعکس ایک منتشر اور لاغر مالوہ "اگر اس کو اس کی قسمت پر چھوڑ دیا جاتا تو بھی دہلی کے لیے کچھ کم سردرد نہیں تھا۔ اور اس سمت سے مستقل خطرہ بنا رہتا۔

جنوری ۱۵۴۲ء کے آغاز میں شیر بنگال سے آگرہ کے لیے روانہ ہوا۔ وہ مالوہ سے خبر حاصل کرنے کے لیے مضطرب تھا۔ جب شیر آگرہ کو سفر کر رہا تھا، تو اسے شجاعت خاں کا ایک عریضہ ملا جس میں تحریر تھا کہ گوالیار قلعہ کے ہمایوں کے گورنر محمد ابوالقاسم نے اس سے صلح کر لی ہے۔ اس کے بموجب جب آنحضرت گوالیار پہونچیں گے، تب وہ اس قلعہ کو آنحضرت کے افسروں کے سپرد کر دے گا۔ چنانچہ شیر نے حکم صادر کیا کہ فوج گوالیار کے راستہ مانڈو کی جانب کوچ کرے۔ (عباس نسخہ صفحات ۲۰۳-۲۰۲۔)

فروری ۱۵۴۲ء کے وسط میں غالباً شیر نے اپنی فوج کا رخ گوالیار کی جانب موڑنے کے لیے اٹاوہ سے بھینڈ کی جانب کوچ کیا۔ کالپی پہونچنے پر سنبھل کے فوجدار نے بلگرام سے بھاگے ہوئے آخری مغل سردار، بیرم خاں کو شیر کے حوالہ کر دیا۔ بیرم خاں پہلے سنبھل سے ہمالیہ کی جانب ہردوار بھاگ گیا تھا، پھر بھیس بدل کر چند روز سنبھل کے نیک خصلت قاضی عبدالوہاب کے یہاں پناہ گزیں رہا۔ بعد ازیں قاضی نے اسے لکھنؤ کے راجہ متر سین کے حوالہ کر دیا۔ مجبور ہو کر راجہ کو بیرم خاں کو ناصر خاں کے حوالہ کرنا پڑا اور اگر عیسٰی خاں سروانی بیچ میں حائل نہ ہوتے تو بیرم خاں کا سر بلا پس و پیش قلم کر دیا جاتا۔ بیرم خاں کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا[2] وہ ایک قیدی کی طرح

---

[1] جن وجوہات سے میں نے شیر شاہ کی مالوہ کی مہم کی تاریخ میں ردوبدل کیا ہے یعنی اپریل ۱۵۴۲ء (دیکھیے شیر شاہ صفحہ ۲۵۴) کے بجائے فروری ۱۵۴۲ء، ان کے متعلق دیکھیے اس باب کا دوسرا ضمیمہ۔

[2] اس کے متعلق ہم کو ابوالفضل کے بیان کا اعتبار نہیں کرنا چاہیئے کہ شیر شاہ نے کھڑے ہو کر بیرم خاں کا استقبال کیا اور تحفہ و تحائف کا تبادلہ کیا۔ بیرم خاں اس وقت ایک ادنیٰ حیثیت کا فرد

Marfat.com

حراست میں دربار کے ساتھ سفر کرتا رہا۔ شیر گوالیار پہونچا اور مغل گورنر ابوالقاسم نے حسب معاہدہ قلعہ اس کے حوالہ کر دیا۔ یہ گورنر ایک سال کے محاصرہ کے بعد رسد کی کمی کی وجہ سے شیر کے سپہ سالار شجاعت خاں سے صلح کرنے کو مجبور ہو گیا تھا ابوالقاسم کو بھی قیدی بنا کر پٹھان لشکر میں بھیج دیا گیا۔ اس کا مستقبل بھی بیرم خاں کی طرح تاریک تھا۔

جب شیر شاہ کی فوج گوالیار سے کوچ کر کے مالوہ کی شمالی سرحد کے کنارے جنوب مغرب میں گاگروں کی جانب بڑھی تو مالوہ کے سرداروں نے راحت کی سانس لی۔ گاگروں مکندرا نام کے پہاڑی سلسلہ کی آخری مشرقی سرحد پر واقع ہے۔ ان پہاڑیوں سے ہو کر مالوہ سے مشرقی راجپوتانہ کو راستہ جاتا ہے۔ اس وقت تک شجاعت خاں کو پتہ نہیں تھا کہ اس کی فوج کی منزل کہاں ہو گی کیونکہ اس کا آقا اپنے ارادوں کو چھپانے میں طاق تھا۔ اگر وہ دراصل جنوب کی جانب جانا چاہتا تھا تو شمال کی سمت میں کوچ کرتا تھا۔ اس طرح شیر نے سب سے پہلے اس درہ کے دہانہ پر قبضہ کر لیا تاکہ قادر شاہ کے راجپوت مددگار اگر ضرورت کے وقت اسکی مدد کو آنا بھی چاہیں تو ان کو وہیں روک دیا جائے پھر وہ دفعتہً جانب جنوب سارنگ پور کی طرف مڑا جو گاگروں سے ۱۲۰ میل ہے۔ اس وقت قادر شاہ اجین میں تھا جو کہ سارنگ پور سے ۰۰ امیل جنوب مغرب میں ہے۔ قادر شاہ اجین سے باہر بھی نہ نکل پایا تھا کہ شیر نے سارنگ پور پر بلا کسی لڑائی کے قبضہ کر لیا۔ قادر شاہ فطرۃً خوفزدہ ہو کر اپنے دارالمقام مانڈو کی جانب بھاگ چلا، جو کہ اجین سے ۰۰ امیل جنوب میں تھا۔ وہ شیر کے اس دفعتہً حملہ سے سراسیمہ اور حواس باختہ ہو گیا۔ دراصل شیر شاہ ایک فاصلے پر اس شیر شاہ سے مختلف تھا جو کہ سر پر آ گیا ہو اور ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے تیار ہو جو کہ اس کے راستہ میں روڑا اٹکانے کی کوشش کرتے ہوں۔ یوں تو قادر شاہ کے پاس لڑائی کا کافی سامان تھا مگر اس میں راجپوتوں کی سی اولالعزمی اور

تھا اور چاہے وہ شاہ ایران کا سفیر کیوں نہ ہوتا تو بھی کوئی بھی دہلی کا سلطان اسکی طرف متوجہ نہ ہوتا۔

Marfat.com

خطروں کا مقابلہ کرنے کا اتنا دم خم نہ تھا کہ وہ غنیم سے تن تنہا لوہا لے سکے یا موت
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑ سکے۔ اگر وہ ہمت سے کام لیتا اور اپنے مضبوط
قلعہ میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کرتا تو ممکن تھا کہ اس عرصہ میں دوسرے مالوہ کے
سرداروں کو آپس میں متحد ہونے کا موقع مل جاتا اور تب وہ ایک پرچم کے سایہ
میں شیر کا مقابلہ کر لیتے۔ شیر کافی عرصہ تک سارنگ پور میں مقیم رہا۔ گویا کہ وہ یہاں
ایک حملہ آور کی حیثیت سے نہ ہو کر ایک قانونی جائز حکمراں کی طرح ہو۔ مالوہ کی
مہم میں نہ ایک خون کا قطرہ گرا، نہ شیر نے لوٹ اور غارت گری کی اجازت دی،
نہ رعایا کو غلام بنانے کی کوشش کی گئی نہ کسی قسم کی تباہی و بربادی کی نوبت آئی۔
مالوہ سے قادر شاہ کی حکومت اس طرح چشم زدن میں ختم ہو گئی گویا کہ وہ ایک
پانی کا بلبلہ تھا جو شیر کی پھونک سے ہی پھوٹ گیا۔ یہ شیر کی خوش نصیبی تھی کہ قادر شاہ
کو خاندیش اور گجرات کی جانب بھاگنے کا خیال نہیں آیا اور اس کے قبل کہ
اس نے اطاعت قبول کر کے اپنے کو ذلیل کیا اس کے واسطے راستے صاف تھے اور
وہ بچ [illegible] تھا۔

کہا جاتا ہے کہ قادر شاہ کے خاص مشیر امیر سیف خاں نے اسے یہ مشورہ دیا تھا کہ
فوراً سارنگ پور جا کر شیر شاہ سے مصالحت کرے۔ قادر شاہ اجین واپس آیا اور یہاں
سے اس نے اپنا ایک سفیر سارنگ پور اطاعت کا پیغام لے کر بھیجا۔ پھر وہ اپنا تمام
سامان چھوڑ کر محض دو سو گھوڑوں کے ساتھ چل پڑا۔ اس کی آمد کی خبر سن کر
شجاعت خاں اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔ شیر نے بڑی گرم جوشی سے اس کا
استقبال کیا۔ قادر شاہ نے مالوہ کی سالم ریاست بطور نذر پادشاہ کو پیش کر دی۔
شیر نے اس کے عوض میں اس کی شاہانہ شان کے مطابق گلناری خیمہ اور دوسرے
[illegible] لوازمات اس کو عطا کیے۔ اس رسمی ملاقات کے موقع پر قادر شاہ کا پلہ بھاری
رہا۔ قادر شاہ نے ایسی شستہ اور فصیح زبان میں گفتگو کی جو کہ السنہ مشرق میں بہترین
ہے[1] اس زبان میں یہ صلاحیت ہے کہ کوئی بھی انسان خوش اسلوبی بیان کے دامن

---

[1] عباس اور دیگر افغان مورخ پٹھانوں کی طبعی مذاق کی کمی کا اظہار کرتے ہیں جبکہ وہ اس غرض

Marfat.com

میں اپنے حقیقی ارادوں کو چھپا کر ظاہرہ اخلاق وصداقت کی نمائش کر سکتا ہے۔
شیر شاہ نے قادر شاہ کے اس مؤدبانہ شائستہ خطاب کا جواب محض ایک مسکراہٹ سے دیا۔ شیر کا اپنی زندگی میں چوڑ ڈاکوؤں سے، غیر مہذب سپاہیوں سے، بچھڑے ہوئے پوربیوں سے سابقہ پڑا تھا۔ اس کی زبان کو وہ مرسع شائستگی نصیب نہ تھی جو کہ بادشاہوں کا خاص وصف ہوتا ہے کسی فرد میں یہ اوصاف تب ہی پیدا ہو سکتے ہیں جب کہ وہ یا تو شاہی خاندان میں پیدا ہوا ہو یا اس کو کسی دربار میں تربیت پانے کا موقع ملا ہو۔

قادر شاہ کے پہونچتے ہی شیر شاہ نے حکم دیا کہ سارنگ پور سے ڈیرے اٹھائے جائیں اور فوج اجین کی جانب روانہ ہو۔ یہ طویل سفر کم از کم ۵ منزل کا تھا۔ اس سفر کے دوران شیر شاہ اور قادر شاہ رسمی تعلقات اور عوام کی نظر سے دور ایک دوسرے کے گہرے دوست ہو گئے۔ مشتاقی نے لکھا ہے (اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کے دلچسپ تفصیلی بیان کو باور نہ کریں) کہ اس سفر کے دوران دونوں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔ دونوں نے اپنی ابتدائی طوفانی زندگی کے راز ایک دوسرے پر آشکارا کیے اور اپنی جوانی کی احمقانہ حرکتوں پر دل کھول کر ہنسے۔ شیر کو اپنی زندگی میں ہنسی مذاق و تفریح طبع کا موقع بہت کم ملتا تھا اور وہ بھی تب جبکہ وہ فوج کے کوچ کے وقت اپنی مستی میں محو ہو جاتا تھا۔ قادر اس سے پیشتر بھی کئی سلطانوں کی خدمت میں رہ چکا تھا۔ اس نے کئی بار ایسی فوجوں کی کمان کی تھی جو شیر شاہ کی اس فوج سے جو اجین کی جانب جا رہی تھی بدرجہا بڑی تھیں لیکن اس نے اپنی زندگی میں کسی فوج کو بھی اتنی وقت کی پابندی کے ساتھ کوچ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ فوج ریگ کی گھڑی کے مطابق سفر کرتی تھی۔ شام کو اپنے پڑاؤ کے چاروں طرف

سے قادر شاہ کے الفاظ کو دہراتے ہیں گویا کہ وہ مانڈو کے بیکس اور بدقسمت بادشاہ کا مضحکہ اڑاتے ہوں۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ان الفاظ پر تاریخ کی مہر ثبت کر دی ہے گویا کہ ان کے کچھ معنی ہوں۔ "وہ بڑے انکسار سے شاہی لشکر میں خاکروبی کا کام کرنے کو تیار ہو گیا۔"
(ہمایوں۔ صفحہ ۱۶۵)

Marfat.com

کھائیاں کھودتی تھی گویا کہ اسے دشمن کے حملہ کا ڈر رہو۔ چار سُو لوٹ مار کرنے کے بجائے اپنے خیموں میں ہی رہتی تھی۔ عباس نے لکھا ہے کہ ایک روز قادر شاہ نے افغان سپاہیوں کو بیلدار کی طرح مٹی کھودتے ہوئے دیکھ کر کہا ان کا آقا ان سے بہت سخت کام لیتا ہے اور ان کی حالت بہت خراب ہے۔ سپاہیوں نے مالوہ کے اس سابق فرمانروا کو جو مثل طاؤس زرق برق پوشاک سے ملبوس تھا نفرت کی ہنسی سے دیکھا اور جواب دیا " ہمیں اس سخت محنت سے مسرت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ ہمارا آقا بھی ہماری ہی طرح سخت محنت کرتا ہے"[1] قادر شاہ کو یہ جواب سن کر یہ تعجب ہوا ہوگا کہ شیر شاہ کے سپاہی اس کو اس درجہ پیار کیوں کرتے ہیں جبکہ وہ ان سے بیحد جان توڑ کام لیتا تھا۔ کوچ کرتے وقت سپاہیوں کی تفریح طبع کا کوئی سامان نہ رہتا تھا۔ نہ تو لشکر کے ساتھ بھانڈ یا ظریف رہتے تھے نہ ناچنے والی طوائف، جو انکی خشک زندگی میں وقتاً فوقتاً رنگینی پیدا کرسکیں۔ قادر شاہ کی نظروں میں افغان لشکر کسی مہذب آدمی کے رہنے کے لیے جو شائستہ سوسائٹی میں رہنے کے عادی ہوں موزوں نہیں تھا۔ شیر شاہ بذاتِ خود ایک چوکیدار کی طرح رہتا تھا۔ اس کا بہادر شاہ یا ہمایوں جیسے بادشاہوں سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

قادر شاہ نے سیاسی زیرکی سے شیر شاہ کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ اس سے شیر شاہ کے سامنے ایک نازک صورت حال پیدا ہوگئی۔ مانڈو کی ریاست پر فوراً تسلط کر لینا اور قادر خاں کو قید کرنا اس کی نظروں میں ایک نفرت انگیز و ذلیل کام تھا اس کے برعکس قادر شاہ کے اعمالنامہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو اس کی ریاست واپس دے کر باجگذار حاکم بنانا بھی دانائی سے بعید ہوتا۔ شیر کو اس بات کا احساس ضرور تھا کہ قادر شاہ بلاشبہ ایک قابل حکمراں ہے اور شاہی رتبہ کا حقدار ہے۔ لہٰذا اسے کم ازکم کسی صوبہ کا گورنر تو بنانا ہی چاہیے۔ اجین پہونچنے پر شیر شاہ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس نے قادر شاہ کے نام ایک فرمان جاری کیا کہ اس کو مالوہ کے بجائے لکھنوتی[2] کا سلطان بنا دیا گیا ہے۔ ان حالات میں

---

[1] عباس صفحہ ۲۱۰-۲۰۹- [2] طبقات ۵۹۲-۲۷۱، عباس ۲۱۱-۲۱۲- مخزن ۲۵- جگہ

Marfat.com

شیر کا یہ سکوت نامناسب نہ تھا۔ اگر وہ اس وقت قادر شاہ کو اس سے زیادہ فراخدلی دکھاتا تو یہ شبہ ہوتا کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ گیا، جو ایک حکمراں کے شایانِ شان نہیں۔ اس پر بھی فرشتہ شیر کے اس عمل پر بہت چیں بجبیں ہوا ہے اور یہ حق بجانب ہے کیونکہ وہ اس زمانہ کے سیاسی ماحول کا ترجمان تھا[1] آگے چل کر شیر شاہ کا یہ طرزِ عمل، اکبر کی معزول حکمرانوں کے متعلق انسانی اور بامروّت پالیسی کا پیش خیمہ تھا۔ مثال کے طور پر کشمیر کے یوسف شاہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ قادر شاہ کی اطاعت پذیری کے بعد مالوہ کے دیگر سرداروں کے پاس شیر کی اطاعت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہنڈیہ اور سیونی مالوہ (نربدا کے جنوب میں ہیں) کے حاکم سکندر خاں میانہ کے لڑکے معین خاں نے از خود اجین جا کر شیر شاہ کی خدمت میں باریابی حاصل کی اس کی ملازمت قبول کر لی۔ شیر نے اس کے والد کا خطاب سکندر خاں اس کو عطا کیا اور ۱۳ ہزار جاگیر اس کو واپس کر دی۔ گجرات سے بھی دریا خاں گجراتی جو گجرات کے نابالغ بادشاہ کا ولی و سرپرست تھا اور عالم خاں لودی (جو بہلول خاں لودی کا لڑکا اور تخت کا دعویدار تھا) شیر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے گجرات میں خانہ جنگی کی وجہ سے ان کا نقشہ پلٹ چکا تھا۔ شیر نے ان کو سیاسی مہاجرین سمجھ کر اپنے یہاں پناہ دی اور بالترتیب ان کو اجین اور سارنگ پور کا گورنر بنا کر ان کے گذارہ کا معقول انتظام کر دیا۔ اس موقع پر خواص خاں بھی، جس کو شیر نے لاہور سے بلایا تھا، لشکر سے آملا۔

بیچارہ قادر شاہ شیر کے اس فرمان سے بہت مایوس ہوا لیکن وہ ہر چار طرف

کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ نظام الدین اور فرشتہ لکھنوتی بتاتے ہیں (باقی حاشیہ آئندہ ص)

[1] باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) عباس نے کالپی لکھا ہے۔ مزن نمبر مہرا۔ مجھے نظام الدین کی رائے پسند ہے۔ شیر کی پالیسی کے نقطہ نظر سے مالوہ کے سابق سلطان کے لیے لکھنوتی سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ یہ جگہ قادر شاہ کی حیثیت کے مطابق تھی۔ بنگال پھر بھی ایک ریاست تھی، حالانکہ اس کا وجود برائے نام ہی تھا۔

[1] فرشتہ جلد ۲۔ صفحہ ۲۷۱۔

Marfat.com

سے شکنجہ میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کے پاس شیر کے حکم کی تعمیل کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے اپنے بیوی بچوں اور دیگر متعلقین کو اکٹھا کیا اور ایک ایسی جگہ پر اپنے خیمہ نصب کیے جو شیر کے لشکر اور شہر کے درمیان تھی۔ شیر نے قادر شاہ پر یہ زور ڈالا کہ وہ فی الفور اپنے بیوی بچوں اور دیگر لواحقین کو بنگال روانہ کر دے اور بعد میں خود بھی وہاں چلا جائے۔ قادر شاہ نے جب یہ عرض کیا کہ اس کے پاس باربرداری کے لیے مویشی نہیں ہیں، شیر نے حکم دیا فوراً قادر شاہ کو سو اونٹ اور سو خچر مہیا کیے جائیں قادر شاہ نے ان مویشیوں پر اسباب لاد دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں سے الوداع کہہ رہا ہے مگر دوسرے روز صبح شیر خاں کو معلوم ہوا کہ قادر خاں اسے دھوکہ دے کر گجرات کی جانب بھاگ گیا۔ شجاعت خاں اس کے تعاقب میں گیا لیکن ناکام رہا۔ گجرات کی سرحد اس مقام سے سو میل سے کچھ ہی زیادہ دور تھی اور قادر خاں شجاعت خاں سے کئی گھنٹے پیشتر فرار ہو چکا تھا۔ شیر خاں شجاعت خاں کی اس لاپروائی پر بہت ناراض ہوا لیکن اس بیان میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ اس کو اجین کی فوجداری سے معزول کر دیا گیا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس کو ابھی تک اجین کی فوجداری ملی ہی نہیں تھی، مشتاقی کا یہ بیان بھی قابل اعتبار نہیں کہ شیر اور شجاعت دونوں کی سازش اور ایما سے قادر شاہ بچ کر بھاگ گیا۔ بہر حال دونوں طرف کی بازی برابر رہی۔

قادر شاہ کا گجرات بھاگ جانا مستقبل میں آنے والی مصیبت کی تمہید تھی شیر نے اپنا ایک سفیر گجرات بھیجا کہ وہ مفرور قادر شاہ کی سازشوں کو ناکام کر دے اور فوراً اجین سے روانہ ہو کر مانڈو اور دھار کی جانب چل دیا۔ شیر نے ان دونوں مقامات پر بغیر کسی لڑائی کے قبضہ کر لیا۔ عباس اور دیگر مورخین اس کے متعلق بالکل خاموش ہیں کہ شیر کی فوج نے جانب جنوب دریائے نربدا پار کیا یا نہیں، لیکن ہمارے پاس بالواسطہ اس قسم کی شہادت موجود ہے کہ شیر نے راجہ بھوپال اور معین خاں کی جاگیروں کا دورہ کیا۔ معین خاں نے اپنی مرضی سے شیر شاہ کی اطاعت قبول کی تھی اور اس کی جاگیر اس کے نام منتقل کر دی گئی تھی مگر اب شیر شاہ نے اپنی گرفت کو اور بھی زیادہ جکڑ دیا کیونکہ اس نے اس کی جاگیر کی از سر نو حسب ضابطہ پیمائش کرائی اور مالگذاری تشخیص کی۔ اب یہ طے پایا کہ جاگیردار اس علاقہ کا انتظام کرے گا۔ اور اسکی

Marfat.com

جمع میں سے انتظامیہ اخراجات اور اپنی فوج کا خرچہ جو شاہی فوج کے ساتھ رہتی ہے، وصول کر کے بقیہ آمدنی شاہی خزانہ میں جمع کرے گا۔ شیر کے لیے ہنڈیا اور سیونی علاقہ کا دورہ کرنا اس لیے اور بھی زیادہ ضروری تھا کیونکہ فوجی اعتبار سے یہ دونوں مقام بہت اہم تھے۔ مشرق میں گونڈوانہ سے اور جنوب میں ست پڑا پہاڑیوں کے دروں کے اس پار سے اس علاقہ میں ہو کر فوجی راستے جاتے تھے۔ قادر شاہ کے فرار ہوتے ہی شیر شاہ کے دماغ میں یہ اندیشہ پیدا ہونے لگا تھا کہ اس کے چلے جانے کے بعد اس خطہ میں کون کون سی پریشانیوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ خاص طور پر بیجا گڑھ اور تیر گڑھ کے راجہ بھوپال کا وسیع علاقہ جہاں گجرات، خاندیش اور مانڈو کی سرحدیں ملتی تھیں، شیر شاہ کے لیے دردسر تھا، کیونکہ شیر کی نظر میں مالوہ کے ان ذی اختیار اور بااثر جاگیرداروں کی نیک نیتی اور وفاداری مشتبہ تھی۔ اس مہم کے دوران راجہ بھوپال کا شیر شاہ کی جانب کیسا رویہ رہا، مورخین اس کے متعلق خاموش ہیں لیکن قرین قیاس تو یہ ہے کہ اس نے اطاعت قبول کر لی اور حسب معمول شرائط پر اس کی جاگیر اس کو واپس کر دی گئی اور اس کو مع اس کی فوج کے شاہی خدمت میں لے لیا گیا مالوہ کے جملہ سرداروں میں غالباً راجہ بھوپال ہی ایک ایسا جاگیردار تھا، جو تباہی اور بربادی سے بچا رہا۔ ہمارے پاس اس قیاس آرائی کے لیے کافی ثبوت ہے کہ داستانوں اور فسانوں میں جس راجہ بھوپال کا ذکر آیا ہے اور جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس نے اس علاقہ پر کافی عرصہ تک حکومت کی (حالانکہ شہر بھوپال ایک عرصہ بعد قائم ہوا تھا) وہ یہی راجہ بھوپال ہے، جس کا ذکر تاریخ میں آتا ہے۔ یہ راجہ شیر شاہ کا وفادار سردار تھا، اغلب ہے کہ ایک سال بعد جب پورنمل کا قلع قمع ہو گیا، تب رائے سین کے علاقہ کا کچھ حصہ اس کو بطور انعام دیا گیا ہو۔ بہر حال بیرم خاں اور ابوالقاسم کا شیر شاہ کے لشکر سے بیجا گڑھ کے نزدیک کسی مقام سے فرار ہونا (بیجا پور برہان پور کے شمال مغرب میں تقریباً ۶۰ میل ہے) اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ شیر نے اس علاقہ کا دورہ کیا تھا۔

مخزن کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیجے گڑھ اور مہیشور کے درمیان کسی جگہ شیر نے افغان فوج رکھی اور جب قادر شاہ مالوہ کو فتح کرنے کے لیے اس خطہ میں داخل

Marfat.com

ہوا تو شیر شاہ کے فوجدار حاجی خاں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ بیرم خاں، جو شیر کی فوج کے ساتھ تھا، ہزار ہا دقتوں کے بعد برہان پور کے نزدیک سے فرار ہو گیا۔ اس کے ساتھ گوالیار کا گورنر ابوالقاسم بھی تھا۔ دونوں گجرات کی جانب روانہ ہوئے۔ جب یہ لوگ راستے میں ہی تھے، تب شیر خاں کے سفیر نے جو اس وقت گجرات سے واپس آ رہا تھا اس خبر کو پا کر اپنے کچھ سپاہی ان کی تلاش میں روانہ کیے اور ابوالقاسم کو گرفتار کر لیا۔[1] تاریخ عارف قندھاری سے جو بیرم خاں کے ایک ملازم کی لکھی ہوئی ہے[2] اس واقعہ کے متعلق مزید وضاحت ملتی ہے کہ پہاڑی علاقہ میں گھومتے گھومتے بیرم خاں نے کن کن حادثات کا سامنا کیا۔ 'گواروں' کی ایک جماعت سے کس طرح اس کی اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ یہ گوار لوگ

---

[1] اکبرنامہ۔ ۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ فٹ نوٹ ۴۔ یہ بات قابل غور ہے کہ بیرم خاں ٹھٹھ کے نزدیک 'جُون' میں دوبارہ ہمایوں سے ملا تھا۔ اس سے بیشتر اس کی زندگی کے جو سوانح ابوالفضل نے قلمبند کیے ہیں، وہ گمراہ کن ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ . . . . گجرات سے پہلے بیرم خاں ہردوار گیا اور وہاں سے 'جُون' آیا، یہ بالکل لغو ہے۔ مسز بیورج نے ہردوار کی جگہ ماروار لکھ کر اس کی کچھ اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن بیورج کے پاس اس ردّ و بدل کی کوئی مستند وجہ نہیں ہے۔ چامر نے ہردوار کی جگہ دوارکا لکھا ہے جو یقیناً اس سے بہتر ہے۔ ابوالفضل اور عارف قندہاری کے بیانات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ بیرم خاں ہردوار گیا۔ ہماری رائے میں پہلے بیرم خاں سنبھل گیا۔ وہاں سے ہردوار گیا، پھر دوبارہ لوٹ کر قاضی سنبھل کے یہاں پناہ لی۔ یہاں سے لکھنور کے راجہ کے پاس گیا (لکھنور موجودہ لکسر ہے، جو ہردوار اور مراد آباد کے درمیان ریلوے اسٹیشن ہے۔)

یہ ایک مثال ہے کہ کس طرح ابوالفضل نے تاریخی واقعات کو غتر بود کر دیا ہے بعض مورخین نے اس کو صحیح مان لیا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے 'دوارکا' سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ وہ برہان پور سے گجرات ہوتا ہوا دوارکا پہونچا ہوگا اور وہاں سے ساحل سندھ کے لیے کشتی میں سوار ہوا ہوگا۔

Marfat.com

ناچ اور شراب میں مست تھے۔ کس طرح بیرم خاں کو تا زندگی کٹر شیعہ ہوتے ہوئے بھی، اس ناچ اور مے نوشی میں حصہ لینا پڑا۔

اس عرصہ میں رائے سین کا راجہ پورن مل اپنی جگہ مضبوط بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نگاہ میں راجپوتوں کی خودداری اور تہوری تھی۔ اسے اپنی فوج کی طاقت اور قلعہ کی مضبوطی میں واثق یقین تھا۔ اب شیر کے غیظ و غضب کا شکار بننے کو وہ تن تنہا ہی باقی رہ گیا تھا۔ لیکن اس موقع پر شیر کا غضب آشتی پذیر و صلح کن تھا۔ اسنے تحمل و بردباری سے کام لیا۔ عباس رقمطراز ہے کہ خود پورن مل نے ہی ابتدا کی پہل کی تھی۔ وہ گاگرون کے مقام پر شیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور شاہی اعزاز و خطابات حاصل کیے، جبکہ حقیقت اس کے قطعاً برعکس ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ پورن مل آخری حکمراں تھا جو شیر سے اس وقت ملا جب وہ مالوہ سے واپس ہو رہا تھا۔ یہ ممکن ہے عباس کے بیان کے مطابق ملاقات کے مقام کا نام گاگرون ٹھیک ہو۔ مگر ہم مندرجہ ذیل وجوہات سے عباس کی رائے سے متفق نہیں ہیں۔

۱۔ عباس لکھتا ہے جب شیر گوالیار سے گاگرون پہونچا اس نے شجاعت خاں کو بھائی پورن مل کو بلانے کے لیے حکم دیا۔ شجاعت خاں نے گوالیار کے سابق حکمراں رام شاہ کو پورن مل کے پاس بھیجا۔ پورن مل نے شجاعت خاں کے نام ایک تحریری پیغام دیا کہ وہ بذات خود یہاں آنے کی زحمت گوارا کرے اور اپنے ساتھ لے شیر کی خدمت میں لے جائے۔ جب شجاعت خاں رائے سین آیا تب اس نے رتنا ولی سے درخواست کی کہ وہ ازراہِ کرم پورن مل کو اس کے ساتھ جانے کی اجازت دیدے۔ بوقت رخصت رتناولی نے، جو پورن مل کو جان سے بھی زیادہ عزیز تھی، شجاعت خاں سے یہ خطاب کیا۔ "میں کھانے کی میز پر اپنے شوہر کا انتظار کروں گی۔ اس کی واپسی کے وقت تک میں قلعہ کے برج پر بیٹھی رہوں گی" شجاعت نے جواب دیا "آپ مطمئن رہیں اور یقین کریں کہ کل بھائی پورن مل ضرور آپ کے پاس آجائیں گے۔"

جب بھائی پورن مل ۶ ہزار سپاہیوں کے ساتھ وغیرہ (عباس ۲۰۶-۲۰۸، ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۳۹۲)

عباس کا یہ بیان ایک استادانہ تاریخی فسانہ بھی نہیں ہے، بلکہ یہ ایک پٹھان کٹھ پتلی کے تماشہ کی طرح ہے جس میں نہ تو وقت کی پابندی ہے اور نہ فضائے

Marfat.com

بسیط کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ محض فوجی کیمپ کی گپ بازی ہے جس میں کہ دورحال کے ایک راجپوت کی تصویر پیش کی گئی ہے کہ کس طرح ایک بہادر، محبت سے آلودہ ہوکر ایک عورت کے دامن سے وابستہ ہے۔ عباس کے بیان میں صرف اتنی ہی حقیقت ہے کہ شیر نے شجاعت خاں سے یہ کہا کہ وہ کسی سیاسی چال سے پورنمل کو اطاعت قبول کرنے کے لیے رضامند کرلے۔ اس مصالحت کے کام پر راجہ رام شاہ گوالیار کو مقرر کیا گیا، لیکن اس کا مشن بے سود رہا، پھر شجاعت خاں بڑے عہد و پیمان کے بعد پورنمل کو شیر کے پاس چلنے کے لیے رضامند کر پایا۔

(۲) اگر شیر کا یہ ارادہ تھا کہ پہلے وہ پورنمل کو مرعوب کرکے اس کو اس لڑائی سے باز رکھے تو اس کو گاگروں جانے کے بجائے گوالیار سے براہِ راست جنوب کی جانب جانا چاہیے تھا اور سرونج کے نزدیک کسی جگہ چندیری اور رائے سین کے درمیان اپنی فوج رکا دینا چاہیے تھا۔ گاگروں اور رائے سین کے درمیان تو سیدھا فاصلہ بھی تقریباً دو سو میل ہے اور اس لیے یہ بات بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ پورنمل سے شیر نے اس قدر دور دراز مقام پر بیٹھ کر صلح و مصالحت کی سلسلہ جنبانی کی ہو خصوصاً جبکہ گاگروں سے رائے سین کا راستہ سارنگ پور اور اس علاقہ کی حد سے گزرتا ہے جو دشمنوں کے قبضہ میں تھا اور جس کو ہنوز شیر شاہ زیر نہیں کر پایا تھا۔

۳۔ اگر شیر اتنے عرصہ تک گاگروں میں مقیم رہا ہوتا تو قادر شاہ کو جو اس وقت اجین میں تھا تیاری کے لیے کافی موقع مل جاتا اور اس حالت میں وہ شیر کا استقبال اپنی فوج کے ساتھ نہایت گرمجوشی سے کرتا۔ علاوہ بریں کوئی بھی مورخ یہ بیان نہیں کرتا کہ پورنمل شیر شاہ سے گاگروں کے علاوہ کسی دوسری جگہ سارنگ پور، اجین یا مانڈو وغیرہ جاکر ملا ہو۔[1]

---

[1] موجودہ نقشہ میں گاگروں جسے کہیں کہیں گاگرونی بھی لکھا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سارنگ پور سے بجانب شمال سو میل ہے (طول البلد ۷۶ — ۳۰ ۔ عرض البلد ۵ — ۲۴) ابو الفضل کے بیان کے مطابق یہاں ایک قلعہ تھا (آئین صفحہ ۲۰۹) بھان پورا چمبل سے ۲۰ میل جانب مشرق اور گاگروں سے ۴۰ میل مغرب۔ جنوب مغرب میں ہے یہ شیر کے زمانہ کی ٹکسال تھی اور غالباً نتھمبور جاتے وقت شیر کی قیام گاہ تھی۔

Marfat.com

لہٰذا زیادہ قرینِ قیاس بات یہ ہے کہ شیر نے اپنے واپسی سفر میں شجاعت خاں کی فوج کو اپنے سے علیحدہ کر دیا اور اسے حکم دیا کہ وہ رائے سین کی جانب کوچ کرے اور مصالحت کے ذریعہ پورنمل کو اطاعت قبول کرنے کے لیے رضامند کرے پورنمل تو رائے سین کے قلعہ کی فصیل کے پیچھے بیٹھ کر انتظار کر سکتا تھا لیکن شیر کی حالت اس وقت ایسی نہ تھی کیونکہ راجپوتانہ کی سرحد پر حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ پورنمل کو خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ باعزت صلح ہر حال میں بہتر ہے شجاعت خاں نے بھی اس بات کا اس کو مکمل یقین دلایا تھا پھر بھی اس کو شجاعت کی دھوکہ دھڑی کے خلاف وعدہ وعہد کے بمقابلہ اپنی تلوار پر زیادہ اعتماد تھا۔ باقی واقعہ مخزن نے صحیح صحیح بیان کیا ہے۔ اس میں رتناولی اور شجاعت خاں کے درمیان طفلانہ و ہیجان آمیز مکالمہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

"دراصل پورنمل نے شجاعت خاں کی سلسلہ جنبانی پر شیر شاہ کی خدمت میں جانا اس شرط پر منظور کیا تھا کہ پہلی ملاقات کے بعد اس کو واپس لوٹنے کی اجازت مل جائے گی۔ وہ ۶ ہزار گھوڑا سواروں کے ساتھ جن میں کسی کی بھی عمر ۴۰ سال سے زیادہ نہ تھی، شیر کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے روانہ ہوا۔ پہلی ملاقات کے وقت شیر نے اس کو ۱۰۰ گھوڑے اور کئی بیش قیمتی خلعتیں انعام میں دیں۔ پھر بوقت واپسی پورنمل نے اپنے بھائی چاند بھوج (رجتر بھوج) کو بادشاہ کی خدمت میں چھوڑ دیا۔"

شیر شاہ کے لشکر میں اس طرح جا کر پورنمل نے نہایت حوصلہ مندی اور دلیری کا ثبوت دیا کیونکہ شیر شاہ کسی اخلاقی اصول کا قائل نہ تھا۔ پورنمل نے یہ ایک ایسی مثال قائم کی جس کی کہ نقل کرنے کی شیر شاہ کبھی بھی ہمت نہ کر سکتا تھا۔ مثلاً شیر شاہ ہمایوں سے، جو یقیناً پورنمل سے زیادہ عالی وقار و قابل تعظیم تھا اس پُرامن طریقہ سے نہیں مل سکتا تھا۔ اپنے تحفظ کی پیش بندی میں پورنمل شیر شاہ سے زیادہ ہوشیار نکلا اس لیے شیر شاہ نے اپنے وعدہ پر قائم رہنا ہی مناسب سمجھا اور اپنی دریادلی و فیاضی سے اس کو اپنی جانب ملا لیا۔

مالوہ میں فوجی حکومت قائم کر کے شیر وہاں سے چل دیا۔ لیکن ابھی وہاں کی صورتِ حال اطمینان بخش نہیں تھی۔ اس کو دریا خاں گجراتی اور عالم خاں لودی

Marfat.com

(جو بالترتیب اجین اور سارنگ پور کے جاگیردار تھے) کی وفاداری پر شبہ تھا۔ حاجی خاں کو، جو کہ ایک اعلیٰ درجہ کا امیر تھا ایک دوسرے افسر کے ساتھ ۱۲ ہزار فوج کی کمان دے کر مانڈو اور دھارا کا منتظم بنا دیا گیا۔ ایک دوسرے افسر صدر خاں خار سین کو غالباً مندسور کا فوجدار مقرر کیا گیا، جو اجین سے تقریباً ۵۰ میل مغرب بہ مغرب شمال میں واقع ہے۔ شیر شاہ اس وقت خواص خاں اور شجاعت خاں دونوں میں سے کسی کو بھی مالوہ میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ان کو اپنے ہمراہ لے کر شیر شاہ گاگروں سے بوندی کے راستہ رنتھمبور کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں جا کر ہاڑا راجپوتوں کو مرعوب کرنے کے لیے اس نے ایک اور شیر گڑھ کی تعمیر کے لیے ایک جگہ منتخب کی۔ تمام سفر میں شیر شاہ کو کسی بھی جگہ کوئی مشکل یا مزاحمت پیش نہ آئی لیکن راستہ میں معین خاں اس خیال سے کہ اس کو مالوہ کے باہر نظر بند کر لیا جائے گا، پریشان ہو اٹھا۔ شیر شاہ نے فوراً ہی اس کو قید کر لیا اور اسکی ہنڈیا اور سیونی کی جاگیر ضبط کر لی۔ معین خاں کا بھائی ناصر خاں

---

[1] عباس اور مخزن نے جگہ اور مقامات کے ناموں میں گڑبڑی کی ہے۔ ڈارن لکھتا ہے "حاجی خاں اور صدر خاں خار سین مالوہ کے فوجدار مقرر کیے گئے (جلد ۱، صفحہ ۱۳۳) عباس نے دھارا میں حاجی خاں کے ساتھ جنید خاں کو بتایا ہے۔ صدر خاں تیسرا افسر ہوگا اور مندسور کے بجائے غلطی سے مالوہ لکھ گیا ہوگا۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد مبہم طور سے .... کہتے ہیں "دھار اور مغربی علاقہ حاجی خاں کو دیا گیا"۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس مہم کے دوران افغانوں کا قبضہ چندیری پر ہو گیا اور یہ راجہ کے بھتیجے کو دیدیا گیا لیکن یہ غلط ہے (دیکھیے ہمایوں صفحہ ۱۶۷) یہ بات دوسری مہم کے متعلق سچ ہو سکتی ہے۔

[2] عباس لکھتا ہے "رنتھمبور جاتے ہوئے راستہ میں سے ہی سکندر خاں میانہ (معین خاں) جو سیونی کا حکمراں تھا بھاگ گیا۔ (قلمی نسخہ صفحہ ۲۳) لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ مخزن یا کسی دیگر ذرائع سے اس واقعہ کی تائید نہیں ہوتی۔ معین خاں قید کر لیا گیا تھا اور میانہ پٹھانوں نے انتقام کی قسم کھائی تھی۔ اس کے بعد ناصر خاں نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا اور ۶ ماہ بعد ایک معرکہ کی لڑائی میں شجاعت خاں کی کسی طرح جان بچ گئی۔ ناصر خاں کا خیال تھا کہ وہ شجاعت خاں کو معین خاں کی ضمانت کے بطور اپنی حراست میں رکھے گا لہٰذا رنتھمبور

Marfat.com

معین خاں کی فوج کی ایک ٹکڑی کے ساتھ جان بچا کر بھاگ نکلا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شجاعت خاں کو دوبارہ مالوہ بھیجنا پڑا کہ مبادا وہاں بغاوت ہو جائے۔ ہنڈیا اور سیونی کا علاقہ اس کو بطور جاگیر دیدیا گیا اور چار ہزار فوج کا مزید اضافہ اس کی کمان میں کیا گیا۔ میانہ افغانوں کے ساتھ شیر کی جارحانہ کارروائی اس بات کی دلیل ہے کہ سیاست میں خون کا رشتہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔

رنتھمبور کا مشہور و معروف قلعہ جس پر کبھی چوہان راجپوتوں کو ناز تھا اب بوندی کی سرحد سے ملحق جے پور ریاست میں ہے۔ چتوڑ کے ساتھ ساتھ اس قلعہ پر بھی بہادر شاہ کا قبضہ ہو گیا تھا۔ تب سے یہاں ایک گجراتی فوج رہتی تھی، جس کا کمانڈر ایک اعلیٰ افسر ابوالفراعثمان خاں تھا جسے خانخاناں کا خطاب حاصل تھا۔[1] بہادر شاہ کے انتقال کے بعد قلعہ کا کمانڈر قادر شاہ سے مل گیا۔ یہ قلعہ اپنی حفاظت کے لیے اب بھی اتنا ہی مستحکم اور پائیدار تھا جتنا کہ پہلے تھا لیکن گجراتی خانخاناں عالم ضعیفی میں دلیر نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شیر نے قلعہ میں بڑے شیریں گفتار سفیر بھیجے اور نہایت ہی پرامن طریقہ سے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔[2] شیر، قادر شاہ کی طرح سخی اور کمزور دل نہ تھا۔ اس نے خانخاناں کو بلا تکلف قلعہ سے باہر نکال دیا۔ اس کے بعد تاریخ کے صفحات میں اس کا کہیں ذکر نہیں آتا ہے۔ شیر نے رنتھمبور کی طاقت کا بہت اچھی طرح اندازہ لگایا تھا اور اسے اپنے سب سے بڑے لڑکے عادل خاں کے حوالہ کر دیا۔ ۱۵۴۲ء کی برسات کے شروع میں شیر آگرہ واپس لوٹ آیا۔ یہ وہ وقت تھا جب خانہ بدوش ہمایوں تاج و تخت سے محروم، مارواڑ کی سرحد پر ریگستان سے ہو کر ڈیراول کی جانب بڑی مشکل سے سفر کر رہا تھا۔

کے راستہ میں سے کوئی نہ کوئی ضرور مفرور ہوا ہوگا۔ یہ معین خاں نہ ہو کر اس کا بھائی نامرخاں ہو سکتا ہے۔ مخزن نے آگے چل کر لکھا ہے کہ معین خاں کو مرزاؤں کے ایما پر قتل کر دیا گیا ڈارن کی تاریخ میں میانہ کی جگہ مرزا غلطی سے لکھا گیا ہے (ڈارن جلد ا صفحہ ۱۳۴) کیونکہ معین خاں کے قتل میں کسی مرزا کی کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ کام اسکے خاندان والے اور رشتہ دار ہی کر سکتے تھے، جن سے اس کے تعلق اچھے نہ ہوں۔ بہرحال معین خاں قید ہونے کے بعد تاریخ میں گمنام ہو گیا۔ اگر مخزن کا یہ بیان درست ہے تو حقیقتاً شیر کا یہ فعل نہایت ناجائز اور سفاکانہ تھا۔

[1] عباس صفحہ ۲۱۳۔

[2] نظام الدین نے لکھا ہے "سلطان محمود خلجی کے افسروں میں سے..." (دیکھیے طبقات صفحہ ۲۲۱)

Marfat.com

باب 14 کا ضمیمہ ۱

سکندر خاں میانہ اور راجہ بھوپال کا علاقہ

ہنڈیا اور سیواس میں سکندر خاں میانہ کی جاگیر کے تعین میں مجھے پریشانی محسوس ہو رہی تھی۔ لہٰذا ۱۹۲۱ء میں اس کے متعلق سرکار (سرجادو ناتھ سرکار) نے مندرجہ ذیل جغرافیائی نوٹ جوڑ دیا تھا۔

فارسی تواریخ میں معین خاں بن سکندر خاں کی جاگیر کو ہنڈیا اور سیواس کی جاگیر بتایا ہے۔ ہنڈیا دریائے نربدا کے جنوبی کنارے (۳۱-۷۷ مشرق، ۳۰-۲۲ شمال) میں مشہور و معروف جگہ ہے۔ سیواس غالباً غلطی سے ستواس کے بجائے لکھ دیا گیا ہے۔ ستواس نربدا کے شمال اور ہنڈیا سے ۲۰ میل جانبِ مغرب واقع ہے۔ کاتب کی کسی غلطی کو مان کر ہم دیواس کو سیواس نہیں تسلیم کر سکتے ہیں کیونکہ دیواس نام کا ایک بڑا شہر ہنڈیا سے بجانب شمال مغرب کافی فاصلہ پر اجین کے نزدیک ہے۔ دیواس نام کی دوسری جگہ بہت چھوٹی ہے، جو ہنڈیا سے بجانب جنوب ۶ میل ہے۔ فارسی قلمی نسخوں میں سکندر کے نام کے ساتھ ستواسی لکھا ہوا ہے میواتی نہیں۔ آئین اکبری میں دیواس اور ستواس نام کے دو محال ہیں۔ کیا یہ جگہ سیونی ہو سکتی ہے (دیکھیے سرجادو نارناتھ سرکار شیر شاہ صفحہ ۲۶۲)

اب کی بار جب میں تمام تواریخی مواد کا از سرِ نو مطالعہ کر رہا تھا، میں نے دیکھا کہ عباس نے ایک جگہ معین خاں کو سیونی کا حکمراں بتایا ہے (سرکار قلمی نسخہ ۲۱۳) ۱۹۲۰ء میں یہ بات میری نظر سے اوجھل ہو گئی تھی اور اس لیے میں سرجادو ناتھ

Marfat.com

سرکار کی توجہ اس طرف نہ دلا سکا۔ یہ میرے سن رسیدہ استاد کی تاریخی اہلیت کی دلیل ہے۔ انہوں نے غلطی نہ کی۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی اعتراض نہیں کہ سیونی کو ہی صحیح جگہ تصور کر لیا جائے۔ آئین میں ستواس اور دیواس کی طرح سیونی کو سرکار ہنڈیہ کی ایک محال بتایا ہے (آئین جلد ۲ صفحہ ۲۰۷) دریائے نربدا کے جنوب میں واقع ہونے کی وجہ سے اس کا جائے وقوع معین خاں کی جاگیر کی تفصیل سے زیادہ میل کھاتا ہے۔

عباس کے قلمی نسخہ میں لکھا ہے "بھوپال کہ ولایت بیجے گڑھ واز تماہا در تصرف او بود" (صفحہ ۲۰۷) ایلیٹ نے اپنے ترجمہ میں مہیشور کو بھوپال کا راجہ بتایا ہے۔ میں اس کے مقابلہ سرکار کے قلمی نسخہ عباس کو زیادہ درست مانتا ہوں۔ میری کتاب "شیر شاہ" کے شائع ہونے کے بعد پروفیسر ہودی والا نے ایلیٹ کی غلطی کی اصلاح کی ہے۔ پروفیسر موصوف نے لکھا ہے "عباس کا اس تحریر سے اصل منشا یہ تھا کہ مہیشور کا راجہ بھوپال تھا" پروفیسر صاحب کو یہ بھی شبہ ہے کہ نمہار کی جگہ غلطی سے "تماہا" لکھ دیا گیا ہے۔ اصل جگہ "نمار" ہے۔ بیجے گڑھ اسی ضلع میں مانڈو سے تقریباً ۶۰ میل بجانب جنوب اور برہان پور سے شمال مغرب اتنے ہی فاصلہ پر واقع ہے (اسٹڈیز ۴۵۵-۴۵۶)

مجھے ایلیٹ کی عبارت میں پروفیسر ہودی والا نے جو اصلاح دی ہے، پسند ہے۔ لیکن میں موجودہ نقشہ میں تماہا اور نمار کی جگہ مہیشور کو ترجیح دیتا ہوں۔ یہ وہی جگہ ہے، جسے آئین میں سرکار مانڈو کی "چولی مہیشہ" محال بتایا گیا ہے (آئین جلد ۲ صفحہ ۲۰۶) اور یہ راجہ بھوپال کا صدر مقام تھا۔ میری اس بات کی تائید مزید اس بات سے ہوتی ہے کہ مہیشر دریائے نربدا کے جنوبی کنارے سے نزدیک ہے۔ شمال میں مانڈو اور جنوب میں بیجے گڑھ سے اس کا فاصلہ قریب قریب برابر ہے اور اس وجہ سے مانڈو کے خالی تخت پر اس مقام سے قبضہ کرنا زیادہ آسان تھا۔

ڈاکٹر ایشوری پرشاد اپنی قدیم فرسودہ بات پر ہی بضد ہیں اور ان مقامات کو ہنوز تماہا اور سیواس ہی لکھتے ہیں (ہمایوں صفحہ ۱۶۵)

Marfat.com

باب 14 کا ضمیمہ 2

شیر کے مالوہ پر حملہ کرنے کی تاریخ

پہلے میرا یہ خیال تھا کہ محرّم ۹۴۹ ہجری کے آغاز میں مطابق اپریل ۱۵۴۲ء شیر مالوہ کی مہم پر روانہ ہوا۔ (شیر شاہ صفحہ ۲۵۴) اب واقعات کا از سرِ نو مطالعہ کرنے کے بعد میں اپنے اس خیال کو مسترد اور متروک سمجھتا ہوں۔ مندرجہ ذیل وجوہات میری پرانی رائے کی تردید میں پیش نظر ہیں۔

میں نے شروع میں ۹۴۹ ہجری اس وجہ سے لکھا تھا کہ نظام الدین (ص ۲۳۱) فرشتہ (صفحہ ۲۲۷) اور مخزن (صفحہ ۴۳) سب ہی اس تاریخ پر متفق تھے۔ علاوہ بریں گوالیار اور اجین کی ٹکسال سے جو سکّے دستیاب ہوئے تھے وہ بھی اس بات کی تصدیق کرتے تھے۔

زیادہ تر مورّخین نے سلسلہ واقعات کو ترتیب دینے میں عبّاس کی نقل کی ہے اور رائے سین پر قبضہ کرنے تک کے واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ بلاشبہ رائے سین کی فتح ۹۴۹ ہجری کے آخری نصف دور میں ہوئی لیکن مالوہ کی فتح کے لیے شیر شاہ کو دو بار حملہ کرنا پڑا۔ پہلا حملہ ۹۴۸ھ ہجری کے آخری نصف دور میں ملوخاں عرف قادر شاہ کے خلاف ہوا دوسرا حملہ پورنمل کے خلاف ہوا۔ ان دونوں حملوں کے درمیان شیر شاہ بہار میں بیمار رہا۔ عبّاس نے لکھا ہے کہ بیماری کی بے ہوشی میں شیر نے پورنمل سے انتقام لینے

Marfat.com

کی قسم کھائی تھی اور بڑی بڑی توپیں ڈھلوائی تھیں۔ مالوہ کی ان دو مہموں کے درمیان، جو ۹۴۹ ہجری کے پہلے نصف دور میں ہوئیں، تقریباً ۶ مہینہ کا وقفہ تھا۔ لیکن اس وقفہ کے دوران شیر کی علالت وقسم مورخ کی ایجاد تخیل ہے کیونکہ اس عرصہ میں مالدیو کی سازشیں اور اس کے علاقہ میں مفرور ہمایوں کا داخلہ شیر کے تاج وتخت کے لیے باعثِ ہیجان وتفکر تھا اور شیر مع اپنی فوج کے، ناگور سے مارواڑ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ تعجب انگیز بات ہے کہ عباس (نسخہ صفحات ۲۳۲، ۲۳۳) اور مخزن (نسخہ صفحہ ۹۴) دونوں نے ہی شیر شاہ کے خلاف ہمایوں اور مالدیو کی سازش جیسے اہم واقعہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ شیر کا پہلا حملہ ۹۴۸ ہجری کے آخری دور میں ہوا اور دوسرا حملہ ۹۴۹ھ ہجری میں ہوا۔ لہٰذا میں نے اپنی پہلی تصنیف "شیر شاہ" میں مالوہ کے حملہ کی پہلی تاریخ غلط لکھی ہے۔ سکوں سے محض یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۹۴۹ھ ہجری اس کی آخری حد تھی، نہ کہ ابتداء، جیسا کہ کچھ مورخوں نے بتانے کی غلطی کی ہے۔

(۲) شیر شاہ کے پہلے ایڈیشن میں میں نے اس جگہ کا نام واضح نہیں کیا، جہاں سے شیر نے مالوہ پر پہلا حملہ کیا تھا، حالانکہ عباس نے صاف لکھا ہے کہ شیر نے بنگال سے آگرہ جاتے وقت اپنی فوج کو گوالیار اور مانڈو کی جانب موڑ دیا۔ اسی وقت اس کو شجاعت خاں سے ایک خط ملا تھا، جس میں لکھا تھا " افغان بالائے قلعہ گوالیار ومغلاں در لشکر آمدید"۔ بزبان ہندی اس کا مطلب ہے کہ افغان لوگ قلعہ میں داخل ہو گئے اور مغل لوگ چھاونی میں آ گئے۔ اگر یہ بات درست ہے، تو پھر ابوالقاسم کی وہ تحریر بے معنی ہو جاتی ہے، جس کا کہ بعد میں ذکر آیا ہے کہ ابوالقاسم نے یہ وعدہ کیا کہ شیر کے وہاں پہونچنے پر قلعہ اس کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ لہٰذا میں نے یہ پورا جملہ مسترد کر دیا، کیونکہ اس سے کوئی خاص مطلب نہیں نکلتا۔ لیکن اگر تاریخی واقعات کی صداقت معلوم کرنے کے لیے ہم اس اصول پر کاربند ہوں کہ اگر کسی بیان کا ایک جز صریحاً غلط ہے، تو اس کو سالماً مشتبہ اور مسترد تصور کر لینا چاہیئے تو عباس، مخزن اور اکبر نامہ (ماقبل تخت نشینی اکبر) کی سند بالکل بے معنی ہو جائے گی، اور ان میں کچھ بھی باقی نہ رہ جائے گا۔ اس قسم کے سخت

Marfat.com

اصول کا اطلاق عالی مرتبہ امام بخاری کے لیے تو موزوں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے حدیث کی تحقیق کرتے وقت یہ اصول مقرر کیا تھا کہ اگر کوئی مصنّف ایک مرتبہ دروغ گوئی کرتا ہے تو اسے ہمیشہ دروغ گو سمجھنا چاہیئے اور اگر کسی مقولہ یا روایت کا کوئی جز مشتبہ ہے تو اس سالم مقولہ کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ لیکن روز مرّہ کی زندگی میں کسی بھی انسان کے قول و فعل پر یہ اصول عائد نہیں ہو سکتا۔ اس کی کچھ باتیں سچ بھی ہو سکتی ہیں اور کچھ باتیں جھوٹ۔ ہمیں قرونِ وسطیٰ کے مورخین کے بیان کے ہر جز کو تحقیق کی نظر سے دیکھنا ہوگا اور جھوٹ و سچ کی آمیزش میں سے سچائی کے ہر دانہ کو علیحدہ کرنا ہوگا۔ اسی کسوٹی پر عباس کو پرکھنے کے لیے مندرجہ ذیل واقعات ظہور میں آتے ہیں۔

۱۔ شیر بنگال سے آگرہ کے لیے نہیں بلکہ گوالیار اور مانڈو کے لیے روانہ ہوا۔

۲۔ جس وقت شجاعت خاں نے شیر کو پیغام بھیجا، اس وقت مغل فوج گوالیار کے قلعہ سے باہر نہیں آئی تھی۔

(۳) شیر نے مالوہ پر پہلا حملہ ۹۴۸ ہجری کے آخری نصف میں کیا۔ یہ ممکن ہے کہ مالوہ سے روانہ ہونے سے پیشتر ۹۴۹ ہجری (جو ۱۷ اپریل ۱۵۴۲ء کو شروع ہوتا ہے) کے ایک یا دو ماہ گزر گئے ہوں۔

(۴) میں نے پہلا حملہ اپریل مئی ۱۵۴۲ء کے دوران بتایا تھا۔ (۲) یہ وقفہ نہایت ہی قلیل ہے۔ اس قلیل عرصہ میں وہ سب واقعات سرزد نہیں ہو سکتے جن کا مورخین نے بیان کیا ہے۔ لہٰذا یہ تاریخ بھی درست نہیں ہے اور اسی لیے اس ایڈیشن میں تاریخوں کو بدلنا ضروری ہو گیا تاکہ واقعات کو صحیح طور پر سمجھا جا سکے۔

Marfat.com

باب 15

ریگستان کا سایہ

راجپوتانہ کا ریگستان اور اس کے باشندے

راجپوتانہ کا یہ ہیبتناک ، ویعنی ریگستان اراولی سلسلہ کے مغربی دامن اور گجرات۔ سندھ کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ زمانہ قدیم سے اس خطہ کی وجہ سے وقتاً فوقتاً شمالی ہند کی سیاست پر تاریکی چھاتی رہی ہے۔ یا تو یہاں کے خانہ بدوش قبائل ہندوستان کے باہر اور اندر گھومتے پھرتے رہے ہیں اور ہندوستان کی سیاست کو درہم برہم کرتے رہے ہیں، یا یہاں کے ریگ۔۔ان کو بآسانی پار کر کے غیر ملکی حملہ آور ملک کے حفظ امن کو تہ و بالا کرتے رہے ہیں۔ اس ریگستان کو پار کرنا اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ کسی خشک کھائی کو۔ اس وجہ سے سلطنت ہند کو ہمیشہ یہ ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے کہ اقتصادی جوکھم کو برداشت کر کے اور بے حد فوجی خسارہ سہہ کر تحفظ ملک کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس خط پر اپنی مضبوط گرفت قائم رکھے۔ اسی ریگستان کے پار سے یا اسی خطہ سے ، ویں صدی میں گورجر، پرتیہار، راشٹر کوٹ قبائل شمالی ہند کی زرخیز گھاٹیوں میں داخل ہوئے تھے اور آئندہ صدیوں میں مسلم حملہ آور بھی اسی راستہ سے وقتاً فوقتاً ہندوستان پر اچانک حملہ کرتے رہے۔

راجپوتانہ کے ریگستان میں نہ صرف ریگ کے ذرّے ہی منتشر ہوتے

Marfat.com

رہے ہیں، بلکہ وہاں کی غارت گر خانہ بدوش آبادی بھی بلوچستان کے ریگستان اور کوہ سلیمان کے ڈھالوں سے آتی جاتی رہی ہے۔ چنانچہ اس ریگستان کے گہوارہ میں ہندوی اقوام کے نسلی تنوع کی ایک متواتر تغیر پذیر شبیہ کھنچ کر رہ گئی ہے۔ بالخصوص اس لیے کہ یہاں مختلف جماعتوں اور قبائل کے تہوں، کا مجموعہ یکسر ہو چکا تھا۔ اس میں سیاسی اور سماجی یک رنگی پیدا ہو چکی تھی پھر بھی اس ریگستان کے ہمعصر باشندوں کے نسلی اوصاف اور ان کی بول چال، انکی انفرادیت کو نمایاں کرتی رہی۔ قرونِ وسطیٰ میں یہ خطہ دل کش کم اور تکلیف دہ زیادہ تھا۔ ریگستان کے دائرے کا ہر ذرہ علی الدوام برسرِ پیکار تھا۔ اگرچہ اس کے باشندے مہذب نسل کے تھے، مگر شومیِ بخت نے ان کو خانہ بدوش اور نانِ شبینہ کا محتاج بنادیا تھا۔ یہاں نہ تو کافی بارش ہی ہوتی تھی اور نہ پیداوار ہی وافر ہوتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ اکثر قحط اور ٹڈی کی وبا نازل ہو جاتی تھی۔ بایں ہمہ اراولی کے پہاڑوں کی بہ نسبت ریگستان راجپوتوں کی آزادی کا بہتر مسکن ثابت ہوا۔[1] قرونِ وسطیٰ میں تھال یعنی اصل ریگستان میں مارواڑ، بیکانیر، جیسلمیر، بہاولپور (جو کہ پہلے ڈیراول کے بھاٹیوں کا صدر مقام تھا) اور تھاں پرکر شامل تھے۔ یہ علاقے رہزنوں کے لیے بہشت تھے اور آج بھی ہیں۔ یہاں ایسے لوگ رہتے ہیں جو کہ خدا اور شیطان دونوں سے ہی ٹکر لینے کو آمادہ رہتے ہیں، تاہم ہندوستان کی تاریخ میں اس ریگستان کی ایک خاص اہمیت ہے۔ یہ ملک کے بہترین جانبازوں کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کی جیتی جاگتی تہذیب قرونِ وسطیٰ کے راجپوتی سماج پر تب تک حاوی رہی، جب تک کہ راجپوت وہ نہ رہے جو کہ پہلے تھے، یا جیسی کہ ان سے امید کی جاتی تھی۔ ریگستان کا چارن (بھاٹ)، اس تمدن و تہذیب کا محافظ و علمبردار تھا اور بہادر راجپوت سورما اس کا قدرتی ثمر۔

اگر اس سے پیشتر نہیں تو کم از کم دسویں صدی سے تو پرتی ہارہ سولنکی چوہان پرمار اور بھاٹی ریگستان پر اپنا اقتدار جمانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اس

---

[1] مغل سلطنت میں آگرہ ضلع میں کیرولی کا راجہ بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ وہ ۵۶ کروڑ

Marfat.com

سے بہت پہلے یودیہا (جوہیا) راجپوت اور سندھ کی وادی میں رہنے والے اور دیگر قبائل مثلاً کھوکھر وغیرہ اس سرزمین میں داخل ہو چکے تھے اور اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر چکے تھے۔ بھاٹی لوگ دو شاخوں میں تقسیم ہو کر یہاں آئے پہلی مرتبہ ہیمہا یادو جو جنوب سے آئے اور آج تک وہاں موجود ہیں اور دوسری مرتبہ غزنی سے آئے جب اس خطہ میں اسلام کا زور شروع ہو گیا تھا۔ بھاٹی لوگ جو ویدک زمانہ کے یادو قبیلہ سے اپنا تعلق بتاتے ہیں کسی زمانہ میں تعداد میں سب سے زیادہ تھے اور دور دراز ریگستان اور پنجاب کے زیادہ تر حصوں میں ان کی حکومت تھی۔ راٹھور لوگوں کے عروج نے ریگستان میں ان کا اقتدار ختم کر دیا۔ راٹھور لوگوں کی ابتدائی تاریخ تاریکی میں پوشیدہ ہے۔ ۱۶ ویں صدی سے ماقبل، مغربی راجپوتانہ کی تاریخ باہمی جنگ و جدل، خبیث جرائم اور عورتوں کے جوہر کی ایک مسلسل داستان ہے۔ اس عرصہ میں زراعت و تجارت تباہ ہونے سے عوام کی زندگی نہایت پریشانی کی تھی۔

شور و غل، جنگ و جدل، شراب و افیون، عورت و موسیقی اس زمانہ کی راجپوت سوسائٹی کے نمایاں شوق تھے۔ جب کسی راجپوت کے سامنے خاندانی انتقام یا موروثی زمین کی حفاظت کا سوال در پیش ہوتا تو حب الوطنی اور قومی ایثار کا جذبہ قبیلائی یا علاقائی ہو جاتا تھا۔ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ سے انتقام لینے کے لیے غیر ملک و مذہب کے حملہ آور کی مدد لینے سے گریز نہ تھا۔ تمام راجپوتانہ باہمی

جادو لوگوں کا سردار ہے حالانکہ وہ ۵۶ ہزار لوگوں کا بھی حکمراں نہ تھا۔ جیسلمیر کے بھاٹی اپنے کو چھتر اعلیٰ یعنی شاہی چھتر کے مالک کہتے تھے اور ایک روایت کے مطابق ان کے پاس ۴ چھتر یعنی حکومت کے صدر مقام تھے۔ (۱) دہلی یعنی اندر پرستھ (۲) غزنی (۳) جیسلمیر جیسلمیر کے بھاٹی لوگ کسی وقت ۹ گڈھوں پر حکومت کرتے تھے۔ مثلاً جیسلمیر، پوگل برسال پورہ من، ابھن، ڈیراور، کہرور، اسنی کوٹ اور ماروٹ (ذیلی کمیات۔ جلد۲ صفحہ ۱۶۲) ماروٹ دہلی ملتان کے کارواں کے راستہ پر ایک مشہور مقام تھا۔ موجودہ بہاولپور شہر سے ۹۰ میل مشرق میں تھا۔ (ہودی والا۔ ا سٹڈیز۔ صفحہ ۲۲۴)

Marfat.com

کشمکش و خانہ جنگی کا شکار تھا۔ کہیں سولنکی پرمار کے خلاف تھے تو کہیں پرمار بھاٹیوں کے۔ کہیں پرتی ہار اور چوہانوں میں رسّہ کشی تھی تو کبھی راٹھور آپس میں اور کبھی دوسرے قبیلوں کے خلاف آمادۂ پیکار تھے۔ راٹھوروں کی ابتدائی تاریخ ان کی طاقت کے ارتقاء و اقتدار کی کہانی ہے، جو اس قسم کی غداری اور جرائم سے پُر ہے، جسے پڑھ کر آج بھی انسان خوف و نفرت سے لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔

راجپوتانہ میں آنے سے پہلے جنگجو راٹھور قبیلہ دریائے گنگا کے مغرب میں قنوج کے علاقہ میں رہتا تھا۔ یہ لوگ ایک زیادہ محفوظ جگہ کی تلاش میں موجودہ مارواڑ کے خطّہ میں آئے تھے اور غالباً یہ راجپوتانہ کی تاریخ کا آخری "انقلاب" تھا۔ راٹھوروں کی یہ ہجرت تیرھویں صدی کے تیسرے عشرہ میں یعنی التتمش کے عہدِ حکومت میں ہوئی۔ گنگا کے میدان میں آباد یہ راجپوت قوم اپنی آزادی کھو چکی تھی۔ قدم قدم پر اس کے مذہب کی توہین کی جاتی تھی۔ التتمش نے تمام سندھ اور راجپوتانہ کی خاص خاص ریاستوں کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملا لیا تھا۔ اس سے ان شکست خوردہ راجپوتوں کو اپنا عزم و حوصلہ و جوہر دکھانے کا نیا راستہ مل گیا۔ میواڑ کے راٹھوروں کا آبائی وطن "کھور" ہے یہ ضلع فرخ آباد، تحصیل قائم گنج میں شمس آباد سے ۳ میل ہے۔ ۱۲۲۵ء میں سلطان شمس الدین نے 'کھور' کو تہ و بالا کر کے اس کے کھنڈرات پر موجودہ قصبہ 'شمس آباد' آباد کیا۔ اس کا منشا راٹھور لوگوں کو دبائے رکھنا تھا۔ راؤ سنہاجی نے اپنے قبیلہ کے دو سو سپاہیوں کو ساتھ لے کر آبائی وطن کو خیر باد کہا اور یہ سب پشکر اور دوارکا کی زیارت کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستہ میں پالی اور بھینمل کے ستم زدہ براہمنوں نے ان سے یہ درخواست کی کہ وہ اس علاقے کے غنڈوں سے انکی حفاظت کریں۔ اِس اپیل کا نتیجہ یہ ہوا کہ راؤ جی نے ان جرائم پیشہ لوگوں کے خلاف تلوار اٹھائی اور جلد ہی وہاں ایک ریاست کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بڑے لڑکے استھان جی نے کھیر کے حکمران گوہل قبیلہ کے خلاف دھابی راجپوتوں سے سازش کی اور جس رات کھیر کی شہزادی سے اس کی شادی ہو رہی تھی، اس نے دھوکہ دے کر دھابی اور گومل دونوں سرداروں کا صفایا کر دیا اور کھیر پر قبضہ کر لیا۔ ٹھیک اسی طرح اس نے ایدر کے حکمران کو

جس کے ساتھ اس کے وزیر نے دنا کی بھی تلوار کے گھاٹ اتارا اور ایدر پر قبضہ کر لیا۔
منڈور موجودہ جودھپور سے چند میل کے فاصلہ پر ہے۔ آٹھ پشتوں تک راٹھوروں
اور پرماروں کے بیچ یہ بنائے مخاصمت بنا رہا۔ لیکن نویں پشت میں مسلمانوں سے
خائف ہو کر پرہاروں نے راٹھوروں سے صلح کر لی اور راؤ چنداجی کو منڈور
جہیز میں دیدیا۔ ناگور میں ایک کھوکھر راجہ حکمراں تھا۔ اس کی بیوی کی بہن راؤ چنڈاکو
بیاہی تھی۔ راؤ اپنی سالی سے ملنے کا بہانہ کر کے ناگور گیا اور وہاں پہونچ کر دغابازی
سے اپنے ساڑھو کو قتل کر ڈالا اور ناگور پر اپنا تسلط کر لیا۔[1]

لودی سلطنت کی بنیاد کے ساتھ ساتھ ہی جودھپور کی راٹھور سلطنت کا
آغاز ہوا۔ راؤ چنڈا کے پوتے اور رنمل کے لڑکے راؤ جودھا نے سسودیہ راجپوتوں
سے اپنے والد کے قتل کا انتقام لینے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اس کی کوشش میں
تقریباً تمام موروثی سلطنت اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ ۱۵ سال کی سخت مصیبت
اور متواتر جد و جہد کے بعد ۱۴۵۳ء میں اس نے منڈور پر دوبارہ قبضہ کر لیا پھر چار سال
کے قلیل عرصہ میں اس نے سسودیہ راجپوتوں کو ہرا کر اپنے باپ دادا کی کھوئی ریاست
کو پھر سے حاصل کر لیا۔ ۱۴۵۸ء میں مذہبی عقائد کے مطابق منڈور کے مقام پر اسکی رسم
تاجپوشی ہوئی۔ ایک سال بعد اس نے منڈور سے ۶ میل جنوب میں اپنے لیے ایک
نئے صدر مقام جودھپور کی بنیاد نہایت ہی بے رحم رسم سے ڈالی۔ ماہ جیٹھ طلوع مہتاب
کی ۸ تاریخ مطابق ۱۵۱۶ بکرمی اس نے ایک چمار کی دیوی چامنڈا کے قدموں پر
قربانی کی۔ یہ دیوی اس علاقہ کی الاتر مقدس دیوی تھی۔ اس کے تین روز بعد
اس چمار کی لاش کو قلعہ کی بنیاد میں رکھا گیا اور پھر پانچ روز بعد قلعہ کے اندا
پھاٹک کی تعمیر کی ابتدائی رسم ادا کی گئی۔ شاید راؤ جودھا کی زندگی کا سب سے مکروہ
سیاہ کارنامہ تھا اپنے داماد اجیت کو قتل کرنا جو چاپر اور درینرا کا موہل راجپوت
سردار تھا (یہ علاقہ اب جودھپور کا ملانی پرگنہ ہے) اس نے دھوکہ سے اپنے داماد

---

[1] منڈور یا منڈا ور پر قبضہ کے متعلق دیکھیے نینسی کی کھیات جلد ۱۔ صفحہ ۲۳۰ فٹ نوٹ۔ اس کا
بیان کچھ اور ہی ہے۔ چنڈا نے کس طرح کھوکھر سرداروں کو قتل کیا۔ دیکھئے وہی جلد ۲ صفحہ ۶۱۔

Marfat.com

کو منڈور بلوا لیا اور اس موقع کی تاک میں تھا کہ اس کے تمام موہل ساتھیوں کو قتل کر دے۔ اجیت کی ساس کو' جو کہ ایک بھاٹی راجکماری تھی' اپنے شوہر کے ناپاک ارادوں کا پتہ چل گیا۔ اس نے کسی طرح اجیت کو جودھپور سے باہر نکال دیا۔ راؤ جودھا نے موہل سرداروں کا تعاقب کیا۔ جنیدا کے نزدیک ایک لڑائی میں ۵۴ راجپوت مع اپنے بہادر آقا اجیت کے ہلاک ہو گئے۔ راؤ جودھا کی لڑکی راج بائی اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہو گئی۔ راٹھور لوگ ان بہادروں کی خاک کو اپنے پیروں سے روندتے ہوئے موہل کے علاقہ میں داخل ہو گئے۔ قرون وسطیٰ میں ایک راجپوت حکمراں اپنے ذاتی مفاد کے لیے کس درجہ ظالم و سفاک ہو سکتا ہے' اس کی یہ ایک واضح مثال ہے [1]

راؤ جودھا کا بھائی راؤ بیکا اپنے لیے ایک خود مختار ریاست کی تلاش میں اپنے وطن سے روانہ ہوا۔ وہ جنگل دیس (موجودہ بیکا نیر ریاست) کے جاٹوں اور بھاٹیوں کو ختم کر کے اپنی خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔ راجپوتوں کی جارحانہ حرکت کے تین قدم ہوتے تھے۔ پہلے تو وہ ایک خوف زدہ مہاجر کے بھیس میں کسی علاقہ میں آباد ہو جاتے تھے' اس کے بعد وہ اس علاقہ کے جائز حکمرانوں کے بیچ باہمی نفاق و حسد کے بیج بوتے تھے اور آخر میں اپنے معاون و مددگار کو قتل کر کے ان کے ملک و ریاست پر قبضہ کر لیتے تھے۔ سلطنت بیکا نیر کی بنیاد بھی اسی طریقہ پر پڑی۔ یہ جنگل دیس کے جاٹوں کی سلطنت جمہوریہ کی خاک سے پیدا ہوئی۔ یہ علاقہ مارواڑ ریگستان کی شمالی سرحد پر ہے۔ بیکا کا پہلا ٹھکانہ جنگل دیس میں "کورم دیسار" مقام تھا (یہ ایک خود مختار ریاست کا صدر مقام تھا) ۱۴۷۲ء مطابق ۱۵۲۹ء بکرمی میں

---

[1] راؤ جودھا کی غداری کے لیے دیکھئے نینسی کی کھیات جلد ۱ صفحہ ۱۹۳۔ پنڈت وشونا تھ نے اپنی عالمانہ تصنیف "میواڑ کے اتہاس" میں اس واقعہ کا ذکر اس انداز سے کیا ہے' جو تنقید و تبصرہ کی کسوٹی پر کھرا نہیں اترتا۔ پنڈت جی راجپوت دربار کے درباری مورخ تھے۔ ان کا بیان معتبر نہیں مانا جا سکتا۔ ہمیں اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار ہے کہ راؤ جودھا گیا' بنارس' پریاگ وغیرہ مقدس مقامات کی زیارت کے لیے گیا تھا۔ یہ سب نینسی کی جدت طبع ہے۔

Marfat.com

راؤ بیکا اس مقام پر تخت نشین ہوا۔ وہ یہاں "گودرا" جاٹوں کی مدد کرنے آیا تھا، جن کی کہ 'سہارن، جاٹوں سے عداوت تھی۔ 'بھارنگ' کے سہارن جاٹ گودرا جاٹوں کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکے[1] اس لیے کہ راؤ بیکا گودرا جاٹوں کا مددگار تھا انہوں نے سوائی کے نرسنگھ جاٹ کو اپنی مدد کے لیے بلایا۔ چالاک راجپوتوں نے "بھارنگ" کے سہارن جاٹوں میں نفاق پیدا کر دیا اور راؤ بیکا کے چچا 'کندھل' کو اپنی اعانت کے لیے بلایا۔ چچا اور بھتیجے دونوں نے سہارن جاٹوں کے ایک فرقہ سے سازش کر کے ایک رات کو نرسنگھ جاٹ کے پڑاؤ کو گھیر لیا اور اس کو قتل کر دیا اس طرح سیاسی بساط پر ایک ہی چال سے راٹھور راجپوتوں نے جاٹوں کی تین آزاد حکومتوں کو ختم کر دیا اور چند روز میں گودرا جاٹ خود اپنے ہی ملک میں راٹھوروں کی رعایا بن کر ان کی زمین جوتنے لگے۔ اس کے بعد راؤ بیکا نے اسی طرح بھاٹی لوگوں کے خلاف اپنی جارحانہ کاروائی

جاری رکھی اور ۱۶ سال کے بعد ایک خود مختار ریاست قائم کر لی جس کا صدر مقام بیکانیر تھا۔ اس شہر کی بنیاد راؤ بیکا نے ۱۴۸۹ء میں ڈالی تھی۔ بیکانیر کی روز افزوں طاقت کے سامنے جودھپور کا ستارہ ماند پڑنے لگا۔ آہستہ آہستہ حالت یہ ہو گئی کہ بیکانیر جودھپور کو اپنا آقا تصور کرنے میں پس و پیش کرنے لگا۔

ڈیڈوانہ (صحیح ڈوڈوانہ) اور سانبھر کے نمک کے علاقے راجپوتانہ کے سب سے اہم و مشہور علاقے تھے۔ ہر راجپوت حکمران اس علاقہ پر اپنا تصرف چاہتا تھا راٹھور لوگ بھی اس کے لیے کوشاں تھے ڈوڈ لوگ اس علاقہ کے زمانہ قدیم سے

---

[1] ایک روایت یہ ہے کہ ایک روز سہارن جاٹوں کے چودھری نے شراب کے نشہ میں اپنی عورت کو خوب زدوکوب کیا، کیونکہ اس نے گودرا جاٹوں کے چودھری کی سخاوت کی خوب تعریف کی تھی۔ اس پر جاٹنی نے یہ قسم کھائی کہ آئندہ وہ شوہر کو بھائی سمجھے گی اور کبھی اس سے ہم بستر نہ ہو گی ایک رات اس عورت کے ایما سے گودرا چودھری اس ستم زدہ عورت کو بھگا لے گیا تب سے ہی دونوں قبیلوں میں دشمنی شروع ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راٹھوروں نے دونوں قبیلوں کی سلطنت و آزادی ختم کر دی (ٹیسس جلد ۲ صفحات ۲۰۱ - ۲۰۳)

Marfat.com

مالک تھے۔ ڈوڈ لوگ پرمار راجپوتوں کی ۳۶ شاخوں میں سے ایک تھے۔ اس علاقہ کو بعد میں چل کر ڈوڈوانہ کہنے لگے۔ غالباً ۱۵ ویں صدی کے پہلے نصف میں راٹھوروں نے اس خطہ سے ڈوڈ لوگوں کو نکال کر ڈوڈوانہ پر قبضہ کر لیا۔ سانبھر ۱۱۹۳ء میں شہاب الدین غوری کے حملہ تک چوہانوں کے قبضہ میں رہا۔ وہ اسے اپنا وطن سمجھتے تھے اور ان کو اس پر فخر تھا۔ شہاب الدین غوری کے حملہ سے جب چوہان منتشر ہو گئے تو مغرب سے راٹھور اور مشرق سے کچھواہا راجپوت اس علاقہ میں داخل ہو گئے۔ کچھواہا راجپوتوں کی آمد نے راٹھوروں کا مشرق کی جانب بڑھنا روک دیا۔ یہ کچھواہہ راجپوت امبر اور جے پور کے دھندھار قبیلہ سے زیادہ قدیم تھے۔ راؤ جودھا نے اپنے ایک لڑکے بیہا یا بیرسنگھ کو باگری میں تعیّن کر دیا۔ یہ علاقہ اراولی پہاڑ کے ڈھال پر اجمیر کے بعد سے شروع ہو کر میدتا (موجودہ میرتہ) تک پھیلا ہوا ہے جو جودھپور سے ۷۰ میل مشرق میں ہے۔ یہ مید لوگ جاٹوں سے ملی جلی ایک قوم تھی جو مالوہ سے مغرب کی جانب چل کر میواڑ (مید اپت منڈل) آ گئی تھی میواڑ سے شمال کی جانب چل کر پھر یہ لوگ اجمیر پہونچے اور بالآخر راٹھور راجپوتوں کے آنے سے بیشتر مارواڑ کے مشرقی نصف حصے کے مالک بن گئے۔ غالباً مارواڑ میں

میدتا ان کا آخری قلعہ تھا۔ راؤ جودھا کے لڑکے بیرسنگھ نے اس علاقہ کو مغلوب کر کے ۱۴۵۹ء مطابق ۱۵۱۵ بکرمی میدتا کا قلعہ تعمیر کروایا۔ اسی سال راؤ جودھا نے جودھپور کی بنیاد ڈالی تھی۔ راؤ جودھا کے لڑکے راؤ شجاع نے میدتا کا قلعہ اپنے لڑکے راؤ باگا کو دیدیا۔ لیکن اس کا انتقال اپنے والد کی زندگی میں ہی ہو گیا۔ راؤ شجاع کی وفات کے بعد راٹھور سرداروں کے ایک فرقہ نے باگا کے لڑکے راؤ گانگا (مالدیو کے والد) کو جودھپور کے تخت پر بٹھا دیا۔ راجپوت سرداروں کا دوسرا فرقہ راؤ جودھا کے پوتے اور ڈوڈا کے لڑکے بیرم دیو کی حمایت کر رہا تھا (مترجم کا نوٹ۔ نینسی کی کھیات جلد ۲ فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۱) یہاں سے راٹھور راجپوتوں میں باہمی خانہ جنگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ شیر شاہ نے ان کے باہمی نفاق سے فائدہ اٹھا کر مارواڑ پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہا۔ مالدیو نے ۱۵۴۱ء میں ہمایوں سے مل کر شیر شاہ کے خلاف سازش کی تھی۔ اسی جرم کی یہ سزا تھی۔

Marfat.com

راؤ مالدیو کے منصوبے اور سازشیں

راؤ گانگا کا لڑکا اور ولی عہد مالدیو چوہان نسل کی سروہی راجکماری "پدما کماری"
کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس کے مزاج میں وہی تیزی اور تیکھاپن تھا جس کے لیے
سروہی کی تلوار مشہور ہے۔ (ایران اور عرب کے بازاروں میں اسے ہندی تلوار کہتے
ہیں۔ دسویں صدی میں ٹولڈو اور دمشق کی تلواروں نے اس کی شہرت ختم کردی)
ایام طفولیت سے ہی وہ اپنے والد کے ساتھ سیاست و جنگ میں حصہ لینے لگا تھا،
لیکن اس کے والد اس کی حوصلہ مندی اور سخت ضدی پن سے متفکر رہتے تھے، کنواہہ
کی لڑائی کے بعد رانا سانگا کی موت نے ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایک خلا
پیدا کر دیا۔ شہزادہ مالدیو اس خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ وہ جانتا تھا کہ
اس کے کمزور والد میں اس جگہ کو پُر کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک
روز جب راؤ گانگا اپنی محل کی ایک کھڑکی میں بیٹھے ہوئے نسیم سحری کی خنکی کا مزہ لے رہا
تھا، تو مالدیو نے اسے نیچے ڈھکیل دیا اور گانگا کو ہمیشہ کے لیے ۲۱ مئی ۱۵۳۱ء کو موت
کی ٹھنڈی گود میں سلا دیا۔[1] مالدیو کی رسم تاجپوشی ۵ جون ۱۵۳۱ء کو ہوئی۔ فاتح

---

[1] ایم۔ ایم۔ اوجھا نے لکھا ہے کہ راؤ گانگا کی موت ۱۵۲۶ء میں پانی پت کی پہلی لڑائی میں ہوئی
بابر نے اپنی تزک میں ایک گنگو یا کنگو نام کے راجہ کا ذکر کیا ہے۔ اوجھا کی رائے میں یہی
جودھپور کا گانگا تھا (دیکھیے "راجپوتانہ کا اتہاس" جلد ۲ صفحہ ۶۸۵۔ اور تزک صفحہ ۵۶۳)
پنڈت بی۔ ریو۔ جودھپور کے دور حال کے درباری مؤرخ تھے۔ انھوں نے راؤ گانگا
کی انتقال کی تاریخ مئی ۱۵۳۱ء لکھی ہے۔ جب تک ہمیں ایم۔ ایم۔ اوجھا کی رائے کی
تائید میں بیّن ثبوت دستیاب نہ ہوں یہ مناسب ہوگا کہ ہم ریو کی تاریخ کو صحیح تسلیم
کرلیں۔ مگر ریو یہ ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے کہ راؤ گانگا کا محل کی کھڑکی سے گرنا
محض ایک اتفاقیہ واقعہ تھا۔ شاید وہ درباری مؤرخ کی حیثیت سے اس واقعہ پر زیادہ
تنقید بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے میں نینسی کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں (ریو۔ مارواڑ
کا اتہاس جلد ۱ صفحہ ۱۱۵) اب میں شیر نامہ میں لکھی گئی مالدیو کی تاجپوشی کی تاریخ ۱۵۲۲ء کو
رد کرتا ہوں۔ یہ محض ایک اندازہ تھا اور ریو کی تاریخ کو صحیح تسلیم کرتا ہوں۔

Marfat.com

بابر بادشاہ کی موت اس سے ۶ ماہ پیشتر ہو چکی تھی۔ مالدیو کو اپنے مقتول والد سے محض دو پرگنے یعنی جودھپور اور سوجات و راثت میں ملے تھے۔ اس کے علاوہ راٹھور قبیلہ کے ۹ طاقتور سردار اس کے والد کے باجگزار اور جاگیردار تھے، جو اپنی جاگیروں میں تقریباً خود مختار تھے۔ ان ٹھکانوں کے نام تھے جیتارن، پوکرن خلودی، باڑمیر، کوٹڑا، کھیر، مہیبا، سوانہ، میدنا۔

ابھی تک مالدیو کے اطاعت گزار سردار اور جاگیردار اس کو اپنا آقا اس لیے تسلیم کرتے تھے کہ وہ ان کے قبیلہ کا سردارِ اعظم تھا، لیکن اب مالدیو نے ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ حالانکہ مالدیو کے کردار میں بہت سی کمزوریاں تھیں لیکن سیاسی مصلحت اور دور اندیشی، اصلاحی ذہانت، مدبرانہ حکمت علمی میں وہ اپنے ہمعصر راجپوتوں سے کہیں آگے تھا، لیکن اندرونی مطلق العنانی قائم کرنے اور بیرونی جارحانہ کاروائی میں اس نے نہایت عجلت سے کام لیا۔ ہمایوں بہادر شاہ کی حرکت کی وجہ سے اپنے ہی مسائل اور مشکلات میں اس قدر مصروف تھا کہ اس کو راجپوت اور راجپوتانہ کی طرف نظر اٹھانے کی فرصت نہ تھی۔ یہ مالدیو کے لیے سنہرا موقع تھا۔ مالدیو نے راجپوتانہ میں رانا سانگا کا پارٹ ادا کرنا چاہا لیکن اس کی شخصیت میں مہارانا سانگا اور مہارانا پرتاپ کے اخلاقی اوصاف اور مقناطیسی کشش کی کمی تھی، تاہم اس میں شک نہیں کہ اس کے خاندان بھر میں اس کے مقابلہ کا کوئی جوانمرد سپاہی نہیں ہوا، حتیٰ کہ مہاراجہ جسونت سنگھ بھی اس کا ثانی نہ تھا۔ مدبری اور فنونِ جنگ میں 'درنیرا' کا بہادر جری سردار درگاداس راٹھور ہی ایک ایسا سردار تھا جو اس سے سبقت لے گیا۔ درگاداس مالدیو سے تقریباً ۱۵۰ سال بعد پیدا ہوا تھا۔

راٹھور حکمراں کی جارحانہ کاروائیوں کا راجپوتانہ کی ۴ ریاستوں جیسلمیر، میواڑ امبر اور گجرات پر خراب اثر پڑا۔ ان ریاستوں کے خلاف مالدیو کی کارروائیوں کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) جیسلمیر۔ راٹھور لوگ راجپوتانہ کے ریگستان پر اپنا تسلط و اقتدار قائم کرنے کے لیے پیہم کوشاں تھے۔ لہٰذا بھاٹی راجپوتوں سے ٹکرانا ان کے لیے

Marfat.com

لازمی اور قدرتی بات تھی۔ اس وقت جیسلمیر کی گدی پر راول لون کرن بھاٹی فرمانروا تھا، جو کہ مالدیو کا ہمعصر تھا۔ ابتدا میں بھاٹی سرداروں کی حکومت ریگستان میں موجودہ بہاولپور سے امرکوٹ اور پھلودی[1] سے بھکر کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی اور انہیں اس بات کا فخر تھا کہ وہ راجپوتانہ کے شمالی دروازہ کے نگراں و محافظ ہیں (یعنی کہ شمالی سمت کے شیر ہیں) لیکن ذرائع کی کمی اور باہمی حسد و نفاق کی وجہ سے ان کی مشرقی و شمال مشرقی سرحد پر جودھپور اور بیکانیر کا غلبہ ہوگیا اور ان کا اثر ختم ہوگیا۔ مالدیو نے ڈیراول اور بکوم پور موجودہ کے علاقہ پر قبضہ کرلیا اور اپنی ریاست کے حدود کی توسیع ساتل میر اور پوکھرن تک وسیع کرلی۔ لون کرن نے اپنی لڑکی کی شادی مالدیو سے کرکے اس کی اطاعت قبول کرلی۔ شادی کی رات عیاش و شرابی مالدیو نے بستر عروسی کو ایک خادمہ سے مباشرت کرکے ناپاک کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو دولہن امادی نے یہ کہہ کر اس سے قطع تعلق کرلیا کہ وہ اسی خادمہ کے لائق ہے جس کے ساتھ اس نے ہم بستری کی ہے۔ امادی اپنے شوہر کے ساتھ چلی تو گئی لیکن اس سے ہمیشہ دور رہی[2] حالانکہ اس نے اپنی تمام زندگی اپنے شوہر کی وفادار رہ کر گزاری۔ بہرحال مالدیو کی سیاسی غرض پوری ہوگئی۔ بڑی تعداد میں بھاٹی لوگ اس کی ملازمت میں آگئے اور اس نے راٹھور، سسودیہ اور کچھواہہ راجپوتوں کے خلاف ان کو استعمال کیا۔

(۲) میواڑ: اپنی تخت نشینی کے سال ہی مالدیو نے میواڑ سے بھدرا جن[3] غصب

---

[1] پھلودی جودھپور سے شمال۔شمال مغرب میں ۷۰ میل۔ پوکھرن عرض البلد ۵۵-۲۶° و طول البلد ۵۵-۷۱° پر جودھپور سے شمال مغرب میں ۸۵ میل اور جیسلمیر سے بجانب مشرق ۶۵ میل ہے جے تارن جودھپور سے ۵۶ میل مشرق میں ہے۔

[2] ریو نے مارواڑ کی سب سے زیادہ ناقابل اعتبار کھیات کا ہی سہارا لے کر دغابازی کا الزام راول لون کرن پر ہی عائد کیا ہے۔ (دیکھئے مارواڑ کا اتہاس جلد ۱۔ صفحہ ۱۲۱)

[3] بھدراجن عرض البلد ۳۶،۲۶ اور طول البلد ۵۳،۷۲ پر واقع ہے۔ جودھپور سے ۵۰ میل جنوب اور سوانہ سے ۳۲ میل مشرق میں ہے۔

Marfat.com

کرلیا۔ جب حرامی بنبیر نے میواڑ کی گدی پر جبراً غاصبانہ قبضہ کرلیا تو سسودیہ راجپوتوں نے اودے سنگھ کی حمایت میں، جو اس وقت ۱۵۳۷ء میں کمبھلگڑھ میں پناہ گزیں تھا، راؤ مالدیو سے مدد مانگی۔ راؤ مالدیو نے پالی کے چوہان سردار اکھیراج سونگارا اور اپنے سپہ سالار کوپا اور کھیم کرن کو حکم دیا کہ وہ اپنی فوج لے کر مصیبت زدہ شہزادہ کی کمک کو روانہ ہوجائیں۔ سسودیہ اور راٹھوروں کی متحدہ افواج نے غاصب بنبیر کو ماہولی کی لڑائی میں زیر کیا اور اس کو چتوڑ سے نکال باہر کردیا۔ ۱۵۴۰ء میں مہارانا اودے سنگھ کا دوبارہ چتوڑ پر قبضہ ہوگیا۔ اودے سنگھ کو مدد دینے میں مالدیو کسی ایثار و شجاعت کے جذبہ سے متاثر نہ تھا، بلکہ اس کا اصل مقصد تھا، اپنی سیاسی خودغرضی کی تکمیل اور تمام راجپوتانہ پر اپنا تسلط کرنا۔ چنانچہ چتوڑ تو اس نے مہارانا اودے سنگھ کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا، مگر چتوڑ کے پرگنوں میں ٹونک اور جہازپور (بناس دریا کے مشرق میں) اور رنتھمبور اور بوندی جانے والے درّے کے پائیں تک اپنے فوجی تھانے قائم کردیے۔ ۱۵۴۰ء میں بلگرام کی جنگ کے بعد جب ہمایوں کا موروثی تخت اس کے ہاتھ سے چلا گیا تب مالدیو نے اپنی جارحانہ کارروائیوں کی رفتار اور بھی تیز کردی۔ اس نے چاتسو (موجودہ جے پور سے ۲۴ میل منجانب جنوب) لعل سونت، ٹوڈا (بھیم ؟) اور ملارنہ (رنتھمبور کے قلعہ سے ۱۷ میل ہے) کو فتح کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۵۳۹ء میں جب ہمایوں بنگال میں مصروف تھا، تب مالدیو کی فوج بیانہ اور ہنڈون تک مشرق میں بڑھ آئی تھی۔

مشرقی راجپوتانہ میں مالدیو کا سیاسی اقتدار اس کے ایک مکروہ عیش پرستی کے فعل کی وجہ سے ختم ہوگیا۔ میواڑ کا ایک ماتحت سردار راؤجیت سنگھ جھالا راؤ مالدیو سے آملا تھا۔ مالدیو نے اپنے آغاز حکومت میں اسے کھیروا میں ایک جاگیر دے کر میواڑ کی بغل میں کانٹا لگا دیا تھا۔ مالدیو نے راؤجیت سنگھ کی لڑکی سروپ دیوی سے شادی بھی کرلی۔ چند روز بعد ۱۵۴۰ء میں مالدیو اپنی سسرال گیا، اور اپنی چھوٹی سالی پر فریفتہ ہوگیا، اور راؤجیت سنگھ کو دھمکی دی کہ اگر وہ بخوشی اس لڑکی کی شادی اس سے نہیں کرے گا تو وہ جبراً اس کو اٹھا کر

Marfat.com

لے جائے گا۔ بیچارے سسر نے شادی کی تیاری کیلیے ماہ کی مہلت مانگی اور اس بیچ سردار اپنے سارے خاندان کو لے کر کمبھلمیر بھاگ گیا، جہاں اس نے مہارانا اودے سنگھ سے اپنی لڑکی کی شادی کر دی۔[1] اس طرح مالدیو کے پنجہ سے اس کی عیاشی کا

شکار نکل جانے پر وہ آگ بگولہ ہوگیا اس نے میواڑ کے علاقہ کو روند ڈالا اور کمبھلمیر کے مقام پر مہارانا کا محاصرہ کیا۔ یہ مقام اودے پور سے ۲۰ میل مغرب شمال جنوب میں ہے۔ اس ناقابلِ تسخیر و مستحکم قلعہ کی فصیل کی چٹانوں پر راٹھور تلوار بیکار ہی بجتی رہی اور رجب مئی ۱۵۴۲ء میں مالوہ کی فتح کے بعد شیر کی فوج رنتھمبور میں داخل ہوگئی تو راؤ مالدیو کا سارا غرور و نشہ چور ہوگیا۔

(۳) کچھواہا۔ کچھواہا لوگ اپنی نارو کا اور خانگروٹ شاخوں کو ملاکر تعداد میں راٹھوروں سے کہیں زیادہ تھے۔ مالدیو کے عروج سے پہلے وہ آگرہ اور دہلی کے مغرب کے ایک بڑے حصہ پر سانبھر اور رینتھا واٹی تک اپنا تسلط جمائے تھا۔ لیکن کچھواہا راجپوتوں میں اپنی شاخ و قبیلہ کی وفاداری کا اتنا جذبہ نہیں تھا جتنا کہ راٹھور لوگوں میں تھا۔ اس لیے مشترکہ مقاصد کی خاطر وہ آپس میں آسانی سے متحد نہ ہو پاتے تھے۔ علاوہ بریں کچھواہا سلطنت کی سرحد مسلم سلطنت سے اس قدر نزدیک تھی کہ ان کے سر پر ہمیشہ خطرہ کی تلوار لٹکتی رہتی تھی۔ اس سے انہوں

---

[1] ایم۔ ایم۔ اوجھا اور ریو کے مطالعہ سے ایک دلچسپ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کس طرح بالترتیب میواڑ اور مارواڑ کے لیے اپنی تصانیف میں تعصب کا اظہار کرتے ہیں۔ شلا ریو نے لکھا ہے کہ مہارانا اودے سنگھ نے اپنی گدی واپس مل جانے کے بعد چالیس ہزار فیروزی اشرفی اور بسنت راؤ نام کا ایک ہاتھی مالدیو کو بطور نذرانہ بھیجا۔ اوجھا اس باب میں بالکل خاموش ہے اور یہ مناسب ہے۔ اس کے برعکس اوجھا نے لکھا ہے کہ سسودیہ فوج نے راٹھوروں کو کمبھلمیر کے نزدیک ایک لڑائی میں ہرادیا اور مالدیو بھاگ گیا۔ اسی طرح اوجھا نے سالی کے واقعہ کو خوب رنگ دیکر لکھا ہے۔ ریو اس متعلق بالکل خاموش ہے۔ ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ٹوڈ ہی سب سے زیادہ معتبر اور مستند ہے۔ دیکھئے اوجھا 'راجپوتانہ کا اتہاس' جلد ۲۔ صفحات ۷۱۸-۷۱۹۔ اور ریو 'مارواڑ کا اتہاس' جلد ۱۔ صفحات ۱۱۸-۱۱۹۔

Marfat.com

نے یہ سبق سیکھ لیا تھا کہ بہادری کے مقابلہ میں عقل و سمجھداری سے کام لینا بہتر ہے۔ امیر کو نہ تو کبھی سسودیوں کی طرح بُرے دن دیکھنے پڑے تھے کہ اس کے جوان سر سے کفن باندھ کر لڑیں اور عورتیں جوہر کی رسم ادا کریں، نہ کبھی تاریخ میں ان کی بہادری و مردانگی کی شہرت ہی پھیلی تھی۔ مسلمانوں کی فتح سے پہلے انہوں نے آخری پرتھوی راج کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ پانی پت کی لڑائی سے پہلے رانا سانگا کی اطاعت قبول کر لی تھی اور غالباً ۱۵۴۰ء کے بعد انہوں نے مالدیو کو اپنا آقا تسلیم کر لیا۔ ۱۵۲۸ء میں پرتھوی راج کچھواہا کے انتقال کے بعد، جو امبر ریاست کا بانی مبانی تھا، اس کے ۱۲ لڑکوں میں باہمی اختلاف رونما ہو گیا تب مال پورا پر مالدیو کا قبضہ ہو گیا۔ بہت دنوں سے اس مشہور تجارتی قصبہ کو لے کر پرمار اور کچھواہا لوگوں میں جھگڑا چل رہا تھا۔ ۱۵ ویں صدی کے آخری دور میں کچھواہا راجپوتوں کی ایک شاخ شیخاوٹ، ریگستان کے اس بنجر علاقہ میں آباد ہونے چلی گئی، جسے اب شیخاوٹی کہتے ہیں۔ ... وقت کا واقعہ ہے جبکہ شیخاوٹ قبیلہ کا سردار تھا شیخا جس نے سیکر قصبہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کے لڑکے رائمل نے اپنے ملازم پٹھان سپاہیوں کی مدد سے بھائی اور دوسرے راجپوتوں کو اس علاقہ سے نکال کر اپنی ایک خود مختار حکومت قائم کر لی۔ ان پٹھانوں میں شیر شاہ کا والد میاں حسن بھی شامل تھا۔ مالدیو نے رائے مل کے پوتے راؤ لون کرن سے اپنی لڑکی ہنسبائی کی شادی کی، لیکن بوڑھے رائمل نے مالدیو کے دشمن اور تخت سے معزول چچا راؤ بیرم دیو کو اپنے یہاں پناہ دینے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ مالدیو[1] نے بیرم دیو کے تعاقب میں اپنی فوجیں شیخاوٹی میں داخل کر دیں اور امرسار اور دوسرے مقامات پر قبضہ کر کے انہیں اپنی ریاست میں ملا لیا۔ اس نے ڈیڈوانہ سے، جو کہ سیکر سے تقریباً ۵۷ میل ہے، چوہانوں کو فتح پور[2] سے نکال کر، جو کہ سیکر سے شمال شمال مغرب

---

[1] ٹوڈ نے مالدیو کی فتوحات میں ججاور مقام کو بھی شامل کیا ہے۔ (ایٹلس صفحہ ۸۵۱) دوسرے مقامات کے ساتھ میں نے یہ قیاس کیا تھا کہ یہ مقام مشہور ججاور نہیں ہے، جو مالدیو کے خاص علاقہ میں تھا (شیر شاہ ۲۶۴-۲۷۵)۔ اس لیے میں نے اسے ہریانہ صوبہ کی تحصیل جھجھر مان لیا لیکن یہ

Marfat.com

۷۰ میل ہے قایم خانیوں کو نکال کر اور جھنجھنوں کو، جو کہ تقریباً ۷۰ میل نارنول سے مغرب میں ہے، شیخاوتوں سے چھین کر اس علاقہ پر اپنا تسلط مستحکم کیا۔ جبکہ سنہ ۱۵۴۰ء کے دوسرے نصف میں شیر شاہ پنجاب میں مصروف تھا تب غالباً اس کی جائے پیدائش یعنی نارنول بھی مارواڑ کا ایک پرگنہ ہو گیا۔

مالدیو کی جنوب میں سروہی اور گجرات کی جانب توسیع

سروہی کے دیورا چوہان پہلے میواڑ کے اطاعت کیش تھے، لیکن راٹھوروں سے بھی ان کے تعلقات اتنے ہی اچھے تھے۔ مالدیو کے والد راؤ گانگا نے سروہی کے فرمانروا راؤ جگمل کی لڑکی سے شادی کی تھی اور اس نے خود اپنی لڑکی چمپا بائی کی شادی اپنے خسر کے پوتے راؤ رائے سنگھ سے کی تھی۔ چمپا بائی کے بطن سے راؤ اودے سنگھ پیدا ہوئے۔ اس نے بیکانیر خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کی مگر چند روز کی حکومت کے بعد ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے وقت انکی رانی حاملہ تھی۔ سروہی سرداروں نے راؤ جگمل کے پوتے اور ددا کے لڑکے مان سنگھ دیئہ۔ کو میواڑ سے بلا کر گدی پر بٹھا دیا اور اس کو ٹیکہ دیدیا۔ لیکن اودے سنگھ کی والدہ نے، جو کہ ایک تحکم پسند خوددار سن رسیدہ خاتون تھی، مان سنگھ کو میواڑ کا حکمراں ماننے سے صاف انکار کر دیا اور اعلان کیا کہ گدی کا جانشین اودے سنگھ کے لڑکے کی رانی کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ ہے۔ راؤ ددا نے، جو کہ سروہی کو اپنے بھتیجے کی امانت سمجھ کر وہاں راج کر رہا تھا، خود اپنے لڑکے مان سنگھ کو ریاست سے یہ خیال کر کے بدر کر دیا تھا کہ مبادا وہ اس کی وفات کے بعد وراثت کے مسئلہ پر اودے سنگھ سے جھگڑا کر بیٹھے۔ مان سنگھ دیورا اتنا ہی بداعمال تھا جتنا کہ اس کا والد نیک

غلط ہے۔ ریو نے مالدیو کے پرگنوں کی ترتیب میں جماور کو بھی شامل کیا ہے۔ یہ وہی مقام ہے یہ دراصل ریاست جودھپور میں اودے پور سے شمال مغرب میں ۳۵ کوس واقع ہے۔ ڈاکٹر ایس کے بنرجی نے لاعلمی سے میری رائے کو صحیح مان کر غلطی کر دی (ہمایوں بادشاہ جلد ۲ صفحہ ۶۶)۔ ؎ یہ فتح پور عرض البلد ۲۸ اور طول البلد ۷۵ پر واقع ہے۔

Marfat.com

سیرت اور پاک خصلت تھا۔ اس نے علی الاعلان اودے سنگھ کی حاملہ بیوی کو مع ۸ مہینے کے بچّہ کے جو کہ پیدا ہو گیا تھا قتل کر دیا۔ بس یہیں سے راٹھوروں اور دیوروں میں بنائے مخاصمت پیدا ہو گئی۔ مان سنگھ کی یہ مکروہ سفاکانہ حرکت اس کی مدبّری اور مردانگی کے پردہ میں چھپ گئی۔ مالدیو نے سروہی کو دیوروں کے قبضہ میں اِس خوف سے چھوڑ دیا مبادا وہ مہارانا اودے سنگھ سے مل کر اس کے نو مفتوح علاقہ میں بدامنی پھیلا دیں۔ بالآخر یہ دشمنی ازدواجی تعلقات کے ذریعہ ختم ہو گئی یعنی مان سنگھ دیورا کی لڑکی اورنکارکنور کی شادی راؤ مالدیو کے لڑکے چندرسین سے ہو گئی۔[1]

ماروار کی جنوبی سرحد پر مالدیو نے جو فتوحات کیں اُن میں جالور کا مشہور خطّہ بھی شامل تھا۔ حالانکہ جالور شروع میں گجرات کی سلطنت کا ایک جز تھا۔ لیکن اس کا حاکم ایک پٹھان سردار سکندر خاں[2] تھا جو کہ قریب قریب خود مختار تھا۔ جب خانہ بدوش بلوچیوں کو ارغونوں نے سندھ سے باہر نکال دیا تو انہوں نے جالور پر قبضہ کر کے سکندر خاں کو برطرف کر دیا۔ راؤ مالدیو نے اس جلاوطن پٹھان کو ایک گاؤں دونارا بطور جاگیر دید یا لیکن چند روز بعد وہ جالور بھاگ گیا اور راٹھور فوج نے اس کا تعاقب کیا۔ سکندر خاں نے گجرات کے مفرور لودی پٹھانوں کی مدد سے مورچہ لیا لیکن اس کی ہار ہوئی اور وہ زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۵۳۸ء میں مالدیو نے جالور کو اپنی ریاست میں ملا لیا۔ اس کے چند روز بعد جودھپور کے قیدخانہ میں سکندر خاں فوت ہو گیا۔ مالدیو نے جیت مالوٹ اور راٹھوروں کو (جوجیت مل کے خاندان سے

---

[1] سروہی کے واقعات کے لیے دیکھیے نینسی کی کھیات جلد ۱۔ صفحہ ۱۲۶۔۱۲۷۔ ریو نے مان سنگھ دیورا اور مالدیو راٹھور کے تعلقات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ان پرگنوں میں، جو کہ مالدیو نے فتح کر کے اپنے راج میں ملا لیے تھے سروہی اور آبو کا نام شامل نہیں ہے (مارواڑ کا اتہاس جلد ۱۔ صفحہ ۱۴۲)

[2] ریو نے مارواڑی کھیات پر شبہ نہ کر کے سکندر خاں کو ایک بہاری پٹھان لکھا ہے لیکن یہ بات غلط ہے۔ لودی حکومت میں یا اس کے بعد کسی بھی بہاری پٹھان نے مغربی ہندوستان میں آکر اپنا گھر نہیں بسایا۔ سکندر خاں کے متعلق دیکھیے۔ ریو۔ وہی صفحہ ۱۲۲۔

Marfat.com

تھے، سوانا ے اور چوہانوں کو سانچور سے نکال کر اپنی ریاست کی توسیع مکمل کر لی[1]
بہادر شاہ کی وفات کے بعد گجرات کی طاقت ختم ہو چکی تھی اس لیے مالدیو نے بلا کسی
مزاحمت کے اپنی سلطنت کی وسعت جانب جنوب لونی دریا کی گھاٹی کے کنارے کنارے
پھیلا دی۔ دوسری جانب اسکی فاتح فوج خلیج کچھ کے مغربی دامن پر واقع بھن مل
ماروار اور رادھن پور تک پہونچ گئی ماروار ریاست کی سرکاری تاریخ میں لکھا
ہے اور ہمارے پاس اس کو غلط ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ مالدیو نے سوڈا پرمارون
کو ہرا کر اپنی سلطنت کی توسیع امر کوٹ اور تھل پارکر تک کر لی[2] اور اس طرح
وہ ہندوستان کے ریگستان کا تنہا مالک بن گیا۔ نہ تو مالدیو سے پہلے اور نہ اسکے
بعد کسی راجپوت حکمراں کی سلطنت ریگستان کے اس قدر طول و طویل علاقہ پر
قائم ہوئی۔

تاریخ کے دو اہم واقعات تقریباً بیک وقت ہی رونما ہوئے۔ ایک تو تھا
شیر شاہ کا مغلیہ سلطنت کا تختہ پلٹنا اور دوسرا تھا مالدیو کے حوصلہ کی تکمیل، یعنی مغربی
ریگستان اور سارے راجستھان پر اس کے تسلط کا قائم ہونا۔ کامیابی کے نشہ
نے اس کی عالمگیری کی بھوک کو اور بھی تیز کر دیا اور وہ ۱۶ ویں صدی کے راشٹر کوٹوں
کی طرح جہانگیری کا خواب دیکھنے لگا۔ اس کے تصور میں یہ نقشہ بنا کہ انہل وارہ پٹن
سے لے کر قنوج تک ایک وسیع راجپوت سلطنت قائم کرے۔ لیکن اس حوصلہ کی تکمیل

---

[1] مالدیو کی فتوحات کا جائے وقوع (i) جالور عرض البلد ۱۲ ۲۵ طول البلد ۳۷ ۲۲ جودھپور سے ۷۵ میل جانب جنوب (ii) سوانہ جالور سے ۴۰ میل شمال۔ شمال مغرب جودھپور سے ۶۰ میل جنوب مغرب۔ عرض البلد ۴۸ ۲۵ طول البلد ۲۶ ۴۷ (iii) سانچور۔ جودھپور سے ۱۳۲ میل جنوب مغرب۔ عرض البلد ۵۴ ۲۴ طول البلد ۴۶ ۷۱۔

[2] پارکر خلیج کچھ سے شمال شمال مشرق میں ہے۔ یہ سندھ کے شمالی حصہ سے راجپوتانہ جانے والے کارواں کے راستہ پر ایک مشہور مقام تھا۔ جہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں، زمین سیراب ہے۔ باغی لٹیرے اور ڈاکوؤں کے پناہ لینے کے لیے اچھا علاقہ ہے۔ جب نینسی نے اپنی کھیات لکھی تھی اس میں ۴۰ موضع شامل تھے (نینسی کی کھیات جلد ۱ صفحہ ۳۵۲ اور ریو۔ جلد ۱ صفحہ ۲۴۲)

Marfat.com

کے پسِ پشت نہ تو دیگر راجپوت قبائل تھے اور نہ خود اس کا راٹھور قبیلہ ہی۔ اس کی مرکزیت اور بے حجاب حملہ آوری کی پالیسی کی وجہ سے دوستوں کی بہ نسبت اس کے دشمنوں کی تعداد کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس کا ذاتی کردار اس کو ایک قومی ہیرو بنانے کے ناقابل تھا۔ نہ تو وہ دوسروں میں ولولہ پیدا کر سکتا تھا اور نہ کسی اعلیٰ مقصد کی تکمیل کے لیے لوگوں کے جذبۂ ایثار کو متحرک کر سکتا تھا۔ اس کی ابتدائی تعجب انگیز کامیابی کا راز تھا اس کی انتظامیہ صلاحیت اور سیاسی دانائی۔ اس نے راٹھوروں کے قبائلی عناد سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ان کو اپنے ساتھ کر لیا۔ راجپوتانہ میں جو قبیلوں میں باہمی بغض و حسد پھیلا ہوا تھا اس کی آڑ میں اس نے ایک قبیلہ سے دوسرے کو ٹکرایا۔ کبھی ایک کا ساتھ دیا، کبھی دوسرے کا۔ اس طرح سے سب کی جائداد کو ہڑپ لیا۔ قومی روایات اور سیاسی عقائد کے تحت راجپوت کے لیے دو ہی راستے تھے، یا تو تلوار کے زور سے زندگی بسر کرنا یا اگر تلوار سے ڈرے تو بھوکوں مرنا۔ چنانچہ مالدیو جیسے دریادل مالک کے لیے سپاہیوں کی کیا کمی ہو سکتی تھی اور ایسے سپاہی جن کو کہ اپنے روٹی دینے والے کی فرمابرداری میں اپنے عزیز و اقارب کی جان لینے میں بھی کوئی عار نہ ہو۔ یہ تھا راجپوتوں کا اخلاقی معیار۔ وفاداری ولی نعمت کی وفاداری، جس کی کہ اتنی زور سے مدح سرائی کی جاتی ہے۔ اس کا سلسلہ رامائن اور مہابھارت کے عہد سے چلا آ رہا تھا۔ اسی نے بھیشم اور درونا چاریہ کے باطن پر پردہ ڈالا تھا۔ جو اپنے ولی نعمت کے مکروہ افعال کا چپ چاپ مشاہدہ کرتے رہے اور اس کی آنکھ بند کر کے تقلید کرتے رہے، خواہ اس نے وراٹ (موجودہ جے پور) علاقہ سے مویشیوں کا سرقہ کیا ہو، خواہ کورکشیتر کے میدانِ جنگ میں غیر منصفانہ لڑائی لڑی۔

مالدیو کا انتقام اور بیوفائی

مالدیو کا حوصلہ تھا راجپوتانہ میں رانا سانگا جیسا ہیرو بننا، مگر اس کے کردار میں اعلیٰ اوصاف کی سراسر کمی تھی۔ اپنے عزیز و اقارب سے اس نے جس طرح بے محابا انتقام لیا اور ان کو سفاکانہ دغا دی، بالآخر اس کو اپنے ان اعمال کا خمیازہ بھگتنا

Marfat.com

پڑا۔ اس نے اب منحرف و مخالف راٹھور سرداروں کا نام و نشان مٹانے کی پالیسی پر عملدرآمد شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بقائے نفس اور جذبۂ انتقام (یعنی جان کے عوض جان) سے متاثر و متحرک ہو کر ایسے نازک موقع پر میڈتنا اور بیکانیر کے راٹھور (جو کہ جودھپور کے راٹھوروں کے ہم جد تھے) مالدیو سے منحرف ہو کر شیر شاہ سے جا ملے۔

راؤ جودھا کا سب سے بڑا لڑکا دودا اپنے والد کی عین حیات میں ہی گزر چکا تھا۔ راٹھور سردار دودا کے لڑکے بیرم خاں کو جودھا کی گدی کا جائز وارث مانتے تھے لیکن جودھا کے دو چھوٹے لڑکوں سنتال اور شجا نے اسے تاج سے محروم کر دیا وہ باری باری سے خود تخت پر بیٹھ گئے۔ بیرم کے معاون و مددگار اس بات سے ناراض تھے۔ جب راؤ شجا کے دو لڑکوں باگا اور نارا کا انتقال اس کی زندگی میں ہی ہو گیا تو شجا نے اپنے بھتیجے بیرم کی تربیت شروع کر دی۔ وہ چاہتا تھا کہ بعد اس کے وہ ہی گدی کا مالک ہو، کیونکہ باگا کا لڑکا گاگا ابھی نابالغ تھا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ

اس عرصہ میں باگا کی چالاک عورت نے کچھ با اختیار سرداروں کو اپنے لڑکے کی حمایت میں توڑ لیا۔ جب سن رسیدہ راؤ شجا کا انتقال ہوا تب ضعیف موروثی پردھان (حکومت کا وزیر اعظم یعنی راٹے مل) جودھپور میں موجود نہ تھا۔ چنانچہ ان سرداروں کو موقع مل گیا اور انہوں نے باگا کے لڑکے گاگا کو تخت پر بٹھا دیا اور بیچارے بیرم دیو کو قلعہ سے باہر کر دیا۔ راٹے مل بیرم کو لے کر سوجت چلا گیا اور اس نے اس بے انصافی کا بدلہ لینے کی قسم کھائی۔ راؤ گاگا نے سوجت سے بیرم کو نکالنے کے لیے جنگ شروع کر دی لیکن اگر راؤ سوجت کے ایک گاؤں پر حملہ کرتا تو راٹھل اور بیرم اس کے عوض میں جودھپور کے دو گاؤں لوٹ لیتے۔ اس خانہ جنگی میں جیتا اور کوپا نے (جو راٹھوروں کے جنیاوت قبیلے سے تھے)، بالترتیب گاگا اور بیرم کا ساتھ دیا۔ یہ دونوں سردار بہت بڑے بہادر اور جنگجو تھے اور ان کی وجہ سے بہت دنوں تک جنگ کا پلڑا ہموار رہا۔ با۔ راٹھل حالانکہ جین مذہب کا پیرو تھا لیکن بڑا دلیر اور خوش تدبیر تھا۔ ایک روز ہولی کی رات کو گاگا اپنا فوجی پڑاؤ جو کہ راٹھل کے بالمقابل تھا چھوڑ کر اپنے محل میں چلا آیا حالانکہ اس کے

Marfat.com

وزیر ساہانی نے جو غالباً ذات کا کھتری تھا اس کو منع کیا تھا۔ راؤ گانگا نے اپنے وزیر کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ خطرہ کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ آج جشن کی رات ہے اور بنار راسمل تمام رات جوا کھیلنے میں مشغول رہے گا۔ لہٰذا دشمن کی جانب سے دفعتہً حملہ کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ دوسرے روز جب راؤ گانگا محل سے واپس لوٹا تو اس کی فوج کا ایک سپاہی بھی زندہ نہ بچا تھا۔

اس کے بعد راؤ گانگا نے حکمتِ عملی سے کام لیا۔ اس نے کوپا کو ایک لاکھ روپیہ کی جاگیر کا لالچ دے کر جتیا کے توسط سے بیرم دیو کی جانب سے توڑ لیا۔ جتیا نے کوپا سے یہ بھی کہا کہ بیرم لاولد ہے۔ اس کے مرنے کے بعد اسے مجبور ہو کر راؤ گانگا کو اپنا آقا ماننا پڑے گا۔ چند روز بعد مہتہ راسمل بھی بیرم دیو کی خاطر لڑتے لڑتے مارا گیا۔ اب بیرم کا ستارہ ڈھلنے لگا۔ اس نے سوجت کو گانگا کے حوالہ کر دیا اور راسمل کے لڑکے رائے سال کو لے کر وہ جودھپور سے دور میدتا اور باگری چلا گیا۔ سیاست کے متعلق یہ چچا بھتیجوں میں اختلاف ہونے کے باوجود بھی دونوں میں ذاتی تلخی اور کشیدگی نہ تھی۔ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ بیرم دیو تن بتقدیر ہو کر میدتا میں رہنے لگا۔ راؤ گانگا نے یہاں کوئی مزاحمت نہ کی، لیکن بیرم کے چھوٹے بھائی شیکھا نے بغیر اس کے (بیرم) مشورہ کے اپنی مطلب برآری کے لیے لڑائی چھیڑ دی۔ شیکھا نے گانگا کے خلاف ناگور کے پٹھان فوجدار دولت خاں لودی سارنگ خیل سے مدد مانگی۔ ادھر گانگا کی حمایت کرنے اس کا جانباز رشتہ دار بیکانیر کا راؤ جیت مل آیا۔ لڑائی میں شیکھا مارا گیا اور اس کے معاون و مددگار پٹھان اپنے خیمہ گاہ اور ہاتھی چھوڑ کر سرپٹ بھاگ نکلے اور سارا سامان فاتح فوج کے ہاتھ لگا۔ اس جنگ میں گانگا کا خورد سال لڑکا مالدیو بھی شریک تھا۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے چنانچہ اس کے دماغ میں یہ بات سما گئی کہ فتح کا سہرا اسی کے سر ہے اور تمام مال غنیمت اسی کو ملنا چاہیے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ایک زخمی ہاتھی بھاگتا ہوا میدتا پہونچ گیا۔ یہاں اس کو بیرم کے آدمیوں نے پکڑ لیا اور شہر پناہ کے ایک نیچے پھاٹک کو توڑ کر بطور مال غنیمت کے اسے وہ وہاں لے گئے۔ لڑکے کی ضد پر راؤ

Marfat.com

گا گا نے ہاتھی واپس مانگا، مگر مالدیو کا اصل منشا رتھا' میدتا کے راٹھوروں کو ذلیل کرنا۔ میدتا کے لوگ اس شرط پر بطور نذرانہ ہاتھی دینے کو تیار ہو گئے کہ راجکمار مالدیو وہاں آکر ان کی عزت افزائی کریں۔ لہٰذا وہ وہاں گیا اور جب دعوت میں وہ اپنی اعزازی جگہ بیٹھا تو اس نے کہا کہ جب تک ہاتھی نہ لایا جائیگا وہ ایک لقمہ بھی نہ اٹھائے گا۔ اس کی ضد سے پریشان ہو کر میدتا کے راٹھوروں نے مالدیو سے برملا یہ کہہ دیا "ہمارے یہاں بھی تمہاری طرح بہت سے ضدی لڑکے ہیں" اس پر مالدیو اٹھ کھڑا ہوا اور چلتے چلتے یہ چنوتی دے گیا کہ اگر میں میدتا کے ببول کو کاٹ کر یہاں مولی نہ بودوں تو میرا نام مالدیو نہیں۔ اس کا اسے یہ جواب ملا کہ اگر میدتا کا ایک ببول بھی کٹا تو جودھپور کے آم کا درخت نہ بچے گا۔ (نینسی کی کھیات جلد ۲۔ صفحات ۱۴۴-۱۴۷)

جودھپور کی گدی پر بیٹھنے کے بعد راؤ مالدیو کو میدتا کی یاد آئی۔ اس نے اپنے چچا راؤ بیرم کو وہاں سے نکال دیا اور اپنے نام کی عزت کی خاطر وہاں سے ببول اکھاڑ کر مولی بوادی۔ بیرم دیو نے بھی میدتا چھوڑتے وقت یہ قسم کھائی کہ اگر اس نے اپنے ببولوں کے عوض جودھپور کے آم نہ اکھاڑے تو لعنت ہے اس کے بیرم نام پر۔ بیرم نے سہس مل پنوار سے، جو غالباً بہادر شاہ گجراتی کے عہد کا افسر تھا' اجمیر چھین لیا اور اس علاقہ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ راؤ مالدیو نے اپنے چچا بیرم کی توہین کرنے کے لیے سہس مل پنوار کو میدتا کے علاقہ میں 'ریان'[له] کی جاگیر دیدی۔ ایک روز دفعتہً تاراگڑھ کی مینار سے بیرم کو ریان کی پہاڑیوں کی جھلک دکھلائی دی۔ اس نے اسی وقت قسم کھائی کہ وہ جب تک سہسا کا خون نہ پی لے گا پانی نہیں پئے گا۔ چنانچہ بیرم اپنے ساتھ کچھ سوار لے کر روانہ ہو گیا اور ایک خونریز لڑائی میں اس نے سہسا کو قتل کر دیا۔ اس پر راؤ مالدیو نے اپنے مشہور سپہ سالاروں جتیا، کوپا، اکھیراج، سونگرا کو ناگور سے بلوا بھیجا کہ وہ بیرم کو نہ صرف

له یہ جگہ لونی دریا کے دائیں کنارے پر میدتا سے ۱۶ میل جنوب مشرق اور جودھپور سے ۶۸ میل شمال مشرق میں ہے۔

Marfat.com

ریان سے نکال دیں بلکہ اجمیر پر بھی قبضہ کرلیں۔ اس وقت بیرم کے وفادار پردھان راسمل کا انتقال ہوچکا تھا۔ بیرم اپنے سے قوی ترغنیم کے حملہ کی تاب نہ لاکر اجمیر چھوڑکر رائے سال کے علاقہ شیخاوٹی کو چلا گیا۔ یہ واقعہ ۱۵۳۵ء میں ہوا۔

اپنی غمناک جلاوطنی کے دوران بیرم نے کچھوا ہا راجپوتوں کے شیخاوٹی علاقہ میں، جہاں بنہاٹا اور ریہ وارہ گاؤں تھے اپنا ٹھکانہ قائم کرلیا۔ لیکن مالدیو نے اس کو وہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ اس نے ایک فوج بیرم کو وہاں سے نکالنے کو بھیجی۔ بیرم نے آخری بار قسمت آزمائی کی سوچی لیکن اس کے مشیر پردھان کھیما مہتہ نے، جو رائے سال مہتہ کا لڑکا تھا اس کو ایسا قدم اٹھانے سے باز رکھا اور کہا "اگر مرنا ہی ہے تو پھر میدتا کی سرزمین کو ہی یہ شہادت کیوں نہ نصیب ہو" یہاں مورخین کے بیان میں اختلاف ہے۔ نینسی کے بیان کے مطابق بیرم پہلے ملرانا کے مسلم تھانیدار کے پاس گیا اور پھر رنتھمبور کے مسلم تھانیدار کی خدمت میں حاضر ہوا (۱۵۴۰ء)۔ یہ بات سچ بھی ہوسکتی ہے کہ خانخاناں ابوالفرح نے، جو کہ مانڈو کے فرمانروا قادر شاہ[1] (ملوخاں) کی جانب سے رنتھمبور کا قلعدار تھا بیرم کو مالوہ بھیجدیا تاکہ اسکو مالدیو کی اس فوج سے کوئی پریشانی نہ اٹھانا پڑے، جو کہ گرد و نواح میں چکر کاٹ رہی تھی۔ مگر بیرم ۱۵۴۲ء سے قبل شیر شاہ کی خدمت میں نہیں پہونچ سکا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ شیر شاہ رنتھمبور سے آگرہ واپس جارہا تھا۔

راؤ مالدیو کا بیکانیر کو اپنی سلطنت میں ملحق کرنا اس کے لیے میدتا پر حملہ کرنے سے بھی کم حق بجانب تھا۔ راؤ جودھا کے بھائی راؤ بیکا نے غالباً ۱۴۶۵ء کے آس پاس بیکانیر ریاست کی بنیاد ڈالی تھی اور اس وقت سے بیکانیر کا گھرانہ

---

[1] ریو کہتا ہے کہ قادر شاہ نے ۱۵۴۰ء میں بیرم کو شیر کے پاس جانے کا مشورہ دیا میں ریو کے مقابلہ نینسی کو زیادہ معتبر سمجھتا ہوں کیونکہ ریو ہر جگہ مالدیو کی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے (ریو مارواڑ کا اتہاس جلد ۱۔ صفحات ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۳) بیرم دیو کون تھا؟ اسکے متعلق ابھی مزید تحقیق ہوئی ہے۔ دیکھیے نینسی کی کھیات جلد ۲ صفحات ۱۵۵۔ ۱۵۷۔ اور بحث کے لیے دیکھیے۔ مترجم کا نوٹ صفحہ ۱۶۰ پر۔

Marfat.com

جودھپور ریاست کے لیے ایک قوی بازو بنا ہوا تھا۔ راؤ جیت مل مالدیو کے والد راؤ گانگا کا ہر مدافعانہ لڑائی میں مددگار رہا خواہ وہ لڑائی ناگور کے بھائی فوجدار کے خلاف تھی، خواہ راؤ گانگا کے چچا شیخا کے خلاف۔ لیکن مالدیو نے تخت نشینی کے بعد مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ یا تو وہ بیکانیر کو جودھپور کا باجگذار بنائے گا یا پھر اسے تلوار کے زور سے اپنی ریاست میں ملائے گا۔ جب شیر خضر خاں کی بغاوت دبانے کے لیے بنگال روانہ ہو گیا، تب مالدیو نے اس کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر دو ہزار فوج لے کر بنا کسی اشتعال کے بیکانیر پر حملہ کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ راؤ جیت مل نے اپنے وزیر 'ناگ راج' کو شیر شاہ کی خدمت میں مدد کی درخواست لے کر بھیجا اور خود مالدیو سے جنگ کرنے بیکانیر سے باہر آیا۔ ایک روز طلوعِ آفتاب سے پہلے مالدیو نے شبخون مار کر راؤ جیت مل کو قتل کر ڈالا اور جودھپور کی فوج نے بیکانیر کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ کے وفادار جانثار فوجدار نے دو سو گھوڑ سواروں کی نگرانی میں راؤ جیت مل کے لڑکے کلیان مل اور بھیم کو مع ان کے خاندان کے قلعہ سے باہر روانہ کر دیا۔ اس کے چوتھے روز بیکانیر کی فوج نے قلعہ کے دروازے کھول دیے۔ اور ایک ایک نوجوان نے میدان جنگ میں جام شہادت نوش کر لیا۔ مالدیو اپنے ہی قبیلہ و عزیز و اقارب کی لاشوں پر پیر رکھ کر بیکانیر کے خالی قلعہ میں داخل ہوا۔ جیت مل کے لڑکوں نے شیر شاہ کے علاقہ میں پناہ لے لی اور کہا جاتا ہے کہ بھیم شیر کے دربار میں گیا۔ وہاں مالدیو کے ظلم و ستم کا شکار میدتا کا بیرم پہلے سے ہی موجود تھا۔ بھیم اور بیرم دونوں نے شیر شاہ کے حضور میں اپنے لیے انصاف کی دہائی دی اور ظلم کا انتقام لینے کے لیے شیر کو ترغیب دی کہ وہ مارواڑ پر حملہ کرے۔ یہ واقعہ ۱۵۴۲ء کے آخری نصف میں ہوا جب شیر مالوہ کی مہم سے آگرہ واپس لوٹ چکا تھا۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح مالدیو کا غلبہ اور اقتدار روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور ریگستان کا منحوس سایہ شیر کی قسمت پر منڈرانے لگا تھا۔ شیر شاہ کو مالدیو کی جانب سے خطرہ محض اس کا ایک وہم نہ تھا بلکہ ایک حقیقت تھی۔

Marfat.com

شیر شاہ کے دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہونے سے جو تشویشناک کیفیت
پیدا ہو گئی تھی مالدیو اس جانب سے بے خبر نہ تھا۔ ۱۵۴۱ء کے شروع میں جب
ہمایوں شیر شاہ کے تعاقب سے بچ کر صحیح سلامت بھکر پہونچ گیا تب مالدیو نے
اس سے گفت و شنید جاری کر دی۔ مالدیو کی یہ تجویز تھی کہ قبل اس کے کہ شیر شاہ
اس کی سرحد کے نزدیک اپنی حکومت کو مستحکم کر سکے اس کے خلاف فوج کشی کرنی چاہئے
سیاسی دور اندیشی اور مصلحت کا یہ تقاضا تھا کہ مالدیو شیر کے خلاف کسی بھی جدوجہد
میں ہمایوں کو اپنا علم بردار بنائے کیونکہ ہمایوں کے میدان میں آنے سے نہ
صرف شیر کی مشکلات میں اضافہ ہوگا بلکہ رعایا بھی اس کے خلاف بغاوت کردیگی
دراصل ۱۵۴۱ء کے آخری نصف میں شیر شاہ بڑے ہی نازک دور سے گزر
رہا تھا۔ اس کے پاس آگرہ اور دہلی کی حفاظت کے لیے بہت کم فوج تھی۔ اس کی فوج
کا زیادہ تر حصہ یا تو پنجاب کی لڑائیوں میں مصروف تھا یا بنگال میں موجود تھا
مالدیو کے حق میں بہترین بات یہ تھی کہ شیر اس وقت دہلی سے ایک ہزار میل
دور اور آگرہ سے سات سو میل دور بنگال کے دار السلطنت گوڑ میں پھنسا ہوا تھا

جبکہ مارواڑ کی سرحد سے جہاں راٹھوروں کی فوجی چھاؤنیاں تھیں آگرہ اور دہلی سو
میل سے بھی کم فاصلہ پر تھیں۔ یہ شیر کی خوش قسمتی تھی کہ ہمایوں نے مالدیو کی عرض و
معروض پر کوئی توجہ نہ کی۔ بلکہ وہ ٹھٹھ کے شاہ حسین ارغون کے ساتھ خیالی پلاؤ
پکاتا رہا۔ بالآخر ایک سال تک متواتر مصیبتیں برداشت کرنے اور ناکامی کا منہ
دیکھنے کے بعد ہمایوں اپنے خواب شیریں سے بیدار ہوا۔ اور اس کی توجہ مالدیو کی
طرف مبذول ہوئی۔ کہ وہ اس کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ اور اسے اس کی تجویز پر غور
کرنا چاہیئے۔ اب مالدیو کی مدد اس کو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا معلوم ہوئی۔ ٹھیک ۱۲ ماہ
ضائع کرنے کے بعد ہمایوں نے مالدیو کے دعوت نامہ کا جواب بھیجا لہٰذا مالدیو نے
اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جس کا وہ مستحق تھا۔

بادشاہ ہمایوں کی سندھ اور مارواڑ میں آمد

(۲۶ جنوری ۱۵۴۱ء لغایت ۱۱ جولائی ۱۵۴۳ء)

Marfat.com

ہمایوں کے قبضہ سے دہلی کی سلطنت تو نکل ہی چکی تھی مگر ہنوز اس کو اپنی شکست وزیاں کا کوئی غم نہ تھا۔ اس کے دماغ پر تصوّف کا غلبہ تھا اور اس کی زندگی کا ہر عمل ایک راز بنا ہوا تھا۔ وہ اپنی قسمت پر قانع و صابر تھا۔ اور ہر مصیبت میں اپنے کو کچھوے کی طرح سمیٹے ہوئے تھا۔ زندگی کے جس طوفان میں ایک معمولی انسان کے پیر اکھڑ جاتے ہیں وہ اس کی شدت سے بے نیاز تھا۔ اس کے لیے یہ سب اللہ کی مرضی تھی۔ ایک بے باک امید پرستی ہی اس کی موجودہ ناقابل برداشت تکالیف زندگی اور مشتبہ مستقبل کی دہشت میں اس کی دست گیری کر رہی تھی۔ ایک مرتبہ لاہور کے مقام پر اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ اس کی نئی شادی ہو گئی اور اس کے یہاں ایک لڑکا ہوگا اس لڑکے کا نام بھی مشہور و معروف صوفی شیخ احمد کی روح نے بحالت مراقبہ اس کو بتایا تھا۔ ہمایوں تب سے ہی اس خواب کی تعبیر کا منتظر تھا۔ جب وہ جنوری ۱۵۴۱ء کے آخری ہفتہ میں خستہ حال روہڑی پہونچا تو اس نے بھکّر کے شاہ حسین ارغون کے فوجدار سے یہ مانگ کی کہ وہ اس قلعہ کو اس کے حوالہ کر دے اور اس کو وہاں سکونت پذیر ہونے دے۔ ہمایوں کے پیغام کو سچ مان کر ازراہِ ہمدردی و مروت انسانی فوجدار نے کئی صد کشتیوں پر غلہ لاد کر ہمایوں کے لشکر میں بھیج دیا۔ اس کے بعد ہمایوں نے شاہ حسین کے پاس فرمان بھیجا کہ وہ فوراً اس کے دربار میں حاضر ہو ورنہ اگر دیری کی تو وہ ٹھٹھہ پر حملہ کر دے گا۔ سندھ کے فرمانروا نے دور سے ہی ہمایوں کو اپنا سلام بھیجدیا اور چند روز کے حیلہ و حوالہ کے بعد روہڑی سے ہمایوں کے لشکر میں جانے والی سب رسد کو راستہ میں ہی ضائع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑائی شروع ہو گئی۔ ہمایوں کے پاس نہ توپخانہ تھا نہ کشتیاں۔ پھر بھی اس نے بذات خود اس جزیرہ کا گھیرا ڈال دیا اور مرزا ہندال اور یادگار مرزا کو جو دریا پار کر کے سندھ کے مغربی کنارے پر پاتر[1] کے مقام پر ڈیرہ ڈالے تھے سہوان کے

---

[1] پاٹ یا پاتر گاؤں کے کھنڈرات لرکانہ ضلع میں موجود ہیں۔ یہ سہوان سے ۴۰ میل بجانب شمال اور سندھ سے ۲۰ میل بجانب مغرب واقع ہے۔ (مہری والا اسٹڈیز صفحہ ۵۰۹۔)

Marfat.com

قلعہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا مگر مرزا لوگ آپس میں جھگڑتے رہے اور ہمایوں کا ساتھ چھوڑ کر بھاگنے کی بات سوچنے لگے۔ مصالحت کی غرض سے ہمایوں بذات خود روہری سے پاتر آیا لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ صورتِ حال بد سے بدتر ہو گئی۔ غلط فہمی اور شکوک بڑھ گئے۔ یہاں ہمایوں مرزا ہندال کے استاد و منظور نظر بابا دوست کی ایک ۱۴ سالہ لڑکی پر فریفتہ ہو گیا۔ اس واقعہ سے تمام گھر میں ایک طوفان بپا ہو گیا۔ لیکن ہمایوں نے بڑے صبر و اطمینان سے کام لیا۔ اس نے نجومیوں سے ساعت سعید نکلوائی اور خاموشی سے حمیدہ بانو سے نکاح کر کے اس کو روہری لے آیا۔ اس پر ہندال برگشتہ ہو گیا۔ اور وہ قندھار کی طرف چل دیا مگر یادگار ناصر مرزا کو ہمایوں نے بمشکل تمام پھسلا لیا اور اس شرط پر اس کو اپنے ساتھ روہری لایا کہ ہندوستان کی سلطنت کو تسخیر کرنے کے بعد ایک تہائی حصہ اس کو دیا جائیگا ہمایوں کو قوی امید تھی کہ جلد از جلد وہ اس کام میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہمایوں خود تو سیوہان چلا گیا مگر بھکر کے محاصرہ کی کمان یادگار ناصر کو سونپ گیا۔ اس اثنا میں شاہ حسین ارغون نے پینترا بدلا۔ اور یادگار ناصر کو بیوقوف بنا دیا۔ اس کو اس بات کا لالچ دیا کہ وہ اس کو بادشاہ تسلیم کرے گا۔ اس کو اپنا داماد بنالے گا۔ اور اس کو ٹھٹھہ کی ریاست اور اس کے لاتعداد مال و متاع کا واحد وارث قرار دے گا۔ یہ سن کر یادگار ناصر خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے تمام کشتیوں پر قبضہ کر لیا تاکہ ہمایوں دریائے سندھ کو پار نہ کر سکے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ بادشاہ کو گرفتار کرنے کی بھی راہ دیکھنے لگا۔ شاہ حسین ارغون ایک بہت بڑا بیڑا لے کر دریائے سندھ میں اترا۔ اور اس نے ہمایوں کی ان تمام کشتیوں پر جو کہ سیوہان میں لنگر انداز تھیں قبضہ کر لیا۔ ان میں اس کا تمام خزانہ لدا ہوا تھا اس کے ساتھیوں کے بیوی بچے سوار تھے۔ اس طرح سے شیر شاہ کے پنجے سے جو کچھ بچا کھچا تھا اب وہ بھی ہمایوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ دو مقامی زمینداروں کی مدد سے بمشکل تمام روہری کی جانب بچ کر نکل گیا۔ مگر یادگار ناصر اتنا سنگدل کمینہ نکلا کہ اپنے ہونے والے خسر کو خوش کرنے کی غرض سے وہ ہمایوں کے پڑاؤ پر حملہ کرنے اور اس کو قتل کرنے کو بھی آمادہ ہو گیا۔ اس کے اس رویہ سے مغل اتنے

Marfat.com

برافروختہ ہوگئے کہ ان میں سے ایک کثیر تعداد نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہر حالت میں وہ آئندہ بابر کے بدقسمت لڑکے کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ ہمایوں نے اپنے احسان فراموش بھائیوں کے مخدوش پڑوس سے دور رہنا ہی مناسب خیال کیا اور وہاں سے اپنا ڈیرہ اکھاڑ کر بے سروپا شمال کی جانب اوچہ کو روانہ ہوگیا۔ (۷ مئی ۱۵۴۲ء)

ہمایوں ہنوز عالم تذبذب میں تھا۔ کبھی وہ تن بتقدیر رہنے کی سوچتا تھا اور کبھی مدینۃ السلام ہجرت کرنے کی بات کرتا تھا۔ اس طرح سے وہ شرعی ناحق شناس اور انسانی جذبہ سے بے بہرہ دنیا سے پناہ گزیں ہونا چاہتا تھا۔ لیکن حمیدہ بانو بیگم کا کیا ہوگا؟ اس سے قبل ہمایوں نے اتنی گرما گرم محبت کسی عورت سے نہ کی تھی اس محبت نے جادو کا کام کیا۔ اس کو راہِ راست پر لے آئی اور اس کے فرائض کو عیاں کر دیا کہ اس کو ایک شوہر اور ایک بادشاہ کی حیثیت سے جدوجہد کرنا ہے۔ مشکلیں برداشت کرنا ہے اور بالآخر کامیابی حاصل کرنا ہے۔ پہلے تو اس نے غالباً یہ سوچا کہ قندھار پہونچ کر ہندال اور عسکری سے مصالحت کرے۔ کیونکہ باوجود ان کی گذشتہ ناہنجاری اور احسان فراموشی کے نہ تو اس کو اپنے بھائیوں کے متعلق کوئی شک و شبہ ہی تھا نہ اس کے دماغ میں کوئی دغدغہ تھا۔ چنانچہ اس نے اوچہ کی جانب اس مقصد سے کوچ کیا کہ بخشو لنگا کی امداد سے وہ دریا کو عبور کر کے اس پار پہونچ جائے گا۔ مگر جب وہ بخشو لنگا کے علاقہ میں داخل ہوا تو اس کو یہ پتہ لگا کہ اس کے سابق خانخاناں کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔ وہ اتنے کے لیے بھی تیار نہ تھا کہ ہمایوں اس کے علاقہ میں رسد فراہم کرنے کے لیے بھی رک سکے۔ ہمایوں کے لیے یہ انکشاف دل شکن تھا۔ کیونکہ وہ سندھ میں شیریں خوابوں میں محو تھا۔ اور ملتان اور اوچہ میں گذشتہ ۲ ماہ میں جو واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے وہ ایسے نہ تھے کہ اس کی نگاہ اس نازک حالت کی جانب پھیرتے جس میں کہ اب وہ اپنے کو پھنسا ہوا دیکھ رہا تھا۔

اس طرح مشکلوں میں گرفتار اور خطروں سے خوفزدہ ہمایوں کے قافلہ نے اوچہ سے جنوب مشرق کی سمت کوچ کیا اور وہ ہندوستان کے ریگستان میں داخل ہوگیا تاکہ مارواڑ پہونچ کر اپنی قسمت آزمائی کرے۔ مالدیو اس وقت تک

Marfat.com

ہمایوں کی جانب سے ناامید ہو چکا تھا۔ اس نے ۱۵۴۱ء کے آغاز میں مغلوں سے سلسلہ جنبانی شروع کی تھی لیکن یہ سلسلہ ناکام رہا۔ اگر روہری سے روانہ ہوتے وقت ہمایوں اور مالدیو کے درمیان نامہ و پیام ہوتا تو وہ اوچہ کی جانب ہرگز نہ جاتا۔ یہ بات ہمیں جوہر سے معلوم ہے۔ بیکانیر پہونچنے کے لیے یا بھکر سے مارواڑ کی کسی بھی سرحدی چوکی تک پہونچنے کے لیے روہری سے اوچہ کا راستہ اختیار کرنا ایسا ہے گویا کسی مثلث کے دو اضلاع کا سفر کرنا۔ روہری سے جیسلمیر ہوتے ہوئے پوکھرن جانا گویا مثلث کا تیسرا ضلع ہے۔ جس میں سب سے کم فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے پوکھرن جیسلمیر سے ۶۵ میل مشرق میں اور جودھپور سے ۸۵ میل شمال مغرب میں ہے۔ اگر ہمایوں نے روہری سے روانہ ہوتے وقت مالدیو کے علاقہ میں جانے کا ارادہ کیا ہوتا تو سہل ترین راستہ یہ تھا کہ وہ روہری سے چند میل مشرق میں منگول کے ریگستان میں پہونچ جاتا اور وہاں سے کارواں کے راستہ یا جنگلی ریگستان کو پار کرتا ہوا جیسلمیر شہر کے مغرب میں تقریباً ۲۵ کوس فاصلہ پر نکل جاتا۔ چونکہ اس وقت تمام ریگستانی علاقہ پر مالدیو کا غلبہ تھا اس لیے ہمایوں

۱؎ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب ہمایوں سندھ میں مقیم تھا مالدیو نے اس کے پاس نامہ و پیام بھیجے تھے لیکن ہمایوں اس وقت گجرات یا ٹھٹہ فتح کرنے کے منصوبے باندھ رہا تھا لہذا اس نے مالدیو کی تجویز پر کوئی غور نہیں کیا۔ سندھ میں سب کچھ کھو کر ہمایوں نے بحالت یاس کہا تھا "اچھا۔ میں مالدیو کے پاس جاؤں گا" ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اس کو لفظ بہ لفظ صحیح مان لیا ہے یہ ہمایوں کا فوری خیال تھا ویسا ہی جیسا کہ مدینہ جانے کا۔ اسی گلبدن کے بیان کو صحیح مان کر ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے کہ جب ہمایوں نے 'اَرو' کے پاس سے اپنے خیمہ اٹھالیے تو اس نے مارواڑ جانے کا مصمم ارادہ کیا لیکن ہمایوں کا اوچہ کی جانب کوچ کرنا خود اس بیان کی زبردست تردید کرتا ہے کیونکہ اوچہ کے راستہ سندھ کو پار کر کے محض قندہار ہی پہونچا جا سکتا تھا یادگار مرزا اور شاہ حسین نے بوجہ عداوت قندھار جانے کے دوسرے تمام راستے جو سکر ہو کر جاتے تھے میلوں تک بند کر دیے تھے۔ (ہمایوں نامہ صفحات ۲۰۹۔ ۲۱۰)

Marfat.com

اگر اس موقع پر مالدیو کو اپنے ارادہ سے مطلع کر دیتا تو پھر کس کی مجال تھی کہ سفر میں ہمایوں کو کوئی پریشان کرے[1] ہمایوں کو کم از کم جغرافیہ کا اتنا علم ضرور تھا کہ مارواڑ بھکر کے مشرق میں ریگستان کے اس طرف ہے نہ کہ بجانب شمال اوچہ کی طرف۔ اوچہ میں دھکے کھانے کے بعد ہمایوں روہری واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے اس کے پاس مارواڑ پہونچنے کا دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا علاوہ اس کے کہ وہ اوچہ سے ریگستانی علاقہ میں داخل ہو جائے۔ اس وجہ سے جوہر کا بیان زیادہ معتبر ہے کہ ہمایوں کا قافلہ ریگستان میں بغیر پتوار کے جہاز کی طرح گھومتا رہا اسے نہ اپنی منزل کا پتہ تھا نہ جادہ منزل کا۔ یہ محض حسن اتفاق تھا کہ چلتے چلتے انہیں مالدیو کا ڈیر اول[2] کا قلعہ دکھائی دے گیا۔

جوہر نے اپنے آقا ہمایوں کے اس ظلمت آمیز سفر کا بیان نہایت ہی رقت آمیز تفصیل سے کیا ہے۔ البتہ اس نے کہیں کہیں مقامات کے نام و تعین میں ضرور گڑبڑ کر دی ہے۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں اوچہ سے شمال مشرق مشرق میں روانہ ہوا۔ اسکی حالت خستہ و زبوں تھی۔ نہ اسے اپنی منزل کا نشان معلوم تھا نہ اپنے نصب العین کا گمان۔ نہ اس کے پاس رسد ہی تھی۔ وہ تقریباً ۱½ ماہ تک جنگلات میں دربدر بھٹکتا رہا۔ اس عرصہ میں سنکر کے بیج اور پھل اسکی غذا تھی[3] پھر دفعتہً انہیں دلاور[4] کا قلعہ دکھائی پڑا جو مالدیو کی سلطنت میں تھا۔

---

[1] نظام الدین لکھتا ہے "یادگار ناصر کی غداری کے بعد ہمایوں نے مالدیو کے پاس جانے کی سوچی" (ایلیٹ جلد ۵ صفحہ ۲۱۰۔ ۲۱۱) لیکن یہ حالات کا صحیح جائزہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کہتے ہیں کہ ہمایوں نے اُرڈے سے اوچہ کا راستہ پکڑا۔ دراصل ارور روہری سے نزدیک ہے اور جیسلمیر میں بمقابلہ ارور اور اوچہ کم فاصلہ ہے۔ جیسلمیر جانے والا راستہ اس راستے سے کسی جگہ نہیں ملتا۔ اس لیے یہ بات غلط ہے اور الجھن میں ڈالتی ہے (ہمایوں، صفحہ ۲۲۱)

[2] مجھے اس قسم کے پیڑ کا علم نہیں ہے۔ یہ ڈیر اول سے ملتان اور سندھ جانے والے راستہ میں کہیں اگتا ہوگا۔ البتہ جنگلی بیر ضرور ہوتے ہیں جو چھوٹی چھوٹی خاردار جھاڑیوں پر لگتے ہیں اور بیر کی مانند ہوتے ہیں۔ یہ جھاڑیاں مارواڑ سے مکران بلوچستان کے راستہ کی پہاڑیوں

Marfat.com

ہمایوں نے یہ سفر غالباً جولائی ۱۵۴۲ء کے آخر میں کیا ہوگا جب ساون کا سہانا موسم ہوتا ہے اور ریگستان میں ہر چار سو ہریالی لہرانے لگتی ہے اور جنگلی بیر پک جاتے ہیں .یہی وہ بیر ہونگے جن کو جوہر نے اس وقت کھایا ہوگا۔ آج بھی ریگستان کے غریب باشندہ اس بیر کے آٹے کی روٹیاں بنا کر کھاتے ہیں۔

مئی سے جولائی ۱۵۴۲ء تک ہمایوں کے وفادار ساتھیوں کو ایک لمحہ کو بھی آرام نصیب نہ ہوا۔ وہ متواتر پا بہ رکاب رہے۔ نہ کہیں سر چھپانے کو جگہ تھی نہ آسائش کا سامان۔ ۵۰ سال بعد جوہر کو ان پریشانیوں کی یاد جو کہ اس نے اپنے شاہی آقا کا ہمسفر ہونے میں برداشت کی تھیں، تازہ ہوگئیں مگر اس تکلیف وہ جانبازی کا بہت سا حال فروگزاشت بھی ہو گیا ہوگا۔ مغل محض بیر کھا کر ہی زندہ نہ رہے ہونگے اور بیر بھی تو ریگستان میں بہ افراط نہیں پیدا ہوتے۔ انہوں نے سوداگروں کے کاروانوں کو لوٹا ہوگا۔ کیونکہ ریگستان کا قانون ایسے فعل کو جائز مانتا ہے وہاں تو اخلاق۔ زر۔ اور خون کسی بھی اصول کی پرواہ نہیں کی جاتی ہے۔ بادشاہ کو

جنگلوں اور ریت کے ٹیلوں پر بہ افراط پائی جاتی ہیں۔ دیہاتی مستورات اکثر ان بیروں کو کھا کر گزارہ کرتی ہیں یا ان کا سفوف آٹے میں ملا کر اپنی بھوک رفع کرتی ہیں۔

۱؎ جوہر نے دلاور لکھا ہے۔ آج کل نقشہ میں یہ ڈیراول ہے۔ نینسی نے اپنی کھیات میں اس مقام کو ڈیراور لکھا ہے۔ اس کے متعلق ایک روایت یہ ہے کہ دیوراج بھاٹی کو جو جیسلمیر ریاست کا بانی تھا اس کے ماموں بھٹو نے اتنی زمین دینے کا وعدہ کیا کہ جتنی کہ ایک بھینس کی کھال سے ڈھک سکتی ہے۔ دیوراج نے بھینس کی کھال کی باریک دھجیاں بنائیں اور زمین کی پیمائش شروع کر دی۔ اس رقبہ میں اس نے ڈیراول کا قلعہ بنایا۔ اس کے مغرب میں سندھ کی جانب ۴۰ کوس ویران ہے اور مارواڑ کے جنوب مشرق میں ۶۰ سے ۸۰ کوس تک ریگستان ہے۔ وہاں اس نے میٹھے پانی کے ۴ کنویں کھدوائے۔ ایک تالاب قلعہ کے - - - - - - - - -

- - - - - - - - اندر بنوایا۔ ایک قلعہ کی کھائی کے باہر بنوایا۔ سندھ کی تمام سرحد پر یہ قلعہ بہت مشہور ہوا۔ سندھ اور ملتان سے کارواں کا راستہ اسی قلعہ کے پاس سے گزرتا تھا۔ (کھیات جلد ۲ صفحات ۲۶۶ - ۲۶۷)

Marfat.com

سب سے اول نہیں بلکہ سب سے آخر میں کھانا ملتا ہوگا۔ اس کی پانی کی بوتل بھی سب سے آخر میں بھری جاتی رہی ہوگی اور کبھی خالی بھی رہ جاتی ہوگی اور کوئی رحمدل گھوڑا دیدیتا ہوگا تو وہ اس پر سوار ہو جاتا ہوگا۔

یہ وحشتناک سفر بھی ظرافت سے خالی نہ تھا۔ ایک بار جوہر کے آقا نے اپنے ایک سپاہی کو پانی کا راشن دینے سے پہلے اس سے قرضہ کی فارخطی لکھوائی۔ یہ قرضہ ہمایوں نے کبھی اپنی ضرورت پورا کرنے کے لیے لیا تھا۔ بادشاہ قرضہ میں نہیں مرنا چاہتا تھا مبادا کوئی قرضخواہ حشر کے روز دامنگیر ہو۔ گلبدن نے اس قسم کے دیگر واقعات جو اس نے حمیدہ بانو سے سنے تھے قلمبند کیے ہیں۔ فاقہ اور طویل سفر سے مغل اس قدر بے قرار ہو گئے تھے کہ انہوں نے تہیّہ کر لیا کہ وہ ڈیرا اول پر جبراً قبضہ کر کے اسی نخلستان میں بود و باش اختیار کر لیں گے۔ حالانکہ ہمایوں بھی اپنے ساتھیوں سے کم آزردہ خاطر نہ تھا۔ مگر اس نے اپنے شاہی وقار اور خودداری کو نہ چھوڑا اس نے متذکرہ بالا تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اگر تمام کائنات بھی اس کو مل جائے تو بھی وہ ایسی مکروہ حرکت نہ کرے گا۔ چنانچہ اس نے جانبازوں کو یہ اشارہ کیا کہ اگر انہوں نے ایسا کوئی کام کیا تو مالدیو کی مدد سے دہلی کے تخت کی تسخیر کی تجویز پر پانی پھر جائے گا۔ وہ لوگ اس بات کو مان گئے کچھ روز آرام کرنے کے بعد ہمایوں کا قافلہ ڈیرا اول سے پھلودی کے لیے روانہ ہوا۔ اس سفر میں پانی کی قلت سے اسکے ہمراہیوں کو بہت تکلیف ہوئی۔ ان کا دوسرا پڑاؤ جیسلمیر علاقہ میں برسال پور[1] تھا

---

[1] جوہر گلبدن اور ابو الفضل نے سفر کا جو نقشہ دیا ہے اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ڈیرا اول کے بعد بالترتیب پیل پور (بائل پور) سائلیر اور واصل پور مقامات پر ڈیرہ ڈالا۔ ہمایوں کے جاتے وقت پھلودی کے بعد ساتلیر کا دکھایا سمجھ میں نہیں آتا۔ پھلودی سے باہر جاتے وقت تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہمایوں نے وہاں قیام کیا ہو جیسا کہ ابوالفضل اور میر معصوم کہتے ہیں۔ واصل پور کی جگہ برسال پور ہونا چاہیئے۔ جو سرکار بیکانیر کا ایک محال ہے۔ (آئین جلد ۲ صفحہ ۲۷۰) (ہودی والا اسٹڈیز صفحہ ۵۹) بوگل کے ماویرسالی بھاٹی نے جیسلمیر کے مشرق میں بیگم پور کی ترائی میں اس قصبہ کو بسایا تھا۔ جس نے بیگم پور کا جو جائے وقوع بتایا ہے اس سے ہمایوں کے سفر کا نقشہ سمجھنے میں ملتی ہے۔ یہ پھلودی

Marfat.com

جہاں انہیں ایک تالاب اور چھوٹا دریا نظر آیا۔ اس کے بعد ہمایوں کا قیام ایک گمنام جگہ پر ہوا جسے ابوالفضل نے بیکانیر سے ۴۰ کوس بتایا ہے۔ ہمایوں اس جگہ ۷ ربیع الآخر ۹۴۹ ہجری مطابق ۳۱ جولائی ۱۵۴۲ء[1] پہونچا۔ آخر کار مغل قافلہ پھلودی میں داخل ہو گیا جو کہ پوکھرن سے ۲۰ میل شمال مشرق اور جودھپور سے ۱۵ میل شمال۔ شمال مغرب ہے۔ یہ قافلہ اگست ۱۵۴۲ء کے شروع ہفتہ میں پہونچ گیا۔

ہمایوں کی آمد کی خبر مالدیو کو پہلے سے ہی ڈیراول کے سرحدی قلعہ سے مل گئی ہو گی۔ بادشاہ کا اوّلین استقبال نہایت ہی گرمجوشی اور مہمان نوازی سے ہوا۔ گلبدن بیگم رقمطراز ہے کہ اس منزل یعنی پھلودی کے مقام پر مالدیو کی جانب سے نقرئی مہروں کی پیش کش آئی۔ اور یہ فیاضانہ پیغام موصول ہوا کہ "میں آپ کو بیکانیر دیتا ہوں"[2] مگر ہمایوں نے طویل سفر کی یہ زحمت محض بیکانیر جیسی ادنیٰ چیز کے لیے نہ برداشت کی تھی۔ چنانچہ حسب معمول بلا لحاظ وقت و کیفیتِ حال کے ہمایوں نے شاہانہ تکبر و نخوت کا رویہ اختیار کر کے اتکہ خاں کو مالدیو کے پاس سفیر بنا کر بھیجا اور بذریعہ فرمان اقدس اس سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ بذاتِ خود اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہو[3] مگر قبل اس کے کہ راؤ مالدیو کوئی آخری فیصلہ کر سکے جس بڑی سرعت سے شیر شاہ جودھپور کے بالکل قریب پہونچ گیا تھا۔

. . . . سے ۲۵ کوس۔ جیسلمیر سے ۷۰ کوس اور بیکانیر سے ۴۰ کوس ڈیراول سے ۶۰ کوس اور پوگل سے ۴۴ کوس ہے۔

[1] اکبر نامہ جلد ا صفحہ ۲۷۰۔ شاید اس تاریخ کو مغل "جوگی کا تالاب" مقام پر تھے۔ جودیپات تالاب اور جوگی تیرتھ کے نزدیک ہے۔ اور 'وٹنوک' کے قرب و جوار میں ہے۔ وٹنوک بیکانیر سے جنوب مغرب ۷ اکوس اور 'جوگی کا تالاب' سے مغرب کی جانب ۴ یا ۵ کوس ہے۔ ابو الفضل بیکانیر سے ۲۱ کوس بتاتا ہے۔ جو ٹھیک ہے دجوگی کا تالاب اور وٹنوک کے لیے مانیسی کھیات جلد ۲ صفحہ ۳۵۵)

[2] ہمایوں نامہ صفحہ ۱۵۴۔

[3] جوہر نسخہ صفحات ۷۶۔ ۷۸۔ اسٹیورٹ صفحات ۳۶۔ ۳۸۔

Marfat.com

اس نے ہمایوں اور مالدیو دونوں کا طرزِ عمل طے کر دیا۔ دونوں کو اپنی سازش و پریشانی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

شیر شاہ کی آمد اور راؤ مالدیو کو شکست

شیر شاہ کی روز افزوں طاقت پر مغل راجپوت متحدہ حملہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے مالدیو کے حساب شمار میں وقت کا خیال ایک نہایت ہی اہم جزو تھا اس کی یہ بد قسمتی تھی کہ ہمایوں نہایت اطمینان سے وقت کی دُم پکڑے ہوئے تھا جبکہ شیر شاہ نے اس کے کاکل پکڑ کر دونوں کو دفعتہً سکتہ و شکست کے عالم میں ڈال دیا۔ مالدیو تو ۱۵۴۱ء میں یہ امید لگائے ہوئے تھا کہ ہمایوں اس سے آملے گا۔ اس کے پاس اس وقت ۲۰ ہزار فوج تھی۔ اور اس نے ہمایوں سے دوبارہ اصرار کیا تھا کہ وہ جلد از جلد کوچ کر دے[1] ایک جاگیردارانہ فوج غیر متعین وقت تک خدمت گذار نہیں رہ سکتی تھی۔ لہٰذا ۱۵۴۲ء میں مالدیو اس حالت میں نہ تھا کہ ہمایوں کے ساتھ جو اس نے وعدہ کیا تھا اس کو شیر شاہ کے ساتھ دشمنی مول لے کر وفا کر سکتا۔ مالدیو کے لیے اوّل تعجب انگیز واقعہ تھا ملوخاں کی طاقت کا مکمل انہدام اس کو یہ امید تھی کہ جب مارواڑ کی فوجی امداد سے ہمایوں دہلی اور آگرہ پر حملہ آور ہوگا تو ملوخاں شیر شاہ کے بازو کو دھر دبوچے گا۔ مالدیو نے نہایت ہی محنت و جانفشانی سے راٹھور ریاست کی مشرقی راجپوتانہ میں بیرونی تحفظ کی تکمیل کی تھی۔ شیر شاہ نے چشم زدن میں اس کو تہ و بالا کر دیا۔ اور مالدیو اپنی فوج بھی جمع نہ کر پایا۔ چنانچہ ایک سال بعد صورت حال یک قلم بدل گئی۔ حملہ آور ہونے کے بجائے اب مالدیو کو شیر شاہ کی قربت سے بچنے کی فکر دامنگیر ہونے

---

[1] بیکانیر کے خلاف مالدیو نے ۲۰ ہزار فوج اکٹھی کی تھی۔ پھر ایک خط میں ہمایوں کو ۲۰ ہزار فوج کی مدد دینے کے لیے لکھا تھا۔ غالباً یہ دونوں باتیں ۱۵۴۱ء کی ہوں گی۔ مالدیو کے خط کے لیے دیکھیے گا معصوم اور بیکانیر کے خلاف فوج فراہم کرنے کے لیے دیکھیے گا ریو۔ مارواڑ کا اتہاس جلد ۱۔ صفحہ ۱۲۵۔

Marfat.com

لگی۔ پھر بھی مالدیو خاموش نہ بیٹھا شیر شاہ کے آگرہ واپس جانے کے بعد مالوہ میں جو شورش بپا ہوئی اس کی تہ میں اس کی سازش رہی ہوگی۔ مالوہ میں باغیوں کی تخریبی کاروائی اور مفرور قادر شاہ کا مالوہ پر حملہ غالباً دونوں مالدیو کی آخری کوشش تھیں کہ کسی طرح شیر شاہ کی توجہ مالوہ کی جانب مبذول ہو جائے

شیر شاہ ہمایوں سے تو بخوبی واقف تھا مگر مالدیو اس کے لیے ایک ناآشنا فرد تھا۔ جس کی لامحدود طاقت و تسلط کا دبدبہ ریگستان کے سایہ کے پس پردہ تھا۔ چنانچہ اس نے ہر خطرہ کے مقابلہ کی تیاریاں کیں۔ مگر وہ دل سے یہ نہ چاہتا تھا کہ مالدیو کے باغیوں کی سرکوبی کرنے سے بیشتر مالدیو سے برسرِ پیکار ہو۔ اس کے دونوں صدر مقاموں میں دہلی آگرہ کے مقابلہ میں کم محفوظ تھی۔ کیونکہ شیر نے رنتھمبور کے قلعہ کو فتح کر کے اور کچھواہا علاقہ کو سلطنت میں شامل کر کے اجمیر کی جانب سے آگرہ پر مالدیو کے حملہ کے امکانات کم کر دیے تھے۔ لیکن شیخاواٹی کا اہم علاقہ ہنوز مالدیو کے قبضہ میں تھا۔ اس علاقہ سے دشمن کی رسائی ریواڑی تک ہو سکتی تھی۔ اور غنیم الور کے فوجدار سے بچ کر دہلی اور

آگرہ کے درمیان اپنی فوج فراہم کر سکتا تھا۔ ایسی حالت میں دشمن کے علاقہ پر پہلے ہی حملہ کرنا شیر شاہ نے اپنی حفاظت کا بہترین ذریعہ سمجھا۔ لہٰذا شیر نے شیخاواٹی کے علاقہ سے ناگور پر حملہ کرنے کی اسکیم بنائی۔ ناگور مالدیو کی سلطنت کا شمالی دروازہ تھا یہاں سے دہلی پر آسانی سے فوج کشی کی جا سکتی تھی۔ شیر نے ہیبت خاں نیازی کو حکم دیا تھا کہ وہ ملتان اور لاکھی جنگل کے باغی بلوچوں اور جاٹوں کے خلاف پنجاب کی فوج لے کر حملہ کرے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر راجپوت اور مغلوں کی فوج متحدہ ہو کر دہلی کی جانب کوچ کرے گی تو اس کو اور ہیبت خاں نیازی کی فوجوں کو متحد ہونے کے لیے ناگور ہی سب سے بہتر مقام ہوگا۔ اس کے برعکس مالدیو کا خیال تھا کہ شیر کا حملہ اجمیر کے محاصرہ سے شروع ہوگا۔ وہاں اس نے اپنی حفاظت کی مکمل تیاریاں کر لی تھیں۔ لیکن شیر فن جنگ کا ماہر تھا۔ وہ نہ تو مالوہ واپس گیا نہ اس نے اجمیر پر ہی حملہ کیا۔ جب برسات زوروں پر تھی وہ آگرہ میں بغیر زیادہ دن قیام کیے شیخاواٹی کے علاقہ میں داخل ہو گیا۔ اور ناگور کی جانب

Marfat.com

چل پڑا۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ ادھر ہمایوں پھلودی کے نزدیک پہونچا اور ادھر ناگور پر شیر شاہ کا قبضہ ہو گیا۔ ناگور جودھپور سے شمال۔ شمال مشرق میں براہِ راست محض ۷۰ میل تھا۔

نظام الدین[1] شاہد ہے کہ جب اگست ۱۵۴۲ء کے دوسرے ہفتہ میں ہمایوں کا سفیر جودھپور پہونچا تو ناگور اور اس کے گرد و نواح کے علاقہ پر شیر کا قبضہ ہو چکا تھا لیکن ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ آگرہ سے ناگور تک کا سفر شیر شاہ نے کس راستہ سے کیا۔ چونکہ ہمایوں کا نشانہ شاہی دہلی کے علاوہ اور کوئی دوسری جگہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے یہ خیال کرنا زیادہ قرین قیاس ہے کہ شیر نے اپنی فوج دہلی اور مارواڑ کی مغربی سرحد پر واقع چوکیوں کے درمیان کہیں لگائی ہوگی۔ کیونکہ دشمن کی یہ چوکیاں دہلی کے بہت نزدیک تھیں۔ جس سے حملہ کا زبردست خطرہ ہر وقت بنا رہتا تھا۔ لہٰذا شیر پہلے تو آگرہ سے براہِ راست میوات کے علاقہ سے گزر کر شیخاواٹی پہونچا ہوگا جو مالدیو کا اطاعت کیش تھا اور اس پر اپنا تسلط کرنے کے بعد ناگور اور اس کے قرب و جوار کے علاقہ پر مثلاً دیدوانہ وغیرہ پر حملہ کیا ہوگا۔ یہ علاقہ جودھپور سے شمال مشرق میں تقریباً ۱۳۰ میل ہے۔ ہمارے پاس نظام الدین کے بیان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ جودھپور کے سفیر بھیجنے سے پیشتر ہی شیر ناگور فتح کر چکا تھا۔ اس نے مالدیو کے سامنے یہ دلفریب تجویز پیش کی کہ اگر وہ ہمایوں کو زندہ گرفتار کرے یا اسے مارواڑ کے علاقہ سے جلاوطن کر دے تو شیر اس کو ایک کافی بڑا علاقہ بطور انعام دیگا۔ جس سے اس کی سلطنت کی حدود میں اضافہ ہو جائے گا۔

اب مالدیو پس و پیش میں پڑ گیا۔ اس کے پاس جو فوج تھی وہ اس کے جاگیرداروں اور رشتہ داروں نے فراہم کی تھی۔ اس کی مستقل فوج مختلف تھانوں اور قلعوں پر تعینات تھی جو چتوڑ کے قرب و جوار سے لے کر گجرات اور

---

[1] طبقات اکبری۔ صفحہ ۲۰۶۔ ایلیٹ جلد ۵۔ صفحات ۲۱۱۔

Marfat.com

جیسلمیر تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس فوج کو ایک مہینہ کے عرصہ میں بھی فراہم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ ہمایوں سے ملنے بذات خود اس لیے نہیں گیا کہ پھر واپس لوٹنے کا راستہ بند ہو جاتا اور ضرورت پڑنے پر وہ شیر سے یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ ہمایوں کا اس کی سلطنت کی حدود میں آ نا محض ایک اتفاق تھا۔ مالدیو یہ بھی جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن اسکو اپنے تحفظ کیلئے شیر شاہ سے لڑنا ہی ہوگا لہٰذا کیوں نہ مغل بادشاہ کو اپنے ساتھ لے کر مورچہ لیا جائے۔ اس سے کم از کم ایک فائدہ تو یہ ضرور ہوگا کہ اس کو شیر کے خلاف لڑنے کا اخلاقی حق حاصل ہو جائیگا لیکن اس نے مغلوں سے مدد ملنے کا جو اندازہ لگایا تھا وہ سب غلط ثابت ہوا۔ مالدیو کو یہ امید تھی کہ ہمایوں کی مدد کرنے سے ہمایوں کے سب بھائی اور نخشٹہ کے سب مغل شاہی پرچم کے نیچے اکٹھے ہو جائیں گے لیکن اب اس نے دیکھا کہ ہمایوں کے پاس صرف دو یا تین ہزار سپاہی ہیں اور وہ بھی نہایت خستہ حالت میں اس کو اپنا مستقبل تاریک معلوم ہونے لگا۔ اب اس کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے۔ یا تو ارادۃً شیر سے لڑ کر اپنی تباہی اور بربادی کا سامان فراہم کرے یا مدعو مہمان کے ساتھ غداری کر کے راجپوت شجاعت اور مردانگی میں بٹہ لگائے۔ ایک طرف شیر تلوار کے زور سے اس کو اپنی شرط ماننے کے لیے مجبور کر رہا تھا۔ دوسری طرف اس کا کوئی ارادہ بیکس و بے چارے ہمایوں کو اس حالت میں دھوکہ دینے کا نہ تھا۔ کم از کم مالدیو کی زندگی کے آئندہ واقعات سے یہ ہی نتیجہ نکلتا ہے۔

کچھ عرصہ تک مالدیو عالم تذبذب اور پس و پیش میں رہا اور یہی وجہ تھی کہ مغل بادشاہ کی جانب سے اس کی بے التفاتی بڑھتی گئی۔ اس کے برعکس ہمایوں بلا وجہ ہی مالدیو کی نیت پر شک کرنے لگا تھا یہ صحیح ہے کہ اس کے پاس جودھپور سے اس امر کی کوئی اطلاع نہ حاصل ہوئی کہ وہاں جنگ کی تیاریاں ہو رہی ہیں یا اس کو دہلی کا تخت واپس دلوانے کے لیے فوج اکٹھا ہو رہی ہے اگر ہمایوں نے مالدیو کے دعوت نامہ کو اس وقت فوراً قبول کر لیا ہوتا جبکہ شیر شاہ بنگال میں مصروف تھا۔ اور وہ مارواڑ چلا آتا تب

Marfat.com

تو مالدیو کا فعل قابلِ مذمت ہوتا۔ مگر اب صورت حال بدل چکی تھی۔ اور اس میں مالدیو کا کوئی قصور نہ تھا۔ اب مالدیو اور ہمایوں کا مستقبل بالکل ہی یکساں تھا۔ دونوں ہی ایسے ریگستان میں ہمسفر تھے جہاں پانی بھی دستیاب نہ تھا۔ ایسے مسافروں کے نفس میں یہ مروت نہیں ہوتی کہ وہ یہ کہہ سکیں کہ آپکی ضرورت میری ضرورت سے زیادہ ہے کیونکہ اس قسم کی قابلِ تحسین کمزوری سے دونوں کی مرگ کا اندیشہ رہتا ہے۔ مارواڑ سے امرکوٹ کے سفر میں ہمایوں کو جو مصائب جھیلنا پڑے اس سے متاثر ہوکر تیموری مورخین نے ایسے نازک موقع پر مالدیو کی نیت و فعل پر نہایت ہی سختی سے تبصرہ کیا ہے۔ انھوں نے جو بے وفائی کا صریحاً الزام مالدیو کے کردار پر لگایا ہے وہ سراسر بیجا ہے نہ اس کا کوئی ثبوت ہی دستیاب ہے۔ اگر مالدیو اپنی رعایا کے متعلق اپنی ذمہ داری کو نظر انداز کرکے راجپوتی آن کے شایاں کام کرتا تو بحیثیت ایک فرد کے اس کو اپنے وعدہ کو وفا کرنے کی ستائش تو مل جاتی مگر اس کی بیحد مہنگی قیمت ادا کرنا پڑتی۔ کیونکہ اس صورت میں اس کو لامحالہ ہزاروں لوگوں کی جان و مال کی تباہی سے دوچار ہونا پڑتا۔ اس کے طرزِ عمل کو زیادہ سے زیادہ اخلاقی بزدلی کہہ سکتے ہیں نہ کہ غداری۔

اس وقت جودھپور کے دربار میں دو مغل موجود تھے۔ ایک تو اتکہ خاں تھا جسے ہمایوں نے مالدیو کے ارادہ اور نیت کا پتہ لگانے کے لیے بھیجا تھا۔ دوسرا ملّا سرخ تھا جو ہمایوں کا سابق مہتمم کتب خانہ تھا۔ مالدیو چونکہ عرصہ دراز سے مغل اور راجپوتوں کا ایک مشترکہ محاذ بنانے کی فکر میں تھا۔ اس نے اس ملّا کو بہت دنوں سے اپنی خدمت میں داخل کر لیا تھا۔ اس وقت تک جودھپور میں عربی اور فارسی کا کوئی ایسا کتب خانہ تھا جہاں عربی اور فارسی عالموں کی ضرورت محسوس ہوتی۔ ملا سرخ شیر شاہ کے سفیر کے ساتھ مالدیو کے چاپلوس رویہ کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس قسم کا رویہ عموماً اپنے سے قوی تر بادشاہ کے سفیر کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس نے خوفزدہ ہوکر ہمایوں کو ایک ایسا خط لکھا گویا کہ اس نے شیر کا وہ خط پڑھ لیا ہو جو اس کا سفیر مالدیو کی خدمت میں لایا تھا۔ گلبدن نے بھی اس

Marfat.com

واقعہ کا بیان ایسے الفاظ میں کیا ہے گویا اس نے شیر کے پیغام کو خود سنا ہو۔
اس نے لکھا ہے کہ "جہاں کہیں بھی آپ مقیم ہوں وہاں سے فوراً ہی کوچ کر دیں۔
مالدیو کا ارادہ آپ کو قید کرنے کا ہے۔ اس کے وعدہ پر کوئی اعتبار نہ کیجئے۔
یہاں شیر شاہ کا خط لے کر ایک سفیر آیا تھا جس میں مالدیو کو یہ لکھا گیا تھا کہ جس
طرح سے بھی ہو سکے آپ بادشاہ کو قید کر لیں۔ میں آپ کو ناگور، اور اور جو بھی
علاقہ آپ چاہیں آپ کو دیدوں گا"[1]

ظاہر ہے کہ ملا سُرخ نے اپنے شکوک ہمایوں کے سفیر پر ظاہر کیے ہونگے[2]
اتکہ خاں بنا کسی اطلاع و اجازت کے جودھپور سے چلدیا۔ تاکہ دربار کی صورتحال
سے اپنے آقا کو آگاہ کر دے۔ اگر مالدیو کے دل میں کسی قسم کی بدگمانی یا غداری
کا خیال ہوتا تو اس میں اتنی طاقت تھی کہ وہ سالم راجپوتانہ میں ہر ایک مغل کو
زندہ گرفتار کر لیتا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ہمایوں کے سفیر کا دربار سے اس طرح بھاگنا
مالدیو کی ایما سے ہی ہوا ہوگا کیونکہ وہ خود چاہتا تھا کہ اس بلا سے جتنی جلدی ہو
نجات ملے۔ جس سے معاملات میں زیادہ پیچیدگی نہ ہو۔ بہر حال ہمایوں کی
جلد از جلد مراجعت اور جودھپور سے اس کے سفیر کی واپسی نے مالدیو کے لیے
ایسی صورت حال پیدا کر دی جس سے کہ اس کو کچھ راحت مل جائے۔ چنانچہ
اس نے کچھ سوار مغلوں کے تعاقب میں روانہ کر دیے تاکہ سنگدل شیر شاہ کو

جو اس کے علاقہ میں جما بیٹھا تھا منہ دکھا سکے۔

جودھپور سے ہمایوں کے بھاگنے کی کہانی مختصر اور دردناک ہے۔ بدقسمت
بادشاہ عالم سراسیمگی میں پھلودی۔ ساتل میر۔ پوکھرن کے راستہ سے ہو کر دو جیسلمیر
کے علاقہ کی طرف بھاگا۔ جوہر نے مارواڑ کی سرزمین میں ہمایوں کی زندگی کے آخری
سانحہ کو یوں بیان کیا ہے۔

"ایک روز صبح کو دکھائی پڑا کہ دشمن کے تین دستے جن میں سے ہر دستہ
میں تقریباً ۵۰ سوار تھے ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔۔۔ تمام سامان گھوڑوں

---

[1] ہمایوں نامہ صفحہ ۱۴۴۔ [2] دیکھیے طبقات ایلیٹ جلد ۵ صفحہ ۲۱۲۔

Marfat.com

کی پشت پر سے اتار کر اونٹوں پر لاد دیا گیا۔ اور پیادہ سپاہیوں کو گھوڑوں پر بٹھا دیا گیا لیکن ان کی تعداد صرف ۱۶ تھی۔ اعلیٰ حضرت کے پاس گھوڑا نہیں تھا۔ شیخ علی صرف، پیادوں کو لے کر دشمن کے خلاف آگے بڑھا۔ جب یہ لوگ دشمن کے نزدیک پہونچے انہوں نے اپنے ترکش سے تیروں کی بوچھار شروع کر دی۔ اللہ کے فضل سے فتح نصیب ہوئی۔ تیروں کی بوچھار سے دشمن کے ۲ سپاہی زخمی ہو گئے (اسٹورٹ کے غلط ترجمہ میں سپاہی کے بجائے سردار لکھا ہے) اور گھوڑوں سے گر پڑے۔ باقی ماندہ فوج تتر بتر ہو گئی۔[1]"

جس فوج کے بل بوتے پر مالدیو نے متواتر ۱۵ سال تک بہت سے سنگ پشت دشمنوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا تھا اس کے سپاہی کسی ایسی مٹی کے بنے تھے جو کہ اس سے بہتر تھی۔ چنانچہ اس معاملہ پر جوہر کی شہادت سند ہے۔ اور مالدیو پر غداری کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ لہٰذا اس واقعہ پر کہ ۱۵۰۰ راٹھور شہسوار ہمایوں کو گرفتار کرنے میں ناکام رہے کسی قسم کی بھی تنقید بیکار ہے۔ اگر خون کی پہلی جھلک کو ہی دیکھ کر مالدیو کے سپاہی سات مغلوں کے سامنے سے ہی بھاگ کھڑے ہوئے تو غالباً شیر کے ایجنٹ کو دھوکہ دینے کے لیے یہ ایک بہانہ تھا۔ یہ پرجوش قصہ اس کے گوش گذار کیا گیا ہوگا کہ کیسے مغلوں کا تعاقب کیا گیا اور اس میں راجپوتوں کو کتنا نقصان اٹھانا پڑا۔ تعاقب کرنے والے دستوں کو مالدیو نے کچھ اور ہی ہدایت دی ہوگی اور اس نے یہ نہ کہا ہوگا کہ مفرور مغلوں کو گرفتار کریں۔ چنانچہ سپاہیوں نے ایسا ہی کیا۔[2]

جب ہمایوں بلا کسی اطلاع کے جیسلمیر کی حدود میں داخل ہو گیا اسی وقت سے اس کے مصائب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں اس کے ساتھیوں نے نہایت ہی مکروہ کام کیے۔ جن سے کہ راجپوتوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگی انہوں نے سینگ والے متبرک جانوروں (گائے) کو پکڑ کر ذبح کیا اور ان کے گوشت سے

---

[1] جوہر نسخہ صفحات ۸۰-۸۱۔ اسٹیورٹ صفحہ ۳۹ (صحیح نہیں ہے)

[2] بینسی کہیات جلد ۲ صفحہ ۲۵۸۔

Marfat.com

شکم پری کی۔ جیسا کہ جوہر کے بیان سے ظاہر ہے۔ مغلوں کے مصائب کا گمان تو کیا جا سکتا تھا مگر ان کا قلمبند کرنا غیر ممکن تھا۔ تعجب کی بات نہیں کہ ایسے پریشانی کے عالم میں ہمایوں کے بے حد وفادار اور فرمانبردار ساتھی بھی اتنے گستاخ ہو گئے کہ انہوں نے بادشاہ کو بھی گھوڑا دینے سے انکار کر دیا۔ بیچاری حمیدہ بیگم کئی ماہ کی حاملہ تھی۔ یہ قدرت کا ایک کرشمہ ہی تھا کہ وہ اسقاط سے بچ گئی تین روز تک یہ لوگ بنا پانی کے سفر کرتے رہے۔ انجام کار جیسلمیر کے راول لون کرن کو ان پر رحم آیا۔ اس نے اپنے لڑکے کنور مالدیو بھاٹی (جیٹسی ہوت) کو صلح کا جھنڈا ہاتھ میں دے کر بھیجا تا کہ خستہ حال مفرورین بلا مزاحمت کے امرکوٹ تک پہونچ سکیں۔

امرکوٹ جس کا زیادہ صحیح نام عمرکوٹ[1] ہے پرمار قبیلہ کی سوڈا شاخ کا صدر مقام تھا۔ بہادر سوڈا راجپوتوں نے ہمایوں کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ وہ کسی بھی انسان سے نہیں ڈرتے تھے۔ خواہ وہ مالدیو ہو خواہ شیر شاہ۔ اسی عمرکوٹ کے قلعہ میں نومبر ۱۵۴۲ء کو حمیدہ بانو کے بطن سے اکبر پیدا ہوا۔ شاید ہند کی قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں اس سے سعید وقت اور واقعہ کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ حمیدہ کے اس نوزائیدہ طفل پر ہمایوں اتنا ہی مبارکباد کا مستحق ہے جتنا کہ شیر شاہ۔ کیونکہ واقعہ تو یہ ہے کہ بہ نسبت تیموری بوسیدہ سلطنت کے اکبر شیر شاہ کی مستحکم اور باترتیب حکومت کا قابل تر وارث ہوا۔ اگر اکبر وجود میں نہ آتا تو شیر شاہ کو تاریخ ہند میں اتنی فضیلت حاصل نہ ہوتی۔ اس وقت سے ہمایوں کے متعلق شیر شاہ کے انتشار کا اختتام ہو گیا۔

اس طوفان کے ہٹ جانے سے مالدیو کو اتنی ہی راحت ملی جتنی کہ شیر شاہ کو۔ کیونکہ دونوں میں سے کوئی جنگ نہیں چاہتا تھا۔ شیر کو ۱۵۴۲ء کی خزاں میں

---

[1] اکثر اس جگہ کو ہم عمرکوٹ نہ کہہ کر امرکوٹ کہتے ہیں قابل غور بات یہ ہے کہ اس نام کا کوئی تعلق خلیفہ عمر الخطاب سے نہیں ہے نہ کسی دیگر مسلمان سے ہے۔ اس شہر کو امراہ سمرہ نے بسایا تھا جو سمرہ قبیلہ کا تھا۔ یہ راجپوتانہ کے ریگستان کا بدنام ڈاکو تھا۔ اس کے قصے ہر خاص و عام کی زبان پر ہیں

Marfat.com

مالوہ پہونچنے کی جلدی تھی۔ ادھر مالدیو بھی اس ناخوشگوار جھٹکے سے سنبھلنا چاہتا تھا۔ اگر مغل مورخین کے اس بہتان میں کہ شیر شاہ نے ناگور اور الور کا مسرت خیز لالچ دے کر مالدیو کو توڑ لیا ذرا بھی سچائی ہو تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ شیر نے یہ وعدہ ذہنی انتشار کے ساتھ کیا تھا اور بعد میں اس کو وفا نہ کیا بیچارہ مالدیو دھوکے کا شکار بن گیا ـــــــــــــــــــ کیونکہ شیر شاہ نے اپنی فوجیں مارواڑ سے تو ہٹا لیں مگر شیخاواٹی اور ناگور کے مفتوح علاقہ میں اپنا تسلط بدستور قائم رکھا۔ مالدیو کو اس بات کے لیے رہین منت ہونا چاہیے تھا کہ اس کو شیر شاہ کے دشمنوں کے ساتھ ناکامیاب سازش کا زیادہ سخت پاداش نہیں ملا۔ بہرحال مالدیو اتنی تحسین کا مستحق تو ہے ہی کہ اس نے ہمایوں کو شیر خاں کے حوالہ نہ کرکے ایک نازک گرفت سے نجات حاصل کرلی اور وہ ملامت سے بری رہا[1]

---

[1] یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ہم نے اس باب کو از سر نو مرتب کیا ہے۔ اور اپنی پہلی تصنیف "شیر شاہ" سے جگہ جگہ ردوبدل کر دیا ہے۔ (دیکھیے شیر شاہ باب دس)۔ یہ ردوبدل کسی عالم فاضل مورخ کی تنقید پر نہیں کیا گیا۔ مالدیو کی جانب جو غداری منسوب کی جاتی ہے اور ہمایوں کی واپسی کے متعلق مزید تفصیل کے لیے دیکھے اس باب کا ضمیمہ۔

Marfat.com

باب 15 کا ضمیمہ

مالدیو کی منسوبی غداری کے متعلق کچھ حقیقت پر تبصرہ اور ہمایوں کی واپسی

ہمایوں کے خلاف جو غدّاری مالدیو کی جانب منسوب کی جاتی ہے اس کو اکبری دور کے مورخوں نے حد سے زیادہ مبالغہ آمیز کر دیا ہے۔ اس کی وجوہات صاف ہیں ہمایوں دو ہفتہ تک مالدیو کے علاقہ میں قیام پذیر رہا اس دوران جو واقعات رونما ہوئے ان کا صحیح طور سے اندازہ کرنا مشکل ہے۔ واقعات پر روایتوں کی تہہ چڑھ گئی ہے۔ پھر بھی اگر ہم قرونِ وسطیٰ اور زمانہ حال کے مورخوں کے بیانات کی گہری تنقید کریں تو کچھ نہ کچھ حقیقت عیاں ہو ہی جاتی ہے۔ پہلے ابوالفضل ہی کو لے لیجیے۔

راستہ ہی میں (یعنی ڈیرا اول سے پھلودی کے) اس کے خدّاموں اور حشم کو مالدیو کے متعلق غدّاری اور دھوکہ کا شبہ ہوا۔ اور انہوں نے اعلیٰ حضرت سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔۔۔ مال کار میر سمندر کو مالدیو کے پاس روانہ کیا گیا۔

ناگور کا سنکائی جو کہ مالدیو کا معتمد خاص تھا تجارت کے بہانہ پڑاؤ میں داخل ہوا۔ اس مکّار کے آنے سے اعلیٰ حضرت اور بھی چوکنّے ہو گئے۔۔۔ اب اس نے رائے مل سونی کو بھیجا۔۔۔ شاہی فوج پھلودی سے چل دی۔۔۔ اور 'کل یوگی' پر خیمہ زن ہوتی۔۔۔۔ یہاں رائے مل کا ہرکارہ پہونچا اور اس نے اپنی چھوٹی انگلی دبائی یہ

Marfat.com

اس بات کی طرف صاف اشارہ تھا کہ سیاہ دل بدمعاش مالدیو کے دماغ میں غداری اور خیانت کے خیالات موجزن ہیں۔ اور وہ آنحضرت کے استقبال کی آڑ میں ایک لشکر جرار بھیجنے کی سوچ رہا ہے.... آنحضرت نے اپنی لگام پھلودی کی جانب موڑ دی۔ (اکبرنامہ صفحات ۳۷۱۔ ۳۷۳)

قابل افسوس بات تو یہ ہے کہ شاہی مؤرخ نے ایک صحیح واقعہ کو نظر انداز کردیا ہے۔ وہ یہ کہ اتکہ خاں کو سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ جودھپور میں ملا سرخ نے اتکہ خاں سے اپنے شبہات کا اظہار کیا اور اتکہ خاں وہاں سے بلا اجازت بھاگ پڑا۔

ابوالفضل کے بیان کے مطابق ہمایوں ۴ ربیع الثانی ۹۴۹ھ ہجری کو دلاور (ڈیراول) کی تلہٹی میں ٹھہرا۔ اسی مہینہ کی ۷ تاریخ کو یعنی ۳ جولائی ۱۵۴۲ء کو بیکانیر سے ۱۲ کوس دور ایک دوسرے مقام پر ٹھہرا۔ ہمایوں ۱۰ جمادی الاوّل مطابق ۲۲ اگست کو امرکوٹ پہونچا۔ اگر ان واقعات کو صحیح مان لیا جائے تو ڈیراول سے پھلودی جانے میں سات دن (اس میں وہاں ٹھہرنے کے ۲ دن بھی شامل ہیں) اور پھلودی سے واپسی میں سات دن لگے ہوں گے۔ اس حساب سے ہمایوں مارواڑ کے علاقہ میں دس دن سے زیادہ نہیں ٹھہرا ہوگا۔ جودھپور اور پھلودی کے درمیان ۷۵ میل کا فاصلہ ہے۔ بذریعہ سانڈنی آمدورفت میں ۲ دن تو ضرور لگے ہوں گے لہٰذا اتکہ خاں جودھپور دربار میں ۳ دن سے زیادہ نہیں ٹھہرا ہوگا۔ اصول سفارت کو مدنظر رکھتے ہوئے اتنے قلیل عرصہ میں کسی کے دل کی بات کو سمجھ لینا اور برے ارادہ کو بھانپ لینا ممکن نہیں ہے۔ تاہم ابوالفضل نے رائے عامہ کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ عوام کا یہ خیال تھا کہ ابتدا میں تو مالدیو نیک طینت تھا۔ اور خدمت کرنا چاہتا تھا مگر بعد میں راہ راست سے منحرف ہوگیا۔ وہ بھی یا تو فوج کی کم تعداد اور سپاہیوں کی حالت زبوں دیکھ کر یا شیر شاہ کے جھوٹے وعدہ سے متاثر ہوکر۔ اگر ابوالفضل اتنے ہی پر قناعت کرلیتا اور عوام کی ناقابل تسلیم رائے کی طرف نہ جھکتا تو اس کی رائے فیصلہ کن ہوتی۔

ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے رائے عامہ کو صحیح تصور نہیں کیا ہے اور انکی رائے سے میں اتفاق کرتا ہوں۔ (ہمایوں جلد ۱ صفحہ ۲۱۳) ڈاکٹر بنرجی بھی اکبرنامہ میں

Marfat.com

مذکورہ مالدیو کے خلاف صریحاً غداری کے الزام کو تسلیم نہیں کرتے لیکن ان دونوں فاضل مورخوں نے میر سمند اور سنکائی کی کہانیوں کی چھان بین نہیں کی ہے۔ ان کہانیوں کو آسانی سے کوئی شخص باور نہیں کر سکتا۔ سوائے ان کے جو کہ مالدیو کے کردار پر کم ظرفی اور کمینہ پن کا رنگ چڑھانا چاہتے ہیں۔ صورت حال دراصل ایسی تھی کہ مالدیو کو ہمایوں پر جاسوسی کرنے کا موقع ہی نہ تھا اور نہ وہ ہمایوں کے جواہرات کو دھوکہ سے غصب کر سکتا تھا۔ یہ صرف لغو گپ بازی ہے جس کی کہ بعد میں تشہیر ہو گئی۔ چونکہ ان واقعات کے متعلق ابوالفضل کی سند ضمنی ہے اس لیے اس کو علیحدہ رکھنا ہی مناسب ہے۔ جوہر کے بیان کے تبصرہ سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ راٹھوروں نے جو ہمایوں کا تعاقب کیا وہ محض ایک ظاہرداری کی بات تھی۔ (شیر شاہ صفحہ ۲۷۸) مارواڑ کی جو تاریخ پنڈت بشیشور ناتھ ریو نے ہندی میں تصنیف کی ہے اس سے مالدیو کے کردار پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ بلکہ اس کے برعکس پراگندگی پراگندہ تر ہو جاتی ہے۔ انھوں نے فارسی مورخوں کے بیانات کو توڑ مروڑ کر مالدیو کی صفائی پیش کی ہے جس کی کہ کوئی ضرورت نہیں۔ ان کا بیان جو کہ مارواڑ کی کھیاتوں پر مبنی ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔

"جب ہمایوں جودھپور کے نزدیک پڑاؤ ڈالے تھے تو راؤ جی نے اس کی خوب مہمان نوازی کی۔ بعد ازیں جب ہمایوں نے یہ خیال کیا کہ جودھپور کے استقدر نزدیک رہنا مناسب نہیں اور پھلودی میں پڑاؤ ڈالنے کی خواہش ظاہر کی تب راؤ نے بخوشی منظور کر لیا۔ جب ہمایوں دی جھار سے پھلودی کے لیے روانہ ہو گیا تو راؤ جی نے اپنی کچھ فوج ہمایوں کے پیچھے اس لیے بھیجدی کہ مغل سپاہی سڑک کے کنارے کے دیہاتوں میں لوٹ مار نہ کریں۔ لیکن ہمایوں کی فوج کو یہ شبہ ہو گیا کہ راجپوت سپاہی ان کو قتل کرنے اور شاہی خزانہ لوٹنے کے لیے آرہے ہیں۔"

بعد ازیں ایک دوسرا ناخوشگوار واقعہ ظہور میں آیا۔ جب ہمایوں پھلودی کے نزدیک پہونچا اس کے سپاہیوں نے ایک گائے قتل کر دی۔ راؤ جی کی

Marfat.com

فوج نے خیال کیا کہ مغل سپاہیوں نے یہ کام عمداً ہندو مذہب کی تذلیل کے لیے کیا ہے۔ انھوں نے بادشاہ کا راستہ میں تعاقب کیا اور ہمایوں کا قافلہ جب ساتلمیر کے نزدیک تھا لڑائی شروع ہو گئی۔ چونکہ راجپوت فوج کثیر تعداد میں تھی اس لیے ہمایوں بچ کر نکل گیا (ریو۔ مارواڑ کا اتہاس جلد ۱ صفحہ ۱۲۷)

ریو نے مالدیو کی جو صفائی پیش کی ہے وہ محض طفلانہ ہے اور اس سے اس کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ گائے مارواڑ میں قتل نہیں کی گئی تھی بلکہ جیسلمیر کے علاقہ میں ہوئی تھی۔ جس کے لیے مغلوں کو بڑی گراں قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ ہمایوں کے پاس نقاب پوش مستورات، معاون، ملّا و نجومیوں کے علاوہ ۲۰ آدمی سے زیادہ نہیں تھے۔ (اکبر نامہ ۳۷۳۔ ۳۷۴)

ہمیں اس واقعہ کی اصلیت سمجھنے کے لیے نظام الدین کے سنجیدہ بیان پر غور کرنا ہوگا۔ وہ لکھتا ہے۔

"جب مالدیو کو ہمایوں کی کمزور حالت کا علم ہوا وہ بہت ہی متوحش ہوا وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس کے پاس شیر کا مقابلہ کرنے کے کافی ذرائع نہیں ہیں۔ شیر نے مالدیو کے پاس اپنا سفیر بھیجا تھا اور اس کو بڑی بڑی امیدیں دلائیں تھیں اور مالدیو نے کمال بے مروتی سے یہ وعدہ کر لیا کہ اگر ممکن ہوا تو وہ ہمایوں کو قید کر کے دشمن کے حوالہ کر دے گا۔ ناگور اور اس کے ماتحت علاقہ پر شیر کا قبضہ ہو چکا تھا۔ مالدیو خائف تھا مبادا شیر ناراض ہو کر ہمایوں کے تعاقب میں اس کے علاقہ میں اپنی فوج داخل کر دے۔ (طبقات صفحہ ۲۰۹ ایلیٹ جلد ۵۔ صفحہ ۲۱۱۔ ۲۱۲)

شیر نے ناگور سے میڑتا کی جانب ۳۔۴ منزل کوچ کیا۔[1] وہ اپنی شرائط منظور کرانے کے لیے مالدیو پر دباؤ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے جھوٹے وعدوں

---

[1] عباس نے میوات سے ۳۔۴ منزل لکھا ہے۔ میں نے شیر شاہ لکھتے وقت نظام الدین کے مقابلہ عباس کو ترجیح دی تھی۔ (شیر شاہ۔ صفحہ ۲۷۵) لیکن اب دونوں مورخین کے بیانات کا جائزہ لینے کے بعد میں نظام الدین کی بات زیادہ معتبر سمجھتا ہوں۔

Marfat.com

سے مالدیو کو دھوکہ دیا اور مالدیو نے اپنے طرزِ عمل سے اسے دھوکہ دیا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس نے اپنے ضمیر کا پاس کیا اور راجپوت کی آن پر بھی بٹہ نہ لگنے دیا اور اپنی حفاظت بھی کر لی۔ لہٰذا مالدیو کے عمل میں کہیں بھی غدّاری کی جھلک نہیں ہے۔ البتّہ اسے بے مروتی ضرور کہہ سکتے ہیں، جو کہ سیاست میں قابلِ معافی ہے۔ اپنی قربانی دے کر دریا دلی دکھانا گھر پھونک تماشہ دیکھنا سیاست کا اصول نہیں ہے۔

تاریخ کی مانگ ہے اور انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم مالدیو پر منسوبی غدّاری کی تہمت کا جو اس نے ہمایوں کے ساتھ کی اس غداری سے مقابلہ کریں جو مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور نے دارا شکوہ کے ساتھ کی تھی۔ دارا مہاراجہ جسونت سنگھ کے بلانے پر ہی اجمیر آیا تھا۔ اس کے پاس ایک اعلیٰ منظم فوج تھی۔ اس کے قبضہ میں گجرات کا متمول صوبہ تھا۔ پھر بھی مہاراجہ جسونت سنگھ نے تقریباً ویسی ہی صورتِ حال میں وعدہ خلافی کی۔ امبر کا راجہ جے سنگھ جو ہندوؤں کے لیے اورنگ زیب کا ایک سیاسی فریب کا ہاتھی تھا۔ اس نے مہاراجہ جسونت سنگھ کی وحشت کا بیجا فائدہ اٹھایا اور نہایت ہی کامیابی سے اسے توڑ لیا۔ مالدیو کی وعدہ خلافی جسونت سنگھ کی وعدہ خلافی کے مقابلہ میں ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتی۔ میواڑ کے علاوہ راجپوت حکمرانوں کی ایسی متعدد مثالیں ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جانباز راجپوت کا اخلاقی معیار میدانِ جنگ میں اس کی جرأت و دلیری کے ہم پلہ نہ تھا۔ یہ ہمت مردانہ اتنی تحسین کی مستحق نہیں جتنی کہ راجپوت خاتون کا آگ میں جل کر خاکستر ہو جانا۔

فارسی تاریخوں کے مطالعہ سے اور ہمایوں کے موجودہ سوانح نگاروں سے ہم پر یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ جب ہمایوں امرکوٹ کے لیے بھاگا تو راستہ میں کیا ہوا۔ یہ بات ہنوز تاریکی میں ہے۔ اس کے متعلق سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمایوں کا نصب العین کیا تھا۔ ہمایوں نے امرکوٹ جانے کا ارادہ کب اور کیوں کیا؟ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد

Marfat.com

کے اس بیان کی کیا سند ہے۔ ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں "امرکوٹ کے راجہ نے ہمایوں کے پاس ایک شفقت آمیز پیغام بھیجا۔[1] اب ہمایوں کی امید کا تنہا سہارا وہی تھا" (ہمایوں۔ ۲۱۳) اس بات میں بھی شبہ ہے کہ کیا واقعی ہمایوں اور امرکوٹ کے ایک ادنیٰ حاکم میں ہمایوں کے امرکوٹ پہونچنے سے پہلے کوئی سلسلہ نامہ و پیام چلا۔ بہرحال یہ ناممکن ہے کہ ہمایوں کے دس روزہ قیام کے دوران مارواڑ میں اس کو یہ پیغام ملا ہو۔ غالبًا ہمایوں کا سب سے پہلا خیال بھکر کی جانب گیا ہوگا وہاں اس کے بہت سے ساتھی یادگار ناصر مرزا کے ساتھ موجود تھے۔ اور شاید اس کا ارادہ جیسلمیر کے راستہ بھکر جانے کا تھا۔ ڈاکٹر ایس۔ کے بنرجی کہتے ہیں " اس نے دلاور (ڈیراول) کی بہ نسبت زیادہ مشرقی راستہ سے جانا پسند کیا۔ اور ساتلمیر پہونچ گیا جو پوکھرن سے ۲ میل شمال مغرب میں ہے" (ہمایوں بادشاہ جلد ۲۔ صفحہ ۶۹)

نقشہ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ پوکھرن اور ساتلمیر پھلودی کے مشرق میں نہیں ہیں بلکہ جنوب۔ جنوب مغرب میں ہیں۔ لہٰذا لفظ مشرق طباعت کی غلطی ہے۔ یا قلم کی بھول۔ اس کے بعد جو ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں وہ صریحًا غلط ہے۔

"ایک بار اس کی فوج کا دُنبالہ دشمن کا پیچھا کرتا ہوا راستہ بھول گیا اور وہ واپس نہ آسکا۔ اس عرصہ میں راجپوت فوج کا دوسرا دستہ سامنے آیا اور اس نے فورًا ہی ایک تنگ گھاٹی میں ہمایوں کی فوج پر حملہ کر دیا۔ ہمایوں محض اپنی ذاتی بہادری اور حفاظتی انتظام کی بدولت ہی بچ سکا۔"

اس بیان سے ڈاکٹر صاحب نے ابوالفضل کو بھی مات کر دیا ہے۔ ہمایوں کی فوج کا دنبالہ دشمن کی فوج کا تعاقب کیسے کر سکتا تھا۔ اصل میں یہ اشارہ

---

[1] قابلِ اعتبار فارسی مورخوں نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی ہے جس کی بنا پر یہ گمان بھی کیا جا سکے کہ ہمایوں کو امرکوٹ کا وہاں جانے سے قبل کوئی علم بھی تھا۔ ایسے پیغام شاید جب ہی پہونچے ہوں گے جب وہ امرکوٹ میں داخل ہوگیا ہوگا۔

Marfat.com

تردی بیگ اور دوسرے مغل سرداروں کی جانب ہے جن کو راجپوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔ تاکہ ہمایوں اور بیگمات کو بچ نکلنے کا موقع مل جائے۔ ان لوگوں کا راجپوتوں سے کبھی مقابلہ نہیں ہوا۔ بلکہ وہ جیسلمیر کے علاقہ میں بھاگ گئے اور بعد میں ہمایوں سے جا کر مل گئے۔ جہاں تک مغلوں اور راجپوتوں میں تصادم کا سوال ہے ابوالفضل بھی کہیں یہ ذکر نہیں کرتا۔ کہ ہمایوں نے بذات خود اس لڑائی میں کوئی حصہ لیا۔ جوہر بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ہمایوں جیسلمیر کے گرد و نواح میں کسی جگہ پہونچا؟ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہمایوں جیسلمیر کے راج کے حد میں تو داخل ہوا لیکن جیسلمیر کے نزدیک نہیں پہونچا۔

جیسلمیر کا قلعہ پوکھرن اور ساتلمیر سے جانب مغرب ۶۰ میل ہے اور اسنی کوٹ قریب قریب وسط میں ہے۔ مغلوں سے ساتلمیر سے روانہ ہونے کے بعد دوسرے پڑاؤ پر گنتو کشی ہوئی۔ اور شاید اسنی کوٹ کے مقام پر ہی راجہ لونا کرن کا لڑکا مالدیو بھائی صلح کا پیغام لے کر آیا تھا۔ اس نے ان کی اس حرکت پر لعنت و ملامت کی اور ان کو جانب جنوب بھگا دیا۔ جوہر نے شاید افواہ کی بناپر یہ لکھ دیا کہ راجہ کے آدمیوں نے راستہ کے سب کنوئیں ریت سے بھر دیے جو لوگ ریگستان سے واقف ہیں وہ شاید ہی اس بات کا یقین کریں کیونکہ جیسلمیر کے ریگستان میں ایک کنواں ۵ میل سے زیادہ آبادی کی موت و زندگی کا سوال ہے۔ ان کنوؤں کی عموماً گہرائی ۲۰ سے ۴۰ پرس یعنی ۱۴۰ سے ۲۸۰ فٹ ہوتی ہے ان کنوؤں کو ریت سے بھرنے کے معنی مغلوں کو تڑپانا نہیں بلکہ خود اپنے خاندان اور مویشیوں کو ہلاک کرنا ہوتا۔ دراصل راجہ لونا کرن نے یہ کیا تھا کہ اس نے راستہ کے تالابوں پر اپنے محافظ اور پہرہ دار مقرر کر دیے تھے تاکہ پانی نہ ملنے سے مغلوں کو پریشانی ہو۔ (اکبرنامہ۔ ۱۔ ۳۷۵)

غالباً پوکھرن اور جیسلمیر کے درمیان کسی جگہ ہمایوں کے سامنے یہ سانحہ آیا ہوگا اور اس کے بعد اس نے بھکر جانے کا خیال ترک کر دیا ہوگا۔ اب وہ جنوب کی طرف جانے کو مجبور رہا ہوگا۔ اگر ہمایوں جیسلمیر سے براہ راست امرکوٹ کا سفر کرتا تو

Marfat.com

راستہ میں پانی کے بغیر اس قدر تکلیف نہیں ہو سکتی تھی۔ جیسی کہ دردناک کہانی جوہر نے لکھی ہے۔ جیسلمیر سے امرکوٹ کا فاصلہ ۷۰ کوس ہے۔ اور دونوں ریاستوں کی سرحدیں ۳۵ میل پر ملتی ہیں۔ جیسلمیر سے ۷، یا ۸ کوس دور مغرب میں کھانڈی کی جھیل ہے۔ ۱۸ویں کوس پر بھمبرا گاؤں ہے۔ ۲۲ویں کوس "پرداہو سوٹیا" ہے اور ۳۰ویں کوس پر پھونیا گاؤں ہے۔ دراصل مغلوں نے اس ناامیدی اور پریشانی میں اس عام راستہ کو چھوڑ کر کوئی سیدھا راستہ اختیار کیا ہوگا۔[2] اسلیے ان کو جیسلمیر علاقہ میں اس قدر وقت لگا اور اتنی پریشانی و زحمت برداشت کرنا پڑی۔

---

[1] نینسی ری کھیات جلد ۲۔ صفحہ ۲۵۷۔ ۲۵۸)

[2] ڈاکٹر ایشوری پرشاد لکھتے ہیں "ہمایوں نے ریگستان کو عبور کرنا شروع کیا۔ یہ راستہ بعد میں شیر شاہ اور اس کے میزبان کے لیے بہت مہلک ثابت ہوا۔" ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان شیر شاہ کے واقعات زندگی سے میل نہیں کھاتا۔ جیسلمیر اور امرکوٹ کے ریگستانی علاقہ میں جانے کی بات تو درکنار۔ شیر شاہ کبھی اپنی زندگی میں جودھپور کے مغرب میں بھی نہیں گیا۔

Marfat.com

باب 16

مالوہ کی مکمّل فتح اور شیر کی سلطنت میں ملایا جانا

مالوہ میں بغاوت

جون ۱۵۴۲ء میں شیر راجپوتانہ کے لیے روانہ ہوگیا اس کے چلے جانے کے بعد فوراً مالوہ میں بدامنی پھیل گئی۔ اس کی خاص وجہ شیرشاہ کی پالیسی تھی۔ شیرشاہ نے مالوہ کے قدیم حکمرانوں کو وہاں سے ہٹا کر دوسری جگہ بھیج دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جب انھوں نے شیرشاہ کی اطاعت قبول کر لی ہے تو انہیں اپنے علاقوں میں بلامزاحمت رہنے دیا جائے گا۔ لیکن شیرشاہ سمجھتا تھا کہ یہ فرمانروا اس کی مرکزی حکومت میں روڑا بنے ہوئے ہیں اور اس کی حکومت کے لیے مستقل سردرد ہیں۔ شیرشاہ کی یہ پالیسی سہسرام کے سنگدل شقدار کی خصلت کا آئینہ ہے کہ وہ باغیوں اور سرکشوں کے ساتھ کبھی نرمی سے پیش نہیں آتا تھا اور بغیر ان کی جان لیے چین سے نہ بیٹھتا تھا۔ قادرشاہ عرف ملّو خاں کے ساتھ اس کے سلوک نے مالوہ کے جاگیرداروں اور زمینداروں کے اعتماد کو بری طرح ہلا دیا تھا اور جب اس نے سکندر خاں میانہ کے متبنّی معین خاں کو محض اس لیے قید کر لیا کہ اس کی وفاداری مشتبہ ہے تو ان لوگوں کے غیظ و غضب میں ابال آگیا۔

معین خاں کی معزولی اور قید کے بعد شیرشاہ اسے اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔

Marfat.com

اس نے شجاعت خاں کو ہنڈیہ اور سیونی کا فوجدار بنا دیا اور اس کے منصب میں چار ہزار گھوڑ سواروں کا اضافہ کر دیا معین خاں کے بھائی ناصر نے سیونی سے (فرشتہ نے اسے سیواس لکھا ہے) ۶ ہزار گھوڑے اور دو سو ہاتھی فراہم کیے۔ (عباس) شجاعت خاں دو ہزار گھوڑ سوار لے کر اس کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوا — نیل گڑھ[1] کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ جب دونوں طرف کی فوجیں جنگ کی کشمکش میں مصروف تھیں۔ ناصر خاں اور شجاعت خاں کی فوج کے کچھ سپاہی کھدیڑ دیے گئے۔ تین سپاہیوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ شجاعت خاں پر حملہ کر کے اس کو زندہ پکڑ لیں گے اور پھر معین خاں کی ضمانت کے عوض اس کو قید میں رکھیں گے۔ ان میں سے ایک سپاہی نے اس کی گردن پر کٹار ماری۔ دوسرے سپاہی نے بھالے سے اس کے نتھنے زخمی کر دیے۔ اور اس کے سامنے کے دانت توڑ دیے۔ تیسرے سپاہی نے تلوار کا وار کر کے اس کے لمبے بالوں کو پکڑ لیا۔ اور اسے ناصر خاں کے پاس زندہ لے جانا چاہا۔ شجاعت خاں نے تلوار کی ایک ضرب سے اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے اور اپنے آپ کو چھڑا لیا اس کے قبیلہ کے ایک سپاہی مجاز خاں نے دوسرے گھوڑ سوار کو قتل کر دیا اور مبارک خاں سیرانی نے تیسرے کو ہلاک کر دیا۔ اس طرح ان سے نجات پا کر شجاعت خاں نے اپنا گرا ہوا پرچم پھر بلند کر لیا اور اس کی فوج جو پہلے بھاگ کھڑی

---

[1] عباس کے نسخہ میں نیل گڑھ لکھا ہے ایلیٹ نے محال کرا لکھا ہے۔ ہم ان دونوں مقامات کا تعین نہیں کر پائے ہیں۔ مخزن نے اس مقام کو گرا۔ گونڈوانہ اور جبلپور کے نزدیک بتایا ہے (ڈارن ۔ ۱ ۔ ۱۳۲)۔ نظام الدین لکھتا ہے کہ شجاعت خاں ناصر خاں کے مقابلہ کے لیے ہنڈیا اور سیونی سے گیا۔ (طبقات صفحہ ۵۷۲) ان مقامات کے متعلق قیاس آرائی کی ضرورت نہیں ہے۔ محال کرا اور گرا غالباً نیل گڑھ کے جائے وقوع کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم اس قیام کا تعین کہیں گونڈوانہ میں گرا کے نزدیک کرتے ہیں۔ نظام الدین لکھتا ہے کہ راجا رام شاہ گوالیاری جو شجاعت خاں کے ساتھ تھا پہلے راجپوت لے کر مبارک خاں سیرنی کی مدد کو گیا تھا اور اس نے تیسرے گھوڑ سوار کو قتل کیا تھا۔ (طبقات ۵۹۲ ۔ ۵۹۳ ، فرشتہ جلد ۲ صفحہ ۲۷۱)۔

Marfat.com

ہوئی تھی دوبارہ جمع ہوگئی۔ اور اس نے جان توڑ لڑائی کے بعد فتح حاصل کی۔[1]

سیونی کے علاقہ میں ناصر خاں کی بغاوت ایک تنہا واقعہ نہ تھا۔ مانڈو کے سابق بادشاہ قادر شاہ کا دقیقہ سنج دماغ مالوہ میں شیر کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی جان توڑ کوشش کے پس پردہ لگا ہوا تھا۔ قادر شاہ نے حملہ کرنے کی غرض سے گجرات میں ایک فوج بھی اکٹھی کر لی تھی۔ جب ۱۵۴۲ء کی برسات میں شیر مالدیو کی سازش اور ہمایوں کے منصوبہ کو ناکام کرنے کے لیے مالدیو کے علاقہ پر حملہ آور تھا تو قادر شاہ نے حملہ کرنے کا اچھا موقعہ دیکھا۔ یہ بھی اغلب ہو سکتا ہے کہ مالدیو نے شیر کی توجہ مالوہ کی طرف راغب کرنے کے لیے وہاں شورش پھیلانے میں حصہ لیا ہو۔ عباس نے ملوخاں کے اس حملہ کے متعلق بہت ہی کم واقعات قلم بند کئے ہیں۔ پھر بھی ان سے اتنا تو معلوم ہوتا ہی ہے کہ ملوخاں نے ایک ساتھ شیر کے دو فوجداروں پر حملہ کرنے کی تجویز بنائی تھی۔ پہلا فوجدار ہنڈیہ اور سیونی کا شجاعت خاں کا تھا اور

دوسرا دھار کا حاجی خاں جو گجرات کی سرحد پر نگہبانی کے لیے تعینات تھا۔——

ملوخاں پہلے حاجی خاں کی فوج کو ٹپا کرنا چاہتا تھا اور بعد ازیں نربدا کے جنوب میں کہیں ناصر خاں سے مل کر شجاعت خاں سے مورچہ لینا چاہتا تھا۔ انھیں یہ امید نہ تھی کہ شجاعت خاں ناصر خاں کے خلاف میدان میں آجائے گا۔ کیوں کہ اس کی ۴ ہزار گھوڑ سواروں کی فوج کا ۳/۴ حصہ ہنڈیہ سے سیونی تک کے دور دراز علاقہ میں مقامی ڈیوٹی پر تعینات تھا۔ لیکن شجاعت خاں کی دلیری اور غیر معمولی سرعت نے صورتِ حال پر قابو پالیا۔ اس نے لڑائی میں اوپر کا جبڑا کھو کر ناصر خاں پر مکمل فتح حاصل کر لی۔ یہ جبڑا تو پھر درست نہ ہو سکا لیکن اس فتح کا عوام پر بہت گہرا اثر ہوا۔

اس فتح کے چند روز بعد جب کہ شجاعت خاں ابھی بستر علالت سے اٹھا بھی نہ تھا (اس کے ہاتھ اور چہرے پر زخم لگے تھے) حاجی خاں کا پیغام آیا کہ قادر خاں بانسواڑہ سے اس کے خلاف حملہ کرنے آرہا ہے اور کسی روز بھی لڑائی شروع

---

[1] عباس نسخہ صفحہ ۲۱۴-۲۱۵ - ایلیٹ جلد ۴ - صفحات ۳۹۵-۳۹۶

Marfat.com

ہو سکتی ہے (عباس)۔ عباس۔ نظام الدین اور فرشتہ نے اس خط کے آنے کے بعد کے واقعات کا عجیب سا افسانہ لکھا ہے۔

شجاعت خاں ایک پالکی میں سوار ہو کر فوراً دھار کے لیے روانہ ہو گیا۔ رات کے وقت وہ حاجی خاں کے لشکر میں جا پہنچا۔ اس کو نیند سے جگایا اور اسی وقت غنیم پر حملہ کرنے کی تجویز بنائی یہ چھاپہ مکمل طور پر کامیاب رہا قادر خاں شکست کھا کر گجرات بھاگ گیا۔[1]

تمام واقعہ کا یہ ایک مختصر اور پُرمعمہ خاکہ ہے۔ ملوخاں نے مالوہ میں جو شورش بپا کی اس کی تقریباً صحیح تصویر پیش کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مورخوں سے جو معلومات دستیاب ہیں ان کی روشنی میں مندرجہ ذیل واقعات کا جائزہ لیا جائے۔

ملوخاں کا مالوہ پر حملہ

بنسواڑہ ڈانگر پور کے جنوب میں ہے۔ یہاں سے ماہی ندی کے کنارے کنارے دھار اور اجین کو راستہ جاتا ہے۔ یہ راستہ اس عام راستہ سے جو کچھ گجرات سے دوہد ہو کر مالوہ جاتا ہے۔ زیادہ لمبا ہے حالانکہ اس راستہ میں خطرہ کم ہے۔ ملوخاں نے مالوہ پر حملہ کرنے کے لیے بنسواڑہ کو اپنا فوجی صدر کیمپ بنا لیا تھا۔ یہاں سے اس نے فوج بھرتی کی تھی۔ یہیں سے وہ شہر کے فوجدار عالم خاں[2] لودھی سے جو سارنگ پور میں تھا سلسلہ نامہ و پیام کر رہا تھا۔ جیسا کہ بعد کے واقعات سے ظاہر ہے۔

---

[1] فرشتہ جلد ۲ صفحہ ۱۷۳۔ طبقات صفحہ ۵۹۳۔ نظام الدین لکھتا ہے کہ جب شجاعت خاں میدان جنگ سے زخمی ہو کر اپنے لشکر میں پہنچا ابھی اس کے زخموں کی مرہم پٹی بھی اچھی طرح نہ ہو پائی تھی کہ اسے حاجی خاں کا خط موصول ہوا۔ یہ بات واقعہ کو پُر اثر بنانے کے لیے ڈرامائی انداز میں کہی گئی ہے۔

[2] دریا خاں لوہانی کا مالوہ میں انتقال ہو چکا تھا۔ عالم خاں اپنی حرکتوں کی وجہ سے مالوہ میں نہ ٹھہر سکا (میرات سکندری انگریزی ترجمہ لطف اللہ فریدی کالنگ واڈاوریئنٹل سیریز صفحہ ۱۷۲) اس سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ عالم خاں ملوخاں کی سازش میں شریک تھا۔

Marfat.com

تجویز یہ تھی کہ ناصر خاں میانہ کا ہنڈیہ اور سیونی میں شجاعت خاں کے خلاف حملہ ملو خاں کے مانڈو پر حملہ کے ساتھ ساتھ ہو۔ دریا خاں گجراتی فوت ہو چکا تھا۔ اور خاباً عالم خاں غداری کر کے ملو خاں کے ساتھ مل گیا تھا اور اس نے دھار اور مانڈو کی شمالی سرحد کو غیر محفوظ چھوڑ دیا تھا۔ لیکن ملو خاں نے ان دو مقامات میں سے کسی پر بھی حملہ نہ کیا۔ جس کے اندیشے کا اظہار مانڈو کے فوجدار حاجی خاں نے اپنے خط میں شجاعت خاں سے کیا تھا۔ اگر ملو خاں اجین پر قبضہ کر لیتا اور جنوب کے راستے نربدا تک پہنچ جاتا تو وہ مانڈو اور دھار کو مکمل طریقے سے محیط کر سکتا تھا اور گوڈوانہ کی سرحد پر حاجی خاں اور شجاعت خاں کے مابین نامہ و پیام کو روک سکتا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملو خاں نے اس قسم کا کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس لیے شجاعت خاں اتنی جلدی مالوہ کے جنوب مشرقی گوشہ سے حاجی خاں کی مدد کو جا سکا اور ملو خاں کو اس کا پتہ بھی نہ لگا۔ یہ بات تب تک مکمل نہ تھی جب تک حاجی خاں اور ملو خاں کی فوجوں کے مقام میں ردّ و بدل نہ ہوا تھا۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عباس کے سلسلہ بیان میں واقعہ کی کوئی کڑی گمشدہ ہے۔ اس گمشدہ کڑی کا پتہ مخزن کے بیان سے لگ جاتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حاجی خاں نے شجاعت خاں سے مدد کی اس وقت درخواست کی جبکہ ملو خاں کھرگاؤں[1] میں اس کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملو خاں اجین آنے کے بجائے جنوب کی جانب مڑ گیا تھا۔ اور روجے گڑھ اور مہیشور کے راجہ بھوپال کے علاقہ میں داخل ہو گیا۔ اس کا منشا یہ تھا کہ شجاعت خاں کی فوج پر ہر دو جانب سے چھاپہ مار کر اسے پسپا کر دے۔ ناصر خاں میانہ سامنے سے حملہ

---

[1] شجاعت خاں کو خبر ملی کہ ملو نے حاجی خاں کو کانگڑا میں گھیر لیا ہے (ڈارن ۱۔ ۱۳۴) یہ کانگڑہ کھرگاؤں ہی ہو سکتا ہے جو دجے گڑھ سے تیس میل شمال مشرق اور مہیشور سے تیس میل نربدا کے جنوبی کنارے پر ہے۔ (کھرگاؤں کے لیے آئین۔ جلد ۳ صفحہ ۲۰۶) کانگڑہ کالی سندھ ندی پر چندیری کی سرکار میں ہے (آئین جلد ۳۔ صفحہ ۲۰۲) یہ جگہ بہت دور ہے لہٰذا ممکن نہیں ہے۔

Marfat.com

کرے اور وہ عقب سے بلوخاں کی اس چال نے حاجی خاں کو مجبور کر دیا کہ وہ دھار میں اپنی قلعہ بندی چھوڑ کر راجہ بھوپال کے علاقہ میں آجائے اور ملوخاں کے منصوبے کو تہ و بالا کر دے۔ جب ملوخاں وجے گڑھ سے شمال کی سمت آگے بڑھ رہا تھا تو حاجی خاں اس کا سد راہ بن گیا۔ اور اس نے وجے گڑھ اور نربدا کے وسط میں اپنی فوج لگا دی۔ ملوخاں نے اس کو کھرگاؤں میں آکر گھیر لیا اور اس کی فوج کو مہیشور گھاٹ کی جانب کھدیڑ دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب شجاعت خاں ناصر خاں کے خلاف لڑ رہا تھا اور جب وہ جنگ میں زخمی ہو کر بستر پر آرام کر رہا تھا تو اسے حاجی خاں کا خط ملا۔ باقی کہانی کو نظام الدین نے بہترین طریقہ سے بیان کیا ہے۔ حالانکہ اس بات کا یقین کرنا دشوار ہے کہ ایک رات اور ایک دن سے بھی کم عرصہ میں (۲۴ گھنٹے سے بھی کم) شجاعت خاں ایک پالکی میں سوار ہو کر "کوملی مورسہ" (چوبی مہیشور[1]) کے نزدیک حاجی خاں کے پاس ایک سو پچاس گھوڑسوار لے کر پہنچ گیا اور اسے نیند سے جگا دیا۔

ملوخاں کی شکست اور واپسی

شجاعت خاں چوبی مہیشور (آئین ۳ صفحہ ۲۰۶ سرکار مانڈو) غالباً رات کے وقت پہنچا لیکن اس رات کو نہیں جس رات وہ روانہ ہوا تھا۔ کیونکہ گونڈوانہ کی سرحد سے اس مقام تک تقریباً ۲۰۰ میل سفر کرنا تھا۔ ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ قرون وسطیٰ کے لوگ اس قسم کی گپوں پر کیسے یقین کر لیتے تھے کہ غنیم تو سر پر کھڑا تھا اور شیر خاں کا سپہ سالار نیند میں خراٹے لے رہا تھا اور جب شجاعت خاں جس کی آمد کا اسے از حد اشتیاق و انتظار تھا۔ وہاں پہنچا اور اس کی آمد پر ہر چہار سو مسرت آمیز شور ہوا۔ تب بھی سپہ سالار کی نیند نہیں ٹوٹی۔ حالانکہ شجاعت خاں نے اپنا سفر ڈاک چوکیوں کے ذریعہ کیا ہوگا اور ہر مقام پر پالکی لے جانے والے کہار

---

[1] طبقات صفحہ ۵۹۳ ہم نے آئین کے چوبی مہیشور کو صحیح مانا ہے پہلی تصنیف "شیر شاہ" کے وقت اس مقام کا تعین کرنے میں ہم ناکام رہے۔

Marfat.com

بدلے ہوں گے۔ تب بھی وہ حاجی خاں کے لشکر میں ۳ دن سے پہلے نہیں پہنچ سکا ہوگا البتہ یہ صحیح ہے کہ اس خبر نے کہ حاجی خاں اور شجاعت خاں کی فوج ایک جگہ اکٹھی ہوگئی ہے ملو خاں کے حواس باختہ کر دیے ہوں گے۔ چولی مہیشور کے نزدیک ملو خاں کی شکست ہوئی لیکن افغانوں کی یہ فتح فیصلہ کن نہ ہو سکی۔ یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ افغانوں نے ملو خاں کی فوج کا تعاقب کیا یا نہیں۔ یا ملو خاں کس سمت بھاگا۔ بلاشبہ ملو خاں وجے گڑھ کے راستے خاندیش کے علاقے میں بھاگ گیا۔ اور ہمیشہ کے لیے اس نے مالوہ کو خیر باد کہہ دیا۔ مالوہ کی تاریخ میں پھر اس کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ حاجی خاں اور شجاعت خاں کو شیر کے آنے اور مزید کمک پہنچنے تک انتظار کرنا پڑا۔ اس سے پہلے ناصر خاں میانہ کو بھی زیر کرنا ممکن نہیں تھا۔ شیر خاں نے حاجی خاں اور شجاعت خاں کی خدمات کے عوض ان کے عہدے کی ترقی کی اور دونوں کو بارہ ہزاری منصبدار بنا دیا۔[1]

شیر کا پورنمل کے علاقہ پر حملہ

جنوری ۱۵۴۳ء

شیر ستمبر ۱۵۴۲ء میں مارواڑ سے آگرہ واپس آیا۔ اور ایک مہینہ آرام کرنے کے بعد راجپوتانہ کے راستہ سے مالوہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ کیونکہ ہمایوں کے جونپور کے نزدیک آنے کی وجہ سے مالوہ میں پھر شورش کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ مالوہ کے تازہ ترین واقعات کے بعد سیاسی مصلحت کا تقاضا تھا کہ شیر راجپوتانہ کی

---

[1] عباس کے قلمی نسخہ اور ایلیٹ کے ترجمہ سے پتہ چلتا ہے کہ صرف حاجی خاں کو ہی بارہ ہزاری منصب دیا گیا۔ لیکن یہ غلط ہے۔ بلاشبہ شجاعت خاں کو بھی اسی وقت بارہ ہزاری منصب دیا گیا تھا۔ جب شیر نے دوبارہ مالوہ کا دورہ کیا تھا تو چند متعلقین نے یہ شکایت کی کہ شجاعت خاں کو قاعدہ سے بارہ ہزار فوج رکھنی چاہیے لیکن وہ نہیں رکھتا۔ جب شجاعت خاں کو اس شکایت کا علم ہوا تو وہ کھجوارہ (کھجوراہو) آیا اور اس نے سات ہزار ۵۰۰ گھوڑوں پر داغ لگوائے۔ اور بیان کیا کہ باقی گھوڑے اس کے اضلاع میں ہیں۔ (ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۴۰۶-۴۰۷)

Marfat.com

ریاستوں سے ہوکر سفر کرے تاکہ اس کی غیر مغلوب طاقت کا وہاں رعب غالب ہوسکے[1]۔ مالوہ کے انتظام میں حکومت کو از سر نو ترتیب دینے کے بعد شیر چندیری کے راستہ بہار کو روانہ ہوگیا۔ راستہ میں اس نے شہزادہ جلال خاں کو اپنی فوج سے علیحدہ کر دیا تھا اور اس کو چندیری اور پورنمل کے دوسرے علاقہ کو فتح کرنے کا حکم دے دیا تھا[2]۔ یہ حملہ نہ تو دھوکے سے ہوا نہ بلا اشتعال کیا گیا تھا۔

تاریخ میں کوئی ایسا ثبوت دستیاب نہیں ہے جس سے کہ یہ ظاہر ہو کہ شیر شاہ کی عدم موجودگی میں جو میانہ لوگوں نے شورش بپا کی اس میں پورنمل نے

[1] جنوری ۱۵۴۳ء میں شیر چندیری سے باہر گیا۔ اور وہاں تقریباً ۲ مہینے قیام کیا۔ اس دوران میں اس نے بہار کا انتظام از سر نو کیا۔ اس کا ذکر ایک علیحدہ باب میں کیا جائے گا جب شیر کے نظام حکومت پر تبصرہ ہوگا۔

[2] رائے سین کی فتح کی تاریخ کے متعلق بہت اختلاف رائے ہے۔ عباس (ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۳۹۷) نظام الدین (صفحہ ۲۳۱) فرشتہ (صفحہ ۲۲۷) سب اس بات پر متفق ہیں کہ پورنمل کے خلاف فوج کشی ۹۵۰ھ میں ہوئی۔ ڈاوسن کا یہ خیال ہے (جلد ۴ کہ شیر نے ۹۵۰ھ کے آغاز میں یہ علاقہ فتح کر لیا ہوگا۔ انگریزی حساب سے سال ۹۵۰ھ ۶ اپریل ۱۵۴۳ء کو شروع ہوتا ہے۔ ڈاوسن کے اس بیان کی تائید بدایونی سے بھی ہوتی ہے۔ بدایونی نے اس محاصرہ کا تاریخ وار بیان کیا ہے اور ۹۵۰ھ میں اس فتح کو دکھایا ہے۔ عباس کے بیان کے مطابق رائے سین کا محاصرہ ۶ مہینے تک رہا۔ یہ بالکل ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ اس نے مالوہ کی پوری مہم کا وقت رائے سین کے محاصرہ میں شمار کیا ہے۔ یہ محاصرہ مارچ ۱۵۴۳ء سے پہلے نہیں شروع ہوا جب شیر کی فوج ادھر آگئی تھی۔ اصل محاصرہ غالباً ۴ ماہ سے کم رہا ہوگا یعنی مئی جون ۱۵۴۳ء تک جو ۹۵۰ھ ہجری میں پڑتا ہے۔ یہ بات بدایونی اور ڈاوسن دونوں سے میل کھاتی ہے۔

میں نے اسی کو صحیح تسلیم کیا ہے۔ میری پہلی تصنیف "شیر شاہ" میں دی ہوئی تاریخیں غلط ہیں لہٰذا میں انھیں رد کرتا ہوں۔

Marfat.com

ان کا ساتھ دیا ہو۔ حالانکہ میانہ اس کے قریبی ہمسایہ تھے۔ ایک ہی سال بیشتر شیر شاہ نے پورنمل کو اس کے موجودہ علاقہ میں بحال کیا تھا۔ اور اس کی مشروط اطاعت گیشی سے بھی مطمئن ہو گیا تھا۔ اس اثنا میں کون سے ایسے واقعات ظہور پذیر ہو گئے تھے جن کی وجہ سے شیر شاہ کو پورنمل کے خلاف فوج کشی کرنا ناگزیر ہو گیا۔ حسب معمول عباس نے شیر شاہ کی صفائی دیتے ہوئے اس کے طرز عمل کی مدح سرائی کرتے ہوئے واقعات بیان کرنے کے بجائے افسانہ لکھ دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب شیر بہار چلا گیا اور جنگ کی کمان پورنمل کیخلاف جلال خاں کے سپرد کر گیا۔ تو وہ پٹنہ میں شدید بخار میں مبتلا ہو گیا۔

عالم سرسام میں وہ یہ چلایا کرتا تھا کہ اس کا مرض اللہ کے غضب کا نشان ہے کیونکہ اس نے کافر پورنمل سے ان مظالم کا انتقام نہیں لیا تھا جو کہ اس نے مالوہ کے سیدوں پر ڈھائے تھے۔ اس نے مسلمانوں کے بیوی بچوں کو قتل کر دیا تھا۔ اور اسلام کی توہین کی تھی۔ چنانچہ اس نے یہ قسم کھائی کہ علالت سے صحت پانے کے بعد وہ رائے سین پر حملہ کرے گا اور کافروں کو نیست و نابود کر دے گا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا شیر شاہ نے یہ پاک قصد بحالت سرسام کیا تھا۔ یا اس کے سرسامی سوانح نگار نے اس کو اس پر اس غرض سے تھوپ دیا کہ تاریخ کی عدالت میں اس کی اس بے جا حرکت کے لیے صفائی پیش ہو جائے۔ چونکہ زمانہ حال کے مورخوں نے بھی انہاموں کو صحیح مان لیا ہے۔ لہٰذا اس پیہم دوہرائے جانے والے افسانہ کی تنقید ضروری معلوم ہوتی ہے۔[1]

(۱) جہاں تک اسلام مذہب کی توہین اور مالوہ کے سیدوں کی اہانت کا سوال ہے مسلم مؤرخین نے ۴۰ سال کے عرصہ میں تین مرتبہ یہ الزام دوہرایا ہے کہ مالوہ کے سیدوں کی عورتوں اور لڑکوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور انھیں غلام اور کھیل بنایا گیا۔ دوم مرتبہ تو یہ کہانی مالوہ کے راجپوتوں کے خلاف دوہرائی گئی ہے۔ اور آخری بار اکبر کے عہد میں فاضل محمد بیر شیروانی کے خلاف۔ سب سے پہلے اس قسم کی آواز نظام الدین۔ فرشتہ و منصف میرات سکندری نے پورنمل کے والد سلہا سے

---

[1] ڈاکٹر ایشوری پرشاد۔ ہمایوں۔ صفحہ ۱۷۳۔

Marfat.com

پوربیہ کے خلاف بلند کی ۔ یہ حقیقت ہے کہ مالوہ کے آخری خلجی سلطان نے سلہاوی کو جبراً مسلمان بنا دیا تھا۔ بعدازیں مہارانا سانگا نے اسے پھر ہندو بنایا حالانکہ مسلمان مورخین اسے آخر تک صلاح الدین ہی کہتے رہے۔ مسلمانوں کو

یہ بات ناگوار خاطر تھی۔ اور وہ اسے کفر سمجھتے تھے کہ صلاح الدین نے اسلام مذہب کو توخیرباد کہہ دیا لیکن وہ مسلم بیویوں کو اپنے حرم میں ہی رکھے رہا۔ کچھ مسلم مورخ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اسلام کا انتقام لینے والے بہادر شاہ نے اسے دوبارہ مسلمان بنایا۔ یہ کہتے وقت وہ بھول جاتے ہیں کہ بہادر شاہ کی مالوہ فتح سے دس سال پیشتر ہی کنواہہ کے میدان جنگ میں سلہاری جام شہادت نوش کر چکا تھا۔

(۲) عباس اور مخزن دونوں نے ہو بہو سلہاری کے لڑکے پورنمل پر بھی وہی تہمت لگائی ہے کہ اس نے مسلمانوں پر ظلم وستم کیا۔ اور اپنے حرم میں مسلمان عورتوں کو رکھا مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ پورنمل کو یہ سب ظلم کرنے کی فرصت کب اور کہاں مل گئی۔ ۱۱ سال یعنی ۱۵۴۳ء تک متواتر اس کے بیوی بچے میواڑ میں جلا وطنی کی حالت میں رہے۔ پھر ملوخاں نے دوست بناکر اس کو مالوہ واپس بلا لیا اور چندیری و رائے سین کا علاقہ اس کو انعام دے دیا۔ طاقت ور مسلم حکمران قادر شاہ کے ہوتے ہوئے پورنمل کو یہ حوصلہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ستیدوں پر اس قسم کا ظلم کرتا۔ مزید براں جب شیر شاہ نے اس سے اس کے حرم کی مسلمان عورتیں واپس کرنے کو کہا تو یہ بتایا جاتا ہے کہ پورنمل نے یہ جواب دیا تھا کہ اس کے حرم میں کوئی مسلمان عورت نہیں ہے[1]۔ اس پر بھی شیر شاہ نے پورنمل سے مکروہ اور ذلیل انتقام لیا۔

گویا مسلم مورخین کا اس کے متعلق یہ مقولہ تھا "اگر یہ حرکت تم نے نہیں کی تو تمہارے باپ نے کی تھی"۔ ایسی کہانی کو سچ مان کر تاریخ لکھنا گویا تاریخ

---

[1] رائے سین کے واقعہ کے لیے دیکھیے ڈارن ۔ ا ۔ صفحات ۱۴۶-۱۴۸۔ سلہاری کے جرم کے متعلق دیکھیے طبقات صفحہ ۵۸۳۔

Marfat.com

کا گلا گھونٹنا ہے۔[1]

(۳) ۱۵۴۳ء میں شیر شاہ نے پورنمل پر حملہ کیا۔ اس کے لیے کسی مذہبی پردہ کی آڑ لینے کی ضرورت نہ تھی بلکہ سیاسی وجوہات ہی کافی تھے اور وہی شیر شاہ کی صفائی پیش کرتے ہیں کہ یہ حملہ بغیر کسی اشتعال کے نہیں کیا گیا تھا۔ ابھی مشکل سے ایک سال ہوا ہوگا جب شیر نے گاگروں سے پورنمل کو رخصت دی تھی۔ اس وقت پورنمل نے اپنے ایک بھائی کو مع راجپوت فوج کے ایک دستہ کے بطور ضمانت نیک چلنی خود شیر شاہ کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ اب اس کے بھائی چتر بھج اور اس فوج کا کیا ہوا؟ اگر وہ اس وقت تک شیر کی خدمت میں ہوتے تو غالباً پورنمل شیر کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند نہ کرتا۔ کیونکہ اس حالت میں اسے ڈر ہوتا کہ شیر اس کا انتقام اس کے بھائی سے لے گا۔ لہٰذا یہ بات صاف ہے کہ اب پورنمل شیر کے ساتھ وہی چالاکی کرنا چاہتا تھا جو کہ دس سال پیشتر شیر نے ہمایوں کے ساتھ کی تھی۔

اس نے بھی ہمایوں کے خلاف کھلی جنگ کرنے سے پہلے اپنے لڑکے قطب خاں کو مع افغان فوج کے مالوہ کے مغل لشکر سے ملا لیا تھا۔ در اصل رائے سین کے راجپوت ناصر خاں کے میانہ لوگوں کے ساتھ رنتھمبور سے فرار ہو گئے تھے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ جب باغی ناصر خاں شجاعت خاں پر دباؤ ڈال رہا تھا تب پورنمل نے اس کی کوئی مدد نہیں کی علاوہ بریں چندیری میں جلال خاں کا کام بہت دیر طلب ثابت

---

[1] ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے تاریخ سلاطین افغانیہ کے مصنف احمد یادگار کی تقلید کی ہے اور اس کے بیان پر کوئی شبہ نہیں کیا ہے۔ لیکن احمد یادگار کے دماغ میں فتور تھا۔ اس نے سلطان سکندر لودی کے کردار کا بڑا ہی ہیبت ناک نقشہ کھینچا ہے۔ اس نے اسے ایک نمونہ کا مسلمان بتایا ہے جو ہندوؤں کو یہاں تک ساتھ ساتھ ان کے دیوتا بھی چھوا تا تھا۔ اس نے متھرا کے حجاموں کو حکم دیا تھا کہ ہندوؤں کی داڑھی نہ بنائی جائے۔ تاکہ کم از کم وہ صورت سے تو مسلمان معلوم ہوں۔ اس کٹر مورخ نے یہ باتیں محض اس لیے لکھی تھیں کہ اس سے اسلام کی عزت بڑھے گی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی حرکات سے غیر مسلم عوام کی نظر میں مسلمان مذہب کی توقیر کم ہو جاتی ہے۔

Marfat.com

ہوا کیونکہ راجپوت جم کر لڑ رہے تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پورنمل پہلے سے ہی لڑائی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ چونکہ اسے شیر کے حملے کا ڈر تھا لہٰذا پورنمل کی حرکت اشتعال انگیز ضرور تھی۔ شیر نے اس کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں کیا تھا۔ کسی بھی فریق پر وعدہ خلافی کا جرم ثابت کرنے سے پہلے انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ اس طرف سے کوئی وعدہ ہونا چاہیئے۔ شیر نے کوئی وعدہ پورنمل سے نہیں کیا تھا۔ لہٰذا اس جرم کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ تاریخ ہمیشہ اسی فریق کو مورد جرم قرار دیتی ہے جو جنگ میں پہلے حملہ کرتا ہے۔

چندیری اور رائے سین کی فتح

جنوری ۱۵۴۳ء میں جلال خاں نے چندیری کا محاصرہ کیا۔ تب سے ہی پورنمل کے خلاف جنگ کا آغاز ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مہم میں راجہ کے ایک بھتیجے نے افغان فوج کی مدد کی بعد میں شیر نے اس کی غداری کے انعام میں اس کو چندیری دے دیا۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو یہ غدار پورنمل کے خاندان کا نہیں ہو سکتا۔ یہ کوئی میدنی رائے کے رقیب خاندان سے جھوٹا دعویدار ہو سکتا ہے۔ بابر نے میدنی رائے سے ۱۵۲۸ء میں چندیری فتح کیا تھا۔ حالانکہ خلجی حکومت میں چندیری اور گوالیار کے سرداروں کو پوربیہ کہتے تھے۔ لیکن رائے چند جسے مہارانا سانگا نے میدنی رائے کا خطاب دیا تھا۔ چوہان راجپوت تھا۔ سلہادی اور اس کا خاندان تنوار[1] قبیلہ سے تھا جو گوالیار میں راج کرتا تھا۔ ایک راجپوت کے دل میں اس سے زیادہ کوئی خواہش نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنا آبائی وطن اپنے دشمنوں سے واپس لے لے۔ اگر بزورِ شمشیر نہ مل سکے تو عیاری اور فریب سے بھی اسے احتراز نہیں

---

[1] میں نے "شیر شاہ" میں سلہادی پوربیہ کو چوہان لکھا تھا۔ ڈاکٹر ہیرانند شاستری نے بعد میں اس کی تائید کی۔ لیکن ٹوڈ کہتا ہے وہ تومر تھے۔ پروفیسر ہودی والا کے پاس اس قسم کے ثبوت ہیں جن سے ٹوڈ سے بات زیادہ وزن دار معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا میں نے بھی اپنی پہلی رائے میں ترمیم کر لی ہے۔ (ہودی والا اسٹڈیز صفحہ ۴۶۱)

Marfat.com

لہٰذا یہ غدار غالباً میدنی رائے کا بھتیجا ہو سکتا ہے۔ اس نے غالباً افغانوں کا ساتھ اسی مقصد کی تکمیل کے لیے دیا ہوگا۔ ایسا ہی دوسرے لوگوں نے بھی کیا تھا چندیری کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد رائے سین کے راجپوتوں نے افغانوں کے خلاف ایک ایک چپہ زمین کے لیے جدوجہد کی۔ جلال خاں کی فوج چندیری اور بھیلسہ کے درمیان ۱۲۰ میل کے علاقہ پر تین مہینہ میں قبضہ کر سکی۔ اپریل ۱۵۴۳ء کے شروع میں اس مہم کی کمان خود شیر شاہ نے اپنے ہاتھ میں لی۔

بھیلسہ سے جانب جنوب ۱۴ میل اور موجودہ بھوپال شہر سے جانب مشرق ۲۷ میل پورنمل کے رائے سین کے کھنڈر آج بھی وندھیاچل پہاڑ سے علیحدہ ایک بلند ترین چوٹی پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ قلعہ بیتوا ندی کے چڑھاؤ کی طرف جانب مشرق ۷ ½ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ شمال اور جنوب سے دو پہاڑی ندیاں اس پہاڑی چوٹی کو دوسرے پہاڑوں سے علیحدہ کرتی ہیں جس کی وجہ سے قلعہ کی مضبوطی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مشرق کی جانب ایک مضبوط طویل چٹان کی دیوار ہے جو بالنہ سے

رائے سین کی جانب بتدریج اونچی ہوتی چلی گئی ہے۔ یہ بلندی ۱۵۷۲ فٹ سے لے کر ۱۷۶۰ فٹ تک ہے جس پہاڑی پر یہ قلعہ واقع ہے وہ مشرق کی جانب کو نکلی ہوئی ہے۔

کسی بھی فوج کے لیے خواہ وہ کتنی ہی کثیر تعداد میں ہو اس پہاڑی قلعہ کا محاصرہ کرنا ممکن نہ تھا اس کی صرف ناکہ بندی ہی کی جا سکتی تھی۔ رائے سین کے قلعہ کے سامنے شیر کی حالت بھی اتنی ہی نازک تھی جتنی کہ چنار کے دوسرے حملہ کے وقت ہمایوں کی تھی۔ دشمن پیہم بیدار و ہوشیار رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے نہ تو قلعہ پر سیڑھیاں لگائی جا سکتی تھیں نہ دفعتاً حملہ کیا جا سکتا تھا۔ نہ سرنگ ہی لگائی جا سکتی تھی۔ ناکہ بندی میں کوئی خاص واقعہ ظہور پذیر نہ ہوا۔ سوائے اس کے کہ ۱۵۰۰ پٹھانوں اور اتنے ہی راجپوتوں کے درمیان ایک جھڑپ ہوئی۔ اس کے بعد شیر نے حکم دے دیا کہ کوئی افغان قلعہ کے نزدیک نہ جائے۔ عباس پھر بھی کہتا ہے کہ اس حملہ میں افغانوں کی فتح ہوئی۔ شیر شاہ کا زور بازو اور اس کی خوش تدبیری کا یہ تقاضا تھا کہ قلعہ پر گولہ باری کر دی جائے اور وہ شروع بھی ہو گئی۔ مخزن کا بیان ہے کہ

Marfat.com

شیر شاہ نے دیگر حصاروں کی توپیں بھی اپنے ہی پڑاؤ میں منگوا لیں اور توپ خانہ کو ایک بلند چبوترہ پر چڑھا کر قلعہ پر ایسی آتش فشانی کی کہ محافظین کو سانس لینا دوبھر ہو گیا۔[1] اسی سلسلہ میں عباس نے شیر شاہ کے متعلق ایک اور واقعہ بھی بیان کیا ہے جو کہ اس کے کردار کو پیش نظر کرتا ہے۔ عباس نے لکھا ہے کہ شیر شاہ نے یہ حکم دیا کہ جیسے بھی ہو سکے افغانوں کے پاس سے تمام تانبہ اور پیتل خواہ وہ دیگوں کی شکل میں ہو یا بڑے چمچوں کی شکل میں۔ فراہم کر لیا جائے۔

اور اس کو بھاری توپوں اور گولوں کے ڈھالنے میں کام میں لایا جائے۔[2] ہمیں اس فسانہ کو کلیتاً باور نہ کرنا چاہیئے اس میں صریحاً نمک مرچ لگا ہوا ہے۔ کیونکہ کسی فوج کے باورچی خانہ میں مٹی کی رکابیوں اور دیگوں سے کام نہیں چل سکتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تانبے اور پیتل کی فراہمی کے لیے تمام قرب وجوار کے علاقہ کو غارت کیا گیا ہو گا۔ اگرچہ غارت گری شیر شاہ کے طرزِ جنگ کا معمول نہ تھا۔

شیر شاہ کے لیے وقت تنگ ہو رہا تھا ادھر موسم برسات کی آمد تھی۔ ادھر مالدیو مارواڑ کو سرتاپا مسلح کر رہا تھا۔ عباس کا بیان ہے کہ گولہ باری سے پریشان ہو کر پورنمل نے ہتھیار ڈال دینے کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ کیونکہ دمدمہ کی آڑ سے راجپوت اجل کو دعوت دیتا ہے صلح کی بات نہیں کرتا ہے۔ شیر شاہ نے حکمت عملی سے کام تو لیا ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ گولہ باری سے بھی باز نہ آیا۔ شیر شاہ اپنے سپاہیوں کو بچانا چاہتا تھا۔ ان کی زندگی اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ بدایونی[3] نے حسب معمول مبالغہ آمیز الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کو راجپوتوں کے جوہر شجاعت کا پورا علم تھا وہ

---

[1] دیکھیے دارن جلد ۱ صفحہ ۱۳۶۔

[2] دیکھیے عباس نسخہ صفحہ ۲۴۳۔ ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۴۰۱۔

[3] شیر شاہ ایک سلطنت کے لیے بھی اپنے سپاہی کا سر دینے کو تیار نہ ہوتا کیونکہ اس کو افغان جان سے زیادہ عزیز تھے۔ بدایونی۔ رینکنگ کا ترجمہ۔ جلد ۱ صفحہ ۴۷۷۔

Marfat.com

اس بات کا خواہاں تھا کہ وہ اس کے لیے اپنی جان دیں نہ کہ اس کی مخالفت میں۔ لہٰذا اغلب یہی معلوم پڑتا ہے کہ نامہ و پیام کی شیرشاہ نے ہی پہل کی۔ پورنمل خاموش نہ رہا۔ اور اس نے اپنی شرطوں پر صلح کرنا قبول کیا۔ شیرشاہ نے فی الفور انھیں منظور کر لیا۔

شیرشاہ نے پورنمل کو بنارس[1] دینے کی تجویز کی مگر پورنمل نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا "میں قلعہ خالی کرتے کو تیار ہوں بشرطیکہ شہزادہ عادل خاں اور قطب خاں نائب قسم کھا کر یہ وعدہ کریں کہ فوجی آن و بان سے راجپوتوں کے بال بچوں اور ان کے مال و متاع کو مالوہ سے باہر لے جانے میں کوئی مزاحمت نہ ہوگی۔" مذکورہ بالا افسران کو شیرشاہ نے بلا بھیجا اور صلح کی شرائط منظور کر لیں۔ علاوہ بریں شیرشاہ نے پورنمل کی ہتک آمیز مانگ کو بھی مان لیا کہ وہ افغان پڑاؤ کو قلعہ سے دو منزل دور ہٹالے گا۔ پورنمل کی یہ جال بر پیش بندی تھی کیونکہ اس نے یہ منصوبہ بنا رکھا تھا کہ بیتوا ندی عبور کر کے وہ گونڈوانہ کے جنگلوں میں روپوش ہو جائے گا۔

چار ہزار راجپوت مع اپنے عیال و اطفال و ساز و سامان کے رائے سین کے قلعہ سے نیچے اترے اور ٹھیک اسی مقام پر خیمہ زن ہوئے جہاں پر کہ ایک روز قبل شیرشاہ مقیم تھا[2] یہاں ان پر جو بیتی وہ نوشتہ تقدیر تھا۔ ایک متنفس بھی زندہ نہ بچا۔ ہمیشہ کے لیے شیرشاہ کی عزت میں بٹہ لگ گیا کیونکہ اس نے یا تو عمداً یا ایسے واقعات سے مجبور ہو کر اس کے قابو سے باہر ہو گئے تھے ایک افغانی دستہ کو ان پر حملہ کرنے کی اجازت دے دی[3]

---

[1] ڈارن جلد اصفحہ ۱۳۶۔ جو وجہ بتائی گئی ہے کہ وہ پورنمل کے حرم سے کچھ مسلمان ... کی رہائی چاہتا تھا۔ غلط ہے۔

[2] عباس نسخہ صفحہ ۲۲۵۔

[3] اس بحث طلب معاملہ کے متعلق تفصیلی تبصرہ دیکھیے۔ ضمیمہ۔ رائے سین کے قتل عام کے لیے شیرشاہ کی ذمہ داری

Marfat.com

باب 16 کا ضمیمہ

رائے سین کے قتل عام میں شیر شاہ کی ذمہ داری

رائے سین کے اس حسرت ناک سانحہ کے لیے ہمیں ابو الفضل سے زیادہ کوئی معتبر شہادت نہیں مل سکتی کیونکہ اس کا بیان افغان مورخین کے اقوال پر مبنی ہے۔ اس واقعہ کے چار صدی بعد بھی ہم ابو الفضل کی رائے سے اتفاق کرنے کی جانب مائل ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"شیر نے پر فریب وعدہ اور مکار صلح کر کے راجہ کو قلعہ سے نکالا اور گمراہ قانون دانوں اور مکروہ بیوقوفوں کی کوشش سے انھیں لوگوں کو تہ تیغ کیا جن کو کہ اس نے پناہ دی تھی۔" اکبر نامہ ترجمہ ا۔ ۳۹۹۔ یہ فیصلہ اکبر کے زمانے کے علما کے شایانِ شان ہے۔ نظام الدین نے اس واقعہ کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا ہے۔

"علما نے خصوصاً میر شیخ سید رفیع الدین صفوی نے پورنمل کے قتل کا فتویٰ دیا۔" (طبقات ۲۲۱)

شیخ نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں کیا تھا۔ بدایونی سے پتہ چلتا ہے کہ افغان وگرد و نواح کے مسلمان مل کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پاک طینت شیخ سے اپیل کی (سلطان سکندر لودی نے اس کے تقدس کی وجہ سے اس کو المقدس کا خطاب دیا تھا۔) کہ وہ اپنے اثر سے بادشاہ پر دباؤ ڈالے (بدایونی ا۔ ۴۷۶)۔ مخزن اور بھی زیادہ صاف ہے "شیخ خلیل۔ میر سید رفیع الدین اور دیگر علما سب اس بات پر متفق تھے کہ سچے مسلمان بادشاہ کا فرض اولین ہے کہ وہ کسی بھی قسم اور صلح کی پرواہ کیے بغیر کافر اور ناپاک لوگوں کو واردِ جہنم کرنے میں تساہلی نہ کرے۔ (ڈارن ا۔ ۱۴۷)۔

عباس۔ نعمت اللہ (مصنف مخزن) احمد یادگار (تاریخ سلاطین افغانیہ)

Marfat.com

سب اس بات پر بہت خوش ہیں کہ شیر نے علما کے فتویٰ کے سامنے سر جھکایا اور شرائط صلح کو توڑ کر کافروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ قابل افسوس بات تو یہ ہے کہ یہ افغانی مذہبی مجنوں یہ کہہ کر ہی قناعت نہیں کرتے کہ افغانوں نے راجپوتوں کے پڑاؤ پر حملہ کر کے کافروں کو پامال کر دیا بلکہ انھوں نے قصاص انتقام کی فرضی کہانیاں بھی ایجاد کیں اور ان کو اشاعت دی۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ شیر نے انتقام لینے کی غرض سے پورنمل کی ایک کمسن لڑکی۔ دو بھتیجے اور ایک بھتیجی کو ناچ سکھانے والے ایک استاد کے سپرد کر دیا تاکہ وہ ان کو اپنے فن کی تعلیم دے۔ (ڈارن ۱۔ ۱۳۸)۔ اس قسم کی اخلاقی گراوٹ اور ادبی فریب نے اکبر کے زمانہ کے افغان مورخین کو جادہ مستقیم سے منحرف کر دیا تھا۔ وہ اپنا سب کچھ کھو چکے تھے۔ علیش ماضی کی یاد اکثر انھیں پریشان کرتی تھی۔ اب ادبی شغل ہی ان کی دل جمعی اور صبر کا تنہا ایک ہی سہارا تھا کہ وہ اس قسم کے فرضی قصہ" کو لکھ لکھ کر غریب ہندوؤں سے بدلہ لیا کریں۔ اس زمانہ میں عقل پر مذہب کا غلبہ تھا۔ اس مذہبی تعصب اور جنون نے عالموں کو اس قدر کور چشم کر دیا تھا کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ اس قسم کی باتیں لکھ کر وہ اپنے قابل ستائش و پرستش جانبازوں کا منہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کالا کر رہے ہیں۔ کسی بھی رہنما کی شہرت جب اس کے مداح مبالغہ سے کام لینے لگیں محفوظ نہیں رہتی۔ پھر بھی انصاف کا تقاضا ہے کہ شیر کے خلاف جو فرد جرم مرتب کی گئی ہے اس پر نظر ثانی ڈالی جائے کیونکہ موجودہ مورخ اور محقق ابوالفضل اور عباس کی کورانہ تقلید کرتے ہیں۔ شیر شاہ کے جرم کی نوعیت بالاختصار یہ ہے۔

۱۔ بے ایمانی کی صلح اور جھوٹے وعدے (ابوالفضل)

شیر کے خلاف جو بھی کہا جا سکتا تھا اس سے پیشتر ہی کہا جا چکا ہے۔ شروع میں شیر کے دماغ میں کوئی خیال فاسد نہ تھا۔ کیونکہ پورنمل کے مقابلہ میں وہ صلح کا زیادہ خواہش مند و کوشاں تھا۔ وہ یہ بھی بخوبی جانتا تھا کہ ہزار تن بتقدیر راجپوت بغیر اتنے ہی افغانوں کی جان لیے اپنی جان نہ دیں گے۔ دوسری طرف یہ بھی کہا

Marfat.com

جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ تصنع و ظاہرداری تھی۔ جس طرح اورنگ زیب نے سترہویں صدی میں نمک حرام ملاؤں سے دارا اور سنبھاجی کے خلاف فتویٰ لے لیا تھا۔ لیکن ایک مصنف کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی جانب سے اس بات کا اضافہ کرے جو گواہان نے اپنے بیان میں نہیں کہی۔ علاوہ بریں یہ کہنا ابوالفضل کے بیان سے باہر کی بات ہوگی ہمیں ابوالفضل کی بات پر اسی حد تک اعتماد کرنا چاہیئے کہ بعد میں چل کر شیر شاہ نے وعدہ خلافی کی اور اس کی ذمہ داری علما پر ہے۔

۲۔ باقی ماندہ لوگوں سے شیر کا انتقام

یہ سفید جھوٹ ہے[1] کیونکہ ہر آدمی راجپوت کی خصلت سے واقف ہے۔ جب ایسی نازک گھڑی ہوتی ہے تو وہ اپنی عورتوں اور بچوں کو خصوصاً شاہی گھرانے

---

[1] عباس کہتا ہے کہ قیدی لڑکے اور لڑکیاں بازی گروں کو دے دیے گئے۔ مخزن کہتا ہے کہ ناچنے والے استاد کو دے دیے گئے۔ (ڈارن ۱-۱۳۸)۔

احمد یادگار کہتا ہے کہ لڑکوں کو نامرد کر دیا گیا۔

ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے بلاوجہ عباس کی کہانی کو بہت اہمیت دی ہے۔ پورنمل کی ایک لڑکی اور بڑے بھائی کے ۳ لڑکے زندہ پکڑ لیے گئے تھے۔ لڑکی خانہ بدوش گانے والوں کو دے دی گئی۔ (ہمایوں ۱۷۵)۔ سب یہ جانتے ہیں کہ پورنمل کے صرف ایک بڑا بھائی تھا۔ جس کا نام بھوپت تھا۔ یہ اپنے والد سلہادی کے ساتھ کنواہہ کی جنگ میں ۱۵۲۷ء میں مارا گیا تھا۔ بھوپت کے صرف ایک لڑکا تھا پرتاپ جس کو پورنمل نے رائے سین کی گدی پر بٹھایا تھا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ بھوپت کے کئی لڑکے تھے تو جون ۱۵۴۳ء میں وہ سب ۱۶ سال سے زیادہ عمر کے ہوں گے۔ اس زمانہ میں راجپوت کا ۱۶ سالہ لڑکا پورا جوان لڑکا بن جاتا تھا جو بہادر سسودیہ کی طرح لڑ کر مرنا پسند کرتا تھا۔ نیچ آدمیوں کی طرح گرفتار ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ ڈارن لکھتا ہے کہ پورنمل نے اپنی بیویوں کو خود اپنی تلوار سے قتل کر دیا۔ پھر یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی لڑکی کو زندہ چھوڑ دیا ہوگا۔

Marfat.com

کے افراد کو اپنے ہاتھ سے پہلے ہی قتل کر دیتے ہیں۔ اس لیے یہ مان لینا سراسر لغو ہوگا کہ شبیر کے انتقام کے لیے پورنمل کے عزیزو اقارب زندہ ہی اس کے قبضہ میں آگئے۔

۳۔ شیخ رفیع الدین اور اس کا فتویٰ

کافروں کے خلاف اس قسم کا فتویٰ آج بھی کم پڑھے لکھے ملا لوگ دے دیتے ہیں اور اس بدلتی ہوئی دنیا میں اپنے پرانے عقائد اور اصولوں کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس قسم کا فتویٰ اکثر ایسی حالت پیدا کر دیتا ہے جو قابو سے باہر ہو جاتی ہے۔ شیر کے لشکر میں صرف شیخ ہی کو یہ قدرت حاصل تھی کہ وہ اس کو ایسے حکم سے روک سکتا تھا۔ اسلام کا سرپرست و رہنما ہونے کی وجہ سے یہ اس کا پاک فرض بھی تھا کہ وہ رسول اللہ اور خلیفہ کی زندگی سے اس قسم کی مثال پیش کرتا کہ اسلام وعدہ خلافی کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام میں کافر کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کی بھی زبردست اہمیت ہے۔ اس کے برعکس شیخ نے اپنا فتویٰ دیتے وقت اس کی مثال دی ہوگی۔ جب کہ اسلام میں مذہبی اور سیاسی تنزل آچکا تھا۔ جس کے لیے اسی قسم کے مولوی و ملا زیادہ ذمہ دار تھے۔ ہر زمانے میں اور ہر مذہب میں ان پادری لوگوں کے علم و تقدس نے سوسائٹی کو فائدہ بھی پہنچایا ہے اور بے انتہا نقصان بھی۔ لہٰذا اگر کوئی تنہا انسان ایسا ہے جس پر رائے سین کے قتل عام کا جرم عائد ہو سکتا ہے۔ تو وہ شیر شاہ نہیں بلکہ رفیع الدین ہے۔

شیر شاہ نے رفیع الدین کے فتویٰ کے سامنے سر جھکا کر جس کمزوری کا ثبوت دیا وہ اس کے شایان شان نہیں تھی۔ اس سے اس کی ذات و حکومت کو نقصان پہنچا لیکن مولویوں کے اس فتویٰ نے کہ کافر کو دیے ہوئے وعدہ کی کوئی اہمیت نہیں آئندہ نسلوں کو بھی نقصان پہنچایا۔ جب عثمانی بادشاہوں نے یوروپین قوموں کی انجمن اور بین الاقوامی قوانین کے دائرہ میں داخلہ لینا چاہا تو انہیں اس اصول کو علی الاعلان خیرباد کہنا پڑا۔ ہندوستان میں اس کا ہندوؤں کے سیاسی معیار پر خراب اثر پڑا۔ مہاراج ادھیراج سوائی جے سنگھ کچھواہا اور سورج مل جاٹ نے ۱۸ ویں صدی میں ملاؤں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا۔ انھوں نے گنگا جل ہاتھ میں لے کر اور

Marfat.com

گائے کی پونچھ پکڑ کر جو قسم کھائی تھی۔ اس کو پورا نہیں کیا۔ اور کہہ دیا کہ ملیچھ لوگوں کے ساتھ کیا ہوا وعدہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔

۴۔ موجودہ مورخ

(۱) ایلفنسٹن کہتا ہے "اس غداری اور سفاکانہ رویہ کے لئے کوئی معقول وجہ نہیں ملتی۔" (ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۴۵۶)

(۲) ڈاوسن لکھتا ہے "رائے سین کے قیدیوں کا یہ قتل عام ارادی تھا۔" (ایلیٹ ۴۔ دیباچہ صفحہ ۱۸)۔

ہمیں ابھی یہ نہیں معلوم ہوا کہ قتل عام میں شیر کی کیا غرض تھی۔ لہٰذا یا تو شیر کو اس جرم سے بری کرنا ہوگا یا یہ کہنا ہوگا کہ اس نے یہ شر محض شر کے لیے کیا ہوگا۔ پروفیسر ڈاوسن کا بیان مبالغہ آمیز ہے۔ پورنمل کے راجپوت جنگ کے قیدی نہیں تھے۔ وہ اپنے مکار و عیار حملہ آوروں کے خلاف لڑتے لڑتے شہید ہوئے۔ اصل واقعہ یہ ہے[1] کہ عیسیٰ خاں حاجب کی کمان میں ایک افغان فوجی دستے نے راتوں رات سفر کر کے راجپوتوں کا تعاقب کیا۔ راجپوت ان سے ۱۲ گھنٹے پہلے روانہ ہو چکے تھے۔ جب وہ دستہ راجپوتوں کے نزدیک پہنچ گیا اور راجپوتوں کو ان کے ناپاک ارادہ کا علم ہوا تو وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر مرنے مارنے کو تیار ہو گئے جو ان کی قوم کی خصوصیت ہے۔ راجپوت کافی تعداد میں افغانوں کو مار کر شہید ہوئے۔

البتہ کوئی مورخ شیر کی جانب سے یہ صفائی پیش نہیں کر سکتا کہ شیر اعلیٰ

---

[1] میری کتاب شیر شاہ شائع ہونے کے بعد مرحوم جناب ایچ بیورج نے اس واقعہ کے متعلق مجھے ایک خط لکھا تھا جس میں میری رائے کی تردید کی تھی۔ اس خط پر میں ۲۰ سال تک غور کرتا رہا۔ بیورج کی زندگی میں میں نے ان کے خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس وقت مجھ میں ایک نئے مصنف کی رعونت تھی اور میں اپنی رائے کو درست مانتا تھا۔ لیکن اب میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بیورج کی رائے درست تھی۔ اور میں غلطی پر تھا۔ میں ان کی روح سے معذرت کا خواستگار ہوں۔

Marfat.com

اخلاق و کردار کا انسان تھا۔ اس سے اس قسم کی نمک حرامی اور غداری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ کیوں کہ اس کے گذشتہ زندگی کے واقعات اس امر کے شاہد ہیں ہاں۔ یہ بات ضرور ہے کہ رائے سین کے قتل عام کا وہ تنہا مجرم نہیں ہے۔ بلکہ رفیع الدین اس کا شریکِ فعل ہے۔ ایک روایت ہے کہ قطب خاں نائب شیر کی اس وعدہ خلافی اور ذلیل حرکت سے اس قدر آزردہ خاطر ہوا کہ وہ شیر کی خدمت سے مستعفی ہو کر فقیر ہو گیا۔

شیر کے حق میں مندرجہ بالا واقعات صفائی کے بیان کے بعد بھی یہ یقین کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ سلطنت کی شان پر بٹہ لگانے والا ایسا حسرت ناک واقعہ کیسے ظہور پذیر ہو سکتا تھا۔ اگر شیر نے ایسی شرمناک کمزوری نہ دکھائی ہوتی جو کہ وعدہ کی خلاف ورزی کے برابر تھی۔ چنانچہ اب ہم اپنی رائے بدل رہے ہیں اور شیر کو شبہ کا فائدہ نہ دے کر یہ کہتے ہیں کہ تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ شیر کی مذمت کی جائے۔ کیونکہ اس کا جرم ثابت ہے۔

احمد یادگار نے جس نے کہ اپنی تاریخ ۱۶۴۷ء میں لکھی ان سب گپوں اور فرضی کہانیوں کو ایک جگہ فراہم کیا ہے۔ جبکہ رائے سین کے اس واقعہ کے متعلق ہیں اس نے نہایت ہی مسرت سے شیر کے کردار کو زیادہ سے زیادہ گہرے سیاہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ شیر کا یہ فعل محض ارادی تھا بلکہ اس نے اس کے لیے پہلے سے ہی، تجویز بنائی تھی۔ کسی دیگر فرد نے اس کو اس فعل کے لیے اشتعال نہیں دیا تھا۔ شیر شاہ نے یہ حکم دیا تھا کہ افغان کیمپ کے وسط میں ایک جگہ پورنمل کے لیے خالی کی جائے۔ پورنمل کے سپاہیوں نے منت و سماجت کی تھی کہ وہ اس مکار بادشاہ کا زیادہ اعتبار نہ کرے۔ لیکن پورنمل نے یہ کہہ کر سب کو خاموش کر دیا کہ اس کو بادشاہ پر اعتماد کلی ہے۔ پورنمل اپنی بیگمات بھوں بھائی کے لڑکوں کے ساتھ قلعہ سے باہر آیا۔ اور اس نے مقررہ جگہ پر خیمے لگا دیے۔ شیر شاہ قلعے کے اندر داخل ہوا۔ اسی رات کو شیر شاہ کو تیز بخار آ گیا۔ صبح کے وقت جب بخار کی شدت کم ہوئی۔ اس نے کافروں کو برباد کرنے کی قسم کھائی۔ اس نے فوراً ہیبت خاں کے نام ایک پیغام بھیجا۔ "جو کام تمہیں سپرد کیا گیا تھا اسے جلدی

Marfat.com

سے پورا کرو۔ خواص خاں، قطب خاں، جلال خاں بوجالو، ڈوڈا میانہ سب سپہ سالاروں کو تیار ہونے کو آگاہ کردو اور چہار جانب سے ان پر حملہ کردو۔" شیر نے یہ دردناک وحشت انگیز نظارہ خود رائے سین کے قلعہ کی فصیل سے دیکھا۔[1]

یہ بیان تنقید و تبصرہ کا محتاج نہیں حالانکہ احمد یادگار کے بیان کے ہر حصہ کی تائید مشکل ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ انسان اپنے دشمنوں سے تو اپنی حفاظت کرسکتا ہے لیکن اسکے اپنے غیر اصولی بے باک دوستوں سے اسے بچانا مشکل ہے۔

---

[1] دیکھیے تاریخ شاہی فارسی۔ صفحات ۲۱۸-۲۱۹۔

Marfat.com

باب 17

مارواڑ پر حملہ

(951 950 ہجری۔ نومبر 1544ء سے مئی 1543ء تک)

منصوبہ بندی اور تیاریاں: جون ۱۵۴۳ء میں رائے سین پر قبضہ کرنے کے بعد شیر نے یوسف خاں اچاخیل[1] کے لڑکے شہباز خاں کی کمان میں ایک مضبوط فوج قلعہ میں تعینات کی اور وہ خود آگرہ واپس آیا۔ آگرہ و دہلی میں غیر معمولی تیاریاں ہونے لگیں اور چار مہینے سے بھی کم عرصہ میں اسی ہزار گھوڑ سوار۔ پیادے، توپ خانہ، جنگی ہاتھی اور غالباً اونٹوں کا ایک رسالہ مارواڑ کی مہم کے لیے تیار ہو گیا۔ اس زمانہ کے مورخین نے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ اس قدر قلیل مدت میں اس نے اتنی کثیر تعداد فوج کیسے فراہم کی۔ مورخین نے اس باب میں فتح پور سیکری[2] کا نام غلطی سے لکھ دیا ہے۔ شیر شاہ کی تیاریوں کو دیکھ کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ ظاہر طور پر شیر نے راؤ مالدیو سے دوستی بنائے رکھی۔ اور امن و صلح کی بات کرتا رہا لیکن درپردہ جب سے وہ اس کے علاقہ سے لوٹ کر آیا فوجی تیاریوں میں مصروف رہا۔ اور آخری لڑائی کے لیے نقشہ بناتا رہا۔ اس نے اپنی سلطنت کی حدود میں مختلف

---

[1] ڈارن نے اپنی تاریخ (جلد ۱ صفحہ ۱۲۸) میں اچاخیل کے بجائے اٹچا خیل لکھا ہے۔ جو غلط ہے۔ اچاخیل ایک قبیلہ کا نام ہے۔ جو ضلع بنوں میں آج بھی پایا جاتا ہے۔ (گلوسری جلد ۲ صفحہ ۲)

[2] عباس نے غلط لکھا ہے۔ مخزن نے اس کی نقل کی ہے۔

Marfat.com

مقامات پر حملہ آور فوج کو مسلح رکھا تھا اس نے مختلف سرکار کے فوج داروں کو خفیہ احکام بھیجے کہ وہ فوج کی بھرتی اور رسد کی فراہمی جاری رکھیں لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ آخر بادشاہ کی تیاریوں کا نصب العین کیا ہے۔ شیر کے لیے فوج فراہم کرنا تو آسان تھا مگر ایسے خطے میں جہاں آبادی کم ہو اور ہمیشہ قحط کے ڈر سے اور پانی کی کمی سے پریشانی رہتی ہو۔ رسد رسانی کا کام بہت مشکل تھا۔ مؤرخوں نے حسب معمول جو مبالغہ آمیز خیالی مرقع پیش کیا ہے اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شیر شاہ کی یہ مہم ویسی ہی تھی۔ جیسی کہ زرزیس کے میڈیائی لشکر کی جبکہ وہ ہیلاس کے خلاف فوج کشی کر رہا تھا۔ یعنی اس موقع پر شیر کا لشکر اتنا کثیر التعداد تھا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ محاسب نہایت غور و خوض کے بعد بھی اس کو شمار کرنے میں قاصر تھے[1]۔ دیر لوگوں کا فاتح اپنے لاثانی جانبازوں کے گروہوں کے باوجود بھی تھرمابلی یا میرا تھان کے احکامات کو اپنے حسابی شمار سے باہر نہیں رکھتا۔ اور نہ شیر نے ہی ایسا کیا۔ اگر دورِ قدیم میں زرزیس کے ایرانی دل بادلوں نے ہیلاس کی ندیوں کو خشک کر دیا تھا۔ تو کون سی تعجب کی بات ہے۔ کہ لونی جیسی اکیلی ندی اور مالدیو کی ریاست کے چند کنوئیں ہندوستانی

حملہ آور فوج کے لیے وضو کا پانی بھی دستیاب نہ کر سکے۔ خاص کر جب کہ اس علاقہ میں ہمیشہ ہی پانی کا قحط رہتا تھا اور ہندوستان کے سپاہی عربوں کی طرح پانی کے خرچ میں کفایت کے عادی نہ تھے۔ پھر بھی ۸ ماہ کے دوران مہم میں ایک متنفس کو بھی کوئی پریشانی نہ اٹھانا پڑی۔ سپاہی کے رو سے یہ تھی شیر شاہ کے حسنِ انتظام کی اہلیت۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ناگہانی فوجی ضرورت میں روپے اور سپاہیوں سے مشکل کام ہو جاتا ہے۔ مگر حسن انتظام کے بغیر کامیابی محال ہوتی ہے۔

راؤ مالدیو ایسا غنیم نہ تھا جو کہ ہمایوں کی طرح دوبارہ عالم غفلت گرفت

---

[1] عباس۔ ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۴۰۵۔ کرنل ٹوڈ کم سے کم تعداد ۸۰ ہزار بتاتا ہے —

Marfat.com

میں آجاتا۔ ایک سال کی نمائشی صلح کے دوران بھی وہ اتنا ہی باخبر اور با ہوشیار رہا جتنا کہ خود شیر رہا تھا۔ اس نے اپنے علم کے چاروں طرف اتنی کثیر اور ایسی مردانہ فوج اکٹھا کرلی تھی کہ جودھ پور کی بدفال زمین پران کے نشان کے نیچے کبھی بھی اکٹھا نہ ہوئی تھی۔ بھاٹ سوانح نگاروں نے تو اس کی تعداد ۸۰ ہزار بتائی ہے مگر نظام الدین کے سنجیدہ شمار کے مطابق اس کی تعداد ۵۰ ہزار سے کم نہ تھی۔[1] مارواڑ کی کھیر (یعنی قومی رضاکار فوج) نے اسلحہ باندھ لیے تھے۔ چوہان بھائی اور پرمار بھی بطور کرائے کے سواروں کے بھرتی ہوئے۔ تمام ریاست کے قلعوں میں تحفظ کا مناسب بندوبست کردیا گیا جبکہ شیر شاہ رائے سین کے قلعہ کے محاصرہ میں مصروف تھا اگر اس وقت مالدیو نے حملہ کی پہل کردی ہوتی تو شاید اس کے حق میں زیادہ سود مند ہوتا۔ مگر اس نے تو انتظار کیا۔ اور اس طرح پانسہ شیر شاہ کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس اثنا میں ہیبت خاں نیازی نے اوپری سندھ پر تسلط قائم کرلیا تھا۔ اور بھکر کا قلعہ بھی فتح کرلیا تھا۔ ٹھٹھہ کا شاہ حسین ارغون بھی مفرور ہمایوں سے ہار کھاکر بے حرمتی سے پست ہوچکا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے علاقہ کا نصف سے زیادہ حصہ افغانوں نے چھین لیا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ شیر شاہ کے خلاف جدوجہد میں لوگ بآسانی اس کے چاروں طرف اکٹھا ہوجاتے مگر مغل بادشاہ قندھار کو روانہ ہوچکا تھا۔ (جولائی ۱۵۴۳ء) چنانچہ جب ۱۵۴۳ء کے دوسرے نصف میں مالدیو شیر کے حیطہ تصرف سے گھر گیا تو مارواڑ کی طاقت میں نسبتاً کچھ کمی آگئی۔ کیونکہ اب وہ اکیلا پڑ گیا تھا مغرب میں جیسلمر جوکہ سندھ سے بالکل متصل تھا اس کے دامن کا تحفظ نہ کرسکتا تھا۔ شمال اور شمال مشرق میں بیکانیر شیر سے پنہ پر ہوگیا تھا۔ کیونکہ وہاں پر فیروز پور، تحفظہ اور سرسا کی سمت سے حملہ ہوسکتا تھا۔ اس کی مشرقی سرحد یعنی شیخاواٹی کے سراسر طول میں یہی کیفیت تھی۔ جنوب مشرق میں میواڑ کمزور اور مخالف تھا۔ مگر اس سب سے زیادہ خطرناک بات تھی غنیم کے خیمے میں

---

[1] دیکھیے طبقات صفحہ ۲۷۷، ریو مارواڑ جلد ا صفحہ ۱۲۸۔

Marfat.com

بیکانیر اور میدنا کے معزول حکمرانوں کی موجودگی۔ اور پھر مالدیو کا اعمال نامہ بھی ساتھ میں تھا کیونکہ بیشتر راٹھور سرداروں نے بلا جنگ کیے ہوئے اس کی ماتحتی قبول نہ کی تھی۔ وہ لوگ اس سے بدظن تھے۔

ہمیں چنداں ضرورت نہیں کہ ہم مالدیو اور شیر میں جو تنازعہ ہوا اس کی اصلی یا خیالی وجوہات کی چھان بین کریں۔ یا اس بات کی جستجو کریں کہ آیا سال گذشتہ کے معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے کے بعد بھی شیر شاہ کے پاس حملہ کرنے کی کوئی جائز اور معقول وجہ تھی یا نہیں اسلامی اور قدیم ہند کا یہی سیاسی اصول تھا کہ اولین موقع پر ہی حملہ آور ہو اور فتح کرو۔ اس دور میں خواہ مغرب ہو یا مشرق دونوں ہی جگہ ہم بودی ذلت کا نشان تھا۔

یا سیاسی حالات کا تقاضا۔ ہندوستان میں اشوک ایک افسانہ بن گیا تھا۔ شیر سے ایک صدی قبل دہلی کے پنڈتوں نے اشوک کے کتبوں میں فیروز تغلق کی آمد کی پیشین گوئی دریافت کر لی تھی۔ ابھی اکبر اور ابوالفضل کا عہد ۵۰ سال بعد آنے والا تھا۔ جب کہ ایک کھوکھلے سیاسی اخلاق کی تبلیغ ہوئی۔ اور اس کے ذریعہ حملہ آوری اور جہانگیری کی ہوس کی مذمت کی گئی۔ نا تو ہندوستان کے کسی شاندار عہد میں اور نہ باہر اسلامی خلافت کی تاریخ میں ایسا ثبوت ملتا ہے کہ خود مختار ریاستیں امن و امان کے ساتھ ہم بود رہی ہوں۔ بہرحال دہلی کا شیر اور مارواڑ کا ناقابل تسخیر سور ایک عرصہ تک بلا جنگ و جدل کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ کیونکہ ہندوستان کی سیاسی فضا میں دو ہی راستے تھے یا تو پرخطر ہم بودی یا کلیتاً نیستی۔

مالدیو کی ریاست میں ہر دو جانب سے گھسا جا سکتا تھا۔ رنتھمبور ہو کر اجمیر ضلع میں یا شیخاواٹی اور نارنول ہو کر ناگور ضلع میں۔ شیر کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ پہلے کس طرف سے حملہ کیا جائے یہ مسئلہ سیاسی نقطہ نظر اور فن حرب دونوں کی رو سے کافی اہم تھا اس وقت تک شیر راجپوتانہ کے علاقہ سے کلیتاً اچھی طرح واقف نہ ہو پایا تھا نا راجپوتوں کی طاقت سے ہی۔ اس نے سیاسی دوراندیشی سے حد سے زیادہ یہ گمان کر لیا تھا کہ ممکن ہے اس کو بھی بابر کی طرح کنواہہ کی

Marfat.com

صورت حالات کا سامنا کرنا پڑے۔ اور راجپوتوں کی متحدہ طاقت سے لوہا لینا پڑے۔ لہٰذا شروع میں یہ احتیاط لازم تھی کہ اس کے کسی فعل وحرکت سے عنبر اور میواڑ کی ریاستیں جو اجمیر کے پڑوس میں ہیں خوف زدہ نہ ہو جائیں۔ علاوہ بریں اگر پہلا حملہ اجمیر کی جانب سے کیا جاتا تو اس مضبوط قلعے کو فتح کرنے میں کافی وقت ضائع ہو جاتا اور مالدیو کو موقع مل جاتا کہ وہ شیر کے ساتھ وہی چال چل سکتا تھا۔ جو شیر نے چنار کے محاصرہ کے وقت ہمایوں کے ساتھ کھیلی تھی۔ افغان فوج کے اجمیر میں پھنس جانے کے بعد یہ ممکن تھا کہ بہادر جست راٹھور گھوڑ سوار ہریانہ ہو کر دہلی پر ٹوٹ پڑتے اس کے برعکس مالدیو کی تیاریوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شیر پہلے سال کی طرح بے خوف ہو کر ناگور پر بھی شیخاواٹی ہو کر دفعتاً حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے حالات میں یہ لازم ہو گیا کہ مالدیو کو شیر کے حملے کے منصوبے سے بالکل بے خبر رکھا جائے۔ تاکہ اس کو زک نصیب ہو۔ شیر کا آگرہ میں قیام اور وہاں سے اس کی فوج کی نقل وحرکت مالدیو کو دھوکہ دینے کی محض ایک ترکیب تھی جس کا کہ بالآخر مالدیو کو سامنا کرنا پڑا۔[1]

مالدیو پر اچانک حملہ

۱۵۴۳ء کی برسات میں شیر کی نقل وحرکت نے مالدیو کو شیر کے ارادوں کے متعلق حیران کر دیا۔ مخزن[2] میں لکھا ہے کہ بظاہر شیر سیر وشکار کی دل بستگی میں محو رہا اور دہلی و آگرہ کے درمیان گھومتا رہا۔ سیر وشکار کے اس دور میں ایک مرتبہ شیر کا مقابلہ گور گاؤں کے سرکش وبدنام گوجر ڈاکوؤں سے ہوا۔ یہ گوجر دہلی سے تقریباً ۱۸ میل پالی پاکھل[3] کے ویران پہاڑی علاقوں میں آباد تھے۔

---

[1] ڈارن جلد ۱ صفحہ ۱۳۸۔

[2] تاریخ داؤدی قلمی نسخہ صفحہ ۲۴۲۔ ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۴۷۷۔ دونوں قلمی نسخوں میں پالی اور پاکھال گوجروں کے قصبوں کے نام بتائے ہیں۔ ایلیٹ نے پالی اور پہل لکھا ہے۔ پروفیسر ہوڈی والا نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ یہ مقامات کے نام ہیں (اسٹڈیز صفحہ ۴۷۷) مجھے داؤدی نے گمراہ کر دیا تھا اس لیے

Marfat.com

ستمبر ۱۵۴۱ء میں شیر دہلی کے نئے شہر اور اس کے اندر کی عمارتیں مثلاً شیر منڈل جو اب ۳ سال کے عرصہ میں مکمل ہونے والی تھیں دیکھنے آیا۔ اس مرتبہ شیر اپنے پیر فکار میں ہریانہ کے اندر نارنول تک چلا آیا۔ نارنول شہر کا آبائی مسکن تھا۔ جہاں اس نے جد امجد ابراہیم کی قبر پر ایک مقبرہ و قلعہ بنوانا شروع کیا تھا۔ میاں ابراہیم کی وفات کے وقت شیر محض ایک طفل نوزائیدہ تھا۔ شیر دہلی میں خود زائش مند تھا۔ عدملین کی طرح بظاہر مصروف رہتے ہوئے بھی امور سلطنت کی طرف مبذول رہتا تھا۔ دفعتاً ۱۵۴۲ء کی خزاں میں مطابق ۹۴۹ھ دہلی کی بے شمار فوج شیخاوتی کے علاقے سے ہوتی ہوئی نارنول کی جانب سے مالدیو کے علاقہ میں دریا کے سیلاب کی طرح ٹوٹ پڑی۔ مالدیو کے سپہ سالار کو پلنے پہ تشویشناک خبر اپنے آقا کو جودھ پور بھیجی۔ جو وہاں سے ۱۲۰ میل دور تھا۔[1]

چونکہ ہمارے پاس کوئی مستند تاریخی ثبوت نہیں ہے لہٰذا یہ قیاس آرائی بے سود ہے کہ شیر نے آگے بڑھنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کیا۔ عباس کو ہندوستان کے طبعی جغرافیہ کی ماحقہ واقفیت نہ تھی۔ وہ لکھتا ہے شیر آگرہ سے روانہ ہو کر فتح پور سیکری پہنچا۔ اور وہاں سے کمال احتیاط کے ساتھ آگے بڑھا۔ مخزن بھی اس رائے سے متفق ہے کہ شیر پہلے فتح پور سیکری گیا۔ جہاں اس نے سب تندرست نوجوانوں کو فراہم کر کے مسلح ہونے کا حکم دیا۔[2]

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں اس بات کی تفتیش میں ناکام رہا۔ داؤدی کی تاریخ ہجری ۹۴۶ھ بھی غلط ہے۔ واقعات کا سلسلہ بھی غلط ہے۔ اس نے اس کو ملتان کی فتح کے بعد لکھا ہے۔ میں نے ۹۴۵ھ میں پالی اور باکھال کا حملہ دکھایا ہے۔ جہاں تک سنگر گڑھ دہلی کی بات ہے داؤدی کی تاریخ ۹۴۷ھ ٹھیک ہو سکتی ہے۔

[1] دیکھیے سارداد اجمیر صفحہ ۱۵۱۔ اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس راجپوت تاریخ کے مطالعہ سے میری پہلی رائے کی مزید تائید ہوتی ہے کہ شیر نے یہ حملہ فتح پور سیکری کی جانب سے نہیں کیا۔ عباس کی غلط رائے کے لیے دیکھیے۔ عباس ۲۳۴۔ اور ایلیٹ جلد ۶ صفحہ ۴۰۶۔

[2] ڈارن صفحہ ۱۳۸۔

Marfat.com

اس خیال کی لغویت اس بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ فتح پور سیکری آگرہ سے محض ۲۴ میل دور ہے جہاں تک اس مہم کی تفصیل کا سوال ہے یہ ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن جگہ کا نام ضرور غلط ہے۔ یہ مقام فتح پور مالدیو کی ریاست کی سرحد یا سرحد کے نزدیک دیدوانہ کے قرب و جوار میں کہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ راجپوت ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ کوپا نے شیر کے حملہ کے متعلق خبر دیدوانہ سے جودھ پور بھیجی تھی۔ نقشہ پر نظر ڈالنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ لفظ فتح پور کے ساتھ سیکری کا اطلاق لاحاصل اور غیر ضروری ہے۔ یہ فتح پور شیخاواٹی ہونا چاہیے۔ ابو الفضل نے اسے فتح پور جھن جھنوں[1] لکھا ہے۔ یہ شیخاواٹی کے صدر مقام سیکر سے شمال مغرب۔ مغرب میں ۳۰ میل دور واقع ہے۔ اور دیدوانہ سے اس کا فاصلہ بجانب مشرق۔ مشرق شمال ۵۴ میل ہے۔ یہ موضع فتح پور جھن جھنوں ہی وہ جگہ ہو سکتی ہے جہاں سے شیر نے اپنی فوج کو مسلح ہونے کا حکم دیا ہوگا۔ نقل و حرکت میں احتیاط اس لئے لازم تھی کہ دیدوانہ میں مسلح راٹھور فوج موجود تھی۔ فتح پور جھن جھنوں سے شیر بجانب مغرب بیکانیر کی طرف چل دیا۔ بر فعل کوپا کو دھوکا دینے کے لیے تھا۔ شیر کو بیکانیر پہنچ کر اپنا ایک فرض بھی پورا کرنا تھا جس سے اس کو خود بھی تقویت ملتی۔ بیکانیر کے سابق وارث شہزادہ کلیان مل[2] اور اس کے بھائی بھیم کو جو بھاگ کر اس کی پناہ میں آ گئے تھے ان کا تخت و تاج واپس

---

[1] فتح پور جھن جھنوں دیکھیے آئین ۲ صفحہ ۲۷۷۔ یہ مقام عرض البلد ۲۸° اور طول البلد ۷۵° پر واقع ہے۔ ۱۷۹۶ء میں مرانٹھا ہریانہ سے شیخاواٹی داخل ہوئے تھے اور فتح پور کے مقام پر ایک لڑائی ہوئی تھی۔ (سرکار رفال آف مغل ایمپائر جلد ۴۔)۔

[2] نینسی نے راؤ کلیان مل کی تخت نشینی کی تاریخ بکرمی سمبت ۱۵۹۹ مطابق ۱۵۴۲ء دکھائی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شیر نے اس مہم کے شروع میں کلیان کو تخت واپس دلایا۔

Marfat.com

دلانا تھا یہ کام بہت آسان تھا کیونکہ ریاست کے باشندگان اپنے جاں بر حکمراں کی واپسی کے لیے کوشاں اور خواہش مند تھے[1] اس طرح ریگستان میں اپنی فوج کی پشت مضبوط کرنے کے بعد شیر نے ناگور اور میدتا کی جانب براہِ راست کوچ کیا۔ گویا اس کا ارادہ جودھ پور پر حملہ کرنے کا ہو۔ شیر کی اس نقل و حرکت سے

کوپا دیدوانہ میں الگ پڑ گیا۔ وہ اس راجپوت جری سردار سے لوہا نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش صرف اتنی ہی تھی کہ وہ اس کے (شیر) محاصرانہ طرزِ عمل سے مجبور ہو کر دیدوانہ سے ہٹ جائے۔ نینسی کے ایک چلتے پھرتے حوالہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کوپا نے اپنے ایک افسر مسمی گاگا کو بطور ایک سفیر کے شیر کے پاس بھیجا۔ مگر یہ نہیں معلوم پڑتا کہ کیوں؟ کوپا ایک بہادر اور تجربہ کار سپاہی تھا۔ اس کا ضمیر بے داغ تھا۔ لہٰذا اس پر غداری کا شبہ کرنا غلط اور ناحق ہوگا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مالدیو نے کوپا کو یہ ہدایت دی تھی کہ شیر کی فوج سے ٹکر نہ لے۔ بلکہ وہ دیدوانہ چھوڑ کر اپنی فوج کے ساتھ جے تارن کے مقام پر راٹھور فوج سے آ کر مل جائے۔ جے تارن اجمیر اور بیار کے درمیان ایک جگہ ہے۔ (یہاں بیکانیر سے میرتہ جنکشن ہوتی ہوئی جودھ پور جانے والی ریلوے لائن کا ایک اسٹیشن ہے۔) اگر اس جوشیلے اور اولوالعزم نوجوان نے شیر کے پاس بذریعہ سفیر یہ پیغام بھیجا ہو کہ یا تو وہ لڑائی کے میدان میں آ جائے یا پھر

---

[1] بجرنگ بھاٹی کے لڑکے گاگا کے لیے دیکھئے نینسی جلد ۲ صفحہ ۲۲۵ و ۲۷۔ گویا اور گاگا ایک ہی ماں کی اولاد تھے اور آپس میں ایک دوسرے کو بھائی کہتے تھے۔ گاگا کے متعلق نینسی نے متضاد بیان دیے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اسے سور شہنشاہ کی خدمت میں بھیجا گیا تھا جس نے اس کو قید کر لیا۔ لیکن یہ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ شیر کے خلاف کوپا کے ساتھ لڑائی میں شریک ہوا تھا۔ اور شہید ہو گیا۔ اگر گاگا پہلے سے شیر کی حراست میں ہوتا تو کوپا کے ساتھ سامیل کی جنگ میں شیر کے خلاف کیسے لڑتا۔ لہٰذا ہم اس گاگا بھاٹی کی قید خانہ کی کہانی کو رد کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کوپا اس بے عزتی کو خاموش بیٹھ کر برداشت کرنے والا انسان نہ تھا (نینسی دہی ۲۷۔)۔

Marfat.com

اس کو دیدوانہ سے بلا مزاحمت چلا جانے دیا جائے۔ توغالباً شیر نے آخری تجویز کو مان لیا ہو گا۔ کیونکہ گویا کی فوج دیدوانہ سے صحیح سلامت چلی گئی تھی اور سامیل کی جنگ میں جو مالدیو کی آخری فیصلہ کن لڑائی تھی اس نے حصہ لیا تھا۔
مالدیو نے پہلے سوچا تھا کہ وہ شیر کی فوج کو میروار کی پہاڑیوں میں جو اجمیر کی طرف جاتی ہیں اور جنگلات سے ڈھکی ہوئی ہیں گھیر لے گا۔ لیکن جب اس کو یہ خبر ملی کہ شیر فتح پور جھن جھنوں کی طرف بڑھ رہا ہے تو اس کو اپنی چال نہایت ہی ناقابلِ عمل معلوم ہوئی۔ شیر نے اپنی گذشتہ سال والی چال سے پھر کام لیا۔ لیکن اب اس کا پیمانہ نہایت ہی خوفناک تھا۔ اس نے مالدیو کے سب سے زیادہ خطرناک مقامات پر چوٹ کی۔ چنانچہ مالدیو کے سامنے اب

یہ مسئلہ در پیش ہوا کہ اجمیر اور جودھ پور دونوں کا بیک وقت کیسے تحفظ کرے۔ کیونکہ اس کو پتہ نہ تھا کہ اس میں سے کس پر حملہ پہلے ہو گا۔ ایسے نازک موقع پر مالدیو نے صورت حال کا نہایت ہی خوش اسلوبی سے اندازہ لگا لیا اور اپنی تمام فوجوں کو جو کہ غیر محفوظ مقامات جیسے کہ دیدوانہ اور میدتا میں تعینات تھیں جے تارن پرگنہ میں اکٹھا کر لیا۔ اس فوج کی تعداد پچاس ہزار تھی جے تارن (نقشہ میں جیتیزم) جودھ پور سے ۵۰ میل مشرق میں اور اجمیر سے ۴۰ میل مغرب میں ہے۔ مالدیو نے بپار کو اپنا صدر مقام بنایا۔ اس قصبہ کی اس نے قلعہ بندی کر لی تھی۔ اور یہاں اپنے لیے ایک خاص محل بھی تیار کیا تھا۔ زمانہ حال میں بپار ایک ریلوے جنکشن ہے۔ یہ راٹھوروں سے ۴۰ میل جنوب مشرق، جودھ پور سے ۳۰ میل شمال مشرق۔ اور جے تارن سے ۱۶ میل سے بھی کم فاصلہ پر ہے۔ شیر نے میدتا کو برم دیو کو دیدیا۔ لیکن جب آگے بڑھا تو اس کو دشواریاں پیش آنے لگیں۔ اگر جودھ پور کی سمت میں بغیر مالدیو کی میدانی فوج سے ٹکر لیے بڑھتا تو وہ راٹھوروں کی زد میں آجاتا۔ وہ بپار اور جے تارن سے نقل و حرکت کر کے اس کو خشک علاقہ میں شکنجے میں پھانس لیتے۔ لہذا شیر کے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ رہ گیا تھا کہ میدتا سے جنوب مشرق کو بڑھ کر مالدیو کی فوج کے پاس پہنچ کر اس سے فیصلہ کن ٹکر لے۔ مگر جب جے تارن پہنچ کر اس کا آگے کا

Marfat.com

راستہ بند ہو گیا کیونکہ ۱۲ امیل دور گری گاؤں میں راٹھور فوج مالدیو کی کمان میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی تب اس نے جے تارن کے پاس ہی سامل گاؤں میں مورچہ بندی کرلی۔ یہ دونوں فوجیں جس مقام پر خیمہ زن تھیں اس کے تین طرف مشرق کو چھوڑ کر دریائے لونی اور اس کی معاون ندیاں تھیں حالانکہ موسم سرما میں وہ دریا خشک تھا۔ اس علاقہ میں لمبی لمبی گھاس اور خشک

نالے تھے۔ جن کی آڑ سے ایک دوسرے کے ساتھ معمولی جھڑپیں کرنا بہت آسان تھا۔ ظاہرہ صورت حال یہ تھی کہ یا تو شیر اب اجمیر کی جانب بڑھے یا وہیں انتظار کرے اور مالدیو کو یہ ترغیب دے کہ وہ فوج لے کر میدان جنگ میں اتر آئے۔ تاکہ جم کر لڑائی ہو اور مالدیو کا انجام رانا سانگا کی طرح ہو جائے۔ اس نے اپنے سب سے بڑے لڑکے عادل خاں کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ وہ آگرہ سے فوج لے کر رنتھمبور کی جانب سے کوچ کرے اور اپنی نقل و حرکت سے اس قسم کا مظاہرہ کرے۔ گویا اس کا ارادہ جنوب مشرق میں اجمیر پر حملہ کرنے کا ہے۔

اجمیر پر ہر دو جانب سے حملہ کا خطرہ تھا۔ لہٰذا راؤ مالدیو نے یہ سوچا کہ اجمیر میں عورتوں اور بچوں کو رکھنا بعید از عقل و مصلحت ہے۔ لیکن اسے اپنی بیگم "روٹھی رانی اوما دیوی (پراکرت میں "اومادے") کو اس خطرناک وقت میں اجمیر چھوڑ کر جانے کے لیے رضامند کرنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ گڑھ بیٹلی۔ (قدیم تاراگڑھ) قلعہ کا گورنر و محافظ بھیرو داس جساوت کا لڑکا بہادر شنکر بھاٹی تھا۔ یہ قلعہ پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر بنا ہوا چیل کے گھونسلہ جیسا دکھائی دیتا تھا۔ اوما دیوی نے مالدیو کے محلوں سے دور اجمیر کو اپنی رہائش گاہ کے لیے پسند کیا تھا۔ اور وہ اپنی قسم کے مطابق ایک برہمچارنی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ یہ قسم اس نے اپنے حجلہ عروسی میں ہی پہلی رات کو لے لی تھی۔ عیاش مالدیو کو اس کی مرضی کے خلاف کام کرنا تو درکنار اس کے سامنے جانے کا بھی حوصلہ نہیں تھا۔ جودھ پور کا صدر بھاٹ ایشور داس ہی ایک ایسا شخص تھا جس کی بات کا اس فولادی مزاج کی عورت پر کوئی اثر ہو سکتا تھا۔ وہ

Marfat.com

چارن ایشور داس کو اپنے ساتھ اجمیر لے آئی تھی۔ مالدیو نے ایشور داس چارن کو جودھ پور سے ایک پیغام بھیجا کہ اجمیر کے قلعہ میں جتنی رسد جمع کی جا سکے اتنی کر لی جائے۔ اور رانی کو جودھ پور آنے کے لیے سمجھایا جائے۔ لیکن مغرور رانی اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔ اس نے یہ کہا کہ اجمیر کو اس لیے چھوڑ دینا کہ یہاں حملہ کا خطرہ ہے۔ راجپوتی شان کو زیب نہیں دیتا۔ اس سے میرے شوہر کے راٹھور خاندان اور میرے والد کے بھاٹی خاندان کی عزت کو بٹہ لگ جائے گا۔ راؤ کو مجھ میں اتنا تو یقین رکھنا ہی چاہیے کہ میں رانا سانگا کی چوہان بیگم کرن وتی کی طرح جوہر کی رسم ادا نہ کروں گی۔ بلکہ میدانِ جنگ میں دشمنوں کی صفوں کے درمیان ایک بہادر کھشترانی کی موت مروں گی جو کہ ہمارا زیور ہے۔ راؤ مالدیو خود اجمیر آیا اور اس نے رانی سے یہ کہلا بھیجا کہ وہ اجمیر کی حفاظت کی ذمہ داری اس کے ہاتھوں میں چھوڑ دے اور خود جودھ پور کی حفاظت کرنے کے لیے وہاں چلی جائے۔ اس بات پر رانی اوماوے رضامند ہو گئی اور اپنے ساتھ چند گھوڑ سوار لے کر جودھ پور چلی گئی جب وہ جودھ پور سے ۱۵ کوس جانب مشرق کوسانہ گاؤں میں پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ راؤ مالدیو کی دوسری بیگمات اس کو طعنہ دے رہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے جودھپور کے قلعہ میں جا کر پناہ لینے سے انکار کر دیا۔ اور اسی گاؤں میں ٹھہر گئی۔[1]

قابلِ معافی حب الوطنی کے جذبے سے مغلوب ہو کر راجپوت سوانح نگاروں نے سنیر شاہ کی مشکلات کا حال بڑھا چڑھا کر لکھ دیا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ مالدیو نے اسے جے تارن میں اپنی زد میں لے لیا تھا۔ ان کا یہ بیان بھی صحیح ہو سکتا ہے کہ افغان کیمپ کے کچھ افراد سے چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوئیں جبکہ سور اعظم کے اوتار (وشنو) کے غضور پجاریوں سے چوٹ کھا کر شیر کے بھیڑیے دم دبا کر بھاگ گئے۔ اراولی پہاڑیوں کے ڈھالوں پر ایسا نظارہ غیر معمولی نہیں کہ شیر جنگلی سور کے وار سے بھاگ کھڑا ہو۔ بدایونی رقمطراز ہے کہ شیر اپنی فوج کو ان تند مزاج سور خصلت ذلیل ہندوؤں سے الجھانے میں پس و پیش کر رہا تھا۔ اس نے

---

[1] بھاٹوں کی اس روایت کے لیے دیکھیے ریو۔ مارواڑ۔ جلد ا صفحہ ۱۲۔ فٹ نوٹ ا۔

Marfat.com

آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ شیر نے افغانوں کو ایسے خطرہ میں پڑنے سے سختی سے آگاہ کر دیا تھا۔ اگر کوئی تلوار لے کر اس سور خصلت گروہ سے بھڑنے کی جرأت کرے گا تو اس کا خون اسی کے سر پر ہوگا۔ (بدایونی۔ جلد ۱۔ صفحات ۳۶۹۔ ۳۷۹)۔ کرنل ٹوڈ نے جو کچھ لکھا ہے اس میں راجپوتانہ کے بھاٹوں جیسا جوشیلا انداز تو ہے لیکن تاریخی حقیقت کم ہے۔ وہ لکھتا ہے شیر کو مالدیو کے خلاف آسانی سے فتح حاصل نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کو اپنی حرکت پر تاسف ہوا۔ وہ ان بہادر راجپوتوں کے سامنے لڑائی میں آنے سے ڈرتا تھا۔ وہ اب ایسی جگہ تھا جہاں سے واپس لوٹنا بھی اس کے امکان سے باہر تھا۔ ایک ماہ تک دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے ڈٹی رہیں۔ شیر کی حالت روز بروز بدتر ہوتی چلی گئی۔ اور اس نازک حالت سے بچنے کا اس کے سامنے کوئی راستہ نہ تھا۔[1]

اس تصویر میں کرنل ٹوڈ نے ضرورت سے زیادہ گہرا رنگ بھر دیا ہے۔ دراصل شیر کے سامنے محض دو مسئلے درپیش تھے۔ پہلا یہ کہ اپنی فوج کی رسد کا کیا انتظام کرے؟ دوسرا یہ کہ کس حکمت عملی سے غنیم کو لڑنے کے لیے میدان میں آنے کی ترغیب دے۔ وہ نارنول سے میدتا تک دشمن کے علاقہ میں ۲۶۰ میل اندر تک گھس آیا تھا۔ اب وہ ایسے علاقہ میں تھا جہاں نہ کھیتی ہی ہوتی تھی اور نہ زندگی کے گذر و بسر کے کوئی دیگر ذرائع تھے۔ اس کو اپنی فوج کے لیے رسد دہلی اور میوات سے منگانی پڑتی تھی۔ اس لڑائی میں مالدیو کو شیر کے مقابلہ اتنی ہی آسانیاں دستیاب تھیں جتنی کہ شیر کو ۱۵۳۹ء۔ ۱۵۴۰ء میں ہمایوں کے خلاف دستیاب تھیں۔[2] راجپوت افغانوں کی چال کو ان کے خلاف ہی استعمال کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ راؤ مالدیو کی ریاست کا کچھ حصہ شیر کے قبضے میں جا چکا تھا۔ لیکن ہنوز اس کا پلہ بھاری تھا۔ کیونکہ لڑنا یا نہ لڑنا اسی کی مرضی پر تھا۔ اور کب اور کہاں لڑا جائے اس کے

---

[1] انلس صفحہ ۸۵۳۔

[2] اگر شیر اس لڑائی کا آغاز اجمیر کے محاصرہ سے کرتا تو لڑائی کا حشر بھی غالباً وہی ہوتا سالم راجپوتانہ دہلی سلطنت کے تسلط سے باہر ہو جاتا۔

Marfat.com

اختیار میں تھا۔

شیر نے اپنی فوج کی جو از سر نو تنظیم کی اس سے بھی صورتحال پر کچھ اثر ضرور پڑا۔ محمود شاہ اور ہمایوں کے خلاف لڑائیوں میں اس کی کامیابی کا راز اس کا رسالہ تھا۔ اس کے رسالہ نے چوٹ کی اور اسی کی وجہ سے سرخرو ہوا۔ چوسہ اور بلگرام کی لڑائیوں میں حالانکہ اس کے پاس توپ خانہ اور ہاتھی بھی تھے لیکن اس نے ان پر کوئی بھروسہ نہ کیا۔ ان دونوں لڑائیوں میں ایک بھی گولہ نہ داغا گیا۔ لیکن مغلوں کی شکست کے بعد اس نے مغل فوج کے ڈھانچہ پر اپنی فوج کی تنظیم کی تھی۔ اس نے اپنے توپ خانہ میں اصلاح کی۔ پیادہ فوج تیار کی۔ ان کو بندوقوں سے مسلح کیا۔ اپنے لشکر میں جنگی ہاتھیوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس کی فوج کا خاص حصہ "رسالہ" ہی تھا۔ اور اس کی اہمیت بھی زیادہ تھی۔ اس نئی تنظیم کی وجہ سے شیر کی فوج میں مغل فوج کے جملہ اوصاف و عیب نمودار ہوگئے اس قسم کی فوج غنیم کے حملہ سے حفاظت کے موقع پر تو اپنی غیر معمولی جراًت و دلیری کا اظہار کر سکتی ہے لیکن وہ ضبط و نظم کے ساتھ دشمن پر حملہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ کوئی بھی تجربہ کار دور اندیش سپہ سالار طریقہ جنگ میں ذرا سی تبدیلی کر کے اپنے رسالہ کی مدد سے دشمن کے ہاتھی اور پیادہ فوج کو بیکار کر سکتا ہے شیر ان کی امداد سے راٹھوروں کے ناقابل تسخیر رسالہ کو پست کرنا چاہتا تھا اگر جنگ میں مالدیو وہی غلطی کرتا جو رانا سانگا نے کنواہہ کی جنگ کے وقت کی تھی تو بلاشبہ اس کا انجام بھی رانا کی طرح ہی دردناک ہوتا۔

جس شاندار رسالہ کی مدد سے شیر نے سورج گڑھ چوسہ اور بلگرام کی فتوحات حاصل کی تھیں وہ رسالہ راجپوتوں کے مقابلہ میں بے کار تھا کیونکہ راجپوت رسالہ کی طاقت بھی ان سے کچھ کم نہ تھی۔ بنگالی گھوڑا اور سپاہی در اصل افغان گھوڑے اور سپاہی کے مقابلہ میں کم ظرف تھا۔ مغلوں کا تپچاق گھوڑا یقیناً افغان گھوڑے سے بہتر تھا۔ لیکن جب افغان اور مغل آمنے سامنے کی لڑائی میں تلوار اور بھالوں سے لڑتے تھے تو تجیم شخیم قد آور افغانوں کے مقابلہ چست و چالاک مغل تیر انداز کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن راجپوت

Marfat.com

گھوڑا اور سردار افغانوں کے مقابلہ چیتی، طاقت و ثابت قدمی میں ذرا بھی کم نہ تھا۔

سامیل اور جے تارن کی لڑائی (جنوری ۱۵۴۴ء)

مارواڑ کے پرگنہ جے تارن میں واقع سامیل کی لڑائی کے متعلق تاریخ میں بہت سے فسانے جوڑے گئے ہیں۔ افغان سوانح میں اس لڑائی کی صحیح تفصیل ناپید ہے۔ یہ لڑائی اجمیر کے نزدیک کسی مقام پر بتائی گئی ہے۔ البتہ مارواڑ کی کھیاتوں اور بھاٹوں کے گیتوں سے اس لڑائی کے چند اہم واقعات دستیاب ہوتے ہیں۔ خصوصاً یہ کہ لڑائی کس مقام پر لڑی گئی تھی۔ راجپوت فوج کی کیا حالت تھی اور لڑائی کی صحیح تاریخ کیا ہے۔ نینسی نے اپنی کھیات اس واقعہ کے ۱۲۰ سال بعد لکھی تھی۔ اس کی بدولت اس لڑائی کے بہت سے واقعات روشنی میں آئے۔ وہ لکھتا ہے یہ لڑائی سامیل کے مقام پر ہوئی۔ پوس مہینہ کی ایک کھرے والی صبح کو (انگریزی تاریخ کے مطابق ۵ اردسمبر ۱۵۴۳ء سے ۱۵ ارجنوری ۱۵۴۴ء) جیتا اور کوپا نے شیر کے لشکر پر حملہ کیا۔ حالانکہ بھاٹوں کے گیتوں اور قصوں میں قومی آن کی رنگ آمیزی ہے لیکن افغان مورخین عباس۔ نعمت اللہ۔ نظام الدین اور بدایونی سب نے اس بات کی تائید کی ہے۔

تمام مورخ اس بات سے متفق الرائے ہیں کہ شیر نے اپنی شرمناک ذلیل حرکت سے مالدیو کے دل میں کوپا اور جیتا کی وفاداری کے متعلق شبہ پیدا کر دیا۔ وہ اپنے سایہ سے ڈرنے لگا۔ اور پیچھے ہٹ گیا۔ راجپوت کھیاتوں میں اس چالاکی کا موجد بیدتا کے بیرم دیو کو بتایا ہے۔ عباس اور دیگر مورخین نے بیرم دیو کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ بلکہ اس کی ایجاد کا سہرا شیر کے ہی سر باندھا ہے۔ دونوں جانب سے دستیاب شہادت کا گہرا مطالعہ کرنے سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس تذلیل و توقیر میں شیر کا کیا حصہ ہے اور بیرم دیو کا کیا حصہ ہے۔

راجپوت ذرائع

(۱) نینسی لکھتا ہے "راؤ اسی ہزار سوار لے کر لڑنے کے لیے اجمیر آیا۔ وہاں

Marfat.com

بیرم کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے کوپا کے پاس ۲۰ ہزار روپے بھیجے کہ وہ اس کے لیے کمبل خرید دے۔ ۲۰ ہزار روپیہ جیتا کے پاس بھیجا کہ وہ اس کے لیے سروہی سے تلوار مہیا کرے۔ دوسری طرف وفاداری کا نقاب اوڑھ کر اس نے مالدیو کو ایک خط بھیجا کہ جیتا اور کوپا درپردہ شیر سے ساز باز کیے ہیں اور وہ راؤ کو گرفتار کر کے شیر کے سامنے بھیج دیں گے۔ اگر ثبوت کی ضرورت ہو تو راؤ مالدیو ان کے خیموں کی تلاشی لے لیں۔ جہاں روپیوں کی تھیلیاں موجود ہیں۔ اسی اثنا میں جلال جالو کا (جلال بن جالو) نے کہا "حضرت سلامت۔ بہتر ہو اگر فتح و شکست اس طرح طے کر لی جائے کہ مالدیو کی جانب سے کوئی ایک بہادر لڑائی کے لیے بلا لیا جائے اور آپ کی جانب سے مجھے لڑائی کے لیے بھیج دیا جائے۔" بادشاہ نے بیرم سے یہ سوال کیا "کیا تمھیں یہ تجویز پسند ہے۔" بیرم نے جواب دیا "حضرت۔ میں پہلے اس پٹھان کو دیکھ لوں۔" جب پٹھان کو بلایا گیا بیرم نے اسے دیکھا اور کہا۔ "اگر اس جیسے تین پٹھان بھی ایک جگہ مل جائیں تو مالدیو بیدا ابھرمالوٹ کو بھیج دے گا۔ اور وہ ان تینوں کو قتل کر کے ان کے ہتھیار چھین کر اپنے خیمہ میں واپس لوٹ جائے گا۔ اس کے بدن پر ایک خراش بھی نہیں آئے گی۔ یہ تجویز مناسب نہیں ہے۔" بیرم کے خط نے مالدیو کے دماغ میں شبہ پیدا کر دیا۔ اور جب ان کے خیموں سے تھیلیاں برآمد ہوئیں تو مالدیو خوف زدہ ہو گیا۔ رات کا وقت تھا۔ جیتا۔ کوپا۔ اکھیراج۔ کوپا کے ڈیرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ راؤ مالدیو آئے اور انھوں نے یہ خبر سب کو سنا دی۔ تینوں سرداروں نے کہا "ہم آپ کے ساتھ جودھ پور چلیں گے۔" راؤ سکھ پال میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ ان کا ایک ہاتھ کھیما اداوت کے ہاتھ پر تھا۔ جیتی نے پیچھے سے للکارا "سامیل اور جودھ پور کے درمیان بہت سے خطرے ہیں۔" یہ سنکر کھیما نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اور پیچھے رہ گیا۔[1]

---

[1] نینسی کھیات ۲ - ۱۵۷ و ۱۵۸ - یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ مالدیو کے جودھ پور روانہ ہوتے وقت کچھ سرداروں کو شک پیدا ہو گیا تھا کہ مالدیو کے دماغ میں غداری کی بو ہے۔

Marfat.com

(۲)، شیر سامیل میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ مالدیو گری کے مقام پر تھا۔ اس وقت یہ چال کھیلی گئی۔ بیرم نے شیر کے نقلی فرمان ڈھالوں کی گدیوں میں چھپا دیے اور اپنے مخبروں کے ذریعہ یہ ڈھال مالدیو کے سرداروں کو فروخت کر دیں۔ اسی اثنا میں بیرم نے مالدیو کے نام ایک پیغام بھیجا "حالانکہ آپ نے میرے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا ہے۔ لیکن میں آپ کو یہ اطلاع دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کے تمام سردار شیر شاہ سے سازش کیے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو میری بات میں کوئی شبہ ہو تو تم ان کی نئی ڈھال اپنے قبضہ میں لے کر خود دیکھ لو۔" یہ خبر پاکر راؤ مالدیو نے تمام سرداروں کی ڈھالوں کو کھلوایا اور ان کی تہ سے فرمان برآمد ہوئے۔[1]

حالانکہ یہ ڈھال کی کہانی زیادہ ممکن و معقول معلوم ہے لیکن یہ دونوں افسانے دادی اماں کی کہانیوں کے مانند ہیں۔ جو محض طفلان شیر خوار یا پیرانِ سن رسیدہ کا دل بہلا سکتی ہیں۔ راجپوت دماغ اس قسم کی مکر و فریب کی باتیں ایجاد کرنے کے نا اہل ہیں۔ خصوصاً بیرم دیو کا بوسیدہ دماغ اس قسم کی ایجاد نہیں کر سکتا۔ البتہ مسلمان حکمراں خلیفہ کے زمانے سے ہی اس قسم کی باتوں کے موجد و ماہر رہ چکے ہیں۔ ساتویں صدی میں ابو سفیان آٹھویں صدی میں ابو مسلم خراسانی۔ سترھویں صدی میں اورنگ زیب اس کی مثال ہیں۔ لیکن ایک بات یہاں قابلِ غور ہے کہ اس کہانی سے جلال خاں بن جالو کا نام کیسے منسوب ہوا۔ اور یہ نام راجپوتوں کے دماغ میں نینسی کے وقت تک کیسے ترو تازہ رہا۔ یہیں خفی خاں سے پتہ چلتا ہے کہ جس نے نینسی سے پچاس سال بعد لکھا تھا کہ جب جیتا اور کوپا نے شیر کی فوج کو بھگا دیا تو جلال خاں جلوانی نے دفعتاً راجپوت فوج پر حملہ کر دیا۔ سامیل کی لڑائی میں شیر نے کوئی ایسی ترکیب نکالی ہو تو یہ غیر ممکن نہیں۔ دراصل تاریخ کے بہت سے حقائق ذہن سے محو ہو گئے ہوں گے یا ان میں ردو بدل ہو گیا ہوگا۔ قبل اس کے کہ مسلمانوں

---

[1] ریو مارواڑ ا۔ ۱۳۹۔

Marfat.com

نے اس زمانہ کی تاریخ لکھنی شروع کی۔ یا راجپوت کہانیوں یا افسانوں کا آغاز ہوا۔ یہ کہانی کہ دو آدمیوں کی کشتی سے ہی تمام لڑائی کی فتح وشکست کا فیصلہ کرلیا جائے۔ سچ ہو سکتی ہے۔ اگر اس بات کو صحیح تصور کرلیا جائے تو یہ تجویز. اور خیال پہلے مالدیو کے دماغ میں آیا ہوگا نا کہ شیر کے. کیونکہ یہ تجویز راجپوتوں کے کردار وخصلت کے مطابق ہی ہے۔ بیدا بھر مالوٹ تاریخ کی ایک مایہ ناز ہستی تھی۔ وہ مالدیو کی طرح سوری خاندان کے بعد تک زندہ رہا۔ اس کی طاقت و شجاعت کے متعلق بیرم دیو کے بیان میں کوئی مبالغہ نہ تھا۔ لیکن مالدیو یہ بھول گیا کہ جس دشمن سے اس کا پالا پڑا ہے وہ راجپوت نہیں افغان ہے۔ جو جائز یا نا جائز جیسے بھی ہو اپنی مطلب براری کے لیے ہر قسم کا ہتھکنڈہ استعمال کرسکتا ہے۔ وہ پرتھوی راج یا شیر دل رچرڈ نہیں جو تلوار کے بل پر شہرت کا بھوکا ہو

مسلم سوانح نگار

مسلم مورخین اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ شیر نے ہی یہ ترکیب نکالی تھی حالانکہ اس کی تفصیل کے متعلق آپس میں اختلاف ہے۔ نا تو انھوں نے اس قصے میں کہیں روپے کے خریطوں کا ذکر کیا ہے اور نہ گدی دار ڈھالوں کا بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ:

اس قسم کے جعلی خطوط لکھے گئے تھے۔ جن کو بعد میں برآمد کیا گیا۔ مخزن کی کہانیوں میں بڑی الجھن ہے۔[1]

---

[1] ڈارن نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے "شیر نے ایک جعلی خط لکھوایا اور ایسا ظاہر کیا کہ یہ خط راجپوت فوج کے سرداروں کی جانب سے خصوصاً مالدیو کے مشیر خاص جیتا اور کوپا کی جانب سے شیر شاہ کے لیے لکھا گیا ہے۔ اور کوپا کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ خط کا خلاصہ یہ تھا" بادشاہ مطمئن رہیں کسی قسم کی پریشانی نا محسوس کریں فوراً جنگ شروع کردیں۔ میدان جنگ میں ہم علی الاعلان اپنی وفاداری کا اظہار کریں گے۔ اور مالدیو کو گرفتار کرکے بادشاہ کے حوالے کردیں گے۔"

Marfat.com

خفی خاں نے یہ اور جوڑ دیا ہے کہ شیر نے اس علاقہ کے کچھ زمینداروں کو جن کو کہ مالدیو نے معزول کر دیا تھا اور جو اس سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ اپنے ساتھ کر لیا۔ اور ان کی مدد سے پوشیدہ طور پر بزبان ہندی کچھ خطوط لکھوائے اور ان کو پکڑوا بھی دیا۔ بات تو مختصر ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتی اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ بیرم اور دیگر سردار اس فعل کے مرتکب تھے۔ مگر ایسی گہری چال کی کامیابی کا انحصار رازداری پر تھا اور یہ اغلب نہیں کہ شیر نے اس کو غدار راٹھوروں پر آشکارہ کیا ہو۔ اس نے ان سے مالدیو کے افسروں اور اس کے علاقوں کے متعلق اطلاعات تو حاصل کیں مگر اس کے علاوہ کچھ اور مدد نہ مانگی شیر بذات خود ہندی داں تھا اور اس زبان میں جعلی فرمان لکھنے کے لیے اس کو کسی اور کی امداد کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ یہ قیاس صحیح ہے کہ جو جال اس نے پھیلایا اسی کا ایجاد کردہ تھا اور وہ ہو بہو اس کے مشابہ تھا جس کے ذریعہ سے اورنگ زیب نے اپنے کو ایک نہایت ہی نازک صورت حال سے ۱۳۵ سال بعد بچایا۔ جب کہ شہزدہ اکبر اور راٹھور درگا داس اس کو دفعتاً زیر کرنا چاہتے تھے۔

شیر نے مالدیو کو پسپا کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں تلوار کا سہارا نہ لے کر مکروفریب سے کام لیا۔ اس سے راجپوتوں کو لاف زنی کا اور موقع مل گیا اور وہ کہنے لگے کہ شیر ان کے جال میں آ چکا تھا۔ شیر نے یہ ترکیب اس لیے استعمال نہیں کی تھی کہ، مالدیو سے خائف تھا یا جنگ میں اس کی شکست کے زیادہ امکان تھے۔ بلکہ یہ تو ایک قسم کی قماربازی تھی۔ اگر شیر ناکامیاب ہو جاتا تو اس کی حالت پر اس کا کوئی خراب اثر نہیں پڑتا۔ اگر کامیاب ہو جاتا تو بغیر خون بہائے بے وقوف راٹھوروں پر غالب آجاتا۔ اس فریب پر عمل کر کے شیر نے اپنے اخلاق و کردار

(ہسٹری آف افغان جلد ۱۔ صفحہ ۱۳۸) اس عبارت سے مطلب تو صاف نہیں ہوتا لیکن منشا مزور صاف ہے کہ جعل سازی کا یہ کام شیر شاہ نے کیا اور وہ ہی اس مکروہ و معیوب چال کا موجد تھا۔

Marfat.com

کو معیار اخلاقی سے نیچے نہیں گرایا کیونکہ چانکیہ سے لے کر موجودہ زمانہ تک
مکر و فریب سیاست جنگ کا خاص حربہ تسلیم کیا گیا ہے اور عام دستور رہا
ہے۔ صرف فرق اتنا ہی رہا ہے کہ جب کہ مشرقی ممالک نے اعلانیہ طور سے اس
بدخو مقولہ کا یعنی جنگ و عشق میں ہر فعل مباح ہے۔ اعتراف کیا ہے مغربی ممالک
نے متبرک الفاظ میں ایسی نافض بے ایمانی کی مذمت کی ہے مگر حقیقت تو یہ ہے
کہ جولیس سیزر سے آج تک مغرب کے لوگوں نے بھی اسی مقولہ پر عمل کیا ہے۔
لیکن مارواڑ کے ان مایہ ناز و ممتاز جانباز یعنی سن رسیدہ جیتاؤ کوپا
کے روشن نام پر سیاہی لگانا شیر کی ایک ظالمانہ حرکت تھی۔ اس سے بھی زیادہ
قابل نفرت و افسوسناک تھی مالدیو کی اخلاقی بزدلی اور عقل سلیم کی کوتاہی
یہ وفادار سردار وہ تھے جنھوں نے خود اس کی اور اس کے والد راؤ گاگا کی
قسمت بلند کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا تھا۔ اور تا زندگی خود مالدیو کی
مدد کی تھی پھر بھی اس نے ان ہی پر شبہ کیا۔ راؤ جیتا ان مالوٹ راٹھوڑ
کے سردار خاندان سے تھا۔ جب راؤ شجانے اپنے تخت کے وارث بیرم دیو کو
نامزد کیا تھا تو انھیں راٹھور راجپوتوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا
تھا۔ اور اس کی جگہ گدی پر راؤ مالدیو کے والد راؤ گاگا کو بٹھایا تھا۔ یہ اکیلا
ہی راجپوت سردار تھا جس نے کبھی اپنی فوج کو مفتوح علاقہ کو لوٹنے یا وہاں کی
رعایا پر ظلم کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ایک دفعہ ناگور علاقہ کے کئی گاؤں
کے مکھیا نے بطور شکرانہ اس کو ۲۰ ہزار روپے کی تھیلی پیش کی تھی۔ اس
نے انھیں لوگوں کو یہ روپیہ باؤلی بنانے کے لیے واپس دے دیا۔ راج لانی
گاؤں کے نزدیک یہ باؤلی آج بھی موجود ہے۔ اور اس پر انتسابی کتبہ کندہ
ہے۔[1] کوپا مہراجوت قبیلہ سے تھا۔ اور راؤ گاگا بیرم کی خانہ جنگی کے دوران
بیرم کا مددگار تھا۔ راؤ جتیا نے راؤ گاگا کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کوپا کو ایک

---

[1] ریو مارواڑ صفحہ ۱۱۷۔ فٹ نوٹ۔ راؤ جتیا پنچاین بن اکھیراج بن
رنمل کا لڑکا تھا۔

Marfat.com

لاکھ ٹنکا کی جائداد دے کر اپنی طرف بلالے۔ تب سے راؤ گانگا اور مالدیو کی حمایت میں بھیشم اور درونہ چاریہ کی مانند جیتا اور کوپا نے سیکڑوں بار میدانِ جنگ میں تلوار چلائی تھی اور فتح حاصل کی تھی۔ انھوں نے لڑتے وقت یہ کبھی نہیں سوچا کہ حق و انصاف مالدیو کی جانب ہے یا اس کے برعکس۔ وہ اپنے آقا کے لیے پوری وفاداری و جانبازی سے لڑے تھے لیکن شرارت تو ہو ہی چکی تھی شیر کی اس چال کے بعد مالدیو کو نہ صرف اپنے سرداروں پر ہی اعتماد نہ رہا۔ بلکہ خود پر بھی اعتماد جاتا رہا۔ شیر کی چال مکمل کامیاب ہوگئی مالدیو نے افغانوں کے خلاف جم کر لڑائی لڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اس جگہ ٹھہرنا بھی پسند نہ کیا۔ اور اس نے جودھ پور کی حفاظت کے لیے پیچھے لوٹنا مناسب سمجھا۔ جیتا اور کوپا نے اس کی اس تجویز کی پرزور مخالفت کی۔ زندگی میں پہلی بار انھوں نے اپنے آقا کی حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اپنے مفتوح علاقہ بیکانیر، ناگور، میڑتا، دیدوانہ، سانبھر، شیخاواٹی کو تو اپنی مرضی سے کسی کو بھی سونپ دے۔ انھیں کوئی عذر، گلہ و شکایت نہ ہوگی لیکن جس علاقہ کو اس نے ان کے مشترکہ بزرگوں کا خون بہا کر حاصل کیا ہے مثلاً پالی، بگھیر، سوجت، جے تارن اس علاقہ کو دشمن کے سپرد کرنے کا اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

حالانکہ مالدیو نامناسب شبہات سے متاثر تھا مگر اس میں حقیقت نہیں کہ وہ اپنے سرداروں کو عین موقع پر چھوڑ کر رات کے وقت فرار ہو گیا۔ اصل تو یہ ہے کہ وہ اپنی تدبیر جنگ میں تغیر و تبدل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب اس معاملہ پر سرداروں کی بیٹھک ہوئی تو اس میں اختلاف رائے ظاہر ہوا۔ اس کی صاف وجہ یہ تھی کہ اس وقت ہر فرد شک و شبہ سے متاثر تھا اولوالعزم سردار دشمن کو پشت دکھانا نہیں چاہتے تھے خواہ اس میں فوجی مصلحت کیوں نہ ہو غالباً مالدیو کی یہ تجویز تھی کہ جودھ پور اور سوانی کی سمت میں ہٹ کر مقابلہ کرنا بہتر ہوگا۔ کیونکہ یہاں سے ۱۲ سال تک متواتر راؤ جودھا دشمن سے لوہا لیتا رہا تھا۔ سیوانا جودھ پور سے جنوب مشرق ۶۵ میل ہے اور دساگا

Marfat.com

۲۵ ہزار فٹ بلند پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مالدیو کی تجویز دانشمندانہ تھی۔ خاص کر اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ عادل کی فوج اجمیر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جس سے کہ راجپوتوں کے بازو وعقب کو خطرہ کا اندیشہ تھا۔ اگر راٹھور فوج سامل اسیوان کی پہاڑیوں میں مورچہ بند رہتی تو شیر اپنے تازہ تجربے سے مستفید ہو کر راجپوتوں کا اور تعاقب کرنا نامناسب اور پرخطر خیال کرتا اور اس طرح مارواڑ کا نصف حصہ راٹھوروں کے تسلط میں باقی رہ جاتا۔ مگر راجپوت سردار تو مالدیو کے دماغ میں ان کی وفاداری کے متعلق بے جا شک وشبہ سے برافروختہ ہو گئے تھے پھر جب انھوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تو اس کا شبہ اور بھی بڑھ گیا چنانچہ اپنی فوج کا بیشتر حصہ اپنے ساتھ لے کر بوقت شب مالدیو جودھ پور کی طرف چل دیا۔ بقیہ ۱۲ سے ۲۰ ہزار سورماؤں نے جیتا، کویا اور اکھیراج سونگرا کا ساتھ دیا۔ کیونکہ وہ اس داغ کو مٹانا چاہتے تھے جو کہ دشمن نے اپنی چال بازی سے ان کی عزت پر لگایا تھا۔

دوسرے روز سمبت بکرمی ۱۶۰۰ء (جنوری ۱۵۴۴ء) ماہ پوس کی شکل ایکادشی تھی[1]۔ راجپوت اپنی زندگی کے آخری سفر کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ انھوں نے پہلے روز اپنے مخبر افغان لشکر میں اطلاع فراہم کرنے کے لیے لگا رکھے تھے حالانکہ ان کا راجہ ان کا ساتھ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ لیکن ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے تھے۔ آخر ان کی رگوں میں اس نسل کا خون موجزن تھا جو ہمیشہ

---

[1] ہم دیوان بہادر ہربلاس شاردا کی دی ہوئی تاریخ صحیح تسلیم کرتے ہیں یہ تاریخ درست معلوم ہوتی ہے۔ (دیکھیے اجمیر صفحہ ۱۵۲)

(دیکھیے اجمیر صفحہ ۱۵۲) ریو نے اس تاریخ کو نظرانداز کر دیا ہے اور اس کے لیے کوئی وجہ نہیں بتلائی ہے "انھوں نے لکھا ہے" پوس کی اندھیری رات تھی۔ شکلا اکادشی کو بھی طلوع آفتاب سے پیشتر دو گھنٹے اندھیری رہتی ہے اس لیے یہ تاریخ مخزن کے بیانات سے میل کھاتی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ رات اندھیری تھی جاڑا اور کہرا تھا۔

فتح و موت کی جانب سے بے خبر محض لڑائی کے لیے لڑائی لڑتے تھے۔ آدھی رات گذرنے سے پہلے وہ اپنے پڑاؤ گری سے صف آرا ہو کر نکل پڑے۔ ناہموار پتھریلی زمین، پچھلے پہر کی تاریک رات اور اس پر کہرے کا غلبہ۔ سب لوگ افغان پڑاؤ کا راستہ بھول کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ اسی اثنا میں راجپوت لشکر کی نقل و حرکت سے مطلع ہو کر شیر نے اپنے مشیروں کی ایک خفیہ مجلس اسی شب کو منعقد کی تھی اور انھیں آگاہ کر دیا کہ دشمن کے مخبران کی فوج کے موجودہ نظام کو دیکھ کر واپس گئے ہیں۔ لہٰذا موقع و محل کو دیکھتے ہوئے ہمیں اپنے خیمے فوراً یہاں سے ہٹا لینے چاہیئں۔ غنیم ہمارے خیمے اور پڑاؤ کو خالی پا کر عالم حیرت میں پڑ کر اپنا ارادہ بدل دے گا۔ چنانچہ راتوں رات تمام فوج ۷ میل دائیں سمت ہٹ گئی۔ اور اس کے برعکس حملہ آور فوج جاڑے کی تاریک رات میں راستہ بھول کر پہاڑیوں اور چٹانوں میں بھٹک گئی۔

شیر کو اس تدبیر سے دوہرا فائدہ ہوا۔ ایک طرف تو دشمن حیرت زدہ اور سراسیمہ ہو گیا اور دوسری طرف افغان چوکنے ہو گئے اور تمام رات مسلح رہے۔ جب علی الصباح راجپوت دکھائی دیے تو افغانوں نے اچانک حملہ کر دیا مگر اس سے راجپوتوں پر کیا اثر ہوتا وہ تو سر سے ہی کفن باندھ کر چلے تھے حالانکہ راجپوت رات کے سفر سے ماندہ اور اچانک حملہ سے پریشان خاطر تھے لیکن افیون اور جنگ کے نشے نے انھیں موت کی طرح سنگدل بنا دیا تھا۔ ان کے زوردار حملہ نے افغان رسالے کو جو شیر کی فوج کا پشت پناہ تھا تتر بتر کر دیا۔ شیر کی نظر میں گولا انداز کی جان توپوں کی بہ نسبت زیادہ بیش قیمت تھی۔ اس کا توپخانہ ارابہ یعنی الٹی ہوئی بیل گاڑیوں کے پس پشت تھا۔ اس کا رسالہ دائیں بائیں بازوؤں پر تھا۔ اس کا جلو ہاتھیوں کی قطاروں سے مستحکم تھا ہاتھیوں پر بندوقچی سوار تھے۔ وہ ریت کے بوروں کی دیوار کے پیچھے پوشیدہ تھے۔ اس قسم کی پشت پناہ شیر شاہ عموماً اپنے پڑاؤ کے چاروں طرف بنا لیتا تھا۔ جہاد کا نعرہ لگانے والا بدایونی لکھتا ہے: "اپنی بیوقوفی سے یا اسلام کے اقبال سے کافر با جماعت گھوڑوں سے نکل پڑے۔ اور دامن سے دامن وابستہ کر کے غنیم پر

Marfat.com

برچھے اور تلواریں برسانے لگے۔ لہذا شیر نے فیل سواروں کو یہ حکم دیا کہ آگے بڑھ کر ان کو کچل ڈالیں۔ ہاتھیوں کے عقب میں جو توپ خانہ اور تیر انداز تھے انھوں نے گولوں اور تیروں کی خوب بوچھار کی۔[1]

راجپوتوں کے لڑنے کا یہ عجیب و غریب طریقہ نہ توان کا احمق پن تھا نہ اسلام کا بلند اقبال۔ نہ یہ اسپارٹا کے مسلح سپاہیوں کی طرح دباؤ کا طرز عمل تھا۔ یہ توان کے باجماعت شہید ہونے کا قدیمی طریقہ تھا۔ جس سے وہ بہشت میں سب ایک ساتھ مل سکیں۔ جب ریت کے بوروں کے پیچھے سے آنے والی بندوق کی گولیوں نے ان کے گھوڑے بیکار کر دیے تو وہ ہاتھ میں تلوار لے کر گھوڑوں سے کود پڑے اور ہاتھیوں پر ٹوٹ پڑے وہ ہاتھیوں کو اونٹوں کی طرح مارتے کاٹتے چلے گئے۔ جان دینے سے پہلے انھوں نے ہر چار سُو موت کا نظارہ پیش کر دیا۔ ان کے شیطانی غیظ کے سامنے افغان فوج خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ کہتے ہیں اس وقت ایک افغان سپاہی نے شیر شاہ کو بھدی گالیاں دینا شروع کر دیا۔ اسے بزدل کہا اور اس پر یہ تہمت لگائی کہ وہ اپنے خیمے میں آرام سے پڑا ہے جبکہ کافر اس کی فوج کو گاجر اور مولی کی طرح کاٹ رہے ہیں۔ اور اس کے فاتح کیمپ تک بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ شیر نے یہ سب سُنا اور بڑے اطمینان سے قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف رہا۔ (ڈارن ۱۔ ۱۳۹)

ڈارن کے اس بیان میں کچھ مبالغہ ہو سکتا ہے لیکن اس میں کچھ حقیقت بھی ہے کہ شیر شاہ اس لڑائی کے دوران محض تماش بین ہی رہا۔ وہ اپنے خیمے میں بیٹھا صبر و اطمینان سے قرآن شریف پڑھتا رہا۔ اور اللہ تعالیٰ سے فتح کی دعا مانگتا رہا۔ لیکن اس کا فعل بزدلانہ نہیں تھا بلکہ از خود معنی خیز تھا۔ نازک گھڑی میں عقل سلیم سے کام لینے کا یہ ایک طریقہ تھا اور صحیح وقت پر صحیح فیصلہ لینے میں سازگار تھا۔ یہ ایک ایسے سپہ سالار کی شایان شان تھا جسے اپنی فتح کا مکمل

---

[1] بدایونی قلمی نسخہ ۳۹۷ رینکنگ ۱۔ ۴۷۹۔ مخزن بھی بدایونی کی تصدیق کرتا ہے۔ ڈارن ۱۔ ۱۳۹۔

Marfat.com

یقین ہو۔ اورنگ زیب جنگ کے دوران اپنے ہاتھ میں سبیح رکھتا تھا۔ احمد شاہ ابدالی قلیاں کشی کرتا تھا۔ یہ کامیابی کا تتمہ تھا۔ یقیناً ان سب میں قرآن شریف پڑھنے کا طریقہ سب سے اچھا تھا۔ پانی پت کی تیسری لڑائی اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ میدانِ جنگ میں فتح اس کی ہوتی ہے جو دوپہر تک حقہ پیتا رہے۔ نا کہ بھاؤ کی جو تمام دن دشمن کے خلاف سر مارتا رہا اور جس نے دونوں ہاتھوں سے بیک وقت تلوار چلا کر شجاعت و مردانگی کی مثال قائم کی۔

شیر کی تدبیر کلیتاً کامیاب ہوئی۔ جب راجپوتوں کے حملہ کی گرمی و تیزی کچھ کم ہوگئی تو خواص خاں اور جلال خاں بن جالو نے دونوں بازوؤں سے دبانا شروع کیا۔ ۱۲ ہزار گھوڑ سواروں میں سے جو لشکر سے باہر نکلے تھے۔ صرف ۶ ہزار ہی اپنے سپہ سالار آقا کے پاس رہ پائے۔ ان میں سے ایک بھی فرد زندہ نہ بچا۔ لیکن مرنے سے پہلے انھوں نے کم از کم کتنے ہی افغانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

میدان جنگ لاتعداد راجپوت راٹھور سرداروں کی لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ ایک ایک سردار شجاعت و جاں نثاری کا نمونہ تھا۔ انھیں کشتوں کے درمیاں جاں باز جیتا، کوپا۔ اکھیراج سونگارہ[1] اور دیگر سردار موت کے آغوش میں میٹھی نیند سو رہے تھے۔ مارواڑ کے بھاٹوں نے لکھا ہے کہ گری کے تاڑ کے درخت جو مالدیو کی فراری سے شرم و غیرت سے سرنگوں تھے اب فخر و شان سے آسمان چھو رہے تھے۔ گویا وہ بہشت میں جیتا و کوپا کی قدمبوسی کے لیے بے تاب ہیں۔ انھوں نے اپنی موت سے شیر کو ایک سبق سکھا دیا۔ رائے سین کے قتل عام کے بعد شیر کو ملاؤں کی بات ماننے پر افسوس ہوا تھا۔ اب سامیل کی لڑائی نے اسے بتا دیا کہ راجپوت کی عزت و خودداری سے مذاق کرنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ اب شیر نے یہ احساس کیا کہ یہ بہادر جواں مرد زیادہ بہتر سلوک کے مستحق تھے۔ اگر شیر

---

[1] سونگارہ جالور کا چوہان سردار تھا۔ مالدیو نے پالی اس کو جاگیر میں دی تھی۔ نینسی ۱۵۵۔ جیتا اور کوپا کی جاگیر باگری میں تھی۔ جو سوجت پرگنہ کی ریاست ہے۔

Marfat.com

ان کے ساتھ عقل و دانش سے کام لینا تو یہ جاں باز شہید شیر کے خلاف نہ لڑ کر شیر کی حمایت میں لڑ سکتے تھے۔ فاتح شیر کو اپنی ظفر و کامرانی لاحاصل معلوم ہونے لگی اور اس نے اپنے مغلوب دشمن کی شجاعت کے لیے ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔ "میں نے مٹھی بھر باجرہ کے لیے ہندوستان کی سلطنت داؤ پر لگا دی تھی۔" اگر شیر کو مارواڑ کے طبعی نقشے کا اچھا علم ہوتا تو شاید اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ مارواڑ کی دولت یا تو سپاہی کی تلوار ہے یا وہاں کی زمین کے خود رو بھورا تاں ہیں۔[1]

یہاں کچھ جوشیلے نوجوانوں نے یہ سوال اٹھایا ہے۔

اگر مالدیو اس قسم کے ۵۰ ہزار راجپوتوں کے ساتھ شیر کے خلاف لڑتا تو کیا نتیجہ ہوتا؟[2]

لیکن اس میں کسی قسم کے شبہ و قیاس آرائی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ مہارانا سانگا کی شکست خود اس سوال کا جواب ہے۔ مہارانا کی کمان میں کنواہہ کے میدان میں اس سے بھی زیادہ جری اور دلیر راجپوت جاں بازوں کی فوج تھی۔ اور مغل فوج شیر شاہ کی سامیل کی فوج سے بدرجہا کم تھی پھر بھی جنگ کا انجام رانا کے لیے مہلک ہوا۔ جس شیر نے اس مغل طاقت کو ہندوستان سے باہر نکال دیا اسے مالدیو کی ۵۰ ہزار فوج کو شکست دینے میں ذرا سی اور زیادہ مشقت کرنی پڑتی۔ اس کا نقصان بھی زیادہ ہوتا۔ مگر مالدیو کے پچاس ہزار سپاہی موت کے

---

[1] مذاق کے طور پر بھورات کو مارواڑ کی دولت کہا جاتا ہے یہ ایک قسم کی جنگلی گھاس ہے جو برسات کے موسم میں دو فٹ تک بڑھ جاتی ہے۔ اس کے پھل گچھے دار ہوتے ہیں اور اس پر کانٹے ہوتے ہیں وہ غریب و مسکین جن کو باجرا بھی نصیب نہیں ہوتا اپنی بھوک مٹانے کے لیے بھورات کے سوکھے پھلوں کو پیس کر آٹا بنا لیتے ہیں۔

[2] ایک قابل تنقید نگار اور میرے دوست پروفیسر سری رام نے لکھا ہے کہ اگر مالدیو کے ساتھ چالاکی و عیاری سے کام نہ لیا جاتا تو شاید گری کے میدان میں شیر اپنی سلطنت ہی کھو دیتا۔ جرنل آف انڈین ہسٹری۔ اپریل ۱۹۲۶ء

Marfat.com

منہ میں چلے جاتے۔ یہ خیال کرنا کہ اس حالت میں جنگ کا نتیجہ کچھ دوسرا ہوتا، خیالی پلاؤ پکانا ہے۔ تاریخ کی رفتار کو بدلنا سہل نہیں ہے۔ تاریخ ہمیشہ سائنس کے پیچھے چلتی ہے خواہ اس کا نتیجہ اچھا ہو یا بُرا۔ سولہویں صدی میں ہرکولیز، بھیمسن بھیم اور رستم کی اہمیت بندوق کی ایک گولی سے زیادہ نہ تھی۔ آگے آنے والی صدیوں میں سامیل کی جنگ میں شہید ہوئے جاں بازوں کی اولادیں دھرمت کی لڑائی میں اورنگ زیب کے توپ خانہ کے خلاف اس سے بھی زیادہ شجاعت و مردانگی کا مظاہرہ کیا بعد ازیں میدتا کی جنگ میں انھوں نے مہادہ جی سندھیا کے توپچیوں کا صفایا کردیا۔ اور ڈی باٹنی کی تربیت یافتہ فوج کو کاٹ ڈالا۔ لیکن آخری نتیجہ کیا ہوا۔ اس تلخ حقیقت کو ہمیں ذہن نشین کرنا ہوگا کہ خواہ جنگ کا وقت ہو یا امن کا زمانہ۔ قدیم متروک اور فرسودہ طریقہ نئے طریقے پر غالب نہیں آسکتا۔ جہاں تک فن حرب کا تعلق ہے بابر اور اس کے قابل شاگرد شیر کی فتوحات اس کی زندہ مثال ہیں۔ مندسور میں ہمایوں کے خلاف بہادر شاہ کی توپیں اور رومی خاں کی ترکیبیں سب بے کار ہو گئیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ نئے طریقے پر پرانا طریقہ غالب آگیا۔ بلکہ یہ اس بات کی تائید ہے کہ سائنس بھی ناتجربہ کار لوگوں کے ہاتھوں میں جا کر کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ نا قابل شاگرد قابل استاد کا ہم پلہ نہیں ہوسکتا۔ ۱۹ ویں صدی میں علی وال اور سوبراؤں کے مقام پر سکھوں کی شکست اسی اصول کا عملی ثبوت ہے۔

جودھپور، اجمیر، الور، جالور اور دیگر قلعوں کا فتح ہونا

سامیل کی جنگ نے ماروار کی قسمت کا فیصلہ کردیا۔ مالدیو کو اپنے گذشتہ جارحانہ کارناموں کا بھرپور انعام ملا۔ جیتا اور کوپا کی موت سے اس کے دونوں مضبوط بازو بیکار ہوگئے۔ اب وہ دیرینہ عظمت و شوکت کی محض ایک دھندلی نشانی ہی رہ گیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ مارواڑ کے راٹھور راجپوت سر کٹنے کے بعد بھی لڑتے ہیں[1] سولہویں صدی میں شیر کے افغانوں نے سترھویں صدی میں

---

[1] مراٹھانی۔ رائے زنی کے لیے دیکھیے بھاؤ صاحب چی بکھار۔

Marfat.com

اورنگ زیب کے مغلوں نے اور اٹھارہویں صدی میں جے آپا سندھیا کے مراٹھوں نے یہ نظارہ اپنی آنکھوں سے خوفزدہ ہو کر دیکھا تھا۔ سامیل کی لڑائی کے بعد شیر کی فوج دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ فوج کا ایک حصہ خواص خاں کی کمان میں مغرب کی جانب مالدیو کے تعاقب میں جودھپور کے لیے روانہ ہوا اور دوسرا دستہ شیر کے ساتھ جانب مشرق اجمیر فتح کرنے کے لیے چل دیا۔

خواص خاں کے جودھپور پہنچنے سے پہلے ہی مالدیو نے جودھپور کے قلعہ سے جتنا بھی ممکن ہو سکا سب سامان سیوان کے قلعہ میں منتقل کر دیا۔ اس میں راجپوت گھرانوں کی مستورات اور بچے بھی شامل تھے۔ سیوان کا قلعہ جودھپور سے جنوب مغرب میں ۶۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ قلعہ پہاڑ کی ایک اونچی چوٹی پر واقع ہے۔ اس پہاڑ کو گھنگروٹ کی پہاڑی کہتے ہیں[1] اس پر رسائی مشکل ہے۔ خواص خاں نے جودھپور کا محاصرہ شروع کر دیا۔ یہ قلعہ حالاں کہ بہت مستحکم اور پائیدار تھا مگر توپ خانہ کی گولہ باری کی تاب نہ لا سکا۔ راجپوت فوج آخری وقت تک قلعہ میں قید رہنے کی بہ نسبت لڑ کر مرنا زیادہ پسند کرتی تھی۔ حسب معمول راجپوتوں نے قلعہ سے نکل کر حملہ کر دیا۔ اور ان کا ایک آدمی بھی زندہ نہ رہا۔ جودھپور قلعہ کی حفاظت کرنے والوں میں اچلا بن شوراج، تلوکسی، برجنگ اور بمیل بھاٹی کے نام مشہور و معروف ہیں۔ ان جانباز شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے مالدیو نے قلعہ کے اندر بعد میں ان کی چھتریاں بنوا دیں[2]

---

[1] یہ پہاڑیاں جودھپور راج کے لیے وقت مصیبت میں پناہ گاہ ہیں جس طرح بوندی راج کے لیے کوٹہ اور سسودیہ لوگوں کے لیے پرگنہ چھپن ہے۔ (نینسی)

[2] یہ باتیں ریو کی تاریخ مارواڑ (جلد ۱ صفحہ ۱۳۰-۱۳۱) سے اقتباس کی گئی ہیں۔ ہمیں اس سے اختلاف ہے ریو نے جودھپور قلعہ کی حفاظت کرنے والوں میں بھاٹی شنکر سوراوت کا نام لکھا ہے۔ اس کی چھتری اچلا اور دیگر سرداروں کے ساتھ بنی ہوئی ہے لیکن اس بات سے نینسی کا بیان غلط ثابت نہیں ہوتا کہ شنکر

Marfat.com

جودھ پور کی فتح کے بعد خواص خاں نے اپنی توجہ گوساز گاؤں کی طرف کی:

بھاٹی ابہیر کی حفاظت کرتا ہوا شہید ہوا۔ ریو نے اچلا تلوکسی کو جو بالترتیب شنکر بھاٹی کے چچا اور بھتیجے تھے راٹھور ثابت کرنے کے لیے کوئی سند پیش نہیں کی ہے جبکہ نینسی نے شجرہ نسلی پیش کر کے انھیں صاف طور پر بھاٹی ثابت کر دیا ہے۔ حالانکہ مارواڑ کی تاریخ لکھنے والوں میں ریو بہترین مصنف خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کی تاریخ میں بہت سی خامیاں ہیں۔ یہ چھتریاں ان بہادر لوگوں کی یاد میں بنائی گئی تھیں جو شیر شاہ کے خلاف لڑائی میں کام آئے تھے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ جودھ پور کی ہی لڑائی میں شہید ہوئے ہوں۔ ہم اس باب میں نینسی کی کھیات اور اس کے مشہور ایڈیٹر رام نرائن دگڑ سے ملی کچھ معلومات ذیل میں درج رہے ہیں،

ا۔ نیما بھاٹی (جو جیسا بھاٹی کے خاندان سے تھا۔ جلد ۲۔ صفحہ ۳۸۸) مالدیو اور شیر شاہ کی لڑائی میں شریک ہوا تھا۔ میدان جنگ میں زخمی ہوا۔ اس کا خدمتگار اسے میدان سے اٹھا کر لے گیا۔ بعد میں وہ مر گیا۔ شاید یہ سامیل کی لڑائی کا حوالہ ہے (جلد ۲ صفحہ ۳۹۱)

۲۔ تلوکسی (انند سنگھوٹ) مالدیو کا خدمت گار تھا۔ میڑتہ کی لڑائی میں دیوی داس جیتا واٹ کے ساتھ شہید ہوا (جلد ۲ صفحہ ۳۹۷) کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ شیر شاہ اور مالدیو کی فوج کے درمیان میڑتہ کے مقام پر لڑائی ہوئی تھی۔ اسی خاندان کا بیٹا بھاٹی دیوی داس جیتا واٹ کی کمان میں لڑتا ہوا میڑتہ کی لڑائی میں ہلاک ہوا۔ (جلد ۲ صفحہ ۳۹۸)

۳۔ بھوج راج جودھاوات بھاٹی (بھوجا) جودھ پور کے قلعہ کے پھاٹک پر لڑتا ہوا مارا گیا۔ بکرمی سمبت ۱۶۰۰ میں شیر شاہ وہاں آیا۔

۴۔ شنکر سوراوت بھاٹی بہادر راجپوت جسے مالدیو نے اجمیر کا قلعہ دار مقرر کیا تھا۔ سور بادشاہ کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ جودھ پور قلعہ میں ایک چھتری شنکر سوراوت کے لیے دوسری بھاٹی تلوکسی کے لیے ہے۔ (برجنگ کا لڑکا) تیسری اچلا کے لیے ہے (شودان بھاٹی کا لڑکا) (جلد ۲ صفحہ ۴۱۲) یہ مالدیو کی کم ظرفی

Marfat.com

یہ موضع جودھ پور سے جانب مشرق ۱۵ کوس ہے۔ یہاں راجپوت بہت بڑی تعداد میں لڑنے کو اکٹھے ہوئے تھے۔ رانی اومادے جب اجمیر سے جودھ پور کے لیے روانہ ہوئی تھی تب سے اسی گاؤں میں اس کا قیام تھا۔ نہ تو مالدیو کی منت و سماجت نہ افغانوں کی آگے بڑھتی ہوئی فوج کا ڈر رانی کو یہاں سے جودھ پور کے قلعے یا کسی دوسری جگہ جانے کے لیے مجبور کر سکا۔ کہا جاتا ہے کہ مالدیو کی دوسری بیویوں نے حسد کی وجہ سے اسے جودھ پور میں نہ آنے دینے کے لیے ایک چال کھیلی تھی۔ انھوں نے آسا بھاٹ کو اس کے خیمے میں بھیج کر اس کی تمکنت کو مشتعل کر دیا اور رانی کے سامنے ایک دوہا پڑھا۔ جسے سن کر رانی کے غصے میں ابال آگیا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ وہاں سے ذرا بھی حرکت نہ کرے گی بلکہ جہاں ہے وہیں لڑتے لڑتے جان دے دے گی۔ مارواڑ میں جانثار بہادر راجپوتوں کی کوئی کمی نہ تھی جو اس کی حفاظت اور عزت بچانے کے لیے سر کٹانے کو تیار رہتے۔ اوماوے کا پڑاؤ بے کس راجپوتوں کی پناہ گاہ بن گیا تھا۔ جودھپور اور کوسانہ کے درمیان جہاں آج قصبہ خواص پور ہے۔ خواص خاں نے قیام کیا۔ یہاں اسے معلوم ہوا کہ اگر افغانوں نے کوسانہ پر حملہ کیا تو رانی مع اپنے نیم مسلح راجپوتوں کے لڑتے ہوئے مرنے کا ارادہ کر رہی ہے۔ خواص خاں نے ایک بہادر سردار کی مانند رانی کے مقابلہ میں اپنی ہار تسلیم کرلی۔ اور کوسانہ چھوڑ کر وہ ایسے دشمنوں کی تلاش میں چل دیا جن سے لڑنا اس کی شان و مرتب کے لیے موزوں ہو۔ بعد میں جب رانی اوماوے نے اپنے والد کے گھر جیسلمیر

تھی کہ اس نے سامیل کی لڑائی میں شہید ہوئے دیگر سرداروں کی یادگار نہیں بنوائی حالانکہ وہ ان کی موت پر رویا تھا۔ (ریو۔ مارواڑ)

سلہ جودھ پور کی سرکاری تاریخ میں خواص خاں کے ساتھ انصاف سے کام نہیں کیا۔ کہا گیا ہے کہ خواص خاں میں اوماوے کے خلاف لڑنے کی ہمت نہ تھی۔ (ریو۔ مارواڑ جلد اصفحہ ۱۲۰ حنط نوٹ) یہ بات سچ ہے کہ شیر اور اس کے افغانوں میں عورت کے

Marfat.com

جانے کی خواہش ظاہر کی تو خواص خاں نے اس کو مع اس کے متعلقین کے صحیح و سلامت جانے دیا[1]

خواص خاں نے پہلے پھلودی اور پوکھرن ہیں مالدیو کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ مالدیو کا سپہ سالار دھنا بھاٹی پھلودی کی حفاظت کرتا ہوا مارا گیا۔ رودسی ہوٹ بھاٹی بینی داس، رام داس، دلپت اور گوگل پوکھرن کی لڑائی میں کام آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھلودی اور پوکھرن جو راٹھوڑ اور بھاٹیوں کے درمیان بنائے مخاصمت تھے۔ شیر کے حکم سے جیسلمیر کے راول لون کرن کو واپس دے دیے گئے۔ جودھپور سے تقریباً ۶۵ میل بجانب مغرب خواص خاں نے ایک مضبوط فوجی چوکی قائم کی۔ جس کا نام شیر گڑھ رکھا۔ یہ جگہ اب جودھپور کا خوش حال پرگنہ ہے۔ اب خواص خاں نے اپنی توجہ جودھپور اور سیوان کے درمیان متنازعہ علاقہ کی جانب مبذول کی۔ یہاں راؤ مالدیو چھپا ہوا تھا۔ افغان فوج نے منڈور کے اجڑے ہوئے قدیم صدر مقام میں اپنا خیمہ لگایا۔ اس میں صرف ایک ترمیم ہوئی۔ خواص خاں نے جودھپور قلعہ کے شمال کی سمت میں ایک بنا پھاٹک بنوایا۔ راجپوت روایت کے مطابق بوڑھے بیرم دیو نے اپنی قسم پوری کرلی۔ اس نے میدتا کے ببولوں کا انتقام جودھپور کے آم کے پیڑوں سے لیا[2] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جودھپور کی کمان

خلاف لڑنے کی ہمت نہ تھی وہ محض مردانہ مردوں کے خلاف ہی لڑ سکتے تھے۔ دشمن جس قدر قوی اور مضبوط ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ دو سو سال بعد ظالم پٹھان امیر خاں نے بھی جے پور شہر کو اسی طرح چھوڑ دیا تھا۔ جب غیر حاضر مہاراجہ کی بہن نے اس کے پاس یہ خبر بھیجی تھی کہ قلعہ کی حفاظت کے لیے کوئی مرد نہیں ہے۔ صرف میں ہی ہوں۔

(امیر نامہ)

[1] ریو نے جودھپور کی روایت کو بیچ مان کر لکھا ہے کہ راؤ میواڑ میں کیلاوا چلی گئی۔ یعنی جیسلمیر کی روایت کے مطابق وہ پہلے جیسلمیر گئی اور بعد میں کیلاوا۔

[2] کہا جاتا ہے کہ جب بیرم دیو پیڑ کاٹنے چلا تو رعایا نے شرم شرم کے نعرے لگائے۔ اس نے اپنی قسم پوری کرنے کے لیے ایک پیڑ کی محض ایک شاخ ہی کاٹی (دینسی جلد ۲

خواص خاں اور بیرم دیو دونوں کو اس لیے مشترکہ دی گئی تھی کہ مبادا مسلم تسلط کے خلاف بدامنی پھیل جائے۔ بہرحال بیدتا بیرم دیو کو واپس مل گیا۔ اس کے علاوہ اجمیر کے قرب و جوار میں اس کو کچھ نئے علاقے بھی دیے گئے۔ بیرم دیو کافی دنوں تک وہیں رہا۔ اور بعد میں شیر کے وارثوں کے زمانہ میں افغانوں کی حمایت میں وہ مالدیو کے خلاف لڑا۔

افغان سامبل کی لڑائی کے بعد شیر کے مزید کارناموں کا تبصرہ کرتے ہیں شیر نے اپنی نصف فوج کے ساتھ مالدیو کے پرگنہ سوجت اور پالی پر قبضہ کر کے اجمیر کا محاصرہ کیا۔ اجمیر کا قلعہ کافی مستحکم اور پائیدار تھا۔ اس کی حفاظت کے لیے وہاں کافی فوج و رسد تھی۔ قلعہ کا کمانڈر شنکر بھاٹی جری سورما سردار تھا۔ معلوم ہوتا ہے یہ محاصرہ کافی دنوں تک چلا۔ اس سے مالدیو کو تقویت ملی۔ اور وہ سیوان کی پناہ گاہ سے باہر نکل کر شیر کی توجہ دوسری جانب مبذول کرنے کے لیے اس کی فوج کے عقب میں آ گیا۔ شیر نے اجمیر کا محاصرہ اپنے لڑکے شہزادہ عادل خاں اور برہم جیت گوڈ کے راجپوتوں کے سپرد کر دیا۔ اور خود مالدیو کے تعاقب میں چل پڑا۔ اجمیر کے آس پاس کا علاقہ پہلے کسی زمانہ میں گوڈ لوگوں کا تھا۔ بارہویں صدی میں سانبھر کے چوہانوں نے ان کو یہاں سے نکال دیا تھا۔[1] شیر نے

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ صفحہ ۶۵۹) نینسی کے اس بیان میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ سور بادشاہ نے جودھ پور میں ۴ ماہ تک قیام کیا۔ عباس کے بیان کے مطابق شیر جودھ پور قطعاً نہیں گیا۔ یہاں یہ بات درست ہے اور میں اپنا پہلا بیان واپس لیتا ہوں میں نے لکھا تھا شیر نے بڑی چالاکی سے مالدیو کو جودھ پور سے باہر نکال دیا۔ عباس کی تنقید کے لیے مجھے بہت افسوس ہے (شیر شاہ صفحہ ۳۰۰ فٹ نوٹ) عباس (قلمی نسخہ صفحہ ۲۳۴۔ ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۴۰۶) مخزن (ڈارن جلد ۲ صفحہ ۱۴۱) کی رائے درست ہے۔ کہ جودھ پور کا فاتح خواص خاں تھا۔

[1] بپا راول کے عہد میں جب چتوڑ میں موری لوگوں کا راج تھا تو گوڈ اجمیر کے مالک تھے (مترجم کا نوٹ نینسی جلد ۲ صفحہ ۱۸۴) میواڑ میں گودوار غالباً اسی فرقہ سے منسوب

Marfat.com

برہم جیت گوڈ پر یہ آخری مہربانی کی کہ اس کو اجمیر کا فوج دار مقرر کیا۔ تجربہ نے شیر کو یہ سبق سکھا دیا تھا کہ راجپوت کو راجپوت کے خلاف استعمال کرنا زیادہ مصلحت آمیز اور کفایت شعار طریقہ ہے۔ افغانوں کو وقت ضرورت کے لیے بطور امدادی فوج بچائے رکھنا چاہیئے۔

اب شیر کے سامنے ایک اور سخت مہم تھی۔ سروہی کے دیورا چوہان مالدیو کے ماما ہوتے تھے۔ اب وہ راٹھوروں کی مدد کے لیے آگئے۔ شیر نے سروہی کو پسپا کیا اور مالدیو کو آبو کی پہاڑیوں میں گھیر لیا۔[1] نینسی کے زمانہ میں اس پہاڑی پر ۱۲ گاؤں آباد تھے[2] اس سے اس پہاڑی کے رقبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر اچل گڑھ واقع تھا۔ یہاں تک غنیم کی رسائی محال تھی۔ راٹھور اور دیورا چوہان پہاڑیوں میں چھپ کر لڑ رہے تھے اس لیے شیر کا توپخانہ پہاڑ پر نہیں جا سکتا تھا۔ اس حالت میں دونوں فریق صلح کے لیے راضی ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ مالدیو نے اپنے خاندانی پنڈت اور مشہور سردار برجنگ بھائی[3] کو شیر کی خدمت میں بطور سفیر بھیجا۔ شیر نے پنڈت کو تو واپس کر دیا لیکن

ہے۔ چوہان اور تنوار کی مانند یہ لوگ بھی جانب مشرق پھیل گئے۔ برہم جیت گوڈ کے متعلق مزید معلومات کے لیے دیکھیئے باب ۷ کا ضمیمہ۔

[1] مالدیو اسی عرصہ میں بچ کر بھاگ نکلا۔ اور آبو کے قلعہ میں چھپ گیا (ڈارن ا۔ ۱۴۰) سلسلہ واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ خواص خاں کا جودھ پور پر قبضہ ہو جانے کے بعد مالدیو نے آبو میں جا کر پناہ لی تھی۔ راجپوت مورخ اس باب میں بالکل خاموش ہیں۔ شیر کے نام کے آبو میں جو سکے ملے ہیں ان سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

[2] آبو پہاڑ کے ۱۲ گاؤں کے نام ہیں۔ اچل گڑھ، تنیسا، دلوارہ، ہیت ماٹھی سہراسال، اوریا، واس دیو، نہارلو، باس تھان، امرانی، رشتی کیش (نینسی ا ۔ ۱۱۸)

[3] برجنگ بھائی بھیرو داس وت نینسی لکھتا ہے کہ مالدیو نے اپنے سردار کو راج پنڈت کے ساتھ سفیر بنا کر بھیجا لیکن کب اور کس مقام پر؟ اس کے متعلق نینسی خاموش ہے

Marfat.com

برجنگ بھاٹ کو وہیں قید کر لیا۔ کسی سفیر کے ساتھ اس قسم کا سلوک اہل ہنود میں بہت معیوب اور قابلِ مذمت سمجھا جاتا ہے۔ آج کی مہذب سوسائٹی میں بھی یہ حرکت ناقابل معافی ہے۔ لیکن دونوں سفیروں میں سے برجنگ کی اہمیت کم تھی۔ پروہت کو جانے کی اجازت دینا اور کم اہمیت کے سردار کو اپنے یہاں روک لینا۔ اس امر کی دلیل ہے کہ شیر نے صلح کے لیے کچھ شرائط پیش کی ہوں گی اور اس بات کا یقین کرنے کے لیے کہ ہر دو فریق شرائط پر کاربند رہیں گے اس نے بھاٹ سردار کو بطور ضمانت اپنے دربار میں رکھ لیا ہوگا۔ شیر کے اس رویہ سے مالدیو کے دل میں کچھ شکوک پیدا ہو گئے۔ اور صلح کی بات چیت بیچ میں ہی ختم ہو گئی۔

مالدیو شیر کی نظروں سے بچ کر مغرب کی جانب سانچور[1] بھاگ گیا۔ یہ جودھ پور سے جنوب مغرب میں ۱۳۲ میل اور سیوان سے ۷۰ میل ہے۔ شیر نے شمال مغرب کی جانب اپنا رخ کیا۔ تاکہ مالدیو کے قلعہ جالور پر حملہ کرے۔ جالور جودھ پور سے ۷۵ میل جنوب میں ہے۔ خواص خاں کی فوج کو جو سیوان میں مقیم تھی سانچور کی جانب مالدیو کے تعاقب میں جانے کا کام سونپا گیا۔ خواص خاں نے سانچور پر قبضہ کر لیا لیکن مالدیو گرفتار نہ ہو سکا۔ شیر شاہ کی وفات کے بعد بھی وہ سیوان سے حملے کرتا رہا۔ اگر ابتدا سے ہی مالدیو نے پیشوا باجی راو اول

برجنگ کو شیر نے قید کر لیا۔ شیر کی وفات کے بعد وہ پھر بھاگ کر مالدیو کے پاس چلا آیا۔ برجنگ کو ویرائی اور رمادیو جاگیریں ملے۔ ویرائی میں آج تک برجنگ سار (تالاب) اور اس کا کھدوایا ہوا ایک کنواں ہے۔ اس نے مادیو میں جوگی کا ایک آشرم بنوایا اسی برجنگ بھاٹ کا لڑکا گاگا سامیل کی لڑائی میں مارا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مارواڑ کی مہم میں شیر نے والد کو قید کر لیا یا لڑکے کو اس کے متعلق کچھ مغالطہ ہے۔ (نینسی ۲- ۴۲۱) کیا مالدیو نے بجرنگ کو اس لیے بھیجا تھا کہ وہ موقع ملنے پر شیر کو قتل کر دے۔

[1] سانچور لونی ندی کے محانہ پر مارواڑ جھین مل میں واقع ہے۔ شمال میں (۲۴°۵۰ شمال) اور مشرق میں (۷۱° ۵۵)

Marfat.com

اور جسونت راؤ ہولکر جیسے رسالہ سرداروں کی طرح غنیم کے توپ خانہ اور تنظیم یافتہ فوج کے خلاف اس طرز جنگ کو اپنایا ہوتا تو وہ شاید شیر کے خلاف زیادہ کامیاب ہوتا۔ اور اس کو سمجھونہ کرنے پر مجبور کر دیتا۔ اور اپنی ریاست کو بھی بچا لیتا۔

جالور پر شیر کا قبضہ ہوگیا۔ ایک عرصہ سے یہ مقام باغی اور سرکش پٹھانوں کا صدر مقام بنا ہوا تھا۔ تاکہ راٹھور لوگ سروہی اور اجمیر کے اضلاع میں نہ گھس آئیں۔ جالور کی کڑی ناکہ بندی کی گئی۔ اس عرصہ میں اجمیر کا گھیراؤ بھی بہت تیزی سے چلتا رہا۔ شنکر بھاؤ کی کمان میں گڑھ بیٹلی کی فوج نے قلعہ سے باہر نکل کر آخری حملہ کر دیا۔ اور دشمنوں کی بہت سی جانیں ضائع کر کے جام شہادت نوش کر لیا۔ اس طرح مارواڑ کی مہم ختم ہوگئی۔ شیر نے اجمیر شریف کی درگاہ کی زیارت کی اور وہاں کے مقدس فقیر خواجہ معین الدین چشتی کے حضور میں خدا کا شکر ادا کیا۔ خواجہ معین الدین کو دنیادار لوگ اپنی نجات کی کشتی تصور کرتے ہیں۔ شیر نے درگاہ کے مسکینوں کو اعلیٰ پیمانہ پر خیرات تقسیم کی۔ اور حج کے تمام رسوم ادا کیے[1] اس وقت شیر کو شاید یہ اندازہ نہیں تھا کہ اب اس

---

[1] تاریخ داؤدی قلمی نسخہ ۲۳۸۔ اجمیر کی درگاہ شریف کی زیارت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس وقت یہ عقیدہ پھیل چکا تھا کہ مکہ شریف کے بڑے حج کے عوض میں اجمیر شریف میں چھوٹا حج کیا جا سکتا ہے۔ آج بھی مسلمانوں میں یہ عقیدہ مروج ہے۔ اب سے ۳۰ سال پہلے میرے کچھ مسلم طالب علم ڈھاکہ سے میرے ساتھ تاریخی سیاحت کے لیے اجمیر آئے تھے۔ تب انھوں نے یہاں چھوٹے حج کے رسوم ادا کیے تھے۔ میں حالانکہ کافر تھا لیکن امام نے ایک روپیہ ۱۲ آنے لے کر مجھے بھی یہ حج کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن میں نے ۱۲/۸ آنے دے کر ہی نجات حاصل کر لی۔ زیارت گاہ کے محافظ کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ میرے ہی مسلم طالب علم اسی سیاحت کے دوران جب بنارس آئے تھے تو انھوں نے بنگالی ہندوؤں کا بھیس بدلا اور وشوناتھ کے پروہت

Marfat.com

دار فانی سے اس کے آخری سفر کی کشتی تیار ہے۔

مارواڑ کی اس مہم میں مئی ۱۵۴۴ء کے آغاز تک شیر شاہ کو ۶ مہینے لگے اس کو اس نو مفتوح علاقہ میں فوجی اور انتظامیہ مسائل طے کرنے کے لیے اجمیر میں کافی دن ٹھہرنا پڑا۔ اس نے برہم جیت گوڈ کو اجمیر کا فوج دار مقرر کر دیا۔

خواص خاں کو مارواڑ کی مختلف چوکیوں پر تعینات فوج کا اعلیٰ سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ لیکن اس کا یہ عہدہ مارواڑ کے وائسرائے کی مانند نہ تھا وہ صرف جودھ پور کا فوج دار تھا۔ جودھ پور کو سرکار بنا دیا گیا جس کا رقبہ تقریباً وہی تھا جو آئین اکبری میں درج ہے۔ اسی طرح ناگور کو بھی ایک سرکار بنایا گیا اور وہاں کا فوج دار عیسیٰ خاں نیازی کو مقرر کیا گیا۔ لیکن ناگور سرکار کا رقبہ آئین اکبری میں درج رقبہ سے بہت کم تھا۔ اکبر کے زمانہ میں اس سرکار میں میدتا بھی شامل تھا۔ نارنول لودی سلطنت کے آخری عہد تک حصار فیروزہ کا ایک پرگنہ تھا اب اسے بھی سرکار بنا دیا گیا[1] اور اس کا یہ رقبہ بھی وہی تھا جو آئین میں درج ہے۔ اجمیر سے ۳۰ میل جنوب مشرق میں ہرمرا مقام پر ایک فوجی تھانہ بنایا گیا (نینسی جلد ۲ صفحہ ۱۵۹) تاکہ اجمیر میرواڑ کے شورش پسند علاقہ میں امن قائم رہے۔ میرواڑ اب اجمیر ضلع کا ایک پرگنہ ہے۔ اس تھانہ کا افسر غالباً جلال خاں بن جالو کو بنایا گیا بعد کی مسلم سرکار اجمیر جس میں کہ سالم جے پور ریاست بالاستثنا نارنول اور علاقہ جودھ پور کا کچھ حصہ ابھی مفتوح نہ ہو پایا تھا اور رفالوناً سلطنت میں شامل نہ تھا لہذا

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نے ان سے ایک ایک روپیہ لے کر ان کو درشن کرائے۔

[1] بابر کی فہرست میں نارنول کا نام سرکاروں میں نہیں ہے۔ (میمائرس ۵۲۱) لیکن اسے صوبہ آگرہ کی سرکار بنایا گیا ہے۔ (آئین جلد ۲ - ۵۰۴) ابوالفضل نے لکھا ہے کہ نارنول میں ایک پتھر کا قلعہ تھا۔ لودی زمانہ میں وہاں کوئی قلعہ نہ تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس قلعہ کو شیر شاہ نے بنوایا ہو گا۔ جبکہ اس نے نارنول کو سرکار کا صدر مقام بنایا۔ عباس کہتا ہے کہ شیر کی یہ خواہش تھی کہ وہ ہر ضلع میں ایسا قلعہ بنائے۔

Marfat.com

اب شیر اپنی فوج لے کر اجمیر سے سانبھر کی جانب گیا۔ اور شمال مغرب میں کچاون[1] تک جا پہنچا۔ یہ مقام موجودہ کچاون ہے جو اس وقت پھلیرا جنکشن (جے پور) اور میرٹھ جنکشن (جودھ پور کا میدتا) کے درمیان ایک ریلوے اسٹیشن ہے۔

مخزن کا کچاون اور رتھور نٹن کے گز ٹیئر کا کچان دراصل ایک ہیں۔ یہ جودھ پور ریاست کا ایک قصبہ ہے جو کہ جودھ پور سے ۱۲۸ میل مشرق شمال مشرق اور اجمیر سے ۵۰ میل مشرق میں واقع ہے۔ (صفحہ ۴۸۵) سانبھر اور کچاون کا یہ علاقہ فوجی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے۔ یہ اجمیر امبر اور شیخاواٹی کو مارواڑ سے

---

[1] مخزن لکھتا ہے چتوڑ سے شیر کچاون گیا (جو صحیح نہیں ہے) ڈارن جلد ۱۔ ۱۴۰-۱۴۱ عباس لکھتا ہے کہ جب شیر خواص خاں اور عیسیٰ خاں نیازی کو بالترتیب جودھ پور اور ناگور سونپ دینے کے بعد مارواڑ سے واپس آگیا۔ تو سپاہی چھاونی میں جانے کے لیے چلّانے لگے۔ (ایلیٹ جلد ۴۔ صفحہ ۴۰۶) لیکن شیر شاہ کہاں لوٹا۔ عباس اس ضمن میں خاموش ہے۔ مخزن کہتا ہے کہ شیر مارواڑ سے آگرہ واپس لوٹا اس دوران میں مالدیو بچ کر بھاگ نکلا اور آبو کے قلعہ میں چھپ گیا۔ (ڈارن ترجمہ) شیر دوبارہ آگرہ سے روانہ ہوا۔ اور چتوڑ کو فتح کرنے کے لیے براہ راست کارروائی شروع کردی (ڈارن جلد ۱۔ صفحہ ۱۴۰) یہ بات بعید از عقل ہے اور غلط اور لغو ہے۔ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ شیر مارواڑ سے آگرہ واپس نہیں آیا بلکہ اجمیر آیا۔ عباس اور مخزن دونوں میں سے کسی کی بھی نظر اس غلطی کی طرف نہیں گئی۔ داؤدی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ عباس کے سلسلہ واقعات قلمبند کرنے میں کچاون کی کڑی گم ہوگئی ہے۔ مخزن نے اس کڑی کو جوڑ دیا ہے۔ کہیں واقعات کی ترتیب الٹ دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شیر نے چتوڑ پہلے فتح کیا اور بعد میں کچاون۔ اس متعلق عباس درست ہے کہ شیر چتوڑ کی فتح کے بعد کچاون گیا۔ چتوڑ اجمیر سے جنوب، جنوب مشرق میں ۱۱۰ میل ہے جبکہ کچاون (رتھورنٹن کا کوچان) اجمیر سے جانب مشرق، شمال میں ۵۰ میل ہے اس لیے شیر نے پہلے نزدیک کی جگہ فتح کی ہوگی تب چتوڑ گیا ہوگا اور چتوڑ سے کھمبوارہ گیا ہوگا۔

Marfat.com

جوڑتا ہے۔ مہم کی ابتدا میں شیر شاہ کی فوج نارنول اور آگرہ سے اس علاقہ کو چھوڑ کر ایک طرف چلی گئی تھی۔ اس کے بعد میرٹھ پر قبضہ کرکے اس خطہ کو جودھپور سے علیحدہ کر دیا تھا۔ ابھی امبر کے علاقہ میں جا بجا راٹھوروں کی فوجی چوکیاں موجود تھیں جیسے سانبھر اور کچاون وغیرہ اس لیے اجمیر کے گرد و نواح سے دشمن کا صفایا کرنا لازم ہو گیا۔ ابھی شیر کی فوج کچاون کی مہم میں مصروف ہی تھی کہ ۱۵۴۴ء کی برسات شروع ہو گئی۔ سردار و سپاہی بارش اور کیچڑ سے بے زار و نالاں ہو گئے۔ وہ فوجی چھاونیوں میں واپس لوٹ کر آرام کرنے کے آرزومند تھے۔ شیر نے یہ کہہ کر ان کو تسلی دی کہ وہ خود ایسی جگہ رہنا چاہتا ہے جہاں سے اس کی فوج اپنی کارروائی جاری رکھ سکے۔ (ڈارن ا۔ صفحہ ۱۴۱) یہاں سے شیر نے کس راستہ سفر کیا۔ کس جانب گیا اور اس کا نصب العین کیا تھا۔ اس کے متعلق اختلاف ہے۔ لہٰذا کوئی بات وضاحت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔

یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ سانبھر اور کچاون سے شیر اپنی فوج واپس لے گیا اور تب وہ چتوڑ گیا۔ ابھی کچھواہہ راج میں اس کو چند راٹھوروں کے مضبوط اڈے مثلاً مال پورہ، ملرانا، لال سوٹ وغیرہ اور فتح کرنے باقی تھے۔ اور پھر ان علاقوں کا بندوبست کرنا بھی باقی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھواہہ علاقہ سے بوندی میں ہو کر میواڑ پہنچا ہوگا۔ شیر نے کچھواہہ ریاست کے پرانے راٹھور علاقہ کو سرکار رنتھمبور میں ملا کر شہزادہ عادل خاں کے سپرد کر دیا۔ شیر نے دھندھار[1] علاقہ میں بھی اپنی فوج تعینات کی۔ عباس اور مشتاقی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ بوندی کے ہاڑا لوگوں کے علاقہ سے پہلے بھی ایک بار گزر چکا تھا اور یہاں

---

[1] پروفیسر ہودی والا کا خیال ہے کہ دھندھیرا مالوہ کی راجپوت ریاست دھام دھیرا ہو سکتی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم ان کی بات سے اتفاق نہیں کرتے کیونکہ سیاق عبارت سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ دھندار۔ ونداہار۔ دھندیر دراصل راجپوتوں کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ جس سے کچھواہہ کا علاقہ منسوب ہوا۔ کچھواہہ علاقہ میں آگرہ سے جانے کے لیے دیوسہ کی طرف سے راستہ ہے اور یہی دھندھار ہے اسی لیے شیر کی فوج یہاں تعینات کی گئی تھی۔

Marfat.com

اسے کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ بوندی کے حکمراں راؤ سرطان شیر کا ہم عصر تھا۔ سرطان کے سوتیلے شریف زاد بھائی اس کے حق کو چنوتی دے رہے تھے۔ شیر نے راؤ سرطان کو بوندی کا حکمراں تسلیم کرلیا اور اسے اپنا ماتحت بنا لیا۔ اس کی حیثیت ایک آزاد ریاست کی مانند ہی رہی۔ کچھواہہ لوگوں کے ساتھ بھی شیر نے اس قسم کا سلوک کیا۔ حالانکہ راٹھوروں نے ان کا جو علاقہ پہلے چھین لیا تھا اس کو شیر نے واپس نہیں لوٹایا۔

۱۵۴۴ء کی برسات میں جب شیر نے میواڑ کی مہم شروع کی تو اس کو یہ امید تھی کہ سسودیا راجپوتوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کافی لمبا اور شدید ہوگا۔ لیکن چتوڑ کنواہہ کی جنگ کے بعد پیہم دنداں شکن پولٹیکل سانحات کے جھٹکوں سے سنبھل نہ پایا تھا۔ مالدیو کی جارحانہ کارروائی اس کی بربادی و تحقیر کا آخری منظر تھا۔ مغرور راٹھوروں کی طاقت کی تباہی سے دہلی سلطنت کی بہ نسبت میواڑ کو زیادہ راحت ملی۔ تاہم شیر کی ناقابل تسخیر فوج کے بمقابل اس کے نام کا زیادہ غلبہ تھا۔ ابھی چتوڑ سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر ہی تھا کہ چتوڑ کا قلعدار مہارانا اودے سنگھ (جو ابھی نابالغ تھا)، کی طرف سے شیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہ اپنے ساتھ قلعہ کی کنجیاں بھی لایا۔ مگر شیر محض چتوڑ سے فارغ نہ ہو سکتا تھا۔ یہ تو اس کے لیے نعمت غیر مترقبہ کے مانند تھا۔ حالانکہ فارسی مورخ اور راجپوت کھیات نگار میواڑ میں شیر کی نقل و حرکت کے متعلق خاموش ہیں۔ لیکن پروفیسر ڈی سی سرکار کو جو پہلے سرکار ہند میں ماہر کتبات تھے کمبھل گڑھ میں ایک کتبہ ملا جس میں حکمراں وقت شیر کے وارث اسلام شاہ[1] کا نام لکھا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیر کی فوج کمبھل گڑھ تک بلا کسی مزاحمت کے پہنچ گئی ہوگی۔ یہ حقیقت ہے کہ مہارانا اودے سنگھ نے افغان

---

[1] اسلام شاہ نے راجپوتانہ میں کوئی نئی فتوحات نہیں کیں۔ وہ اپنے گھر کی سازشوں اور بغاوتوں کو دبانے میں مصروف رہا خصوصاً پنجاب میں ہیبت خاں نیازی کی بغاوت دبانے میں مصروف رہا۔ لہذا کمبھل گڑھ اس کے والد نے ہی فتح کیا ہوگا۔ کمبھل گڑھ کا جو نیا کتبہ دستیاب ہوا ہے۔ اس پر فہرست کتب میں بحث کی جائے گی۔

Marfat.com

حکومت کی اطاعت قبول نہیں کی۔ نہ شیر نے اس مسئلہ کو اکبر اور جہاں گیر کی طرح اپنی عزت کا سوال بنایا۔ کہ وہ خود دار سسودیہ راجپوتوں کو دہلی کی اطاعت ماننے کو مجبور کرے۔ مہارانا اودے سنگھ نے بھیلوں کے علاقہ پرگنہ جرّا میں پناہ لی تھی۔ مصیبت پڑنے پر میواڑ کے حکمراں اکثر اسی علاقہ میں پناہ لیتے تھے۔ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ شیر نے میواڑ کے زیادہ تر حصہ پر اپنا قبضہ کر لیا لیکن جب مہارانا اودے سنگھ اپنی آزادی کی حفاظت کی خاطر اراولی کی ناقابل عبور گھاٹیوں میں چلا گیا تو شیر نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ اور اس کو وہاں خود مختار رہنے دیا۔ شیر دراصل مغز کی فکر کرتا تھا چھلکے کی نہیں۔ وہ نام و نمود کی شاہانہ جاہ و حشمت کے لیے اپنے نصب العین کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ نہ کوئی ایسا خطرہ مول لیتا تھا نہ ضدی رویہ اختیار کرتا تھا۔ میواڑ اور مارواڑ میں اس نے اسی اصول کو اپنایا۔ چتوڑ اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ چتوڑ سرکار میں شامل کر دیا گیا۔ اور اس پر حکومت کرنے کے لیے احمد خاں سروانی و حسن خاں خلجی کو مقرر کیا گیا۔ اب چتوڑ ایک شاہی قلعہ ہو گیا اور خواص خاں کے بھائی شمس خاں کی کمان میں وہاں ایک فوج اور بندوقچیوں کی ایک پلٹن رہنے لگی۔[1] اس طرح دس مہینے تک شیر مارواڑ فتح کرنے اور بعد میں راجپوتانہ کے باقی علاقہ کو زیر کرنے میں مصروف رہا۔ اس کے بعد یہ طویل جنگ پوری شان و کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئی۔[2] جنگ و غم کی یہ طویل داستان اکبر اور شیر جیسے بانیانِ

---

[1] عباس لکھتا ہے کہ یہ تینوں افسر چتوڑ کے قلعہ کے لیے مقرر کیے گئے۔ (قلمی نسخہ صفحہ ۲۲۵) مخزن نے صرف شمس خاں کا نام لکھا ہے۔ ان دونوں بیانوں کو متضاد نہ سمجھ کر ایک دوسرے سے ملا کر پڑھنا چاہیے۔ شمس خاں قلعہ کی فوج کا کمانڈر تھا اور شہر کا حاکم جبکہ بقیہ دو افسران پرگنوں کے مالک تھے جو اس سرکار کے ماتحت تھے۔ (ڈارن ۱۔۱۴۰)

[2] اس باب میں قابل غور بات یہ ہے کہ میں نے شیر کی آگرہ واپس آنے کی بات نہیں لکھی اور ۱۵۴۴ء کی گرمی اور برسات کے دنوں میں سلسلہ واقعات کو از سر نو ترتیب دیا ہے۔ اس لیے میری تصنیف "شیر شاہ" کا وہ حصہ راجپوتانہ میں

Marfat.com

سلطنت کو ایک سبق دے گئے۔ سوال یہ ہے کہ شیر کو اس طویل زحمت کے بعد کیا ملا۔ راجپوتانا کی سرزمین سے اتنی مالگذاری نہیں وصول ہو سکتی تھی جو وہاں کے نظام سلطنت کے صرفہ اور فوجی خرچہ کے لیے کافی ہو۔ مارواڑ میں پانی اور پیسہ کی کبھی

اپنی فوج چھوڑ کر دہلی کی سلطنت کو پھر سے زندہ رکھا" مسترد سمجھنا چاہیے۔ وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) میں ایلیٹ کے حاشیہ کا نوٹ پڑھ کر (جلد ۴۔ صفحہ ۴۰۶ نوٹ نمبر ۲۔) غلط راستہ پر ہو گیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں میں نہ تو پروفیسر ہودی والا کے مانند قابل ہی تھا نہ اتنا حوصلہ مند ہی تھا کہ میں ایلیٹ کی بات کو غلط مانتا۔ کیونکہ پراگندہ افغان مورخین نے بھی اس کے بیان کی تائید کر دی تھی لہذا میں نے لکھدیا "شیر آگرہ واپس آیا۔" حالانکہ اس کی راجپوتانہ کی مصروفیات کو دیکھ کر یہ قرین قیاس نہیں۔ ایلیٹ کے حاشیہ کے نوٹ کے متعلق پروفیسر ہودی والا کہتے ہیں "اس کو تسلیم کرنے سے سلسلہ واقعات بجائے واضح ہونے کے اور زیادہ مبہم اور پیچیدہ ہو جائے گا"۔ (شٹڈیز جلد ا صفحہ ۴۶۲)

(۲) مخزن کے کچاون اور کوچہ وارا میں مغالطہ پیدا کرنے کی میری ہی ذمہ داری ہے۔ (ڈارن ا۔ ۱۴۰) میں نے عباس پر زیادہ بھروسہ کیا اس لیے کچاون کا کہیں ذکر نہیں کیا مجھے ڈارن کے ترجمہ سے کچھ تعصب تھا۔ خصوصاً جبکہ اس میں اور دیگر قلمی نسخوں میں اختلاف تھا۔ لہذا میں نے ڈارن کے کچاون اور عباس کے کچھواہہ کو ایک سمجھ لیا۔ میں نے کچاون تلاش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اور اصل تاریخ سے دور چلا گیا۔

(۳) چونکہ چتوڑ کی فتح سے پہلے شیر کا تمام وقت جے پور کے موجودہ کچھواہہ علاقہ میں صرف ہوا۔ میں نے یہ اندازہ لگایا کہ شاید عباس کا اسی علاقہ سے مطلب ہے۔ چنانچہ میں نے اس کو کچھوارا بتلایا جو کچھواہہ لوگوں کا مسکن ہے۔ جیسے جاٹ وارا۔ اہیر وارا۔ کھیچی وارا وغیرہ لیکن یہ بالکل غلط ہے کیونکہ موجودہ جے پور علاقہ کو فارسی زبان میں دھندار کہتے تھے۔ راجپوت مورخوں نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ قدیم کچھواہہ روایتوں کے مطابق کچھواہہ لوگ بہت دنوں تک جیجا کا بھکتی میں رہے تھے۔ بعد میں جب کچھواہہ لوگوں نے اسے فتح

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

افراط نہیں رہی۔ میواڑ۔ اجمیر اور بوندی کے جاگیردار غریب کاشتکاروں سے جتنا روپیہ وصول کرتے تھے وہ ان کے حوالی موالی اور ان کی ناعاقبت اندیش فیاضی کے لیے مشکل سے کافی ہوتا تھا۔ مسلم علاقہ میں صنعت وحرفت ناپید تھی۔ صرف سانبھر میں نمک بنتا تھا۔ تو کیا شیر نے یہ زحمت محض کچھ دانہ نمک یا مشت بھر باجرہ وجھوار کے لیے برداشت کی تھی۔ ؟ نہیں۔ شیر نے راجپوتانہ کی قیمت نہ وہاں کی مال گذاری کے حساب سے لگائی تھی نہ وہاں کی دولت کے حساب سے بلکہ اس نے یہ مہم اپنے اور بعد کو آنے والے دہلی تخت کے پٹھان۔ مغل اور انگریز فرماں رواؤں کی دل جمعی کے لیے کی تھی۔ راجپوتانہ تاریخ کے آغاز سے ہی شورش انگیز رہا ہے۔ وہاں کسی بھی وقت کوئی طوفان اٹھ سکتا تھا۔ دہلی کے سلطان اپنی حکومت کے آغاز سے ہی راجپوت قوم کو کچلنے اور دبانے میں سرگرم رہے تھے۔ شیر کی یہ مہم اسی پالیسی کا آخری دور تھا۔ شیر کی پالیسی سے ہند کی تاریخ میں اب ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس نے راجپوتوں سے مصالحت کرکے ان سے باعزت اعتماد وتعاون حاصل کیا۔ اور اس طرح ہند میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنا ڈالی۔

جنگ سامیل سے راجپوت آزادی اور عظمت کا روشن چراغ گل ہو گیا۔ تاریخ کا ایک معرکۃ الآرا دور ختم ہو گیا۔ یہ دور تھا پرتھوی راج ورنتھمبور کے چوہان کی شجاعت کا۔ میواڑ کے مہارانا سانگا کی جانبازی کا اور مارواڑ کے مالدیو کی دلیری وجانثاری کا۔

اب راجپوتانہ کی تاریخ کا وہ دور شروع ہوا جس میں راجپوتانہ دہلی کی شاہی حکومت کا ذی وقار نائب بن گیا اور یہاں امن وامان قائم ہو گیا۔ یہ دور بیرم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کرلیا تو اس کا نام کچھوارہ ہو گیا۔ (موجودہ کچھوارہ)۔ مجھے ڈارن کے متعلق اپنے تعصب کے لیے افسوس ہے اور میں نے اپنی پہلی تصنیف "شیر شاہ" میں کچھوارہ کا تعین غلط کیا تھا۔ جس کے لیے میں نادم ہوں۔

Marfat.com

اور کلیان مل سے شروع ہو کر مان سنگھ۔ مرزا راجہ جے سنگھ۔ ستر سال ہاڑا۔ مہاراجہ جسونت سنگھ، مہاراجہ سوائی جے سنگھ اور راجپت سنگھ راٹھور تک چلا گیا۔ یہ بات دوسری ہے کہ کبھی کبھی مغل سلطنت کی فضا میں کوئی مہارانا پرتاپ۔ راج سنگھ یا درگا داس جیسا درخشاں ستارہ چمک گیا۔ جس سے مغل فرماں روا ہمیشہ خائف رہے لیکن اب راجپوت احساس خودی کھو چکا تھا۔ زندگی کی کوئی حرکت ان میں باقی نہ تھی کہ وہ پھر سر اٹھا سکیں۔ ۱۸ ویں صدی میں لٹیرے مرہٹہ سرداروں کے ہاتھ سے انھیں اور بھی زیادہ تکلیف اٹھانی پڑی اور خون بہانا پڑا۔ ۱۹ ویں صدی میں برطانیہ کے شہنشاہوں نے انھیں اپنی پالیسی سے ہندوستانی عجائب گھر کا محض زیب و زینت کا کھلونا بنا دیا۔ اور بالآخر ۲۰ ویں صدی میں ہماری آنکھوں کے سامنے جمہوریت کے زلزلہ نے انھیں اپنی گدی سے اتار کر چھوڑ کر دیا۔

Marfat.com

باب 17 کا ضمیمہ

برمازید گور کے متعلق کچھ واقعات

(برہم جیت یا برہما دیتہ گوڈ)

۱۹۲۱ء میں میری تصنیف "شیر شاہ" شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس ضمن میں محض پروفیسر ہودی والا ہی ایسے مورخ ہیں جن کی تنقید سے میری معلومات میں کچھ اضافہ ہوا ہے۔ ایلیٹ نے جن فارسی تاریخوں سے مدد لی پروفیسر موصوف نے ان پر اعلیٰ پایہ کی تنقید کی ہے۔ میں ان اہم معلومات کے لیے ان کا ممنون و مشکور ہوں۔ موجودہ دور کا کوئی عالم فارسی و عربی زبان پر اس قدر دسترس نہیں رکھتا جتنی کہ پروفیسر مذکور کو ہے۔ قرون وسطیٰ کے تاریخی ادب کی مہارت میں وہ بے مثال ہیں۔

پروفیسر موصوف کی رائے ہے کہ اس زمانہ کے ترکوں اور افغانوں میں برمازید ایک عام نام تھا۔ لہذا اس قیاس آرائی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ یہ ہندو نام ہے۔ پروفیسر موصوف نے اپنی بات کی تائید میں مندرجہ ذیل واقعات پیش کیے ہیں:

(۱) ہمایوں نے بنگاش کے علاقہ میں ایک افغان قبیلہ کے خلاف جارحانہ کارروائی کی تھی جس کا نام برمزیدی تھا۔ (اکبر نامہ ۳۲۳۔ ترجمہ ۱۔ ۵۹۸)۔ یہ بات واضح طور پر اس کی دلیل ہے کہ برمازید افغانی نام تھا۔

(۲) نام کے آگے گور یا کور لگانا بھی عام رواج تھا۔

Marfat.com

(۳) تاریخ داؤدی میں شیر کے اس سپہ سالار کا نام برمازید سور لکھا ہوا ہے۔ تاریخ داؤدی کا مصنف خود افغان تھا۔ لہذا وہ یقیناً جانتا ہوگا کہ یہ آدمی افغان ہے ہندو نہیں۔

پروفیسر ہودی والا نے اس نام کو صحیح طریقہ سے "برمازید گور" لکھا ہے۔ اسٹورٹ نے جوہر کی تصنیف کا ترجمہ کرتے وقت اس کو فارید گور بنا دیا۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے جو ہمایوں کے سوانح نگاروں میں سب سے بعد کے ہیں پروفیسر ہودی والا کی تنقید کی طرف مطلق توجہ نہیں کی۔ بلکہ ایک صدی پہلے کے اسٹورٹ کی تقلید کرتے ہوئے اس نام کو "برمازید" کے بجائے فرید خاں گور بنا دیا ہے۔ (ہمایوں۔ صفحہ ۱۳۶)۔

پروفیسر ہودی والا نے اپنی رائے کی تائید میں جو دلیلیں پیش کی ہیں، مندرجہ ذیل واقعات کی کسوٹی پر ٹھیک ثابت نہیں اترتیں جس سے اس سپہ سالار کا سور ہونا تو درکنار مسلم ہونا بھی ثابت نہیں ہوتا۔

الف۔ تاریخ داؤدی نے برمازید گور کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اس کی آزاد رائے نہیں ہے۔ تاریخ داؤدی کے جن نسخوں میں یہ نام آیا ہے وہ قطعی مستند نہیں مانے جا سکتے۔ اس کا اقتباس مخزن سے لیا گیا ہے۔ نہ تو مخزن کے کسی نسخہ میں اور نہ ڈارن کے ترجمہ میں سور لکھا ہوا ہے۔ (دیکھیے ڈارن ا۔ صفحہ ۱۵۸۔ ایل ۲۳۔ صفحہ ۱۴۸۔ آخری سطر) عباس نے بھی متواتر برماجد گور لکھا ہے۔ کسی دیگر مورخ نے بھی سور نہیں لکھا۔ جو کہ صریحاً ایک غلطی ہے یا کاتب کا اپنی طرف سے اضافہ ہے۔ چنانچہ تاریخی اصول شہادت کے یہ بات برعکس ہے کہ اس کو سور مان لیا جائے۔ ایک ہی فرد سور اور برمازید دو قبیلوں کا نہیں ہو سکتا۔

(ب) مخزن اور دیگر تواریخوں میں افغان قبیلوں کے خاندانی شجرے درج ہیں۔ ان میں کسی شجرہ میں برمازیدی قبیلہ کا ذکر نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ شاخ بتوں میں موجود ہو۔ یہ قرین قیاس نہیں ہے کہ عباس اور مخزن اپنے شجروں میں برماجد گوڈ کا ذکر نہ کرتے اگر وہ پٹھان ہوتا۔

Marfat.com

(ج) محض یہ کہنا کہ برمازید ایک افغانی نام ہے اور گور اس نام کے بعد کا لفظ ہے اس شخص کو افغان ثابت نہیں کر سکتا۔ لودی اور سوری خاندان کی قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں کہیں یہ ذکر نہیں ہے کہ بنوں کے برمازیدی افغانوں نے کبھی ہندوستان کی طرف ہجرت کی۔ پھر یہ اکیلا برمازیدی اتنے دور دراز علاقے یعنی خطہ بہار میں کیسے دفعتاً اس قدر اعلیٰ درجہ کا سپہ سالار بن گیا۔ اور شیر کی خدمت میں اس قدر شہرت حاصل کر لی کہ اگر برمازیدی اس کے قبیلہ کا نام ہے اور گور عرف ہے تو اس کا اصلی نام کیا ہے؟

(د) برہم جیت گوڑ کے حالاتِ زندگی یہ بتاتے ہیں کہ شیر اس پر اس درجہ یقین و اعتماد رکھتا تھا کہ جتنا وہ کسی افغان میں نہیں رکھتا تھا۔ اگر شیر کسی شخص کو صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتا تھا تو وہ اس کو برہم جیت گوڑ کے حوالے کر دیتا تھا، اور برہم جیت کو اس کا سر قلم کرنے میں ذرا بھی گریز نہ ہوتا تھا۔ خواہ وہ بدقسمت افغان ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس اگر شیر کسی شخص کے ساتھ رحم و نرمی کا سلوک کرنا چاہتا تھا تو اس کو خواص خاں کے سپرد کر دیتا تھا۔ یہ دونوں اشخاص اس کے خاص الخاص معتمد افسر تھے اور شیر کے کردار کے تاریک و روشن دونوں پہلوؤں کے بالترتیب نمائندہ تھے۔

ہماری رائے کی تائید مزید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ۱۶ ویں صدی میں اجمیر برہم جیت کو دیا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ گوڑ لوگوں کا آبائی وطن ہو گیا۔ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں راجہ بٹھل داس کے خاندان کو امتیاز حاصل ہوا۔

ہمیں مخزن سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اسلام شاہ کے عہد حکومت میں برہم جیت گوڑ نے خواص خاں کا ساتھ چھوڑ کر اجمیر پر اپنا تسلط بنائے رکھا۔ غالباً برہم جیت گوڑ مونگیر ضلع کے راجپوت زمینداروں میں سے ایک تھا[1] جو شیر شاہ سے مانوس ہو کر اس کی خدمت میں چلا آیا۔ قنوج کے حکمراں گوڑ لوگوں سے لڑتے تھے۔

---

[1] نینسی نے گوڑ لکھا ہے۔ شاہ جہاں کے درباری مورخ عبدالحمید لاہوری نے اپنے بادشاہ نامہ میں اسے گور لکھا ہے۔ مثلاً راجہ بٹھل داس گور۔ ارجن داس گور وغیرہ۔

Marfat.com

شیر نے بھرت پور سے جو راجپوت فوج فراہم کی تھی۔ غالباً برہم جیت اس کا سپہ سالار

ٹوڈ جس نے نیلینی کے ۱۵۰ سال بعد لکھا ہے اس قبیلہ کا ذکر کرتا ہے :-
"گوڈ قبیلہ کسی وقت راجستھان میں معزز سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ اس نے کبھی ممتاز درجہ حاصل نہیں کیا۔ بنگال کے قدیم حکمراں اسی قبیلہ کے تھے۔ اور ان کی راجدھانی کا نام لکھنوتی تھا"

(مورخ نے شاید وسط ہند کے "سو پور" راجپوت سرداروں سے جو اس قبیلہ کے آخری سردار تھے یہ بات سنی ہو گی۔ ۱۸۰۹ء میں مہادجی سندھیا نے اس قبیلہ کو دبا دیا۔ یہ جان کر مورخ کو بہت افسوس ہوا۔ لیکن اس بات میں کوئی سچائی نہیں ہے کہ گوڈ لوگوں نے اپنے نام پر بنگال کی دار السلطنت کا نام رکھا۔ یہ گڑ بڑ اس لیے پیدا ہو گئی کہ برہمن پہلے ہی سے دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ پنچ گور، پنچ دراوڑ۔ یعنی گوروں کی پانچ شاخیں اور دراوڑ یعنی جنوبی برہمنوں کی پانچ شاخیں۔ یوپی اور مشرقی پنجاب کے گوڈ برہمن راجپوت اور جاٹوں کی طرح ہی جنگجو ہوتے تھے اور ہیا ۱۸۵۷ء کے غدر میں ان برہمنوں نے قابل تحسین حصہ لیا تھا۔ میں نے یہ بات اپنے دہلی کے ایک گوڈ برہمن طالب علم سے سنی تھی (کالکا رنجن قانون گو)

ٹوڈ اس سے آگے لکھتے ہیں "ہمارے پاس یہ یقین کرنے کی وجہ ہے کہ گوڈ پہلے اس زمین پر قابض تھے جو بعد میں چوہانوں کے قبضہ میں آگئی۔ تمام قدیم تاریخوں میں انھیں اجمیر کے گوڈ لکھا ہوا ہے"۔ (انلس پرانا ایڈیشن جلد ۲-۱۲۰)

جگدیش سرن گیلوٹ کہتے ہیں کہ آج کل گوڈ لوگ دو شاخوں میں منقسم ہیں" دھرنا اور امیٹھا" (راجپوتانہ کی ہندی تاریخ) یہ نام بالترتیب مالوہ کے دھار اور یوپی کے ضلع رائے بریلی میں امیٹھی سے منسوب ہیں۔ چوہانوں سے پہلے یہ لوگ مالوہ سے اجمیر آئے اور ۱۲ ویں صدی سے پہلے ہی انھوں نے مشرق کی جانب یوپی اور بہار میں جا کر نئی آبادیاں بسانی شروع کر دی تھیں۔

بہر حال شیر شاہ کے عروج سے صدیوں پہلے بہار اور یوپی میں گوڈ راجپوتوں

Marfat.com

تھا جو بعد میں شیر شاہ کا ہمراز و معتبر بن گیا۔ شیر کے دل میں اس کے لیے پیار تھا۔ حالانکہ وہ گاہ بگاہ اس کی سفاکی کے لیے اس کو لعنت و ملامت بھی کرتا تھا۔

جب تک افغان ذرائع سے اس باب میں مزید معلومات حاصل نہ ہوں یہ کہنا زیادہ حقیقت کے نزدیک ہوگا کہ برہم جیت ایک راجپوت تھا۔ بمقابلہ اس کے کہ ہم اسے برما زیدی گوڑ کہیں۔ اور اس کا اصلی نام بھی ہمیں معلوم نہ ہو۔ افغان مورخین نے شیر کی تاریخ میں جن اداکاروں کا ذکر کیا ہے ان میں یہ کردار اپنے اخلاق و خصلت کی وجہ سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے[1]

کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا جو لوگ آج برہم جیت گوڑ کو پرواز تخیل سے مسلمان ثابت کرتے ہیں تعجب نہیں کہ ایک روز مستقبل میں وہ شیر کے اس سپہ سالار کو ایران کے بہرام گور کا خاندانی بنا دیں۔

[1] بدایونی نے برہم جیت گوڑ کے لیے "دجال امت و حجاج روزگار خود" لکھا ہے (منتخب التواریخ قلمی نسخہ جلد ا صفحہ ۳۷۹) یعنی اسے اسلام کا دشمن اور اپنے زمانہ کا "حجاج" یعنی ظالم بتایا ہے۔ اگر یہ شخص غیر مسلم نہ ہوتا تو بدایونی اسے اسلام کا دشمن کیوں بتاتا۔ خونریزی اور ظلم میں اس کی مشابہت حجاج بن یوسف سے کی گئی ہے۔ جو کافر اور ظالم تھا۔ حجاج ایک مدرسہ کا معلم اور سپاہی تھا۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کا داہنہ ہاتھ تھا۔ اس نے مسلمانوں کو کعبہ سے بھگانے کے لیے غلیلوں سے پتھر پھنکوائے تھے۔ ایک لاکھ ۲۰ ہزار مسلمانوں کو عراق میں قید کر لیا تھا اور اپنی گورنری کے زمانہ میں تقریباً اتنے ہی مسلمانوں کو قتل کیا تھا۔ لہذا ان دلیلوں کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ برہم جیت گوڑ یقیناً افغان یا مسلمان نہیں تھا۔

Marfat.com

باب 18

آخری مہم اور انتقال

بندیل کھنڈ فتح کرنے کا شیر کا منصوبہ

جملہ مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ شیر چتوڑ سے آگرہ نہیں بلکہ کھجوارا گیا یہ وہ مقام ہے جہاں آج کل بندیل کھنڈ میں کھجوراہو کے مشہور مندر ہیں لیکن کسی تاریخی ذریعہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کب گیا اور اس سفر کے لیے اس نے کون سا راستہ اختیار کیا۔ کہا جاتا ہے کہ شیر نے عادل خاں سے رنتھمبور کے گرد و نواح کے علاقہ میں شکار کا انتظام کرنے کے لیے کہا۔[1] اگر یہ بات درست

---

[1] ڈارن (۱۴۰-۱) عباس لکھتا ہے کہ شیر نے چتوڑ کے نزدیک پہنچ کر عادل خاں کو رخصت دے دی اور خود کھجوارا کے لیے روانہ ہو گیا۔ چتوڑ سے کھجوارا کا عام راستہ منڈسور۔ اجین۔ سارنگ پور ہو کر جاتا ہے۔ شیر کے اس سفر میں کسی جگہ کا ذکر نہیں آیا۔ علاوہ بریں اس راستہ سے سفر کرنے کے معنی ہیں زیادہ فاصلہ طے کرنا۔ کیوں کہ یہ ایک مثلث کے دو اضلاع ہیں لہٰذا ہم اس ضمن میں مخزن کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔

Marfat.com

ہے تو شیر نے اس علاقہ میں چند روز قیام کیا ہوگا۔ یہ علاقہ موجودہ سوائی مادھو پور کے نزدیک کوٹہ کی سرحد پر ہے۔ بندیل کھنڈ پہنچنے کے لیے سب سے سہل اور سیدھا راستہ مکند وارا درا سے گذر کر گگرون، چندیری ہو کر جاتا ہے۔ ان مقامات پر اس وقت شیر نے قبضہ کر لیا۔ اپنے سب سے بڑے لڑکے عادل خاں سے رخصت لے کر (شاید یہ زندگی کی آخری الوداع تھی) اور اسے رنتھمبور جانے کی اجازت دے کر شیر مالوہ کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ شجاعت خاں کو بھی حاضر ہونے کے لیے فرمان بھیجا گیا۔ ابھی بندیل کھنڈ کی فتح کی ابتدا بھی نہ ہوئی تھی کہ شیر نے شجاعت خاں سے دکن کی فتح کے متعلق مشورہ کیا۔ اغلب ہے کہ ظفر و کامرانی نے شیر کے حوصلے کو دوبالا کر دیا ہو۔ اور وہ دکن کو اپنے حیطہ تصرف میں لانے کا خواب دیکھنے لگا۔ عباس اور مخزن سے جس دکن کا حوالہ ملتا ہے اس کا مطلب صرف اس علاقہ سے ہے جو کہ خاندیش کی فاروقی ریاست کی سرحد سے ملحق تھا۔ تاریخ ہند کی یہ ایک حقیقت ہے کہ شمالی ہند کے ہر بادشاہ نے مالوہ کی فتح مکمل کرنے کے لیے دکن فتح کرنا لازمی سمجھا اور بادشاہ نے دکن کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے اس خطہ کو زیر کرنا کامیابی کا پہلا قدم سمجھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شیر کچھوراہہ کی سرحد کے نزدیک پہنچا تو شجاعت خاں نے اپنے بارہ ہزار گھوڑوں میں سے ۶ ہزار گھوڑے شیر کے معائنہ کے لیے پیش کیے۔ اور باقی گھوڑوں کے لیے بہانہ کر دیا کہ وہ اس کے علاقہ کی مختلف چوکیوں پر تعینات ہیں۔ شیر نے شجاعت خاں کو ایک ہاتھی اور ایک خلعت انعام میں دیا اور اسے ہنڈیہ اور سیونی جانے کی اجازت دے دی۔ بادشاہ نے اسے یہ بھی تاکید کی کہ وہ اپنی مالوہ کی فوج کو لڑائی کے لیے بالکل کمربستہ کر دے۔ اور جوں ہی اسے کالنجر کی فتح کی خوشخبری ملے وہ فوراً دکن پر حملہ کر دے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو
سوزنِ تدبیر گو ساری عمر سیتی رہے

کچھوراہہ (موجودہ کھجوراہو) قدیم سلطنت جی جا بھکتی کا ایک خوش حال آسودہ صدر مقام تھا۔ ۱۱ویں صدی کے آغاز میں جی جا بھکتی کے حکمراں اپنے

Marfat.com

پڑوسی راج قنوج اور مالوہ سے جنگ و جدل میں مصروف تھے۔ اس کے آخری بہادر حکمراں گنڈا نے سلطان محمود غزنوی کا مقابلہ کیا تھا۔ ۱۱ویں صدی میں البرونی اور ۱۴ویں صدی میں ابن بطوطہ کے زمانہ میں کھجوراہو کے قرب و جوار کا علاقہ "جج ہوتی"[1] کہلاتا تھا۔ آج بھی بندیل کھنڈ کے لوگوں کے دماغ میں یہ نام تازہ ہے۔ اس وسیع اور قوی سلطنت کا مرکزی علاقہ ایک مخمس کی شکل کا ہے جس کا ایک بازو چھتر پور سے مہوبہ، دوسرا مہوبہ سے باندہ۔ تیسرا باندہ سے کالنجر۔ چوتھا کالنجر سے پنا اور پانچواں پنا سے چھتر پور ہے۔ کھجوراہو اب تقریباً کھنڈر ہے۔ پنا اور چھتر پور دونوں مقامات سے تقریباً برابر فاصلے پر یعنی ۲۵ میل ہے۔ مہوبہ سے یہ جگہ ۳۴ میل ہے۔ کھجوراہا ریاست کے زوال کے بعد کالنجر کی عظمت میں چار چاند لگ گئے۔ اور یہ ۱۲ویں صدی میں چندیلا راجپوتوں کا صدر مقام بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ چندیلا راجہ پرمالدیو (پرم دری دیو) اور اس کے مشہور سورما آلہا اور اودل نے جو بنافر قبیلے کے تھے پرتھوی راج چوہان کو لڑائیوں میں ہرایا تھا جب کالنجر کے مسلمان حملہ آوروں نے متواتر اسے جارحانہ کارروائیوں کا نشانہ بنالیا نوبت سے سردار کالنجر چھوڑ کر ریوا چلے گئے۔ یہ علاقہ جنگلات اور پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ اور ناقابل رسائی تھا۔ لودی عہد حکومت میں اس کو بھاٹا کہتے تھے۔ اور ابوالفضل کے زمانہ میں یہ بندھو یا بندھو گڑھ کہلاتا تھا۔ پٹنہ کا راجہ بعید ما سلطان بہلول اور سکندر لودی کو جنوبی بہار اور جمنا اور چمبل وادی میں متواتر پریشان کرتا رہا۔ ایک مرتبہ سلطان سکندر لودی نے بھاٹہ کے اس طاقتور راجا کے خلاف فوج کشی کی لیکن وہ ناکام رہا۔ اس نے اس علاقہ کو خوب اچھی طرح لوٹا اور

---

[1] جج جابھکتی کے قدیم نشانات اب ناپید ہیں صرف وہاں کے مندر اور خوبصورت جھیل باقی ہیں یہاں کے باشندے بڑے فخر سے اپنے کو جج ہوتی نسل کا بتاتے ہیں خواہ وہ برہمن ہوں دھوبی ہوں یا چمار۔ اس خیال کے مطابق یوپی کے قنوجیہ برہمن بندیل کھنڈ کے جج ہوتی برہمنوں کے مانند ہیں۔ ان لوگوں میں سیاسی اور تمدنی امارت پرستی موجودہ کلکتہ یا لکھنؤ والوں کی مانند ہے۔

Marfat.com

کھجوراہو کے مشہور مندروں کو توڑ کر مذہبی جنون کے نشانات ہمیشہ کے لیے ثبت کر دیے۔ جنوری ۱۵۲۸ء میں بابر کالپی سے چندیری جانے کے لیے اس راستہ سے گذرا تھا۔ اس کا استقبال بڑی گرم جوشی سے ہوا تھا۔ اس نے کچھوراہہ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ جگہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے ہر جانب سے محیط ہے۔ اس کے تین جانب دس بارہ میل لمبی ایک جھیل ہے۔ صرف شمال میں خشک میدان ہے۔ جہاں سے اس شہر میں کوئی داخل ہو سکتا ہے۔[1]

سوانح نگار اس کے متعلق کوئی روشنی نہیں ڈالتے کہ شیر نے اس مقام کو اپنی فوجی کارروائی کا صدر مقام کیوں بنایا۔ حالانکہ کالنجر پر حملہ کرنے کے متعلق انھوں نے کافی گپ بازی کی ہے۔ شیر کا اس مہم کا فوری مقصد کالنجر فتح کرنا نہ تھا۔ بلکہ وہ اس وقت باندہ اور ہمیرپور کے علاقہ کو ڈاکوؤں

---

[1] (تزک ۵۹۱ - ۵۹۲) مترجم کا حاشیہ کا نوٹ جس میں کچھوراہہ مقام کا تعین کیا گیا ہے۔ گمراہ کن معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس جگہ کو کچھوراہا نہ سمجھ کر کرواہا تسلیم کریں۔ کرواہا کچھوراہا کے مقابلہ گمنام جگہ ہے۔ بابر نے جو جائے وقوع اور طبعی جغرافیہ اس جگہ کے متعلق بیان کیا ہے اس سے کھجوراہو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کھجوراہو کا جائے وقوع ۲۴° ۵۰' شمال ۵۶-۷۹° مشرق ہے۔ کرواہا کا جائے وقوع ۸° ۲۴° شمال اور ۷۷° ۵۰' مشرق ہے

[2] عباس نے لکھا ہے کہ شیر نے کچھوراہا سے کالنجر کے لیے کوچ کیا اور شاہ بندی تک پہنچا۔ میں نے اپنی پہلی تصنیف "شیر شاہ" میں اس مقام کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ میں اس مقام کا تعین کرنے میں ناکام رہا تھا۔ لہذا شیر کی نقل وحرکت کو بیان کرنے میں حقیقت سے دور بھٹک گیا۔ پروفیسر ہودی والا کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ شاہ بندی وہ جگہ ہے جو نقشہ میں آج سہوندا ہے لیکن ان کی یہ رائے صائب نہیں ہے کہ یہ جگہ شیر کے کچھوراہہ کے راستہ میں پڑتی ہے۔ کچھوراہہ سے کالنجر زیادہ نزدیک ہے۔ سہوندا کالنجر سے اور آگے شمال۔ شمال مغرب میں ۱۴ کوس ہے۔ اور باندہ سے جنوب میں ۱۸ کوس

Marfat.com

سے صاف کرنا چاہتا تھا۔ یہ علاقہ سلطان سکندر لودی کے زمانہ سے لے کر بابر اور شیر شاہ کے زمانہ تک متواتر بدامنی اور شورش کا مرکز تھا۔ اس بدامنی اور شورش کا اثر جونپور، پریاگ، گڑھا نک پور جیسے دور دراز علاقوں تک پڑتا تھا۔ ۱۵۴۴ء کی برسات میں شیر نے کھوارا کو اپنا فوجی صدر مقام کیوں بنایا؟ اس کے لیے ہمیں اس وقت کے حالات کا جائزہ لینا ہوگا جو مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) شیر کی غداری کی وجہ سے سلطان سکندر لودی کا بیٹا سابق بادشاہ محمود لودی[1] دورا ہا کی جنگ میں شکست کھا کر بھاٹہ کے راجا کے پاس بھاگ آیا تھا۔ حالانکہ اس نے بادشاہ بننے کا خیال اپنے دل سے بالکل نکال دیا تھا اور وہ شاہی نشان بھی استعمال نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس کے حامی موالیوں میں سے کچھ اس قسم کے کٹر ضدی لوگ تھے جو شیر کو ہنوز اپنا بادشاہ تسلیم نہیں کرتے تھے۔

(۲) اس وقت بھاٹہ کی گدی پر شیر کا ہم عصر راجہ بیرم سنگھ دیو تھا جو نہایت ذی جاہ و با اثر تھا۔ یہ راجہ بدھی چندر کے بھائی کا بیٹا تھا (افغان تاریخوں میں راجہ بھید لکھا ہے۔) بیر سنگھ[2] کنواہہ کی لڑائی میں مہارانا سانگا کے پرچم کے

ہے۔ لہٰذا سہونداجاتے وقت شیر کا نصب العین کالنجر نہیں ہوسکتا بلکہ کوئی دوسری جگہ ہوگی۔ جو باندہ کے نزدیک ہونی چاہیے (اسٹڈیز صفحہ ۴۶۳) یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ پروفیسر موصوف کا یہ کہنا بالکل بے معنی ہے کہ کھوراہہ کھینچی وارا ہے۔ جو باندہ ضلع میں ہے۔ دراصل کھینچی وارا مالوہ کا ایک خطہ ہے جہاں شورش پسند کھینچی چوہان رہتے تھے۔ یہ علاقہ چندیری سے ۷۰ میل مغرب میں ہے اور پاربتی دریا کی آدھی دوری پر مشرقی کنارے پر ہے۔

[1] سلطان سکندر کا بیٹا محمود ۱۵۲۹ء میں بہار میں تخت نشین ہوا۔ مسٹر نیول کے فراہم شدہ سکوں میں اس کے نام کا ایک سکہ اس بات کو ثابت کرتا ہے (اچ این رائٹ دی سلطان آف دہلی دیر کوائنج اینڈ میٹرولوجی دلو کسفورڈ ۱۹۳۶ - صفحہ ۲۶۲)

[2] بیر سنگھ دیو کے لیے دیکھیے تزک بابری (۵۲۱ - ۵۶۲ - ۶۳۹) اسے محض

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

نیچے بابر کے خلاف لڑا تھا۔ بعد ازیں اس نے بابر کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ مشرقی ہند میں یہی اکیلا راجپوت تھا جس نے شیر کی اطاعت نہیں تسلیم کی تھی۔ شیر سمجھتا تھا کہ چنبل و جمنا دوآبہ کی چھوٹی چھوٹی راجپوت ریاستوں کو بھی بیر سنگھ دیو پناہ دیتا ہے۔ لہذا شیر بھاٹہ راج کو اپنی سلطنت کے لیے مستقل خطرہ سمجھتا تھا۔

(۳) اریل کا راجہ بیر بھان جس نے مفرور ہمایوں کی جماعت کو چوسا کی جنگ سے فرار ہونے کے بعد پناہ دی تھی شیر کی نظروں میں مشتبہ تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں شیر نے اس کو معاف کر کے اپنے یہاں نوکر رکھ لیا تھا اور اس کی برابر نگرانی ہوتی رہی۔ تاریخ سلاطین افغانیہ کا مصنف احمد یادگار جو مذہبی جوش میں دیوانہ اور پاگل تھا کہتا ہے کہ شیر کے کالنجر پر حملہ کرنے کا سبب یہ تھا کہ راجہ کالنجر نے اپنی پناہ میں آئے ہوئے۔ بیر سنگھ دیو بندیلا کو شیر کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا[1]۔ لیکن فرشتہ جو اس سے قدیم تر و معتبر مورخ ہے۔ اس کے لیے زیادہ معقول وجہ پیش کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ کالنجر کا راجہ پورن مل کے ساتھ شیر کے سلوک و رویہ کو دیکھ چکا تھا۔ لہذا اس نے شیر کی اطاعت قبول نہیں کی۔ بلکہ مخالفانہ رخ اختیار کیا۔ پھر بھی یہ بات سچ ہے کہ کوئی نہ کوئی مفرور کالنجر ضرور گیا جس سے شیر کو فوری بہانہ مل گیا۔ اور یہ شخص راجہ اریل ہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سنگھ" کہتے تھے جو دانگ یا دانگیہ کا بگڑا ہوا لفظ معلوم ہوتا ہے اس کے ایک معنی ہیں لیٹرا اور دوسرے معنی ہیں دانگ علاقہ کا رہنے والا۔ دانگ بندیل کھنڈ کا مشرقی علاقہ ہے۔ بعد کے قصے کہانیوں میں یہ بیر سنگھ نام بدل کر "نر سنگھ" ہو گیا جو خاندانی شجرہ میں پایا جاتا ہے۔ شاید ایلیٹ نے جیسا تھا ویسا ہی لکھ دیا۔ (ایلیٹ میموئرس آف دی ریس آف دی نارتھ ویسٹرن پراونسز ۱-۴۶) یہ بات قابل ذکر ہے کہ میں نے بیر سنگھ کے متعلق جو کچھ لکھا تھا رد کر دیا جائے (شیر شاہ ۳۳۳-۳۳۴)

[1] ایلیٹ جلد ۴ صفحہ ۷، ۴ فٹ نوٹ پروفیسر ہودی والا کہتے ہیں کہ مفرور راجہ بندیلہ نہیں تھا بلکہ بگھیلہ تھا۔ شاید سولنکی چوہان تھا۔ بھاٹہ کا بیر سنگھ دیو بندیلہ تھا اور قنوج کے گہوار خاندان کا وارث تھا۔

Marfat.com

ہو سکتا ہے جو بھاٹہ کے بیر سنگھ دیو کی پناہ میں گیا تھا۔ ریوا کے علاقہ میں آج تک اس کا خاندان حکمراں ہے۔

(۴) شیر کی راجپوتانہ کی مہم کے دوران ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگرہ واٹاوہ ضلع کے راجپوتوں میں کافی شورش برپا ہوگئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ شیر نے باہ میں واقع سرہند سے ۱۲ ہزار گھوڑ سوار بہادر چوہانوں[1] کی بغاوت فرد کرنے کے لیے بھیجے تھے۔ راجپوتوں میں اس شورش کی وجہ سے ہی اریل کا راجہ بیر بھان فرار ہوا ہوگا۔ ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے ہم یہ جان سکیں کہ راجہ بیر بھان کب اور کہاں بھاگ گیا مگر قرین قیاس یہ ہے کہ یہ واقعہ اس وقت ہوا ہوگا جب شیر مارواڑ کی مہم میں مصروف تھا۔

لہذا یہ ظاہر ہے کہ شیر نے گجھوراہہ کو اپنا صدر مقام بلاوجہ نہیں بنایا تھا۔ یہ فیصلہ ارادتاً سوچ سمجھ کر ہی کیا گیا تھا۔ راجپوتانہ میں قیام کے بعد یہ کام لازمی ہوگیا تھا۔ شیر نے گجھوراہو کو مستقل چھاونی بنانے کے لیے پسند کیا اور یہاں پہاڑی پر ایک پتھر کا قلعہ بھی تعمیر کروایا[2]۔ بہرحال اس جگہ کو فوجی صدر مقام

---

[1] عباس لکھتا ہے کہ شیر نے کالپی سرکار میں ۲ ہزار بندوقچی رکھے تھے (صفحہ ۲۲۳) لیکن ایلیٹ کے قلمی نسخہ میں بھدوریہ لکھا ہے۔ اپریل گزیٹر کے مطابق ۱۲ ہزار گھوڑ سوار باہ میں رکھے تھے۔ باہ ۵۲ ۲۶° شمال اور ۵۵-۰ ۷۸° مشرق میں ہے۔ یہ آگرہ سے اٹاوہ جانے والی سڑک پر ہے۔ آگرہ سے ۴۶ میل جنوب مشرق اور بیڑ سے ۶ میل ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کالپی کی مستقل فوج کے علاوہ یہ گھوڑ سوار سرہند سے کسی ضرورت کے لیے لائے گئے ہوں۔ شیر بھدوریہ میں بھی ایک فوج رکھتا تھا۔ یہ مہاو چھاونی کے نزدیک بھدوریہ ۱۰۔۷۸ مشرق ارض البلد اور ۴۹۔۲۶ شمال ہے۔ (اپریل گزیٹر جلد ۲ صفحہ ۲۳۷ دیکھیے)۔

[2] بابر نے گجھوراہہ میں کسی قلعہ کا ذکر نہیں کیا مگر ابوالفضل لکھتا ہے کہ سرکار ہیانوان میں گجھوراہہ جگہ پر ایک پتھر کا قلعہ ہے (آئین نیا ایڈیشن ۲-۲۰۰) لہذا شیر نے ہی یہ قلعہ تعمیر کیا ہوگا۔

Marfat.com

اس لیے بنایا گیا تھا کہ کالنجر اور ریوا کے علاقہ میں لڑنے والی فوج کو رسد مہیا کی جا سکے۔ موسم زمستان کے آغاز میں شیر اپنی فوج لے کر باندہ کی جانب چل دیا۔ اس نے کالنجر کو ایک طرف چھوڑ دیا۔ اس سے شیر کا منشا کالنجر کے قلعہ کے چاروں طرف کے علاقہ کا تفصیلی جائزہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کالنجر کے قلعہ کا محاصرہ کرنے سے بیشتر اس کو بندیل کھنڈ کے باقی ماندہ حصہ کو فوجی و سیاسی کمک سے محروم کرنا ہوگا۔ وہ سہوارہ تک پہنچا ہی تھا کہ اس کو یہ بری خبر ملی کہ عالم خاں نے میرٹھ[42] میں بغاوت شروع کر دی ہے اور قرب و جوار کے علاقہ میں بڑے پیمانہ پر لوٹ مار کی ہے۔

ہنڈیہ اور سیونی کے ان میانہ افغانوں نے مالوہ کی مہم میں شیر کی مدد کی تھی۔ انھیں یہ امید تھی کہ اس کے عوض میں شیر ان کو ان کے بھائیوں کی زمین دے دیگا یہ افغانوں کی پرانی عادت تھی۔ لیکن شیر کا اصول دوسرا ہی تھا۔ شیر نے ان کو جاگیریں تو دیں لیکن دوآبہ کے علاقہ میں دیں جس کے دوسرے الفاظ میں معنی تھے ان کی اپنے آبائی وطن سے جلاوطنی۔ شیر نے تمام فوجداروں کو مستقل حکم دے رکھا تھا کہ سلطنت کے جس گوشہ میں بھی بغاوت ہو فوجدار ان کے حکم کا انتظار کیے بغیر اسے فرو کرنے کے لیے فوراً سخت قدم اٹھائیں۔ اس وقت سرہند کا فوجدار خواص خاں کا نائب و غلام ملک بھگونت تھا۔ اس نے فوراً باغی عالم خاں میانہ کے خلاف فوج کشی کی اور اس کو مغلوب کر دیا۔ یہ اطلاع شیر کو تب ملی جب شیر سیوندھا سے ۲ منزل پیچھے کالنجر کی جانب ہٹ گیا تھا۔ اب شیر نے مطمئن ہو کر کالنجر کا محاصرہ شروع کر دیا۔ کالنجر کو کسی قسم کی کمک بھاٹہ کی جانب سے نہ

---

[42] عباس ایلیٹ ۴-۴۰۷۔ اس سے مختلف بیان کے لیے دیکھیے ڈارن ۱-۱۴۰۔ وہ لکھتا ہے عالم خاں میانہ کو قید کر لیا گیا۔ ڈارن نے میرٹھ لکھا ہے۔ عباس نے میرٹھ لکھا ہے۔ میرٹھ سے غافل پڑھنے والے کا دھیان مارواڑ کی جانب چلا جاتا ہے۔ کچھ مؤرخوں کا خیال ہے کہ عالم خاں لڑائی میں مارا گیا مگر یہ ٹھیک نہیں ہے۔ عالم خاں شیر کے بعد بھی زندہ رہا (دیکھیے ڈارن ۱-۱۵۹) اور اسلام شاہ کے زمانہ میں اس نے پھر غداری کی۔

Marfat.com

پہنچ سکے۔ اس ارادہ سے شیر نے شہزادہ جلال خاں کو ایک مضبوط فوجی دستے کی کمان دے کر بھاٹہ کے علاقہ پر حملہ کرنے بھیج دیا لیکن بھاٹہ کے گنجان جنگلی علاقہ میں کدال اور پھاوڑے کے بغیر سپاہی کی تلوار یا توپ تا گولہ بالکل بے کار تھا۔ نومبر ۱۵۴۴ء کے آغاز میں باپ بیٹا ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ اب انھیں دوبارہ ایک دوسرے سے زندہ ملنا نصیب نہ ہوگا۔

کالنجر اور بھاٹہ کے خلاف لڑائی

افغان مورخین نے کالنجر کے محاصرہ کا ذکر بہت ہی مایوسانہ انداز میں کیا ہے۔ شاید ہی کبھی اس قدر اہم لڑائی کا بیان اس انداز سے کیا گیا ہو۔ ان لوگوں نے شیر کی کالنجر کی لڑائی کا مقصد اور اس کی ادھوری کامیابی کا راز گپ بازی اور مذہبی تعصب کے پردہ میں پنہاں کر دیا ہے۔ کچھ مورخین اس بات کے لیے افسوس کرتے ہیں کہ ہندوؤں نے کبھی اپنی ترتیب وار تاریخ نہیں لکھی جس کی وجہ سے مسلمان مورخین کو واقعات کو توڑ مروڑ کر لکھنے کا موقع مل گیا۔ شیر کے خلاف ۱۵۴۹ء میں بندیلوں نے جو جنگ آزادی لڑی اس کے متعلق ان لوگوں کی یہ شکایت بالکل بجا و درست ہے۔ ہندی ادب میں 'ویر گاتھا' کا عہد ختم ہو چکا تھا۔ بدقسمتی سے ۱۶ ویں صدی میں بندھیل کھنڈ میں کوئی ایسا درباری سوانح نگار بھی پیدا نہیں ہوا جیسا کہ ۱۷ ویں صدی میں مہاراجہ ستر سال کے دربار میں لال شاعر تھا۔ بندیل کھنڈ کے علاقہ میں راجپوتانہ کی طرح اس لڑائی کے متعلق کہیات بھی نہیں لکھی گئی۔ جس سے فارسی مورخین کے بیانوں میں اصلاح ہوتی یا ادھورے خاکے مکمل ہو جاتے۔ عباس اور مخزن کے قول کے مطابق ہمیں یقین کر لینا چاہیئے کہ کالنجر پر شیر کا حملہ ایک قسم کا جہاد ہے۔ کالنجر کے محاصرہ میں اتنا طویل عرصہ کیوں لگا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مخزن نے حلفیہ بیان دیا ہے کہ شیر شاہ نے سُنا کہ راجہ کے حرم میں ایک خوبصورت طوائف رقاصہ ہے جو ناچنے میں کمال مہارت رکھتی ہے۔ اس کو یہ ڈر ہو گیا کہ اگر قلعہ پر اچانک حملہ کر کے قبضہ کیا گیا تو ممکن ہے قلعہ کے اندر کی فوج سب مال و اسباب

Marfat.com

کو تباہ کر دے اور اس لڑکی کو جلا دے۔[1]

در اصل یہ گپ بازی شیر کی اصل کمزوری پر پردہ ڈالنے کی ایک بھونڈی کوشش ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اس علاقہ میں شیر کو عوام کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور شروع شروع میں اس کی فوج اور توپ خانہ کو کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ افغان سوانح نگار لکھتے ہیں کہ سات مہینے کی جان توڑ کوشش کے بعد شیر اور جلال خاں کی فوجوں میں: ۵ میل سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔[2] اس کے یہ معنی ہوئے کہ دونوں باپ بیٹے لپشت سے پشت ملا کر مخالف کے بھاری پلے سے بھڑے ہوئے تھے۔ آخر کار جب حملہ آور کا کافی جان و مال کا نقصان ہو چکا تب کہیں جا کر کالنجر فتح ہوا۔ بھانہ راجہ نے غنیم کو پیچھے دھکیل دیا اور سور خاندان کے بعد اس کی آزادی برقرار رہی۔ اس لڑائی کے یہ واقعات ایسے ہیں جن میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس لڑائی میں شیر کو مکمل کامیابی نہیں ملی اور محاصرہ بھی کافی طویل عرصہ تک رہا۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ (۱) لڑائی کی ماہیت (۲) راجپوت قبیلوں کا کردار۔ خواہ وہ قبیلہ بگھیلہ ہو، بندیلہ ہو یا چوہان (۳) لڑائی کے خط کی طبعی کیفیت۔ اب ان وجوہات پر باری باری سے تبصرہ کیا جاتا ہے۔

جنگ کی ماہیت

بندیلہ راجپوتوں کا کردار کالنجر کے قلعہ کی فصیل کے گرد و نواح کا علاقہ شیر کے حملہ کے وقت غالباً بالکل وہی تھا جو بابر کی وفات کے وقت تھا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ۱۵۳۰ء میں جب ہمایوں نے کالنجر پر حملہ کیا تھا تو اس کے پاس شیر کے مقابلہ میں کم فوج اور چھوٹا توپ خانہ تھا کیونکہ ۱۵۳۰ء میں شیر کی طاقت

---

[1] ڈارن ۱۔ ۱۴۱۔ عباس اپنے کو بچا کر لکھتا ہے "کالنجر کا راجہ کیرت سنگھ شیر سے ملنے قلعے سے باہر نہیں آیا۔ لہذا شیر نے قلعہ کے محاصرہ کا حکم دے دیا (عباس قلمی نسخہ، ۲۳ ایلیٹ ۱۴۱ھ) اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عباس نے جب یہ تاریخ لکھی اس وقت اس لڑائی کے زیادہ تر واقعات اس کے ذہن سے فراموش ہو چکے تھے۔

[2] ڈارن ۱۔ ۱۴۲۔

Marfat.com

کمال عروج پر تھی۔ تاہم ہمایوں نے ۳ مہینہ کی قلیل مدت میں ہی کالنجر کے راجہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ جب کہ شیر ۱ مہینہ میں بھی یہ کام نہ کر سکا۔ کوئی بھی یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ ہمایوں شیر سے بہتر سپہ سالار اور فن جنگ کا ماہر تھا۔ تب ۱۵ سال کے عرصہ میں کالنجر کے دو حملہ آوروں کے کارناموں میں اس قدر زبردست تفاوت کیوں رہا۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دونوں حملہ آوروں کو مختلف صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اب کالنجر کی حالت بدل چکی تھی اور وہاں کی رعایا بیدار ہو چکی تھی۔

۱۵۳۰ء میں ہمایوں نے ببن اور بایزید افغانوں کو بندیل کھنڈ سے نکالنے کے لیے جنگ کی تھی۔ بندیلہ مغلوں سے زیادہ افغانوں سے نفرت کرتے تھے۔ انھیں یاد تھا کہ سلطان سکندر لودی نے کس طرح ان کے ملک کو تباہ کیا تھا۔ وہ افغان حملہ آوروں کو اپنے ملک سے نکالنے پر آمادہ تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کالنجر کا راجہ مغلوں کو الجھائے رکھنے کے لیے در پردہ افغانوں کی مدد کرتا رہا۔ لیکن ۱۵۴۵ء میں صورت حال مختلف تھی۔ راجہ کالنجر کے سامنے پورن مل کی مثال تھی۔ وہ شیر کی ایمانداری پر اس قدر اعتماد نہیں کر سکتا تھا جتنا کہ اس نے ہمایوں کا اعتبار کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس دوران میں بارود کا خوف بھی مٹ چکا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ جمنا اور چمبل دوآبہ کے سبھی سرکش اور باغی راجپوت اور دوسرے علاقہ کے راجپوت جن کو شیر شاہ نے اپنے گھروں اور گڈھیوں سے نکال دیا تھا اب بندیل کھنڈ کے جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لے سکتے تھے۔ اسی لیے ۱۵۴۵ء میں بندیل کھنڈ کی لڑائی میں سختی آ گئی تھی۔ ایک سنگدل شیر کے مقابلہ میں یہ لڑائی ان کی موت و زندگی کا سوال تھا۔ ان مخالف راجپوتوں میں جو شیر کے انتقام کے ڈر سے مفرور بندیل کھنڈ میں پناہ گزیں تھے سب سے زیادہ قوی اور بہادر راجہ اریل کا بیربھان تھا۔ اریل الہ آباد قلعہ کے سامنے واقع ہے۔ یہ بھاگ کر بھاٹہ پہنچ گیا تھا اور مشرقی ہند میں راجپوتوں کی آزادی کی لڑائی کا آخری علمبردار تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے ریوا کے موجودہ شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی۔

Marfat.com

علاقے کے باشندوں کا کردار

بندیل کھنڈ اور بگھیل کھنڈ کے باشندے خواہ وہ اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ اپنے ہمسایوں کی نظر میں معزز نہیں سمجھے جاتے تھے وہ راجپوتانہ کے باشندوں کی طرح مرد میدان نہ تھے بلکہ تحقیراً ان کو لوگ "کوہی" یا چالاک پہاڑی کہتے تھے۔ ایک لڑاکو کی حیثیت سے بندیلوں میں استقلال تو کم تھا لیکن شجاعت و عیاری میں وہ مراٹھوں کی طرح تھے۔ جو دشمن کو پریشان کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اس علاقے کی یہ ایک مشہور کہاوت تھی "چالاکی اور عیاری میں ایک بندیلہ سو بقالوں[1] کے برابر ہے۔" بندیلوں کی یہ عیاری لڑائی میں ان کے بہت کام آئی۔ اپنے سے قوی غنیم کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ بہت ضروری تھا کہ راجپوتانہ کے راجپوت موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میدان جنگ میں جاتے تھے۔ یہ ایک قابلِ تعریف بات تھی لیکن جنگ میں ان کی شجاعت و دلیری اتنی کام نہیں آئی جتنی کہ

---

[1] ایلیٹ (میموئرس آف دی ریسز آف دی نارتھ ویسٹرن پراونسز جلد ا صفحہ ۴۶) بقال عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں سبزی فروش عام زبان میں یہ لفظ منڈی میں اناج تولنے والے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چھوٹے دکان دار کو بھی بقال کہتے ہیں۔ راجپوتانہ میں کسی آدمی کو بڑی سے بڑی بات کہتے وقت کہا جاتا ہے کہ "تو بنیا ہو جا" زمانہ قدیم سے ہندوستان کے لوگوں میں بنیا کم تولنے کے لیے بدنام ہے خواہ وہ ماہی فروش ہو یا جوہری۔ قرون وسطیٰ کے ایک سنسکرت زبان کے شاعر نے کہا ہے "خدا کی مخلوق کا ایسا نظام ہے کہ بندر میں عیاری دکاندار میں چوری اور شاعر میں حسد لازم و ملزوم ہیں" تولنے والا یہ چالاکی اپنے ہاتھ کے ہیر پھیر سے کرتا ہے بظاہر تو خریدار کو لگتا ہے کہ اس نے ایک سیر یعنی ۸۰ تولہ سامان تولا ہے مگر تول سے کم زیادہ وہ حسب مرضی ڈنڈی مار دیتا ہے۔ دکانداروں کا ڈنڈی مارنا زبان زد ہے۔ میں نے خود ایک ماہی فروش کو ایسی عیاری دکھلاتے ہوئے دیکھا ہے۔

(کے۔ آر۔ کیو)

Marfat.com

بندیلوں کی عیاری و چالاکی مفید ثابت ہوئی لیکن آخر میں بندیلوں کو بھی اپنی اس خصلت کی وجہ سے مراٹھوں ہی کی طرح نقصان اٹھانا پڑا۔ مراٹھوں کی طرح بندیلوں کو بھی اپنی مقامی خود مختاری و آزادی سے لگاؤ تھا لیکن وہ ہمیشہ باہمی جنگ و جدل میں مصروف رہتے تھے۔ مراٹھوں کی طرح زندگی میں لوٹ مار کرنے یا باہر جاتے وقت ان کی ضروریات بہت کم ہوتی تھیں انھیں ضرورت تھی محض ایک لیڈر کی اور چاہیئے تھا ایک بہانا جس سے وہ سپاہی بن کر اپنی حب الوطنی کا ثبوت دے سکیں۔ جب شیر شاہ نے ان کے ملک پر حملہ کیا تو ان کو یہ دونوں چیزیں خود بخود مل گئیں۔ لڑائی کا بہانہ بھی ملا اور ملک میں بہت سے رہنما بھی پیدا ہو گئے۔

بندیل کھنڈ کی بناوٹ

بندیل کھنڈ ایسا علاقہ ہے جہاں بارش کم ہوتی ہے۔ آمد و رفت کے ذرائع بہت مشکل اور کم ہیں۔ قرون وسطیٰ میں یہاں صنعت و حرفت نام کو نہ تھی۔ زراعت کی حالت قابلِ رحم تھی کوئی بھی کاشتکار امن چین سے روٹی نہ کھا سکتا تھا۔ نہ اپنی فصل ہی کاٹ سکتا تھا۔ جب تک اس کو کسی ڈاکو یا لٹیرے کا سہارا نہ ہو۔ بندیل کھنڈ کی طبعی بناوٹ اونچی نیچی پہاڑیوں کے ڈھالوں پر ناقابلِ عبور جنگل اور گھاٹیاں یہ تمام چیزیں مجموعی طور پر ایک کاہل اور ایماندار آدمی کو بھی ڈاکو بننے کی ترغیب دیتی ہیں۔ آج کل کی طرح اس زمانہ میں بھی ڈاکو یا لٹیرا یا تو محب وطن سمجھا جاتا تھا یا سیاسی مصیبت زدہ۔ بندیل کھنڈ جھیلوں کا علاقہ ہے۔ اس میں قدرتی و مصنوعی دونوں قسم کی جھیلیں ہیں۔ انھیں جھیلوں پر وہاں کی زراعت کا دارومدار ہے۔ اور یہی ان کے مویشیوں اور آدمیوں کے لیے پانی کا ذریعہ تھیں۔ سیلاب اکثر آتا ہے مگر جلدی چلا جاتا ہے زمین خشک و پیاسی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ بندیلوں کی جسمانی و دماغی طاقت اس بات میں لگی رہتی تھی کہ پانی کا ذخیرہ کس طرح جمع کیا جا سکے۔ انھوں نے پہاڑی چشموں پر سطح باندھ باندھے ہوتے تھے دشمن کے حملے کے وقت یہ باندھ ان کی حفاظت کرتے تھے۔ ان باندھوں کو توڑ کر دشمن کو پانی سے محروم کیا جا سکتا تھا۔ یا دشمن

Marfat.com

کے لشکر کو رات ہی رات میں پانی کے سیلاب میں بہایا جا سکتا تھا۔ تمام علاقہ پہاڑی قلعوں اور جنگلات سے بھرا ہوا تھا۔ ان قلعوں میں کالنجر اور بھاڑ میں بندو گڑھ سب سے زیادہ مضبوط، پائیدار، مستحکم اور اہم تھے۔

مندرجہ بالا وجوہات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کوئی حیرت و تعجب کی بات نہ تھی کہ شیر شاہ کو اس علاقہ کو تسخیر کرنے اور ان لوگوں کو مغلوب کرنے میں اس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اورنگزیب اور اکبر جیسے عظیم الشان شہنشاہوں نے بھی اسی قسم کی دقتیں برداشت کیں۔

تاج المآثر اور پرمال راسو کے عہد میں دور دراز تک مشہور چندیلا صدر مقام کے کالنجر قلعہ کے متعلق بہت سی پر جذبہ نظمیں تصنیف ہوئیں۔ مگر آج وہ قلعہ سیاحوں کو روکھا اور ہیبت ناک نظر آتا ہے۔ کالنجر کا قلعہ الہ آباد سے مغرب، مغرب شمال میں براہ راست ۱۰۰ میل ہے۔ کھجوراہو سے مشرق، مشرق شمال ۳۸ میل۔ پنا سے شمال مشرق ۲۵ میل اور ریوا سے شمال مغرب ۵۰ میل ہے۔ شیر شاہ کے فوجی صدر مقام کھجوراہو سے موجودہ ریوا قصبہ جس کے نزدیک بھاٹہ کی راجدھانی تھی ۹۰ میل مشرق، مشرق جنوب ہے لیکن اس پہاڑی علاقہ میں فوجیں خط مستقیم میں سفر نہیں کر سکتیں۔ ان کو جگہ جگہ پہاڑیوں کو عبور کرنے کے لیے چکر کاٹ کر جانا پڑتا ہے۔ لہذا کوئی بھی فاصلہ طے کرتے وقت اصل سے تین گنا محیط ضرور ہو جاتا ہے۔ اس پر جنگل صاف کر کے توپ خانہ کے لیے راستہ بنانا آسان کام نہ تھا۔ خصوصاً جب شیر کو مقامی مزدور دستیاب نہیں تھے۔ بابر نے بھی یہی مشاہدہ قلمبند کیا تھا کہ ہندوستان کے دیہات اور شہر رات کی رات میں غائب ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے روز پھر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ بندیل کھنڈ کا پہاڑی علاقہ اس قسم کا ہے کہ بظاہر دشمن کی فوج کا کوئی بھی نشان نہ دکھائی دے پھر بھی ذرا سی غفلت میں خدا جانے فوج کہاں سے بلائے ناگہانی کی طرح سے ایک دم نمودار ہو جاتی ہے۔ ان ہی وجوہات اور مشکلات سے جب شیر کو کالنجر کا قلعہ دکھائی پڑا تو اس کو کوئی خاص مسرت حاصل نہ ہوئی۔

Marfat.com

جس وسیع پٹھار پر کالنجر کا قلعہ واقع ہے وہ سطح سمندر سے تقریباً ۱۲۳۰ فٹ مستقیماً بلند ہے۔ اس کا محیط ۴ یا ۵ میل ہے۔ اس پٹھار اور نزدیک سے نزدیک پہاڑی کے درمیان ۱۲۰۰ گز چوڑی ایک خندق ہے۔ اس کی دیواریں میدان سے عمودی اٹھی ہوئی ہیں جن کی اونچائی ۱۵۰ فٹ سے ۱۸۰ فٹ تک ہے اور ناقابل رسائی ہیں۔ قلعہ کے ہر چہار جانب فصیل ہے جو پہاڑیوں کی تلہٹی سے شروع ہو کر اوپر تک جاتی ہیں۔ اس فصیل پر چڑھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جہاں ایسی قدرتی گنجائش ہے بھی وہاں ایک مزید دیوار بنا دی گئی ہے۔ اس مورچہ بند پہاڑی تک پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ بھی پہاڑی کی ڈھال پر سے ترچھا ہو کر جنوب مشرق کی سمت میں پہنچتا ہے۔ یہ راستہ تنگ، ناہموار اور جھاڑیوں سے پُر ہے اور کہیں کہیں تو تقریباً عمودی ہو کر پہلے یا نچلے دروازے تک پہنچتا ہے۔ یہاں سے قلعہ بندی کے اندر داخل ہوتے ہیں پھر بھی ۴/۱ حصہ ڈھالو ہے۔[1]

قلعہ کی یہ تفصیل ۱۹ ویں صدی میں لکھی گئی ہے۔ اس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ۱۶ ویں صدی میں یہ قلعہ کس قدر مستحکم ہوگا۔ اس زمانہ میں قلعہ توڑنے کے ذرائع بہت کم تھے اور حفاظت کرنے کے زیادہ، اس لیے قلعہ پر حملہ کرنے کی کوشش زیادہ تر ناکام رہتی تھی۔ کالنجر کے قلعہ میں توپ خانہ اور بارود نہیں تھا لیکن ان کی کمی فصیل پر جمائے ہوئے بڑے بڑے پتھر کے ٹکڑوں سے پوری ہوتی تھی۔ یہ شیر کے توپ خانہ سے کہیں زیادہ کارآمد تھے لہذا شیر کے پاس اس قلعہ کا محاصرہ کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس کو ایسی ڈھالو زمین پر چڑھنے کے لیے ایک ایک انچ زمین کے لیے لڑنا تھا۔ اس کو اپنے توپ خانہ کو فصیل تک پہنچانا تھا۔ تاریخ داؤدی نے بڑے مبالغہ آمیز لیکن قابلِ معافی انداز میں شیر کی اس جدوجہد کا بیان کیا ہے جو اس نے سات مہینے تک اس قلعہ کو فتح کرنے کے لیے کی۔ شیر کو مسلم مارواڑ فتح کرنے میں بھی ۷ مہینے کا عرصہ

---

[1] بندیل کھنڈ گزیٹر، ۴۔۹۔۴۰۔

نہیں لگا تھا۔

شیر نے قلعہ کا محاصرہ کیا اور سرنگیں کھدوانی شروع کر دیں۔ اس نے توپوں کو بلندی پر نصب کرنے کے لیے بلند مینار بنوانا شروع کیا اور سرپوش راستہ بھی کھدوایا۔ اس طرح سرنگیں قلعہ تک پہنچ گئیں اور مینار اتنا بلند ہو گیا کہ اس کی چوٹی سے قلعہ کے اندر کا حصہ بخوبی دکھائی دینے لگا۔ ۷ مہینے تک سپاہی اور لشکر کے دوسرے آدمی رات دن محنت کرتے رہے ۲۰۰۰ کاریگر توپ ڈھالنے کے کام میں متواتر لگے رہے۔ ۴۰۰۰ دیغ جن سے کہ ۴۔۴ من کے گولے داغے جا سکتے تھے ڈھالی گئیں۔ مزدوروں پر روزانہ ۲ لاکھ تنکہ صرف ہوتا تھا۔ اس اثنا میں یہ جد وجہد ایک دن کو بھی نہ رکنے دی گئی[1]۔

اتنی سخت جاں فشانی اور صرفہ کا تصور ہمارے سامنے اکبر کے چتوڑ کے محاصرہ کی تصویر پیش کرتا ہے جب کہ توپ خانہ کو اوپر چڑھانے کے لیے مزدوروں کے تحفظ کے لیے اس کو ایک چھوٹا چبوترہ تعمیر کرنا پڑا تھا۔ شیر کے عزم بالجزم نے روپیہ اور فوج کی مدد سے قدرت و محاصرین کی سنگدل دلیری پر فتح پائی اور اس کو چور چور کر دیا۔

جب سب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو آخری حملہ کا دن مقرر کیا گیا۔ دس ربیع الاول ۹۵۲ھ مطابق ۲۲ مئی ۱۵۴۵ء بروز شنبہ افغان فوج حسب معمول پیٹ بھر ناشتہ کرنے کے بعد حملہ کے لیے آگے بڑھی۔ شیر خود لکڑی کی مینار پر چڑھا اور کمان سے تیر چھوڑ کر اس نے حملہ شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ تیروں کی بوچھار ہونے لگی مگر محافظ قلعہ فصیل پر ڈٹے رہے جب شیر نے دیکھا کہ تیروں کی بارش بے اثر ہے تو اس نے اپنے سپاہیوں کو حقہ (ایک بھدی

---

[1] قلمی نسخہ تاریخ داؤدی صفحہ ۲۴۹۔ پروفیسر ہودی والا نے سخت نکتہ چینی کی ہے میں نے فارسی کے لفظ من کا ترجمہ انگریزی کے وزن من سے کر دیا۔ لیکن میرا منشا یہ نہ تھا کہ شیر کی توپ ۴ من یعنی ۱۶۰ سیر کا گولہ پھینکتی تھی۔ داؤدی کا مطلب شاید یونانی وزن من سے تھا۔ جو محض ۷ پونڈ کا ہوتا تھا۔ بہرحال میرا ترجمہ غلط تھا۔

Marfat.com

شکل کا ہانڈی کا گولہ موجودہ زمانہ کی ہینڈ گرینیڈ) لانے کا حکم دیا تاکہ وہ راجپوتوں پر پھینکے جائیں جب دریا خاں حقہ لایا شیر پلیٹ فارم سے نیچے اتر آیا۔ اور حقوں کے پاس کھڑے ہو کر اس نے اپنے آدمیوں کو ان میں فلیتہ لگا کر قلعہ کے اندر پھینکنے کا حکم دیا۔ جب شیر کے سپاہی ان حقوں میں فلیتہ لگا کر قلعہ کے اندر پھینکنے میں ہمہ تن مصروف تھے تو مشیت ایزدی سے ایک حقہ قلعہ کی دیوار سے ٹکرا کر واپس آگیا اور حقوں کے انبار میں گر گیا جس سے تمام حقوں میں ایک دم آگ لگ گئی۔ اور بڑے زور کا دھماکہ ہوا شیخ خلیل، شیخ نظام اور دوسرے دانش مند اور سپاہی آگ کی لپٹوں میں جھلسنے سے بال بال بچ گئے لیکن جب باہر نکالا گیا تب قریب قریب آدھا جل چکا تھا۔ اسی حالت میں اسے خیمہ کے اندر لے جایا گیا اس کے سب امیر و سردار دربار میں اکٹھے ہوئے۔ شیر نے عیسیٰ خاں حاجب کو بلایا اور یہ حکم دیا کہ اس کے زندہ رہتے رہتے ہی قلعہ پر قبضہ ہو جانا چاہیئے۔ عیسیٰ خاں نے شیر کا یہ حکم سب امیروں کو سنا دیا اور حکم دیا کہ قلعہ پر چہار جانب سے حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لینا چاہیئے۔ یہ حکم سن کر شیر کی فوج مور و ملخ کی مانند قلعہ پر ٹوٹ پڑی[1] شیر نیم بیہوشی کی حالت میں تکلیف برداشت کرتا رہا۔ جب کوئی شخص اس کی مزاج پرسی کے لیے خیمے میں آتا تو اسے فوراً جا کر لڑنے کا اشارہ کر دیتا۔ اس کے سپاہیوں نے دیوار پر یورش کر دی اور اب چاقو و خنجر سے جھڑپیں ہونے لگیں۔ قلعہ کے محافظوں نے قلعہ کے اندر گھر گھر میں لڑائی لڑی۔ آخر میں راجہ کرت سنگھ ۷۰ آدمیوں کو لے کر ایک مضبوط و مستحکم قلعہ میں گھس گیا۔ ظہر کی نماز کا وقت تھا افغان لڑتے لڑتے تھک چکے تھے۔ لہذا انھوں نے قلعہ کا گھراؤ کر لیا۔ تاکہ دوسرے روز صبح باقی کام ختم کر دیا جائے۔ جب شیر کو فتح کا نوید ملا تو اس کے چہرے پر مسرت و اطمینان کی جھلک دکھائی دی اور اس کی زبان سے بے ساختہ یہ کلمہ نکلا " اللہ تیرا شکر ہے۔ یہ میری آخری خواہش تھی" اس[2] رات شاید نیم شب تک شیر زندہ

---

[1] عباس قلمی نسخہ صفحہ ۲۳۸-۲۳۹۔ ایلیٹ جلد ۴۔ ۴۰۸-۴۰۹۔

[2] عباس کہتا ہے کہ شیر کا انتقال ۱۰ ربیع الاول کو ۴ گھڑی رات گزرنے پر ہوا۔

Marfat.com

رہا۔ اس کے بعد طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا اور شیر کو جسمانی و روحانی دونوں سکون مل گئے۔

انجام

ظفر و کامرانی اور نیک افعال کے درمیان شیر کی دفعتاً وفات اور حکمراں کی حیثیت سے اس کے کردار کے اوصاف کی وجہ سے اس کی ذات کے چاروں طرف ایک ایسے مجاہد اور غازی کا ہالہ بن گیا ہے جو اپنے کام کو ادھورا چھوڑ کر چلا گیا ہو۔ وہ ۱۶ ویں صدی کا طوفانی انسان تھا۔ فتح و ظفر کی لہریں ایک کے بعد ایک اسے اوپر اٹھا رہی تھیں کہ مئی ۱۵۴۵ء میں مرگ ناگہانی نے اسے اپنی گود میں لے لیا۔ اگر اس سال وہ داعی اجل نہ ہوا ہوتا تو شاید آئندہ سال ابیری میں اس کی وفات ہوتی یا ایک سال بعد دولت آباد یا گوا میں کیونکہ علاؤ الدین یا محمد تغلق کی طرح اس کی بھی یہی کوشش تھی کہ اپنی سلطنت کے حدود ایک بحر سے دوسرے بحر تک قائم کرے۔ بالفرض محال اگر وہ دس سال اور بقید حیات رہتا تو شاید وہ اتنا مستحکم نظام سلطنت بنا لیتا اور انتظامی اصلاح کر لیتا کہ آئندہ دس سال تک اکبر کو کچھ کرنے کی گنجائش ہی نہ رہتی۔ یہ ایک محض انسانی کمزوری ہے کہ ہم یہ خواہش کرتے ہیں کہ ایک سودمند روش زیادہ عرصہ تک چلتی رہے۔ اور وہ اس خیال سے کہ جس کا آغاز اچھا ہوتا ہے اس کا انجام بھی یقیناً بہتر ہوگا۔

شیر نے محض ۵ سال حکومت کی لیکن اتنے سے ہی قلیل عرصہ میں اس نے اپنے لیے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں ایک ممتاز درجہ بنا لیا۔ بلاشبہ اکبر اعظم کے بعد اگر کسی کو قابل حکمراں تسلیم کیا جا سکتا ہے تو وہ شیر شاہ ہی ہے۔ یہ تصدیق طلب ہے کہ اگر وہ ۵۰ سال اور زندہ رہتا تو وہ اکبر کا ثانی ہو جاتا یا اس سے بھی سبقت لے جاتا۔ شیر شاہ اورنگ زیب اور اکبر کے اوصاف کا مجموعہ تھا۔ صرف اس میں اورنگ زیب کا پولیٹیکل تعصب نہ تھا۔ اور کچھ حد تک اکبر کی فراخدلی تھی۔ جس عہد میں وہ فرماں روا ہوا اس کا ماحول ہی ایسا تھا کہ نہ تو اکبر سے بڑا فلسفی پیدا ہی ہو سکتا تھا اور نہ رعایا اس کو برداشت ہی کر سکتی تھی۔ شیر کو سیاسی و مذہبی

Marfat.com

میدان میں رجعت پسندی اور قدامت سے ٹکر لینی تھی۔ ۲۰۰ سال کی دینی طرز حکومت کے خلاف جس کی جڑیں سوسائٹی میں بہت گہری ہوگئی تھیں اس کو جدوجہد کرنا تھی۔ اس کے لیے اس کے عہد کی فضا اتنی موافق و سازگار نہیں تھی جتنی کہ اس کے اور اس کے وارثوں کے بعد مغلوں کو ملی۔ اکبر کی ذہنیت و فطرت بچپن سے نقلابی تھی۔ وہ مسلمان ہونے کے باوجود اسلام کے اصول دینیات سے بے بہرہ تھا۔ س کی یہ لاعلمی مذہبی اصلاح کے لیے نعمت خداداد ثابت ہوئی۔ اس کے درباری مشیروں میں ابوالفضل اور شریف عاملی جیسے ذی فہم عیار تھے۔ جو علما کو اپنے جال میں پھنسائے رکھتے تھے۔ اس کے برعکس شیر دینیات اسلامی کا ماہر تھا۔ اسلام کے متعلق اس کا نظریہ اور عقیدہ اس قدر راسخ تھا کہ اگر اکبر اور ابوالفضل اس کے بالمواجہ اس قسم کا کفر زبان پر لاتے تو وہ انھیں فوراً پھانسی پر لٹکا دیتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ضعیف العمری میں شیر کا ذاتی تقدس اور مذہبی رجحان بگڑ کر اورنگ زیب کے سیاسی تعصب میں نہ بدل جاتا۔ وہ ۶۰ سال کا ہوچکا تھا۔ یہ وہ عمر ہے جب مشرق کے آدمی کی عقل خراب ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ یہی رویہ مشرق کے جمہوری نظام حکومت میں بھی اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ بہرحال اگر وہ زیادہ دن زندہ رہتا تو تاریخ میں اس کا درجہ پہلے کی بہ نسبت ضرور گر جاتا۔ کیونکہ اس حالت میں وہ رعایا کے ایک طبقہ کی اکثریت یا اقلیت کو ضرور ناراض کر دیتا۔ جیسا کہ اس کے بعد اکبر داورنگ زیب کے ساتھ ہوا۔ چنانچہ یہ افسوس کا مقام نہیں کہ شیر اپنا کام ادھورا چھوڑ کر چلا گیا۔ دنیاوی معاملات میں کب فضا بدل جائے کوئی پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔

یہ کہنا فضول ہے کہ شیر اپنے کارناموں سے خود مطمئن نہیں تھا[1]۔ تاریخ اور

---

[1] ڈاکٹر ایشوری پرشاد۔ ہمایوں۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ڈاکٹر موصوف نے افغان مورخین کی بات کو لفظ بہ لفظ تسلیم کر لیا ہے اور ان پر کوئی تنقید نہیں کی ہے۔ شیر کی خواہشات جو اس کی زندگی میں پوری نہ ہوسکیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔
(۱) روہ کے علاقہ کو ویران کرنا (۲) مغلوں کو روکنے کے لیے لاہور شہر کو برباد کرنا (۳) حج جانے والے مسافروں کے لیے ۵۰ (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

Marfat.com

فلسفہ میں آج تک کوئی جاہ طلب حکمراں ایسا نہیں ہوا جس نے دم آخر شاعر کی زبان میں یہ نہ کہا ہو

"بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے"

یہ شیر کی خوش قسمتی تھی کہ وہ سرگرمی عمل کے دوران میں ہی مرا۔ اس کے سامنے صرف ایک ہی نصب العین تھا۔ ایک ہی منزل تھی۔ اس کا دل و دماغ اسی جانب متوجہ تھا۔ اور اس کی خواہش مرنے سے پہلے پوری بھی ہو گئی۔ اس کی حکومت چند روزہ ہی تھی۔ لیکن آئندہ کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس حکومت کی اہمیت اکبر کی ۵۰ سالہ حکومت سے کسی طرح بھی کم نہ تھی۔ اس کے بعد اس کے خاندان کی حکومت مشکل سے ۱۰ سال رہی لیکن جس حکومت کو اس نے اپنی تلوار سے بنایا۔ عقل و سیاست سے سنوارا۔ اس کے مختلف رکن اور ادارے آج تک زندہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جہازوں کا بیڑہ تیار کرنا جس کا ہر جہاز ایک سرائے کے برابر ہو۔ (۴) پانی پت کے میدان میں ابراہیم کا ایک مقبرہ بنانا اور مغل شہیدوں کی یادگار بنانا۔

ہم پہلے ہی دو باتوں کی لغویت پر بحث کر چکے ہیں۔ تیسری چوتھی خواہش بعد کے افغانوں کی ایجاد تخیل ہے۔ اور شیخ چلی کی کہانی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ مغلوں کی سخت حکومت میں وہ ایسی ہوائی باتوں سے اپنے دل کو خوش کر لیتے تھے کبھی حج پر جانے کی سوچتے تھے کبھی افغانوں کی دیرینہ عظمت کی یاد میں سر دھنتے تھے۔ اس طرح ان کا من ڈانواں ڈول رہتا تھا۔ اگر شیر کو ابراہیم سوری کی قبر بنانے کی فرصت مل سکتی تھی تو ابراہیم لودی کی قبر بنانے کی فرصت کیوں نہ ملی؟

اگر شیر اس قسم کے جہاز حاجیوں کے لیے بنوا بھی لیتا تو بھی ان کو گاڑیوں پر لاد کر سورت لے جانا ہوتا اور اس کے لیے گجرات کے بادشاہ کی اجازت لینی ہوتی۔ اس قسم کی گپ بازی ۱۶ ویں اور ۱۷ ویں صدی کے سفید ریش ضعیفوں کو تو بہلا سکتی ہے لیکن آج کل کے نوجوان تو اسے سن کر شیر کی عقل کا مذاق ہی اڑائیں گے۔

Marfat.com

ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ارتقا کی منزلیں وسیع تر ہوتی چلی گئیں۔ ایک کے بعد ایک حکمراں آئے اور گئے، سوری خاندان کے بعد مغل آئے اور مغلوں کے بعد انگریز لیکن اسکے ادارے جب تک ہندوستانی سکوں میں روپیہ اور پیسہ کا رواج رہیگا خواہ ان کی اصل قیمت کتنی ہی کم کیوں نہ ہو جائے اور جب تک ملک میں مالگزاری کا موجودہ طریقہ مروج ہے شیر کی یاد ہند میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اس کی مدح سرائی میں نہ تو کسی بدایونی اور نہ نظام الدین کے قصائد سے اقتباس کی ضرورت ہے نہ اس کے مرتبہ پر تبصرہ کے لیے لوح مزار کی جستجو۔ اس نے سونار گاؤں سے نیلاب تک شاہراہ عام بنوایا۔ مسافروں کے آرام کے لیے سرائیں بنوائیں۔ زراعت کی فلاح و بہبود کے لیے نئی نئی اصلاحات کیں۔ افغانوں اور بنیوں کو حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں تک پہنچنے کی یکساں سہولت دیں۔ اس کے یہ جملہ کارنامے زبان حال سے اس کی شہرت و عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔ پھر لوح مزار کے کتبہ کی کیا ضرورت؟

شیر کا یہ ارادہ نہ تھا کہ اپنی سلطنت کو اپنے دونوں لڑکوں یعنی عادل خاں اور جلال خاں میں تقسیم کر دے۔ روایت ہے کہ کسی موقع پر اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ اس کا پوتا نور خاں۔ بن عادل خاں اپنے والد اور چچا سے زیادہ اس کا وارث بننے کا مستحق ہے۔ یہ ایک جد کی معنوی کمزوری تھی جس سے کہ رسول اللہ بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ اس کو اپنے لڑکوں کی خصلت کا بخوبی علم تھا۔ اور اس کو بیشتر سے آگاہی ہو گئی تھی کہ اس کی وفات کے بعد ویسے ہی بُرے دن آئیں گے جیسے کہ بہلول اور سکندر کی وفات کے بعد آئے تھے۔ شیر کے دونوں لڑکے اس کی امیدوں سے فروتر ثابت ہو چکے تھے۔ بڑے لڑکے میں طوفانی ماحول میں حکومت کرنے کا اسپاتی مادہ نہ تھا اور نہ اس کی شخصیت ہی پُر رعب تھی۔ چھوٹا لڑکا آگ اور بجلی کی مانند تھا۔ مگر وہ انسانیت کے اوصاف سے بے بہرہ تھا۔ عادل اپنی جسمانی طاقت اور دلکش اخلاق کے لیے مشہور تھا۔ مگر وہ کاہل الوجود اور بے سکت تھا۔ جلال خاں ایک تند خو سپاہی تھا۔ عیاری اور مکاری میں طاق، مگر خود سر، خود آرا، مخالفت سے چڑ جانے والا تھا۔ اس کے آتشی مزاج و انتقامی خصلت سے لوگ خوف زدہ رہتے تھے مگر مردانہ اوصاف نے فوجی افسران کے نوجوان طبقہ میں اسے

Marfat.com

ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ اس کے علاوہ پرانے امیر جو کہ شیر کی ذات خاص کے قریب تر تھے جلال خاں پر شبہ کرتے تھے۔ نیک اوصاف کی وجہ سے وہ بڑے شہزادے کے دلدادہ و وفادار تھے۔ شیر کی چاہے یہ خواہش کیوں نہ رہی ہو کہ اس کی وفات کے بعد اس کے لڑکوں میں خانہ جنگی نہ ہو مگر جس مسلم حکمراں کے ایک سے زیادہ لڑکے ہوں وہ اس کا تدارک نہیں کر سکتا۔ اسلامی حکومت میں باوجود اس کے کہ اس کو اصولاً ربّانی جمہوریت کہا جاتا تھا نہ تو حق خلف اکبر کا اصول تھا نہ شہنشاہیت کی ربانی حق کی اخلاقی اجازت۔ نہ تو چناؤ کنندہ تھا اور نہ کوئی چناؤ کا واضح قانون شیر شاہ کا نہ تو کوئی وزیر اعلیٰ ہی تھا اور نہ مجلس وزرار جو کہ سازش کا تانا بانا بناتی۔ یا شہزادوں کے حوصلے پر مہمیز لگاتی۔ اس نے بہلول اور سکندر لودی کے عہد کے پٹھان جرگہ کے دوبارہ زندہ کرنے کے جملہ امکانات ختم کر دیے تھے کیونکہ اس نے قبائلی اتحاد و اجتماع کو برباد کر کے سلطنت کے تحفظ کے خیال سے اپنی مشترکہ جماعتیں بنا دی تھیں۔ اودھ کے دوستانہ فرملی اور مغربی پنجاب کے نیازی اس طرزِ عمل سے مستثنیٰ تھے کیونکہ فوجی ضرورت کی وجہ ان کو روا رکھنا لازمی تھا۔ شیر نے افغان افسروں اور سپاہیوں کو فوجی نظم کے ذریعہ سے اتنا مطیع کر لیا تھا اور جاگیر و تنخواہ دے کر اتنا فرماں بردار بنا لیا تھا کہ وہ اپنے موروثی کی طرح قبیلوں اور خاندانوں کے پیرائے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تو شیر اور اس کے خاندان کے وفادار تھے ان کو اس سے مطلب نہ تھا کہ کون تخت نشین ہوتا ہے بااین ہمہ وراثت کے مسئلہ کو طے کرنے میں فوج کے افسروں اور امیروں کی ہی آواز بلند رہی۔ کالنجر کے محاصرہ میں شیر کی وفات کے بعد فوجی افسروں اور معتبر خانہ زاد امیروں کی ایک خفیہ بیٹھک ہوئی۔ بادشاہ کی وفات کی خبر کو باہر والوں سے پوشیدہ رکھا گیا۔ اور سب کام حسبِ معمول ہوتے رہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خاص حادثہ واقع نہیں ہوا ہے مگر درپردہ بیٹھک میں دونوں شہزادوں کے اوصاف و خرابیوں پر تبصرہ ہوا۔ اور اس مسئلہ پر غور کیا گیا کہ شیر کے تاج و تخت کا وارث کس کو بنایا جائے۔ مجموعی طور پر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ بالآخر جلال خاں کی حمایت میں ایک ترکیب نکلی۔ جو لوگ عادل خاں کے بڑا ہونے کی وجہ سے اس کی حمایت

Marfat.com

کر رہے تھے ان کے ضمیر کو بظاہر دلیل پیش کر کے مطمئن کیا گیا۔ مثال کے طور پر یہ بتایا گیا کہ سلطان سکندر نے اپنے بڑے بھائی بارک شاہ کے حقوق کو غصب کر کے تخت حاصل کیا تھا بعد میں اس ضرب المثل کے مطابق کہ دولت و سلطنت حاضر کو ہی دستیاب ہوتی ہے۔ سمجھوتہ ہوا اور طے یہ پایا کہ دونوں بھائیوں میں سے جو کوئی پہلے پہنچ جائے گا اسی کو سلطان تسلیم کیا جائے گا۔

چنانچہ دو خط لکھے گئے۔ ایک خط کو لے کر عادل خاں کے لڑکے محمد خاں کو اس کے والد کے پاس رنتھمبور بھیج دیا گیا۔ اس بہانے وہ لشکر سے باہر چلا گیا اور دوسرے خط کو جلال خاں کے کیمپ ریوا میں بھیج دیا گیا۔ جو کہ کالنجر سے براہ راست ۵۰ میل تھا۔ جلال خاں نے اپنے پہلے ہی فعل سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ واقعی بادشاہ بننے کے قابل ہے۔ خط ملنے پر کوئی مسرت یا یاس کی جھلک اس کے چہرے پر نہیں آئی۔ اس کے لشکر میں کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔ وہ فوجی مفاد کے ایثار کے لیے تیار نہ تھا۔ اور نہ ریوا کے جواں مرد اور پر جوش راجپوتوں کو ہی پیٹھ دکھانا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہاں سے ایک دم ہٹنے سے اس کی حالت پر خطر ہو جاتی چنانچہ اپنا کام ختم کر کے وہ پانچویں دن کالنجر پہنچ گیا۔ اور اسی روز ۱۵ ربیع الاول ۹۵۲ھ بروز جمعرات اسے تاج پہنا دیا گیا۔ شیر کی لاش کو جو ابھی تک خیمے میں رکھی ہوئی تھی عارضی طور پر کالنجر کے نزدیک دفن کر دیا گیا۔ بعد میں اس کو سہسرام کے مقبرے میں منتقل کیا گیا۔ چند روز کی عارضی خاموشی اور سکوت کے بعد خانہ جنگی کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا جس کی وجہ سے شیر کے ولی عہد کو ریوا کے راجہ کے یہاں پناہ لینا پڑی۔

شہزادہ جلال خاں نے کالنجر میں اسلام شاہ کا خطاب اختیار کیا۔ فوج کے تمام افسروں کو جو وہاں موجود تھے راضی کیا۔ اور عیسیٰ خاں حاجب کو "مقبول دار" کے عہدے پر مقرر کیا۔ یہ حکومت کا سب سے زیادہ معتبر عہدہ تھا۔ اس نے عیسیٰ خاں کے لڑکوں کو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر نامزد کیا۔ اور اس طرح بہترین دماغوں کو اپنی جانب ملا لیا۔ حالانکہ نئے بادشاہ نے فوج کے سپہ سالاروں اور سرداروں کے ساتھ کرم و مروت کا سلوک کیا تھا۔ لیکن ہر شخص سراسیمہ تھا اور اپنے سلطان پر اعتماد کرنے میں پس و پیش کر رہا تھا کیوں کہ اس نے فوج کے حالات سے آگاہی پالنے

Marfat.com

کے لیے سب جگہ اپنے جاسوس مقرر کر دیے تھے۔ ان جاسوسوں کا یہ فرض تھا کہ وہ بادشاہ کو بتائیں کہ سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے والے حضرات بادشاہ کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں اور سرکاروں کے فوجدار کیا کر رہے ہیں اسی اثنا میں شہزادہ عادل خاں کے لڑکے محمود خاں نے آگرہ پر چھاپہ مارا۔ اسے یہ امید تھی کہ یہ دارالسلطنت کے رہنے والے عادل خاں کی موافقت کریں گے۔ لیکن قلعہ کے افسر اور سپاہی قلعہ میں ہی پناہ گزیں ہو گئے۔ اور انھوں نے نفرت و حقارت سے اس کے وعدوں اور دھمکیوں کو ٹھکرا دیا۔ شیر کا یہ نوجوان اولوالعزم پوتا اپنے والد کے لیے معاون و مددگار تلاش کرنے کی نیت سے راجپوتانہ کے سرداروں کے پاس بھی گیا۔ جودھ پور کا خواص خاں، ناگور کا عیسیٰ خاں نیازی، اجمیر کا برہم جیت گوڑ، ہرمارا کا جلال خاں بن جالو اس رائے کے تھے کہ شیر کا جائز وارث ہی اس کی گدی پر بیٹھے۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ تمام امیر و سردار حتیٰ کہ لاہور کا ہیبت خاں نیازی بھی اسلام شاہ کے حق میں حلف وفاداری اٹھا چکے ہیں تو انھوں نے اس تجویز کی مخالفت کرنا اور ملک کو خانہ جنگی کی آگ میں جھونکنا مناسب نہ سمجھا۔ انھوں نے بھی اسلام شاہ کے خطوط کا جواب دے دیا اور اس کے خطاب شاہی کو تسلیم کر لیا۔ اور اس سے درخواست کی کہ عادل خاں کی جان و جاگیر کو محفوظ رکھا جائے۔ عادل خاں اس وقت رنتھمبور کے قلعہ میں پناہ گزیں تھا۔

اسلام شاہ کالنجر سے آگرہ کے لیے روانہ ہوا۔ اس نے خواص خاں اور راجپوتانہ کے دیگر سرداروں کو پیغام بھیجا کہ وہ دربار میں حاضر ہوں۔ وہ خود دارالسلطنت آگرہ میں بڑے کروفر سے داخل ہوا۔ اور فوج کے سپاہیوں کو دو مہینہ کی تنخواہ بطور بخشش تقسیم کی۔ خواص خاں جب دربار میں حاضر ہوا تو اسلام شاہ نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر کے سینہ سے لگا لیا۔ اور بوسوں سے اسے نہال کر دیا۔ لیکن یہ بوسے بہت جلدی نہایت مہلک ثابت ہوئے۔ اسلام شاہ کے دل میں اپنے بھائی کی جانب سے ہر وقت کھٹکا رہتا تھا۔ اس نے رنتھمبور دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور نہ باہمی اختلاف اور دل شکنی دور کرنے کے لیے وہ دربار میں آنے کو تیار تھا۔ عادل خاں نے اسلام شاہ کو ایک خط بھیجا کہ وہ آگرہ آنے کو بالکل تیار ہے۔ شرط یہ ہے کہ

Marfat.com

خواص خاں، قطب خاں نائب عیسیٰ خاں نیازی، جلال بن جالو اس کے پاس آکر اسے یہ یقین دلادیں کہ ملاقات کے بعد اس کو صحیح سلامت واپس کر دیا جائے گا اسلام شاہ نے ان سرداروں سے درخواست کی کہ وہ رنتھمبور جاکر بڑے شہزادہ کو دربار میں بلالائیں اور اسے برادرانہ الفت و اخلاص کا یقین دلائیں۔

جلال خاں بن جالو نے جو کہ ایک دلیر جنگ آزمودہ سپاہی اور اسلام شاہ کا جگری دوست تھا۔ یہ بات کھول کر کہہ دی کہ سلطنت کے امرائے عظام کو مبتلا کر کے حلف دروغی کرنے سے تو بہتر یہ ہوگا کہ فوراً رنتھمبور پر دھاوا بول دیا جائے اور عادل خاں کو سلطنت کے باہر دور کھدیڑ دیا جائے۔ اس نے کہا "آپ جو وعدہ کر رہے ہیں مجھے یقین ہے کہ آپ کل عادل خاں کے پہنچنے کے بعد وفا نہ کریں گے۔ کیونکہ حکمراں ایسی ہی حالت میں صلح اور مصالحت کرتے ہیں جب کہ وہ بزور بازو اپنے منصوبوں کی تکمیل نہیں کر سکتے" یہ وہ مقولہ تھا جس پر کہ شیر شاہ و اسلام شاہ نے عمل کیا۔ اور اس کے پس پشت دنیا کی ہزار ہا سال کی کارروائی تھی۔ لیکن شاہ محمد فرمولی کی با اثر دلیل سے جلال خاں بن جالو زیر ہو گیا۔ اس نے یہ کہا کہ اپنے آقا کی بہبودی کی خاطر کسی فرد کو بھی حلف دروغی سے گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ ۱۸ویں صدی تک تاریخ اس قسم کی مثالوں سے پر ہے۔ اور یہ جذبہ افغانوں میں فطری طور پر موجود تھا۔ خواص خاں اور دیگر سپہ سالاروں کو اس معاملہ کا علم بھی نہ تھا وہ نیک نیتی سے رنتھمبور چل دیے تاکہ دونوں بھائیوں میں خانہ جنگی کی نوبت نہ آئے۔

چاروں[2] سرداروں نے عادل خاں کو یہ یقین دلایا کہ وہ اسلام شاہ کی طرف سے مطمئن رہے۔ اس کو ضرر پہنچنے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ شہزادہ عادل خاں نے رنتھمبور خالی کر دیا۔ اور ان سرداروں کے ہمراہ آگرہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہ ملاقات کی تاریخ مقرر ہونے تک فتح پور سیکری میں قیام پذیر رہا۔ روایت

---

[1] ڈارن جلد ۱۔ صفحہ ۱۴۹۔

[2] یہ حصہ نظام الدین کی طبقات اکبری کے سہارے لکھا گیا ہے۔ دیکھیے نول کشور پریس سے شائع کتاب صفحہ ۲۳۳

Marfat.com

ہے کہ اسلام شاہ نے ملاقات کے دن ہی عادل خاں کے قتل کا منصوبہ باندھ رکھا تھا۔ اس غرض سے اس نے اپنے دربانوں کو حکم دیا تھا کہ وہ ملاقات کے دن ان تین سرداروں کے سپاہیوں کو دربار میں نہ داخل ہونے دیں لیکن عین موقع پر یہ تجویز ناکام ہو گئی۔ کیوں کہ ان سرداروں کی طرف داروں کو یہ شبہ ہو گیا تھا کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ لہٰذا وہ جبراً دربار میں گھس گئے۔ جب یہ تجویز ناکام ہو گئی تو اسلام شاہ مسند سے نیچے اتر آیا۔ اور اس نے اپنے بھائی عادل خاں کو تخت پر بٹھا کر یہ کہا "آپ بادشاہ ہیں میں تو اب تک بطور متولی کے کام سنبھالے ہوئے تھا۔ اب میں آپ کی امانت آپ کو سونپ رہا ہوں۔" اس پر عادل خاں گدی سے اٹھا۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر دوبارہ اسلام شاہ کو گدی پر بٹھایا اور خود رعایا کی طرح مسند کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ عادل خاں کو بیانہ کا قلعہ دے دیا گیا جو آگرہ سے ۵۳ میل جنوب مغرب میں ہے اور جب تک وہ قلعہ خالی ہو اس کو آگرہ سے ۶ میل دور سکندرہ میں ٹھہرنے کے لیے کہہ دیا۔ چند روز کے بعد اسلام شاہ نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اس نے اپنے محل کے خاص خواص غازی محلی کو ایک زنجیر طلائی دے کر اس کام کے لیے بھیجا کہ وہ عادل خاں کو قید کر کے وہاں لے آئے۔ اس پر خواص خاں اور عیسیٰ خاں نیازی علی الاعلان مصیبت زدہ شہزادہ کی مدد پر کھڑے ہو گئے۔ اسلام شاہ کے اس رویہ سے جملہ سرداروں کے دل میں اس کی جانب سے نفرت پیدا ہو گئی۔ جلال خاں بن جالو اور برہم جیت گوڑ نے بھی عادل شاہ کا ساتھ دیا اور فوج میں اسلام شاہ کو تخت سے ہٹانے کی سازش ہونے لگی۔

فوج میں اس درجہ بد امنی اور بے چینی پھیل گئی کہ اسلام شاہ نے چنار اور روہتاس کے قلعہ میں بھاگ جانا بہتر سمجھا۔ سرداروں نے یہ مشورہ کیا کہ آدھی رات کے وقت جب عادل شاہ کی فوج آگرہ کے نزدیک پہنچ جائے گی اس وقت تمام باغی سردار اسلام شاہ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ خواص خاں اور عادل شاہ کے معاون دیگر سردار میوات کی سرحد سے آگرہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ جب وہ فتح پور سیکری پہنچے تو وہ رات شب برات کی تھی۔ جب کہ مسلمان شب بیداری اور دعا کرتے ہیں۔ خواص خاں نہ صرف ایک دلیر سپاہی

Marfat.com

ہی تھا بلکہ ایک پاک طینت صوفی بھی تھا۔ پھر بھلا اس کو یہ کب گوارا ہوتا کہ وہ شیخ سلیم الدین چشتی کے ساتھ بغیر نماز ادا کیے رہ جاتا۔ اس تاخیر کی وجہ سے خواص خاں کو تو برادن دیکھنا ہی پڑا اس کے معاون بھی بدقسمتی کے شکار بنے۔ جب یہ لوگ منڈاگور یعنی موجودہ مدھوکر جو کہ آج کل آگرہ قلعہ اسٹیشن سے۔ امیل کے فاصلہ پہ پہنچے تو صبح ہو چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلال خاں بن جالو۔ برہم جیت گوڑ اور دیگر سرداروں نے باغیوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور اسلام شاہ سے جا کر مل گئے۔ آگرہ کے نزدیک ایک لڑائی ہوئی۔ اور اس لڑائی میں جلال خاں بن جالو اسلام شاہ کی طرف سے اس قدر بہادری اور بے خوفی سے لڑا جتنا کہ وہ اس کے خلاف لڑتا۔ اگر یہ لڑائی دن نکلنے سے پہلے رات میں ہی ہوئی ہوتی خواص خاں بڑی دلیری سے کچھ دیر تک لڑتا رہا۔ بعد میں جب اسے یہ معلوم ہوا کہ عادل خاں کی فوج تتر بتر ہو کر فرار ہوگئی ہے تو وہ اور عیسیٰ خاں نیازی میوات[1] کے راستہ سرہند کی جانب بھاگ گئے اور عادل خاں چند اور کے راستہ بندھیل کھنڈ کی جانب چلا گیا۔

اس کے ایک سال بعد اسلام شاہ نے انبالہ کے نزدیک طاقت ور نیازیوں کے خلاف ایک فیصلہ کن لڑائی لڑی۔ اس وقت نیازی فوج ہیبت خاں کی کمان میں تھی۔ خواص خاں جو سرہند سے بھاگ کر کمایوں کی پہاڑیوں میں چلا گیا تھا مفرور عادل خاں کی حمایت میں نیازیوں سے مل کر ایک متحدہ محاذ بنانے کی فکر میں تھا اور اسی مقصد کی تکمیل کے لیے وہ اپنی فوج لے کر ہیبت خاں کا ساتھ دینے کے لیے انبالہ کے میدان میں اتر آیا۔ اور ہیبت خاں سے آملا۔ ابتدائی کامیابی نے نیازیوں کے دماغ میں یہ فتور پیدا کر دیا تھا کہ کیوں نہ ہم شیر شاہ کے لڑکوں کو تخت سے ہٹا کر خود ہندوستان کے حکمراں بن جائیں۔ جب خواص خاں کے کان میں یہ آواز پہنچی تو اس نے حملہ سے قبل شب کو نیازیوں سے یہ سوال کیا کہ اگر ان کو فتح نصیب ہوئی تو کون تخت نشین ہوگا؟ اور جب اس نے عادل شاہ

---

[1] خواص خاں اور عادل خاں کے دیگر حمایتوں نے ایک اور لڑائی فیروز پور جھرکہ میں لڑی۔ مگر وہ ہار گئے۔ جھرکہ میوات کے ضلع نجارہ میں ہے۔ تاریخ شیر شاہی صفحہ ۱۴۳ھ

Marfat.com

کے نام پر زور دیا تو نیازیوں نے یہ جواب دیا کہ سلطنت کوئی میراث نہیں ہوتی. کیا وہ عادل خاں کے لیے جانبازی کرنے آئے ہیں؟ خواص خاں کو مذہبِ اسلام میں تو عقیدت تھی ہی۔ مگر اس کے بعد اگر وہ کسی کے ساتھ وفادار تھا تو وہ تھا اس کے موروثی آقا کا خاندان۔ چنانچہ فوراً ہی اس نے اسلام شاہ کو شکست و تحقیر سے بچانے کی تدبیر کرلی۔ دوسرے روز صبح جب کہ لڑائی زوروں سے ہو رہی تھی اور نیازیوں نے اسلام شاہ کے قلب کے چھکے چھڑا دیے تھے اور اس کو درہم برہم کر دیا تھا تو ایسے نازک موقع پر خواص خاں اپنی فوج لے کر میدانِ جنگ سے ہٹ گیا اور ایک نزدیک کی پہاڑی پر سے تماشہ دیکھنے لگا کہ اب کیا ہوتا ہے۔ خواص خاں کی روگردانی سے نیازی فوج میں خوف وہراس پھیل گیا اور سپاہی ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ جب کہ وہ ایک دلدلی نالہ پار کر رہے تھے تو ان میں سے بہت سے ہلاک ہو گئے۔ خواص خاں کا یہ تو ارادہ تھا کہ اگر اسلام شاہ کو ہارتا دیکھتا تو اس کی مدد کو جاتا۔ وہ فتح کے موقع پر اس کی مہربانی کا خواہاں نہ تھا۔ کیونکہ اس سے اس قسم کی خلاف ورزی ہوتی جو کہ اس نے عادل خاں کے سلسلے میں کی تھی۔ وہ اعظم ہمایوں اور قطب خاں کی کمان میں جو نئی فوج مرتب ہوئی تھی اس کو چیرتا ہوا بھاگ نکلا۔ ان سپہ سالاروں نے اپنے سپاہیوں کو یہ ہدایت کی کہ وہ سیاہ بلا سے دور ہی رہیں۔ سیاہ بلا کا مطلب تھا خواص خاں جو کہ پہاڑوں کی سمت میں کوچ کر رہا تھا۔

اسلام شاہ نے خواجہ وائس سروانی کی کمان میں ایک فوج ہیبت خاں نیازی کے تعاقب میں بھیجی۔ نیازی پوری طاقت سے سندھ کی جانب بھاگا یہاں دھن کوٹ یا دن کوٹ کے مقام پر وہ از سرِ نو منظم ہو گئے اور انھوں نے اپنا تعاقب کرنے والے غنیم کو ہرا دیا۔ دہلی سے مزید شاہی کمک ملنے پر خواجہ وائس نے نیازیوں کو نمک کے پہاڑ کی جانب بھگا دیا۔ یہاں گکھڑ لوگوں نے ان سے دوستی کرلی۔ اسلام شاہ ایک عظیم الشان فوج لے کر نیازیوں اور گکھڑ لوگوں کو کچلنے کے لیے روانہ ہوا۔ اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے اسے پنجاب میں دو سال تک رکنا پڑا۔ آہستہ آہستہ اسلام شاہ کو افغانوں کی وفاداری پر

Marfat.com

شک ہونے لگا۔ اس نے اپنی فوج میں خصوصاً پیادہ فوج میں بڑی تعداد میں ہندوؤں کی بھرتی شروع کر دی۔ جس سے افغان لوگ مرعوب ہو جائیں فنِ حرب میں اسلام شاہ بھی اپنے والد کی طرح استاد تھا۔ اس نے وقت ضرورت کے لیے پنجاب کی حفاظت کی غرض سے کشمیر کی سرحد کے نزدیک شمالک کی پہاڑیوں میں جہاں آسانی سے کوئی نہ پہنچ سکے مان کوٹ[1] آباد کیا اس شہر کے آباد کرنے میں افغان سپاہیوں کو مزدوروں کی طرح محنت کرنی پڑی۔ مان کوٹ چار قلعوں اور چار شہروں پر مشتمل تھا۔ مان کوٹ، رشید کوٹ وغیرہ بدایونی کہتا ہے کہ دو سال تک افغان دیو نژاد چونہ اور پتھر ڈھونے میں لگے رہے۔ (بدایونی قلمی نسخہ جلد ا۔ صفحہ ۳۸۷)۔

موجودہ زمانہ کے گکھر[2] لوگ شیر شاہ کو بھول چکے ہیں مگر انھیں اسلام شاہ کی تاسف آمیز یاد ابھی آتی ہے۔ جس کے ظلم و تشدد سے وہ اتنے ہی خائف رہے

---

[1] مان کوٹ برطانیہ حکومت میں کشمیر میں تھا۔ یہ وادی دریا کے دائیں کنارے پر شمال مغرب میں ۱۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور لاہور سے ۱۰۱ میل شمال مشرق ارض البلد ۳۸ ۳۲ اور طول البلد ۴۲-۵۰ ۷ فوجی نقطہ نظر سے یہ جگہ نمک کے پہاڑ میں شیر کے روہتاس قلعہ کی طرح لاجواب ہے (تھورنٹن گزیٹر صفحہ ۵۷۵)

[2] گکھر لوگ راولپنڈی کے قرب و جوار میں پائے جاتے ہیں۔ شکل و شباہت میں یہ سرحدی پٹھانوں کی طرح ہیبت ناک نہیں ہوتے۔ لمبا قد، گالوں کی ہڈیاں اٹھی ہوئیں اور سرخ رنگ یہی ان کا حلیہ ہے۔ میں نے اس علاقہ کا دورہ ایک نہایت ہی دلچسپ شخص کے ساتھ کیا تھا۔ اس کا نام مرز سرور خاں تھا۔ اس کو میں نے ٹکشلہ کے نزدیک اپنا رہنما بنایا تھا۔ اس کی یاد کبھی میرے ذہن سے بھلائی نہیں جا سکتی۔ وہ اپنے آپ کو مغل بادشاہ بہادر شاہ کا خاندانی بتاتا تھا۔ اس کی جسمانی ساخت اور طریقہ و شعور دیکھ کر اس کی بات غلط نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس وقت ایک مایوس عاشق تھا۔ وہ حجام کے ایک تندرست لڑکے پر عاشق ہو گیا تھا۔ اس نے اس کے لیے بہت روپیہ بھی خرچ کیا۔ لیکن وہ اپنے معشوق کی توجہ اپنی جانب راغب کرنے میں ناکام رہا۔ وہ ان مخدوش

Marfat.com

جتنا کہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں خیبر درہ کے افغان جمرود کے فوجدار ہری سنگھ نلوا سے تھے۔ اسلام شاہ نے اپنے پرانے ساتھی ہیبت خاں نیازی سے بڑا سخت پر درد انتقام لیا۔ ہیبت خاں نیازی نے زندگی بھر شیر کو پایہ عروج پر پہنچنے میں اس کی مدد کی تھی۔ اسلام شاہ نے گکھڑ لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے علاقہ سے نیازی لوگوں کو نکال دیں۔ جب ہیبت خاں کے کچھ بچے ہوئے مصیبت زدہ ساتھی کشمیر کی ایک گھاٹی سے بچ کر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے تو کشمیریوں نے انھیں قتل کر دیا۔ انھیں ڈر تھا مبادا اسلام شاہ کشمیر پر حملہ کر دے۔ تمام پنجاب میں نیازیوں کا صفایا کر دیا گیا۔ انھیں سندھ دریا کے اس جانب بھگا کر ڈیرہ اسمعیل خاں کے بلوچیوں کے علاقہ میں بھیج دیا گیا۔

ہمیں اسلام شاہ کے ان بداعمالی کے قصوں کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس نے کس طرح شیر کے عہد حکومت کے اعلیٰ مرتبہ سپہ سالار جلال خاں بن جالو قطب خاں وغیرہ کو اپنے راستہ سے ہٹا یا۔ اس نے چند روز کے لیے مالوہ کے شجاعت خاں سے مصالحت کی مگر شجاعت خاں اپنی جان کے ڈر سے گجرات

لوگوں سے واقف تھا جو پوشیدہ رہتے ہیں اس لیے اسے ساتھ رکھنا ایک ایمان دار آدمی کے مقابلہ میں حفاظت کے خیال سے زیادہ اچھا تھا وہ میرے ساتھ ایمان دار رہا۔ اس نے مجھے اسلام شاہ کے متعلق ایسی باتیں بتائیں جو میں نے کسی تاریخ اور گزیٹیر میں نہیں پڑھی تھیں۔ اس نے مجھے وہ جنگلات و پہاڑی ڈھال دکھلائے جن کے متعلق یہ روایت ہے کہ اسلام شاہ روہتاس کو اپنی توپیں اس راستہ سے گھسیٹ کر لے گیا تھا۔ یہ ڈھال صاف طور پر انسان کے بنائے معلوم ہوتے ہیں اور جگہ جگہ سلاخوں کے لیے سوراخ بنے ہیں۔ جن میں باندھ کر توپیں اوپر کی جانب کھینچی گئی ہوں گی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسلام شاہ کا یہ طرز عمل تھا کہ وہ گکھڑ لوگوں کے مویشیوں کو پکڑ لیتا تھا اور اس خطہ کی نباتات برباد کر دیا کرتا تھا۔ تب گکھڑ لوگ بھوک سے عاجز ہو کر اس کی اطاعت قبول کر لیتے۔ وہ ہر روز صبح کو گکھڑ قیدیوں کو قتل کر دیتا تھا۔ اس سے دوسرے لوگ خائف رہتے تھے۔ اس بات کی تائید مخزن سے بھی ہوتی ہے۔

Marfat.com

بھاگ گیا۔ اور اس نے سلطان محمود گجراتی کے یہاں ملازمت کر لی لیکن جلد ہی گجرات کے بادشاہ کو بھی اسلام شاہ کے خوف سے شجاعت خاں کو اپنے علاقہ سے بدر کرنا پڑا۔ بالآخر شجاعت خاں بگلانہ پہنچ گیا۔ وہاں کے راجپوت سردار یعنی ملہر کے بھیرو سنگھ نے اسے پناہ دی اسلام شاہ نے مالوہ کا صوبہ عیسیٰ خاں سوری کو دے دیا تھا۔ لیکن اسلام شاہ کی وفات کے بعد شجاعت خاں نے دوبارہ مالوہ پر قبضہ کر لیا۔ اسلام شاہ نے کمایوں کے راجہ پر اس کے علاقہ میں متعدد بار حملہ کر کے اتنا دباؤ ڈالا کہ خواص خاں نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی موجودگی سے راجہ کو پریشانی میں ڈالنے کے بجائے خود اپنی جان پر کھیلے گا۔ اور وہ بذات خود اسلام شاہ سے ملنے کے لیے دہلی چل دیا۔ اب وہ اس بات سے بے نیاز تھا کہ آیا اسے معافی ملے گی یا جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اسلام شاہ میں شرافت نام کو نہ تھی اس نے دہلی بازار کے چوراہے پر سب کے سامنے خواص خاں کو پھانسی دے کر ذلیل طریقہ سے انتقام لیا اور اس کی لاش کو تین روز تک وہیں پڑا رہنے دیا۔ روایت ہے کہ ہر روز اس کی لاش گلاب کے پھولوں سے ڈھک جاتی تھی[2] اس معجزہ سے خائف ہو کر اسلام شاہ نے اس کی نعش کو

---

[1] سنسکرت کے ایک شاعر رودر کی لکھی ہوئی تاریخی رزمیہ نظم راشٹر اودھو ونس مہا کاویم میں لکھا ہے کہ ملہر کے راجہ بھیرو سین نے منڈپ پربت کے سلطان کو اپنے یہاں پناہ دی تھی۔ اس سلطان نے سلیم شاہ کے خوف سے پناہ مانگی تھی۔ ایڈیٹر نے اس پناہ گزیں کو شجاعت خاں مانا ہے جو بالکل ٹھیک ہے (گائیکواڑ اورینٹل سیریز، ۱۹۱۷)

[2] میں نے شیر شاہ کے جانشینوں کی تاریخ لکھنے میں بدایونی نعمت اللہ (مصنف مخزن) کو سامنے رکھا ہے اس زمانے کے واقعات پر بھی تنقیدانہ نظر ڈالی گئی ہے خواص خاں کی موت کے متعلق مختلف قیاس آرائیاں ہیں احمد یادگار نے تاریخ سلاطین افغانستان میں جو کہ تاریخ شاہی کے نام سے شائع ہوئی ہے لکھا ہے کہ اسلام شاہ نے خواص خاں کے نام ایک خط بھیجا جس میں اس سے ایک دیندار مسلم کی حیثیت سے اجمیر کے رانا کے خلاف لڑائی پر جانے کو لکھا تھا کیونکہ رانا نے مسلمان عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا تھا۔ خواص خاں پر

Marfat.com

دفن کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ دردناک انجام ہوا اس مقدس اور پارسا زندگی کا جو بلا امتیاز مذہب و ملت، نیک و غریب لوگوں کا سہارا تھی۔ باغی اور سرکشوں کے لیے مجسم موت تھا اور میدانِ جنگ میں دشمن کے لیے غیبی گولہ تھی۔ جودھ پور کے لوگوں نے اس کی اچھی قدردانی کی۔ وہاں کے فقیروں نے اس کی یاد میں ایک نقلی قبر بنوائی۔ آج بھی نہ جانے کتنے آدمی اس معجز نما قبر کی زیارت کو آتے ہیں۔ شیر شاہ کے پرانے رفیقوں میں سے صرف ایک ہی شخص اسلام شاہ کے ہاتھوں سے بچا وہ حبیب خاں کاکر تھا۔ اسے سب سرمست خاں کے نام سے جانتے تھے۔ اس نے بنگال کے سید محمود شاہ کے سپہ سالار قطب خاں کو قتل کر کے شیر کے لیے پہلی فتح حاصل کی تھی۔ سرمست خاں لحیم شحیم دلیر سپاہی تھا۔ اس کے سامنے دیو قامت افغان بھی بونے معلوم ہوتے تھے۔ وہ تیز فہم اور خوش اخلاق تھا۔ شیر شاہ اور اسلام شاہ کے زمانے میں وہ باربیگی کے ذمہ دار عہدہ پر تعینات تھا۔ عادل شاہ کے زمانہ میں بھی وہ اسی عہدے پر کام کرتا رہا۔ ایک مرتبہ گستاخ فرمولی لوگوں نے دربار میں شورش برپا کی۔ اس شورش کو دبانے میں وہ ہلاک ہوگیا۔

اس خط کا وہی اثر ہوا جو اسلام شاہ چاہتا تھا۔ خواص خاں پہاڑیوں سے نیچے چلا آیا اور سنبھل کے فوج دار تاج خاں کرانی سے ملا۔ اسلام شاہ نے فوج دار کو پہلے ہی ہدایت دے دی تھی کہ وہ خواص خاں کے آتے ہی اس کو قتل کر دے۔ اس کے جسم میں بھوسا بھروا دے۔ اور اس کے سر کو ایک نیزے کی نوک پر رکھ کر دہلی بھیج دے۔ تاج خاں کے آدمیوں نے خواص خاں کو رات میں ہی قتل کر دیا جب وہ قرآن شریف کی تلاوت میں محو تھا۔ دوسرے روز صبح کو اس کی لاش گلاب کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی پائی گئی جب خواص خاں کا کٹا ہوا سر دہلی پہنچا تب آندھی کا ایک زبردست طوفان آیا کہ دن رات میں تبدیل ہوگیا۔ زلزلوں سے شہر کے بہت سے مکان مسمار ہو گئے۔ اس کی لاش کو دہلی میں لال دروازے کے قریب دفن کیا گیا۔ (تاریخ شاہی صفحات ۲۵۱-۲۵۴)

Marfat.com

اسلام شاہ نے افغانوں پر نہایت سختی سے حکومت کی۔ لیکن کاشتکار اور تجاروں کے ساتھ اپنے والد کی طرح نرمی کا برتاؤ کیا۔ اس کی حکومت دراصل کاغذی حکومت یعنی لال فیتا شاہی تھی۔ یہ اس کے والد کا طرز حکومت نہ تھا۔ ہندو کلرک فارغ البال تھے اور سول کے محکمہ میں ان کا غلبہ تھا۔[1] ان کے مقابلہ میں افغانوں کی حالت خستہ اور زبوں تھی۔ اگر شیر نے ٹوڈر مل کو پایا تھا تو اس کے لڑکے نے اس سے بھی زیادہ ممتاز ہستی ہیمو کو ڈھونڈ نکالا۔ اسلام شاہ کے بعد جب سوری حکومت لڑکھڑانے لگی تو ہیمو نے ہی اسے سہارا دیا۔ سوری عہد میں ہیمو کو وہ مرتبہ اور اقتدار حاصل ہوا جو مغل حکومت میں راجہ مان سنگھ کچھواہہ اور دیگر ہندو خواب میں بھی خیال نہیں کر سکتے تھے۔ اسلام شاہ نے اپنے والد کی طرح سیاست کو مذہب سے دور رکھا۔ اپنی پرائیویٹ زندگی میں وہ کٹر مسلمان تھا اور اسلام کے رسم و رواج کا اتنا ہی معتقد تھا جتنا کہ شیر شاہ۔ اس کا صدر الصدور شیخ الاسلام مولانا عبداللہ سلطان پوری تھا۔ جسے اکبر کے زمانہ میں پریشانی اٹھانی پڑی۔ لیکن اسلام شاہ نے اپنے شیخ الاسلام کو سیاست کے معاملوں میں دخل دینے کی کوئی اجازت نہ دی۔ نہ کبھی حریت پسند علما کے خلاف کام کرنے کی ترغیب دی۔[2] نظام سلطنت کے متعلق

---

[1] اسلام شاہ کے زمانہ میں ہندوؤں کی خوش حالی افغانوں کی آنکھ کا کانٹا تھا یہ بات بدایونی کی ایک کہانی سے ثابت ہے۔ ایک روز شاہ محمد فرملی نے اپنے خوش اسلوب طرز بیان سے سپاہیوں کی مصیبتوں اور ہندوؤں کی محکمہ مال میں بے عنوانی اور غبن کی جانب اسلام شاہ کی توجہ دلانے کے لیے کہا کہ اس نے گذشتہ شب کو ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے کہ آسمان سے مین تھیلے آئے۔ ان میں سے ایک خریطہ میں خاک بھری ہوئی تھی ایک میں سونا ایک میں کاغذ۔ خاک کا تھیلہ سپاہیوں کے سر پر پڑا۔ سونے کا تھیلہ ہندو دفتر والو کے گھر گرا۔ اور کاغذوں کا تھیلہ شاہی خزانے میں رہ گیا۔ (بدایونی جلد ا صفحہ ۳۸۶)

[2] اس باب میں شیخ علائی کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ شیخ الاسلام عبداللہ

Marfat.com

احکام صادر کرتے وقت وہ کبھی علما سے مشورہ نہیں لیتا تھا نہ کبھی یہ خیال کرتا تھا کہ اس کے یہ احکام شرع کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اس کے احکام کی دو کسوٹیاں تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ وقت ضرورت کے مطابق ہو اور دوسری یہ کہ اس کا اطلاق ہر فرد پر مساوی ہو۔

اسلام شاہ کا عہد حکومت بظاہر تو طوفانی معلوم ہوتا تھا لیکن اصل میں اس کا عہد بڑے ہی امن و امان فارغ البالی خوش حالی و ترقی و عروج کا رہا۔ وہ اپنے والد کی طرح نظام حکومت میں سخت تھا۔ اسی کی طرح جفاکش و محنتی تھا۔ اور تفصیل امورات حکومت پر اتنی ہی کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ اس نے ہر بڑی سرکار میں ۴ ہزار گھوڑ سوار مقرر کیے تاکہ حکومت کا رعب عوام کے دل پر غالب رہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ علاقہ کی حفاظت کا بھی معقول انتظام ہو جائے آسٹریا کے ایک بادشاہ نے سوئزرلینڈ کے لوگوں سے اپنی ٹوپی کو سلام کروایا تھا یہ ٹوپی ایک بانس پر لٹکی رہتی تھی اور اس کی حکومت کا نشان سمجھی جاتی تھی لیکن اسلام شاہ نے مغرور پٹھانوں سے اپنے جوتوں کو سلام کروایا۔ یہ جوتے دور دراز علاقوں میں کرسی پر رکھے رہتے تھے۔ اور یہ حکومت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ یورپ میں کم از کم واٹ ٹیلر کو تو یہ حوصلہ اور ہمت تھی کہ اس نے مطلق العنان حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کی لیکن اسلام شاہ کے زمانہ میں کسی کو بھی اس کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس کی حکومت سے مستفید اور فیض یاب ہو کر رعایا کی اکثریت اس کی حمایت کرتی تھی۔ اس نے محمد تغلق کی طرح اپنے پیش رو حکمرانوں کے نظام حکومت میں رد و بدل کر کے کوئی جدت پیدا کرنے کی کوشش نہ کی۔ بدایونی جو کہ اسلام شاہ کے عہدِ حکومت میں محض نابالغ تھا

سلطان پوری نے اس کا چالان کیا بادشاہ نے اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس کو دکن میں جلاوطن کر دیا۔ بعد ازیں جب اسلام شاہ نے دیکھا کہ اس کی تقاریر اور وعظوں سے سوسائٹی کی بنیاد ہل رہی ہے تو دوسری مرتبہ اس کو گرفتار کیا گیا اور چند کوڑوں کی سزا دی گئی۔ جس سے وہ زخمی ہو گیا۔ (بدایونی قلمی نسخہ صفحہ ۴۰۰-۴۰۲ جلد ۱)

Marfat.com

لکھتا ہے:

"اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد اس نے فرمان صادر کیا کہ شیر شاہ کی بنی ہوئی ہر دو سرائیں کے درمیان ایک نئی سرائے بنوائی جائے۔ اور اس میں ایک مسجد، آرام گاہ، بہشتی اور لنگر کا انتظام ہونا چاہیئے۔ لنگر خانہ سے مسلمانوں کو پکا ہوا کھانا اور ہندوؤں کو کھانا پکانے کا سامان ملنا چاہیئے۔ اس نے ایک دوسرا فرمان جاری کیا کہ شیر شاہ کے زمانہ میں جو مدد معاش اور ائمہ لوگوں کو دیا گیا تھا وہ اسی طرح تمام ہندوستان میں جاری رہے۔ اس کی تعمیر کردہ سرائے اور باغات کم وبیش نہ ہونے پائیں اور لاپرواہی سے ان کو ضرر نہ پہنچے۔ اور اس نے یہ بھی حکم دیا کہ لال رنگ کا خیمہ کوئی آدمی استعمال نہ کرے محض بادشاہ سلامت ہی اس رنگ کا خیمہ استعمال کر سکتے ہیں۔ دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ سلطنت کی تمام زمین کو خالصہ بنا دیا سپاہیوں کو نقد تنخواہ دی جانے لگی۔ شیر نے گھوڑوں پر داغ لگانے کی رسم جاری کی تھی۔ اس نے اس رسم کو جاری رکھنے کا حکم دیا۔ ایک نیا کام اس نے یہ کیا کہ وہ ہر سرکار کو حکم نامہ لکھ کر بھیجا کرتا تھا جس میں دینی، ملکی، مالی امورات پر بالتفصیل ہدایت ہوتی تھی۔ ان احکام کا مقصد تھا سپاہیوں، کاشتکاروں اور تاجروں کی دقت رفع کرنا۔ اور جملہ حکام کا فرض تھا کہ ان احکام کی تعمیل بے پس وپیش بے چون وچرا کریں۔ خواہ وہ احکام شریعت کے مطابق ہوں یا خلاف۔ کسی حاکم کی یہ مجال نہ تھی کہ شاہی حکم کو قاضی یا مفتی کے پاس رائے زنی کے لیے بھیجے۔ پنج ہزاری۔ دس ہزاری اور بیس ہزاری امرا کا ایک جلسہ ہر جمعہ کو ایک عالی شان خیمہ میں ہوتا تھا۔ وہاں اسلام شاہ کے ترکش اور جوتے ایک کرسی پر رکھے رہتے تھے۔ سب سے پہلے فوجی افسر بعد ازیں امین یعنی منصف اور اس کے بعد مطابق مانند درباری باری باری سے اپنی جگہ سے اٹھ کر سلام کرتے اور پھر اپنی جگہ واپس آکر بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد دبیر حکم نامہ پڑھ کر سناتا۔

یہ حکم نامہ ۸۰ صفحات پر لکھا ہوتا تھا۔ دبیر اس حکم نامہ کو سنانے وقت اپنی طرف سے کوئی لفظ کم وبیش نہیں کر سکتا تھا۔ ہو بہو لفظ بہ لفظ سارا حکم نامہ پڑھا جاتا

Marfat.com

تھا اس حکم نامہ کی ہر لفظ کی تعمیل ہوتی تھی۔ اگر کوئی امیر یا امین اس حکم نامہ کے خلاف کوئی حکم صادر کرتا تو دبیر اس معاملہ کی اطلاع فوراً دربار میں دیتا تھا۔ اور خلاف ورزی کرنے والے امیر کو مع اس کے بیوی بچوں اعزا و اقارب کے سخت سزا ملتی تھی۔" (بدایونی قلمی نسخہ جلد ا۔ صفحہ ۳۸۴-۳۸۵)

حالانکہ پرانے امیر سپہ سالار مطیع چکے تھے اور اسلام شاہ پنجاب میں کافی عرصہ تک مصروف رہا لیکن اس کی سلطنت میں کسی جانب بھی انتشار کا کوئی اثر نمودار نہیں ہوا، نہ سلطنت میں کوئی علاقہ کم ہوا۔ یہ سچ ہے کہ سیوانہ میں راؤ[1] مالدیو اور ریوا کے راجپوت اب کچھ سر اٹھا رہے تھے۔ اب مارواڑ میں

---

[1] مارواڑ کے موجودہ مورخ راؤ مالدیو کو ایک قابلِ احترام ہستی اور قومی ہیرو بتاتے ہیں۔ جس نے شیر کی فتح کے ایک سال کے اندر ہی تمام ملک سے افغان حکومت کا صفایا کر دیا۔ (ریو مارواڑ کی ہندو تاریخ جلد ۱)۔ مالدیو کے متعلق ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جودھپور کے قلعہ پر مالدیو کا قبضہ شیر کے جودھپور فتح کرنے کے ۵۶۶ دن بعد ہو گیا تھا۔ جیسا کہ ڈاکٹر وی ایس بھارگو پی ایچ ڈی نے اپنے مقالہ (مارواڑ اینڈ دی مغل ایمپررس) میں لکھا ہے "اگر یہ کتبہ نقلی نہیں ہے تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مالدیو نے عارضی طور پر جودھپور کے قلعہ پر قبضہ کر لیا ہو گا۔ جب خواص خاں عادل خاں کی حمایت میں اس کے چھوٹے بھائی کے خلاف لڑنے گیا تھا بینی نے لکھا ہے پٹھان لوگ مارواڑ میں بہت بے رحمی سے لڑ رہے تھے۔ بیرم دیوا اور دیگر لوگ ابھی تک پٹھان حکومت کے وفادار تھے۔ عادل شاہ کے تخت پر قبضہ کر لینے کے بعد جب تین جانب سے جنگ وراثت شروع ہو گئی تب مالدیو نے اپنے علاقہ کا زیادہ تر حصہ واپس لے لیا۔" ہم یہ نتیجہ فارسی مورخین کے بیان سے نکال سکتے ہیں۔ یہ بات قابلِ یقین نہیں ہے کہ شیر شاہ کا تسلط مارواڑ میں کل ۵۶۶ دن رہا۔ اگر ایسا ہوتا تو آج ۴۰۰ سال کے بعد بھی اسی کی حکومت کی نشانیاں مارواڑ میں مثلاً شیر پور پرگنہ اور خواص پور کیسے باقی ہیں۔ اور کیسے آج تک بہاری پٹھانوں کا وجود وہاں قائم رہتا۔

Marfat.com

خواص خاں کی جگہ میواڑ کا فوج دار حاجی خاں پٹھانی تعینات تھا اور بڑی قابلیت سے خواص خاں کی کمی کو پورا کر رہا تھا۔ مارواڑ میں کمبھل میر تک اسلام شاہ کی حکومت کا سکہ چلتا تھا۔ اسلام شاہ فرموبی اور کرانی سرداروں کے علاوہ دوسرے قبیلے کے لوگوں پر زیادہ یقین نہیں کرتا تھا وہ اپنے خانہ زاد غلاموں اور قبیلے کے لوگوں کو دوسروں پر ترجیح دیتا تھا۔ اس نے اپنے چچازاد بھائی اور بہنوئی مبارز خاں کو (جو بعد میں سلطان عادل شاہ ہوئے) سنبھل کا پرگنہ سونپ دیا اور ۲۰ ہزار فوج اس کی کمان میں دے دی۔ لیکن اپنے غلام پرخندہ خاچک کو اس کا نائب بنا کر ساتھ بھیج دیا۔ مالوہ میں عیسیٰ خاں سور کا تقرر شجاعت خاں کی جگہ کیا۔ بیانہ غازی سور کو دیا اور آگرہ میں اپنے لڑکے ابراہیم کو تعینات کیا۔ لاہور کا گورنر اپنے بہنوئی احمد خاں سور کو بنا دیا۔ بنگال کا گورنر محمد خاں سور کو نامزد کر دیا۔ اسلام شاہ اپنے والد ہی کی طرح مغلوں کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھتا رہا۔ ایک مرتبہ جب اسلام شاہ دہلی میں تھا تو اس کو خبر ملی کہ ہمایوں نیلاب پار کر آیا ہے۔ اس وقت حکیموں نے اس کے گلے میں فاسد خون نکالنے کے لیے ستر (۷۰) جونکیں لگا رکھی تھیں۔ لیکن یہ خبر ملتے ہی اس نے جونکیں ایک طرف پھینک دیں اور فوراً فوج کو کوچ کے لیے حکم دے دیا۔ اس وقت اس کا توپ خانہ لشکر میں موجود تھا لیکن توپ گاڑیوں کو کھینچنے والے بیل پاس کے گاؤں میں چر رہے تھے۔ اسلام شاہ نے حکم دیا کہ بیلوں کا انتظار نہ کیا جائے بلکہ ہر توپ گاڑی کو دو ہزار پیادے کھینچیں۔ اس طرح وہ اسی روز دہلی سے ۳ میل باہر جا کر ٹھہرا۔ ایسے دشمن کے خلاف ہمایوں کو کیا امید ہو سکتی تھی آخر اسلام شاہ اسی شیر شاہ کا لڑکا تھا جس نے اسے ہندوستان سے باہر نکال دیا تھا اور اسی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ ۳۰ اکتوبر ۱۵۵۳ء کو ۸ سال حکومت کرنے کے بعد اسلام شاہ کا انتقال ایک پھوڑا نکلنے کی وجہ سے ہو گیا۔ اس کے تخت کا وارث اس کا ۱۲ سالہ لڑکا فیروز خاں بن گیا۔ اس کی موت کے بعد وہ طوفان آیا جس نے افغان حکومت کو ہندوستان سے جڑ سے ہی اکھاڑ دیا۔

تاریخی نقطہ نظر سے اسلام شاہ کا عہد شیر شاہ کے عہد کا تسلسل ہے۔

Marfat.com

اور اس کی پنج سالہ حکومت کی ایک کامیاب تفسیر۔ اگر شیر نے اپنے لڑکے
کے کارناموں کی آب و تاب کو کم نہ کر دیا ہوتا تو بلاشبہ تاریخ میں اسلام شاہ
کا نام عجوبہ روزگار ہوتا۔ اگر شیر کو اپنا تسلط مستحکم کرنے کے لیے ایسی ہی
صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا جیسی کہ اسلام شاہ کو درپیش ہوئی تو شاید
وہ بھی سفاکی بے وفائی اور دھوکہ دہی کے الزامات سے جو کہ قرون وسطیٰ کے
مؤرخوں نے اسلام شاہ سے منسوب کیے ہیں نہ بچ سکتا۔ برعکس اس کے
اگر اسلام شاہ نہ ہوتا تو شیر کی فطری قابلیت صرف ایک حیرت انگیز درخشاں
شرارہ بن کر رہ جاتی۔ اس کی چمک ہندوستان کے سیاسی افق پر شہاب
تابندہ کے مانند بے خطا نہ ہوتی اور صدیوں بعد تک حکمرانوں اور مدبروں
کی رہنمائی نہ ہوتی۔ اور شیر کے عہد کی تمام شان و شوکت غروب آفتاب کی
سرخ جھلک بن کر رہ جاتی جس سے کہ شفق کا فریب ہو سکتا تھا۔

اسلام شاہ کی وفات نے ہر سوری سردار کے دماغ میں دوسرا شیر شاہ
بننے کا حوصلہ پیدا کر دیا۔ اگر یہ لوگ بالاتفاق رہتے تو اندرونی ہیجان و شورش
اور باہری مغلوں کے حملوں کا مقابلہ کر لیتے۔ اسلام شاہ نے افغانوں کو اپنے
آہنی پنجہ میں جکڑ کر ان کے حوصلے اور ہمت پست کر دیے تھے۔ انھیں
نہایت مطیع و تربیت پذیر بنا دیا تھا۔ یہ ایک ایسی غلطی تھی جس نے افغانوں
کے سیاسی مستقبل کو تاریک بنا دیا۔ یہ ایک ایسی بھول تھی۔ جس سے کہ اس
کے والد نے احتراز کیا۔ فوجی نظم و ضبط انسان کے کردار میں وہ اوصاف پیدا
نہیں کر سکتا جو کہ کسی قوم کو مصیبت کے دنوں میں زندہ رکھتے ہیں۔ انسان
کے اندر یہ خوبیاں جذبہ حب الوطنی، قوم پرستی اور احساس خودی سے پیدا
ہوتی ہیں۔ علاوہ بریں اسلام شاہ چونکہ افغانوں پر بھروسہ نہیں رکھتا تھا۔
اس نے سلطنت کے خاص خاص عہدوں پر غیر ملکی لوگوں کا تقرر کیا تھا۔ مثلاً
پنجاب میں روہتاس کے قلعہ کا گورنر ایک ایرانی تاتار خاں کاشی کو بنایا۔
اس تاتار خان نے احمد سوری کو شاہی خطاب اختیار کرنے کی ترغیب دی
تھی۔ بعد ازاں مغلوں نے اسے لالچ دے کر اپنی طرف ملا لیا تھا۔ اسلام

Marfat.com

شاہ نے مبارز خاں کو فوج میں ایک اعلیٰ عہدے پر معمور کیا۔ اس کو یہ امید تھی کہ اس کی وفات کے بعد وہ اس کے نابالغ لڑکے کا ولی و سرپرست بن کر کام کرے گا۔ اور سلطنت کو پاش پاش ہونے سے بچائے گا۔ لیکن مبارز خاں نے اپنے بھتیجے کو قتل کر دیا۔ اور خود گوالیار میں سلطان عادل شاہ کا خطاب اختیار کر لیا۔ اس سے دوسرے سوری سرداروں کو بھی بغاوت کرنے کا موقع مل گیا۔ اور ہر سردار خود مختار سلطان بننے کا خواب دیکھنے لگا۔ مبارز خاں

نے تخت کے اصل وارث کو قتل کر کے بڑی زبردست حماقت کی کیونکہ اس کی موجودگی میں وہ اس لڑکے کا ولی بن کر تمام سلطنت کا اصلی مالک بنا رہتا۔ اب یہ موقع اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کی ذات میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ جملہ افغانوں کو رشتۂ اتحاد میں باندھے رہتا۔ فرمولی اور کرّانی سرداروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ افغان مورخوں نے بڑے افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ حکومت کا خوف و احترام لوگوں کے دلوں سے جاتا رہا۔ ابراہیم سوری نے جو آگرہ میں سلطان بن کر بیٹھا تھا عادل شاہ کے افغانوں کو متواتر شکست دے کر اس کی طاقت کو تقریباً بالکل ہی ختم کر دیا۔ بہت کوشش کرنے کے باوجود وہ عادل کی لڑکھڑاتی حکومت کو سہارا نہ دے سکے۔ لہذا انھوں نے ہیمو کو وزیر بنا کر حکومت کے کلی اختیارات اسے سونپ دیے۔ ہیمو کے برسراقتدار آتے ہی صورت حال بدل گئی۔ ہیمو جیسا قابل منتظم اور سپہ سالار اس زمانہ میں افغانوں میں دوسرا نہیں تھا۔

مورخوں نے ہیمو کے کردار کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اس کا مذاق اڑانے کے لیے اس کی شکل و شباہت بھی بے ڈول بتائی ہے۔ اس کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک معمولی بنیا تھا۔ جو گھوڑے پر بھی سواری نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بھی وہ افغانوں پر حکومت کرنے کا خواہشمند تھا۔ ابوالفضل نے بڑی تفصیل سے اور غیر ایماندارانہ طریقہ سے اس قابل قدر ہندو کا خاکہ کھینچا ہے۔ جس نے اسلام شاہ کے عہد حکومت میں محض اپنی قابلیت کی بنا پر اس قدر ترقی

Marfat.com

کی اور اسلام شاہ کا معتبر افسر بنا۔[1]

ہیمو ریواڑی کے رہنیا کا لڑکا تھا۔ وہ دیسی لوگوں کی دھوسر ذات میں قطب پور گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو بھارگو براہمن کہتے ہیں حالانکہ یہ ہنوز اپنا آبائی پیشہ تجارت کرتے ہیں۔ ہیمو پہلے شورہ بیچا کرتا تھا۔ بعد میں بازار میں تولنے کا کام کرنے لگا۔ اسلام شاہ کے عہد میں وہ دہلی کے بازار کا شحنہ (سپرنٹنڈنٹ) بن گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہیمو خفیہ محکمہ کا صدر اور داروغہ ڈاک چوکی تھا۔ اسلام شاہ کے زمانہ میں خفیہ محکمہ کی بہت اہمیت تھی۔ اور ڈاک چوکی کے ذریعہ ایک سیر سوناموُنگ[1] (دال کی سب سے اچھی قسم) اور ایک من تازہ چاول بنگال سے ہر روز اسکے پاس آتا تھا۔ خواہ وہ دریائے سندھ کے کنارے خیمہ زن کیوں نہ ہو۔ حالانکہ وہ بدنام بنیا قوم سے تھا لیکن وہ قرون وسطیٰ کی تاریخ میں ان ممتاز ہستیوں

---

[1] ابوالفضل لکھتا ہے "ظاہرہ طور پر نہ ہیمو کا کوئی حسب تھا نہ نسب" نہ صورت تھی نہ سیرت۔ خدا نے بدمعاشوں کو سزا دینے کے لیے اس سے بھی زیادہ بدمعاش آدمی بھیجا تھا۔۔۔ مختصر یہ کہ اس بدشکل پستہ قد آدمی نے عیاری اور چالاکی سے لوگوں کی برائی کرکے اور اپنی تاجرانہ قابلیت سے سلیم خاں کے دل میں جگہ کرلی۔ ظاہرہ طور پر وہ اپنے آقا کا وفادار تھا لیکن دراصل وہ اپنا الو سیدھا کر رہا تھا۔ اور مظلوموں کے مال و متاع سے اپنا گھر بھر رہا تھا۔ داکبرنامہ ترجمہ ۱- ۶۱۶ - ۶۱۷)۔ یہ اس قسم کی ایک مثال ہے کہ کسی مورخ کا قلم اور تعصب تاریخ میں کسی بدقسمت کے کردار میں کتنی رنگ آمیزی کرسکتا ہے۔

[1] مخزن کی "بی کی نقل" دیکھئے جس سے ڈارن نے اقتباس کیا ہے۔ ڈارن کا ترجمہ ہے "ہر روز بنگال سے ایک سیر سنارگام اور ایک من تازہ چاول۔" ظاہر ہے کہ مترجم کو دال کی اس مشہور قسم سے جو بنگال کے میمن سنگھ ضلع میں پیدا ہوتی ہے واقفیت نہ تھی۔ یہ مشہور دال "سونا مونگ" کہلاتی ہے۔ مترجم نے اسے غلطی سے سونارگام لکھ دیا ہے۔

Marfat.com

میں سے ایک تھا جو کہ آٹا تولنے میں بھی ماہر تھا اور تلوار چلانے میں بھی راجپوتوں اور ترکوں سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ ایک جنگجو قوم میں جتنی انتظامیہ قابلیت ہونی چاہیئے اس میں ان سے زیادہ تھی۔[1] اسلام شاہ کو اس کی سپاہیانہ صفات کا پتہ چل گیا تھا۔ اور اس نے اسے ترقی دے کر اس عہدہ پر پہنچا دیا جو کہ شیر کے زمانہ میں برہم جیت گوڑ نے حاصل کیا تھا۔ اسلام شاہ کی یہ پالیسی تھی کہ وہ ہر افغان افسر کے ساتھ ایک ہندو افسر بھی فوج کی کمان میں رکھتا تھا تاکہ دونوں ایک دوسرے کی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکیں۔ اسی پالیسی کے ماتحت جب اس نے کامران مرزا کی نقل و حرکت کی نگرانی کے لیے دوسرے افغان سرداروں کو بھیجا تو ساتھ میں ہیمو[2] کا بھی فوجی دستہ بھیجا تھا۔ کامران اس وقت مصیبت زدہ تھا۔ کورچشم تھا اور رمان کوٹ کے نزدیک اسلام شاہ کے دربار میں پناہ لینے آ رہا تھا۔

عادل شاہ کے دربار میں ہیمو کے مرتبہ کے متعلق ابوالفضل لکھتا ہے "ہیمو سب عہدوں پر تقرر کرتا تھا۔ برخاست کرتا تھا اور عدالت کا بھی کام کرتا تھا۔ اس نے اپنی دور اندیشی سے شیر خاں اور سلیم خاں کے خزانہ اور ہاتھیوں کے اصطبل پر قبضہ کر لیا تھا۔ چند روز تک وہ اپنے نام کے ساتھ "رائے" لکھتا رہا۔ بعد میں اس نے راجہ کا خطاب اختیار کر لیا۔ اور اپنے کو راجہ بکرماجیت کہنے لگا۔ اس طرح وہ بڑے آدمیوں کا ہم نام بن گیا۔ اپنی حکمت عملی اور عاقبت اندیشی سے اس نے فقط نام کے لیے عادل شاہ کو تخت پر بٹھائے رکھا۔ اور اس کی جانب سے مخالفین سے لڑتا رہا۔ اپنی شجاعت و دلیری

---

[1] میں نے اپنے ایک مضمون میں جو موڈرن ریویو میں بہ عنوان "دی رول آف دی نان راجپوتس ان راجپوتانہ ہسٹری" فروری ۱۹۵۵ء کو شائع ہوا تھا یہ لکھا تھا کہ راجپوتانہ کے دیسی لوگوں نے اس عہد میں کیا کیا کام کیے۔

[2] بدایونی قلمی نسخہ ۱۔ ۳۸۱ " از تمامی لشکر خوبیتق ہیمو بقال مشہور را کہ دراں ایام بانقریب سعیات و کفایت از تنگی بازار باور جہ اعتبار رسیدہ بود۔"

Marfat.com

سے اسے لڑائیوں میں فتح نصیب ہوتی رہی۔ اس نے بڑے بڑے کام کیے۔
اپنی قابلیت ومردانگی کے لیے وہ مشہور ہوگیا۔"

ہیمو کی کمان میں افغانوں نے مغلوں کا مقابلہ کیا۔ اس میں کسی قسم کا زہبی سوال نہیں پیدا ہوا۔ تغلق آباد کی لڑائی میں ہیمو نے بیگ پر فتح حاصل کی۔ اس فتح میں حاجی خاں پٹھان کا زبردست ہاتھ تھا کیونکہ اس نے ٹھیک وقت پر دشمن کا مقابلہ کیا تھا۔ پانی پت کی دوسری لڑائی میں ہیمو کی شکست محض ایک اتفاقیہ واقعہ تھا۔ چند روز پہلے علی قلی خاں زمانی نے اس کی توپیں چھین لی تھیں۔ اور لڑائی میں اس کی ایک آنکھ جاتی رہی تھی۔ مہارانا سانگا کے علاوہ نہ تو کسی ہندو کو میدانِ جنگ میں اتنے زخم آئے اور نہ کسی راجپوت نے غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف اتنی دلیری ہی دکھائی تھی جتنی کہ پانی پت کے میدان میں ریواڑی کے اس معمولی ہندو نے دکھائی تھی۔

ہیمو کی وفات سے سوری عہد کا آخری عظیم نمائندہ ختم ہوگیا۔ اس کی وفات نے سیاست میں شیر خاں کے قابل ترین جانشین اکبر اعظم کے لیے راستہ صاف کر دیا۔

Marfat.com